सौभाग्यग्रहण
कन्यादानाकडून
पिंडदानाकडे
FEB 1987

ہمارے تہوار: قومی یکجہتی کے حقیقی روپ

۱۔ مہاراشٹر کی ثقافتی سرگرمیوں کی غمازی کرتے ہوئے "گنیش اُتسو" دراصل ہماری قومی یکجہتی کو اُجاگر کرتا ہے۔ لوکمانیہ تلک نے اس تہوار میں سماجی، سیاسی رنگ بھرا تاکہ قومی سطح پر عوامی شعور کو جگایا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام ذات پات، نسل اور ملت کے لوگ آج "گنیش اُتسو" میں حصہ لیتے ہیں۔ پونے میں یہ تہوار بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ سالانہ جلوس میں فلک بوس گنیش جی کی مورتیاں وِسرجن کے لئے نکالی جاتی ہیں۔

۲۔ اپنے علیحدہ ثقافتی ورثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر نے قومی یکجہتی و بھائی چارے کی فضا کو برقرار رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ محرم کے جلوس اس کی زندہ مثال ہیں۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہندو بھی اس میں بڑی تعداد میں عقیدت سے حصہ لیتے ہیں تابوت اور تعزیے "سرو دھرم سمبھاؤ" کی روح کو بیدار کرتے ہیں۔

۳۔ پرجوش اور زندہ دلی پیدا کرنے والا "بھنگڑا" رقص، پنجاب کی ثقافتی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ جس طرح مہاراشٹر میں "گنیش اُتسو" کا تہوار نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے اسی طرح پنجاب میں "بیساکھی کا تہوار" نہایت جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ، بچے بوڑھے اور جوان ذات پات اور مذہب کو بالائے طاق رکھ کر بیساکھی کے اس تہوار میں خوشی خوشی شامل ہوتے ہیں۔ زیر نظر تصویر میں ہمارے ملک میں "بیساکھی جشن" کا ایک منظر دکھلایا گیا ہے

قومی راج

ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

سالانہ: دس روپے ، فی شمارہ: ایک روپیہ

چیف ایڈیٹر: پرمود مانے ★ منیجنگ ایڈیٹر: ریاض احمد خاں
ایڈیٹر: فیروزہ فیضان خان ★ سب ایڈیٹر: عبد اللہ

جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں

جلد ۱۴ ۱۰ جنوری ۱۹۸۷ء شمارہ ۱

ترتیب

نظمیں غزلیں

رسم جہیز

اور

آزادیٔ نسواں

"جہیز اور آزادیٔ نسواں تحریک" آج کل عوامی بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جواں فکر وزیر مملکت برائے تعلیم قانون اور انصاف شریمتی چندریکا کینیا سے کی گئی گفتگو حسبِ ذیل ہے۔ (انجلی راناڈے)

سوال: ہمارے سماج میں رسم جہیز کے بڑھتے ہوئے زور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: رسم جہیز نہایت ہی غیر منصفانہ رسم ہے جو مرد اور عورت کے مابین غیر مساویانہ رویہ پر مبنی ہے۔ اگر لڑکی کے والدین اپنی مرضی سے اُسے کوئی تحفہ دینا چاہتے ہیں تو وہ بخوشی دے سکتے ہیں لیکن جہیز کو رشتہ طے کرتے وقت فیصلہ کن نکتہ نہیں بننا چاہیئے۔ جہیز کی رسم ایک قدیم رسم ہے اس کو سماجی بیداری کے ذریعے ختم کیا جانا چاہیئے۔ حکومت نے بھی جہیز مخالف قانون میں ترمیم و اصلاح کی ہے لیکن پھر بھی قانون میں لچک ہے۔ سماجی بیداری کے ذریعہ بہرحال اس فرسودہ رسم سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

سوال: اس رسم کی وجہ سے کئی خواتین جسمانی اور ذہنی طور پر پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ انھیں نجات دلانے کی خاطر آپ کس نوعیت کی تبدیلی چاہتی ہیں؟

جواب: میں پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ حکومت نے قوانین بنائے ہیں لیکن سماجی مزاج کو ایکدم بدل دینا مشکل کام ہے یہ تبدیلی تعلیم کے ذریعہ لائی جاسکتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ ہم اگر درمیان میں اسکول چھوڑ جانے والے بچوں کی تعداد پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں لڑکیوں کا فیصد زیادہ ہے۔ لڑکیوں کو صحیح خطوط پر تعلیم دی جانی چاہیئے۔ تعلیم ان کو معاشی طور پر خود کفیل بنا سکے گی۔ خواتین ان سرکاری قوانین سے بھی واقف نہیں ہیں

جو اُن کے مفاد کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ذرائع اطلاعات کو چاہیئے کہ وہ ان قوانین کی آسان زبان میں وضاحت کر کے سب کے سامنے پیش کرے تاکہ خواتین چوکنا ہو جائیں اور اپنے حقوق کے لئے عدالت کے دروازے کھٹکھٹا سکیں۔

لڑکے عموماً جہیز نہ لینے کی بات کرتے ہیں لیکن جب خود اُنکی شادی کا وقت آتا ہے تو وہ آئیڈیل بھول جاتے ہیں تعلیم کے ذریعے اس ذہنیت کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے لڑکوں کو چاہیئے کہ جہیز نہ لینے پر سختی سے کاربند رہیں

سوال، کیا آپ نے اس میدان میں کام کیا ہے؟

جواب؛ میں نے اُن خواتین کی قانونی رہنمائی کی ہے جو طلاق یا گذارہ کی رقم وغیرہ کے لئے پریشان حال تھیں اور انہیں کوئی صحیح ڈھنگ سے قانونی طور پر رہنمائی بھی نہیں کرتا تھا۔ ایسی خواتین کو اگر صحیح طور پر قانونی مدد مل جائے تو اُن کی حالت بہتر ہو سکتی ہے لیکن میرے کام کا مرکز شہری علاقہ رہا ہے۔ میں نے دیہی علاقوں میں کام نہیں کیا ہے۔

سوال، آزادیٔ نسواں سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب؛ دستورِ ہند مرد اور عورت کو یکساں درجہ دیتا ہے لیکن سماج میں عورت کو کمتر گردانا جاتا ہے۔ عورتوں کو بھی مساوی مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں۔ عورتیں مردوں کی جائداد سمجھی جاتی تھیں لیکن دستور نے عورت کو باوقار درجہ دیا ہے لہٰذا اُسے بھی ترقی کے مواقع دیئے جائیں۔

سوال؛ "تحریکِ آزادیٔ نسواں" کے بارے میں آپ کیا فرماتی ہیں؟

جواب؛ مغربی ممالک میں آزادیٔ نسواں کی تحریک سے ہندوستانی عوام نے بھی اختلافِ رائے کیا ہے۔ لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس قسم کی تحریک ہندوستان میں بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ لیکن اسکو آگے بڑھا کر دیہاتوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

سوال، کیا اس سلسلہ میں حکومت کے اقدامات اطمینان بخش ہیں؟

جواب؛ حکومت کے اقدامات صد فیصد اطمینان بخش تو نہیں ہیں اور اس ضمن میں کوئی بھی قدم کلی طور پر باعث تسلی نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تھا۔ اب حکومت نے انسدادِ جہیز قانون میں ترمیم و اصلاح کی ہے۔ زنا بالجبر کے معاملہ میں فوجداری قانون میں بھی ترمیم کی گئی ہے۔ اور اب ملزم پر ثبوت کی فراہمی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بہت ہی اچھا اقدام ہے۔

سوال؛ اعلیٰ سطح پر عورتیں کن مسائل سے دوچار ہیں؟ کیا آپ بحیثیت ایک وزیر اس بات کو محسوس کرتی ہیں؟

جواب، جہاں تک محکمہ جاتی مسائل کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ رابطۂ عامہ کے وقت مرد اور عورت کے رابطہ میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے وزیرِ اعظم راجیو گاندھی نے سیاست میں حصہ لینے والی عورتوں کی ہمت افزائی کی ہے اور انہیں مناسب قلمدانِ وزارت بھی سونپے ہیں۔ اب وقت بدل گیا ہے اور عورتیں اپنے روشن مستقبل کی امید کر سکتی ہیں۔ ●

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت بےخودی سے مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے
وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دنیا کو جگاتی ہے
وہی ارمانِ ہستی ہے، وہی ایمانِ ہستی ہے
بدن کہیے اگر ہستی کو تو وہ جانِ ہستی ہے

اختر
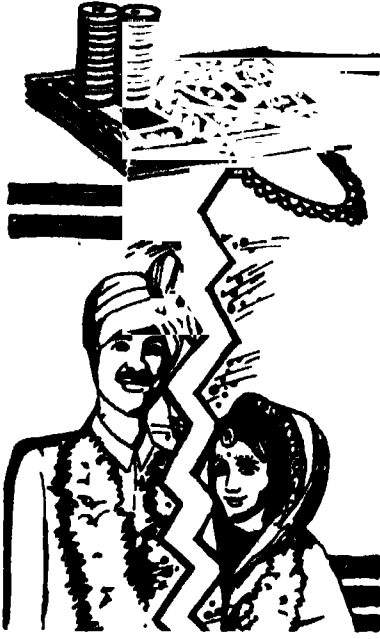
یوسف ناظم
۱۹/۱۳ نادرہ ریکلیمیشن۔ بمبئی ۵۰

جہیز نامہ

ایک زمانہ تھا جب جہیز بڑا جانفزا لفظ تھا۔ اب یہ جاں لیوا ہو گیا ہے۔ اس لفظ میں بڑی موسیقیت تھی۔ مائیں بڑے شوق سے جہیز جمع کرتی تھیں۔ لڑکی نے ابھی چلنا بھی نہیں سیکھا کہ اس کا جہیز جمع ہونا شروع ہو گیا خود بچیاں گڈا گڈی کی شادیاں رچاتی تھیں اور اپنی گڑیا کا جہیز بھی خود ہی تیار کرتی تھیں۔ جہیز زندگی اور خوشی کی علامت تھا۔ اب یہ کس چیز کی علامت ہے اس کا نام لیتے ہوئے جان نکلتی ہے ورنہ اس لفظ کے چار حرف انسانیت کیلئے ۴ ستون تھے۔ جزا، ہمت، یقین اور زندگی۔

جہیز کے یہی معنی ہوتے تھے کیونکہ ہم اُس وقت سیدھے سادے انسان تھے۔ دانشمند یا دانشور نہیں تھے۔ اب اس لفظ کے معنی بدل گئے ہیں۔ چاروں حرف جرم، ہوس، یلغار اور زہر کے معنی دینے لگے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جہیز اصل میں دینے کی چیز ہے لینے کی نہیں۔ یہ جب سے لئے جانے کی چیز بنی، مہر و وفا سے جور و جفا میں تبدیل ہو گئی۔ جب تک شادی میں اصل چیز " دلہن " تھی معاملہ ٹھیک تھا۔ لوگ صحیح معنوں میں آنکھ بند کر کے بیٹیاں دے دیا کرتے تھے۔ لیکن جب سے اس معاملہ میں دلہن کی جگہ جہیز نے لے لی ہے لڑکی کی شادی اور سُولی میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔ وہ

رلی میں نہیں چڑھتی سولی پر چڑھتی ہے۔ آنکھ تو اب بھی بند
تی ہے لیکن ہمیشہ کے لیے مرنے اس غریب کی آنکھ ہوتی ہے

اتنا جہیز ساتھ نہیں لاتی کہ فریق ثانی کی ابھی اور ابھی اوور پرفل
سٹاپ زندگی کا مانا بن لگ سکے۔ فریق کا لفظ ہم نے اس لئے
ستعال کیا کہ اس جہیز نے رفیقوں کو فریقوں میں، حلیفوں کو
یفوں میں اور عقد کو نقد میں بدل دیا ہے۔

گداگری کا لفظ کوئی اچھا لفظ نہیں ہے اور یہ کام تو بہت برا
ہے لیکن گداگری کی ایک مہذب قسم، جہیز طلب کرنے کی بھی
ہے۔ اسے تہذیب اور شائستگی سمجھا گیا ہے۔ جہیز مانگنے کے
لئے اب بڑے بڑے کشکول تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ کشکول
یکھنے میں بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور کشکول نہیں
، دان دکھائی دیتے ہیں۔ اس کشکول کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ
می کا ظرف جتنا چھوٹا ہوگا کشکول اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اس لئے اس
دربی اور اس کے حسن وجمال کو برقرار رکھنے کے لیئے لوگ اپنے

ف کے معاملے میں بہت اختصار سے کام لینے لگے ہیں ان
ں جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے اور زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں وہ تو
ف کا جھگڑا ہی نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں ڈودو جہیز یا کرنے
بھلے ایک کشکول ہی کافی ہے۔ وہ اسے ہی لیے کر لیے
، جگہ گھومتے ہیں اور جہاں بھی کوئی اچھا یعنی "معقول" نقش قدم
ظر آتا ہے یہ اسے بڑی تمنا سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس کشکول
کے بارے میں کچھ اور کہنے کی اجازت دیجئے۔

یہ کشکول گھر کے تمام افراد کی "ٹیم ورک" اور ہم آہنگی
نتیجہ ہوتا ہے۔ اس ٹیم کا کوچ اور کپتان دونوں صدر خاندان
رتا ہے۔ یہ خود بھی میدان میں اترتا ہے اور سنٹر فارورڈ کی
زیشن سنبھالتا ہے۔ ہونے والے نوشاہ کے دوسرے نوجوان
یزو اقارب دائیں اور بائیں سمتوں سے میمنہ اور میسرہ کی طرح
ریق ثانی کے "قلب" پر حملہ کرتے ہیں۔ فارورڈ لائن میں غضب کا
ں میل ہوتا ہے اور ان کے کھیل کے انداز ہی سے اندازہ ہو
تا ہے کہ سب کے سب منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ بہترین
ٹیم ورک اور اعلیٰ درجے کی ڈاجنگ۔ ڈاجنگ کا صحیح اردو
ں ترجمہ چکمہ دینا ہوگا لیکن یہ لفظ جہیز جیسی خوبصورت چیز کے
ان کے سلسلہ میں جچتا نہیں ہے اس لیئے ہم ترجمہ نہیں کریں گے۔
ج دینے میں عمل تو وہی چکمہ دینے کا ہوتا ہے لیکن انگریزی لفظ

ہونے کی وجہ سے سہانا معلوم ہوتا ہے۔ اس ٹیم میں دفاعی لائن بھی
ہوتی ہے جس میں خاندان کی معمر اور بزرگ خواتین کے علاوہ صدر
خاندان کے کچھ ہم خیال اور ہم پیالہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔ لیکن
کھیل چونکہ یکطرفہ ہوتا ہے اس لیئے دفاعی لائن کی طرف گیند آتی ہی
نہیں ہے۔ اس کھیل میں نوشاہ کو زحمت سخن نہیں دی جاتی۔ وہ
صرف پرائز ڈسٹری بیوشن کی تقریب میں نمودار ہوتی ہے۔ فتح کا
سہرا انہی کے سر ہوتا ہے۔ اس کی آمد یا تو گھوڑے پر ہوتی ہے
یا کسی مرسیڈیز میں (مرتا کوئی اور ہے)۔ ساری کی ساری "گیٹ منی"
کا حقدار یہی ہوتا ہے۔ انعام کی رقم کے لحاظ سے یہ ہاکی میچ نہیں
ٹینس میچ ہوتا ہے۔ (اس وقت ٹینس کے کھلاڑیوں کا بینک بیلنس
ہنری فورڈ، وغیرہ جیسے لوگوں کے بینک بیلنس سے زیادہ ہی ہوتا ہے)۔

بڑے لوگوں کے یہاں جہیز کے دینے لیے حساب دینے یا
سوچ سوچ کر دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے
جیسے بحیرۂ عرب، بحر ہند سے مل جائے۔ یہ بزنس پارٹنرشپ
ہوتی ہے۔ اس میں دونوں کا نفع نقصان یکساں ہوتا ہے
(نقصان کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ پیدا تو صرف دولت کے
وارثین ہوتے ہیں اور وہ بھی شاذ و نادر صورتوں میں۔ ان دونوں
رفقائے زندگی کو فرصت ہی نصیب نہیں ہوتی) لیکن جہاں جہیز
مانگنے والے کا دل سنگ اور دینے والے کا ہاتھ تنگ ہوتا ہے وہاں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں لڑکے پیدا اسی لیئے ہوتے ہیں کہ ان
کا اگلا پچھلا سارا خرچ یعنی دودھ کی بوتل سے لے کر شراب کی بوتل
تک کا خرچ اور گود سے گور تک کا خرچ سسرال کے حساب
میں لکھ دیا جائے۔ کمال ہے۔ لڑکا پیدا ایک گھر میں ہوا اور اس کی
پرورش کا خرچ کسی اور گھر سے وصول کیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ اسے
پالنے پوسنے کا فرض ایک ادا کرے اور اسے آخر تک پالنے
کا فرض کوئی اور ادا کرے۔

ایک نعمت کیسے لعنت بنتی ہے جہیز اس کی بہترین مثال ہے
جہیز ایک زمانے میں وسیلۂ نشاط و طرب تھا۔ اب یہ ایک آلۂ حرب
ہے جو کبھی شادی کی تقریب سے پہلے اور اکثر صورتوں میں شادی
کے بعد مسلسل اور متواتر زیر استعمال رہتا ہے۔ کسی شریف آدمی
کو جس نے سماج میں اٹھنے بیٹھنے کی خاطر سفید پوشی اختیار کر رکھی ہو،
قتل کرنے کی سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ اس سے جہیز طلب
کیا جائے۔ وہ شخص رفتہ رفتہ وفات پا جائے گا اور اس قتل کا الزام

بھی کسی کے سر نہ کرے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

پچھلے چند سالوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ جہیز کے خلاف بہت شور مچایا جا رہا ہے اور جہیز کے لین دین کو روکنے کے لیئے قانون بن رہے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر جہیز کے خلاف بھی مورچے نکلنے لگے اور راستہ روکو کی طرح جہیز روکو کی تحریک عام ہو گئی تو ملک ترقی کیسے کرے گا۔ ہونہار لڑکے جن کے ہاتھ میں ملک و قوم کا مستقبل ہے اعلیٰ تعلیم کے لیئے یوروپ کیسے جائیں گے اور جو لڑکے یہیں فارغ التحصیل ہو چکے ہیں وہ اپنی اپنی دوکانیں، کارخانے اور کلینک کیسے قائم کر سکیں گے۔ ان کا سہارا صرف جہیز ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں خود سرکار کو آگے بڑھ کر خاندان، قابلیت، قد و قامت اور دیگر اشیائے ضروری دیکھ کر سب کا نرخ مقرر کر دینا چاہیئے (اشیائے ضروری سے مراد صحت جسمانی وغیرہ ہیں) جب کالجوں میں کیپی ٹیشن رقم وصول کی جا سکتی ہے تو انہیں کالجوں سے نکلے ہوئے (نکالے ہوئے) فرزندوں کا نرخ کیوں نہیں مقرر کیا جا سکتا۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے جس بات کو روکنے کے لیئے کوئی قانون بنا، وہ بات قیامت یا کسی کی جوانی تک پہنچی۔ جب سے جہیز کے لین دین پر پابندی عائد کی گئی ہے یہ چائنا کے فاؤنٹن پن کی طرح اور جاپان کے ملک کی طرح گھر گھر میں عام ہو گیا ہے۔ ہمارا تجربہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو کتاب نہ بکتی ہو اسے ممنوع قرار دے دو۔ فوراً بک جائے گی۔ جو فلم صرف بالغوں کے لیے (بڑی محنت سے) تیار کی جائے گی، اُسے نابالغ (بڑی محبت سے) ضرور دیکھیں گے۔ اس لیئے ہماری رائے میں جہیز کو پانی اور ہوا کی طرح سب کے لیئے بہنے اور چلنے دیا جائے۔ اتنی بڑی آبادی میں اگر چند اموات جہیز کے نام پر واقع ہو جائیں تو اس کا اتنا بُرا نہیں ماننا چاہیئے۔ یہ تو دنیا ہے اور یہاں آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ آنے پر بھی پابندی اور جانے پر بھی پابندی۔ ان میں سے کم سے کم ایک پابندی سے دست کشی ضروری ہے۔

وہ زمانہ اور تھا جب کسی گھر میں کوئی دلہن آتی تھی تو محلے کی اور برادری کی سب بہنیں دلہن کو دیکھنے کے لیے بعد بعد شوق اور جوق در جوق جمع ہوتی تھیں۔ اب دلہن دیکھنے کوئی نہیں آتا سب بہنیں جہیز دیکھنے آتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں کہ چلو اپنے محلے میں ایک ٹی وی اور ویڈیو تو آیا، اب ہماری شامیں یہیں گذرا کریں گی۔ دلہن کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے ہماری ہی جیسی مخلوق ہے۔ یہ کورنگ رنگ البتہ دیکھنے کی چیز ہے ایک ہی وقت میں چار ڈشیں تیار ہو سکتی ہیں۔ جہیز ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہاں تک ٹھیک ہے لیکن اس قانون کی پابندی بھی دوسرے قوانین کی پابندی کی طرح ہونی چاہیئے (یعنی برائے نام)۔

لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیاں جہیز کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں ہمیں تو کہیں نظر نہیں آئیں۔ ہمیں تو یہی نظر آیا کہ گھروں میں لڑکیاں بس بیٹھی ہوئی ہیں۔ اگر کہیں کھڑی بھی ہوئی ہوں گی تو دست بستہ کھڑی ہوئی ہوں گی۔

آخر میں ایک دلچسپ خبر یہ بھی سُن لیجیے کہ شادی کے ایک خواہشمند نوجوان کو جس نے ۲۲ سال کی عمر سے ایک اچھے اور موزوں خسر کی تلاش شروع کر دی تھی، پانچ سال گذر جانے کے باوجود اب تک ایسا خسر ہاتھ نہیں آ سکا ہے جس کا کھاتہ سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں ہو ـــــ اس معاملے میں اسے کامیابی اس لیئے حاصل نہیں ہو سکی کہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں کے کھاتہ داروں کے نام ان کے اعمال کی طرح پوشیدہ ہیں۔
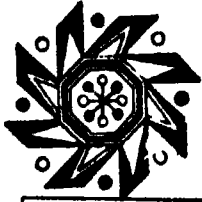
جہیز۔ مہلک سماجی بیماری

اس کا علاج نوجوان کر سکتے ہیں

ہماری حکومت جہیز جیسی مہلک سماجی بیماری کو ختم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور قانون کی گرفت تنگ کر رہی ہے۔ لیکن جہیز کی وبا اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہمارے نوجوان تعاون نہیں کریں گے۔ آج کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی آسائش کے لئے اپنی ضروریاتِ زندگی کا سامان اپنی محنت سے اپنی کمائی سے خریدیں، اپنی دنیا کو خود سنواریں، سجائیں اور اپنے والدین کو بھی دکھلا دیں کہ وہ جہیز نہ لیکر زیادہ وقار اور خود اعتمادی سے اپنی زندگی گذار سکتے ہیں، اپنی دنیا آپ بنا سکتے ہیں۔

علاء الدین جینا بڑھے
۶۲۰ شانتی نگر
چیمبور، بمبئی ۷۱

جہیز کے متوالے

زر گزیدہ ہیں زر کے مارے ہیں

اللہ اللہ! جہیز کی بے پناہ لعنت کا مارا ہوا باپ دکن کے ایک عظیم شاعر سلیمان خطیب (مرحوم) کے الفاظ میں کیا ہی عبرت انگیز لہجے میں کہتا ہے ؎

جی میں آتا ہے اپنی بچی کو — اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفنا دیں
لال جوڑے تو دے نہیں سکتے — لال چادر میں کیوں نہ کفنا دیں
یہ بھی دلہن ہے گھر سے جاتی ہے — موت مفلس کو کیا سہاتی ہے
یہ سہاگن ہے اس کو کندھا دو — ہم نے خون جگر سے پالا ہے
اس کی تربت پہ یہ بھی لکھ دینا — زر پرستوں نے مار ڈالا ہے
ایسے کتنے ہی ماہ پارے ہیں — زر گزیدہ ہیں زر کے مارے ہیں

مصرع "موت مفلس کو کیا سہاتی ہے" خاص طور پر توجہ طلب ہے اس دلہن کی تمام تر رنگینیوں اور شبِ عروسی کے نرم و نازک سہمے ہوئے ارمانوں اور جھجکتے ہوئے جذبات کا بھرپور ماتم سمایا ہوا ہے۔

حال ہی کی ایک خبر ہے، بمبئی سے قریب تھانہ ضلع میں ایک [illegible]ص کو گرفتار کر لیا گیا۔ وجہ؟ جہیز کے مطالبات سے تنگ آکر [illegible] ان مطالبات کو منوانے کیلئے اختیار کیے گئے ہتھکنڈوں کی [illegible]ب نہ لا کر اس کی بیوی نے خودکشی کر لی۔ ایسی خبریں نزدیک [illegible]ے بھی آتی ہیں اور دور سے بھی اور قریب قریب روزانہ پڑھنے یا [illegible]نے میں آتی ہیں۔

ایک خاتون نے کہا ان کی طرف لڑکوں کا بازار لگتا ہے۔ مقام [illegible]ے تعین کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے واقعتاً کوئی خاص مقام بھی ہوگا [illegible]ن سچ تو یہ ہے کہ یہ کالا بازار ہے اور وہ ہاٹ کی صورت کسی ایک [illegible]ام متعینہ پر محدود نہیں رہتا بلکہ دیش بھر میں پھیلا ہوا ہے اور کھلم کھلا [illegible]اس کا سودا ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ تر تعلیم کے لحاظ لڑکوں کی قیمتیں مقرر ہوتی ہیں۔ جیسے میٹرک پاس کے صرف بیس یا پچیس ہزار، گریجویٹ کے پچاس ہزار۔ کامرس اور سائنس کے گریجویٹ کا بھاؤ ذرا اونچا ہوتا ہے اور اگر کوئی انجینئرنگ یا میڈیکل کا گریجویٹ ہے تو پھر کیا کہنے! ان کے تیور آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ کوئی صنعت کار، بڑا زمیندار یا جاگیردار ہی ان کے لئے بولی لگا سکتا ہے۔

شعری صداقت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کا حقیقت پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اس سے پیدا ہونے والی تاثراتی کیفیت ان سچائیوں کی نشاندہی کرتی ہے جو اصل واقعات میں بھی ظاہر نہیں ہو پاتی۔

محترمہ خاتون مذکورہ کی بیان کردہ جزئیات میں دہرانے جا رہا ہوں اس میں ہو سکتا ہے واقعاتی صداقت نہ ہو لیکن وہ شعری صداقت جو

ہمارے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس میں پائی جاتی ہے تو سن لیجئے:

ایسا ہی ایک لڑکا پچاس ہزار میں خرید کر لایا گیا۔ پیسے ادا ہو چکے تھے، اب لڑکا لڑکی والوں کا تھا سو وہ گھر لایا گیا اب لڑکے والے ایک دو دن میں اپنی سہولت کے مطابق آئیں گے اور شادی رچانے کے بعد لڑکے اور لڑکی دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

لڑکے کو کھانا پینا دیا گیا اور رات کو ایک بڑے سے کمرے میں پلنگ پر سلا دیا گیا۔ وہ رسی تڑا کر بھاگ نہ جائے۔ اس کی نگرانی ضروری ہوتی ہے۔ چاروں طرف گھر کے دیگر افراد اور مہمان لیٹ کر سو گئے۔ لڑکی جس کا بیاہ ہونے والا تھا، رات گئے تک گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر پسینہ پونچھتی ہوئی آئی۔ دیکھا تو اس کا زر خرید ہونے والا شوہر پلنگ پر سویا ہوا ہے۔ چپکے سے لڑکے کو جگایا۔ وہ سمجھا اب کچھ رومانس ہونے والا ہے۔ سرگوشی کے انداز میں کہا:

"کیا بات ہے؟ ذرا صبر کرو! کل ہماری شادی ہو گی اور پھر..."

لڑکی نے کہا: "خیر وہ تو جب ہو گی تب ہو گی۔ لیکن اب تم نیچے سو جاؤ، مجھے پلنگ پر سونا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟" لڑکے نے دھیمی آواز سے لیکن غصے کے انداز میں کہا، "تمہیں جاننا چاہیئے کہ میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔"

لڑکی نے پُر اعتماد اور تحکمانہ انداز میں اطمینان اور آہستگی سے کہا! "لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تم زر خرید ہو۔ تم بکاؤ مال تھے اور ہم نے تمہیں خرید لیا ہے اور وہ بھی کسی کے لئے نہیں صرف میرے لئے! میں جس طرح چاہوں تمہیں رکھوں گی، اُتر جاؤ اور نیچے سو جاؤ۔"

اب لڑکے کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے! وہ سب کو پھلانگتا ہوا باہر نکل آیا۔ دھڑام۔ دھڑام! گھر میں ادھم مچ گئی۔ لڑکا بھاگ نکلا اپنے گاؤں کی طرف اور پیچھے لڑکی والے اسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔

ایسی کتنی لڑکیاں ہیں جو جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے اس طرح جرأتِ رندانہ سے کام لیں گی؟ یہ اچھا طریقہ ہے اس رواج کو ختم کرنے کا جو ہمارے معاشرے کے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ لیکن ٹھہریئے بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔

لڑکا خاک پھانکتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ دھڑام سے دروازہ دھکیل کر اپنے ماں باپ کی پناہ میں آ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لوگ بھی آ گئے جنہوں نے روپیہ دیکر اسے خرید لیا تھا۔ ماں باپ نے حقیقتِ حال معلوم کر لینے کے بعد فیصلہ کیا، ٹھیک ہے پچاس ہزار روپے واپس کر کے لڑکے کی گلو خلاصی کر لیں گے۔

لیکن وہ متردد تھے اس کی دو جوان بہنوں کا کیا ہو گا جن کے لئے گریجویٹ نہ سہی دو میٹرک پاس لڑکے پچیس پچیس ہزار میں کہیں سے ڈھونڈ لینے کا ارادہ تھا۔

یہ گھر گھر کی کہانی ہے۔ اس کا سلجھاؤ یکطرفہ نہیں ہو سکتا!!

ایک اور طرفہ تماشا غور طلب ہے۔ بعض بوڑھے جو قبر میں پاؤں میں لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں جہیز کی اس لعنت سے فائدہ اٹھاتے ہیں نوجوان جہیز کے طلبگار رہتے ہیں جو لڑکی کے غریب ماں باپ دے نہیں سکتے۔ اور یہ امیر بوڑھے کھوسٹ ان غریب ماں باپ کو کثیر رقومات دے کر نوجوان کنواریوں سے بیاہ رچا کر انھیں اپنے گھر لے آتے ہیں۔

چند روزہ عیش و عشرت بلکہ ہوس رانی کی زندگی گذارنے کے بعد خود تو سُلگتی چتاؤں میں جل کر خاک ہو جاتے ہیں اور اُن کومل جوان لڑکیوں کو بیرگی کی ٹھنڈی چتاؤں میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

۱: چاہیئے کہ قانون اور سماج دونوں ایک ساتھ ایسوں کے ذریئے ہو جائیں!

۲: اُن نوجوانوں کا سماجی بائیکاٹ کیا جانا چاہیئے، اور انھیں قانون کی کڑی سے کڑی سزا دینا چاہیئے جو اپنے شوہر بننے کی اہلیت کو حصولِ زر کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

۳: یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ اس دور میں گھر بسانا یکطرفہ عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی ایک ہی فریق کی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ نئے وجود میں آنے والے خاندان کے دونوں فریقوں کو پہلے ہی سے سر جوڑ کر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ کہ اس نو تشکیل پذیر یونٹ کے معاشی استحکام کے لئے کون کیا پارٹ ادا کرے گا۔

ن. ایم راوت

جہیز مخالف قوانین ـ چند نکات

جہیز ہمارے سماج کی وہ بُری رسم ہے جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا اقدام ۱۹۶۱ء میں کیا گیا جب پہلی مرتبہ قانونی طور پر اس بُرائی کے خلاف جدوجہد شروع کی گئی اور جہیز کے لینے اور دینے کو جرم قرار دیا گیا۔ مگر یہ رسم ہمارے سماج کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہے جسے یکسر سے ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس میں عوام کی شرکت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال سینکڑوں معصوم لڑکیاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ مہاراشٹر میں جہیز کے سلسلہ میں اس طرح کے ۱۹۸۲ء میں ۲۵ واقعات سرکاری طور پر مندرج کئے گئے ۱۹۸۳ء میں یہ تعداد ۲۵ ہو گئی اور ۸۴ء میں ۱۲۰ ہو گئی۔ یہ تو ہے سرکاری اندراج کی تعداد مگر ایسے سیکڑوں واقعات ہوں گے جن کا ہمیں علم تک نہ ہوگا۔ مرکزی سرکار نے اس سلسلے میں بڑھتی ہوئی تعداد کے مدنظر ۱۹۸۴ء میں مہاتما گاندھی کی یوم ولادت یعنی ۲ اکتوبر کو جہیز مخالف قوانین ایکٹ پاس کیا۔

اب جہیز کی تعریف قدرے بدل گئی ہے۔ اس ایکٹ کے ت کوئی رقم جائداد یا قیمتی اشیاء، براہ راست یا بالواسطہ شادی ں کسی بھی ایک پارٹی کی جانب سے دوسری پارٹی کو یا پھر کسی ر کی جانب سے دولہا یا دلہن کو (اس میں مہر شامل نہیں) ی جائے یا دینے کے لیے رہنا مندی حاصل کر لی جائے۔ مداد رقم یا قیمتی اشیا کو جہیز کا نام دیا گیا ہے ایک جرم ہے ر ایسا کرنے والے کو چھ ماہ سے زائد کی سزا جو کہ بڑھ کر ۲ سال سکتی ہے نیز دس ہزار روپے جرمانہ تک عائد کیا جا سکتا ۔ اس بات کا دعویٰ کوئی تسلیم شدہ سماجی بھلائی کا ادارہ

بھی کر سکتا ہے سوائے جموں اور کشمیر کے اس ایکٹ کا نفاذ پورے ملک کی ریاستوں پر ہوتا ہے۔

اس ایکٹ کی سب سے اہم خوبی تحائف کی فہرست کی تیاری ہے جو کہ دولہا دلہن کو دئے جاتے ہیں۔ ہر تحفے کے بارے میں مختصراً نوٹ لکھنا ضروری ہے تا کہ اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جا سکے اس کے علاوہ تحفہ دینے والے کا نام نیز تحفہ دینے والا دولہا دلہن کا رشتہ دار ہے اس کی وضاحت اور فہرست پر دونوں دولہا دلہن کے دستخط ہونے ضروری ہیں۔
اگر یہ فہرست تیار نہیں کی گئی تو شادی میں دئے گئے

تمام تحفے تحائف کو جہیز گردانا جائے گا اور اس ایکٹ کے تحت یہ جرم مانا جائے گا۔

ذیل میں ۱۹۸۰ء کے جہیز مخالف ایکٹ کے اہم نکات درج ہیں:

۱: جہیز کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ جائیداد، قیمتی اشیا نقد پیسے، ڈاکیومینٹس، ہنڈیاں وغیرہ جو براہِ راست یا بالواسطہ ایک پارٹی کی جانب سے دوسری پارٹی کو دی جاتی ہیں۔ اس قسم کا اطلاق مسلم شریعت پر نہیں ہوگا۔

۲: جہیز دینے اور لینے والی دونوں پارٹیاں مجرم قرار دی جائیں گی۔ اس صورت میں انھیں چھ ماہ سے زائد کی سزا جو کہ بڑھا کر ۲ سال کی جا سکتی ہے اور جرمانہ دس ہزار روپیہ تک عائد کیا جا سکتا ہے۔

۳: دولہا دلہن کو شادی میں دیے گئے تحائف کا شمار جہیز میں نہیں ہوگا مگر تحائف کی فہرست کا مرتب کرنا ضروری ہے نیز فہرست پر دولہا دلہن کے دستخط ہونے ضروری ہیں۔ البتہ تحفہ دینے والوں کی جانب سے تحفوں کی رقم ان کی دولت سے زائد نہیں ہونی چاہیے۔
اگر ہو تو اس صورت میں لڑکی کی عمر ۱۸ سال ہوتے ہی، جہیز اس کے نام تین مہینے کے اندر اندر کر دینا چاہیے۔

۴: اگر کوئی شخص مقررہ مدت کے اندر اندر ایسا نہ کر سکے تو وہ سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا جس کی کم از کم مدت چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ۲ سال نیز دس ہزار روپے جرمانہ بھی ہے۔

۵: ایسی صورت میں جبکہ کوئی عورت جائیداد کی وارث ہو لیکن جائیداد ملنے سے قبل اس کی موت واقع ہو گئی ہو تو اس کے قانونی ورثا جائیداد کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۶: اگر کوئی شخص جائیداد کی منتقلی میں تاخیر میں ملوث پایا گیا تو عدالت سے سزا کا مستحق ہوگا۔ اس کے علاوہ عدالت اسے براہِ راست جائیداد کی منتقلی کا حکم دے سکتی ہے کہ جائیداد اس خاتون یا اس کے ورثا کے نام منتقل کر دی جائے۔
اگر وہ شخص جس کے اختیار میں جائیداد ہے مقررہ مدت کے اندر اندر جائیداد منتقل نہ کر سکا تو اس کی قیمت کے برابر روپیہ عدالت وصول کر کے اس خاتون کو دے سکتی ہے۔ جو کہ بطور سزا لیا جائے گا۔

۷: اس ایکٹ کے تحت میٹروپولیٹن میجسٹریٹ یا جوڈیشیل میجسٹریٹ فرسٹ کلاس کے ذریعے چلائے گئے کیس پر کوئی عدالت مخالفت نہیں کرے گی۔
عدالت اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کرے گی جب تک کہ کیس کا اندراج نہیں کیا گیا ہو یا پولس رپورٹ نہ ہو یا رشتہ داروں کی جانب سے دعویٰ نہ کیا گیا ہو یا پھر کوئی تسلیم شدہ ادارہ پیش کار نہ ہو۔

۸: اس ایکٹ کے تحت کوڈ آف کریمنل پروسیجرز لاگو کیا جائے گا جس کے تحت ضمانت دی جا سکتی ہے۔

۹: اس ایکٹ کے تحت جوڈیشیل میجسٹریٹ آف فرسٹ کلاس یا میٹروپولیٹن مجسٹریٹ کے ذریعے چلائے گئے تنازعہ پر کوئی عدالت مخالفت نہیں کرے گی۔
اس سلسلہ میں عدالت اس وقت تک مداخلت نہیں کرے گی جب تک کہ واقعہ کا اندراج نہ کیا جائے یا کیس کی پولس رپورٹ میں متاثرہ افراد کے ذریعے کمپلینٹ یا اس کے رشتہ داروں یا کسی تسلیم شدہ انسٹی ٹیوٹ یا کسی ادارہ کی جانب سے کیس مندرج نہ کیا گیا ہو۔

۱۰: اس ایکٹ کے تحت کوڈ آف کریمنل پروسیجرز لاگو کیا جائے گا جس کے تحت ہر جرم کے لئے مجرم کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اس ایکٹ کا خاص مقصد جہیز کا قلع قمع کرنا ہے مگر محض قانون سے یہ حل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آج کل ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو قانون کو توڑنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے اس لیے سماجی بیداری کے ذریعہ اس عیب پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے سماجی تعلیم کی سخت ضرورت ہے تاکہ لوگ سماجی طور پر باشعور ہو جائیں۔ ایسے نوجوانان جو کہ بیدار مغز ہیں انھیں چاہیے کہ وہ سماج سے دولت مندوں کو ...
(باقی صفحہ نمبر ۱۴ پر)

غلام صوفی حیدری

۴/بی-۱۲، انڈین ایرلائنز کالونی

کالینہ - سانتا کروز بمبئی ۴۰۰۰۲۹

جہیز — ایک لعنت

خدا جانے کس دستِ نحوست نواز سے اس رسم کی اجراء ہوئی تھی۔ وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب پہلے پہل کسی لڑکی کے باپ نے اپنے لختِ جگر کو پرائے کو سونپنے کے ساتھ ساتھ ھنڈا بھی پیش کیا تھا۔ وہ گھڑی ہے اور آج کی گھڑی کہ یہ ھنڈا دوشیزاؤں کیلئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ بھارت کی ناری کے وقار پر ایک ضربِ شدید ہے۔ ایک وہ بھی دن تھے جب بھارت ورش میں ایک لڑکی کیلئے کئی کئی بَراتے تھے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان رشتہ مانگنے والوں کو اپنی برتری کے جھنڈے بھی گاڑنے پڑتے تھے۔ زمانۂ قدیم کی رسمِ سوئمبر اس بات پر کھل کر روشنی ڈالتی ہے۔ کتنا افسوسناک امر ہے کہ اُسی دیس میں آج لڑکی والوں کو ھنڈا بھی دینا پڑتا ہے جس میں کسی لڑکی کا ہاتھ مانگنے کے لئے نہ صرف کمانیں جُھکا کر بلکہ توڑ کر بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ کہاں سے آگئے ہیں ہم کہاں تک (صوفی)

یہ تو خیر ازمنۂ وسطیٰ کی بات تھی ہمارے بچپن میں بھی لڑکی والوں کے گھر کے چکر لگاتے لگاتے پاؤں کے موزے پھٹ جاتے تھے تب جا کر رشتہ طے ہوتا تھا۔ آخر یہ ہنڈے کی بلا کہاں سے نازل ہوگئی۔ ویسے تحقیق سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ہنڈا دینے کی رسمِ خبیث کا شمار جنگ کے دُوررس نتائج میں ہوتا ہے۔ ویسے زمانۂ قدیم سے ہندستان میں راجہ رجواڑوں کی آپس کی لڑائیاں مرد و زن کے تناسب کو اُتھل پتھل کرتی رہی ہیں لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی غارت گری نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ ان دونوں جنگوں میں اتنے سپاہی مارے گئے کہ یہ تناسب شدید طور پر متاثر ہوا اور لڑکوں کی تعداد لڑکیوں کے اعداد و شمار کے مقابلہ میں بہت کم ہوگئی جیسے قحط الرجال ہونے لگا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو

بن پانا مشکل ہو گیا اور لوگ یہ کہکر ایک دوسرے کی ڈھارس باندھنے لگے کہ اللہ میاں نے ہر لڑکی کا جوڑا پیدا کیا ہے، کسی کو بے جوڑ کے نہیں آنا لیکن یہ اعتقاد تو صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے تھا عملی زندگی میں لڑکیوں کے رشتہ کے لئے متلاشی دوڑ شروع ہو گئی۔ یہ ہنڈا لینے دینے کا مرض اسی مسلسل دوڑ میں ہانپنے کا نتیجہ ہے اور جس طرح ایک مرض میں کئی مرض لاحق ہو جاتے ہیں اسی طرح ہنڈے کی یہ رسم ام الخبائث ثابت ہوئی۔ انسانی فطرت بھی عجب پیچیدہ واقع ہوئی ہے۔ جب ایک فرد لڑکی کا باپ ہوتا ہے تو وہ ہنڈے کی رسم کو تباہ کن سمجھتا ہے۔ اس کی خرابیوں کا دل سے قائل ہوتا ہے۔ اس کی تباہیوں پر ایمان رکھتا ہے لیکن جب وہی مرد لڑکے کے باپ کا روپ دھارن کر لیتا ہے تو پھر ہنڈا لینا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ بعض لڑکے والے اس انداز سے ہنڈے کا مطالبہ کرتے ہیں جیسے لڑکی والوں پر ان کے آباؤ اجداد کا قرض ہو۔ بعض لوگ ہنڈے کے مطالبہ میں خود کو ایمانداری کے ساتھ حق بجانب سمجھتے ہیں اور جب کبھی درمیانی حضرات مطالبہ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اس خرچ کا حساب لگاتے وقت بھی شرم محسوس نہیں کرتے جو انہوں نے اپنے لڑکے پر خرچ کیا ہے گویا لڑکے کا پالن پوسن تعلیم و تربیت، ذوق شوق پر جو انہوں نے صرف کیا ہے وہ محض اس امید پر کہ وہ اس کے ہونے والے خسر سے پائی پائی مع سود در سود وصول کر لیں گے ورنہ وہ اپنے لڑکے کو نہ تو پالتے نہ کھلاتے پلاتے، نہ لکھاتے پڑھاتے۔ کتنی شرم انگیز بات ہے۔ ایسے لوگوں کو تو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانا چاہیے۔

ہنڈے کے مطالبہ کا تناسب ہونے والے دولہے کی جسمانی حالت قدوقامت، خدوخال، تعلیمی قابلیت، ملازمت کی نوعیت، معیار تجارت کے تناسب سے کیا جاتا ہے۔

مثلاً لڑکا ڈاکٹر یا انجینئر ہو تو وہ اتنی رقم ہنڈے میں طلب کرے گا جو کبھی کبھی لڑکی کے باپ کا ہارٹ فیل ہونے میں خود کفیل ہو جائے۔ صرف رقم پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ بعض بعض دفعہ موٹر سائیکل یا موٹر کار بھی مطالبہ میں نتھی کر لی جاتی ہے۔ اب آپ گھڑی بھر کے لئے ایسے بدقسمت باپ کا تصور کیجیے جس کے اولادِ نرینہ نہ ہو اور چار یا پانچ لڑکیاں ہوں اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ وہ اس مہنگائی کے دور میں لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے بعد ہر لڑکی کے لئے ہنڈے کی خطیر رقم کہاں سے مہیا کرے۔ اگر آپ کے پاس چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کے علاوہ کوئی اور نسخہ ہو تو پیش کریں۔

قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ایسی ایسی نادر مثالیں مشاہدہ میں آتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

مثلاً شادی کے لئے پچاس ہزار کا ہنڈا طے ہوا ہو اور کسی غیر متوقع اور انہونی وجہ سے لڑکی والے عین وقت صرف چالیس ہزار کا انتظام کر سکے ہوں ایسی حالت میں یا تو بارات واپس چلی جاتی ہے اور لڑکی کو زندگی بھر رونا پڑتا ہے۔ یا اگر درمیانی حضرات کی انتھک کوششوں سے وہ چالیس ہزار قبول کر لئے گئے تو باقی دس ہزار کا مطالبہ لڑکی کے لیے اس وقت تک سوہان روح بنا رہتا ہے جب تک اس کے ماں باپ بقیہ دس ہزار اپنے داماد کو ادا نہ کر دیں۔ ہنڈا کیا ہوا دولہے کے باپ کا قرضہ ہوا اور پھر ہنڈے کی باقی رقم وصول کرنے کے طریقوں میں سود خور یہودیوں کے ظالمانہ رویوں سے بھی تجاوز کیا جاتا ہے مثلاً دلہن کو میکے واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ سسرال واپس آئے تو دس ہزار روپے لے کر ورنہ سسرال کے دروازے اس کے لئے ہمیشہ کے واسطے بند کر دئے جاتے ہیں اور پھر کسی علی بابا کی "سم سم" سے بھی یہ دروازے نہیں کھلتے اور دلہن کو میکے میں عمر بھر سڑتے رہنا پڑتا ہے۔

بعض ہنڈے کے لوبھی (لالچی) اتنے طول طویل پروسیجر کے قائل نہیں وہ اپنے گھر پر ہی دلہن پر اتنے مظالم توڑتے ہیں اور اسے اس حد تک تختۂ مشق ستم بناتے ہیں کہ وہ خودکشی کر لے۔ اس طریق کار میں بھی کچھ عرصہ لگ جاتا ہے اس لئے بعض ستم ظریف لوگوں کو یہ بھی پسند نہیں۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ یہ ہوتا ہے کہ جب سر پھوڑنا ٹھیرا تو پھر ہم خود کیوں نہ پتھر مار دیں۔ چنانچہ ساس سسر، خاوند اور نند اور کبھی کبھی ان میں سے ایک دو مل کر ایک سہانی صبح بہو کے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیتے ہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری اور یہ مشہور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بہو اتفاقیہ جل گئی یا پھر خود سوزی کے واقعہ سے منسوب کر دیتے ہیں اس طرح وہ اپنے لئے ہنڈے کے حصول کا از سر نو موقع فراہم کرنا چاہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس گھناؤنے طریق کار میں مجرموں کو کبھی تخت ملتا ہے اور کبھی تختہ۔

یوں تو عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے پھر بھی لوگ کل ہند شہرت یافتہ وہ حقیقی ڈرامہ نہیں بھولے ہوں گے جس کو جلگاؤں خاندیش کے ایک قاضی صاحب نے اسٹیج کیا تھا جس میں صاحب موصوف نے ملک کے مختلف صوبوں میں مختلف المذاہب دوشیزاؤں سے ہنڈا حاصل کرنے کی غرض سے ایک ایک کر کے شادی رچائی تھی۔

بعض اوقات اخبارات میں ایسی خبریں بھی ملتی ہیں جس سے ہنڈے لینے دینے کی رسم خبیثہ کے ہولناک انجام کا پتہ چلتا ہے مثلاً کچھ عرصہ

یل ایک روزنامے میں اجتماعی خودکشی کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی
ی۔ لکھا تھا کہ چار لڑکیوں کی شادیوں میں جہیز دینے کا سوال درپیش تھا
ب کہ ماں باپ اپنی مالی خستہ حالی کی وجہ سے ایک لڑکی کے رشتہ
ے لیے بھی جہیز فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے چنانچہ ماں باپ اور
ار لڑکیوں نے کنوئیں میں چھلانگیں لگا کر اجتماعی خودکشی کر لی۔
میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ دردانگیز اور ہولناک انجام
ن دوشیزاؤں کا ہوتا ہے جن کے ماں باپ جہیز کی رقم مہیا نہ کرنے
ی وجہ سے ان کی شادیاں نہیں کر پاتے اور نتیجتاً وہ ریڈلائٹ ایریا کی
ریکی میں گم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات سوسائٹی کے نام پر
ملک کے کلنک ہیں اور ملک کے نام پر بدنما داغ سہ

پہنچتی ہیں مری نظریں جہاں تک
اندھیرا ہی اندھیرا ہے وہاں تک (صوفی)

جہیز کی روک تھام کے لئے سرکار زیادہ سے زیادہ قانون
سازی کر سکتی ہے۔ مجرموں کو سخت سے سخت سزائیں دینے کی
انون میں ترمیمات کر سکتی ہے۔ جہیز لینے دینے کو جرم قرار دے
سکتی ہے۔ لیکن ملک کے ادبا اور شعرا، سماجی ورکر اور دیگر رہنما
عام کی رائے جہیز لینے اور دینے کے خلاف تو ہموار کر سکتے
ہیں۔ ع
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

••

صفحہ نمبر ۱ سے آگے

جہیز مخالف قوانین چند نکات۔

خواتین اپنے ہاتھوں میں لینے کا موقع نہ دیں۔ مہیلا
منڈل جیسے ایجنٹ میں اس ضمن میں اہم رول ادا کر
سکتے ہیں۔ دولت و امارت کی غلط نمائش کا بائیکاٹ
کرنا چاہیے تاکہ معصوم لڑکیاں اس لعنت کا شکار نہ بن
سکیں۔ نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کو بھی چاہیئے کہ وہ
اس بات کا عہد کریں کہ وہ ایسے لڑکوں کو ورمالا نہیں
پہنائیں گی جو کہ جہیز کے لئے ان سے شادی کرنا
چاہتے ہیں۔ خواتین کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے
کہ ان کی آزادی نہ مجروح ہونے کے لئے کیونکہ
زندگی کی دوڑ میں وہ بھی مردوں کی ہمقدم ہیں اس
کے لئے قانون سے زیادہ جہیز کے قلع قمع کے لیے
جہیز کی مخالفت کے لئے سماجی بیداری کی ضرورت
ہے اور اسے نوجوان خود ختم کر سکتے ہیں اگر وہ
اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ شادی کے وقت نہ تو جہیز
لیں گے نہ ہی دیں گے

(ترجمہ: نیوزہ خان)

جہیز کی مخالفت کے سلسلہ میں
پوسٹروں کا مقابلہ
منعقد کیا جاتا ہے

جی بی گوجر

جہیز
روک تھام کیلئے سماجی بیداری ضروری

نیچے درج مضمون کی بنیاد وہ ملاقات اور گفتگو ہے جو مسٹر جی. بی گوجر نے اپنے ایک مخلص دوست مسٹر ڈی بی کلکرنی عرف ماماصاحب کلکرنی سے کی تھی جو بمبئی کی "جہیز مخالف تحریک" کے صدر ہیں۔ ماماصاحب کلکرنی اب ۷۵ سال کے ہیں۔ تقریباً ۱۵ برس پہلے انہوں نے "جہیز مخالف تحریک" کے ذریعے عورتوں کے لئے نجات دہندہ کے روپ میں کام کی ابتدا کی تھی اور آج اس سلسلہ میں بذاتِ خود وہ ایک ادارہ ہیں۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماماصاحب ۷۵ سال کے جوان ہیں جو نہ صرف مہاراشٹر کے طول و عرض میں بلکہ ریاست کے باہر بھی دورے پر رہتے ہیں اور اپنی "جہیز مخالف تحریک" کے ذریعے عورتوں کے نجات دہندہ بن کر پُرجوش تقریروں، بامعنی پوسٹروں کی نمائش اور موثر دستاویزی فلموں کی وساطت سے اپنا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

سانے گروجی کے ایک چیلے کی حیثیت سے قدرتاً وہ عورتوں کے لئے رحم کا جذبہ رکھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ عورت مرد کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے ہر مرحلے میں، خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی، معاشی ہو یا انتظامی حتیٰ کہ سائنسی ہو یا اور کوئی۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے شریک کار رہیں۔ شادی شدہ ہو جانا ہی ہر لڑکی کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اپنی زندگی آپ بنانے اور بتانے کی کوشش کرنی چاہیئے خواہ وہ شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کو ماماصاحب پرجوش الفاظ میں "استری مکتی" (عورت کی نجات) کہتے ہیں اور اس جانب پہلے قدم کے طور پر تقریباً ۱۵ برس قبل، ماماصاحب نے بمبئی میں "جہیز مخالف تحریک" کی داغ بیل بعض سرگرم سماجی کارکنوں کی مدد سے ڈالی تھی۔ اب اس تحریک کے صرف ۳۰ مراکز صرف مہاراشٹر میں ہیں اور ممبران سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

سوال: میرا پہلا سوال ماماصاحب سے یہ تھا کہ:
آپ تقریباً ۷۵ برس کے ہو رہے ہیں پھر اس میں دشوار گزار دوروں کے واسطے دن بھر اور راتوں میں بھی آپ کو توانائی کیسے ملتی ہے کہ جہیز مخالف پیغام دور دور تک پہنچائیں؟ آپ کو یہ اندرونی قوت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟

جواب: خوش قسمتی سے میں سانے گروجی کا ایک طالب علم رہ چکا ہوں۔ ان کی تربیت کے تحت مجھ میں سماجی کام کے لئے رحم دلی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوا اس

عمر میں بھی وہ میرے لیے نمونہ ہیں۔ مانے گروجی عورتوں کے بڑے ہمدرد تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس ضعیف جنس کو تمام زنجیروں اور جکڑبندیوں سے چھٹکارا ملنا چاہیئے۔ اسے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہیئے اور دلیری کے ساتھ مردوں کی بالادستی کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ جہیز کی خرابیوں نے سماج کے تانے بانے کو اتنا بوسیدہ کردیا ہے کہ میرے خیال میں اس کا علاج اب یہی ہے کہ عورتوں کو ان بندشوں سے چھڑانے کے لیے تن من دھن سے لڑائی لڑی جائے۔

سوال: کیا آپ اپنے کام کا طور طریقہ مختصر الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں؟

جواب: جہیز کے خلاف قانون بن جانے کے باوجود، مرد، عورتوں کی کمزوریوں سے پہلے ہی کی طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں خود ان کے گھر یعنی سسرال میں ساس، نند وغیرہ کے ہاتھوں دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے جو اصلاح و درستی پیدا کرسکتا ہے یعنی سماجی بیداری اور سماجی بائیکاٹ۔ چونکہ سماجی بائیکاٹ بڑا مشکل کام ہے اس لئے میں نے جہیز کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں تقریروں، سمیناروں کی تنظیم، پوسٹروں کے مقابلے، مضمون نویسی کے مقابلوں کا انتظام وغیرہ کیا کرتا ہوں۔ میٹنگوں میں میری تقریروں پر ہزاروں جوان مرد اور عورتیں اس قسم کے عہد پر دستخط کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں کہ "میں جہیز نہ لونگا نہ دونگا"۔ عوام پر اس کا اچھا اثر ہوتا ہے اور میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس قسم کے خوشی خوشی اور اپنی مرضی سے عہد و پیمان کرنے والوں میں سے کسی نے اسے توڑا نہیں ہے۔

سوال: شادیوں کو منظم کرنے کے سلسلے میں آپ کا ادارہ کس طرح مدد کرتا ہے۔؟

جواب: میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہمارا مقصد سماجی بیداری پیدا کرنا ہے۔ ہم کسی شادی کا انتظام کرنے والے آفس یا بیورو کے بطور خاص کام نہیں کرتے ہیں۔ البتہ ہم ایسے جوانوں کے ناموں کی فہرست ضرور بناتے ہیں جو جہیز نہ لینے کی اور جہیز نہ دینے کی قسم کھاتے ہیں اور شخصی معلومات جو شادی کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں، لکھ لیتے ہیں۔ یہ معلومات صرف ان لوگوں کو دی جاتی ہیں جو عہد کرچکے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع کسی بھی باقاعدہ مقررہ وقتوں میں منعقد ہونے والی میٹنگوں میں ہم پہنچاتے ہیں تاکہ وہ اپنے لیئے مناسب جوڑے کا خود انتخاب کرلیں۔ یہ بھی بتلا دوں کہ اب تک سیکڑوں عہد درج رجسٹر کیے جاچکے ہیں اور بہت سی شادیاں انجام بھی دی جاچکی ہیں جو بغیر جہیز کے ہوئیں، اور بہت سادہ طریقے پر ہوئیں بغیر کسی ظاہری شان اور دکھاوے کے ہوئیں پھر بھی ہم دو الگ الگ جاتیوں کے درمیان شادیوں کی حوصلہ افزائی کے خواہشمند ہیں۔ اسی طرح ہم رجسٹرڈ اور اجتماعی شادیوں کے حق میں بھی ہیں جن کے ذریعہ آئندہ امید ہے کہ جہیز کا طور طریقہ خود بخود نابود ہوجائے گا۔

سوال: آپ ٹھاٹ باٹ والی شادیوں سے کس طرح بچ سکتے ہیں؟۔

جواب: یہ سوال ذرا مشکل سا ہے۔ اگر دونوں پارٹیاں مالدار ہوں اور اپنی دولت مندی کے مظاہرے کے لیے بیتاب بھی ہوں تو سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی تقریبات کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہم نے ہمیشہ لوگوں کو سادہ سول یا رجسٹرڈ شادیوں کو اختیار کرنے کی نصیحت کی ہے۔ میرے خیال میں تمام اچھی سوجھ بوجھ والوں کا یہ فرض ہے کہ شادیوں میں قطعًا دولت کے دکھاوے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیئے۔ وہ دکھاوا خواہ کسی بھی روپ میں ہو۔

سوال: آپ جہیز مخالف تحریک کے سلسلے میں اور کونسی مزید کوششیں عمل میں لاتے ہیں؟

جواب: گزشتہ ۱۵ برس سے ہر مہینے کے پہلے اتوار کو ہم بال موہن ودیا مندر، شیواجی پارک، دادر، بمبئی میں ایک میٹنگ کا انتظام کرتے ہیں تاکہ جہیز کے طور

جہیز مخالف تحریک

کا ایک مرکز

طریقوں کے خلاف نوجوانوں اور ان کے والدین میں سماجی بیداری پیدا کریں۔ تقریباً ۵۰۰ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر سال اس اپیل کو قبول کرتے اور اپنے والدین کے ہمراہ جہیز لینے دینے کے خلاف عہد و پیمان کرتے ہیں۔ شادی کے بارے میں ضروری معلومات خود ان نوجوانوں سے حاصل کی جاتی اور الگ الگ رجسٹروں میں لکھی جاتی ہیں۔ بعد میں وہ رجسٹر انہیں دیکھنے کے لیے پیش بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ سارا کام مفت سروس کے طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ اور کسی مرحلے میں بھی کوئی فیس نہیں لی جاتی جہاں کہیں کالجوں میں یا عوام میں کسی میٹنگ میں تقریر کرنے کے لیے میں جاتا ہوں وہاں بھی اسی قسم کے عہد و پیمان لیتا ہوں ان میٹنگوں کی بدولت ہمارے پیغام کے عام ہونے میں مدد ملتی ہے اور جہیز کی رسوم کے خلاف رائے عامہ ہموار ہوتی ہے۔ ہم وکیلوں کو بھی جہیز لینے والے ملزمین کے مقدمات نہ لینے اور ان کی پیروی نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نیز ایسے ملزمین کے مقدمات سے الگ رہنے کی بھی گذارش کرتے ہیں جو عورتوں پر کسی قسم کے ظلم و زیادتی کے ملزم ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا نشٹر ایسے کچھ وکیلوں نے اس قسم کے مجرمین کی مدد نہ کرنے کا عہد و پیمان کیا ہے۔

ہم نے ان عورتوں کی سہولت کے لئے جو ظلم و ستم کا شکار رہی ہوں۔ خاندانی امور میں قانونی صلاح و مشورہ دینے کا انتظام بھی کیا ہے۔ اس کے لئے میں ان مشیروں سے ہر روز رات کے وقت ملاقات کرتا ہوں۔ ہم نے پریشاں حال عورتوں کو مفت قانونی مشورہ دینے کے لیے ممبئی میں ایک مرکز بھی قائم کیا ہے جو مشہور و ممتاز لیڈی وکیلوں کی زیر نگرانی کام کر رہا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جہیز کی رسم کا خاتمہ ہو اور ساتھ ہی سماج میں ایسا مکمل انقلاب لایا جائے کہ عورتوں کو جکڑ بندیوں سے نجات ملے۔

سوال: آپ "جہیز کے خلاف قانون" کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟"

جواب: شادی ایک شخصی معاملہ ہے۔ ہماری ہندستانی عورتیں جو شرمیلی اور رسوم کی پابند ہیں، بمشکل قانونی مدد لینے کا خیال کرتی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ڈرامائی انداز میں کوئی بات نہیں بن سکتی جب تک کہ لوگ خاص طور سے لڑکی کے والدین اور اس کے رشتے دار، ستم زدہ لڑکی کو پورا تحفظ عطا کرنے اور اس کا مطلقہ ہونا بھی منظور کر لینے پر آمادہ نہ ہوں۔ ہمارے لیئے جنگ کا میدان صرف سماجی پلیٹ فارم ہے، پھر بھی قانون کو سخت بنایا جا سکتا ہے۔ البتہ والدین یا سرپرستوں کو اس حد تک بے غیرت نہ ہو جانا چاہیئے کہ وہ اپنی معصوم لڑکیوں کو پھر ایسے وحشیوں کے سپرد کر دیں جنھوں نے اپنی جوان عمر شریک زندگی کو جلا کر مارا ہو یا قتل کیا ہو۔

سوال: نوجوان لڑکیوں کو آپ اور کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: یہ عمر حسین خوابوں کی عمر ہوا کرتی ہے لیکن پھر بھی شریک زندگی کی حیثیت سے کسی دولتمند خوشرو جوان کا خواب دیکھنے کے بجائے انھیں ایسے شریک زندگی کا خواب دیکھنا چاہیئے جو صحیح معنی میں ان کا شریک ہو سکتا ہو۔ آخر تو زندگی کی قیمت پیسوں کی قیمت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس سلسلے میں کسی نوجوان لڑکی کو اپنی زندگی کا مقصد یہ نہ بنانا چاہیئے کہ صرف شادی ہو جائے اور بس۔ زندگی میں بہتیرے مقامات ایسے آتے ہیں جہاں لڑکی کو اپنی قابلیت اور روشن دماغی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنی اس لیاقت کا اظہار تب ہی کر سکتی ہے جب وہ ایسی زندگی گذار رہی ہو جس میں بے جا جکڑ بندیاں نہ ہوں۔

شادی ایک مقدس عہد و پیمان ہے۔ یہ کوئی فیشن پریڈ نہیں ہے جس میں اپنی جھوٹی شان، بہت زیادہ دولت اور عزت و عظمت کی نمائش کی جائے۔ دو جوان بڑی بڑی امنگوں کے ساتھ باہم مل کر ایک نئی زندگی گذارنے کا عہد و پیمان کرتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنے کیئے ہوئے اس عہد و پیمان کی تقدیس قائم رکھے۔ کسی کو دولت اور جنسی ہوس کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کبھی سیری نہیں ہوتی۔

ہمیں اس سلسلے میں جھوٹی عزت و عظمت کا نقشہ بدلنے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے اور اس کے بدلنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سماجی بیداری لانے کے لیئے کام کیا جائے۔ آخر میں، میرا خیال یہ ہے کہ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اس تحریک میں خود اپنے اور سماج کے مفاد کی خاطر سرگرمی سے حصہ لیں۔"

(ترجمہ و تلخیص، عبداللہ)

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں
روح مرجائے تو ہر جسم ہے چلتی ہوئی لاش
اس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ پہچانتے ہیں،
کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج

ساحر لدھیانوی

بنتِ مسعود

زنجیریں توڑدو

سین نمبر ۱

درمیانی درجے کے خاندان کا اُٹھنے بیٹھنے کا کمرہ ـــ پچپن سال سے اوپر کا ایک شخص مُوڑھے پر بیٹھا اخبار اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زمانے کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے ہے۔ اسی دوران دروازہ پر بیل بجتی ہے۔ صبح کا وقت ہے، بُڈھا بڑبڑاتا ہوا اُٹھتا ہے۔

"یہ صبح صبح کون آن مرا۔ بُرے دنوں میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ خیر دیکھتا ہوں"

آگے بڑھ کر دروازے تک جاتا ہے اور پھر دروازہ کھول دیتا ہے۔

پوسٹ مین ـــ "مسز شہربانو عابد علی کے نام رجسٹرڈ خط ہے۔"

بڈھا ـــ "بہت مہربانی۔" پوسٹ مین کا رسمی شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کرلیتا ہے اور جلدی جلدی کاغذ پر نگاہیں دوڑاتا ہے۔ خط پڑھنے کے ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا ہے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا ہے۔

"اچھا تو یہ خط عابد علی کی فرم کی طرف سے آیا ہے"

خوشی کے ساتھ آواز دیتا ہے۔

بڈھا ـــ "بہو یہ بہو، میں نے کہا بڑی بہو کہاں ہو بیٹیا"

بڑی بہو ـــ "جی ابو جی"

بڈھا ـ خوشی کے ساتھ "بیٹا شہربانو دیکھو آج بہت دنوں کے بعد ہماری قسمت کا سورج چمکا ہے۔ ایک خوشخبری لایا ہوں"

شہربانو ـــ جسکے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی ہے "خوشخبری میرے لئے کیا خوش خبری ہو سکتی ہے۔ اُن کی موت کے بعد میں تو اُس ٹوٹی پتوار کی طرح اکیلی رہ گئی ہوں جس کی کشتی کنارے پر ہی ڈوب گئی ہو"

بڈھا ـــ "ٹھیک کہتی ہے بیٹیا" گہری سانس لیتے ہوئے "مجھ سے پوچھو۔ جوان بیٹے کا گھاؤ آج بھی ہرا ہے۔ مگر کیا کیا جائے اس ظالم دنیا کا چلن ہی کچھ نرالا ہے۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا بس اس کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ کچھ رُک کر..... دیکھو یہ خط تمہارے لیئے آیا ہے"

بہو خط لے کر پڑھتی ہے اور اس کے بعد خط کو بے دلی کے ساتھ میز پر ڈال دیتی ہے اور کہتی ہے۔

بہو ـــ "اور تو مجھے نہ ہی کچھ اچھا لگتا ہے اور نہ ہی کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی کے جس نغمے کو میں نے اپنی روح کا ساز دیا تھا وہ چھن چھنا کر ٹوٹ گیا۔ کاش یہ گیت کا سفر یوں ہچکولے لے کر دم نہ توڑتا۔ آس پاس دور تک اندھیارا ہے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

(روتی ہے)

بڈھا ـــ "نہیں بہو نہیں۔ تم روتی ہو تو میرے دل کا سمندر اُمڈ کر آتا ہے۔ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ وہ تو میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ میری آنکھوں کی روشنی تھا۔"

بہو ـــ "آہ عابد نے مجھے کسی پل صراط پہ لا کے چھوڑ دیا۔ خوابوں کی پالکی موت کی وادی میں راستہ بھٹک گئی۔ موت کتنی بے رحم ہوتی ہے۔ سرخ گلابوں کی روشنی چھین کر لے گئی۔ ابو عابد کو سرخ گلاب کتنے پسند تھے۔ ہے نا ابو؟

زاہد:۔ "جانے والے چلے جاتے ہیں بس ان کی یاد رہ جاتی ہے مگر زندگی تو کسی طور کٹنا ہے ہی۔ دل چھوٹا کرنے سے کیا فائدہ ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے۔ ایک تلخ حقیقت۔"

بانو:۔ "ابو میرے ذہن نے سوچنا بند کر دیا ہے۔ میرے دل نے تو جیسے اداسیوں کے نگر میں بسیرا کر لیا ہے۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

سین نمبر (۲)

بانو:۔ سر میں مسز عابد علی ہوں۔

ڈائرکٹر:۔ "مسز عابد علی ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ کے شوہر کی موت سے فرم کو بھی دھکا لگا ہے۔ ان کی شاندار خدمات کے صلے میں ہی ہماری فرم نے آپ کو جوب (job) آفر کیا ہے۔ آپ نے ہمارا آفر قبول کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے۔ اس طرح آپ اپنی ذمہ داریوں کو آزادانہ طور پر نبھا سکیں گی۔ (کچھ رُک کر) سکریٹری کو آواز دیتا ہے۔

"مارگریٹ مسز عابد علی کو ان کا کیبن دکھا دو اور ہاں انھیں ایڈوانس بھی دلا دو۔"

بانو:۔ "تھینک یو سر"

شہر بانو ڈائرکٹر کا شکریہ ادا کر کے مارگریٹ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔

سین نمبر (۳)

نچلے درمیانے طبقے کے اُٹھنے بیٹھنے کے کمرے (بیٹھک) میں ساس سسر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

ساس:۔ (روایتی انداز میں) "میں کہتی ہوں آپ نے بہو کو نوکری پر بھیج کر کوئی واجب قدم نہیں اُٹھایا۔"

سسر:۔ (بھڑکتے ہوئے) "بیکار کی بکواس مت کرو، پورے بارہ سو ملیں گے۔ یہاں ایک ایک پیسے کو محتاج ہو رہے تھے۔ زاہد علی کچھ کرتا دھرتا نہیں، میرے سینے پر مونگ دلنے کیلئے تم خود کیا کم تھیں۔ شریت کے پیالے پر نکاح پڑھوا کر اس نکھٹو کے لئے دلہن بھی لے آئی۔ ایک نہ شد دو شد۔ آخر یہ خرچ کہاں سے پورے ہوں گے۔"

ساس:۔ "اے لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی بندر کی بلا طویلے کے سر۔ کرے کوئی بھرے کوئی، یہ کیا ایران توران کی لے

بیٹھے، میری بات کا جواب دو۔ میں کہہ رہی تھی اور جو بہو کو باہر کی ہوا لگ گئی تو۔"

سسر:۔ (دانت کٹکٹاتے ہوئے) "ہوں۔ لگ جانے دو جو لگنی ہے باہر کی ہوا، مگر تم چپکی بیٹھی رہو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

ساس:۔ "ٹھیک ہے، میرا منہ سی دو، میری ناک میں نکیل ڈال کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو، مگر یہ مت بھولو کہ جس گھر میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ بڑی بہو کے نام ہے اور ہمارے لڑکے کی موت کے بعد اب اس گھر پر ہمارا کوئی حق نہیں رہ گیا ہے۔"

سسر:۔ (غصے سے) "آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

ساس:۔ "جو عورت صبح سے شام تک گھر سے باہر رہے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کل کو اس کا ذہن بدل جائے اور ہم لوگوں کو یہاں سے نکال باہر کرے۔ ویسے چار ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ارے اسے تو اپنے قبضے میں رکھنا چاہیے تھا"

سسر:۔ "تم اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتی ہو اور مجھے بے وقوف میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔"

ساس:۔ "ارے منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی۔ میں بھی تو سمجھوں کہ تمہارا دماغ کہاں تک جاتا ہے۔"

سسر:۔ "وقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا"

ساس:۔ "تمہارا وقت جانے کب آئے گا۔ آئے گا بھی یا نہیں، کچھ کرنا ہے تو ابھی کرو"

سسر:۔ (سنجیدگی سے) "دیکھو میں چاہتا ہوں کہ موقع آنے پر بڑی بہو کا نکاح زاہد علی سے کر دیا جائے تاکہ گھر کی اینٹ گھر ہی میں لگ جائے۔ پھر نہ تو باہر کی ہوا لگنے کا ڈر اور نہ ہی یہاں سے نکالے جانے کا خطرہ۔ کہو کیسی رہی (چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ لیے ہوئے)۔

ساس:۔ "ارے واہ بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ کیا گھاس چر گئے ہو جی زاہد کی بیوی نہیں ہے کیا، وہ تو طوفان اٹھا دے اور پھر بڑی بہو زاہد کو اپنے دیور سے زیادہ بھائی کی طرح مانتی ہے۔ کیا وہ راضی ہو جائے گی؟"

سسر:۔ "بڑی بہو کو راہ پر لانا میرا کام ہے۔ اسے میں راضی کر لوں گا، چھوٹی بہو کو ذرا دھمکا کر ٹھیک کر لیا جائے گا۔ بڑی اکڑی تو وہ ہے نہیں، زیادہ چوں چرا کی تو طلاق کی دھمکی دے دینا۔ اپنے آپ ہی خاموش ہو جائے گی اور پھر اس کے حصے کی چار روٹیاں اور [illegible]

کچھ اسے ملتے رہیں۔ اس سے زیادہ اُسے اور چاہیے بھی کیا۔

(چھوٹی بہو کے سسکنے کی آواز)

ساس :۔ "میں پھر کہتی ہوں کہیں سفارش کر کے زاہد علی کو نوکری سے لگا دو۔ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

سسر :۔ "میں کہتا ہوں کہ اپنی کالی زبان کو لگام دو۔ اُول فُول بکے جاتی ہو۔ اسی لئے میں عورتوں کے منہ نہیں لگتا۔" (شاطرانہ ہنسی ہونٹوں پہ لاتے ہوئے) "اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔"

(ساس منہ پھیر کر غصے میں چھالیاں کترنے لگتی ہے)

سین نمبر (۴)

(شہربانو گھر میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں تحفوں کے بنڈل ہیں)

شہربانو :۔ (ساس سسر کے نزدیک آتے ہوئے) "اماں یہ آپ کے لیے ہے۔ اباجی یہ آپ کے لئے ہے اور زاہد یہ رہا تمہارا تحفہ۔ (ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) ارے فریدہ کہاں ہے .... کچن میں ہوگی میں خود جا کر دیکھتی ہوں۔ جانے سے پہلے "تین سو روپے کے تحفے خریدے اور یہ رہے باقی کے سات سو روپے اباجی یہ آپ کے لیے ہیں۔ ایک ھزار ایڈوانس ملے تھے۔" (فریدہ کو آواز دیتی ہوئی باہر نکل جاتی ہے) "فریدہ او فریدہ"

شہربانو :۔ (کچن میں داخل ہوتے ہوئے) "دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ ارے تمہارا یہ چہرہ لٹکا ہوا کیوں ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آج اکیلے کام کرنا پڑا تو چہرہ اتر گیا جناب کا۔ بتاؤ نا کیا ہوا۔ آخر اس اداسی کا سبب کیا ہے؟"

(فریدہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر بھابھی کو خاموشی سے دیکھتی ہے)

فریدہ :۔ "بانو بھابی۔ میری اُداسی کی وجہ بہت جلد آپ جان جائیں گی" (فریدہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل جاتی ہے)

شہربانو :۔ "ارے کیا ہوا! ارے کیا ہوا؟" (حیرت سے دیکھتی رہ جاتی ہے)۔

سین نمبر (۵)

چائے کی میز پر بڈھا اور اس کی بیوی چائے سپ کر رہے ہیں۔ ان کا چھوٹا بیٹا زاہد بھی ساتھ ہی میں بیٹھا ہے۔ سب لوگ خاموش خاموش ہیں۔

زاہد :۔ (سنجیدگی سے) "کیا بات ہے امی، آج آپ لوگ بہت چپ چپ سے ہیں۔"

زاہد کی ماں :۔ "ہاں بات ہی کچھ ایسی ہے"

زاہد :۔ "آخر ماجرا کیا ہے۔ کچھ مجھے بھی بتایا جائے۔"

زاہد کی ماں :۔ (بڈھے سے) "آپ ہی بتائیے"

زاہد کا باپ :۔ "برخوردار خدا کے فضل و کرم سے تمہاری بھابی تو نوکری سے لگ گئی، پچاس ہزار روپیہ کی نقد رقم بھی اسے جلدی ملنے والی ہے (معنی خیز انداز میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے) اور جب روپیہ آتا ہے تو آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کل کو کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر کسی کا ہاتھ تھام لے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔"

زاہد :۔ "ابو آدمی کو اپنے تحفظ اور سلامتی کے لئے خود غرضی کی دیوار نہیں اٹھانی چاہیے۔ دوسروں کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کا مطلب ہے کہ ہمارے ضمیر کا ...."

باپ :۔ (بات کاٹتے ہوئے) "تو اب تم مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھاؤ گے دیکھ رہی ہو اپنی سپوت کو، میں نے تو دھوپ میں بال سفید کئے ہیں۔"

زاہد :۔ (لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے) "نہیں ابو، میرا مطلب یہ نہیں تھا"

باپ :۔ (رعب کے ساتھ) "تمہارا مطلب کیا تھا۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میری بات کان کھول کر غور سے سن لو ورنہ پچھتاؤ گے اور زندگی بھر خود کو کوستے رہو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا نکاح شہربانو سے ہو جائے۔"

زاہد :۔ (تعجب کے ساتھ) "ابا جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ خود کو گناہگار کر رہے ہو، اور مجھے بھی کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو۔ کیا میں اپنی بڑی بھابی سے شادی کا تصور کر سکتا ہوں اور پھر میں تو شادی شدہ بھی ہوں۔"

ماں :۔ "کان کھول کر سن لے میں نے اور تیرے باپ نے فیصلہ کیا ہے کہ بڑی بہو کے ساتھ تیرا نکاح کر دیا جائے اور پھر کیا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا؟"

باپ :۔ بات تمہاری عقل میں آئی کہ نہیں؟

ماں :۔ (سمجھاتے ہوئے) "بچے ذرا اور بات کو سمجھو۔ دوسری بیوی کرنا کوئی گناہ تو نہیں اور پھر کیا تم چاہتے ہو کہ ہمارے گھر کی اینٹ کسی دوسرے کی ٹھیری میں جا لگے۔ ہم نے دنیا کی دھوپ چھاؤں دیکھی ہے۔"

زاہد :۔ (گہری سانس لے کر) "ہوں دنیا کی دھوپ چھاؤں ــ اور

اب اس دنیا کی دھوپ چھاؤں آپ کی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔"

سین نمبر (۶)

ڈائرکٹر بیل بجا کر چپراسی کو بلاتا ہے

"رام آسرے ابھی فیڈم مسز شہر بانو کو بتلا دینا کہ بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ ہے۔ شام کو دیر تک رکنا ہوگا۔"

"جی جناب"

سین نمبر (۷)

رات کا وقت ساس سسر اور دیور بالکنی میں کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔ بالکنی سے سڑک پر آتی ہوئی کار کو دیکھا جاسکتا ہے جو ہارن دیکر دھیمی ہوتی ہے۔ گھر کے سامنے جاکر رُک جاتی ہے۔ ایک خاموشی، ڈرائیور کار کا دروازہ کھولتا ہے۔ شہر بانو کار سے اترتی ہے۔

(اسی دوران)

ں :۔ "بڑبڑاتے ہوئے، ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں مہارانی کو نوکری پر گئے، دروازے پر کاریں بھی چھوڑنے آنے لگی۔"

سر:۔ "تو وہی بات سامنے آئی جس کا ڈر تھا۔ بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے" اور تم ہو کر مٹی کے مادھو کی طرح ٹس سے مس نہیں ہوتے"

ں :۔ "میں نہ کہتی تھی کہ باہر کی ہوا لگتے ہی بہو کے پر لگ جائیں گے اس سے پہلے کہ سونے کی چڑیا ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑادے اس کے پر کتر دینے چاہئیں۔"

سر: "اور پھر ہمارے خاندان کی ناک کا بھی تو سوال ہے"

س :۔ "مگر یہ بات ہمارے لاڈلے کی عقل میں بھی تو آنی چاہیئے۔"

ہد :۔ (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) "یہ .... یہ سب کچھ تو میری بھی برداشت سے باہر ہے۔ ٹھیک ہے۔ جیسا آپ لوگ کہتے ہیں مجھے منظور ہے۔"

(بڈھے کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، زاہد کو سرگوشی کے لہجے میں مخاطب کرتا ہے۔)

ما :۔ زاہد "تم نے پہلی بار زندگی میں عقل کی بات کی ہے۔"

جیا :۔ (خوشی کے سا تھ آواز دباتے ہوئے) "ارے آخر بیٹا کس کا ہے۔"

(اسی بیچ شہر بانو داخل ہوتی ہے)

اں :۔ (شہر بانو کو تاتے دیکھ کر) "بہو یہ دفتر سے آنے کا وقت ہے؟ کچھ پاس پڑوس کا بھی تو خیال کیا ہوتا۔"

شہر بانو :۔ (چہرے سے تھکی تھکی لگ رہی ہے) "آج دفتر میں بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ نکل آئی، دیر ہوگئی تھی۔ اس لئے دفتر کی گاڑی سے آنا پڑا۔ نوکری ہے۔ دیر تو ہوگی ہی۔"

سسر:۔ "بٹیا ہمیں فکر ہورہی تھی۔ زمانہ بُرا ہے۔ بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ پاس پڑوس کو تو تم جانتی ہی ہو۔ اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے۔ بس دوسروں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔ اسی لیے بس۔"

شہر بانو :۔ "آپ جانتے ہیں مجھے گلی سڑی روایتوں سے ازلی بیر ہے میری ذات کیا ہے۔ یہ میں زیادہ سمجھتی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنے امیر ماں باپ کی مخالفت میں آگے سر تسلیم خم کرلیتی اور آخر میں تیری کبھی شادی نہ ہوتی۔ تو اب کیا آبرو سمجھتے ہیں۔ زندگی کے آداب میں پڑوس کی سرگوشیوں سے سیکھوں گی۔ مجھے کیا کرنا ہے۔"

(زاہد علی اور اس کی بیوی فریدہ رات کو کمرہ میں)

زاہد :۔ "کیا بات ہے۔ تم سوئی نہیں؟"

فریدہ :۔ "بچپن میں ایک رات آندھی آئی تھی اور بہت دیر تک اندھیرا چھایا رہا تھا اور میں خوف سے رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ آندھی آنے والی ہے اسی لئے تو نیند آنکھوں سے بھاگ رہی ہے؟"

زاہد :۔ (ناراض ہوکر) "ایسا کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے تم پر، آخر مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

فریدہ :۔ "پہاڑ سے بھی بڑی بپتا ٹوٹ پڑی ہے مجھ پر"

زاہد :۔ "تم بے کار میں اپنے آپ کو پریشانی میں ڈال رہی ہو۔ تمہارا حق تمہیں ملتا رہے گا۔"

فریدہ :۔ "حق ......؟ (طنز سے) "چار روٹیاں۔ یہی ہے نا میرا حق بھی تو کہیں یہ بھی تو زیادہ نہیں۔"

زاہد :۔ "پاگل مت بنو۔"

فریدہ :۔ "آج تک میں چپ رہی تو سب ٹھیک تھا، عورت کے لئے منہ کھولنا تم مردوں کی دنیا میں جرم سمجھا جاتا ہے۔"

زاہد :۔ "حالات کے آگے کس کی چلتی ہے فریدہ! حالات بعض حالات کا جبر ہمیں بحث کرنے پر مجبور کرتا ہے، جو ہم نہیں کرنا چاہتے بے بسی ازل سے انسان کا مقدر رہی ہے۔"

فریدہ :۔ "عورت محض ان اینٹوں کی دیوار اور چند کھنکتے سکوں سے خوش نہیں ہوتی۔ وہ تو اس آب حیات کو پانا چاہتی ہے جو مرد اپنی آنکھوں سے اس کے دل میں اتارتا ہے۔"

زاہد :۔ "فلسفہ مت بگھارو۔ زندگی نام ہی سمجھوتے کا ہے اور پھر کوئی چارہ

بھی تو نہیں۔"

فریدہ :۔ "تو کیا تم سچ مچ بانو بھابی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

زاہد :۔ "ابّا اور امّی یہی چاہتے ہیں ۔"

فریدہ :۔ "تو کیا تم نے سچ مچ باتیں مان لی ہیں ؟"

زاہد :۔ "ابّا اور امی یہی چاہتے ہیں۔ کتنی بار کہوں میں تم سے ۔"

فریدہ :۔ "تم بزدل ہو۔ حالات سے ڈر کر مردانگی بھی بھول گئے۔ عورت کا پیسہ ہڑپ کرنے کے لیے اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ تم میری نظروں میں بھی گر گئے۔ جس زاہد سے میرا بیاہ ہوا تھا وہ ایک بھولا بھالا انسان تھا۔ مکان دکان نہ ہوتے ہوئے بھی بالکل سادا مکار نہیں۔ ابن الوقت نہیں"

سین نمبر (۹)

(فریدہ صبح صبح بڑی بہو کے کمرے میں چائے لے کر جاتی ہے ۔ شہربانو اسے آتے دیکھ کر جلدی سے جلد اپنے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے بیٹھ جاتی ہے ۔

شہربانو :۔ سنجیدگی کے ساتھ۔ "آؤ فریدہ، کیا بات ہے؟ آج جلدی چائے لے آئی ہو (رک کر فریدہ کو غور سے دیکھتے ہوئے) ارے کیا بات ہے فریدہ ۔ یہ آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا رات نیند نہیں آئی۔"

(فریدہ جو سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑی ہے ۔ دھیرے دھیرے نظریں اٹھاتی ہے ۔ اس کی نظر شہربانو پر ٹھہر جاتی ہے ۔ پھر شہربانو کے چہرے سے نظریں ہٹا کر خلا میں دیکھتے ہوئے کہتی ہے)۔

فریدہ :۔ "بھابی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ یہی نا کہ میری دنیا اجاڑ کر میری مانگ کا سیندور آپ کی مانگ میں بھر دیں ۔ کیا صرف اس لیے کہ آپ کے پاس دولت ہے ۔ نوکری ہے ۔ بڑی ڈگریاں ہیں ۔"

شہربانو :۔ (حیرت سے) "فریدہ تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہی ہو ۔"

فریدہ :۔ "میں نے جو بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ یہاں تو اسی روز سے کھچڑی پک رہی ہے جس روز سے آپ نے دفتر جانا شروع کیا ہے۔"

شہربانو :۔ "مگر دفتر تو میں نے اباجی کے کہنے سے ہی جانا شروع کیا ہے ۔"

فریدہ :۔ "یہ سب کچھ کیا دھرا تو اباجی ہی کا ہے ۔ "

شہربانو :۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ۔"

فریدہ :۔ "اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو جا کر اباجی سے پوچھ لو۔ "

شہربانو :۔ "آخر یہ لوگ ہوتے کون ہیں ۔ عابد کے لیے میں عیش کو بھول گئی۔ اپنے ماں باپ، خاندان کی صدیوں پرانی روایات سے ہو گئی۔ میں نے تو طوفانوں کے رخ کو موڑ دیا۔ زندگی کے وشال سمندر کو آنسوؤں سے بھر لیا۔ مگر شکست نہیں مانی۔ دیکھتی ہوں زندگی کے اس ناٹک کا ڈراپ سین کیا ہوتا ہے ۔"

(شہربانو تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل کر بیٹھک میں جاتی ہے، جہاں ساس سسر صبح کی چائے پی رہے ہیں)۔

شہربانو :۔ (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) "جی! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔" (سسر چشمہ صاف کرتا ہے اور آنکھوں پر لگا لیتا ہے۔ ساس کے بھی کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑھا سسر دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں اٹھاتا ہے)۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہم سے کوئی شکایت ہے"

شہربانو :۔ (طنزیہ لہجے میں) "شکایت کی بھی آپ نے خوب کہی۔ شکایت تو اپنوں سے ہوتی ہے۔"

ساس :۔ (بیچ میں بولتے ہوئے) "لو اب ہم غیر بھی ہو گئے۔ آخر پتہ تو چلے بات کیا ہے۔"

شہربانو :۔ (اداس لہجے میں) "مجھے آپ لوگوں سے ایسی امید نہیں تھی۔"

سسر :۔ "جو بھی کہنا ہے بہو صاف صاف کہو۔"

شہربانو :۔ "کیا آپ نے مجھے موم کی نازک گڑیا سمجھ رکھا ہے۔ جدھر چاہیں گھما دیں۔"

ساس :۔ "بہو یہ تو کہو آخر ہم سے کونسی خطا ہوئی ہے۔ ہمارا جرم کیا ہے؟"

شہربانو :۔ (آواز اونچی کرتے ہوئے) "خطا ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی خطا یہ ہے کہ آپ نے میرے اجڑے ہوئے سہاگ کا مذاق اڑا دیا ہے۔"

سسر (کرسی سے اٹھ کر) "وہ کیسے؟"

بہو :۔ "جب انسان کی آنکھوں پر غرض کی پٹی چڑھ جاتی ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے مگر آپ یہ بھول گئے کہ وقت کے تیور بدل چکے ہیں۔ عورت کو اب نیلام کی صلیب پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔ وہ کوئی مورتی نہیں جس کا مول تول کیا جائے۔"

سسر :۔ "شہربانو تمیز باقی نہ رہی۔ اپنی حد میں رہو۔ ہمیں سمجھنے کی کوشش کرو ہم چاہتے ہیں کہ اینٹ گھر ہی میں رہے۔ زاہد علی آخر عابد علی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

بہو :۔ "مگر آپ یہ کیوں بھول گئے کہ وہ چھوٹا دیور تو ہے ہی اور فریدہ کا شوہر بھی ہے۔"

ساس :۔ "تو تمہیں من مانی کی اجازت دیں۔ اپنے منہ پھاڑ کے جو بولیں ۔

راتوں کو تمہارا دیر سے آنا برداشت کریں۔ پاس پڑوس کی لعنتیں ملیں
بھابی جی ہر نہ تم سارے مذہب جس کی اجازت نے اسی پر اوپر
کرنے سے کیا فائدہ۔"

۔"مذہب کی آڑ بنا کر دوسروں کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالیے۔ وہ دیکھیے زاہد
کی بہو۔ کیسے سر جھکائے خاموش کھڑی ہے رکھ پڑھی لکھی غریب۔

> مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول
> پیسہ کہاں جو جا کے وہ لائے جہیز مول
>
> نظیر اکبر آبادی

ہندستانی عورت جسے گھر اور شوہر کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے
جسے آٹے کی طرح گوندھا جاتا ہے اور کچھ نہیں کہتی۔ جس پر ظلم
و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور اُف نہیں کرتی۔ آخر اس عورت کا
کب تک روندا اور کچلا جاتا رہے گا۔"

(زاہد کو مخاطب کرتے ہوئے)
زاہد! "کیا تم بھی چاہتے ہو کہ یہ عورت خاموش قیدی بنی رہے؟ کیا اس
عورت کے پاؤں کی بیڑیوں کی جھنکار تمہیں سنائی نہیں دیتی۔ کیا تم
ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتے۔ کیا تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں؟"

زاہد:۔ (نادم ہو کر) "بانو بھابی! مجھے معاف کر دیجیے، وقت کی ستم ظریفی
نے مجھے بے حس بنا دیا تھا۔"

شہر بانو:۔ (روتے ہوئے) "معافی کیوں مانگتے ہو۔ معافی ہی مانگنی ہے تو فریدہ
سے مانگو۔ جس ہیرے کو تم آج تک کوئلہ سمجھتے رہے ——— اور مجھ
سے کاہے کی معافی۔ میں تو تیز ہوا سے اُجڑا ہوا ایک ایسا پتہ ہوں
جسے زندگی کی آندھی نے شاخ سے جدا کر دیا ہے۔"

فریدہ:۔ (سسکتے ہوئے) "بھابی!۔۔۔"

شہر بانو:۔ اس مسئلہ کا محض ایک ہی حل رہ گیا ہے فریدہ! میں یہ گھر چھوڑ کر
چلی جاؤں۔ پگلی تو کیوں روتی ہے۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی
ہوں۔ یہ دنیا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ حوصلہ رکھو۔ ہمت سے کام لو۔
آج سے یہ گھر تمہارا ہے۔ یہ دنیا تمہاری ہے۔ یہ رہے گھر کے
کاغذات۔ آج کے بعد یہ لوگ تمہارے سامنے کھڑے نہیں ہو سکیں گے
اب یہ تمہارے رحم و کرم پر ہیں۔ میں تو کہیں بھی رہ سکتی ہوں۔ کہیں
بھی جا سکتی ہوں۔ میرے پاؤں آزاد ہیں۔ انھیں بیڑیوں میں جکڑا
نہیں جا سکتا۔ اُن کی آخری نشانی یہ تصویر میری راہوں کو روشن
کرتی رہے گی اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں جا رہی ہوں۔ شوہر کی
تصویر اٹھاتی ہے۔ اور چل پڑتی ہے۔

حیرت زدہ ساس اور سسر اور دیور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ سب
مل کر آواز دیتے ہیں۔

فریدہ:۔ "بانو بھابی نہیں، بانو بھابی۔"

زاہد:۔ "بھابی، بھابی"

سوگوار سنگیت کی دھن تیز ہو جاتی ہے، ہواؤں کا شور بڑھتا جاتا
ہے۔ انہیں ہواؤں کے شور اور سوگوار لے کی دھن پر شہر بانو کا اکیلا
وجود آگے بڑھ رہا ہے

سلطانہ ہلدے

میتھیلی شرن گپت کی شاعری میں
عورتوں کی اہمیت

ساحر اور اردو و ہندی کے کئی شعرا نے عورت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

عورت نے جنم دیا مردوں کو
مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا
جب جی چاہا دھتکار دیا

سماج کے ٹھیکیدار چاہے کچھ کہیں لیکن عورت کو جو مقام سماج میں ملنا چاہیئے تھا وہ آج اس بیسویں صدی کے دور میں بھی نہ مل سکا۔ آج بھی عورت کی بے بسی، مجبوری، لاچاری ہمیں پہلے جیسی نظر آرہی ہے۔ عورت کا یہ منظر نہ صرف بھارت میں ہے بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں، جو اپنے آپ کو جدیدیت کا علمبردار کہتے ہیں ان کے یہاں بھی عورت کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری کا وہی عالم ہے۔ آج کے انسان کو یہ سوچنا ہوگا کہ جہاں اس نے زندگی کے بڑے بڑے مراحل طے کئے ہیں۔ جہاں اس کے قدم چاند کو چھو رہے ہیں کیا واقعی اس کی ترقی کی یہی منزل ہے؟ کیا صحیح معنوں میں اس نے ترقی کی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم اسے ترقی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ اس کی ترقی پستی کی طرف رو بہ زوال ہے۔ جب تک سماج عورت کو اس کا جائز مقام نہیں دیتا تب تک وہ ترقی پسند کہلانے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ عورت نظم گلستان، رنگِ بہار ہے لیکن کیا ظلم ہے کہ اسی کو نظمِ گلستاں پر اختیار نہیں۔

اردو اور ہندی کے متعدد شعرا نے اپنے اشعار میں عورت کے جذبات اور اس کے خیالات کو نظم کیا ہے اور اپنے نوشتوں کے ذریعے انھیں ان کا جائز مقام دینے کی کوشش کی ہے۔ ان شعرا میں ہندی کے مشہور شاعر (جو سیاست سے بھی تعلق رکھتے تھے) شری میتھیلی شرن گپت بھی ہیں جن کی مشہور کتاب "بھارت بھارتی" نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ گپت جی اپنے ایک شعر میں عورت کی حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

ابلا جیون ہائے تمہاری یہی کہانی
آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی

اس شعر میں انھوں نے عورت کی مظلومیت کی داستان بیان کی ہے جس کا آنچل ممتا سے لبریز ہوتا ہے لیکن آنکھوں میں نمی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی وہ نمی ہے جو مظلومیت کی داستان بیان کرتی ہے۔

گپت جی: دورِ جدید میں ہندی کے مقبول ترین شاعر مانے جاتے ہیں ان کی نظر بہت وسیع اور دوررس تھیں۔ وہ معمولی باتوں میں بھی فکر و نظر کے پہلو نکال لیتے تھے۔ وہ سماجی زندگی کا شعور بھی رکھتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے زندگی کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی بھی انسانیت کے زاویۂ نگاہ سے کی تھی۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ہے جس میں زندگی کی جولانی اور امنگوں کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے یہاں نئے تجربے بھی پائے جاتے ہیں اسی لیئے وہ سچے احساس اور نئے جذبے کی ترجمانی اور عکاسی بھی کرتے ہیں۔ گپت جی نے عورت کی مجبوریوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی بے بسی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے:

بات بھی نہ اب تک جس سے تھی ہوئی ان راگ میں
یوں اسی کے ساتھ جورت جل گئی وہ آگ میں

اس شعر میں عورت کے ایثار اور قربانی کو اس طرح بیان کیا
کہ شعر پڑھنے والا بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے
ایک اجنبی مرد سے عورت کی شادی ہوتی ہے لیکن کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے ٹھیک سے بات بھی نہیں
کی اور شوہر کی موت واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عورت
نے شوہر کی جدائی میں اپنے آپ کو مٹا دیتی ہے اور یہی اس
کی روپ ہے۔
اس مقبول ترین فنکار کا آئینہ اس کا اپنا فن ہے جس میں
کی زندگی کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک
سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر
رھد راج کے بارے میں فرماتے ہیں:

دیکھتا تھا سدھ راج وسے سے شر دھا سے
بھوگی ہے مدن ورما کو اں ایک یوگی ہے

میتھیلی شرن گپت کی شاعری محض عشق و محبت کی داستان
ہے۔ ان کی نظموں کے پس پردہ ہمارے فرسودہ سماج کے
عناصر ہیں جو آج ہماری زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا فن
واقعات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ ان کی شاعری میں
کی جذبات و احساسات کی کش مکش کے حسین پیکر ہیں۔ ان کی
ری انسانی نفسیات کا خوبصورت پرتو ہے۔ انھوں نے اپنی
ری میں عوت کے کئی روپ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

چھوٹوں کی ماں اور بڑوں کی دت بیٹی ہے
سم ولیکوں کی [illegible]

وہ کہتے ہیں [illegible] بڑوں کی بیٹی، بچوں کی ماں اور اپنی ہمعمر
وں کی [illegible] ہوتی ہے۔ یعنی ایک ہی عورت میں یہ تین درجے پائے
تے ہیں۔
میتھیلی شرن گپت نے لکھا اور خوب لکھا۔ زندگی کے ہر
پہلو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سادگی کے
رو قبولیت عامہ کے اثرات پائے جاتے ہیں جسے وہ نغمے کا رسیا
ایک مطرب کی طرح نغمہ بہ لب رہتے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی
غم اور خوشی دونوں آتے ہیں۔ اسی طرح شاعری کو بھی غم

اور خوشی سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عام انسان غم اور خوشی
کا اظہار ٹھیک طور پر نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس ایک فنکار اپنے
فن کے ذریعے ان جذبات میں بلا کا سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے
میتھیلی شرن گپت کو بھی غم سے محبت ہے اور جب بھی عورت
کا ذکر آتا ہے ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں:

کیا کر نہیں سکتیں بھلا، یدی شکشتا ہوں ناریاں
رن، رنگ، سودھرم۔ رکشا کر چلیں سوکماریاں
لکشمی، اہلیا، بیجا بائی، بھوانی، پدمنی سے
ایسی انیکوں دیویاں ہیں آج جا سکتی گنی،

شاعر نے اس بند کے ذریعے عورت کی محبت، اس کی طاقت
ہمت، عظمت اور اس کی برداشت کرنے کی قوت کو بیان کیا ہے
تاریخ نے بھی عورت ذات کے بہتیرے کارنامے پیش کئے ہیں
اور انھیں کارناموں کو گپت جی نے اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔
میری نظر میں میتھیلی شرن گپت ہندوستان میں ہندی زبان کے
ممتاز شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے آسمان کی بلندیوں کو
چھو لیا۔ لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی اور یہ عظیم شاعر اس سر زمین
پر آنے والی نئی صبح کے انتظار میں چلا گیا۔
اب دیکھنا ہے۔ وہ صبح کب آتی ہے جس کا خواب انھوں نے
دیکھا تھا امید ہے کہ ان کی متوقع صبح عورت کو سماج میں اس کے
حقوق دے گی اور اس کو وہ مقام عطا کرے گی جس کی وہ حقدار ہے۔
آج میتھیلی شرن ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا کلام، ان کے
جذبات ہمارے ساتھ رہیں گے جو ہمیشہ ان کی مقبولیت اور عظمت
کا احساس دلاتے رہیں گے۔
انہیں کے بقول:

مجھے ہے اِشٹ جن سیوا، سدا سچی بھون سیوا
نہ ہوگی پورن وہ تب تک نہ ہو سہدھر منی جب تک

عبدالعزیز عرفان
سیٹ ضلع پریشد ہائی اسکول اکمٹ ضلع آگرہ

جہیز ایک نمائش

جہیز وہ اسباب ہیں جو دلہن کو شادی میں ملتے ہیں۔ آج بھی جہیز سماج کے لیے ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ انسانی رواداری کو ختم کرنے کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ ابتدا میں لڑکی کے والدین اس کی جستجو میں دم توڑتے ہیں بعد میں لڑکی کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ والدین چاہتے ہیں کہ بیٹی کو زیادہ سے زیادہ جہیز دیں چاہے اس کے لیے انھیں مقروض ہی ہونا پڑے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹی کی زندگی خوش حالی اور فارغ البالی سے گزرے۔

اس مہلک مرض میں آج سب ہی اقوام کے لوگ مبتلا ہیں۔ گویا یہ روگ عام ہو چکا ہے اور لڑکیاں جنسِ تجارت بن چکی ہیں حکومت کی پابندی ہوتے ہوئے بھی اندرونی طور پر یہ تجارت زوروں پر ہے۔ جو سب سے زیادہ جہیز دیتا اس کی لڑکی چاہے سیرت صورت کچھ نہ رکھتی ہو قبول کی جاتی ہے۔ یہ دور ہیروں کو ٹھکرانے اور چمکیلے پتھروں کو گلے سے لگانے کا ہے۔

اگرچہ جہیز کی روایت حضرت فاطمہؓ کی شادی سے ملتی ہے حضور پاکؐ نے اپنی دختر پاک اختر کو جہیز کے طور پر کچھ سامان دیا تھا وہ بھی حضرت علیؓ کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیونکہ حضرت علیؓ کے پاس ازدواجی زندگی گزارنے کے لائق سامان نہ تھا۔ حضرت بی بی فاطمہؓ کا جہیز جس کی دلیل دیکر آج بھی لوگ جہیز کی فہرستیں تیار کرتے ہیں وہ ایک چکی، ایک پیالہ، ایک مشکیزہ، گھڑا، چاندی کے دو بازوبند اور چارپائی پر مشتمل تھا۔ لیکن آج کا نظریہ بالکل ہی مختلف ہو گیا۔ اس کا نقشہ ہمارے نظروں کے سامنے ہے۔ کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ نکاح کے وقت جہیز کی نمائش لگتی ہے جس میں خوبصورت انداز میں سازوسامان آراستہ کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دلہن کے رنگ برنگے اور مختلف قسم کے کپڑے بھی اس نمائش کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

قومی راج

آپ اندازہ لگائیے کہ اس رسم اور سازوسامان کو دیکھکر نوجوانوں میں کس قسم کے خیالات و جذبات ابھریں گے۔ آپ ان سے کس بات کی امید کریں گے اور انھیں یہ نمائش کس جانب لے جا سکتی ہے۔ کون سے رجحانات پیدا کر سکتی ہے؟ اور دوسرے غریب والدین ان اسباب کے مہیا کرنے کی قدرت نہ رکھنے پر کس طرح دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب اسی صورت میں فراہم ہو سکتا ہے جب ہم اس ناسور کے خاتمے کو ضروری سمجھیں تاکہ آئندہ نسل اس جان لیوا مرض کی شکار نہ ہو۔

اور پھر خود کی بیٹی جل گئی
جل گئی قسمت کی ہیٹی جل گئی
شور اٹھا کیوں کر جلی کیسے جلی
خون اٹھی شہر کی اک اک گلی

ڈاکٹر یونس اگاسکر
بی ۳۸ بجے دیو
سہکار نگر۔ اندھیری (ویسٹ)
بمبئی ۵۸ ... ۴۰۰

اردو میں اسٹیج کی روایت

اُنیسویں صدی میں

اسٹیج اور ڈرامہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی زبان میں اسٹیج کی روایت کی تلاش دراصل ڈرامے کی پیش کش کی تاریخ کا جائزہ ہے۔ اردو میں ابتدائی اسٹیج کا وجود نوٹنکی اور سوانگ یا بھانڈوں کی نقلوں سے جڑا ہوا تھا۔ اس وقت سنگیت اور رقص کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اُنیسویں صدی میں صوبۂ متحدہ، اودھ، بنگال اور پنجاب میں میلوں ٹھیلوں اور تقریبات کے موقع پر عوامی فنکار مذہبی قصّوں یا عوامی حکایتوں کو رقص و موسیقی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کرتے اور گاؤں گاؤں گھوم پھر کر نوٹنکی کا کھیل دکھاتے اور روزی کمایا کرتے تھے۔ رئیسوں اور زمینداروں کے ہاں بھانڈ اور ڈومنیاں اپنی نقلیں پیش کر کے پیٹ پالتی تھیں۔

ان میں نوٹنکی کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس ں میں عموماً پلاٹ، مکالمے اور اداکاری کے ڈرامائی عناصر روتے تھے اس لحاظ سے نوٹنکی کو اردو اسٹیج کی ابتدائی شکل اسکتا ہے۔ سنگیت اور رقص نے مل کر ان کی تمثیلوں کو سنگیت ناٹک کا روپ دے دیا تھا۔ دوسری طرف دسہرے رشن جنم کے مواقع پر رام لیلا اور کرشن لیلا پیش کرنے کا ج بھی تھا جن میں غیر پیشہ ور ایکٹر کام کیا کرتے تھے۔ جہاں کرشن کی لیلاؤں کا تعلق ہے، ہماری موسیقی، رقص اور ڈرامائی

تمثیلوں میں ان کا اثر صاف جھلکتا ہے چنانچہ کتھک، بھرت ناٹیم اور کیچی پڑی میں کرشن کی لیلاؤں کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کا ابتدائی اوپیرا واجد علی شاہ کا "رادھا کنھیا کا قصہ" بھی کرشن کی لیلا یا رس کی بڑی حد تک انہی سے متاثر ہے۔

مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ اردو اسٹیج کے بانی اور اوّلین ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے "رادھا کنھیا کا قصہ" کو اردو کا پہلا ڈرامہ کہا ہے۔ ان کے خیالات کے جائزے کے لیے ان کی تصانیف

ڈمی راج

اردو ڈراما اسٹیج" اور "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔
موصوف کی تحقیق کے مطابق واجد علی شاہ کی فنون لطیفہ اور خاص طور سے رقص و موسیقی سے دلچسپی نے انھیں کرشن کی راس لیلا کی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے رہس کے نام سے انھیں ترتیب دے کر اپنے دربار کے فنکاروں اور محل کی کنیزوں کے ذریعے اسٹیج کیا اور آگے چل کر خود ہی ایک ڈراما "رادھا کنہیا کا قصہ" کے نام سے لکھ کر اسے رقص و موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔

"رادھا کنہیا کا قصہ" "اردو ڈراما اور اسٹیج" کے ضمیمے میں شامل ہے۔ رضوی صاحب کا خیال ہے کہ ڈراما ۱۲۵۲ھ یعنی ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کی تصنیف ہے اور اسی زمانے میں اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔ قصہ یوں ہے کہ "نسیم ایک غم زدہ عورت ہے جس نے جوگ لے لیا ہے۔ غربت اس جوگن کا خادم ہے۔ صبا کو یہ غم ہے کہ اس نے برسوں سے رادھا کنہیا کا ناچ نہیں دیکھا ہے چنانچہ غربت اس رقص کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ ایک اوپرا ہے جس میں رادھا اور کنہیا کے پریم کا قصہ سنگیت ناٹک کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ رادھا کرشن سے روٹھ جاتی ہیں کہ انھوں نے اپنی مرلی کبڑی کو دے دی ہے جو کرشن کی ایک اور معشوقہ ہے۔ وہ کبڑی تھی مگر کرشن نے نہ صرف اس کا کبڑا پن دور کیا بلکہ اُسے حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ کرشن رادھا کو مناتے ہیں مگر وہ نہیں مانتیں۔ آخری بڑی مشکل سے مرلی واپس مل جاتی ہے اور روٹھی رادھا من جاتی ہے۔

"اردو ڈراما: روایت اور تجربہ" کی مصنفہ ڈاکٹر عطیہ نشاط کا خیال ہے کہ "کسی قصے کو ڈراما کہنے کے لیے جس عمل و حرکت، کشمکش اور تصادم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا یہاں نام بھی نہیں ہے...... کرداروں میں کوئی پیچیدگی، کوئی الجھن نہیں ہے۔ سیدھے سادے سے کردار ناچ گانوں کی لڑیوں میں گوندھے گئے ہیں...... اس کوشش کو ڈرامے کا پہلا قدم کہا جاتا ہے لیکن لیکن اس ابتدائی کوشش کو ڈراما نہیں کہا جا سکتا۔"
(ص ۵۶، ۵۷)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "رادھا کنہیا کا قصہ" اگر ڈراما نہیں ہے تو واجد علی شاہ کو اردو اسٹیج کا بانی کہنا کہاں تک درست ہوگا۔ اگر اسٹیج سے مراد ڈراما اور اس کی پیش کش دونوں کا سنگم ہے تو یقیناً واجد علی شاہ اسٹیج کے بانی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو ڈرامے کے تمام عناصر موجود ہیں اور نہ ہی اسٹیج کے سارے لوازم البتہ ان کی کوشش کو اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ اس کی بدولت اردو میں ڈراما اور اسٹیج کے لیے راہ ہموار ہو کر آ[غا] حیدر حسن امانت کی "اندر سبھا" لکھی اور پیش کی گئی۔

واجد علی شاہ کے حکم اور نگرانی سے لکھنؤ کے قیصر با[غ] میں جو رہس کھیلے جاتے تھے، ان کی شہرت لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں پھیل گئی، اور ان کی پیروی میں اس قسم کے کھیل یا تمثیلیں پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا چنانچہ رہس کی ترتیب و پیشکش کا حال سن کر امانت لکھنوی نے ایک کھیل تیار کیا جس میں راجا ا[ندر] اور اس کی سبھا کی ایک پری کی ایک آدم زاد سے محبت کا قصہ منظوم شکل میں ترتیب دیا گیا تھا۔

پروفیسر احتشام حسین نے صحیح کہا ہے کہ اس قصے پر "میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا غیر معمولی اثر نظر آتا ہے۔" نہ صرف "سحر البیان" بلکہ دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" سے بھی امانت نے استفادہ کیا ہے لیکن ان کی یہ خدمت یقیناً قابلِ ذکر ہے کہ اردو میں ڈرامے کے عناصر انھوں نے سب سے پہلے برتا اور ایک ایسا قصہ ترتیب د[یا] جسے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا جا سکتا تھا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" میں "اندر [سبھا]" کا سال تصنیف ۱۸۵۲ء بتایا ہے یعنی "رادھا کنہیا کا قصہ" کے دس سا[ل] بعد۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط کا اندازہ ہے کہ جنوری ۱۸۵۴ء میں "اندر سبھا" پہلی بار کھیلی گئی۔

قصہ یوں ہے کہ "راجا اندر کے دربار کی ایک رقاصہ سبز پری کو ایک آدم زاد شہزادہ گلفام سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ اسے اپنی انگوٹھی نشانی کے طور پر دے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی پری کا آدم زاد کی محبت میں گرفتار ہونا انتہائی ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی سزا موت سے کم نہیں۔ سبز پری ایک دیو کو اپنا رازدار بنا کر بھیجتی اور گلفام کو اندر لوک میں بلوا لیتی ہے۔ پھر راجا اندر کے دربار میں اپنا رقص پیش کر کے اُس سے دل کی مراد مانگنے کا وعدہ چاہتی ہے۔ راجا اندر خوش ہو کر وعدہ کرتا ہے کہ جو مانگے گی ملے گا۔ اس پر وہ اپنا بھید کھولتی ہے اور آدم زاد کو اپنانے کی اجازت چاہتی ہے۔ راجا اندر بہت خفا ہوتا ہے، دونوں کو جان سے مارنا چاہتا ہے مگر قول ہار چکا ہے، اس لیے سزا دینے سے مجبور ہے چنانچہ سبز پری اور شہزادہ گلفام ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں

امانت کی "اندر سبھا" میں قصہ، کردار، مکالمہ، ڈراما کی کشمکش جیسے عناصر جن سے ڈراما عبارت ہے، موجود ہیں۔ اگرچہ اسٹیج پر اسے پیش کرنے کے لیے رقص و موسیقی اور گانوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال کیا گیا تھا اس کے باوجود اس قصے کے تجسس اور اس کی ڈرامائی کیفیت میں کمی نہیں آئی۔ اس تمثیل کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ گھر گھر اس کی دھوم مچ گئی۔ جگہ جگہ اس کے شو ہوئے۔ عوام و خواص کی زبان پر اس کے اشعار رواں ہو گئے اور امانت کی تقلید میں درجنوں اندر سبھائیں لکھی اور اسٹیج کی گئیں۔ چنانچہ پروفیسر مسیح الزماں کی تحقیق کے مطابق ممبئی کی متعدد پارسی ناٹک منڈلیوں نے اندر سبھائیں پیش کیں۔

جہاں تک امانت کی اندر سبھا کی پیش کش کا تعلق ہے، پروفیسر مسیح الزماں نے اس کے اسٹیج کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"کھلی جگہ پر شامیانہ تان کر ایک طرف پندرہ بیس فٹ لمبی اور لگ بھگ اتنی ہی چوڑی جگہ اسٹیج کے لیے مخصوص کر کے باقی جگہ تماشائیوں کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اسٹیج کے داہنے کنارے پر آگے کی طرف ایک تخت یا چوکی بچھائی جاتی جسے قالین، گاؤ تکیے وغیرہ سے سجایا جاتا۔ اس کے پیچھے تین کرسیاں رکھی جاتیں۔ کرسیوں کے بائیں طرف ایک قدم پیچھے سازندوں کی قطار بیٹھ جاتی۔ انھیں کے ساتھ گانے والے بھی بیٹھتے تھے۔ سازندوں کے پیچھے لال رنگ کا پردہ تانا جاتا تھا اور اداکار پردہ ہٹنے پر سازندوں کے بائیں جانب سے اسٹیج پر داخل ہوتے تھے۔"

(امانت کی اندر سبھا ص ۲۷)

یہی اندر سبھا جب ممبئی کے پارسی اسٹیج پر پہنچی تو اس کے استقبال کے لیے مصور پردوں کا اہتمام ہوا، راجا اندر کے دربار کے مختلف مناظر کے لیے الگ الگ جلسوں کا انعقاد عمل میں آیا یہاں تک کہ سبز پری کو شہزادۂ گلفام کے لانے کے لیے اڑن کھٹولا بھی مہیا کیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو اسٹیج نے انیسویں صدی ہی میں کتنی تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں اور اودھ سے ممبئی آنے تک وہ کن بلندیوں سے گذرا۔

ویسے ممبئی میں "اندر سبھا" کے ورود سے پہلے اسٹیج یا تھیٹر مفقود نہ تھا البتہ اردو اسٹیج کی کوئی قابل ذکر روایت موجود نہ تھی۔ یوں تو ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے پرتگالیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں اردو اسٹیج کے پروان چڑھنے کا تذکرہ "اردو تھیٹر" میں کیا ہے لیکن ان باتوں کو قیاس آرائیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ ۱۸۵۲ء یا ۱۸۵۳ء میں سانگلی کے ایک مراٹھا ڈراما نگار وشنو داس بھاوے کے ترتیب دیے ہوئے ہندستانی ناٹک "راجا گوپی چند جالندھر" کے ممبئی میں پیش کیے جانے کے وافر ثبوت موجود ہیں۔ ڈاکٹر نامی نے غلطی سے بھاؤ دا جی لاڈ کو اس ناٹک کا مصنف بتایا ہے۔ ڈاکٹر لاڈ دراصل اس تھیٹر کے مہتمم تھے جہاں بھاوے نے اپنا ناٹک پیش کیا تھا۔

وشنو داس بھاوے کو مراٹھی کا اولین ڈراما نگار اور مراٹھی اسٹیج کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کمپنی "ہندو ناٹک منڈلی" کے ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کر کے دوسری مرتبہ ممبئی آئے تو یہاں کی عام زبان ہندستانی میں ایک ناٹک تیار کر کے پیش کیا جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ڈرامے کی پیش کش میں اس زمانے کے مقتدر شہریوں جگت ناتھ شنکر سیٹھ اور ڈاکٹر بھاؤ دا جی لاڈ نے خصوصی دلچسپی لی۔ اس دور کے انگریزی اخبارات میں نہ صرف اس ڈرامے کے اشتہارات چھپے بلکہ اس پر تبصرے بھی شائع ہوئے۔ "گوپی چند جالندھر" کا مسودہ تو دستیاب نہیں ہے کیونکہ بھاوے کے اکثر ناٹکوں کے باقاعدہ اسکرپٹ تیار نہیں کیے گئے تھے۔ لوگ زبانی ہی اپنے مکالمے یاد کر لیتے تھے۔ انھیں مکالمے رٹانے کے لیے خود بھاوے یا کوئی اور شخص جو اس کام کے لیے مقرر ہوتا تھا، شاید ایک کاپی اپنے پاس رکھتا ہو۔ بھاوے کے اس ہندستانی ناٹک کی نقل دوسری ناٹک منڈلیوں نے کی اور "اندر سبھا" کی طرح "گوپی چند جالندھر" بھی متعدد بار اسٹیج کیا گیا۔ ان میں سے بعض کمپنیوں کے استعمال کردہ مسودات نامکمل شکل میں مل جاتے ہیں۔

ممبئی میں پارسیوں نے اردو اسٹیج اور ڈرامے کی زبردست خدمت کی ہے۔ ان کے پیش کردہ اردو ڈراموں میں سب سے قدیم دستیاب شدہ ڈراما خورشید ہے۔ یہ گجراتی میں ایدل جی جمشید جی کھور گی کے قلم سے نکلا تھا جسے بہرام جی فریدوں جی مرزبان نے اردو میں منتقل کیا۔ یہ ڈراما ۱۸۷۱ء میں اسٹیج کیا گیا۔ اس میں خورشید نامی حسین عورت کا قصہ پیش کیا گیا ہے جسے اس کا شوہر دہلی کا بادشاہ فتح شاہ کسی بات پر ناراض ہو کر نیلام کروا دیتا ہے۔ اسے نیکیں آباد کے

(باقی صفحہ نمبر ۳۷ پر)

تبصرہ نگار: ریاض احمد خاں

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں بذریعہ رجسٹری لازمی ہیں)

عنوان	:-	"گوکھرو کے پھول"
شاعر	:-	ظفر گورکھپوری
مطبع	:-	ملٹی پرنٹ، بمبئی ۸
قیمت	:-	۳۰/ روپے

ظفر گورکھپوری شاعروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے شعور کو ترقی پسند شعرا اکرام کے کلام کی آب و تاب سے وسعت دی اور موجودہ دور کے نوجوان شعرا کے خیالات سے ہم آہنگی قائم رکھی اور اسی وجہ سے اگر یہ کہا جائے کہ "ظفر ترقی پسند اور اس دور کے نوجوان شعرا کے درمیان ایک ربط ہیں" تو بے جا نہ ہوگا۔

ظفر کے کلام میں زندگی کی علامتیں زندہ اور جاوید ہیں۔ جس میں شعریت اور معنویت کے علاوہ ایک شدید احساس ہے جو شاعر کے حساس دل کو چین اور سکون سے نہیں بیٹھنے دیتا اور جب یہی احساس ایک کرب کی شکل اختیار کرلیتا ہے تب ظفر اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ظفر خالق کائنات کی خلاقی کے قائل ضرور ہیں مگر جب انسانی اقدار پر زوال دیکھتے ہیں تو خاموش تماشائی نہیں بنے رہتے۔ بلکہ اپنی تمام تر قوت کو یکجا کرکے بڑی سے بڑی طاقت سے نبرد آزما ہونے کی قوت پیدا کرلیتے ہیں۔ اور یہی شاعری کی معراج ہے جسے ظفر نے اپنے شعری سفر میں کئی مرتبہ چھوا ہے۔

زیر نظر مجموعہ "گوکھرو کے پھول" ظفر کی شاعرانہ کامیابی کا ایک سنگ میل ہے۔ ظفر نے تیسرے مجموعہ اپنی غزلوں کو اپنی قوم اور اپنے دور کی آواز کو زیادہ بلند کیا ہے۔ ظفر کے دل کا درد ان کا اپنا ضرور ہے مگر اس کا انھیں احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے سے سوا درد میں مبتلا انسانوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ مکمل شاعر وہی ہے جو "میں" کی بجائے "ہم" اور "ہم" کی بجائے "کُل" کی آواز بن سکے۔ ظفر نے "کُل" کی آواز بن کر دکھایا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں جذبات، احساسات، درد، ٹیس اور چبھن کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔

ظفر کے کلام پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری سنطری ہے۔ ہر شعر میں دم خم ہے، آمد ہے اور ہر شعر کا تیور تیکھا ہے منحنی جسم رکھنے والے اس شاعر میں اتنی ہمت ہے جو اپنے وجود کو تو کچور ہوتا دیکھ سکتا ہے مگر اپنے معاشرہ پر انگشت نمائی برداشت نہیں کرسکتا۔ ظفر ایک زمانے سے شعر کہہ رہے ہیں مگر اتنے جگ بیت جانے پر بھی ان کی شاعری پر خارجی اثرات کا تسلط کبھی نہیں رہا یہی سبب ہے کہ ظفر موجودہ دور کے نوجوان شعرا میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں اور یہی انفرادیت ظفر کو اور ظفر کی شاعری کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

"گوکھرو کے پھول" ظفر گورکھپوری کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ جب ان کا پہلا مجموعہ کلام "تیشہ" منظر عام پر آیا تب ہی سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے انھوں نے باوقار شعرا کی فہرست میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ ان کی "وادیٔ سنگ" کی راہیں دشوار گذار ضرور تھیں مگر بڑی کامیابی سے انھوں نے یہ سفر بھی طے کرلیا اور اب — "گوکھرو کے پھول" لیکر حاضر ہوئے ہیں۔ ظفر کی ہر ادا میں ایک انفرادیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی عنوان کو لیجئے۔ "گوکھرو کے پھول" نہ تو خوش رنگ ہوتے ہیں اور نہ خوشبودار۔ البتہ گوکھرو کی خاصیت یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ وہ دامن سے لپٹ جائیں تو ان کا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ اپنے اشعار کی اسی خصوصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے شاید ظفر نے یہ عنوان پسند کیا ہو۔

غزلوں کا یہ مجموعہ خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع ہوا ہے جس کے ایک فلیپ پر ڈاکٹر قمر رئیس اور دوسرے پر پروفیسر فضیل جعفری نے ظفر کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا عمدہ پیرایے میں اظہار کیا ہے۔ مجروح سلطان پوری نے "ایک جدید ترقی پسند شاعر" کے عنوان سے ظفر کی شاعری پر ان کی فنی صلاحیت اور اسلوب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ظفر گورکھپوری ایک ایسے فنکار شاعر ہیں جن کی منفرد گوئی سے مزید تازہ اور توانا نئی غزل کا انتظار بجا طور پر کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ظ انصاری کا قلم بیباک ضرور ہے مگر انسانی قدروں اور پاسِ ادب کے فریم میں ہی نئی راہیں تلاش کرتا ہے جس کی وا

(باقی صفحہ نمبر ۳۷ پر)

قومی راج

نظر برنی

عورت

نخلِ مراد، روحِ تمنا، قرارِ جاں
ذی شان و دلفریب محبت کی داستاں

تمہیدِ رازِ عشق ہے تفسیرِ کائنات
عورت ہے آدمی کے لیے مقصدِ حیات

تزئین جس کے دم سے مری رہگذر ہوئی
تنہائیوں کو دور کیا ہمسفر ہوئی

اس کی ادائے خاص سے روشن جہاں ہوا
اس کا وجود اصل میں آرامِ جاں ہوا

ایسا ملا ہے اسکو محبت کا بانکپن
اس کی ہے اپنی ذات ہی خود ایک انجمن

حسنِ ازل نے اس کا مقدر سجا دیا
شرم و حیا کا اس کو خزانہ عطا کیا

مومن خاں شوق
اشرف ولا ۱۱-۳-۷۲۳
ٹی پی۔ حیدرآباد (اے۔پی)

نیا سال آگیا

زخموں کو بھول جاؤ نیا سال آگیا
باتیں نئی سناؤ نیا سال آگیا

بدلا لباس وقت تو چہرے دمک اٹھے
جھومو، خوشی مناؤ نیا سال آگیا

پھر بزمِ آرزو میں چراغاں کا جشن ہے
دیوار و در سجاؤ نیا سال آگیا

مہکی ہوئی فضا ہے تو نکھرا ہوا شعور
اب تم بھی گنگناؤ نیا سال آگیا

سازِ طرب پہ رقص میں لاؤ حیات کو
ہر غم کو بھول جاؤ نیا سال آگیا

تلخابۂ حیات میں صہبا انڈیل کر
مہکو، سبو اٹھاؤ نیا سال آگیا

اے شوق! اختلاف کی باتوں کو بھول کر
سب کو گلے لگاؤ نیا سال آگیا

ظفر گورکھپوری

۶/۲ الف، نیو میونسپل کالونی۔ دیونار، بمبئی ۴۳

لاو

(۱)

کتنے اجسام ہیں جو روز جواں ہوتے ہیں
اور شہنائی کی آواز نہیں سُن سکتے
ایک ماں کے گھر لانے میں جنم پاکر بھی
اپنی مرضی سے کوئی پھول نہیں چُن سکتے

(۲)

یہ جہیزوں کے مسائل یہ ہوس کا رسماج
مُردہ رسموں کے یہ بندے یہ رواجوں کے غلام
کتنے زخمی شبابوں کے کفن سیتے ہیں
پیتے ہیں کتنی امنگوں کے چھلکتے ہوئے جام

(۳)

کھو گئیں حرص کی آغوش میں کتنی سیجیں
جن کا اک عکس سُنک خلد نشاں ہوتا تھا
جسم کیا؟ گرد میں لپٹے ہوئے ڈھانچے بھی نہیں
جن پہ جاپان کی گڑیوں کا گُماں ہوتا تھا

(۴)

جل گیا کتنے دھڑکتے ہوئے سینوں کا گداز
نوعروسی کی تمنا نہ اُبھرنے پائی
مفلسی جرم کو پروان چڑھاتی تب رہی
بھر گئی گود مگر مانگ نہ بھرنے پائی

(۵)

تو کہ اُن سال رواجوں کے ستم سے ڈر کر
جان دینے کے ارادے پہ اُتر آئی ہے
چھوڑ کر اپنی امیدوں کے مہکتے ایوان
موت کی وادیِ پُرخار میں در آئی ہے

(۶)

دل کے شعلوں کو ضروری ہے فروزاں رکھنا
موت درمان شبِ غم تو نہیں بن سکتی
زندگی زخم سہی دل کا سُلگتا ہوا زخم
موت اس زخم کا مرہم تو نہیں بن سکتی

پاؤں اِن سرد چٹانوں سے ہٹا لے بیلاو
اپنے اشکوں میں مری آگ ملا لے بیلاو

مشتاق المحوی
(بھوپال)

۲۶ جنوری

چھبیس ۲۶ جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

گاندھی نے شانِ ہند بڑھائی کچھ اس طرح
جانِ عزیز اپنی گنوائی کچھ اس طرح
جنگ و جدل میں سینہ سپر ہو کے دوستو
آزادی اس وطن کو دلائی کچھ اس طرح

چھبیس جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

کردار ہم کو دے گیا وہ آن بان سے
خوش تھا ہر ایک شخص میں پیر و جوان سے
تاریخ لکھ چکی ہے کتابوں میں اس کا نام
آواز آ رہی ہے یہ ہندوستان سے

چھبیس جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

ہندوستاں نے کیسی ترقی کی راہ لی
آئینے کے مثال ہر اک شے چمک اٹھی
نہرو کی اور اندرا کی تعریف کیا کریں
مشتاق اپنے دیش کی تقدیر کھل گئی

چھبیس ۲۶ جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

غزلیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

وہ دل کہ جو بیگانہ بھی اپنا بھی نہیں ہے
دُنیا میں کہیں اس کا ٹھکانہ بھی نہیں ہے

دُنیا نے تو افسانے بنا ڈالے ہیں لیکن
میں نے تو ابھی تک تجھے دیکھا بھی نہیں ہے

کیوں دل کو اب آرام ہے آخر کو بتاؤں
تجھ کو تو کسی بات کی پروا بھی نہیں ہے

تکلیف دوبارہ نہ کرے جلوۂ سینا
اس طرح کا اب کے تو ارادہ بھی نہیں ہے

کیوں مجھ سے تو آزردہ و بدظن ہے کہ مجھ کو
تیرا تو خیال آج تک آیا ہی نہیں ہے

معصوم ہو تم لوگ کہ تم نے تو ابھی تک
شاید مرے اشعار کو دیکھا بھی نہیں ہے

ہر چہرے میں آزاد! یہ کیا ڈھونڈ رہے ہو
ہر چہرہ تو شایانِ تمنا بھی نہیں ہے

رُسوائی کی منزل تو ابھی دُور ہے آزاد
جو راز ہے تیرا ابھی افشا بھی نہیں ہے۔

جلیل ساز

مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

بھر گیا ہے دُھواں دماغوں میں
روشنی اب کہاں چراغوں میں

شاید اُن پر کوئی ستم ٹوٹا
آج سوزش ہے دل کے داغوں میں

بو دیئے ہیں روش روش کانٹے
فصل گل نے تمام باغوں میں

آدمی کا لہو! مئے گل گوں!!
کون سی چیز ہے ایاغوں میں

پلنے والوں کو خوش نصیب کہو
کھو گئے کتنے ہی سراغوں میں

ہم نے کیا زندگی گزاری ہے
بلبلوں میں رہے نہ زاغوں میں

ساز نسبت ہے اس پری سے مجھے
رقص کرتی ہے جو ایاغوں میں،

. قومی راج

قاضی انصار

قاضی پورہ ۔ کھنڈوہ (ایم۔پی)

بے خطر ہو کے بات کرتے ہیں
جو بھی کہنا ہے کہہ گزرتے ہیں!

کچھ تو دیتے ہیں حوصلہ مجھ کو
کچھ مرے بال و پر کترتے ہیں

مجھ کو لہروں میں ڈوب جانے دو
ڈوبنے والے پھر اُبھرتے ہیں

عمر میری ذرا ٹھہر جانا
راتیں سجتی ہیں دن سنورتے ہیں

بھیگے، ٹھٹھرے جلس گئے آخر
اس طرح موسموں کو برتتے ہیں

زندگی کے حسین ترلمحے،
کچھ سمٹتے ہیں کچھ بکھرتے ہیں

ارتقا کی یہ منزلیں انصار
اپنے سائے سے لوگ ڈرتے ہیں

سہیل صدیقی
صدیق ہاؤس۔ یلیم چوک قاضی کیمپ
بارہ سالہ روڈ۔ بھوپال (ایم۔پی)

مزاجِ وقت راس آنے لگا ہے
کنواں پیاسے کے پاس آنے لگا ہے

میں بستی کی طرف لوٹوں تو کیسے
یہ جنگل مجھ کو راس آنے لگا ہے

غموں کی وادیوں میں رہنے والا
نظر اب کیوں اداس آنے لگا ہے

نئی تہذیب کی صورت بدل کر
زمانہ بے لباس آنے لگا ہے

سہیلؔ ان سے کہو طوفاں اٹھا کر
تمہارے گھر کے پاس آنے لگا ہے

اکبر نوری اجرولی
منزل۔ شیش محل حسین آباد لکھنؤ ۳

حدِ نگاہ سے جو ماورا دکھائی دے
ہر ایک پھول سے خوشبو جدا دکھائی دے

دیارِ سنگ میں جب آئینا دکھائی دے
تو ہر قدم پہ نیا حادثا دکھائی دے

ہر ایک چہرہ میں پڑھتا ہوں اس لئے شاید
کہیں تو کوئی نیا فلسفا دکھائی دے

اگر نگاہ سے ہٹ جائے پردۂ منظر
سرِ برہنہ بھی زیرِ ردا دکھائی دے

سلگتے ذہن یہی سوچتے ہیں راتوں کو
کوئی مکان تو جلتا ہوا دکھائی دے

چلا گیا جو اندھیرے بکھیر کر سورج
ابھر کے آئے تو رنگِ حنا دکھائی دے

ساحر نظامی (علیگ)
۲۳۔ ایس ایس (ایسٹ)
ایس ایس (ساؤتھ) اے ایم یو

پُرسکوں پُرامن اک شہر دیجئے
سبز شاداب مجھ کو شجر دیجئے

دیکھنا ہے اگر میری پرواز کو
توڑ کر قید آزادئ پَر دیجئے

جو ملے آپ سے مجھ کو منظور ہے
رنج و غم ہی سہی بے خطر دیجئے

میں مسافر ہوں اور رہبری کے ل
گر فرشتہ بھی تو معتبر دیجئے

اب نہ ساحر کبھی آئے گا میک
آج جی بھر کے سیراب کر د

تو

مسلسل پانچویں سال بھی بھارت شری نے "آرمڈ فورسس فلیگ ڈے" کے موقع پر سب سے زیادہ رقم جمع کی۔ اس موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن اور اطلاعات و رابطہ عامہ ڈاکٹر شری کانت جچلکر کو ۱۲ دسمبر کو دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں ایک "ٹرافی" دیتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔
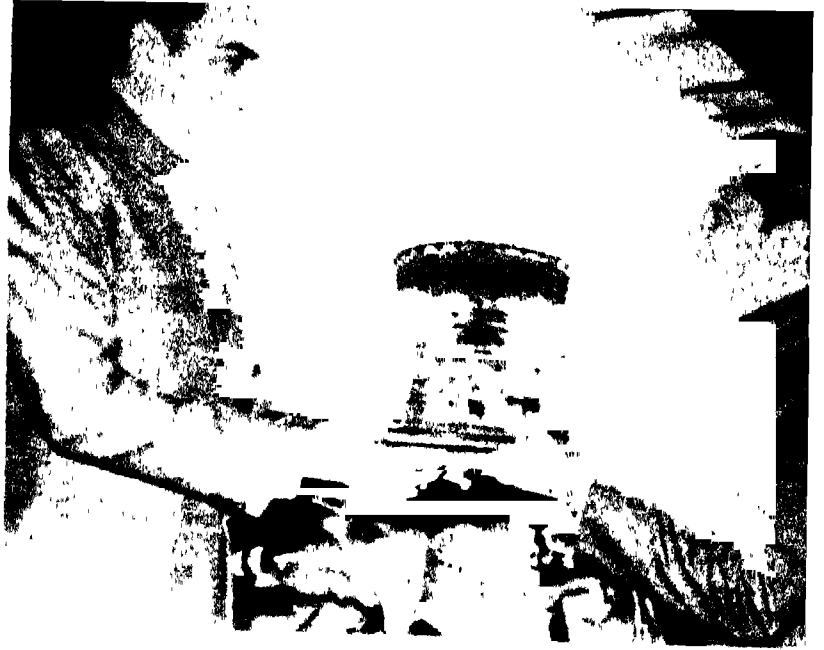
خبریں ۔ تصویروں میں

صدر ہند شری گیانی ذیل سنگھ "گوا ۔ ۱۹۸۶ء" کی نمائش میں بھارت شری پویلین کا معائنہ فرماتے ہوئے۔ اس نمائش کا اہتمام، پرتگیزوں سے گوا کو نجات ملنے کے سبب کیا گیا تھا اور اس جشن سیمیں کو منعقد کیا گیا تھا ڈاکٹر شری کانت جچلکر وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ، صدر ہند کا خیر مقدم کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ شری پربھو ماتے ڈائریکٹر جنرل برائے اطلاعات و رابطہ عامہ بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان "ٹیکسٹائل صنعت" میں شری پیداوار کی نمایاں کامیابی کو سراہتے ہوئے۔

مرکزی ٹیم نے مہاراشٹر میں "خشک سالی" سے متاثرہ علاقہ کا دورہ کیا۔ اس ٹیم کے ارکان، پونے ضلع کے شیرور تعلقہ میں "ضمانتِ روزگار اسکیم" کے تحت "چاکسمن نہر" کے کام کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۳ سے آگے

تبصرہ "گگھرو کے پھول"

سے ان کی تحریر پُر اثر ثابت ہوتی ہے۔ "گگھرو کے پھول" پر انھوں نے نہ صرف ظفر گورکھپوری کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کے کلام کی تازگی اور تہہ داری، الفاظ کے استعمال، تراکیب، استعاروں اور علامتوں پر روشنی ڈالی ہے۔

عزیز قیسی نے "گرسنہ مزدور طرب گاہِ زیب" کے عنوان سے ظفر کی فنی صلاحیتوں پر، ان کی شخصیت اور موجود دور کی شاعری پر عمدہ پیرائے میں تذکرہ کیا ہے۔ عزیز قیسی نے ظفر کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "ظفر گورکھپوری صرف اچھے شاعر نہیں، سچے شاعر ہیں اور "سچ" کی عمر ازلی ابدی ہے۔ سچ مٹ مٹ کے ابھرتا ہے۔ مرتا ہے لیکن ققنس کی طرح پھر اپنی ہی چتا کی راکھ سے پیدا ہوتا ہے۔"

تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ مجموعہ ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے۔ عمدہ کاغذ، صاف ستھری کتابت، بے عیب طباعت کے علاوہ بھی ہر ورق سے نفاست جھلکتی ہے کیونکہ یہ مجموعہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے جزوی تعاون سے شائع ہوا ہے اس لیے اس کی قیمت مبلغ ۳۰ روپے ہے۔ رچنا پبلی کیشنز۔

ایف ۴/۲، نیو میونسپل کالونی۔ دیونار۔ بمبئی ۴۰۰۰۴۳ سے یا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسز بلڈنگ نزد جے جے اسپتال بمبئی ۳ اور مکتبہ کی دلی اور علی گڑھ شاخوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

صفحہ نمبر ۲۹ سے آگے

اردو میں اسٹیج کی روایت

بادشاہ کا لڑکا فیروز سود اگرین کر خرید لیتا ہے اس کے بعد وہ نت نئے مردوں کے حال میں پھنستی اور بچ کر نکلتی ہے۔ آخر دوبارہ اپنے اصل شوہر سے جا ملتی ہے۔

ڈرامے میں پچیس سین ہیں اور بہت سے مناظر بھرتی کے ہیں۔ پلاٹ بھی ڈھیلا ڈھالا اور بے تکا ہے لیکن اس میں تصادم اور کشمکش کا وجود ہے۔ اردو کے قدیم دستیاب شدہ ڈراموں میں خورشید کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ یہ مکمل طور پر نثری ڈراما ہے، اس میں منظوم مکالمے قطعی نہیں ہیں۔ اسے وکٹوریہ ناٹک منڈلی نے پیش کیا تھا۔ اس کمپنی نے 'نور جہاں' اور 'حاتم' کے نام سے دو اور ڈرامے بھی پیش کیے جن کی کامیابی کو دیکھ کر دوسری ناٹک منڈلیوں نے بھی اردو اسٹیج کی طرف توجہ کی۔ خاص بمبئی میں اردو اسٹیج کی روایت کا جائزہ لینے کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ •

سمیتا پاٹل چل بسی

ہندوستانی پردۂ سیمیں کی عالمی شہرت یافتہ مقبول
اور مشہور فلم اداکارہ پدم شری اعزاز یافتہ سمیتا پاٹل
کا دماغ کی رگوں کے پھٹ جانے کے سبب
(Brain Haemorrhage) کی بنا پر ۱۲ دسمبر کو جسلوک ہسپتال میں
انتقال ہو گیا۔

سمیتا دوسری ہندستانی تھیں جن کی فلموں کا Retrospective پیرس میں منعقد کیا گیا تھا پہلے ہندستانی ہیں، مشہور فلم ساز "ستیہ جیت رے"۔

سمیتا یقیناً اس قابل تھی بلکہ ہندی سینما کا جو معیار ہے اس سے موازنہ کیا جائے تو وہ اس سے بھی بہت زیادہ کی مستحق تھی۔ اس کی ناقابل فراموش اداکاری "نشانت"، "منتھن"، "آکروش"، "بھومیکا" اور "چکر" اس کی عظمت کا ثبوت ہیں۔

ہندی اسکرین پر ہیروئن کا خوبصورت ہونا، گانا گانا، ناچنا، مٹکنا اور آنسو بہانا بس یہی سالہا سال سے ہم دیکھتے آئے ہیں سمیتا اور شبانہ اعظمی نے اس رجحان کو بڑی حد تک توڑ دیا۔ "کھنڈر" میں شبانہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندی فلموں میں بھی ہیروئن کا کردار کتنا زبردست ہو سکتا ہے اور یہ ہندستانی اداکارہ بھی کسی سے کم نہیں اسی طرح سمیتا نے ایسی کئی فلمیں ہمیں دی ہیں جو ہندی سینما میں شاید پھر کبھی بن سکیں جیسے "صبح"۔

سمیتا پاٹل نے اپنی اداکاری کا لوہا منوا کر نہ صرف ہندستان کا بلکہ مہاراشٹر کا نام بھی روشن کیا ہے۔ فلمی صنعت میں سمیتا کا نام اسی طرح لیا جائے گا جس طرح کرکٹ میں سنیل گواسکر کا لیا جاتا ہے۔ "بازار" کی سمیتا پاٹل، ستیہ جیت رے کی سمیتا پاٹل سے کتنی مختلف مگر اداکاری کے بام عروج کو چھوتی ہوئی اداکارہ کروڑوں شیدائیوں کو بلکتا چھوڑ گئی۔

س

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

۳۱ سالہ اس اداکارہ کی موت کی خبر سنتے ہی غم و اندوہ کے
ا چل گئے۔ گذشتہ ۲۰ر نومبر کو سمیتا نے ایک لڑکے کو جنم دیا تھا۔
سمیتا ایک اعلیٰ درجہ کی اداکارہ تھی۔ بہت ہی کم عرصہ میں اس نے
ہرت حاصل کر لی تھی جو اس کے ہمعصروں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی
لہ لاکھوں روپے پبلسٹی پر خرچ کرنے، عریاں پوسٹر چھپوانے
ے بعد بھی درون ملک کے علاوہ ان فلمی اداکاراؤں کا بیرونی
ے میں کسی کو نام تک معلوم نہیں ہوتا۔

ایک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن منائے سال نو کے

صبح نوروز۔ ساحر لدھیانوی

قارئین کی رائے

پروفیسر م . خ . شاذلی
کیلاش نگر تانڈ

قومی راج کا آزادی نمبر ملا . پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی .
خاص طور پر دو مضامین، منیر المخوی صاحب کا راحت کوئی صاحب سے متعلق اور احمد عثمانی صاحب کا اسیران جنگ آزادی (مالیگاؤں) . یہ مضامین ہی نہیں بلکہ تاریخی ریکارڈ ہیں احمد عثمانی صاحب کی کوشش بے حد قابل تعریف و ستائش ہے . اللہ جزائے خیر دے انھوں نے بڑی محنت کی ہے . یہ دونوں مضامین ہمارے مضمون نگاروں کے لیے تحریک کا کام کر سکتے ہیں . آج ان موضوعات پر تحقیق و تحریر کی سخت ضرورت ہے . کیا ہی اچھا ہو کہ مہاراشٹر کے ہر ضلع سے اس موضوع پر کام ہو اور یہ تمام تاریخی حقائق سامنے آئیں . یہ نہ صرف ادبی کام ہوگا بلکہ ایک قومی اور ملکی فریضہ کی حیثیت سے دیکھا جائے گا .
دیگر مضامین بھی معلوماتی اعتبار سے نہایت اہم ہیں .
ان فنکاروں کے ساتھ ہی اراکین ادارہ بھی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انتخاب میں نہایت سنجیدہ نقطۂ نظر سے کام لیتے ہیں .

★ ★ ★

بی . این . مہوا آمن
صدر بزم دکھی ۱۱۲ موتھا لبڈنگ . ایم . جی . روڈ
جالنہ (مہاراشٹر)

قومی راج مورخہ ۱۰ / اکتوبر ۸۶ء "مہاتما گاندھی نمبر" دستیاب ہوا جس حسن و خوبی اور سلیقہ سے مہاتما گاندھی جی کی زندگی کے حالات کو قومی راج میں پیش کیا گیا ہے . قابلِ صد مبارکباد ہے .
جنگ آزادی کی تحریک میں مہاتما جی کے رول کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے . ملک کے ہر نوجوان کے لیئے ان کی زندگی مشعلِ راہ ہے .
قومی راج کا مہاتما گاندھی نمبر خود ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے . اس کو سنبھال کر رکھنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں اور یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ قومی راج واقعی ہر لحاظ سے بلند پایہ اور معیاری رسالہ ہے .

شفیع اللہ خان راز اٹاوی (ایم اے)
ایس . این کالج ، کٹرہ پور دل خاں
اٹاوہ (یو . پی) ۲۰۶۰۰۱

قومی راج ، اپنی البیلی اور نرالی آن بان سے مسلسل موصول ہو رہا ہے . ہر شمارہ اپنے اندر نیا پن اور منفرد حسن رکھتا ہے اس کا مطالعہ قاری کے لیے کارآمد ، مفید اور نہایت معلوماتی ہے . حکومت کی پالیسیوں کا خلاصہ ، ساتھ ہی اردو ادب کے معیار کو باقی رکھنے والا مہاراشٹر کا منظر نامہ قومی راج ایک مثالی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے . اس کی گرانقدر تخلیقات اور بے لوث تبصرے پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے .

★ ★ ★

عبدالجبار قاسمی
وائی . ستارا (مہاراشٹر)

قومی راج ، نہایت شاندار طریقہ پر شائع ہوتا ہے . خدا کرے ہمیشہ اسی طرح نکلتا رہے . مجھے قومی راج پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ارباب حل و عقد واقعی سیکولر کردار رکھتے ہیں . تاریخی مواد پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اپنے نظیر کا کوئی دوسرا مثل نہیں رکھتا ہے . شعر و سخن کی محفل میں بھی آج کے شاعر حضرات کی ایسی تخلیقات نظر آتی ہیں جو ملک و قوم کو سنوارنے کا عزم رکھتی ہیں . دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قومی راج کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے .

★ ★ ★

ایس . ایم . شریف محبوب
بزم حباب . پارک سائیٹ . وکھرولی . بمبئی ۷۹

قومی راج کا ہر شمارہ برابر موصول ہو رہا ہے . قومی راج حکومت مہاراشٹر کا بہترین ترجمان ہے جسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے . دن بہ دن اس میں خوبصورتی اور نکھار پیدا ہو رہا ہے . یہ سب قومی راج منتظمین کی کوششیں ہیں . اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قومی راج رسالہ کی عمر دراز ہو .

★ ★ ★

م جمہوریہ نمبر

قومی راج

ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

یف ایڈیٹر: پرمود مانے — ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان
جنگ ایڈیٹر: ریاض احمد خاں — سب ایڈیٹر: عبداللہ

جلد ۱۴ — ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء — شمارہ ۲
زرِ سالانہ دس روپے — قیمت فی شمارہ ایک روپیہ

اس شمارے میں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہمارا سرورق نمبر ۴

مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل شری نرسمہا راؤ نے "اپنا اُتسو" میں ساؤتھ زل زونل کلچرل سنٹر کے ثقافتی پروگراموں کا نئی دہلی میں افتتاح کیا۔

پروفیسر لکشمن ولیش پانڈے اور پروفیسر کملاکر سونٹکے کے ہمراہ گورنر مہاراشٹر ڈاشنکر دیال شرما نے بھی رقص میں حصہ لیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر۔

ساؤتھ سنٹرل زونل کلچرل سنٹر کی جانب سے منعقدہ ڈرل۔
سنٹر کی جانب سے منعقدہ ماہی گیروں کا لوک ناچ۔
۔ اور کنڑنالی لوک رقص۔

ہمارا پرچم عزمِ مصمم کا اعلیٰ نشان

گورنر مہاراشٹر کا پیغام

مجھے انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ میں مہاراشٹر کے عوام کو یومِ جمہوریہ کی ۳۷ ویں سالگرہ کے موقع پر مبارکباد دے رہا ہوں۔

آج کا دن اپنے آپ کو جمہوریت کی بقا کے لیئے وقف کر دینے کا دن ہے۔ کئی سال پہلے آج ہی کے دن ہم نے آزادئ ہند کا عہد کیا تھا۔ پھر اسی دن آزادی کے حصول کے بعد دستورِ ہند کو ہم نے اپنا لائحۂ عمل مانا۔ اسی دستور کے تحت ہم نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی آزادی کو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیں گے۔ اظہارِ خیالات کی آزادی، عقیدہ، مساوات اور ملک کی سالمیت کو ہر صورت میں برقرار رکھیں گے۔

گذشتہ ۳۷ برسوں میں مہاراشٹر نے مختلف میدانوں میں بے پناہ ترقی کی ہے۔ تاہم آج ہمارا دل بہت دکھی ہے۔ مہاراشٹر کی ایک بڑی آبادی اس وقت سخت ترین خشک سالی کا شکار بنی ہوئی ہے مجھے ان متاثرہ دیہاتوں میں سے چند ایک کا دورہ کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ اور ان کے کابینی رفقاء متاثرہ علاقوں کا مسلسل دورہ کر رہے ہیں تاکہ نقصانات کا صحیح اندازہ لگائیں اور راحت رسانی کے کاموں کو فوری طور پر انجام دینے کے احکامات صادر فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ مہاراشٹر کے عوام سابقہ روایت کے مطابق اس بار بھی ان مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں حکومت کو بھرپور تعاون پیش کریں گے اور متاثرہ افراد کی ہر قسم سے مدد کریں گے۔

آج ہمارا ملک نہایت مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ آج چند تفرقہ پسند طاقتیں ہماری جمہوریت اور سالمیت کے لیئے خطرہ بن کر کھڑی ہوئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مہاراشٹر کے عوام اُن قوم دشمن طاقتوں کا منہ توڑ جواب دیں گے۔

آج ہم اپنے اِس پرچم کو سلامی دیتے ہیں۔ یہ وہی پرچم ہے جو ہمارے عزمِ مصمم کا اعلیٰ نشان ہے۔ یہ وہی پرچم ہے جو ہمیں ہماری منزلِ مقصود پر متحد ہو کر پیش قدمی کرنے کے ہمارے عہد کی یاد دلا رہا ہے۔ ہماری منزلِ مقصود ہے تمام لوگوں کے لیئے بلا تفریق مذہب و ملت، ذات پات امن۔ ترقی اور خوش حالی۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما

گورنر مہاراشٹر

ڈاکٹر راجندر پرشاد
نمائندہ اسمبلی کے
صدر جو جمہوریۂ ہند
کے دستاویزی دستور
پر اپنی اختتامی دستخط
ثبت کر رہے ہیں

۲۶ر جنوری کی نمایاں خصوصیت

جدید ہندوستان کی حالیہ تاریخ میں کیلنڈر کی وہ کون سی
یخ ہے جو انقلابی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے اور جو ایک دور کے
ز کی علامت ہے؟

میرے خیال میں اس سوال کے جواب میں رائیں شدید طور پر
ہیں گی۔ بہت سے شہری ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ترجیح دیں گے جس
بنگ آزادی کی قومی داستان کامیابی سے دوچار ہوئی اور ہندوستان
یاسی طور پر آزاد ہوا اس دن محبان وطن کی کئی نسلوں کا وہ خواب
ھوں نے دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر ہوا چنانچہ پورا ملک لفظاً و معناً
جہد کی کامیابی کے نادر احساس سے سرشار اور مسرور تھا۔ دوسری
بہت سے شہری ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کے حق میں ہونگے کیونکہ اسی
وہ دستور جسے اہل ہند نے ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو اختیار کرنے کے
انونی شکل میں اپنے لئے پسند کیا تھا عمل میں آیا۔ دستور ہند
سیاسی آزادی کو اس کی معاشی اور سماجی مشمولات عطا کی اور اس
ے اسے انقلابی مفہوم، مقصد اور قوت سے نوازا۔

پنے طور پر میں ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو اس دن کی حیثیت سے مانتا
ہوں جس دن ہندوستان کی تاریخ میں نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ یہی
وہ تاریخ ہے جب جدید ہندوستان کی خود آگاہی کا نیا باب شروع ہوا
اور اسی کے ساتھ سماجی، اور معاشی برابری کا آغاز ہوا اور اسی
کے ساتھ اس نے ایک سیکولر، عوامی بہبودی کی حامی ریاست کے
مثالی مقصد کے ساتھ قدم آگے بڑھایا۔

نمائندہ اسمبلی کا پہلا اجلاس ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوا تھا جس نے
یہ فیصلہ کیا کہ یہی ہندوستان کی نمائندہ اسمبلی ہوگی۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء
کی آدھی رات کے بعد آزاد ہندوستان کی اعلیٰ اقتدار رکھنے والی
نمائندہ اسمبلی کی حیثیت سے اس کا اجلاس دوبارہ ہوا۔ اور ۲۲ر جنوری
۱۹۴۷ء کو اس نے وہ تاریخی حقیقت پسندانہ تجویز منظور کی جسے وزیر اعظم
نے اس کے روبرو پیش کیا تھا اس اجلاس نے دستور مذکور کے وسیع اصولوں
پر غور کیا اور جسے منظوری کے لئے پیش کیا گیا جس کے خد و خال، موٹی
موٹی خوبیاں اور خاکے اسمبلی کی مختلف کمیٹیوں نے بیان کئے تھے۔
تب ایک ڈرافٹنگ (مسودہ نویس) کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جس
نے مسودۂ دستور کو فروری ۱۹۴۸ء میں شائع کیا۔ ۴ر نومبر ۱۹۴۸ء کو مذکورہ

قومی راج •

اولین صدر جمہوریہ
ڈاکٹر راجندر پرساد
جلوس کی شکل میں
لے جائے جا رہے ہیں۔

مسودہ نمائندہ اسمبلی کے روبرو پیش کیا گیا اس کے بعد اس کی پہلی اور دوسری خواندگی ۱۵ر نومبر ۱۹۴۸ء اور ۱۷ر نومبر ۱۹۴۹ء کے درمیان عمل میں آئی۔ اس مسودہ کی تیسری خواندگی کے لئے اسمبلی کا اجلاس پھر ۱۴ نومبر ۱۹۴۹ء کو ہوا اور ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو دستور منظور ہوا۔ اس پر اسمبلی کے صدر کی دستخط ہوئی اور اس کی منظوری کا اعلان کر دیا گیا۔

❋❋

(مضمون ہذا پرنسپل ڈی کے، ٹوپے کی تصنیف "ہندوستان کا دستور" پر جسٹس پی بی گجندر گڈکر کی تمہید کا ماخوذ ہے)

نوٹ:۔ ۱۰ر جنوری کے شمارے میں کتابت کی بعض غلطیوں کے لئے ہم قارئین سے معذرت چاہتے ہیں۔ (ادارہ)

قطعہ

۲۶ر جنوری

رقصاں ہے سارے ملک میں ہر سمت روشنی
جمہوریت کا جشن ہے چھبیس جنوری

آؤ پھر آج کھائیں قسم اہلیانِ ملک
اِک راہ پر چلیں گے ہم باہم خوشی خوشی

محمد اسمٰعیل ارمان جالنوی
معرفت اورنگ آباد سلک شوروم، اسٹیشن روڈ،
اورنگ آباد (مہاراشٹر) ۴۳۱۰۰۵

"قومی یکجہتی" ریاست مہاراشٹر کا لائحہ عمل

ہمیں اپنی تمام تر قوتیں، ملک کی عظمت کو برقرار رکھنے کیلئے قومی یکجہتی پر صرف کرنی چاہئیں۔

وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان

"قومی یکجہتی آج ملک کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اختلافات کے باوجود اتحاد یہی ہماری تہذیب کا خاصہ ہے۔ تمام فرقوں کا باہمی مفاد کی خاطر ایک دوسرے میں ضم ہو جانا ہی، قومی یکجہتی سے معنون ہے۔" "پرچار کے ذرائع اور اقدامات کیا ہونے چاہئیں" "روحانیت کے فروغ سے قومی یکجہتی کو تقویت حاصل ہوتی ہے"۔ "غیر سماجی اور تفرقہ پرور ذہنیت کی طرف سے ہمیں کس طرح چوکنا رہنے کی ضرورت ہے" وغیرہ وہ مختلف موضوعات ہیں جن پر وزیر اعلیٰ ریاست مہاراشٹر شری شنکر راؤ چوان نے اپنی اس ملاقات میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

قومی راج کے لئے وزیر اعلیٰ سے یہ خصوصی ملاقات شری وِدّا کر گندھے کی ہے۔

ریاست مہاراشٹر کے عوام کا قومی یکجہتی پر سو فیصد اعتماد

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان سے آزادانہ ملاقات

فی زمانہ فرقہ پرست اور غیر سماجی عناصر نے ملک بھر میں تشدد اور شر انگیزیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے، جس سے قومی یکجہتی کو نقصان پہنچنے کا شدید اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

ایک زمین، ایک ملک، ایک زبان، ایک نشان اور ایک جماعت، ایک سماج، انھیں باتوں پر قومیت کا انحصار ہے۔ آج کچھ نام نہاد طاقتیں اسی قومیت کو للکار رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قومی یگانگت اور فرقہ وارانہ خلوص کو آواز دینے کی ضرورت محسوس کی جاری ہے اور اسی کے تحت "ہم" مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان کے قومی یگانگت کے بارے میں تاثرات جاننے کی غرض سے ان کے بنگلہ "ورشا" پر پہنچا۔ وہ ۱۱ر جنوری ۱۹۸۷ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ اس ملاقات کے لیے ہم اپنے ناظم اعلیٰ شری پرمود ملتے اور ڈائریکٹوریٹ برائے

رابطۂ عامہ کے افسر شری شاہد اکبر کے مخلصانہ تعاون کے بھی مشکور ہیں۔ ذہن میں سوالات ترتیب دیئے جا چکے تھے۔ ٹھیک ۱۱ بجکر ۵ امنٹ پر وزیر اعلیٰ نے باریابی کی اجازت دی۔ ان کے چہرے پر مسرت اور تازگی تھی۔ دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہوا اور فوراً خیالات کا تبادلہ شروع ہو گیا۔

- "قومی یکجہتی" آج ایک بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، "کثرت میں وحدت ہی ہماری تہذیب کا مایۂ ناز سرمایہ ہے" آپ کی دانست میں قومی یکجہتی سے کیا مراد ہے؟

(میرے اس سوال کا وزیر اعلیٰ نے بڑے واضح انداز میں جواب دیا)

★ قومی یکجہتی کا سیدھا مطلب ہے کہ ہمارے ملک میں جتنی ریاستیں ہیں، جتنی زبانیں ہیں، جتنے لباس ہیں ان سب میں چاہے جس قدر فرق ہو، ان سب کو جوڑنے والی ہماری اپنی ایک بنیادی تہذیب ہے اور اسی بنا پر قومی یکجہتی کا یہ مفہوم ہوا کہ تفرقات کے باوجود ساری باتوں کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ہم سبھی کے مفاد کے لیئے جو کام کر سکتے ہیں کریں۔

- بھارت میں قومی یکجہتی کی جڑیں بہت گہرائی تک گئی ہیں وزیر اعلیٰ شری چوان نے بھارت کے وزیر برائے امور داخلہ کے فرائض بے حد خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے ہیں اس لیئے لازمی طور پر ان کی دور رس نگاہ نے سبھی ریاستوں کا احاطہ کیا ہے اسی بات کے پیش نظر میں نے ان سے سوال کیا۔

"اپنے تجربات کی بنیاد پر بتایئے کہ کیا بھارت میں قومی یکجہتی کے بیج بو دیئے گئے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا:

★ سارے بھارت میں قومی یکجہتی کی جڑیں یقیناً بڑی گہرائی تک گئی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے کہ کچھ مسائل ہیں جن کا کچھ غیر طبقے یا قومیں یہاں کے لوگوں کو اپنا مطیع یا ہمنوا بنا کر فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہماری قومی یکجہتی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں میں مختلف باتوں کے تعلق سے بے اطمینانی کس طرح پیدا کی جائے، ایسی کوششیں برابر کی جا رہی ہیں اور دل میں یہ شک بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بنا پر قومی یکجہتی کو کسی وقت نقصان بھی ہو سکتا ہے اور اسی لیئے اپنے تمام مسائل ہمیں لازمی طور پر قومی یکجہتی کی مدد سے ہی حل کرنے چاہئیں۔

- "فرقہ وارانہ اور نظریاتی فسادات کو عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے کیا؟ یا بالعموم یہ سیاسی اور تفرقہ پرور عناصر کے پیدا کردہ ہوتے ہیں؟ آپ کے خیال میں یہ فسادات کہاں جنم لیتے ہیں؟"

میرے ان سوالات پر "وزیر اعلیٰ" نے کہا:

★ فرقہ وارانہ نوعیت کے جو فتنہ و فساد رونما ہوتے ہیں اگر ہم ان کی تہہ میں جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان فسادات میں عوام کا قطعی کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ سماج میں غنڈہ گردی کے حامل غیر سماجی اور سماج دشمن قسم کے جو عناصر ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے خاص ماحول پیدا کر کے عام لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ لوگوں پر ایک قسم کی دہشت طاری کی جائے تاکہ خوف زدہ ہونے پر ان کی طرف سے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا جا سکے۔ وہ لوگ مختلف فرقوں میں حاسدانہ جذبات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تہہ میں غالباً کچھ فرقہ وارانہ ذہنیت کے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کی حرکتیں پہلے بھی کیا کرتے تھے، ایسا نہیں ہے۔ پہلے یہ جذبہ عموماً غیر شعوری طور پر ہوتا تھا۔ بے باکانہ کچھ کہنے، کچھ کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوتا تھا لیکن اب یوں لگتا ہے کہ ان میں کچھ جسارت پیدا ہو گئی ہے اب وہ کھلے بندوں کچھ بھی کرنے کے لیئے تیار ہو جاتے ہیں اور یہاں یہ شبہ بھی یقیناً پیدا ہوتا ہے کہ ان کے پشت پناہ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ سماج میں تفرقہ پیدا ہو اور ملک کے نظام میں انتشار وقوع پذیر ہو۔ لیکن ایک عام انسان کو ایسی باتوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ ایسی باتوں کا حامی بالکل نہیں ہوتا۔ طمانچہ کا جواب طمانچہ نہیں ہو سکتا!!

• بعد ازاں میں نے وزیر اعلیٰ سے دریافت کیا کہ اُن کے نقطۂ نظر سے پورے ملک میں مہاراشٹر کی تصویر کیسی ہونی چاہیے؟ مہاراشٹر میں دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں صبر و تحمل، فرقہ وارانہ خلوص و محبت اور باہمی یگانگت بڑے پیمانے پر دکھائی دیتی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

وزیر اعلیٰ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

★ دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں مہاراشٹر میں صبر و تحمل کا جذبہ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ مہاراشٹر کے آج سے پہلے کے دور میں اس طرح کے قومی فسادات شاید ہی دیکھنے کو ملتے ہیں اور اگر ان دنوں فساد ہوئے بھی تو انتہائی مختصر وقت کے لیے محض دو ایک دن ہی میں ختم ہو جاتے تھے لیکن آج فسادات کی کیفیت بالکل برعکس ہے۔ کچھ لوگ فسادات کی آگ کو برابر ہوا دیتے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ حاسدانہ اور مفسدانہ ماحول بڑے پیمانہ پر پیدا کیا جائے۔ جواز کی بات کریں تو مختلف لایعنی جواز پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک مخصوص فرقہ، دوسرے فرقہ پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے اور اسی کے ردِ عمل کی صورت میں وہ فساد کرتا، کرواتا ہے مگر یہ ظاہری صورت ہے، اس کی تہ میں اصلیت یہ ہوتی ہے کہ فساد میں ملوث ہر دو فریق وہ تمام حربے استعمال میں لاتے ہیں، جن کے نتیجہ میں پورے ملک کا امن ریاست مہاراشٹر کا امن برباد ہو کر رہ جائے۔ ایک فریق اگر کوئی غلط حرکت کرتا ہے تو دوسرے فریق کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اُسے بھی ویسی ہی غلط حرکت کرنی چاہیے۔ یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے بلکہ ہر برائی کا جواب اچھائی سے دیا جانا چاہیے۔ فی زمانہ بھلائی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے لوگوں کا اچھے برتاؤ پر عمل کرنے سے دن بہ دن اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ ان کے مطابق "اینٹ کا جواب پتھر سے" آخر یہ قدیم فلسفہ کس دن کے لئے ہے! لیکن سماج میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اس فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے۔ عام لوگ حملہ آوروں کی طرح بے ساختہ میدان میں نہیں کود پڑتے بعض لوگ غریب ہوتے ہیں لہٰذا اس امکانی پہلو سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض سیاستدان اُن کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

• قومی یکجہتی

ریاستِ مہاراشٹر کا لائحۂ عمل:

مندرجہ بالا مسئلہ کے تعلق سے ریاست مہاراشٹر کا لائحۂ عمل کیا ہے؟"

★ میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے فرمایا:

ریاستِ مہاراشٹر کے لائحۂ عمل کی بات کریں تو اس مسئلہ کی بنیاد میں جتنی باتیں آتی ہیں ان کو رفتہ رفتہ عمل میں لایا جانا چاہیے۔ مراد یہ کہ لوگوں کے دل میں اس بنیادی مسئلہ سے متعلق کسی طرح کی غلط فہمیاں اور غلط اندیشے باقی نہیں رہنے چاہئیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہمارے امکان میں ہوتا ہے وہ ہم کرتے ہیں اور اس کے بعد ان مسائل کے حل کے دوران بھی اگر بعض لوگ فرقہ وارانہ ذہنیت کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہوں تو ان کے معاملہ میں سخت تادیبی کارروائیاں کی جانی چاہئیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں کرتا کہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر کسی کے پیچھے پڑنے سے یہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

یکجہتی کے بنیادی نظریات پر محکم یقین کی ضرورت ہے:

• پھر میں نے یکجہتی کے فروغ اور پرچار سے متعلق سوال کیا:

کیا دوردرشن، آکاشوانی اور اخبارات یہ ذمہ داری دیانت داری اور باقاعدگی سے انجام دیتے ہیں؟

انھیں اس معاملے میں، کن صورتوں میں تعاون کرنا چاہیئے اس سلسلے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

اس سوال پر وزیر اعلیٰ نے کہا:

★ دوردرشن اور آکاش وانی کے تعلق سے کچھ اختلافی اور بحث طلب مثالوں کو اس طرح نظر انداز کر دیا جائے جیسے کچھ ہونے کا امکان ہی نہیں کیونکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو باقاعدہ نبھاتے ہی ہیں، لیکن اخباروں سے جو ہماری توقعات ہیں، ان سے سماج ہیں، ان چیزوں کو روکا جا سکے گا، اس نظریے کے تحت میں سمجھتا ہوں کہ اخبار کو ایک کارآمد ذریعہ کی شکل میں استعمال کیا جانا چاہیے لیکن اس کے برخلاف، بعض اوقات بڑے اخبار اس بات کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ دیکھ کر مجھے بیحد افسوس ہوتا ہے عوام اخبار کو ترویج اور پرچار کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آپ لوگ جو کچھ لکھتے ہیں اس سے لوگوں کی توقع ہوتی ہے کہ آپ انھیں اچھائی اور بہتری کی بات بتائیں گے۔ اس کے برخلاف، اگر کوئی اخبار لوگوں کے قومی اور مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کا کام کرتا ہو تو میری رائے میں، ان کے اپنے رہنمائی کے جو اصول اور طریقے ہیں وہ گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی ان اصولوں اور طریقوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں نے یہ توقع کی تھی کہ پریس کونسل کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے اور انھیں بھی Code of Conduct پر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر انھوں نے اس کے مطابق عمل نہ کرنے کا رویہ اختیار کیا اور حکومت نے ان کے خلاف سخت اقدامات کیے تو پھر کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ ہماری آزادی پر شدید ضرب پڑنے لگی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دو تین بار اخبار والوں سے میں نے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اوپر کچھ پابندیاں عاید کر لیں اور بندشیں اختیار کریں تاکہ ان سے ہمیں مناسب اور بامقصد تعاون کی جو توقعات ہیں ان پر وہ پورے اتریں۔ ہمیں اس بات پر بھی اعتراض نہیں کہ وہ ہم پر کڑی تنقید کرتے ہیں وہ آئینی باتوں پر ضرور تنقید کریں۔ لیکن اس ملک کے اتحاد کے نقطۂ نظر سے جو بنیادی باتیں ہیں، ان میں بھی اگر غیر عقیدت مندی کا ماحول انھوں نے پیدا کیا تو میں یہ نہیں سمجھوں گا کہ وہ ان کی معاونت کے اصولوں کے مطابق ہیں وہ اپنے اپنے طور پر اپنا جائزہ لیں اور جو پابندیاں ان پر عاید ہیں انھیں بھی نباہنے کی کوشش کریں۔ "اپنی ذات اور اپنا مفاد" اس نظریہ کا ہمیں شکار نہیں ہونا چاہیئے۔

- **بدعنوانی، بیروزگاری اور اُن کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالی مایوسی اور غلط منصوبے، تفرقہ پرور طاقتوں کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اِس خطرہ کے سدّباب کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟**

★ ہمارے یہاں بے کاری، بے روزگاری بھی ہے، بدعنوانیوں اور جرائم کا بھی زور ہے۔ حالانکہ یہ باتیں صحیح ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے نتیجہ میں ملک میں پھوٹ پیدا ہو، قوموں میں نفاق اور بڑھے اور بڑھے۔ اس تعلق سے ہمارا صحیح قدم تو یہ ہونا چاہیئے کہ ہم سب مل کر یہ سوچیں کہ ہم پیداوار کے تمام شعبوں میں، پیداوار کو کس طرح فروغ دیں اور سب کا حصہ کن مناسب طریقوں سے سب تک پہنچائیں۔

ہماری سوچ کا یہ انداز کہ: "مجھے اپنے نفع نقصان سے مطلب، ملک کے نفع نقصان اور بھلے بُرے کے لیئے میں کیوں مروں، یہ میری ذمہ داری نہیں ہے"

انتہائی غلط انداز ہے۔ ہمیں یہ اندازِ فکر بظاہر خوش
کن معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم قومی مفاد کے نقطۂ
نظر سے غور کرتے ہیں تو فکر کا وہ انداز قومی مفاد پر
ایک ضربِ کاری نظر آنے لگتا ہے۔ میری نظر میں
یہ اندازِ فکر نہایت غلط ہے۔ یہ ہے تو بے کاری
بھی ہوگی۔ بدحالی بھی ہوگی، بدعنوانی اور جرائم بھی ہونگے
جہاں یہ باتیں ہوں گی وہاں ہم دعویٰ کس طرح کر سکیں
گے کہ ہمارے ملک کے نظام اور ہمارے نظامِ حیات
میں یہ ساری خرابیاں اور خامیاں نہیں ہیں۔ اسلئے
مختلف خوش آیند اور خوش انجام طریقوں سے یہ مسائل
ہمیں حتی الامکان حل کرتے جانا ہیں۔ اگر ممکن ہو تو انھیں
ختم ہی کر دینے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ حالانکہ یہ بھی ممکن
ہے کہ ردِّ عمل کی شکل میں یہ برائیاں اور زیادہ بڑھیں کیونکہ
تفرقہ پرور قوتیں جب بھی سر اٹھاتی ہیں تب ملک کی تقدیر
اور اس کے تحفظ و سلامتی اور اس کی حیات کا احساس ہے
ان کے اندر مر جاتا ہے اور یہ چاہنے لگتے ہیں کہ ملک اور ملک
کے نظام میں زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا ہو۔ ملک کے
حالات میں زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوں۔ اسی طرح انھیں
فائدہ اٹھانے کے ہمہ جہتی مواقع فراہم ہوتے ہیں لیکن
عام اور غریب لوگوں کو اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے وہی تباہی
کے آسیب کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں اور یہ تصور تبھی ٹوٹ
سکتا ہے جب ملک میں مکمل امن ہو۔ ترقی کے بہتر منصوبے
بہتر ڈھنگ سے عمل میں لائے جائیں اور نیک نیتی کے
ساتھ ملک کی ترقی اور فروغ کے لیے، ملک کا حکومت
کا اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ یہی ہماری بہتری کا
راستہ ہے۔ اگر اس راستہ سے ہٹ کر ہمیں کوئی
سیدھی پگڈنڈی بھی ڈھونڈنا چاہیں گے تو نہیں ملے گی۔

روحانیت
قومی یکجہتی کو تقویت بخشتی ہے

ہمارے وزیر اعلیٰ مرزا صاحب روحانیت میں گہری عقیدت
رکھتے ہیں، اس ملک کو صوفیوں، سنتوں اور مختلف
مذہبی مقدس کتابوں نے سیکڑوں برس سے بھائی چارے
کی تعلیمات دی ہیں۔ میں نے ان سے سوال کیا:

○ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ قومی یکجہتی میں روحانیت
سے بھرپور مدد مل سکتی ہے؟

★ (میرے اس جداگانہ سوال پر وزیر اعلیٰ کے چہرہ پر ایک
خوشی کی جھلک نظر آنے لگی۔ میرا سوال پورا ہونے سے
پہلے ہی وہ جواب دینے لگے)۔

یقیناً! روحانیت اور روحانی روایات کا قومی یکجہتی
کے معاملہ میں بڑے پیمانے پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔
جو لوگ روحانیت میں یقین رکھتے ہیں اور جو واضح
پر مزاج سے مذہبی ہوتے ہیں، وہ فرقہ پرستی کی بات
سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہماری اپنی مذہبی تعلیمات ہی ایسی
ہیں کہ ہم میں اور ہماری ذات میں مکمل صبر و تحمل کا جذبہ
اور دل میں شدید قوت برداشت ہو۔ ہماری تہذیب
یہ ایک اعلیٰ خصوصیت مانی جاتی ہے کہ بیرون ملک سے
جس قدر مختلف طاقتیں آئیں، ہم نے ان سب کو اپنے
سمو لیا، اور جو کچھ بھی اچھا تھا اسے اپنی ذات میں مدغم کر لیا
اور جو کچھ غلط اور بیجا تھا اسے چھوڑ دیا۔ اپنے خیالات
میں ان کے متعلق کبھی مفسدانہ رجحان پیدا ہونے نہیں
دیا۔ سبھی کے خیالات اور نظریات کو ہم نے ٹھنڈے دل
سے ذہن نشین کیا۔ جہاں جو کچھ اچھا ہے، اسے قبول
کر لینا بھی ہماری تہذیب کا خاصہ ہے۔ اور اسی لیے
وہ تمام اعلیٰ خیالات، موثر اور مختلف انداز میں ہمیں دوسروں
تک پہنچانے چاہئیں۔ اتحاد اور بھائی چارہ کے
اس بنیادی نظریہ کو ہمیں اپنا مسلک ماننا چاہیئے۔ انھیں
نظریات کی روشنی میں اگر ہم اپنے مسائل پر نظر ڈالیں
تو میرا یقین ہے کہ ہمارے بیشتر مسائل بہ آسانی حل
جائیں۔ کسی بھی مذہب کی تعلیمات اس حقیقت سے
انکار نہیں کرتی لیکن بعض لوگ مذہب کو انتہائی
تنگ نظری سے دیکھتے ہیں۔ مذہبی تعلیمات کو غلط رنگ
دے کر کچھ غلط باتوں کی تشہیر کرتے ہیں، وہ اپنے
لوگوں تک پہنچنے تک کی کبھی کوشش تک نہیں کرتے
روحانیت کی اعلیٰ قدروں کو ہم لوگوں تک پہنچانے
کی کوشش کریں تو میں دعویٰ کرتا ہوں، تو قومی یکجہتی

کے معاملہ میں یہ بات انتہائی فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔
(اس کے بعد میں نے سوال کیا۔)

- کیا گیا نیشور یونیورسٹی، ریاستِ مہاراشٹر کا اس سلسلہ میں کوئی منصوبہ ہے جس کے تحت تمام مذاہب کا مطالعہ باہمی موازنہ کی شکل میں کیا جائے؟

وزیرِ اعلیٰ نے جواب دیا:

★ اس بات کے تعلق سے حکومتِ مہاراشٹر کے کئی منصوبے ہیں۔ ان میں ایک منصوبہ یہ ہے کہ تمام مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے مقصد سے ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اسی ضمن میں سنت گیانیشور کے نام پر ایسی یونیورسٹی کے قیام کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ابھی آنی ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ کمیٹی کی رپورٹ جلد از جلد موصول ہو۔ میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام مذاہب کے تقابلی مطالعے کے بعد ایسی کتنی ہی باتیں منظرِ عام پر آئینگی جو تمام مذاہب میں یکساں اور مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف قوموں میں باہمی کشیدگی اور تصادم کا جو مسموم ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اسے بدلنے میں اس یونیورسٹی سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا جا سکے گا۔

اس کے بعد میرا آخری سوال تھا:

- **عوام کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟**

وزیرِ اعلیٰ نے جواب کی شکل میں یہ پیغام دیا:

★ "ریاستِ مہاراشٹر کے عوام قومی یکجہتی پر سو فیصدی یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے کسی بھی وقت کسی بھی طرح قوم پرست جذبات کو اور تفرقہ پرور طاقتوں کو قبول نہیں کیا ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ہم ہمیشہ اسی روش پر چلیں گے ہمیں اپنی تمام تر قوتیں ملک کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے قومی یکجہتی پر صرف کرنی چاہئیں۔ تمام اہلِ وطن کو اسی جذبہ کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنا چاہیے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ عوام میں ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہیں جو اس جذبہ کے حامل ہیں۔ کچھ لوگ ضرور بے راہ روی اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن میں قطعی ایسا نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی پریشان کن بات ہے۔"

اس کے بعد سلام عرض کر کے میں نے وزیرِ اعلیٰ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔

(ملاقاتی - دیواکر کندے)

یوم جمہوریہ کے موقع پر

وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کا پیغام

بھائیو اور بہنو

یوم جمہوریہ کی ۳۷ ویں سالگرہ کے موقع پر میں آپ لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اسی روز ۳۶ سال قبل برطانوی سامراج سے ہمارا ملک مکمل طور پر آزاد ہوگیا۔ ہم نہ صرف آزاد ہوئے بلکہ جمہوریت کا قیام عمل میں آیا، اور تمام تر اختیارات عوام کے ہاتھوں میں آگئے۔ ہم پچھلے ۳۶ سالوں سے یہ دن جوش و خروش سے مناتے چلے آرہے ہیں۔ اس روز ہم ہونے والی پچھلی تمام تر ترقیوں کا جائزہ لیتے ہیں، اور آنے والے کل کے لئے ترقیاتی پروگرام بناتے ہیں۔ ان ہی پروگرام یا پروجیکٹ کو لے کر ہمیں اپنے ملک کو طاقتور اور مستحکم بنانے کا عہد کرنا چاہیئے۔

ہمارے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے زراعت، صنعت اور سائنس کی ترقی کی بنیاد ڈالی۔ جمہوریت اور سوشلزم کو ملک میں پھیلایا اور انہی خطوط پر ہم پچھلے ۳۶ سالوں سے کاربند رہے ہیں۔ ان ترقیاتی کاموں میں ہماری ریاست نے بھی خاطر خواہ ہاتھ بٹایا ہے۔

ہماری ریاست کی ہمہ جہت ترقی ہو اس وجہ سے ہم نے ایک جامع پالیسی وضع کی ہے......

حکومت اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ تمام علاقوں میں متوازی ترقی ہو۔ زرعی، صنعتی اور دیگر شعبوں میں ترقیاتی کاموں کے لئے حکومت نے اقدامات کئے ہیں سماج میں پچھڑے طبقات اور عام آدمی کی مالی بہتری کے لئے سرکار نے کئی ترقیاتی یوجنائیں جاری کی ہیں۔

اس موقع پر میں آپ لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہماری ریاست پچھلے تین سالوں سے خشک سالی کا شکار رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام کے عملی تعاون سے ہم ان حالات کا جنگی پیمانے پر بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

بھارت کے عوام نے اپنے عظیم رہنماؤں اور مجاہدوں کی قربانیوں اور تیاگ اور کروڑوں عوام کی جدوجہد سے آزادی حاصل کی ہے۔ اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے تعصب کو دور رکھ کر باہمی دوستی اور یکجہتی قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ عام انسان کو ملے۔ اس لئے آج اس مبارک دن ہم یہ عہد کریں کہ ہم اپنے ملک کی آزادی سالمیت اور مساوات کو ہمیشہ قائم رکھیں گے۔

ایس۔ بی۔ چوان

(وزیر اعلیٰ مہاراشٹر)

قومی راج

خشک سالی راحت فنڈ

میں دِل کھول کر چندہ دیں

وزیر اعلیٰ کی اپیل

جیساکہ آپ سب جانتے ہیں کہ پچھلے تین برسوں سے مہاراشٹر کے بیشتر علاقوں میں سوکھا پڑا ہوا ہے۔ ریاست
کے تینتیس اضلاع میں سے ۲۳ اضلاع خشک سالی کا شکار رہیں۔ ۴۰،۷۶۰ موضع جات میں سے ۲۱۱۴۱ موضع جات
میں خریف کی فصل بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ وقت پر بارش کے نہ ہونے اور ناکافی بارش ہونے کی وجہ سے
فصلِ ربیع میں ۱۲ لاکھ ہیکٹر اراضی زیر کاشت نہ لائی جاسکی۔ ان تمام باتوں سے کم از کم آپ لوگوں کو اندازہ ہو سکے گا
کہ صورتِ حال کتنی سنگین ہے اور ریاستی زرعی پیداوار کی حالت کیا ہے۔
خشک سالی سے ڈیڑھ کروڑ سے بھی زائد افراد متاثر ہوئے ہیں۔ اس طرح ۳۱۳ و ۱۲ موضع جات اور ۹۴ شہری مرکز
میں بھی خشک سالی کی بناء پر فراہمیٔ آب کا خطرہ ہے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے ان پر سہ طرفہ عملدرآمد کیا جارہا ہے، اول تو زرعی مزدوروں
اور کاشت کاروں کو روزگار، دوئم پینے کے پانی کی فراہمی اور مویشیوں کے لئے چارے کی فراہمی۔
ریاستی حکومت نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کئی منصوبے تیار کئے ہیں اور ان پر
عمل آوری شروع بھی ہو چکی ہے۔ ان منصوبوں میں زرعی مزدوروں اور کاشت کاروں کو فراہمیٔ روزگار، پینے کے
پانی کی فراہمی اور مویشیوں کے لئے چارے کی تقسیم شامل ہیں۔
ریاستی حکومت نے موجودہ صورتِ حال کا پوری طرح مقابلہ کرنے کا تہیہ کیا ہے
علاوہ ازیں حکومت اس سنگین صورتِ حال کا اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان حالات پر قابو پانے کے لئے
اس موقع پر سماج کے تمام طبقات کا تعاون درکار ہے جس کے ملنے کا مجھے مکمل یقین ہے۔ خشک سالی کا مقابلہ کرنے
کے لئے مالی امداد کے علاوہ پانی کی فراہمی کے لئے ٹینکر اور فوری ضرورت کے لئے پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے
ٹینک جیسی دیگر اشیاء کی اشد ضرورت ہے۔

مہاراشٹر اور خاص کر بمبئی کے عوام ایسے حالات میں اپنی اعلیٰ روایات کے مطابق فراخدلی کے ساتھ عطیات،
دیتے آئے ہیں۔ اس لئے مزدوروں، سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین، صنعت کاروں، عوامی اداروں، عوامی سیکٹروں،
ٹرسٹوں، سماجی رضا کاروں اور سماج کے دیگر طبقات سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ شدید خشک سالی
سے متاثرہ علاقوں کا کامیابی کے ساتھ احاطہ کرنے کی غرض سے "وزیر اعلیٰ راحت فنڈ" میں فراخدلی
کے ساتھ عطیات دیں۔

(ایس۔ بی۔ چوان)
(وزیر اعلیٰ مہاراشٹر)

• خواجہ احمد عباس

پنچ میل لوگ...... پنچ میل مذہب

ہندو دھرم میں ذات پات کا مت بھید ہو لیکن دوسرے مذہبوں کی رواداری بھی ہے بات یہ ہے کہ ہندو دھرم کے شاستروں میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی گئی۔ بات چیت کی بحث مباحثہ کی جگہ رکھی گئی ہے۔ اس لئے دوسرے مذہبوں کی بھی خواہ مخواہ کاٹ نہیں کرتے۔ فراخ دلی سے بحث کرتے ہیں۔

اسی طرح بدھ مت کو انہوں نے جھٹلایا نہیں۔ بلکہ
ن کے اصولوں سے بحث مباحثہ کیا۔ جس میں کچھ باتیں
ہ مت کی ہندو دھرم میں شامل ہوگئیں۔ کچھ باتیں ہندو
رم کی بدھ مت میں شامل ہوگئیں۔

اس کے بعد زرد اشتری مت (پارسیوں کا مذہب)
۔ اس کو بھی گجرات کے راجہ نے خوش آمدید کہا۔ ممکن
ان کے پاس "سچ" ہو۔ اس خیال سے ان کو
پناہ دے دی۔

پھر جیوز (Jews) (یہودیوں) کے جہاز آئے
کو بھی پناہ مل گئی اور اپنی طرح سے عبادت کرنے کی
ازت مل گئی۔ پہلا Synagogue بھی قائم ہوگیا
آج بھی کوچین میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد عیسائی آئے۔ ان کو بھی ہندوستان
رہنے سہنے کی اجازت مل گئی۔ ان کا پہلا چرچ بھی کوچین
ہے۔ عیسائیوں سے بھی ہندوؤں نے شاستر آرتھ
بحث مباحثہ) کیا۔ اپنی بات ان کو سمجھائی۔ ان کی بات
د سمجھی۔ غرض اس طرح بعد میں گوا میں ایک بہت
بے سنت (یعنی دھارمک سنت) آئے۔ انہوں نے
کے لوگوں میں عیسائی دھرم پھیلایا۔

اس کے بعد عرب سے مسلمان آئے۔ اُن کا
مذہب توحید کا قائل تھا۔ ان کی بھی خوب خاطر مدارت
ہوئی۔ کیونکہ ان کے دھرم میں بہت سی اچھی باتیں تھیں۔
ذات پات کا جھگڑا نہیں تھا۔ سب مسلمان سوشل لحاظ
سے برابر تھے۔ ان سے بھی ہندوؤں نے بحث مباحثہ
کیا۔ ان سے بھی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ بعد
میں جب افغانستان کے بادشاہوں نے ..... جو نام
کے مسلمان تھے جن کا کام لوٹ مار تھا۔ انہوں نے
جب حملہ کیا تو سومناتھ کے مندر کو مسمار کردیا اور
مال دولت اٹھا کر لے گئے۔ ڈاکوؤں میں اور ان میں کوئی
فرق نہیں تھا۔ ! یہ فاتح نہیں تھے۔ ڈاکو اور لٹیرے تھے

بعد میں مسلمان فاتح افغانستان سے آئے، اور
پھر وسط ایشیا سے۔ ان لوگوں نے فوج کشی ضرور
کی۔ لیکن زیادہ تر پہلے جو مسلمان تھے۔ ان کے خلاف
کی۔ کوئی مندر نہیں توڑے۔ کوئی خزانے نہیں لوٹے۔
کوئی قتلِ عام نہیں کیا۔

پانی پت میں تین بڑی لڑائیاں ہوئیں —— پہلی
ابراہیم لودھی (جو پٹھان بادشاہ تھا۔) اور بابر کے درمیان
ہوئی۔ دوسری ہمایوں اور پٹھان بادشاہ کے درمیان
ہوئی۔ تیسری لڑائی مرہٹوں، ہندوستانی مسلمانوں اور
احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی تھی۔

جلگاؤں میں ۴ جنوری ۱۹۸۶ء کو "افرانیشنل کمیٹی" کے تعلیمی منصوبوں کی امداد کے لئے "کلیان جی آنند جی نائٹ" کلچرل پروگرام منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح وزیر مملکت برائے امور داخلہ شری جے۔ بی۔ مہاجن نے کیا۔ انہیں کے ہاتھ سے سووینیر کا بھی اجرا ہوا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار تقریر کر رہے ہیں اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں شری انا صاحب پوار، شری جے۔ بی۔ مہاجن، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، شری بھنور لال جین، شری اشوک جین، شری شوکت سرکار، شری کشمیر اسنگھ اور ایم۔ ایل۔ اے۔ شری سُریش جین نظر آرہے ہیں۔

غرض مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ بات یہ ہے کہ فارسی زبان، اور مسلم کلچر ہندوستان میں عام طور سے رائج تھا۔ مسلمان معاشرت ہندوستانی رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ مسلمان مزارع مہینوں کے نام ہندو طریقے سے لیتے تھے۔ موسموں کے نام بھی ہندوستانی ہی تھے۔ اس طرح رواداری کے ذریعے ایک ملی جلی ثقافت جنم لے رہی تھی ....

اِس طرح پنچ میل کلچر نے جنم لیا۔
اس طرح اِس سرزمین کو پنچ میل گلستاں مِل گیا۔
قومی یک جہتی نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی۔

صُوفیوں نے اس میں ہاتھ بٹایا۔
بھکتی پنت کے نام لیواؤں نے ہندوؤں کی طرف سے ان کا ہاتھ بٹایا۔
سِکھ دَھرم نے اس ملاپ سے جنم لیا۔
قومی یک جہتی کا بول بالا ہوا۔
اب قومی یک جہتی کو کیا ہوا ؟
سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان کیوں بھید بھاؤ ہے
پنجاب میں یہ قتلِ عام کیوں ہو رہا ہے ؟
ہماری قومی یکجہتی کو کیا ہوا ہے۔ ؟

★★

★ ڈاکٹر شری کانت جیچکار
وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن،
اطلاعات و رابطۂ عامہ، انرجی، مالیات اور میزبانی

قومی یکجہتی

اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے جس پر سب سیاسی پارٹیوں کا اتفاق ہے تو وہ قومی یکجہتی ہے۔ یہ بات ہمارے روزمرّہ کے مشاہدات میں سے ہے لیکن حیرت ہے کہ ہم قومی یکجہتی پر بحث ایک دوسرے پر اعتماد نہ رکھتے ہوئے بھی کر رہے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی کو معلوم ہو کہ قومی یکجہتی کا دروازہ کھولنے کے لئے کون سی چابی ضروری ہے لیکن دوسرے اُسے منظور کرنے سے انکار کرتے ہوں۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ قومی یکجہتی کی جانی مانی شکل بلکہ بنیاد تلاش کریں اور پھر غیر منطقی خیالات اور نقصان پہنچانے والے عقیدوں کو ترک کر کے آگے پیش قدمی کریں۔

یکجہتی کی بہترین تمثیل قدرتی مناظر ہیں۔ آلودگی، جنگلات کی ویرانی وغیرہ ان میں یکجہتی کی عدم موجودگی کے سبب پیش آتی ہیں۔ یعنی قدرتی عناصر میں توازن کا نہ ہونا، اس کا اصل سبب ہے۔

یہ بات انسانی طبیعت پر بھی صادق آتی ہے۔ بعضوں کی کچھ دوسروں پر برتری کو معاشی فلاسفی سے تعبیر کیا گیا تھا۔ جسے بعد میں جنگل کا قانون بتلایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگل کا قانون یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔ لیکن اِسے آسانی سے بھلا دیا جاتا ہے۔

فرق صرف عقل کی کمی بیشی کا ہے۔ اگرچہ نوع کے لحاظ سے سب ایک ہیں۔ یہ سادہ سی بات، چھوٹاپن اور بڑاپن، کی قصیدہ خوانی میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اگر مذہبوں کے ابتدائی زمانوں پر نظر ڈالیں، تو تعلیم یہ دی گئی تھی کہ خدا سب سے بڑا ہے، اور ہم سب اس کی اولاد ہیں اور درجے میں سب برابر ہیں۔ کسی مذہب نے اپنے ماننے والوں کو آپس میں نابرابر ہونے کی تعلیم نہیں دی۔ اس

کے برخلاف مذہبی بزرگوں نے لگاتار ایسے لوگوں کی مذمت
کی ہے جنہوں نے کبھی اور کہیں بھی زندگی کے کسی مرحلے میں
نابرابری پر عمل کیا۔

انسانی عقلمندی تاریخ کی روشنی میں :

توجہ کے ساتھ انسانی عقلمندی کے مطالعہ سے
جس کی روانی ابتدائے تہذیب سے جاری ہے۔ یہ بات
واضح ہوتی ہے کہ برابری کے اصول پر یکجہتی کا سلسلہ ہمیشہ قائم
رہا ہے۔ انقلاب فرانس نے سب سے زیادہ زور اسی
بات پر دیا تھا کہ انسان ہونے کے ناطے، درجے میں سب برابر
ہیں پھر جمہوری زندگی میں نابرابری کیوں برتی جاتی ہے۔ عوام
اور خواص کی یہ جنگ فرانس میں تقریباً ایک سو سال تک
جاری تھی۔ برابری کے ساتھ نظم وضبط کو ایک دوسرے سے
جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بہترین مثال خود انسان کا خاندان
ہے۔ ہم نے قبائلی طرز پر جنسی زندگی گزارنے کے بعد اس تہذیب
کے دور میں قدم رکھا ہے جس میں ایک مرد۔ ایک عورت
کے ساتھ خاندانی گروہ ہوا کرتا ہے۔ یہ گروہ پوری طرح یکجہتی
پر عمل کرتا ہے۔ اختیار کے طور طریقے سے خاندان کے تمام
لوگ واقف ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں موجودہ انتظام کاری
کا درس ملتا ہے۔ خاندان کے سب ارکان ذمہ داریوں،
اختیارات اور فرائض کو جانتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ
یکجہتی کے ساتھ زندگی گزارنے کی قدرتی شکل خاندان ہے
اسی طرح ایک وسیع شکل سماج اور سماجی زندگی ہے۔ جس
بات کو خاندان میں یکجہتی کے نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں وہی
بات سماجی زندگی کے سلسلے میں ہماری نگاہوں سے اوجھل
ہو جاتی ہے۔ اصل سوال یہی ہے کہ جس کی چھان بین
تفصیل کے ساتھ ضروری ہے۔

آزادی اور پابندی

لفظ برابری کے ساتھ لفظ آزادی کا ایسا جوڑ ہے کہ
ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کے
بھائی چارہ یا آپس کے میل جول سے سماج بنتا ہے۔ 9
افراد کے انہیں دونوں حقوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرے
لفظوں میں، برابری اور آزادی سماج میں انسان کے ایسے
دو پہلو ہیں جنہیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا
بدقسمتی سے آزادی کا غلط استعمال کیا جانے لگا، اور
اسے دوسروں کی توہین کرنے، زخم پہنچانے اور نقصان دینے
کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ یہ بات خلافِ اصول اور خلافِ امید
کی جانے لگی۔

نوعِ انساں میں آزادئ زندگی، ایک خاص پہلو
رکھتا ہے۔ زبان باہمی رابطہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا اظہار
لکھ کر اور بات کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ جانور اس کا
فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔ اس لئے ان کی زندگی کا طور
طریقہ تبدیل نہیں ہوا۔ اپنے طور طریقوں کو زبان کے ذریعے
ادا کرنے کی صلاحیت بنی نوعِ انسان کی ترقی کا وہ امتیازی
پہلو ہے جس کا اظہار خاندان میں نیز سماج میں بھی ظہور میں
آتا ہے۔

میرے خیال میں فلسفہ کے اس زمرے سے ہمارا رابطہ
ٹوٹ گیا ہے۔ گفتگو میں اور تحریر میں آزادی کا غلط استعمال
جمہوری خیال کے بھیس میں برداشت کیا جاتا رہا۔ زبان کے
لہجے میں کچھ تیزی اور چبھن پیدا ہوئی تو اسے انقلابی پیغام کا نام
دیا گیا۔ آزادی کو قانونی نگاہ سے دیکھنے پر، آزادی کے
لئے جنگ کرنے والوں کو مدد ملی اور وہ ایک دوسرے کے
خلاف آزادانہ تقریر میں حدود سے آگے بڑھ گئے۔ پہلے کے
قانونی اصول سماجی زندگی میں حیثیت عرفی پر کڑی نظر
رکھتے تھے۔ آج کم ترقی یافتہ ملکوں میں حیثیتِ عرفی پر کڑی
نظر رکھنا تو درکنار اس پر قانون کا کوئی گرفت کی ہی نہیں جا

کوئی بھی جلسہ یا میٹنگ بلا سکتا ہے اور ریاست۔
سربراہ کے خلاف فحش کلام استعمال کر سکتا ہے۔ وزیر اعظم
اور صدرِ مملکت کو ہر قسم کی تحریکات میں گالی دی جاتی
ہے۔ جب مورچوں میں سب سے اہم عہدیداروں کو گالی
جا سکتی ہے تو انتظامیہ کے ماتحت عہدہ دار اور منعقود

انتظامِ سارِ تحفظ کے سایہ سے بالکل محروم ٹھہرے۔

اِس طرح کی حرکت کو اگر ڈھیل دی جائے تو، نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ پہلے میٹنگوں اور مورچوں میں گالی کے الفاظ، خیالات کے اظہار کے لئے پُرجوش شکل میں ہوتے تھے۔ اس شکل نے تشدد کا روپ دھارن کر لیا ہے۔ الفاظ کا تشدد جسمانی تشدد میں تبدیل ہو چکا ہے۔ قدیم لاٹھیوں کی جگہ بارودی ہتھیاروں نے لی ہے۔

اس سلسلے میں خبروں کی اشاعت دماغوں کی تربیت کا کام انجام دیتی ہے۔ اخباری دنیا میں یہ پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوا کرتا ہے۔ مقابلہ آرائی میں مشغول اخباری دُنیا اس پھندے میں داخل ہو گئی۔ ایسی کہانیوں اور خبروں کی اشاعت نے جن میں آزادی کی حُدود سے تجاوز کیا گیا — سادہ دلی سے، آزادی کے اس بے جا استعمال کی رفتار بڑھانے میں اس طرح مُعاونت کی جیسے کہ سماجی زندگی میں وہ کوئی فلسفیانہ تصوّر ہو۔

جمہوریت اور سرمایہ داری اٹھارویں صدی عیسوی کے کارہائے نمایاں میں سے ہیں۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی آزادی سے معاشیات کے اصول نے ترکیب پائی.... مارکس اور ہربرٹ اسپنسر اسی زمانے میں تھے۔ مارکس ہی معاشیات کی تحریک کا تجزیہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ جس کی باگ دوڑ باہم ایک دوسرے کے مقابل قوتوں کے ہاتھ میں تھی۔ ٹھیک اسی وقت ہربرٹ اسپنسر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ معاشی اُمور میں تمام انسانوں کی برابری کے بجائے، اسپنسر کی دلیل یہ تھی کہ بعض لوگوں میں دوسروں کی بہ نسبت بہتر صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ مارکس نے خود اس نظریے کی تردید کی جب وہ کوآپریٹیو سوسائیٹیوں کی تشکیل پر بحث کر رہا تھا۔ عام لوگ بھی کوآپریٹیو سوسائیٹیوں میں اس قسم کی مہمات پر عمل درآمد کر سکتے ہیں۔

نابرابری کے سرچشمے:

تاہم معاشیاتی ارتقائی تاریخ میں، نابرابری، برابری کے اُصول کی جگہ لے لیتی ہے۔ اسے معاشیات کے جاننے والے عموماً آسانی سے تسلیم نہیں کیا کرتے۔ جن اسباب کی بنا پر اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی بنیاد مذہب، ذات پات، زبان، علاقہ وغیرہ ہوا کرتی ہے۔ ہمیں نسلی اختلافات کی تحقیق بھی کرنی ہے۔ مذہبوں کی مقدس کتابوں کی تشریح و ترجمہ ایسے لوگ کرنے لگے ہیں جو انہیں پڑھنے کی صلاحیت بھی بہت کم رکھتے ہیں۔

اختلافات پر زور دینا یا اڑنا، پھوٹ پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پر زور دینے سے بات شروع ہوتی ہے پھر اس میں سختی آتی ہے۔ اختلافات کا اظہار گالیوں سے ہونے لگتا ہے اور علم قانون کے غیر مہذب الفاظ برداشت کر لئے جاتے ہیں۔ پریس، ان لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی اور سنسنی مہیّا کرتا ہے۔ جو دُوسروں کو گالی دینے، اور تقریر و تحریر کی آزادی میں مداخلت کرتے ہیں۔

جمہوریت اپنی بناوٹ کے لحاظ سے برداشت کرنے کا ایک ادارہ ہے۔ جمہوری طاقت کسی دوسرے منظر کے مقابلے میں، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی طرف بہت زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اس لیے جمہوری پارٹیاں آزادیٔ تقریر و تحریر کے غلط استعمال کے لئے زرخیز زمینیں ہوا کرتی ہیں۔ جمہوری پارٹیوں کی کمزور نگاہی ان کی آگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ ہمارے بعد بھلے ہی طوفانِ نوح آئے۔

نوعِ انسانی کا ناقابلِ تنسیخ پہلو

اسی جمہوریت نے سماجی زندگی میں آزادی کی جھلک دکھلائی اور یہی میل جول کے ساتھ رہنے کی وہ پہلی سی آزادی کو نگاہوں سے دُور بھی کر رہی ہے۔ جمہوریت پسندوں کی تقریروں میں کسی کے ساتھ نیک خیالی اور کسی کے ساتھ بدخیالی کا جھکاؤ ہوتا ہے۔ جمہوریت میں قانوناً محفوظ ہونے کے خیال کے تحت دوسروں پر بے بنیاد الزامات لگانے کو،

ELIGIONS ARE ONLY
ARTS OF THE WHOLE

NATIONAL INTEGRITY

حق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خود جمہوریت پسند، جمہوری اداروں کے ڈھانچوں کو برباد کر رہے ہیں۔ سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں برابری کا مطالبہ کرنے کے بجائے ہم، نابرابری کا مطالبہ کرتے اور اس کے لئے ہلچل کرنے پر اکساتے ہیں.....

اگر جمہوریت کی دانائی ان لوگوں میں کم ہوتی جا رہی ہے جو جمہوری اداروں کے کرتا دھرتا ہیں تو عوام اپنی گھریلو زندگی کے مسئلوں میں ان کرتا دھرتاؤں کی نقط نقل کرتے ہیں. ان کرتا دھرتاؤں کے، ان بڑوں کے، طور طریقوں کا اظہار اس ہتھیار بند تصادم سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف مذہبوں، جاتیوں، زبانوں، علاقوں کے حریفوں کے درمیان دیکھنے میں آتا ہے۔

واضح طور پر ہم سب اس لئے اکٹھا ہوتے ہیں کہ قومی یکجہتی کا کوئی حل نکالیں لیکن عدم اتحاد کے اسباب کے بارے میں ہمارے خیالات خود متفق نہیں ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مضمون ہمارے جمہوریت پسندوں میں سے ان بعض لوگوں کو، جن کا ان باتوں سے تعلق ہے، قومی یکجہتی کے لئے ان زیادہ آزمودہ راہوں کو تلاش کرنے میں مدد دے سکے گا.

میں یاسیت (ناامیدی) پسند نہیں کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت کو ان سب باتوں کی معلومات ہے جو اس کے دائرے اور ماحول میں ہیں۔ قدرت ہر نابرابری کو دُرست کر دے گی۔ عدم یکجہتی کا موجودہ روپ، جسے ہم اپنی قومی زندگی میں دیکھ رہے ہیں، یقیناً اتفاق و یکجہتی سے بدل جائے گا۔ البتہ کام کے طریقے کی تشخیص کرنی ہوگی پھر علاج کی راہیں سجھائی دیں گی۔ علاج کی کچھ سوجھ بوجھ میں نے پیش کی ہے۔ بہت سے دوسرے بھی اسی طرح موجودہ صورتِ حال کی پریشان کرنے والی کیفیت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

زندگی کے تمام معاملات پر قومی یکجہتی کے نہ ہونے کا اثر نمایاں ہے۔ وہ قوتیں جو نااتفاقی پیدا کر رہی ہیں کہیں نہ کہیں شکست سے دوچار ہوں گی اور اس کے نتیجے میں سماجی عقلمندی پیدا ہوگی قومی یکجہتی پر اتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ ہمیں سماجی عقلمندی بیدار کرنے والی تاریخی موڑ کی آس کرنی پڑتی ہے۔ جہاں سماج پر سماجی عقلمندی کا سایہ پڑا تو پھر اُسے ہٹایا نہیں جا سکے گا۔ فلسفہ کا یہ اہم درس ہے ہمارے یہاں کے شادی بیاہ کے طور طریقوں میں، جمہوریت میں، ہمارے بین الاقوامی تعلقات میں ان کا علم و ادراک ضروری ہے۔ اگر یہ بات ان سماجی مناظر کے سلسلے میں صحیح ہے تو مذاہب، ذات پات، زبانوں، علاقوں وغیرہ کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ایک بار جہاں مرض پوری طرح دور ہوا، سماج قومی یکجہتی کو اس طرح اختیار کرلے گا جیسے اس نے سماج کے دوسرے بندھن اختیار کر رکھے ہیں۔

(ترجمہ:۔ عبداللہ)

مضطرب نظامی
۵/۳۰۸ جوہری محلہ، لکھنؤ ۳ (یو پی)

دل جو روشن ہوا خوابیدہ نظر جاگ اٹھی ۔۔۔ کیوں نہ ہم آگے بڑھیں راہگذر جاگ اٹھی
زندگی آج بہ عنوانِ دگر جاگ اٹھی ۔۔۔ دورِ جمہور ہے تقدیرِ بشر جاگ اٹھی
گُل کھلائے ہیں بہاروں نے سُبک تر ہو کر ۔۔۔ اب یہ عالم ہے کہ ہر شاخِ شجر جاگ اٹھی
خندہ زن اب ہوا بچۂ گل و شبنم پہ نہیں ۔۔۔ شامِ تاریک گئی تو وہ سحر جاگ اٹھی
وجہ تخریب میں تعمیر کا رنگ آ ہی گیا ۔۔۔ آج پھر غیرتِ اربابِ ہنر جاگ اٹھی
شام کی گود میں وہ نورِ شب آہنگ نہ پوچھ ۔۔۔ جاگ اٹھی روشنی شمس و قمر جاگ اٹھی
کتنی رنگین ہے آزادیٔ گلشن کی بہار ۔۔۔ اک تبسم سے حیاتِ گلِ تر جاگ اٹھی
زنگ آلود نظر آتی ہے شمشیرِ خزاں ۔۔۔ لبِ ہر گُل پہ تبسم کی سپر جاگ اٹھی
نقشِ پا بن گئے خود مشعلِ راہِ منزل ۔۔۔ کارواں گذرے تو ذرّوں کی نظر جاگ اٹھی
نکہتِ گل بھی ہے اب موجِ رواں کے مانند ۔۔۔ شوقِ منزل میں تمنائے سفر جاگ اٹھی
اشکِ غم بن ہی گیا مملکتِ غم کا سفیر ۔۔۔ کیا تمنا تری اے دیدۂ تر جاگ اٹھی

لبِ مُضطرِب پہ جو نغمے ہیں کوئی کیا جانے
سازِ مستی کوئی چھیڑے تو صدا پہچانے

شری پرمود مانے، ڈائرکٹر جنرل
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ

قومی یکجہتی کے سلسلہ میں سرکاری اطلاعاتی اداروں کا حصّہ

آج ہمیں شدت کے ساتھ قومی یکجہتی کا احساس ہو رہا ہے۔ تقسیم کرنے والی قوتوں سے حکومتی سطح پر کشمکش جاری ہے لیکن ان قوتوں سے سبھی محاذوں پر مقابلہ کیا جانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جہاں معاملات کے بارے میں لوگوں کو اپنے آپ پر مزید قابو رکھنے اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے وہیں قومی یکجہتی کے پیغام کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے وسیع پیمانے پر تحریک چلائی جانی چاہئے، سرکاری اطلاعاتی اداروں کے دلوں و دماغ میں قومی یکجہتی کے پیغام کو پوری طرح پھیلانے کا خیال جاگزیں ہے بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ ان اداروں نے اس سلسلے میں اپنے فرائض کو قابلِ تحسین طور پر ادا کیا ہے۔ ان کا کام کافی وسیع اور موثر رہا ہے

یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار شری پرمود مانے ڈائرکٹر جنرل محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ حکومت مہاراشٹر نے اس گفتگو کے دوران کیا جو میں نے قومی یکجہتی کے بارے میں سرکاری اطلاعاتی اداروں کے حصہ" کے موضوع پر ان سے کی تھی۔ فی الوقت سرکاری اطلاعاتی اداروں جیسے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کا قومی یکجہتی کو پھیلانے اور فروغ دینے کے سلسلے میں جو حصہ رہا ہے وہ ایک الگ سوال ہے جو وسعت اور نتیجوں کے لحاظ سے الگ موضوع کا متقاضی ہے اس لئے

اس معاملے پر گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو اس کام کی تشریح اس حد تک پیش کرنے کا خیال کروں گا جس حد تک ڈائرکٹوریٹ جنرل اطلاعات و رابطۂ عامہ نے اسے انجام دیا ہے، ڈائرکٹوریٹ جنرل فی الحال اپنا کام مختلف میڈیموں یا واسطوں کی مدد سے تکمیل کو پہنچاتا ہے جیسے نمائشیں، فلم، خبروں سے متعلق سکشن، فوٹوگرافی سکشن، اشاعت، حوالوں سے متعلق سکشن، اشتہاری سکشن۔
اشتہاری سکشن عام روابط کا سکشن وغیرہ۔ میرے خیال

دوسری کوئی قسم کی ایجنسی نہیں ہے سوائے حکومت کے
ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات کے جو تنہا ابلاغ و تشہیر کے
پہلوؤں سے اتنے بڑے پیمانے پر کام لیتا ہو۔ اتر پردیش
مہاراشٹر کی ریاستوں کے اطلاعات ڈائرکٹروں کے کام کی
...یٹ عوام کے ذہن نشین غالباً آسانی سے نہ ہو سکتا ہو، مہاراشٹر
ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات قومی یکجہتی کے کام میں جس جد
...ساتھ بٹا رہا ہے اس کا پوری طرح سے احاطہ نہیں کیا جا سکتا
آج مہاراشٹر میں اخبارات دس سے زیادہ زبانوں میں شائع
...نے ہیں۔ گذشتہ دہے کے دوران اخبارات کی اشاعت میں
...ست اضافہ ہوا ہے اور خود ان کی تعداد بھی بڑھی ہے
...ے ملک میں ۱۹۲ بڑے، ۲۷۴ درمیانی درجہ کے اور ۴۵۶
...ٹے درجہ کے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر
...رات قومی یکجہتی کے سلسلے میں اطلاعات ہم سے طلب کرتے
...انھیں اچھے مضامین کی تلاش ہوتی ہے۔ جب اخباروں
...یادہ تعداد ہم سے رجوع کرتی ہے تو انھیں گیارنٹی شدہ طور
...ومت کے مصدقہ بیانات کی کسی بھی معاملے میں وقتاً فوقتاً
...ہوتی ہے۔

یہ ڈائرکٹوریٹ ایسے مضامین شائع کرتا ہے جن میں یوم
...ریہ، یوم آزادی وغیرہ جیسے موقعوں پر قومی یکجہتی کے نقطۂ
...و نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ یہ ہم تجربے کی روشنی میں کہہ
...تے ہیں کہ اس قسم کے مضامین چھوٹے اخبارات کے لیے بہت
...ہوا کرتے ہیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے شری مانے
فرمایا کہ بڑے اخبارات بھی بعض اوقات ایسے مضامین سے استفادہ
...نے ہیں یا پھر وہ ایسے مضامین کی ہمارے ذریعے خواہش کرتے ہیں
...ں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز اشخاص نے تحریر کیا ہو

کیا ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات قومی یکجہتی کے مضمون پر کتابچے وغیرہ بھی شائع کرتا ہے؟

ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات کتابیں نہیں شائع کرتا لیکن
...چھے مصنفین کی کتابوں کو خریدکر ان کی مدد ضرور کرتا ہے ان
...علاوہ حکومت میں کتابوں کی اشاعت کا کام بورڈ برائے
...ب و ثقافت انجام دیتا ہے اور ٹسٹ بک پروڈکشن بیورو
...، یہ کام کرتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ بورڈ مذکور نے اعلیٰ ادبی کتابیں جیسے
گیانیشوری، تکارام گاتھا، نیلے چرتر، گڈکری کے تمام تصنیفات
وغیرہ شائع کی ہیں۔ خود ہمارا جریدہ قومی راج (لوک راج)
خاص نمبران — پریم چند، سور داس، گیانیشور، شیوا جی
مہاراج وغیرہ پر شائع کر چکا ہے اور سماجی بیداری پیدا کرنے میں
بھی بڑے پیمانے پر کام کیا ہے۔ فلم پروڈکشن اور تفریحی ٹیکس میں چھوٹ
جیسی رعائتیں دی جاتی ہیں لیکن یہ امور اس ڈائرکٹوریٹ کے حدود
اختیارات میں نہیں آتے۔ قومی راج (لوک راج) کو مہاراشٹر کے
نیز دوسری ریاستوں کے مشہور و معروف قلمکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ اس
ڈائرکٹوریٹ کو بڑے بڑے فنکاروں اور آرٹسٹوں کے مشورے
بھی ملتے رہتے ہیں اس میں فلم پروڈکشن بھی شامل ہے۔ میرا
خیال ہے کہ ہمیں اپنے کام میں کوئی پریشانی نہیں پیش آتی :

کس قسم کی پریشانی؟

سچ پوچھئے تو ہم بحیثیت انتظامیہ کے واجبی احتیاط برتتے
ہیں اس لیے ایسی کوئی دشواری پیش نہیں آتی جو میزانیہ (بجٹ)
میں عدم گنجائش کی بنا پر واقع ہو۔

آپ انتظامیہ کے بلند پایہ افسر ہیں۔ آپ نظم و ضبط کے برقرار رکھنے کا بھی کافی تجربہ رکھتے ہیں قومی یکجہتی کے بارے میں عوامی تعلیم و شعور کی ضرورت آپ کو کہیں دوسروں سے زیادہ محسوس ہوتی ہوگی۔ مہربانی کرکے اس باب میں اپنے تجربات بیان کیجئے۔

واضح طور پر آپ کا سوال فرقہ وارانہ فسادات کے ذیل میں
آتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ نہ صرف نظم و ضبط سے تعلق
رکھتا ہے بلکہ اس مسئلے سے "نمٹنے" کے لئے بنیادی طور پر غور و خوض کی
زیادہ ضرورت ہے۔ لوگ زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں جب وہ اثر
ڈالنے والی عمر میں اچھے ادب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھے اثرات
میں خود اچھی قوت ہوتی ہے۔ بہت سے ضلعوں میں میں نے دیکھا ہے
کہ عام لوگ امن پسند ہیں۔ لیکن جہاں غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ اور
جاہل لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے تو انھیں اکسانے والے کامیاب ہو جاتے
ہیں تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لوگوں میں دھرم اور مذہب کے نام پر جذبات
کو برانگیختہ کرنے کی کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ دیہاتوں میں اس
ڈائرکٹوریٹ کے شائع کردہ پوسٹر اچھا اثر ڈالنے میں مفید ثابت

ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس ڈائرکٹوریٹ کے شائع کردہ اخبارات بھی اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ قومی یکجہتی پر جاری کردہ اشتہارات میں بہت سے جاذب توجہ جملے نعروں کے طور پر استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ بہت سے شاعروں کے اشعار لوگوں کی زبانوں سے ادا ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سے چھوٹے اور بڑے لیڈران ہمارے جاری کردہ اشتہارات کے نعروں کو اپنی تقریروں میں استعمال کرتے ہیں تاکہ حقیقی تنازعے کے موقعوں پر حالات کو قابو میں رکھ سکیں۔ میرے خیالات میں اشتہارات کے ذریعے کامیابی کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے۔

آپ کس قسم کے اخبارات کو اشتہارات جاری کرتے ہیں؟

اس معاملے میں ہماری پالیسی بہت فیاضانہ اور وسیع ہے ہم اس سلسلے میں فقط تعداد اشاعت پر نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ بعض جرائد جو ایک ہزار کی محدود تعداد اشاعت میں شائع ہوتے ہیں انھیں بھی ہم سال میں ایک یا دو بار اشتہارات دیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ قومی یکجہتی کا پیغام ایک ہزار لوگوں تک تو کم از کم پہنچتا ہے۔

کیا ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات کے پاس ایسے مصنفین کے لئے کوئی ایسی اسکیم ہے جو اپنی ادبی تصنیفات میں قومی یکجہتی کو پیش نظر رکھتے ہوں۔ اس کام میں دوسری ایجنسیاں کہاں تک ہاتھ بٹاتی ہیں؟

حکومت ایوارڈ کی تقسیم کے ذریعے جو دوسری ایجنسیوں کی وساطت سے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کو عمل میں لاتی ہے۔ اس لیے یہ کام ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات کے سپرد نہیں کیا جاتا۔

رہی یہ بات کہ دوسری ایجنسیوں کے کام میں شمولیت کی تو خبروں کو جمع کرنے اور شائع کرنے والی مشینری ادبی کنونشنوں کے انعقاد کے موقع پر حرکت میں لائی جاتی ہے۔ ہمارے ضلعی اطلاعاتی دفاتر اس قسم کی ادبی کنونشنوں کے منظم کرنے والوں کے ساتھ تعاون سے پیش آتے ہیں۔

ہماری علاقائی نیز ضلعی دفاتر براہ راست یا کسی اور ذریعے سے ٹیلی پرنٹر لائنوں کی وساطت سے صدر دفتر سے تعلق قائم رکھتے ہیں۔ اس کے ذریعے خبروں کی تشہیر کے سلسلے میں ہم کئی واسطوں کے ساتھ تعاون کی پیش کش کرتے ہیں۔ ہمارا فوٹو سروس کا شعبہ بہت

سے موقعوں پر بہت بیش قیمت کام کرتا ہے۔

آپ قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں حکومتی واسطوں کے کام کا اندازہ کس طرح لگاتے ہیں؟

سرکاری واسطوں نے اپنی کوششوں کا بہترین حصہ سرکاری سطح پر قومی یکجہتی کے پیغام کو پھیلانے میں ادا کیا ہے بلکہ اس کام میں وہ اپنی کوششوں میں کمی نہیں کرتی۔ رہی بات کامیابی یا عدم کامیابی کی تو وہ الگ بات ہے۔ میں آپ کے روبرو اپنے ایک نمائش منعقد کرنے والی یونٹ اور خاندانی بہبود کے اشتہارات شائع کرنے والے ادارہ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ نئی دلی میں اور دوسرے مقامات پر بھی کڑاکے کی سردیوں میں یہ یونٹ نمائشیں منعقد کرتی ہے جس کام میں رات دن محنت کرنی پڑتی ہے۔ مہاراشٹر پویلین نے کتنے ہی ایوارڈ اور انعامات اس طرح کے جیتے ہیں۔ گذشتہ ۱۴ سال کے دوران خاندانی بہبود کے پیغام کو مشتہر کرنے کا کام خاص طور سے دیہاتوں میں کافی کٹھن ثابت ہوا ہے۔ لیکن ڈائرکٹوریٹ برائے اطلاعات نے اس کام کو پوری توجہ اور جانفشانی سے انجام دیا۔ اب ہمیں قومی یکجہتی کے پیغام کو عام لوگوں تک پہونچانے کا کام کرنا ہے ہم سچائی کے ساتھ کوشش کر رہے ہیں اور ہماری کوشش صحیح سمت میں جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت کے وسائل، ذرائع بھی کام میں کامیاب ہوں گے۔ جہاں کام کی نوعیت کافی بڑی ہو تو بعض کوتاہیاں پیش آتی ہی ہیں لیکن جس چیز پر انجام کار نظر ہوتی ہے وہ کامیابی ہے۔ ہم کندھے سے کندھا ملا کر پختہ ارادوں کے ساتھ کام کریں گے۔

(شری مہیش زاور، لوک ستہ کے چیف سب ایڈیٹر کا انٹرویو)

اس باب میں

آل انڈیا ریڈیو کا حصہ تعاون

اگرچہ دوردرشن کا پھیلاؤ اطلاعاتی واسطوں میں آج بہت زیادہ ہو چکا ہے لیکن آل انڈیا ریڈیو برسوں پہلے ملک کے کونے کونے میں

شری مدھوکر گائیکواڑ
(ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو)

ہ چکا تھا۔ یہ عوام کے ساتھ مواصلات کا زبردست ذریعہ ہے
نے کے لیے کہ آل انڈیا ریڈیو نے قومی یکجہتی کے پیغام کو عوام
ہو نچانے میں کیا اقدامات کئے ہیں میں نے اس کے ڈائریکٹر شری
ر گائیکواڑ سے گفتگو کی۔ شری گائیکواڑ آرٹ اور ادب کے
۔ واقف کار ہیں۔ انھوں نے مہاراشٹر کے باہر بھی آل انڈیا ریڈیو
ذمہ داری کے عہدوں پر کام کیا ہے۔ انھیں دیہاتی حلقوں میں
اشاعت کا اچھا تجربہ ہے اس لحاظ سے انھیں معاملات کا
ن حیثیتوں سے دور رس تجربہ ہے

سوال :۔ انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے قومی یکجہتی کو
کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور آل انڈیا ریڈیو جیسے
واسطوں کے ذریعے اسے کس طرح سننے والوں کے
گوش گذار کیا جاتا ہے۔

جواب :۔ جب ہم پروگراموں کی منصوبہ بندی کرتے
تو ہمارے پیش نظر سننے والی جماعت میں زیادہ تر نوجوان ہوا
تے ہیں۔ نوجوان جنھیں مختلف پہلوؤں پر اس کی تعلیم دینا ضروری
۔ مہاراشٹر کے نوجوان مقبول عام مصنفین جیسے مہاراشٹر کے، کھانڈیکر،
کے، اترے وغیرہ سے قدرتی طور پر واقف ہیں۔ لیکن اس بات
نکان ہے کہ وہ ہندی، بنگالی وغیرہ زبانوں کے مصنفین سے واقف
ں اس لئے یہ بات ضروری ہوتی ہے کہ مراٹھی جاننے والے جو
انڈیا ریڈیو کو سنتے ہیں انھیں اچھی ہندی، بنگالی وغیرہ سے
ف کرایا جائے۔

ہم چاہیں: زیعہ کہ ملک کے مختلف حصوں سے نوجوانوں کا انتخاب

کرتے ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں تاکہ وہ اکٹھا ہوں اور کسی منتخبہ
مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار کریں اس کے نتیجے کے طور پر
قدرتاً ان کو ایک دوسرے سے ملنے میں۔ بات کرنے میں، جاننے
پہچاننے میں اور زبانوں کے سمجھنے میں نیز ایک دوسرے کے ادب
اور ثقافت کو معلوم کرنے میں اور باہمی غلط فہمیوں وغیرہ کو دور
کرنے میں مدد ملتی ہے اس بھائی چارگی و اتحاد کا پیغام مختلف زبانوں
میں لوگوں تک پہنچتا ہے۔ اس طرح سے ملک کے مختلف حصوں
کو اور مختلف لوگوں کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے قریب
لایا جاتا ہے اور ان میں یکجہتی پیدا کی جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے
لگتے ہیں کہ وہ سب پہلے بھی ہندوستانی ہیں اور آخر بھی ہندوستانی ہیں۔

ریڈیو فرقوں کے درمیان، علاقوں
کے درمیان شادیوں کے پروگراموں کو مرتب کرتا ہے اور ایسی شادیوں
کی اس خیال کے تحت حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں
کو اور مختلف لوگوں کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے قریب لایا
جائے اور ان میں یکجہتی پیدا کی جائے۔

سوال :۔ جہاں تک پڑھے لکھے اور سمجھدار
سننے والوں کا تعلق ہے بحث و مباحثہ لکچر وغیرہ
بجا ہوتے ہیں لیکن قومی یکجہتی کے پیغام کو
ناخواندہ اور مزدور پیشہ عوام تک آپ کس طرح
پہنچاتے ہیں۔

جواب :۔ سننے والے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ
اونچی سوسائٹی کے سننے والے جن کی پسند یں جداگانہ ہوتی ہیں۔ ایسے
سننے والے خبریں۔ قدیم گانے سننا پسند کرتے ہیں جنھیں ہم ان تک
پہونچاتے ہیں۔ رہی بات عام سننے والوں کی تو ان کے لیے قابل غور
لکچر، بحث و مباحثے پیش کرنے کے بجائے ہم انھیں تفریحی باتیں
اور اس سے متعلق پیغامات انٹرویو اور دلچسپ بحث و مباحثے کے
ذریعے پیش کرتے ہیں مثلاً سرکاری ملازمین کو اپنے کام کے دوران
ملک کے مختلف حصوں میں جانے کے مواقع ملتے ہیں۔ قدرتی طور پر
ایسے اشخاص کو بہت قریب سے ان رسموں اور روایتوں کو جو ہمارے
ملک کے مختلف حصوں میں رائج ہیں دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور وہاں
رہنے والوں کی زندگی کے طور و طریقے اور مختلف لوگوں کے اعتقاد

قومی راج۔

اور مزاج کی کیفیات وغیرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر اس طرح کے تجربہ کار اشخاص کی باتیں عام سننے والوں کے لئے ریڈیو پر منظم کی جائیں تو ان کا اثر لوگوں پر بہت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ بولنے والے کو عام لوگوں کی روزمرہ زندگی کے واقعات کا نقشہ پیش کرنے اور ان کی زبان میں ان کی باتوں کو سمجھانے کا بہترین موقعہ ملتا ہے۔

سوال:۔ آپ اپنے پروگراموں کے ذریعہ قومی یکجہتی کا پیغام کس طرح دیتے ہیں؟

جواب:۔ ہمارا خاص مقصد لوگوں کو خبریں فراہم کرنا، انھیں تعلیم دینا، ان کے لئے تفریح مہیا کرنا ہے، خبروں کے ذریعہ ہم اپنے سننے والوں کو روزمرہ کی علاقائی، قومی اور بین الاقوامی خبریں سناتے ہیں۔ موسیقی کے ذریعہ بڑی حد تک تفریح فراہم ہو جاتی ہے اور دیگر پروگرام تعلیمی یا ملے جلے ہوتے ہیں مگر ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان پروگراموں سے قومی یکجہتی کا پیغام لوگوں تک پہنچے۔ جیسے ہم رزمیہ نظموں یا پواڑوں کے ذریعے ہم شیواجی مہاراج کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یا پھر ہمارے دیگر قومی رہنماؤں پر فیچر تیار کرکے جنتا تک پہونچاتے ہیں

سوال:۔ ریڈیو کے ذریعے اور کون سے پروگرام نشر ہوتے ہیں؟

جواب:۔ ہم کوشش کرتے ہیں متعلقہ شعبوں کے دانشوروں اور انٹیلیکچوئیلز کو بلا کر ان کے خیالات لوگوں تک پہونچائیں۔ ہمارے سننے والوں میں بچے بوڑھے اور نوجوان اور دیہی علاقوں کے عوام سبھی شامل ہیں اس وجہ سے ان کی پسند یا ناپسند کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور پھر ہمارے پروگراموں میں بھی قومی یک جہتی کے پیغام کو اس طرح نشر کیا جاتا ہے کہ دلچسپی برقرار رہے۔ ریڈیو مختلف علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کو اجاگر کرنے کی مسلسل سعی میں سرگرداں ہے۔

بزم اردو پروگرام اور گجراتی پروگرام سندھی اور کنڑ میں پروگرام کا مقصد لوگوں کو ہندستان کی مختلف علاقائی ثقافتوں سے متعارف کروانا ہے۔ جب میں ناگپور اور جل گاؤں میں تھا تب میں نے عید پر بھی ایک پروگرام پیش کیا تھا اور یہ پروگرام اردو کے بجائے مراٹھی میں نشر کیا گیا تھا تاکہ مراٹھی بولنے والوں کو عید کی تقریبات سے متعارف کیا جائے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۲۵ ویں جنم شتابدی کے موقعہ پر آل انڈیا ریڈیو کے سبھی مراکز سے پروگرام نشر کیے گئے۔ اس طرح ٹیگور کی نظموں کا چاہے کسی بھی زبان میں ترجمہ کیا جائے پسند کی جائیں گی۔

سوال:۔ آپ دیہی عوام کے لئے کیا کرتے ہیں؟

جواب:۔ چونکہ یہاں سننے والے زیادہ تر کسان ہوتے ہیں اس وجہ سے پروگرام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اولاً تو معلوماتی جو کھیتوں سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسرا عام پروگرام یہاں بھی ان کے لئے قومی یکجہتی کا پروگرام نشر کرنا ضروری ہے مگر یہاں طریقۂ کار بدل جاتا ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں ہمیں بھجن، نعت، رزمیہ نظمیں، لوک گیت اور کیرتن وغیرہ کے ذریعہ قومی یکجہتی کا پیغام نشر کرنا ہوتا ہے کیونکہ دیہی عوام لمبی لمبی تقریریں پسند نہیں کرتے ہیں اس وجہ سے تفریحی انداز میں انھیں یکجہتی کے پیغامات دیئے جاتے ہیں جیسے کیرتن میں یکجہتی کے پیغام کو پلیٹ کر ان تک پہنچایا جاتا ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے قومی یکجہتی، یکجہتی ہفتہ منانے سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ لوگوں کے دل و دماغ میں بسی رچی ہونی چاہئیے۔ ہم اپنے ملک کے واسیوں میں آہستہ آہستہ یکجہتی کی فضا قائم کرسکتے ہیں۔ جس میں ریڈیو زبردست رول ادا کرتا ہے۔ ریڈیو ایک اہم مواصلاتی ذریعہ ہے مگر اس لئے براہ راست پروپگنڈے

کے بجائے اس طرح پروگرام دئے جائیں جو لوگوں کی پسند پر پورے اترتے ہوں

ممبئی دوردرشن کا رول

ٹی، وی آج زندگی کا عنصر بن چکا ہے۔ گھر میں کرسی، صوفے کی طرح یہ بھی ہر گھر کی زینت بن چکا ہے۔ بعض اوقات والدبھی ٹی وی کے پروگراموں کو دیگر سماجی امور پر فوقیت دیتے۔ یہ مواصلاتی ذرائع میں سب سے اہم ذریعہ ہے جس کا مقابلہ کوئی مواصلاتی ذریعہ نہیں کرسکتا۔ پھر قومی یکجہتی کے لئے یہ سب سے ممکن ثابت ہوسکتا ہے جب کہ کروڑوں لوگوں میں یک وقت یکجہتی کا پیغام پھیلایا جاسکتا ہے۔

ممبئی دوردرشن ٹی وی کے ڈائرکٹر شری آر۔ ایس ساودیکر بات چیت کے دوران قومی یکجہتی میں ٹی، وی کے رول کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔

شری ساودیکر نے فرمایا کہ قومی یکجہتی کسی بھی قوم کے پھلنے پھولنے کے لئے ضروری ہے ذات، پات، مذہب اور زبان کے تفرقات یا علاقائی عصبیت کو دور کرنے کے لئے ٹی، وی پروگرام بہت اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔

انھوں نے کہا یہ سچ ہے کہ ہر شخص کو اپنی مادری زبان پر ناز ہے مگر یہ رجحان بعض اوقات غلط رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ رجحان ہمیں نوکری ملنے سے لے کر انتخابات کے ٹکٹ تک ہر جگہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جب ہمارا ملک آزاد ہوا اور ہم نے جغرافیائی استحکام کو پالیا تب یہ بات بھی سامنے آئی کہ محض جغرافیائی یکجہتی ہی کسی قوم کے لئے اہم نہیں۔ کیونکہ علاقائی، مذہبی اور زبانی تفرقات اور ذات، پات کا فرق بھی ابھر کر سامنے آگئے۔ شری ساودیکر نے فرمایا کہ ذہنی یکجہتی یا ایک قوم ہونے کا احساس ہونا ہمارا خاص مقصد ہونا چاہیئے۔

ٹی وی نے اس مقصد کو مدنظر رکھ کر بہت اہم رول نبھایا ہے۔ ہم نے اسکیمیں وضع کی ہیں جنہیں قومی یکجہتی کو استحکام دینے کی سعی کی جاتی ہے۔ کئی پروگرام ایسے ہیں جن میں خاص طور سے مذہبی تعصب سے دور رہنے اور یگانگت کی فضا قائم رکھنے کو اہمیت دی گئی ہے۔ ٹی وی پر دیوالی، دسہرہ، عید، کرسمس بدھ جینتی، نانک جینتی، اور پیشٹی پر خاص خاص پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں جو کہ مختلف مذاہب کے لیڈران اور مذہبی پیشواؤں کی زندگی پر معنون ہوتے ہیں۔

ٹی وی پر مختلف زبانوں میں مشاعرے، کوی سمیلن اور دیگر ادبی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ یہاں سے ادبی شخصیتوں پر جو چاہے کسی بھی ریاست سے تعلق رکھتے ہوں ان پر ڈاکومنٹری فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔

انسداد چھوت چھات کا پروپگنڈہ براہ راست کیا جاتا ہے یا پھر ڈراموں، بحث مباحثے کے ذریعے اس موضوع پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ لہٰذا بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر طرح سے قومی یکجہتی کا اظہار ٹی وی کے ذریعہ موثر طور پر کیا جاتا ہے۔ چونکہ دیکھنا یقین کرنا مانا جاتا ہے اس وجہ سے دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر ٹی وی پروگرام براہ راست اثر کرتے ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی پروگراموں میں یا نشر یہ کاری کرموں میں اس بات کی خاص طور سے کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو اور ہر جگہ کی تہذیب وثقافت کا تعارف ہو۔

جہاں تک ٹی وی کا تعلق ہے قومی یکجہتی کے لئے ہم سچی لگن سے یہ کوشش کررہے ہیں کہ قومی یکجہتی کا پیغام سیدھا لوگوں کے دل میں اتر جائے۔

• حسرت تاجپوری
131۔ کیلاش بلڈنگ،
ایس۔ وی۔ روڈ۔ کھار، بمبئی 52

قومی یکجہتی

وفا کا جشن مناؤ تو کوئی بات بھی ہے
ترانے دیش کے گاؤ تو کوئی بات بھی ہے
یہ قتل و خون یہ غارت گری یہ ہنگامے
وطن سے ان کو مٹاؤ تو کوئی بات بھی ہے

مذہب کے نام پہ جھگڑے غلط ہیں اے لوگو
گلے سب ہی کو لگاؤ تو کوئی بات بھی ہے
جو بات کہہ کے گئی ہے گلاب کی بیٹی
وہ بات مان بھی جاؤ تو کوئی بات بھی ہے

چراغ چھوڑ گئی ہے جو آج روشن ہے
ان آندھیوں سے بچاؤ تو کوئی بات بھی ہے
تمہارا ہند جو سارے جہاں سے اچھا ہے
تم اس کی شان بڑھاؤ تو کوئی بات بھی ہے

یہ قومی ایکتا ایمان ہی بنا لو تم
یہ عقل کام میں لاؤ تو کوئی بات بھی ہے
حضور ہاتھ ملانے سے کچھ نہیں ہوتا
جو دل سے دل کو ملاؤ تو کوئی بات بھی ہے

خدا کے واسطے حسرتؔ کی بات مانو تم
جو ہو چکا ہے بھلاؤ تو کوئی بات بھی ہے

• پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبد الرّحیم
انسٹیٹوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسیز۔ ناگپور

اُردو ڈراما اور قومی یکجہتی

اُردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب اور کلچر ہے جس کی بنیاد ہی قومی یکجہتی پر رکھی گئی ہے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور تہذیبوں نے اردو کو حُسن اور نکھار بخشا ہے۔ اردو ڈرامہ بھی اسی قومی یکجہتی اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی دین ہے۔

راس لیلاؤں سے متاثر ہوکر اودھ کے آخری تاجدار سُلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے شوقِ ایجاد ہائے تازہ نے رہس لکھ کر اُردو ڈرامے کا آغاز کیا۔ رہس یا راس اصل میں وہ حلقے کا ناچ ہے جو کنہیّا اپنی گوپیوں کے ساتھ وجد کے عالم میں ناچتے تھے پھر رہس اس ناٹک کو کہا جانے لگا جس میں کنہیّا اور گوپیوں کی محبّت کے قِصّے دکھائے جاتے تھے۔ جب واجد علی شاہ نے رادھا کنہیّا کا رہس تیار کرنے کے بعد دُوسرے قِصّوں کے کھیل تیار کئے وہ بھی رہس کہلائے

جان عالم رقص و سُرود سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے کتھک کو خاص طور پر رواج دیا۔ اس فن پر کتابیں لکھیں۔ خوبصورت عورتیں نوکر رکھیں۔ فنِ رقص، اور سنگیت کے ماہرین کو ان کی تعلیم کے لئے مقرّر کیا۔ ان کی تصنیف "مثنوی دریائے تعشق" کا ایک حصّہ رہس پر مشتمل ہے [1]۔ اس کے علاوہ کرشن جی اور رادھا کے قِصّوں کی بنیاد پر دو مختصر ڈرامے لکھے۔ جن کا نام انہوں نے "رادھا اور کنہیا کا قصہ" رکھا۔ رہس کی تیاری میں سُلطان عالم خود دلچسپی لیتے، ہدایتیں دیتے اور بے شمار روپیہ ان پر خرچ کرتے، زرق برق لباس اور زیورات پر ہزاروں

[1] سُلطانِ عالم واجد علی شاہ مسعود سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ۲۲۳

رُد سے پیسے خرچ ہوتے۔ چاندی کے گھنگھرو اور سونے کی بانسری بنائی جاتی۔ کرشن جی کا پارٹ کسی عورت کو دیا جاتا۔ شاہی محل قیصر باغ تے مخصوص مصاحبین ہی کو رہس دیکھنے کی اجازت تھی۔ جانِ عالم کی رہس سے دلچسپی کو دیکھ کر ان کے معاصر شعراء نے خود انہیں کنہیا کہا ہے چنانچہ درباری شاعر برق ان کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

عجب بانکے کنہیا نوجوان سلطانِ عالم ہیں،
حسینِ جانِ جاں، جانِ جہاں سلطانِ عالم ہیں

دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

کہ ملک اودھ میں ہے اک بادشاہ
جیئے وہ ہزاروں برس یا اللہ
کنہیا وہ شاہ خوش اخلاق ہے
مرا بادشاہ کیا ہے اوتار ہے

لکھنؤ کا شاہی اسٹیج قیصر باغ کی چہار دیواری تک ہی محدود تھا۔ لیکن اس کی شہرت گھر گھر پہنچ چکی تھی عوام کی خواہش تھی کہ عوامی سطح پر بھی اس قسم کے رہس تیار کیے جائیں تاکہ عام رعایا بھی ان سے لُطف اندوز ہوں اُردو ڈرامے کے لئے پہلا تھیئٹر تعمیر کرنے کا فخر اودھ کے آخری بادشاہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کو حاصل ہے اور عوامی اسٹیج کا پہلا ڈراما لکھنے کا شرف لکھنؤ کے ایک شاعر و ادیب سید آغا حسن امانت کو حاصل ہے۔ امانت نے "اندر سبھا" لکھ کر عوامی اسٹیج کی بنیاد ڈالی۔ اندر سبھا کا سببِ تصنیف وہ اس طرح بیان کرتے ہیں.......

"وضع کے خیال سے کہیں جانا آنا نہ آتا تھا۔ زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ۔ حاجی مرزا عابد علی، یگانہ ازلی، رفیقِ شفیق مونس و غم گسار قدیمی جاں نثار، شاگردِ اوّل موزوں طبیعت، تخلص عبادت، عاشقِ کلام امانت، انھوں نے ازراہِ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ رہس کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار

تو می راج

گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا،، ۳۱ ؎

اندر سبھا

امانت کے فرزند اکبر سید حسن لطافت وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"احباب نے فرمائش کی کہ قصۂ راجا اِندر اِس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھمری اور ہولیاں اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں۔ بہ سبب اصرار ہر دوست و یار و ناچار ۱۲۶۵ھ میں یہ قصۂ تصنیف کیا اندر سبھا اس کا نام رکھا۔ ۳۲ ؎

اِبراہیم یوسف نے "اندر سبھا" کا ناٹک سے جوڑا ہے وہ لکھتے ہیں.....

سنسکرت ڈراما اپنے عروج پر پہنچ کر زوال ہو چکا تھا۔ لیکن سانگ (سوانگ) صورت میں اس کی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ شکل موجود تھی۔ امانت کے دور میں سانگ اور بھگت مقبول تفریحی مشاغل تھے ان کا سبھا کو رہس کہنا اور بھگت سے زیادہ مقبول ہونے کا دعوٰی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان سے متاثر تھے۔ اندر سبھا میں چھند وں اور دوہروں کی موجودگی اس کا رشتہ سانگ سے جوڑتی ہے۔ اندر سبھا کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ اپنی تخلیق اور پھر اسٹیج پر پیش کیے جانے میں اپنی قو

---

۳۱ ؎ اودھ کا شاہی اسٹیج۔ مصنف سید مسعود حسن رضوی۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج۔ سید مسعود حسن ...

۳۲ ؎

روایات سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ مغرب کی
نقالی نہیں کرتیں" ۵؎

امانت کی اندرسبھا بعض جزئیات میں قدیم ہندستانی ناٹک سے بعض میں قدیم یونانی ڈرامے سے، بعض میں فرانسیسی اوپرا (OPERA) سے بعض میں مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم سے مشابہت رکھتی ہے۔ امانت نے شرح اندرسبھا لکھ کر اسے اسٹیج کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ ان کے عہد میں اندرسبھا کے لئے کوئی عمارت تعمیر نہیں کی گئی تھی وہ زیادہ تر کھلے میدان میں اور کبھی کبھی مکان کے صحن میں کھیلی جاتی تھی۔ ایک وسیع شامیانہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس کے بیچ میں کافی جگہ چھوڑ کے ایک طرف راجا اندر کے لئے سجا ہوا تخت اور پریوں کے لئے کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ وہی صحن یا میدان کے بیچ کی چھوڑی ہوئی جگہ اسٹیج کا کام دیتی تھی۔ اداکار اسی جگہ اپنا اپنا پارٹ ادا کرتے تھے۔

تمدنی میل جول کی یادگار

"اندرسبھا" پر تبصرہ کرتے ہوئے شرر لکھنوی لکھتے ہیں:

"اندرسبھا" کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے علمی و تمدنی مذاق کے باہمی میل جول کی اس سے بہتر یادگار نہیں ہوسکتی۔ اس میں ایک ہندو دیوتا مسلمان تاجداروں کی وضع میں نظر آتا ہے۔ ہیرو یعنی شہزادہ گلفام بالکل لکھنؤ کا کامل شہزادہ ہے جو اپنی زبان سے اقرار کرتا ہے کہ

شہزادہ ہوں میں ہند کا اور نام مرا گلفام
محلوں میں رہتا ہوں اور عیش ہے میرا کام

(افسر) واقعی یہی کام ہمارے بادشاہوں شہزادوں اور نواب زادوں کا رہ گیا تھا۔ پریاں ہندو دیوتا کی اپسرائیں ہیں مگر ان کو کوہ قاف کی عجمی پریوں کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ کیونکہ اپسراؤں کی طرح وہ اپنے لباس کی قوت سے نہیں بلکہ پروں سے اڑتی ہیں۔ دیو ایران اور آذربائیجان کے ہیں۔ پریوں میں رنگ کے لحاظ سے امتیاز ہونا یعنی سفید، سرخ، نیلی اور سبز خالص ایرانی مذاق ہے اور پری کا ایک انسان شہزادے پر عاشق ہونا بھی عجمی اور عربی خیال ہے۔ پریوں کا راجا اندر کی محفل میں ناچنا ایک ہندی ذوق ہے گلفام کا قیدخانہ ایران کے کوہ قاف کا کنواں ہے اور سبز پری جب اس کی جستجو میں نکلتی ہے تو پوری ہندو جوگن ہے اس لئے کہ ہندوستان کا قدیم باجا بین اس کے کندھے پر ہے اور ہندو جوگیوں کی جٹائیں، مندرے اور سیلیاں یہ سب خالص ہندوی چیزیں ہیں" ۶؎

واجد علی شاہ کی لکھی ہوئی رہس کی وجہ سے ہر ناٹک رہس کہلانے لگا اب امانت کی اندرسبھا کی مقبولیت نے لفظ اندرسبھا کے مفہوم کو وسعت دی اور ہر ناٹک اندرسبھا کہلانے لگا۔ امانت کی تتبع میں کئی اہل قلم نے اندرسبھائیں لکھیں ان میں مداری لال کی اندرسبھا اور لالہ بھیرون سنگھ عظمت کی جشن پرستان زیادہ مقبول ہوئیں ان کے علاوہ فرخ سبھا، راحت سبھا، ناگرسبھا، عاشق سبھا ہوائی مجلس جدید، بزم سلیمان، تحفۂ دل کشا اور دیگر اندرسبھائیں اس دور کی یادگار ہیں۔ اندرسبھا کا کھیل پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ کمپنیاں ترمیم و اضافے کے ساتھ بھی ان اندرسبھاؤں کو پیش کرتی تھیں۔ اب باقاعدہ اردو ڈراموں کو اسٹیج مہیا ہوگیا یہ کمپنیاں ملک بھر میں پھرتی رہتی تھیں۔

شکنتلا

ڈراما شکنتلا کو بعض اہل علم اردو کا پہلا ڈراما مانتے ہیں۔ حالانکہ ۱۸۰۱ء میں کاظم علی جوان اور للولال نے اسے ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا اس لئے یہ ترجمہ ہے طبع زاد نہیں۔

جگن ناتھ شنکر سیٹھ کے زیر اہتمام بمبئی میں تھیٹر کے ذریعہ ہندوستانی زبانوں میں ڈرامے پیش کرنے کے جلسے

۵؎ اندرسبھا اور اندرسبھائیں۔ مسعود ابراہیم یوسف ص ۱۳۰

۶؎ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ص ۵۵

۱۸۵۳ء میں پہلے مراٹھی ڈرامے کھیلے گئے،
پھر اُردو ڈرامے "راجہ گوپی چند" اور "جلندھر" پیش کیے گئے۔ ان ڈراموں کے مصنف بھاؤ داجی لاڈ تھے بہرام جی فریدون جی کا ڈراما "خورشید" اُردو کا پہلا ڈراما بتایا جاتا ہے۔ جو اسٹیج کے ذریعہ نئے انداز سے پیش کیا گیا۔ اسٹیج کے ڈراموں میں مراٹھوں اور پارسیوں نے اُردو اسٹیج کو بڑا سہارا دیا۔ پارسیوں میں خان صاحب نوشیروان جی، مہروان جی آرام، ایڈل جی کھوری، پسٹن جی فرام جی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم ڈراما نویسوں نے سنسکرت اور دیگر زبانوں سے اُردو میں ڈراموں کے ترجمے پیش کیے۔ خالص ہندوانہ انداز اور مزاج پر احسن نے چندراولی، بیتاب نے کرشن سداما اور رامائن کا ترجمہ پیش کیا۔ ان کی نثر اس وقت کے ذوق کے مطابق مقفیٰ اور مسجع ہے۔ نیز گانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

اس کے بعد آغا حشر کاشمیری کا عہد شروع ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے خالص ہندوانہ موضوع پر بلوا منگل عرف سور داس مکمل کیا۔ یہ ان کا پہلا ڈراما تھا جس میں ہندو کردار ہندی زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہندی میں دوسرا ڈراما "بھگیرت گنگا" ہے جسے انہوں نے میڈن تھیٹرز لمیٹیڈ کی اور بجبل پارسی الفریڈ کمپنی کے لئے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ سیتا بن باس، بھیشم پرتگیہ، بھارتی بالک، بھارت رمنی، مدھر مرلی، اور دھرمی بالک، لکھے یہ ڈرامے اُردو رسم الخط میں بھی موجود ہیں۔ ان کی ہندی میں اردو کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ بھیشم پرتگیہ کا پلاٹ مہابھارت سے لیا گیا ہے۔

آغا حشر کے ہندی ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عقیم الدین سالک لکھتے ہیں ------

> "ہندی ڈراموں میں آغا صاحب کے خامۂ بہار آفریں نے وہ وہ پھول کھلائے ہیں کہ ہندی زبان قیامت تک ان کے احسان سے سبکدوش نہ ہو سکے گی۔ سوشل، اور دھارمک ڈراموں کے سلسلہ میں آغا صاحب نے ہندو قوم پر ایک بڑا احسان یہ بھی کیا کہ انہوں نے ہندو مذہب اور ہندو تمدن کی عظمت کو کسی طرح کم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ یہ وہ خدمت ہے جس کا اعتراف ہمارے برادرانِ وطن کو ایک نہ ایک دن کرنا پڑے گا۔"[۵]

آغا حشر ہندوستانی ناٹک کی فضا کے سب سے زیادہ روشن ستارے ہیں۔ ان کے بعد پریم چند نے واقعۂ کربلا کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا۔ اردو کے غیر مسلم ڈراما نگاروں میں کیدار ناتھ خورشید، چکبست، برج موہن دتاتریہ کیفی، راجندر سنگھ بیدی، پرکاش، کرتار سنگھ دگل، سدرشن اور کرشن چندر نے ڈرامے کو نئی جہتوں اور نئے تجربوں سے روشناس کرایا۔ کرشن چندر کا ڈراما "دروازے کھول دو" کو سامنے رکھ کر لکھا گیا۔ اسی طرح مسلم ڈراما نگار اظہر افسر کا "بکھرے پھول"، اور ڈاکٹر داؤد کا "باپو کا سپنا"، قومی یکجہتی پر سبق آموز ہیں۔ ساغر نظامی اور منور لکھنوی نے "شکنتلا" کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان میں ساغر نظامی کا ترجمہ فن و ادب کا شاہکار ہے۔

پرتھوی تھیٹر

مشہور فلمی اداکار پرتھوی راج کپور نے پرتھوی تھیٹرز قائم کیا۔ ان کے اصلاحی ڈراموں پٹھان، کسان، اور پیسہ بہت مقبول ہوئے۔

مختصر یہ کہ اُردو ڈراما نویسی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے میں ہندوستانی کلچر اور قومی یکجہتی کو خاص طور پر اُردو ڈراما کے فروغ میں ہندو مسلم سکھ پارسی سب نے پورا پورا تعاون کیا ہے۔

---

[۵] اردو کا اہم ڈراما نگار آغا حشر۔ مصنفہ ابراہیم یوسف صفحہ ۱۳۸

• طالب ممتاز
نواپارا، راجم، ضلع رائے پور (ایم پی)

دلوں میں پیار کی گنگا بہا لیتے تو اچھا تھا

محبت، پیار، ہمدردی جتا لیتے تو اچھا تھا
وطن کو رشکِ صد جنت بنا لیتے تو اچھا تھا

یہ قتل و خون، یہ وحشت، یہ ہنگامے یہ بربادی
یہ شعلے اپنے اشکوں سے بجھا لیتے تو اچھا تھا

تعصب، تنگ نظری، دشمنی، کینہ، حسد، نفرت
یہ کانٹے اپنے رستے سے ہٹا لیتے تو اچھا تھا

اہنسا، شانتی، سکھ، چین، اطمینان، خوشحالی
یہ نہریں اپنی دھرتی پر بہا لیتے تو اچھا تھا

ارادہ، جوش، استقلال، ہمت، حوصلہ، خواہش
یہ جوہر زندگی میں آزما لیتے تو اچھا تھا

وفا، ایثار، خودداری، شرافت، آبرو، غیرت
یہ موتی اپنے دامن میں سجا لیتے تو اچھا تھا

یہ پنجابی، یہ بنگالی، یہ گجراتی، یہ مدراسی
یہ سب آپس میں دل سے دل ملا لیتے تو اچھا تھا

کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی سکھ، کوئی عیسائی
گلے اک دوسرے کو سب لگا لیتے تو اچھا تھا

اڑا کر "ہم شکھر" پر پرچم ہندوستاں طالب
دلوں میں پیار کی گنگا بہا لیتے تو اچھا تھا

★ طفیل اشعر
صدر نیشنل یوتھ انٹگریشن
مومن پورہ، ناگپور - ۱۸

قومی یکجہتی اور نوجوان

اِس مُلک کی گنگا جمنی تہذیب ہمارا ایک ایسا مُقدس ورثہ ہے جس کی حفاظت کرنا ہر ہندوستانی کا اوّلین فرض ہے یہ ملک قدیم زمانے سے مختلف اکائیوں، تہذیبوں مذہبوں اور مِلتوں کا ایک ایسا حسین سنگم رہا ہے۔ جو دُنیا کے تمام لوگوں کے لئے نہ صرف غور وفکر کی دعوت دیتا ہے بلکہ اُن کو حیرت میں بھی ڈال دیتا ہے۔ اِس سرزمین کی ابتدا ہی سے یہ خوبی رہی ہے کہ اس کے سینے میں طرح طرح کے ذخیرے پوشیدہ رہے ہیں۔ اس کے صحنِ چمن میں رنگ برنگے پُھول کِھلتے اور مُسکراتے رہے ہیں۔ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی رہی ہیں۔ متضاد عقائد پروان چڑھتے رہے ہیں اور ہر شخص کو اپنی اپنی بولی بولنے کی آزادی میسّر رہی ہے۔

اِس حقیقت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگرچہ یہاں مختلف مذہب و ملّت کے لوگ رہتے و بستے ہیں۔ لیکن بحیثیتِ قوم یہاں کے رہنے بسنے والے تمام افراد ہندوستانی ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس نے اس سرزمین پر قومی یکجہتی کے چراغ کو ہمیشہ روشن رکھا ہے۔ چنانچہ سر سیّد احمد خاں نے ایک موقع پر بہت واضح الفاظ میں اس حقیقت کی نشان دہی اس طرح کی تھی کہ......

"ہندوستان میں رہنے والے لوگ مذہب کے اعتبار سے ہندو، مسلمان یا کچھ اور ہو سکتے ہیں، لیکن وطن کے لحاظ سے وہ ایک قوم ہیں وہ یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں نذرِ آتش یا سپردِ خاک ہوتے ہیں۔ ان کے فرقے الگ ہو سکتے ہیں لیکن ان کا ملک ایک ہے، اس لئے ان سب کو قومی یکجہتی کی بہتری کے لئے کام کرنا چاہیئے"

میں سب کی بھلائی ہے۔

ں حقیقت کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے
ن نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں
لبۂ صدارت میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ....

"ہندوستان کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ
س کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف
ہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلے کی منزل بنیں
بھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان
قافلوں کی آمد شروع ہوئی اور پھر ایک کے بعد
یک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین
سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود
نے سب کے لئے جگہ نکالی"

اس طرح ہندوستان مذہبوں، ملتوں، اور تہذیبوں
ہ بنتا گیا۔ اس حسین گہوارہ میں مختلف خیال اور عقائد
ں کا ایک ساتھ مل کر رہنا ایک پریشان کن مسئلہ بھی تھا
ریخ شاہد ہے کہ یہاں ہر دور میں لوگوں نے اپنے طرزِ عمل
ادو اتفاق، سالمیت اور بھائی چارگی کا ثبوت دیا ہے
ملک کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ قومی
ر ایکتا کا یہ راز حکمرانِ وقت کی سلجھی ہوئی پالیسیوں میں
ہا ہے۔ انہوں نے حالات اور ماحول کے پیشِ نظر جو
ں ترتیب دیں اور جو منصوبے بنائے وہ ہندوستان
درانہ محبت قائم کرنے میں ہمہ وقت کامیاب رہے
یکن افسوس کے گذشتہ کئی سالوں سے قومی یک جہتی
نا کی یہ انمول کڑیاں کچھ شرپسند عناصر کی فتنہ پردازیوں کے
بار بار ٹوٹ رہی ہیں، جو اس ملک کے دانشوروں کے
پریشان کن مسئلہ بن چکی ہے۔ اگر اس کا گہرائی سے
و مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ
بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم نے ملک کی قومی ایکتا کو سخت
پہنچایا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر ریاست اپنا اپنا حق

طلب کرنے میں مصروف ہے اور علاقائی خود مختاری کا جذبہ دن بہ دن
فروغ پا رہا ہے۔ اس کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ نصاب کے
نام پر طلباء کو جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، اس میں تاریخ کو کچھ
اس انداز میں پیش کیا جا رہا ہے جس کے باعث طلبا کے دل و
دماغ میں تعصب و نفرت کے شعلوں کا بھڑکنا ایک یقینی بات
ہے۔ یہی وہ چنگاری ہے جو کبھی کبھار شعلہ بن کر قومی اتحاد و اتفاق
کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور اس ملک میں رہنے بسنے والی قومیں
آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتی ہے۔ جس کے باعث
ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی فضاء انتہائی مکدر ہو چکی
ہے۔ زمانۂ حال کے ایک دور اندیش شاعر نے اس ماحول کا
نقشہ اپنے اشعار میں اس طرح کھینچا ہے ؎

آج اس حال کو پہنچا ہے بساطِ محفل
جیسا ذرّہ ہو کوئی موجِ طوفاں کے قریب
جیسے ایک شمع جلے رہگذر صرصر پر
آبلہ جیسے کوئی خارِ مغیلاں کے قریب
ریت کے ڈھیر میں جیسے ہو چھلکتا ہوا جام
ناطقہ سر بہ گریباں ہے پریشاں ہے نظر
کارواں رقص میں ہے موت کے دروازے پر

تعصّب و نفرت کی یہ گھنگھور گھٹائیں اس وقت ہی چھٹ
سکتی ہیں، جب ہم سب اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ملک کی
ترقی و خوشحالی کو اپنا مقصدِ حیات بنائیں۔ یہ ذمّہ داری تو ہندوستان
میں رہنے بسنے والے ہر خاص و عام پر ہے ہی لیکن ہم نوجوانوں پر
بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جو اس ملک کے مستقبل کے معمار اور اس
کی تعمیر و ترقی کے ضامن ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں پر فوری طور پر یہ
ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف بھرپور توجہ دیں اور
اس کے لئے ایک لائحۂ عمل مرتب کریں جو ملک میں اتحاد و اتفاق
کی فضا قائم کر سکے۔ ہمیں چاہیئے کہ وہ ایسے اجلاس کا انعقاد کریں
جن میں مختلف خیال کے لوگوں کو مل کر بیٹھنے کا موقع مل سکے۔
تاکہ وہ قریب ہو کر آپس میں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ عید ملن
دیوالی ملن، اور اسی طرح کی دوسری تقریبات بھی اس مقصد کو

(باقی صفحہ نمبر ۴۷ پر)

سردار احمد (علیگ)
سیڑھی والا گھر، کٹرہ شہاب خاں
اٹاوہ (یو۔پی)

کانگریس کے ابتدائی ۳۵ سال

سماجی، ثقافتی اور سیاسی پس منظر

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آنے سے قبل ہندوستان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی زندگی غم و الم کی جس بلندی کو چھو رہی تھی اس کا فطری تقاضہ، اور ردِّ عمل ایک عظیم تنظیم کی دعوت اور بشارت دے رہا تھا جو قومی امنگوں اور حُبّ الوطنی کی ترنگوں کو یکجا کر کے ایک نئے انقلاب کی قوّت کا سرچشمہ بن جائے۔ کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم ضرور تھے لیکن اسکے محرک سرسیّد احمد خاں تھے۔

اس حقیقت کا انکشاف خدابخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرے میں انجمن اسلام بمبئی کے ایک "تذکرہ" سے ہوا۔ جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو استقبالیہ دئے جانے اور پھر اُن کی تقریر کا ذکر ملتا ہے۔

اس تقریر میں انھوں نے کانگریس جماعت کا اصل بانی سرسید احمد خاں کو بتاتے ہوئے اپنی اور مسٹر ہیوم کی اس ملاقات کا حال بیان کیا ہے جو ۱۸۹۲ء میں انگلستان میں ایک لنچ کے موقع پر ہوئی تھی۔ مسٹر ہیوم نے دوران گفتگو ان سے کہا کہ ان کے دماغ میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا خیال سرسید احمد خاں کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" سے پیدا ہوا۔ جس میں سرسید نے بتایا تھا کہ بغاوت اور غدر کا سبب یہ تھا کہ اس ملک کے لوگوں کی کوئی آواز نہ تھی۔ اسی خیال کو لے کر مسٹر ہیوم نے کانگریس کی قومی تحریک شروع کی۔ (اس انکشاف کے لئے دیکھئے، کانفرنس گزٹ علی گڑھ، جلد دس، شمارہ ۱۲-۱۳، صفحہ ۸)۔

انڈین نیشنل کانگریس کو بڑا امید نظروں سے دیکھنے اور اسے اپنے دُکھوں اور غموں کا مداوا سمجھنے اور اس کے ذریعے برٹش ظلم وستم سے نبرد آزما ہونے کے احساس کے پیچھے ہندوستانی قوم کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ کے نشیب وفراز موجود تھے جس کی وجہ سے نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے لوگ ایسی تنظیم کے لئے تیار تھے۔ نانا راؤ اور مولوی احمد اللہ کے بغاوت کے منصوبے اور زنگو باپوا اور عظیم اللہ خاں جیسی ہستیوں کی بیباکی اور حریت پسندی کی لہریں اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہندو مسلم سماج اصلاحی تحریکوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جن کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں۔ راجہ رام موہن رائے سے لے کر مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور

(رابندر ناتھ ٹیگور کے والد ماجد) تک اور پھر برہمو سماج "
سے سوامی دیانند کی تحریک آریہ سماج تک ہندوؤں پر
لذتِ تجدید کا گہرا اثر پڑ رہا تھا تو سید احمد بریلوی، عبدالعزیز
محدث دہلوی اور مولوی جون پوری جیسی شخصیات کا خونِ
جگر مسلم معاشرہ میں دورِ اصلاح کو جگمگا رہا تھا۔ تاریخ
کی اس ہلچل میں آزادی کے صور کی آواز سے فضائیں
گونج اٹھیں۔ ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اولین جنگ
آزادی کی ابتدا ہوئی اور ہندو مسلم اتحاد کی مثال قائم
کرتے ہوئے شمعِ آزادی کے پروانے سر سے کفن باندھ کر
انگریزوں کے مقابل صف آرا ہونا شروع ہو گئے۔ انگریزوں
نے اپنی توپوں، سنگینوں اور گندی سیاست سے
ہندوستان کو غلامی کا طوق پہنا دیا، دلی کا سہاگ لوٹ لیا
جاں نثارانِ وطن کو جبر و ظلم کا نشانہ بنایا، ہندوستانیوں کی
شکست، غم و آلام اور آزمائش کے شب و روز ایک
نئے انقلاب کی بشارت لائے اور رہنمایانِ قوم و ملت
نے نئے سرے سے تمام منتشر قوتوں کو یکجا کرنے اور عوام
میں خود شناسی، خود اعتمادی اور حق شناسی اور بے خوفی
پیدا کرنے کی جدوجہد شروع کر دی جس سے قومی بیداری نے
کروٹ لی۔ اس کے بہت سے پہلوؤں میں سے چند حسب ذیل
ہیں:

- سب سے پہلے صحافت قلمی جہاد کا میدان
بنا اور ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے
والے اخبارات عوامی غم و غصہ کے اظہار سے
لبریز نظر آنے لگے۔ اردو اخبارات کی خدمات
اور اہمیت اس سلسلہ میں سر فہرست ہے
جس کی تصدیق گارساں دتاسی کے بیان
سے بھی ہوتی ہے۔

اردو صحافت مغرب پرستی سے اسی طرح
بیزار تھی جس طرح شاہ ولی اللہ کی انقلابی
تقریریں اور تحریریں مغرب پرستی سے بیزاری کے
ساتھ انقلاب کی آگ بھڑکا چکی تھیں جن کے
لئے رتن لال بنسل نے لکھا کہ "انگریزوں
کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے
ہندوستان کو بچانے کے لئے شاہ ولی اللہ
زندگی بھر لڑتے رہے"۔ اردو اخبارات
کے ایڈیٹروں اور قلم کاروں کو سخت سے
سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی
سامراج کے خلاف لکھنے کے جرم میں
"صادق الاخبار" کے مہتمم کو قید بامشقت
کی سزا ملی۔ "اردو اخبار" کے ایڈیٹر محمد باقر
کو پھانسی دی گئی۔ امام بخش صہبائی کو اور ان
کے دو جوان بیٹوں کو آزادی کے لئے
آواز اٹھانے کی پاداش میں انگریزوں نے
گولی سے اڑا دیا اور ان کی لاشیں دریا میں
پھینک دیں۔ منیر شکوہ آبادی کو اسی
زمانہ میں کالے پانی کی سزا ہوئی۔ مولانا
فضل حق کو سیاسی بغاوت کے جرم میں
جلا وطن کر دیا گیا۔ لیکن جذبۂ آزادی کچلا
نہ جا سکا۔ ان اخباروں کو دبانے اور
اپنی مرضی کا پابند کرنے کے لئے لارڈ لٹن
(Lord Lytton) نے ورناکیولر
پریس ایکٹ نافذ کیا۔ پھر بھی آزادی کے
لئے سرفروشی کی تمنا کو دبایا یا سرد نہ کیا
جا سکا۔

دوسری اہم بات وہ صورتِ حال تھی جس کے
باعث ہر گھر میں انگریزوں کے خلاف نفرتِ عام ہو چکی تھی۔
اس کی تصویر اس وقت کے اردو شاعروں کے کلام
میں صاف نظر آتی ہے۔ جیسے ؎

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا (غالب)

داستانِ دہلیِ مرحوم کی اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز
(حالی)

اور پھر اتحاد اور اتفاق سے پانسہ پلٹ دینے کی
تدبیروں کے بھی اشارے ملنا شروع ہوئے سہ
کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر
یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپّر
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
(اسمٰعیل میرٹھی)

ان عوامل میں تیسری اہم چیز اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہندوستانیوں کا وکالت کے پیشے کی طرف رجحان اور اس کے لئے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے اس کی تعلیم کی طرف توجہ ہے جس کے نتیجے میں ایسے بڑے اور مشہور وکیلوں کی تعداد بڑھنے لگی جو آزاد پیشہ کے ساتھ ملک و قوم کی وکالت اور آزادی کی تحریکوں کا ساتھ دینے کا بھی کام کرنے لگے۔

چوتھی بات جس نے قومی بیداری اور ایک قومی جماعت کی ضرورت کا احساس قوی تر کیا۔ وہ تعلیمی اداروں کا جگہ جگہ قائم ہونا تھا۔ ان تعلیمی اداروں میں انگریزی تعلیم اور سائنسی علوم باقاعدہ داخلِ نصاب ہوئے۔ دُور بیں نگاہوں نے دیکھا اور پُرخلوص دِلوں نے محسوس کیا کہ جب تک ہندوستانی بچوں میں، نوجوانوں میں ہم نئی تعلیم اور مغربی علوم کو اپنے مشرقی علوم کے دوش بدوش عام نہ کریں گے یہ نونہالانِ چمن انگریزوں کے مقابل خود اعتمادی کے ساتھ نہ آسکیں گے۔ اس طرح کے عظیم کاموں میں سب سے درخشاں مثال سر سید اور اُن کے قائم کئے ہوئے ادارہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی ہے جو مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی راجہ مہیندر پرتاپ، ذاکر حسین، رفیع احمد قدوائی، شیخ عبد اللہ جیسی سیاسی شخصیتوں کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں، سائنسدانوں اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کا سرچشمہ بن گیا اور یہ سب قومی آزادی کی لڑائی میں حصہ

لینے کے ساتھ کانگریس کی بھی بنیادوں کو مضبوط ک[illegible]
کے اہل بنے۔

پانچویں اہم بات جس نے ہندوستانیوں
اپنے جمہوری نظامِ حکومت کی کشش میں اضافہ ک[illegible]
تھی لوکل سلف گورنمنٹ کا قیام۔ میری مراد میون[illegible]
اور کارپوریشن کے ذریعہ آبادیوں اور بستیوں
انتظامات اور ان کے لئے الیکشن کے طریقہ کا[illegible]
ہونا ہے جسے اگرچہ انگریزوں نے اپنی انتظامی سہو[illegible]
کی بنا پر کیا تھا۔ لیکن یہ چیز بھی ہندوستانیوں
لئے اپنی خود کی حکومت قائم کرنے اور غیر ملکیو[illegible]
سے اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی ترغیب بن گئی۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیا[illegible]
اس گنگا کی مانند ہے جس کی ابتدائی مناظر میں یہ ا[illegible]
نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ندی آگے چل کر کتنے چشموں[illegible]
دریاؤں اور سریتاؤں کو اپنی آغوش میں سلے[illegible]
کتنے بڑے میدانوں، بستیوں اور آبادیوں میں
حیاتِ نو کا پیغام بنے گی اور کیسے کیسے، تہذیبی و[illegible]
کے مزاجوں اور کرداروں کی آماجگاہ بنے گی اور
طوفانوں، ہنگاموں اور ہواؤں کی شورشوں کا س[illegible]
کرے گی لیکن اپنا سفر جاری رکھے گی۔

۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو ۱۲ بجے دن میں گوکل داس تیج
سنسکرت کالج بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اولین ج[illegible]
ڈبلیو سی۔ بنرجی کی صدارت میں ہوا۔ ہندوستان کے تمام
کی نمائندگی کرتے ہوئے بہتر اشخاص نے تجویز پیش ک[illegible]
ممبروں کے بجائے ہندوستان کے منتخب نمائندے
کانگریس کے کام کو آگے بڑھائیں اور فوجی بجٹ [illegible]
تخفیف کی جائے۔ اس اجلاس کی خبریں دوسرے دن
اخبارات میں شائع ہوئیں جن کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔
کی اس حقیقت کو پڑھنے کے ساتھ "انڈین نیشنل کانگ[illegible]
کی سرگرمیوں کو بھی نہیں بھولنا ہے جس کا پہلا اجلاس
۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں ہوا تھا اور اس سے بھی پہلے ا[illegible]
ایسوسی ایشن آف کلکتہ کے جلسے کلکتہ کے علاوہ پونہ، فتح[illegible]
آگرہ، لاہور اور امرتسر تک ہو چکے تھے اور ایک سیاسی جما[illegible]

ی ضرورت اور اس کے لیے فنڈ کا انتظام زیرِ غور تھا۔ سُشری
بنرجی جنھوں نے انڈین نیشنل کانفرنس کے جلسے لاہور، ملتان
دہلی، آگرہ، علی گڑھ، الٰہ آباد اور بیکانیر میں کرائے تھے پُرزور
لفاظ میں تعلیم کی توسیع، کونسل میں ہندوستانی نمائندگی اور
سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد کے لئے
پیل کر رہے تھے۔ سرسید احمد خاں کی شخصیت کے بھرپور اثرات
ا ابتدا کا بھی وہی زمانہ ہے۔ وہ اپنی تقاریر میں اعلان
کر رہے تھے کہ "اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک
ہم کو نہیں دئے ہیں تو ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ ہم کو دلادے
ی۔۔۔۔۔ وہ دن دور نہیں کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص
کونسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا۔ وہ دن آئے گا کہ تم خود
ہی قانون بناؤگے اور خود ہی اس پر عمل کروگے۔"

غرض کہ ملکی حالات اجتماعی اور قومی پلیٹ فارم کے لئے
سازگار تھے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک انڈین نیشنل کانگریس
کے اکیس سالانہ اجلاس ہوئے جن میں چار انگریز بھی شامل تھے۔ مسلم
سماج کی ہمدردی اور تعلق انڈین نیشنل کانگریس سے شروع
ہی سے رہا۔ اگر مولوی نذیر احمد نے اس کی مخالفت کی
تو علامہ شبلی نے کانگریس کی پُرجوش حمایت دمِ آخر تک کی۔
بہرحال کانگریس کے تیسرے سال ۱۸۸۷ء میں مدراس کے انڈین
نیشنل کانگریس کے اجلاس کے لئے پہلے مسلم صدر بدرالدین
طیب جی کو اتفاق رائے سے چنا گیا اور ۱۸۹۶ء میں کلکتہ میں ہونے
والے کانگریس کے اجلاس کے صدر رحمت اللہ محمد سیانی
تھے۔ سرسید کا اثر تعلیم یافتہ مسلمانوں پر گہرا ہونے کی وجہ
سے سر آکلینڈ کالون لفٹیننٹ گورنر صوبہ جات شمالی مغربی
(اترپردیش) نے ۱۸۸۸ء میں جھوٹی خبریں پھیلا کر اور بے بنیاد
پروپگنڈہ کر کے مسلمانوں کو کانگریس سے دُور رکھنے کی بھی کوشش کی۔
ان گتھی کو کھولنے اور تاریخ کے اوراق سے اس کے اسباب
و عوامل کا پتہ لگانے کا کام محققین کو اب بھی دعوت دے رہا
ہے۔ رہا سرسید کا معاملہ تو ان کو سمجھنے کے لئے پنڈت جواہر لال
نہرو کے درج ذیل الفاظ بہت اہم ہیں:

"سرسید ایک دانشمند مصلح تھے وہ جدید
سیاسی خیالات کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ
کرنا چاہتے تھے۔ یہ مقصد انھیں کسی بنیادی
عقیدہ پر حملہ کر کے نہیں بلکہ مذہب کی عقلی
ترجمانی کر کے حاصل کرنا تھا۔ وہ ہندوؤں کے
خلاف یا فرقہ پرست نہیں تھے۔ انھوں نے
بار بار اس پر زور دیا کہ مذہبی اختلافات
کو کوئی سیاسی یا قومی رنگ نہیں دینا چاہیے۔
انھوں نے کہا کہ "کیا تم سب ایک ہی ملک
میں نہیں رہتے ہو۔ یاد رکھو کہ لفظ ہندو اور
مسلمان محض مذہبی امتیاز کی نشانی ہیں ورنہ
ہمارے ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہوں یا
مسلمان ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

(ڈسکوری آف انڈیا صفحہ ۲۸۷ ۱۹۴۵ء ایڈیشن)

کانگریس کی سرگرمیوں کی رفتار اور شخصیات کی ترتیب
و انتخاب کی نوعیت بتدریج بدلتی گئی اور وہ دھیرے دھیرے
مستقبل میں آزادی کی پکار کی علامت بن گئے۔ اس مقام
تک پہونچنے کی بھی ایک لمبی داستان اور نرم گرم مزاجوں
کے رہنماؤں کی آپسی رام کہانی بھی دلچسپ ہے لیکن
منزل سب کی ایک تھی۔ ناتو (NATU) بھائیوں کی جلاوطنی اور
بال گنگا دھر تلک پر مقدمہ چلنے کے اثرات کانگریس کی اندرونی
فضا پر پڑے۔ شدت پسند اور عجلت پسند تمام قوانین و قواعد
کی پابندیوں کو توڑ کر چھوڑ کر آزادی کے لئے سرگرمی اور
برطانوی سامراج کے خلاف کارروائی تیز کرنے کے حق میں تھے
جبکہ اعتدال پسند اور نرم مزاج اس طریقۂ عمل کے خلاف تھے
اس نازک موقع پر گوپال کرشن گوکھلے کی خدمات ناقابلِ فراموش
ہیں جنھوں نے دوراندیشی سے کام لے کر کانگریس کو شدت
پسند ہاتھوں میں جانے سے بچا لیا۔ لارڈ کرزن کا زمانہ
وائسرائی اور جاپان کی روس پر فتح اور اندرونِ ہند قحط،
بیماریوں کی وبائی صورت اور اقتصادی بدحالی سب نے
مل کر انسانی معاشرہ کو متاثر کیا اور کانگریس کے اندر بھی اس
کے اثرات نمایاں ہوئے۔ کانگریس نے لارڈ کرزن کی
تمام پالیسیوں کا جم کر مقابلہ کیا جن میں اقتصادی معاملات، تعلیمی
اصلاحات، لگان اراضی، ٹیکس، کرنسی، نظامِ آبپاشی، ریلوے
بل (۱۷۷۰ء) کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے اعلان
نامہ کی مخالفت بھی شامل تھی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام آغا خاں کی قیادت میں عمل میں آیا جس
کی علامہ شبلی، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی
بزرگ ہستیوں نے پوری طاقت سے مخالفت کی اور مسلمانوں کی
اکثریت نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے ہندو
مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جس طرح کی سازشیں لارڈ
میکالے کے زمانہ سے شروع کی تھیں اور سرسید کے زمانہ
ملازمت میں بنارس کے انگریز کمشنر نے جس طرح اردو ہندی
کا قضیہ سرکاری سرپرستی میں پھیلانا شروع کیا تھا اس کا بھی سلسلہ
جاری تھا اور فسادات میں بے قصور اور معصوم جانوں کا اتلاف انگریزوں
کی خوشی کا باعث تھا۔ ہندوستان کے ہندو مسلم رہنما اس صورت
حال کے سدِّباب کے لئے کانگریس کے پلیٹ فارم سے
اتحاد و اتفاق کے ساتھ آزادی کی لڑائی سے توجہ نہ ہٹنے کی
تلقین کر رہے تھے۔ اور گولی، جیل اور پھانسی کا انعام پا رہے تھے
کانگریس ان کے خون اور پسینہ سے مضبوط تر اور ہندوستان
کی واحد عظیم قومی جماعت بن چکی تھی۔ انگریز سرکار نے اپنی غلطی
تسلیم کرتے ہوئے تقسیم بنگال کا خاتمہ سنہ ۱۹۱۱ء میں کر دیا لیکن
باقی سازشوں اور مظالم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی سال گنگا دھر
تلک نے تاریخی اعلان کیا کہ "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے" ولایتی
مال اور بدیشی سامان کا بائیکاٹ ہوا۔ پورے ملک میں حب الوطنی
کی نظمیں، آزادی کے لئے تقریریں اور بدیشی مال کی ہولیاں
عام ہوئیں۔ سودیشی مال کے فروغ اور بدیشی مال کے بائیکاٹ
کی تجویز تلک اور حسرت کی تھی جس کی پُرزور وکالت حسرت
موہانی اردوئے معلّیٰ میں کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں کانگریس
کے بمبئی اجلاس نے اس تجویز کی منظوری دے دی۔ مولانا
حسرت موہانی جنھوں نے سنہ ۱۹۲۱ء کے کانگریس اجلاس منعقدہ
احمد آباد میں پہلی بار مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا تھا
کو سنہ ۱۹۱۳ء میں سزا ملی اور اردوئے معلّیٰ کے پریس کی ضبطی
بھی ہوئی۔ جس کے جواب میں حسرت نے سر جیمس مسٹن کو جو جواب
دیا تھا اس سے اس وقت کے رہنماؤں کے لہجے اور کانگریس
کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حسرت موہانی کے الفاظ جو انھوں
نے اردوئے معلّیٰ میں لکھے، ملاحظہ ہوں:

"...... ایک بات البتہ قابلِ اطمینان اور
لائقِ شکر ہے، وہ یہ کہ اس قسم کے نوٹس سے

راقم کو کسی قسم کا مالی، جسمانی، یا روحانی صدمہ
نہ اس وقت پہونچا اور نہ آئندہ پہونچے گا
سر جیمس مسٹن اور ان کے مانند جملہ اربابِ
قہر و غرور کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی ناراضی
اہلِ دولت و جاہ کے لئے کیسی ہی مہیب
اور اہم کیوں نہ ہو۔ ہم سے آزاد فقیروں کا اس
سے مرعوب و مغلوب ہونا کسی صورت سے
ممکن نہیں۔"

ملک کی فضا کانگریس کی ایک اور دیو پیکر
ابوالکلام آزاد کے "الہلال" میں ان کی پرجوش تحر
اور کانگریس کے جلسوں میں ان کی شعلہ بیانیوں سے
مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ میں اپنی ایثار و قر
خدمت و ہمت کے درخشاں کارناموں کے بعد گ
ہدایت پر انگلستان ہوتے ہوئے وطن واپس آ کر ملک
کر یہاں کے قومی رہنماؤں سے مل کر اپنی خدماتِ قوم
احمد آباد میں "ستیہ گرہ آشرم" کھول چکے تھے اور کانگ
کی قوت بن کر تحریکِ آزادی کے ہر موڑ پر اپنی حق
حق گوئی اور عدم تشدد پر مبنی فکر و عمل سے اپنا
وطن کے ماضی کی عظمت، وطن کے مناظرِ قدرت اور
قدر و قیمت کا خوبصورت مواد لئے ہوئے نظموں کا
چرخہ اور کھدر کی قدر بڑھی۔ اچھوتوں اور زیردستوں
توجہ ہوئی اور "انقلاب زندہ باد" زندگی کا جزو بنا۔ ا
علامہ شبلی، علامہ اقبال، چکبست، ظفر علی خاں، تلو
کی وطنی اور قومی نظمیں دلوں کو نئی امنگیں اور نئے
رہی تھیں۔ گاندھی جی جیلوں تک میں اقبال کا ترانہ:
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہ
پابندی سے کانگریسی قیدیوں کے ساتھ گاتے تھے۔
کے بڑے بڑے جلسوں میں بھی "بندے ماترم" کے
تھا۔ اکبر الٰہ آبادی کی ظریفانہ شاعری مغرب پرستی۔
شر کے اثر کو زائل کرنے کا کام کر رہی تھی۔ اکبر کہتے
مذ خوا گر گورنمنٹ نہ ہوتے تو وہ بھی گاندھی جی کی گو
سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی جس سے پو
ہوئی۔ ہندوستان میں ہوم رول کے بھی نعرے بل

تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ تحریکِ آزادی اور تحریکِ خلافت
شن کر قیادت کی آن بان لیے ہوئے تھی۔ مولانا محمد علی جوہر، اور
ا ندھی جی ایک ساتھ اتحاد و اتفاق کا نمونہ بن کر اپنے جلو میں تمام
جاہدینِ آزادی کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے کانگریس اور خلافت
کے ڈائس سے ایک آواز ہو کر بول رہے تھے۔ ایک طرف
ا ندھی جی نے بلا اختلاف خلافت کو قومی مسئلہ بنا دیا تو دوسری
طرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک پر انسدادِ گاؤ کشی
ی قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی۔ ہندستانیوں کے دل
سے انگریز کا ہوّا اور رعب نکل چکا تھا۔ مغرب بیزاری بڑھ
رہی تھی اور روحانی اقدار کو فروغ مل رہا تھا۔ اقبالؔ، ٹیگور
ور پریم چند ادبی محاذ پر چھائے ہوئے تھے۔ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء
وجلیان والا باغ کا دردناک واقعہ ہوا جس میں بغیر اعلان اور
طلاع بیس ہزار پُرامن ہندوستانیوں پر انگریز جنرل ڈائر نے
گولی چلوا دی۔ چار سو ہندستانیوں نے شہادت پائی اور دو
ہزار سے زائد زخمی ہوئے۔ اس سانحے نے ہندستانیوں اور
نگریزوں کے درمیان نفرت کی خلیج کو وسیع تر کر دیا۔
علامہ اقبال کا دل یوں رویا ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

۱۹۲۰ء کے بعد تحریکِ خلافت ختم ہوئی۔ اس کے
تمام رہنما یوں بھی کانگریس کے ہمنوا تھے اور اب کانگریس ہی
کے پرچم کے نیچے آزادی کی لڑائی میں مصروف ہو گئے۔

• ڈاکٹر نایابؔ لکھنوی
روم نمبر ۱۹/۲۴۸، ساتویں لین، نیا پورہ،
مالیگاؤں۔ ۴۲۳۲۰۳ (ناسک)

تصویرِ اتحاد

آپس کا میل جول بڑھاتے رہیں گے ہم
تصویرِ اتحاد دکھاتے رہیں گے ہم

جس سے دلوں میں پیدا ہو ہمت بھی جوش بھی
وہ نغمہ زندگی کا سُناتے رہیں گے ہم

غفلت برت رہے ہیں جو فرضِ وطن کے ساتھ
یاد اُن کو اپنا فرض دلاتے رہیں گے ہم

روشن ہے یوں تو برسوں سے ہندستان کا نام
اور اس میں چار چاند لگاتے رہیں گے ہم

سب کیلئے کھلا ہے، ترقی کا راستہ
اس راستے پہ چلتے چلاتے رہیں گے ہم

مل کے رہیں گے خوشۂ انگور کی طرح
ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملاتے رہیں گے ہم

اپنی نوائے گرم سے زندہ دلی کے ساتھ
ہر انجمن میں رنگ جماتے رہیں گے ہم

باقی رہے گا غم کا اندھیرا کہاں تلک
مہر و وفا کی شمع جلاتے رہیں گے ہم

غربت بھی چل رہی ہے جہالت کے ساتھ ساتھ
دونوں کو جس طرح ہو مٹاتے رہیں گے ہم

کل سے زیادہ آج ضروری ہے ایکتا
یہ نعرہ ہر فضا میں لگاتے رہیں گے ہم

نایابؔ! دوسروں کی مسرّت کے واسطے
اپنی خوشی کے پھول لٹاتے رہیں گے ہم

محمود الحسن ماہر
نزد درگاہ ماتا مندر، آزاد نگر،
گھاٹ کوپر، بمبئی ۴۰۰۰۸۶

مٹا دو یہ آپس کے جھگڑے سپوتو

مٹا دو یہ آپس کے جھگڑے سپوتو
ذرا شانتی دو میری آتما کو

یہ نفرت کی کیوں آگ بھڑکی ہوئی ہے
یہ آپس ہی میں کس لئے دشمنی ہے
تمہیں کیا ہوا کیوں یہ دیوانگی ہے
خدا کے لئے ہوش سے کام لے لو
ذرا شانتی دو میری آتما کو

کہیں تو زبانوں کا جھگڑا کھڑا ہے
کہیں دین سے دھرم الجھا ہوا ہے
غرض میری چھاتی پہ محشر بپا ہے
میری جان پر کیوں ستم ڈھا رہے
ذرا شانتی دو میری آتما

ہیں ہندو میرے سکھ مسلمان میرے
یہ آشائیں میری یہ ارمان میرے
میں اک داستاں اور یہ عنوان میرے
ہیں سب ایک، تم فرق ان میں نہ سمجھو
ذرا شانتی دو میری آتما کو

میری جے کے نعرے لگاتے ہو تم ہی
ہنسی میری جگ میں اڑاتے ہو تم ہی
مرے ہو کے نیچا دکھاتے ہو تم ہی
تمہیں میری سوگند، کرنی پڑے
ذرا شانتی دو میری آتم

بڑے پیار سے سب کو پالا ہے میں نے
ہزاروں جتن سے سنبھالا ہے میں نے
تمدن کے سانچے میں ڈھالا ہے میں نے
سدا میری تہذیب کے گیت گاؤ
ذرا شانتی دو میری آتما کو

نہ بھولو کبھی میرے آدرش ماہر
یہ سب چھوڑ دو آپس کے سنگھرش ماہر
ہمیشہ رہو مل کے سنہرش ماہر
میں ماتا ہوں ماتا میری لاج
ذرا شانتی دو میری آتم

★★★★

میوارام گپت
۳/بی ۳۰، انڈین ایئرلائن کالونی
کالینہ۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۹

شہید اعظم سردار بھگت سنگھ

وہ دن واقعی میں ایک بڑا مبارک دن تھا جس دن رُوحِ انقلاب شہید اعظم سردار بھگت سنگھ عالم وجود میں وارد ہوئے تھے۔ یہ مبارک دن تھا ۲۸ ستمبر ۱۹۰۷ء کا کیونکہ اسی دن بھگت سنگھ کے ایک چاچا سردار سورن سنگھ جیل سے چھوٹ کر گھر آئے تھے اسی دن بھگت سنگھ کے والد ماجد سردار کشن سنگھ نیپال سے واپس گھر آئے تھے اور اسی دن بھگت سنگھ کے ایک دوسرے چاچا اجیت سنگھ کے جیل سے چھوٹ کر گھر آنے کی خوشخبری بھی ملی تھی۔

سردار بھگت سنگھ کا کل خاندان ہی انقلابیوں اور دیش بھگتوں کا خاندان تھا۔ اُن کے والد اور چاچا سب لوگ بجرمِ وطن پرستی ہی جیلوں میں بند کئے گئے تھے۔ بھگت سنگھ کی دادی نے بھگت سنگھ کو بہت بھاگوں والا یعنی خوش قسمت بتایا اور وہ انھیں بھاگوں والا کہنے لگیں۔ "یہ بھاگوں والا" دادی کا پیارا اور آنکھوں کا تارا بچہ بھگت سنگھ کہلایا اور بھگت سنگھ آگے چل کر مادرِ وطن کا پیارا اور آنکھوں کا تارا بن گیا کیونکہ اُس نے اپنی کل زندگی ہی مادرِ وطن کی خدمت میں صرف کر دی تھی۔

بھگت سنگھ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۷ء کو جس گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اس گاؤں کا نام بنگا تھا۔ پنجاب کے ضلع لائلپور کے بنگا (Banga) گاؤں نے بعد کو عالمی شہرت حاصل کر لی کیونکہ اس گاؤں میں بھگت سنگھ روحِ انقلاب بن کر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی ۲۳ سال اور چند ماہ کی زندگی میں بھگت سنگھ نے مادرِ وطن کی خدمت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ کیا تھا۔ حب الوطنی تو انھیں وراثت میں ملی ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ وطن و قوم کی خدمت میں ہی گذرا تھا۔ وہ مجسم انقلاب تھے اور ملک میں انقلاب کے ذریعہ سے مادرِ وطن کے پیروں میں پڑی غلامی کی بیڑیوں کو اتار پھینکنا چاہتے تھے۔

سردار بھگت سنگھ کا یہ کہنا بالکل درست تھا ؎

کام ہے میرا تغیر، نام میرا انقلاب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
میرا ایماں ہے بغاوت میرا مسلک انقلاب
آگ کے شعلوں میں ہے لپٹا ہوا میرا شباب

اور میں دیکھتا ہوں بھگت سنگھ نے جو کچھ کہا ہے اُس پر خود عمل بھی کیا ہے، ان کی انقلابی زندگی، نقلی نہیں، اصلی اور عملی تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ شہید اعظم کہے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے مشہور لیڈر لالا لاجپت رائے نے لاہور میں نیشنل کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کالج کے جملہ پروفیسر وطن پرست اور سیاستداں تھے۔ اسی کالج سے بھگت سنگھ نے

الیف۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اُن کے پروفیسر جے چند ودّیا لنکار (Jai Chand Vidya Lankar) انقلابی خیالات کے تھے۔ انھوں نے بھگت سنگھ کو انقلاب کی تعلیم دی اور انھیں فرانس اور روس وغیرہ ملکوں کی انقلابی تحریکوں سے روشناس کرا دیا۔ اتفاق کی بات کہ بھگت سنگھ کے کلاس کے دیگر طالب علم سُکھدیو، یش پال اور بھگوتی پرشاد وُہرا بھی بھگت سنگھ کے ہم خیال تھے لہذا کالج ہی میں اُن کی ایک انقلابی پارٹی وجود میں آگئی اور اُن میں اَمر (Amar) دوستی قائم ہوگئی۔

ملک کی خدمت کرنے کے لئے اور مادرِ وطن کی غلامی کی بیڑیاں اتار پھینکنے کے لئے انھوں نے کالج کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا شاید اس لئے بھی کہ کالج کی ڈگری سے انھوں نے شہید ہونے کو زیادہ مناسب اور توقیر افزا سمجھا تھا سب نے مل کر پھر نوجوان بھارت سبھا کی بنیاد ڈالی اور پھر جلد ہی تمام شمالی ہند میں جگہ جگہ اس کی شاخیں پھیل گئیں۔ ظاہری طور پر نوجوان بھارت سبھائیں محض سیاسی جماعتیں تھیں جو عام مفاد کا کام کر رہی تھیں مگر باطنی طور پر یہ انقلابی جماعتیں تھیں جو ملک کو آگے آنے والے انقلاب کے لئے تیار کر رہی تھیں۔

شہید اعظم بھگت سنگھ کی ان انقلابی جماعتوں نے ملک میں سیکڑوں ایسے انقلابی نوجوانوں کو پیدا کر دیا جو انقلاب کو ہی اپنا دین و ایمان سمجھنے لگے اور سروں پر کفن باندھ کر اپنے انقلابی لیڈروں کے ہم آہنگ ہو کر گانے لگے ؂

جب سے سُنا ہے ہم نے مرنا ہی زندگی ہے
سر پر کفن لپیٹے قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

زندگی میں شادمانی لانے والی شادی سے بھگت سنگھ جیسے انقلابی ہی تو انکار کر سکتے ہیں۔ بھگت سنگھ جب سولہ[16] یا سترہ[17] سال کے تندرست اور توانا نوجوان ہوئے تبھی سے اُن کے والدین نے انھیں شادی کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہا تھا تاکہ بھگت سنگھ شادی کر کے خانگی امور کو انجام دیں مگر غیب نے ان کے لئے کچھ دوسرا ہی انجام طے کر رکھا تھا شہادت پانے کی تیاری میں لگا ان کا یہ لختِ جگر شادی کر کے کسی نوجوان لڑکی کی زندگی تباہ کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہذا وہ گھر سے مفرور ہو گئے۔ کانپور پہونچ کر انھوں نے اَمر شہید گنیش شنکر ودیارتھی کے پرتاب پریس میں

نوکری کر لی اور اپنا نام بدل کر بلونت سنگھ رکھ لیا۔ نو[illegible] کے لئے تو بھگت سنگھ نے اپنا گھر اور خاندان [illegible] تھا۔ انھیں تو انقلابی کام کرنا مقصود تھا۔ وہ کام وہ [illegible] بھی کرتے رہے تھے اور یہیں پر اُن کی ملاقات [illegible] انقلابیوں سے ہو گئی تھی۔ یہ انقلابی تھے۔ امر شہید [illegible] آزاد، امر شہید بٹوکیشور دت، وجے کمار، اور [illegible] اور سُریش چند بھٹا چاریہ وغیرہ۔ لیکن بھگت سنگھ [illegible] دنوں تک روپوش نہ رہ سکے۔ ان کے ہی کسی [illegible] نے اُن کے والدین کو اطلاع کر دی کہ آپ کا بھگ[illegible] تو بلونت سنگھ کے فرضی نام سے کانپور کے پرتا[illegible] میں مضمون نویسی کا کام کر رہا ہے۔ چند دنوں میں [illegible] سنگھ کو ایک تار موصول ہوا جس میں اُن کی والدہ ودّیا وتی کی سخت علالت کی خبر تھی۔ بھگت سنگھ [illegible] سے بڑی محبت کرتے تھے لہذا وہ کانپور چھوڑ کر [illegible] بنگا Banga چلے گئے۔ اُن کے اس طرح گھر [illegible] پر بڑی خوشی ظاہر کی گئی لیکن پھر گھر کے کسی فرد [illegible] کبھی شادی کا ذکر تک نہ کیا۔ انھیں پتہ تھا کہ شادی [illegible] اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لئے کھو دیں گے۔ بھگت [illegible] آزادی سے اپنا کام کرنے لگے۔ نوجوان بھارت [illegible] کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔

۱۹۲۸ء میں ولایت سے سائمن کمیشن ہند [illegible] لگانے کے لئے آیا تھا کہ آیا ہندوستانی آزادی [illegible] اہلیت بھی رکھتے ہیں کہ نہیں۔ ہندوستانیوں [illegible] شرم اور توہین کی بات تھی اس لئے اس کمیشن [illegible] بائیکاٹ کیا گیا۔ جب یہ کمیشن ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء [illegible] تو ملک کے سرکردہ لیڈر لالہ لاجپت رائے [illegible] بڑا جلوس لے کر اسکی مخالفت کی اور اُسے کا[illegible] دکھلائے۔ یاد رہے اس جلوس کے پیچھے بھی [illegible] کا ہاتھ تھا۔ پولس کے سپرنٹنڈنٹ جے۔ اے اسکا[illegible] (J.A. Scott) نے لاٹھی چارج کا حکم دے د[illegible] پولس جے۔ پی۔ ساؤنڈرس (Saunders) [illegible] خود لالہ جی پر لاٹھیوں کا وار کیا جس سے ان کو سخت [illegible] جسمانی چوٹ سے بھی زیادہ لالہ لاجپت رائے کو

• چندر شیکھر آزاد

• سکھدیو

شیو رام ہری راجگرو

تھی۔ وہ بستر مرگ پر جا لیٹے لیکن بستر مرگ پر جانے کے پہلے ہی انھوں نے کہہ دیا تھا کہ اُن کے جسم پر پڑی ہر لاٹھی برٹش حکومت کے تابوت کے لئے ایک کیل ثابت ہوگی۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ء کو لالہ جی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تمام ملک میں ماتمی جلوس نکالے گئے تبھی بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی نے لالہ جی کے قاتل جے۔ پی سانڈرس کو قتل کر لالہ جی کی موت کا ہنگامی فیصلہ کر ڈالا اور ٹھیک ایک مہینے کے اندر ہی اسے قتل کر ملک عدم کو روانہ کر دیا۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو قریب دن کے چار بجے اس کے دفتر کے نزدیک اُسے بھگت سنگھ اور پونہ مہاراشٹر کے بہادر نوجوان انقلابی شیو رام ہری راجگرو نے اُسے اُس وقت قتل کر ڈالا جبکہ وہ اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اپنے بنگلے کو جا رہا تھا۔ اسی وقت انقلابی فوج کے سپہ سالار پنڈت چندر شیکھر آزاد نے ہیڈ کانسٹبل چنن سنگھ (Chunnan Singh) کا اپنی گولی سے خاتمہ کر دیا جو بھگت سنگھ کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد سبھی انقلابی لاہور سے باہر چلے گئے۔

دہلی اسمبلی میں ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کے دن دو کالے قانون منظور کئے جا رہے تھے۔ سخت مخالفت کے باوجود سرکار اُن دو کالے قانونوں کو پاس کر رہی تھی۔ گویا پبلک کی آواز سننے کے لئے سرکار کے کان بہرے ہو گئے تھے۔

سرکار کے بہرے کانوں تک اپنی آواز پہونچانے کے لئے بھگت سنگھ اور اُن کے عزیز ساتھی بٹوکیشور دت ——— (Batu Keshwar Datt) نے اسمبلی میں دو بموں کا زور دار دھماکا کیا۔ گولیاں چلائیں۔ انقلابی پرچے پھینکے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا اور بعد ازاں دونوں نے خود اپنے کو گرفتار بھی کرا دیا۔ انھوں نے اپنی گرفتاری مصلحتاً کرائی تھی۔ وہ اپنی جان دیکر بھی اپنی پارٹی کو جاندار بنانا چاہتے تھے اور عدالت کے پلیٹ فارم سے دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ انقلابی کیا ہیں؟ اور ان کے اصول کیا ہیں؟۔

دہلی کی عدالت میں ان دونوں انقلابیوں پر مقدمہ چلا اور ۱۲ر مئی ۱۹۲۹ء کو دونوں کو زندگی بھر کے لئے کالے پانی کی سزا سنا دی گئی۔ اسی اثنا میں لاہور میں پولیس سپرنٹنڈنٹ سانڈرس کے قتل کا مقدمہ شروع ہو گیا اور ان دونوں کو بھی وہاں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر لے جایا گیا جبکہ دونوں سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے سرکار سے کچھ مراعات چاہتے تھے اور بیس دنوں سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔ دت بہت کمزور ہو گئے تھے انھیں ایک اسٹریچر میں ڈال کر۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۲۹ء کو لاہور جیل کے اندر اسپیشل ٹریبونل (Tribunal)

کے سامنے پیش کیا گیا۔ انقلابیوں نے اس ٹربیونل کا بائیکاٹ کر دیا اور ۱۳ر جولائی سے سب نے (انشن) فاقہ کشی شروع کر دیا تاکہ سرکار سیاسی قیدی تسلیم کر اُن کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ انشن کی حالت ہی میں بنگال کے انقلابی نوجوان جتیندر ناتھ داس ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو شہید ہو گئے۔

ملزمان کی غیر حاضری ہی میں ٹربیونل نے اپنا فیصلہ بھی ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو سنا دیا۔ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گرو کو پھانسی کی سزا ملی تو بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے وجے کمار سنہا، مہاویر سنگھ، کیشوری لال، شیو ورما، ڈاکٹر گیا پرشاد، بی۔ کے دت، جے دیو کپور اور کمل ناتھ ترویدی کو حبس دوام کی سزا ملی۔ کندن لال کو سات سال اور پریم دت کو تین سال کی سزا دی گئی تھی۔ کل ۱۶ نوجوانوں پر مقدمہ چلا تھا باقی چھوڑ دیے گئے تھے۔ سزا کے خلاف پریوی کونسل تک جو بھی اپیلیں کی گئی تھیں وہ سب خارج کر دی گئیں۔ ان کی سزائیں ہی بحال رہیں۔ بھگت سنگھ تو شروع ہی سے ان اپیلوں کے خلاف تھے۔ انھوں نے تو شہادت پانے کے لیے ہی جیسے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہو۔ آخر وقت تو بھگت سنگھ اپنے والد کشن سنگھ سے بھی ناخوش ہو گئے تھے کیونکہ انھوں نے بغیر بھگت سنگھ کی صلاح لئے رحم کی اپیل کر دی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو بوقت ۷ بجے شام وقت مقررہ کے ایک دن پہلے ہی بھگت سنگھ، سکھدیو اور راجگرو کو لاہور کی سینٹرل جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔
بے رحم سرکار نے ان تینوں نوجوان انقلابیوں کی لاشوں کے ٹکڑے کرا دیئے اور ان ٹکڑوں کو ٹاٹ کے بوروں میں لپیٹ کر ایک ٹرک کے ذریعہ اسی رات کو ستلج دریا کے کنارے لیجا کر مٹی کا تیل ڈال کر پھونک دیا گیا نصف جلے لاش کے ٹکڑوں کو ہی دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ انگریزی سرکار نے ہمارے عزیز ترین انقلابی نوجوانوں کی لاشوں کی یہ بے حرمتی کی تھی۔ اس کی پاداش میں اس ظالم سرکار کو بھی بے آبرو ہو کر ہمارے ملک سے ہمیشہ کے لئے چلا جانا پڑا تھا

- لالہ لاجپت رائے

اور لالہ لاجپت رائے کی وہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ ان کے جسم پر پڑی ہر لاٹھی کی ضرب برٹش حکومت کے تابوت کی کیل ثابت ہو گی۔

سردار بھگت سنگھ نے جو آخری خط جیل سے اپنے چھوٹے بھائی کلتار سنگھ کو لکھا تھا اور جس میں انھوں نے یہ شعر لکھا تھا ۔

مری ہوا میں رہے گی خیال کی بجلی
یہ مشت خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

واقعی میں سردار بھگت سنگھ زندۂ جاوید ہیں اور ان کا انقلابی نعرہ "انقلاب زندہ باد" بجلی کا ہی تو اثر رکھتا ہے حقیقتاً ۔

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

بہار صدیقی بدایونی۔
ویسٹرن ریلوے۔ کوٹہ
(راجستھان)

اہنسا

نگاہ و دل میں تعصب کی شعلہ افشانی
رہے گا تیرا مقدر یہ بدظنی کب تک

جنونِ فرقہ پرستی وہی ہے شور و شر
کہاں تک آگ میں جلتا رہیگا تیرا گھر

گرائے جائیگا گلشن میں بجلیاں کبتک
تباہ ہوگا "اہنسا" کا گھر بتا کبتک

کہاں تک آگ چمن در چمن لگائے گا
کہاں تک امن کے خرمن کو تو جلائیگا

خدا کے واسطے نادم ہو اپنے ظلم پہ تو
کسی بھی لمحہ کوئی چین پائے گا کہ نہیں

ستم برائے ستم آخر تجھے حیا کب تک
سکون حرام رہیگا مجھے بتا کب تک

شکستہ حالیٔ دل پر تری ہنسے گا جہاں
گذارے جائیگا ذلت کی زندگی کبتک

حذر کرے گا نہ فریاد سے کہاں تک تو
بہائے جائے گا کبتک یہ خون کے آنسو

تو اپنی ذات میں حسنِ سلوک پیدا کر
منافرت سے اجڑ جائے گا چمن تیرا

حسد کی آگ تو نفرت دلوں میں بھر دیگی
یہ خانہ جنگیٔ باہم تباہ کر دے گی

حریص و ظالم و بے دیں کو ہم خیال نہ کر
مروڑ بڑھ کے کلائی ستم کی ہمت سے

غرض کے بندوں سے آ دوست عرضِ حال نہ کر
ستمگروں سے کرم کا کبھی سوال نہ کر

غمِ زمانہ کو سہنا بھی جرمِ سنگیں ہے
ستم اٹھا کے مسلسل ستم نواز نہ بن

ستم کو شوقِ کرم میں شریکِ حال نہ کر
تو اپنی جان پہ یہ زندگی وبال نہ کر

اکھاڑ دینی ہے جڑ بھی ستم کی اب تجھ کو
ستم زدوں سے بجا ہے سلوکِ ہمدردی

فضا میں جبر و ستم کی کرم کی بات نہ کر
ستمگروں پہ مگر کوئی التفات نہ کر

مرے عزیز جفاکش ستم زدہ مجبور
ستم پہ ٹوٹ پڑے اتحاد بن کے ستم

تو اتحاد سے اے کاش ایک ہو جائے
وجودِ ظلم یقیناً ہی جڑ سے کھو جائے

محمد جمال پاشا
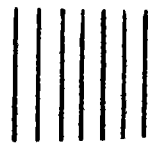
یہ بھی ایک فن ہے

یوں تو دنیا میں ایک سے ایک فن ہیں۔ اور اب تقریباً ہر فن نے پیشے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر اب بھی ایک فن ایسا ہے جو نہ تو پورے طور پر فن بن سکا نہ پیشہ۔ اور وہ ہے صبر کرنا۔

ہمارے دوست حضرت صابر احمق الہ آبادی کا قول ہے کہ "صبر کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں"۔ حالانکہ ہم انھیں برسوں سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ پرلے سرے کے جلد باز واقع ہوئے ہیں پھر ان کی شخصیت میں سوائے نام کے دُم چھلے کے صبر سے یہ مادہ پایا ہی نہیں جاتا۔

صاحب ایمان کی بات تو یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کے بعد اگر کسی کے حصے میں صبر آیا ہے تو صرف خواتین کے۔ مرد صبر سے کام لینا جانتے ہی نہیں۔ پھر وہ مرد کیا جو مرد بھی ہو اور صابر بھی ہو۔ پھر وہ مرد تھوڑی ہوا۔ علامہ اقبال کا مردِ مومن ہوا۔ مرد تو جہاں کمزور پڑتا ہے۔ ہار کھاتا ہے۔ بے بس ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ مزید پُرزے نہ اڑنے کے خوف سے خاموش ہو جاتا ہے۔ مگر بندہ پرور!

خاموشی اور صبر دو مختلف حالتیں ہیں۔ گویا صابر خاموش رہ سکتا ہے مگر خاموشی کے لئے صبر سے زیادہ خوف اور اندیشہ ہائے دور دراز کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہیں سے دونوں کے راستے جُدا جُدا ہو جاتے ہیں۔

عورت تو صاحب صبر کا پتلہ ہوتی ہے۔ مزاجاً صابر اور شاکر واقع ہوا کرتی ہے۔ پہلے وہ اس وقت تک صبر سے کام لیتی ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے۔ شادی کے بعد جب شوہر کام پر جاتا ہے تو وہ اس کے انتظار میں گھر سجاتی اور خود بنتی سنورتی ہے۔ عام طور پر تو شوہر ناکارہ ہی ہوا کرتے ہیں — معلوم ہوا کہ غریب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تارے گن گن کر رات کاٹ دی۔ مگر شوہر نامدار کو تاش کی بیٹھک سے فرصت ہی نہ ملی کہ گھر واپس جانے کی بھی توفیق ہوتی — یا پھر پی پلا کر رات گئے، صرف اس لئے تشریف لے گئے کہ محلہ سر پر اٹھا لیں۔ صبح جب نشہ ہرن ہوا تو بڑا شویٹ طور پر بیوی سے معافی مانگ لی یا مارے ڈھٹائی کے منہ پھلائے اور تیوریاں چڑھائے رہے اور کولہو کے بیل کی طرح پھر اُسی نقشے کو دُہرانے کے لئے گھر سے نکل پڑے۔ بیوی بے چاری حسب معمول صبر کی سِل بنی رہی۔ جب تک میاں صاحب سنبھلیں سنبھلیں جوانی رخصت ہو گئی اور اولاد مرمت کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اب بیوی بے چاری ماں کی حیثیت سے اولاد کی طرف سے بڑھاپے سے قبر تک صبر کرتے کرتے رخصت ہو جاتی ہے۔

جو بیویاں سلیقہ مند اور سگھڑ ہوا کرتی ہیں وہ گھر کی رونق بڑھانے کے لئے خود بھی سروس کر کے آمدنی میں شوہر نامدار کو سہارا دینا پسند کرتی ہیں۔ ایسی بیبیوں کا پالا عموماً اس قسم کے مردوں سے پڑتا ہے جو پرلے سرے سے نکھٹو واقع ہوا کرتے ہیں۔ یعنی خود بھی نوکری یا کاروبار نہ کریں گے — مگر نہ صرف اپنی تنخواہ یا آمدنی کے ساتھ آمدنی کی بالائی تک تن تنہا نوش کر جائیں گے بلکہ بیوی سے بھی رو گا کر اینٹھتے رہیں گے۔ پہلے سگریٹ کے لئے پیسے مانگیں گے تاکہ بیوی کو شوہر کی مفلسی کا اندازہ ہو جائے۔ پھر مختلف بہانوں سے بیوی کی کمائی دوستوں پر بآسانی قربان کر دیں گے۔ جب دیکھیں گے کہ کوئی داؤں نہیں لگ پا رہا ہے تو وہ بیگم کے حسن و جمال کی ایسی تعریفیں کریں گے کہ بیوی بے چاری سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اُن کی مٹھی روزانہ گرم ہی کرتی رہے گی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بیوی جو رفیقۂ حیات ہے۔ دُنیا میں سب سے حسین ترین مخلوق ہے۔ سب سے خوبصورت۔ ماں کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ مخلص ہے۔ اُسی بے چاری کے روپے سے اُسی غریب کو چھوڑ کر شوہر ایسے بے کار، ناکارہ اور غیر مخلص لوگوں میں زندگی کے حسین ترین لمحات گپ اور لڑنے جھگڑنے میں ضائع کر دیتا

جو اس کی ترقی سے جلتے ہیں، اس سے سیاست لڑاتے ہیں'
ٹانگ کھینچتے اور مسائل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ جوانی اور
ن ڈھانے کے بعد بھی عورت بے چاری کے حصے میں سوائے
اور کوفت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عموماً مردوں کو رنگوں کی پہچان نہیں ہوا کرتی۔ ہر تی زیور
ں نہ کھایا کرتے۔ جب کہ عورت ایک نظر میں مرد کو اچھی طرح پہچان
ہے۔ اور پریشان رہتی ہے کہ اس کا شوہر کن بے فضول لوگوں
جھگڑوں میں وقت اور روپیہ برباد کر رہا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے
اس سے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ کہ اس معاملہ میں عورت کو احمق اور
ہ آپ کو بڑا عقلمند سمجھتا ہے اور آخر میں بے وقوف بنا رہتا
ہے۔

عورت ہر معاملے میں صبر سے کام لیتی ہے۔ اگر وہ سمجھدار
ہ تو اس کا صبر اس کے کام آجاتا ہے۔

اور پھر ہم صبر کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک
ہے۔ آخر میں صبر پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ آپ بھی سُن
ے:

"ایک صاحب کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ انھوں نے اپنے
ب دوست سے مشورہ لیا۔

"اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

دوست نے سنجیدگی سے جواب دیا:

"تمہیں اپنی دُلہن کو بہت ہی خوبصورت تحفہ پیش کرنا چاہیے"

"کس قسم کا تحفہ ......؟"

"کوئی خوبصورت سا زیور۔ جسے پاکر وہ خوش ہو جائیں"

وہ صاحب سُنار کے پاس گئے۔ زیور کا ڈیزائن پسند کیا۔
یور کا آرڈر دیا۔ روپے جمع کئے۔ اور دوڑنا شروع کیا۔ تقاضے پر
قاضے کرتے رہے۔ مگر سُنار نے زیور بنا کر نہیں دیا۔ یہاں تک
ن کی شادی ہوگئی اور تحفہ میں انھوں نے دُلہن کو زیور کی نقد
رسید پیش کردی۔ اُن کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ جب لڑکی
جوان ہوگئی اور اس کی شادی ہونے لگی تو وہ سُنار کے پاس
بہت دوڑے۔ یہاں تک کہ ان کی لڑکی کی بھی شادی ہوگئی۔
لڑکی کے بھی لڑکی پیدا ہوئی۔ جب ان کی نواسی کی شادی ہونے
لگی تو وہ سُنار کے پاس بہت دوڑے۔ جب شادی کی تاریخ
نزدیک آگئی تو مجبوراً انھوں نے ایک دادا کی خدمات حاصل
کیں اور جا کر بہت بگڑے۔ سُنار کا بوڑھا اُستاد سمجھ گیا کہ آج
روپیہ واپس کرنا ہی پڑے گا تو اپنے شاگرد پر بہت بگڑ کر
بولا:

"جب میں تجھ سے ہزار بار منع کر چکا ہوں کہ تو جلد باز گاہکوں
کا آرڈر نہ لیا کر تو تُو نے آرڈر کیوں لیا؟ یہ لوگ صبر تھوڑی کر سکتے
ہیں۔ ابھی تو ان کا روپیہ واپس کر دے۔ کوئی ضرورت بے صبروں کے
لئے زیور بنانے کی نہیں ہے۔"

صفحہ نمبر ۲۳ سے آگے

قومی یکجہتی اور نوجوان

تقویت پہنچانے میں اِنتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نوجوانوں کو چاہیئے کہ ایسی تقریبات کا بھی اہتمام کیا کریں تاکہ تعصب اور نفرت کی چنگاریوں کو مزید اچھلنے کا موقع نہ مل سکے۔ اس کے علاوہ وہ ان لٹریچر کو عام کریں جو قومی ایکتا اور اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ساری باتیں سکۂ وقت کی طرح رائج ہوگئیں تو یقین ہے کہ ہندوستان سے فتنہ و فساد کے بادل چھٹ جائیں گے اور اتحاد کا وہ دور شروع ہوگا جس کی پُرسکون فضا میں ہر شخص کو چین سے سانس لینے کا موقع ملے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ ملک بھی ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہوگا۔
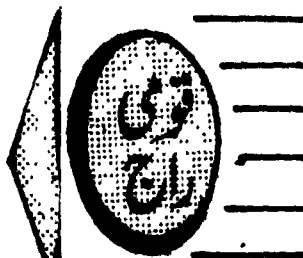
تبصرہ کیلئے کتاب کی دو جلدیں بذریعہ رجسٹری مرحمت فرمائیں۔ (ادارہ)

تبصرہ

تبصرہ نگار: شہ بانو فاروق

عنوانِ کتاب : نئی روشنی
شاعرہ : نورجہاں نوؔر

شاعر جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اطراف کے واقعات و حادثات سے وہ جس طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس کی جھلک اس کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے۔ "نئی روشنی" محترمہ نورجہاں نوؔر کا مجموعۂ کلام ہے۔ بقول ظ۔ انصاری

"یہ ایک گرہست کی شاعری
ہے۔ گرہست کی زبانی اور گرہستن
کی ترجمانی۔ جتنے نشیب و فراز
اس زندگی میں ہوا کرتے ہیں
اتنے ہی اس کلام میں ہیں"

نورجہاں نوؔر کی شاعری کیا ہے۔ اپنی ذات کا عرفان ہے۔ اس میں اکثر نظمیں عورت کی ذات سے متعلق ہیں جیسے "تخلیقِ نسواں"، جس میں انہوں نے کہا ہے ؎

یہ وہ تخلیق جس پر تیرا خالق بھی نازاں ہے

مگر ان کے یہاں عورت باغی نہیں بلکہ دکھ سہنے والی ایثار پرور ہے ؎

تیری سسرال کا بھی نام بہت اونچا ہے
اس کی چوکھٹ کی روایاتِ کہن کی خاطر
تجھ کو شاید کوئی ایثار بھی کرنا ہوگا!

"من کے پجاری"، میں وہ مرد سے کہتی ہیں:

میرے پکوان کا چرچا ہے میرے کنبے میں
میرے اخلاق کے گرویدہ ہیں سب میکے میں
کاش تم بھی میری ممی کی طرح تن کی جگہ
"گورے چہرے کے نہیں من کے پجاری ہوتے"

اسی طرح "نئی روشنی" کی بیشتر نظموں کے موضوعات کا مرکز "عورت" اور اس کے مسائل ہی ہیں۔

نورجہاں نوؔر کی شاعری میں حقیقت کی عکاسی ہے ساتھ ہی ساتھ نظموں میں "پکوان" کی خوشبو بھی شامل ہے جیسے ؎

میرے پکوان کا چرچا ہے میرے کنبے میں

یہ تو حقیقت ہے کہ انہوں نے زندگی کی عکاسی کی ہے مگر اس عکاسی میں کتنی جان ہے اس کا صحیح اندازہ آپ کو "نئی روشنی" پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم عمری میں شادی ہوئی، بچے ہیں، بچے کے بچے بھی ہیں اسی لئے تجربات و مشاہدات کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ انہوں نے سماج کی دکھتی رگوں پر بھی ہاتھ رکھا ہے جیسے "جہیز"، کے بارے میں کہتی ہیں ؎

کسی غریب کی بیٹی کی ڈولی اٹھنے کو
زمیں، نہ کھیت، نہ زیور، نہ گھر بکیں ناحق

اسی طرح جا بجا گھر، گرہستن کی ترجمانی، اس گرہستن شاعرہ کے اس مجموعۂ کلام میں نظر آتی ہے۔

کتاب، طباعت و کتابت کے اعتبار سے بہتر ہے
قیمت ۲۰ روپے ہے اور ملنے کا پتہ ہے
آکاش اپارٹمنٹ، فلیٹ نمبر ۶، منزلہ ۹
اگری پاڑہ۔ بمبئی ۔ ۴۰۰۰۱۱

★ ★

ایم۔ کوٹھیاوی راہی

شاعر نہیں ہے کوئی اداکار ہے وہ شخص
ملتا ہے جو کتابوں میں فنکار ہے وہ شخص

کرتے ہیں سنگسار جسے داغدار لوگ
اے صبح! تیری شب کا طرفدار ہے وہ شخص

گذرے ہیں اس دکاں سے فقیہانِ شہر بھی
تنہا نہیں بدن کا خریدار ہے وہ شخص

اِس بار گر پڑا تو کچل جائے گا ضرور
گر ہو سکے تو روک لو بیمار ہے وہ شخص

آتے ہی شام جس کو بلاتی ہیں کھڑکیاں
اے شہر، تیرا محرمِ اسرار ہے وہ شخص

ہے اور آسماں کی عدالت کا فیصلہ
لیکن تری نظر میں گنہگار ہے وہ شخص

سلجھا رہا ہے کون و مکاں کی جو گتھیاں
خود اپنی الجھنوں میں گرفتار ہے وہ شخص

وہ دن وہ راتیں اچھی تھیں، دھندلے جب اشجار سے
دوری کا احساس حسیں تھا، رستے ناہموار سے

بیس کا مندر وہ کہاں ہے گاؤں کی وہ مسجد ہے کہاں
رات اسی کو سوچ کیے اِس بستی سے ہم بیزار تھے

پتوں سے تن ڈھانپے ہوئے لوگوں نے مرہم رکھا تھا
کِھلے کِھلے زخموں سے جن کے دل نہ کبھی دوچار تھے

قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا وقت سحر کی آنکھوں سے
خوابوں کے کچھ طلسم منظرات پسِ دیوار تھے

پھر اک خوشبو کی یاد آئی پھر اک پیراہن جھلکا
ایسا تو احساس نہیں تھا، ہم جو ابھی اس پار تھے

تم کیا کرنے گئے صبا جب اُجڑے ہوئے خرابے میں
ہم تو خیر اک پاگل ٹھہرے، صدیوں سے بیمار تھے

آج جہاں میں قریہ قریہ سر بگریباں پھرتے ہیں
وہ جو کبھی اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تلوار تھے

شہزادوں کی بھیڑ میں اک مفلس کی جوانی تنہا تھی
لیکن اس کی طرف کی ہی مائل قدرت کے شہکار تھے

جب بھی چراغاں کرنے پہنچے تہذیبوں کے کھنڈر میں ہم
مزاروں سے محوِ گفتگو، کچھ ٹوٹے مینار تھے

سر ادسنجار رکھنے والوں کو سر کرنا آسان نہ تھا
کہتے ہیں اس وقت بھی راہی آپ بڑے فنکار تھے

انوار رضوی
ترقی اُردو بیورو، آر کے پورم
ویسٹ بلاک ۸
نئی دھلی ۱۱۰۰۶۶

۲ دو غزلیں

○

ہانپتی، ہلتی، کانپتی، ڈرتی
زندگی جیسے ناؤ کاغذ کی

کیسی مستی کہاں کی سیرابی
حاصلِ زیست ایک تشنہ لبی

خونِ انساں مباح آدم کو
شہر میں بھی غذا ہے جنگل کی

شیخیاں، طنز، دل شکن باتیں
آپ کی دوستی قیامت تھی

مجھ کو حیرت سے دیکھنے والے
ہوں حقیقت ترے وجود کی بھی

○

میری تپش سے کون جلا کون رہ گیا
سچ پوچھو اپنے دار میں خود یہ ہی سہہ گیا

میں اور تُند و تیز ہواؤں کے سلسلے
میرا وجود کائی تھا پانی میں بہہ گیا

میری شکستگی کے مناظر عجیب تھے
پھوٹا کہیں پہ سر تو کہیں دھڑ ہی رہ گیا

سب مصلحت کے تنگ حصاروں میں قید تھے
وہ کون شخص تھا جو کھلی بات کہہ گیا

○

★ سردانا منتظر
۱۱ - ڈی سری رام روڈ
سول لائنز۔ دہلی ۱۱۰۰۵۴

غزل

پتھر ہیں سب کے ہاتھ میں دل کو سنبھال ر
یہ آئینہ ہے ٹوٹ نہ جائے خیال ر

گزرا ہے کون کون اِدھر نقشِ پا تو دیکھ
کس نے کہا تو سامنے اپنی مثال رکھ

خوشبو تیرے بدن کی ہے ہر سُو تیرے
ظاہر میں ہو عیاں کہیں باطن جمال

ایسا بھی کیا جواب جو ڈھونڈے سے
مشکل سہی ہو حل مگر، ایسے سوال

کائی اگر ہے زیرِ پا پھسلیں گے پاؤں
چلنے میں احتیاط برت دیکھ بھال

یہ زندگی ہے جینے کی طرح سے اِس
اپنے شمار میں نہ کبھی ماہ و سال

تیرا اندازِ وفا سب سے نرالا نکلا

...میل
...پور،
...۳۴۴۴

...ر سمجھتا تھا وہ اپنا نکلا
...اِ آج زمانہ نِکلا
...ہ دھرتی پہ ہے جنت کوئی
...بلتا ہوا صحرا نکلا
...سے اشکوں نے اٹھایا تھا اسے
...سے امیدوں کا جنازہ نکلا
...ہوائی کے پتھر برسے
...سب سے نرالا نکلا
...پہنچ پایا ابھی تک کوئی
...افکار کا دریا نکلا
...یں اک جان سی آئی ہے جمیل
...ن سے اشعار کا جھرنا نکلا

★

ضیاء زخمی
صرافہ، جونی مسجد،
کھام گاؤں

●

گھٹا چھائی تو نشہ کیف کا راتوں میں آئیگا
گرجتے بادلوں کا لطف برساتوں میں آئیگا

نہ جلووں کی نمائش میں نہ سوغاتوں میں آئیگا
تمہارے حسن کا صدقہ تو خیراتوں میں آئیگا

انا جاگی تو انساں کرب کے دلدل سے نکلے گا
اگر مردہ ضمیری ہے تو پھر گھاتوں میں آئیگا

خلوصِ زندگی جب ڈھونڈنے نکلے گا شہروں سے
وفا کی اوڑھ کر چادر وہ دیہاتوں میں آئیگا

وفا سے زندگی خالی ہے جنکی اے ضیاء زخمی
اثر چاہت کا انکی کھوکھلی باتوں میں آئیگا

—٭—

بسنت کمار بسنت
۲۵۱/۳۹، بڑھی بازار،
رکاب گنج۔ لکھنؤ۔ (یوپی)

●

بات جب کرتا ہے اک تیر چبھو دیتا ہے
بحرِ انکار میں مجھکو وہ ڈبو دیتا ہے
ہاتھ پھیلاتا ہے جب کوئی کسی کے آگے
اسکی نظروں میں وقار اپنا وہ کھو دیتا ہے
جب کبھی لکھتا ہے خوش ہو کے کوئی خط مجھ کو
لفظ میں جیسے وہ موتی سے پرو دیتا ہے
کچھ طلب اہلِ جہاں سے میں کروں ناممکن
خوش ہوں میں مجھکو جو وہ دیتا ہے سو دیتا ہے
لکھ کے کاغذ پہ قلم سے وہ مرا نام اکثر
دیکھ کر مجھ کو مٹا دیتا ہے دھو دیتا ہے
عزم و ہمت سے نہیں لیتا ہے جب کام بسنت
بادباں خود ہی سفینے کو ڈبو دیتا ہے

★

پانی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیئے دوسرے علاقوں سے پانی کی فراہمی کی جائے گی، اور خاص کاموں کے لئے لی گئی زمین اس کام کے لیئے استعمال کی جائے اگر اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنی ہو تو حکومت سے اس کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

وزیر اعلیٰ نے میٹنگ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پانی کی قلت کے مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔ اس مسئلے کو ہمیں سلجھانا ہے۔ جن علاقوں میں پانی کی فراہمی نہیں ہے۔ ایسے حصوں میں پانی کی فراہمی کے لئے ورلڈ بینک سے امداد حاصل کی جائے گی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ بڑے پیمانے کے کارخانوں میں بجلی اور پانی کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان سے قحط کا ٹیکس لینے کی تجویز زیر غور ہے۔

وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ اس پروجیکٹ کے تحت عام انسانوں کو اس کا فائدہ حاصل ہونا چاہیئے۔

وزیر اعلیٰ نے ضمانت روزگار اسکیم اور مین پروٹیکشن ٹینکس کا دورہ کیا اور وہاں مزدوروں کے کاموں کا جائزہ لیا۔ جب وزیر اعلیٰ کوتھے نہاکال پر کام کرنے والے مزدوروں سے بات چیت کر رہے تھے، تو وہاں کام پر آئی ہوئی ایک مزدور عورت شریمتی پاروتی باپو راؤ پوار نے خشک سالی سے متاثرہ غریب افراد کی مدد کے لئے قائم کردہ فنڈ میں ۳۰۱ روپے کا ایک چھوٹا تحفہ وزیر اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا۔

مراسلت کا پتہ:-

ایڈیٹر قومی راج

ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز

گورنمنٹ آف مہاراشٹر

۱۵ واں منزلہ، نیو ایڈمنسٹریشن بلڈنگ

مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

"اردو" کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں (وزیر اعلیٰ)

وزیر اعلیٰ مہاراشٹر شری ایس بی چوان نے کہا کہ اردو مشترکہ تہذیب وثقافت کی علمبردار ہے اور اس کا کسی فرقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وزیر اعلیٰ ۲۵ جنوری کو اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام انجمن اسلام میں منعقدہ ایک پروگرام میں تقریر کر رہے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ محدود وسائل کے باوجود حکومت اردو اکیڈمی کی ترقی اور فروغ کے لیئے سب کچھ کرے گی۔

راحت کے کاموں کیلئے سب کمیٹی کا قیام

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پروگرام کی عمل آوری اور فنڈ میں اضافہ کے لئے سیکریٹری ترتیب سے ایک مقررہ وقتی سب کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا۔

وزیر اعلیٰ ۱۴ جنوری کو منترالیہ میں خشک سالی کے حالات کا جائزہ لینے والی ایگزیکیٹو کمیٹی کی میٹنگ میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ لیبر کوآپریشن انڈسٹریز کے میدانوں کی سرگرمیوں کو اس میٹنگ میں فلم شو دکھا کر اجاگر کیا گیا۔ پینے کے پانی کی فراہمی، مویشیوں کا چارہ جیسے مسائل کا آج سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ پانی کے کچھ ذرائع کچھ مدت کے بعد سوکھ جائیں گے۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ آنے والے موسموں کے دوران ہمیں ان حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

فنڈ کے اضافے کے لئے مختلف میدانوں سے موصول ہونے والے مشوروں کا وزیر اعلیٰ نے خیر مقدم کیا۔

قومی راج

شری شنکر راؤچوان، منترالیہ
لہ میں "یوم جمہوریت" کے موقعہ
سران و ملازمین کو "قومی یکجہتی"
حلف دلاتے ہوئے۔

خبریں - تصویروں میں

یوم جمہوریہ کے موقع پر ۲۵ جنوری کی شب مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں وزیر اعلیٰ اور اردو اکاڈمی کے چیرمین شری شنکر راؤ چوان تقریر کرتے ہوئے تصویر میں وزیر مملکت برائے تعلیم شریمتی خیدریکا کینیا۔ وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ شری سید احمد اور اردو اکاڈمی کے نائب چیرمین شری ڈاکٹر ظ انصاری بھی نظر آرہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان فیض پور کانگریس کی جشن طلائی کا افتتاح کرتے ہوئے ۲۹ دسمبر کو فیض پور ضلع جلگاؤں میں
یتی دیپ روشن کر رہے ہیں۔ سابق وزیر شری مدھوکر راؤ چودھری بھی تصویر میں نظر آرہے ہیں۔

• ڈاکٹر شری کانت جیکار وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ گرو گوبند سنگھ کے فرزندگان بابا زور آور سنگھ اور بابا فتح سنگھ کی یوم شہادت پر اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے شری پرسون سنگھ اور شری سرجیت سنگھ بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شری غلام نبی آزاد مرکزی وزیر مملکت برائے غذا و شہری رسد، شری دلاس راؤ دیشمکھ وزیر برائے محصول اور جنگلات، اور شری شیواجی راؤ موگھے وزیر برائے جنگلات ایوت محل ڈویژن میں مہاراشٹر اسٹیٹ ٹرانسپورٹ بورڈ کے ام کھیڈ بس ڈپو کے افتتاح کے موقعہ پر لی گئی تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

• ڈاکٹر شری کانت جیکار وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ محکمۂ نشہ بندی، اور اکسائز کے ریاستی سطح کے کھیل کود کے مقابلے میں عام چمپین شپ حاصل کرنے والے ضلع ناگپور کو انعام پیش کرتے ہوئے

محبوب خاں

پارولہ۔۲۵۱۱۱ء ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)

۱۹۸۶ء کا رسالہ نظر نواز ہوا۔ پچھلے خصوصی نمبروں کی طرح یہ
بھی اپنی جگہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ آپنے اسے
اور پرندوں کی نت نئی معلومات کا ایک بحر بیکراں بنا دیا
س کی گہرائی میں ڈوب کر معلومات کے بیشمار موتیوں سے
کلتا ہے۔
ج ہمارے مدرسہ میں برسہا برس سے برستور آ رہا ہے۔ میں
کی پابندی سے کرتا ہوں۔ اس کی خوبصورت کتابت، عمدہ
ستھری چھپائی قابل تعریف ہے۔ ریاستی خبریں مضامین
تمام تر جامع اور دلچسپ ہوتے ہیں اور اس میں روز بروز
ے۔ بس اس میں کمی محسوس ہوتی ہے تو افسانوں کی جو ادب
ہے۔ امید ہے اس کمی کو دور کرنے کی ضرور کوشش کریں

ن بہ دن بڑھتا ہوا معیار شہرت اور مقبولیت آپ کی اور
ں شب و روز جانفشانی کا زندہ ثبوت ہے۔ اس کے
قابل تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ سے دعا ہے
راہ میں حائل ہر مشکل آسان ہو جائے اور وہ تمام ریاستی
ت لے جائے۔ (آمین)

★ ★ ★

لرحمٰن محمد غفران

م گڑھ (یوپی) ۲۷۶۴۰۳

۱۹۸۶ء کا شمارہ پڑھا۔ آپ نے اس شمارے میں ایک
ی یکجہتی کے معمار۔ چکبست لکھنوی" شائع کر کے ہم
ے طالب علموں کے لیئے بڑا ہی اچھا کام کیا ہے۔ امید
ہر شمارہ میں ایک ادبی مضمون شائع کرتے رہیں گے۔
امنا کے کی وجہ سے رسالہ کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ آپ کی
ہے کہ رسالہ کا معیار بلند سے بلند تر بنانے میں کوئی کسر
خدا کرے ایسا ہی ہو۔

حسینی جاوید (جرنلسٹ)

(نامہ نگار روزنامہ سیاست، ممبر ایڈوائزری کمیٹی آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد،
نائب صدر ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی، اورنگ آباد، اعزازی لائبریرین، باباصاحب مسافر
لائبریری، پن چکی)۔ جاگیردار باؤنڈری۔ اسٹیشن روڈ، اورنگ آباد-۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

قومی راج، ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء، مہاتما گاندھی نمبر کی صورت میں ملا۔ خوب
بلکہ خوب ہے۔ "قومی یکجہتی کے علمبردار۔ مہاتما گاندھی" معلوماتی ہے۔
مجھے بہت پسند آیا۔ دیگر مضامین بھی اچھے ہیں۔
اس شمارے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کا ایک خط (مع عکس) بھی
شامل ہے جو کسی محمد حسین کے نام ہے۔ اس خط میں بابائے قوم نے اقبال
کی مشہور نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" کے بارے میں اپنے
تاثرات ظاہر فرمائے ہیں۔ اس خط کی ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے
کہ یہ خط "اردو رسم الخط" میں لکھا گیا ہے۔ یہ خط واقعی "یادگار" ہے
اور محفوظ رکھنے کے قابل بھی۔ جب کبھی آپ قومی راج کا "اردو نمبر" شائع
کریں، اسی خط کو سرورق (ٹائیٹل) کی زینت بنا سکتے ہیں۔
ایک بات اور لکھنے کی یہ ہے کہ جو بھی نمبر آپ شائع کریں، پہلے
اس کی خوب تشہیر کریں۔ زیر نظر شمارہ دیکھنے کے بعد اپنی محرومی کا شدید
احساس ہو رہا ہے۔ بابائے قوم کے بارے میں کاش میرا بھی کوئی مضمون
ہوتا۔

★ ★ ★

نیرّ آسّی

۸/۱۶۔ ویسٹ پٹیل نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

۱۰ ستمبر ۸۶ء کا قومی راج نظر سے گزرا۔ یوں تو سبھی مضامین و
نظمیات قابل ستائش اور معیاری ہیں مگر پروفیسر جگن ناتھ آزاد
صاحب کا مقالہ "مولانا آزاد کا شعری ذوق" اور محمد شاکر خاں صاحب
کا مضمون "قومی یکجہتی اور اردو" بہت معلوماتی اور دلچسپ
لگے۔

★ ★ ★

قومی راج کے بارے میں اپنی
رائے ضرور لکھیئے اور دوستوں کو
خریداری کے لئے توجہ دلایئے۔
(ادارہ)

قومی راج

PRINTED AT THE GOVT PHOTOZINCO PRESS, PUNE-1987

جلد ۱۴ ۱۰ مارچ ۱۹۸۷ء شمارہ ۳

ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو چھ زبانوں میں
ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زرِ سالانہ:- دس روپئے ○ قیمت فی شمارہ:- ایک روپیہ

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر:—— پرمود مانے
منیجنگ ایڈیٹر:—— ریاض احمد خاں
ایڈیٹر:—— فیروزہ فیاض خان
سب ایڈیٹر:—— عبد اللہ

خشک سالی سے نمٹنے کے لئے

مدد کیجئے

وزیر اعلیٰ کی اپیل

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے سماجی اور رضا کار اداروں سے ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ عوام کی مدد کرنے کے لئے فراخ دلی کے ساتھ عطیات دینے کی اپیل کی ہے ۔

حکومت نے اس سلسلے میں رضا کار اداروں کی جانب سے حاصل ہونے والی امداد کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا ہے، وزیر اعلیٰ کی طرف سے دی گئی یقین دہانی کے سلسلے میں ایک ایڈ منسٹریٹیو سیل فنڈ اور دیگر امداد جمع کرنے کے لئے ۱۲رجنوری سے سچوالیہ جمخانہ، پہلا منزلہ جنرل جگن ناتھ راؤ بھوسلے مارگ، بالمقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲ (ٹیلی فون نمبر ۲۲۴۲۸۷) میں اپنے فرائض انجام دے رہا ہے ۔

مختلف ادارے حکومت کی مختلف طریقوں سے مدد کرسکتے ہیں۔ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی، مویشیوں کے لئے چارہ، متاثر افراد کو ملازمت وغیرہ جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کرکے مدد دی جاسکتی ہے ۔

رضا کار اداروں کی جانب سے مذکورہ راحت کے کاموں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ یہ ادارے متعلقہ ضلعوں کے کلکٹران سے متاثرہ دیہاتوں کی فہرست حاصل کرسکتے ہیں ۔ متاثرہ علاقوں میں اس وقت پینے کے پانی کی اشد ضرورت ہے اس لئے ان علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کی جانب خصوصی توجہ مطلوب ہے ۔ آنے والے موسم گرما میں تقریباً ۱۲۰۰۰ دیہاتوں میں پینے کے پانی کی شدید ضرورت محسوس کی جائے گی۔ اس لئے حکومت نے اس سلسلے میں انتظامات کے لئے ایک ایکشن پلان وضع کیا ہے جو اس طرح ہے ۔

(۱) بور کنوؤں اور ہینڈ پمپوں کی تنصیب (۲) پائپ کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی (۳) عارضی پائپ کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی کی اسکیم (۴) بڑکیوں کی تعمیرات (۵) کنوؤں کو مزید گہرا کرنا (۶) نجی کنوؤں کی حصولی (۷) ٹینکروں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے ایمرجنسی پانی کی فراہمی ۔

رضا کار اداروں کو خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کے مسئلہ کے حل کے لئے ریاستی حکومت

تھ ہٹانا چاہیے جس کے لیے مندرجہ ذیل مشورے دیے گئے ہیں۔

ہنگ مشینوں کی خرید

اس کے لیے ڈی، ٹی، ایچ اور ان ویل مشینوں کی خرید ضروری ہے اُن کی قیمت بالترتیب ۴ لاکھ اور ۲۰ لاکھ روپے
رضاکار ادارے ان مشینوں کے خریدنے کے لیے عطیات دے سکتے ہیں اور کن علاقوں میں ان مشینوں کو
ب کیا جائے۔ اس بابت وہ مشورہ بھی دے سکتے ہیں۔

ر ویل

۱۵۰ سے ۲۰۰ فٹ تک کھدائی کرنے کے بعد جن علاقوں میں پانی حاصل ہوتا ہے ان علاقوں میں بورویل لگائے
تے ہیں۔ ایک بورویل کی قیمت تقریباً ۲۵۰۰۰ ہزار روپئے ہوتی ہے اور اس طرح کے کنویں سے ۲۵۰ افراد کو پینے کا
فراہم کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال ۸۰۰ بورویل کنوؤں کی کھدائی کی ضرورت ہے۔ رضاکار ادارے ان بورویل
مدائی کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق مدد دے سکتے ہیں یا ہیں بورویل کی تنصیب کے لیے ہینڈ پمپوں کی تنصیب کے
فنڈ فراہم کرسکتے ہیں۔

ٹرک موٹروں کی تنصیب

بورویل میں الکٹرک موٹروں کی تنصیب سے ۱۰۰۰ لوگوں کے پانی کی ضرورت کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح
اسکیم کے لیے ۴۰،۰۰۰ روپئے خرچ آتا ہے۔ اگر ان اخراجات کی ادائیگی عطیات فنڈ سے پوری کی گئی ہو
کومت کے ذمہ اس اسکیم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہوگی۔

لٹ کنوؤں میں دوبارہ پانی

جن علاقوں میں کنویں خشک ہوچکے ہیں وہاں ایر کمپریسر مشین اور Revitalisation (تجدید کا کام انجام
والے) سیٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہر یونٹ کی قیمت ۳۰ لاکھ روپئے ہوتی ہے اور ۳۰ یونٹوں کی
ت ہے۔ ادارے ان یونٹوں کو بطور عطیہ دے سکتے ہیں اور وہ ان علاقوں کی نشاندہی بھی کرسکتے ہیں جہاں
نٹوں کی تنصیب کی ضرورت ہے۔ ان یونٹوں کو چلانے کا خرچ حکومت برداشت کرے گی۔

کروں کے ذریعے پانی کی فراہمی

تمام اقدامات میں سب سے خاص کام ٹینکروں کے ذریعے پانی کی فراہمی ہے۔ فی الحال سب سے زیادہ متاثرہ
قوں میں ٹینکروں کے ذریعہ پانی کی فراہمی کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں موسم گرما کی آمد آمد کے پیش نظر پانی کے ٹینکروں
اضافہ کرنا از حد ضروری ہوگیا ہے۔ ایک ٹینکر کی قیمت دو لاکھ روپئے ہوتی ہے۔ ۰۰۰،۱۰ لیٹر پانی کی گنجائش والے

تعمیر راہ

۲۵۰ ٹینکروں کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں پانی کی نقل وحمل کے لئے بھی مستقل ٹینکروں کی ضرورت ہے۔ اس لئے ۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ لیٹر پانی والے تقریباً ۶۰۰ ٹینکروں کی فوری طور پر ضرورت ہے۔

پائپ کے ذریعے پانی کی فراہمی کی اسکیم

جہاں پائپ کے ذریعہ پانی کی فراہمی کی اسکیمات پر عمل ہو رہا ہے وہاں ان اسکیمات پر دو لاکھ سے ۱۰ لاکھ کے خرچ کا اندازہ ہے۔ رضاکار ادارے اس اسکیم کو روبہ عمل لا سکتے ہیں۔ یا دیہاتوں کا انتخاب کر کے فنڈ فراہم کر سکتے ہیں۔ اسکیمات پر عمل درآمد کا تمام خرچ ریاستی حکومت برداشت کرے گی۔ رضاکار ادارے اس سلسلے میں پائپ کے ذریعے پانی کی فراہمی اسکیمات پر عمل درآمد کے لئے ضروری اشیاء مہیا کر سکتے ہیں۔

پانی کی فراہمی کی شدید ضرورت کے پیش نظر پینے کے پانی اور فراہمیٔ آب کے ذرائع اور ٹینکروں کو صاف ستھرا اور صحت کے اصولوں کے عین مطابق رکھنا ہوگا۔ اس لئے صاف صفائی کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ۵۰ کلوگرام کے تقریباً ۶۰۰۰ ڈرمس کی ضرورت ہے۔ رضاکار ادارے ان کی فراہمی کا بندوبست کروا سکتے ہیں۔

چارے کی فراہمی

ریاستی حکومت نے چارے کی فراہمی کے لئے بہت سے اقدامات کئے ہیں۔ ریاستی حکومت نے امداد باہمی شکر خانوں اور رضاکار اداروں سے مویشیوں کا کیمپ کھولنے کی اپیل کی ہے۔ جس مقام پر بھی ایسا کیمپ کھولا جائے گا۔ ریاستی حکومت وہاں فی مویشی ماہانہ ۱۰۰ روپئے کی مالیت کے چارے کا انتظام کرے گی۔ علاوہ ازیں شکر کارخانوں کی جانب سے مویشی کیمپ کھولے گئے ہیں وہاں معدنیاتی حیاتین بڑھانے والے اجزار دینے کی ضرورت ہے۔ ہر جانور کو روزانہ ۲ کلو گرام کی ضرورت پڑتی ہے۔

ان اجزار پر کل اخراجات ۶ ماہ کے لئے ۱۰۰ مویشیوں پر تقریباً ۲۱۶۰ روپئے ہوگا۔ رضاکار ادارے اس سلسلے میں بھی مدد کر سکتے ہیں۔ وہ مویشیوں کے چارے کا بھی انتظام کر سکتے ہیں۔ ۱۰۰۰ مویشیوں کے ہر چھ مہینہ کے لئے ایسے چارے کے لئے اخراجات کا تخمینہ ۱۶ ر۲ لاکھ روپئے ہوگا۔

راحت کیمپوں میں لازمین کو ٹیکے لگانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں وہاں وٹامن کی گولیوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے وہاں کل ۷ لاکھ انجکشن، ۲۶ر۵۲ لاکھ وٹامن کی گولیوں اور ۱۴ لاکھ وٹامن "اے" اور وٹامن "بی" گولیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ رضاکار ادارے ان دواؤں کی فراہمی کا انتظام کروا سکتے ہیں۔ رضاکار ادارے "شجرکاری" کا کام بھی اپنے ذمے لے سکتے ہیں۔ شجرکاری کے کام کی قیمت کا اندازہ فی مربع کلومیٹر ۶ لاکھ روپئے ہے۔
متاثرہ طلبہ کے امتحانات کی فیس خود حکومت ادا کرے گی جس کے لئے احکامات جاری کئے جا چکے ہیں۔ اس سے ۴ر۱ لاکھ طلبہ مستفید ہوں گے۔ جس کے لئے ۵ر۸ لاکھ روپئے خرچ کئے جائیں گے۔ رضاکار ادارے اور مخیر حضرات اور فلاحی کاموں میں مصروف ادارے اس غرض سے قائم فنڈ میں اضافہ کر کے ریاستی حکومت کی مدد کر سکتے ہیں۔

تحریکی

وزیرِ اعلیٰ کا دورۂ مراٹھواڑہ

خشک سالی سے متاثرہ عوام کو دلاسہ

سنہ ۱۹۸۶ء کا سال ختم ہوچکا ہے۔ اسی کے ساتھ سنہ ۱۹۸۷ء کا نیا سال نئی امنگوں آرزوں اور پریشانیوں کو لیکر داخل ہوا ہے مہاراشٹر کے وزیرِ اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے اس نئے سال کی مبارکباد عوام کو دی۔ اور ساتھ ہی ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کا دورہ بھی کیا گیا، اس کا آغاز مراٹھواڑہ کے علاقوں سے کیا۔ اس دورے میں انہوں نے فرمایا کہ حکومت خشک سالی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن اس کام میں عوام کی مدد کی ضرورت ہے۔

مندرجۂ ذیل مضمون میں حکومت نے جو اقدامات کئے ہیں۔ ان کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

لیٰ شری شنکر راؤ چوان نے نئے سال کے آغاز ہ کے پہلے ہی ہفتے میں مسلسل تین دنوں کا مراٹھواڑہ لاتور، ناندیڑ اور پربھنی کے اضلاع کا دورہ کیا۔ لاتور اور ناندیڑ کے ضلع میں قندھار کے عوامی یم ایل اے، گرام پنچایت کے سرپنچ اس کے م سیاسی لیڈر اور افسران کی ایک میٹنگ میں ں نے یہ بھی جاننا چاہا کہ خشک سالی کے حالات نے کے لئے حکومت عوام سے کیا چاہتی ہے۔ علاوہ افسران کو درپیش مشکلات کا وزیر اعلیٰ زہ لیا۔

دوروں سے بات چیت:

حکومت کی جانب سے خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لئے "ضمانت روزگار اسکیم" پر مکمل طور پر عمل درآمد کرنے کے احکامات دیئے گئے۔ اسی مقصد کے تحت وزیرِ اعلیٰ نے گاؤں کے مختلف کاموں کا جائزہ لیا۔ اس میں عثمان آباد ضلع کے لاتور، خورد، دودھ ناٹھا، لاتور ضلع کے نند تھر گا کین گاؤں، ناندیڑ ضلع کے میر شونی، کھیرکا اور دیگر علاقوں میں صاف و شفاف پانی کا انتظام کیا گیا ہے، یا نہیں؟ یا ان گھروں میں پانی کی فراہمی اور مزدوروں تک پانی کی فراہمی کی گئی ہے یا نہیں۔ ؟ ان تمام کاموں کا جائزہ لیا۔ اطمینان بخش طریقے سے انجام دیئے گئے کام کو دیکھ کر وزیر موصوف نے مسرت کا اظہار کیا۔ لیکن جن کاموں کو انہوں نے غیر اطمینان بخش پایا۔ ان پر انہوں نے اپنی ناراضگی و خفگی

ـار کیا۔ نیز جہاں مزدوروں کی تعداد کو زیادہ پایا وہاں
ـنے زیادہ سے زیادہ کام فراہم کرنے کا حکم دیا۔ وزیر
ـف نے انہیں دوسرے روزگار فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا
ـک سالی کے ایام کچھ اور دنوں تک قائم رہیں گے اور پینے
ـانی کی کمی محسوس ہوگی۔ اس سلسلہ میں وزیر موصوف
ـنے فرمایا کہ پھر بھی مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ
ـگار فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ پینے کے پانی کے
ـئلے کو حل کرنے کے لئے پانی کی سطح کو مشینوں کے ذریعے
ـر لانے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ پانی کی سطح گہرائی میں جانے
ـوجہ سے بہت سے دیہاتوں میں پانی کی شدید قلت محسوس
ـرہی ہے۔ اس لئے وزیر موصوف نے فرمایا کہ پرکولیشن
ـابوں کو بنانے کے بعد ان تالابوں میں پانی جمع کیا جائے گا۔

پرکولیشن تالاب کے کام کو مکمل کرنے کے لئے مالی
ـشکلات درپیش ہونے کی وجہ سے کام کو زیادہ بڑھاوا
ـیں مل سکا ہے۔ افسروں کی ان مجبوریوں پر غور کرتے ہوئے
ـزیر اعلیٰ نے اس کام کے لئے ایک لاکھ ۵۳ ہزار کی رقم کو
ـبڑھا کر ۲ لاکھ روپے تک دینے کا وعدہ کیا۔

ـمویشیوں کے لئے حفاظتی مراکز:

وزیر اعلیٰ نے شکر کے کارخانوں کے مالکوں اور دیگر
ـسماجی اداروں سے گذارش کی ہے کہ وہ جانوروں کے
ـرہنے کے حفاظتی مراکز کی تعمیر میں مدد کریں۔ اس بات کو مدنظر
ـرکھتے ہوئے پربھنی ضلع کے ڈونگر کڈا کے مراٹھواڑہ سہکاری
ـشکر کارخانے نے اس موسم گرما میں دو مراکز بنوانے کے کام کی
ـذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے۔ اس کے علاوہ خشک سالی
ـسے متاثرہ عوام کی امداد کے لئے پانی کی فراہمی کی سہولت گاؤں
ـکو دی جائے گی۔ لیکن یہ سہولت صرف چند دنوں کے لئے
ـہوگی۔ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اس بات کو واضح الفاظ
ـمیں بتلا دیا گیا ہے۔
خشک سالی کے کاموں میں عوام کو امداد کرنی
چاہیئے۔ ہر ایک انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ انسانیت
کی خاطر کام کرے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ حکومت کے
پاس راحت کے کام کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ ایسا کہنے سے
ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ خشک سالی
سے مقابلہ کرنے کے لئے عوام میں اعتماد پیدا کرنا ضروری ہے
عوامی نمائندوں کو خشک سالی دور کرنے میں مدد کرنی چاہیئے
ان کاموں میں افسران کی مدد کی بھی ضرورت ہے۔
وزیر اعلیٰ جہاں مراٹھواڑہ کے عوام کے لئے نئے نہیں
ہیں۔ اس دورے کے موقع پر آپ جہاں بھی گئے وہاں
خشک سالی سے پریشان حال لوگ آپ سے ملاقات
کے لئے جوق در جوق اکٹھا ہوگئے۔ ان موقعوں پر وزیر اعلیٰ
نے فرمایا کہ خشک سالی کا مقابلہ کرنے میں حکومت
ان افراد کے ساتھ ہے۔ اس خوشخبری کو سن کر مراٹھواڑہ
کے عوام کے علاوہ مہاراشٹر کے خشک سالی سے
پریشان عوام کو بھی دلاسہ ملا۔

کیا آپ وزیر اعلیٰ کے خشک سالی راحت فنڈ میں
مدد کرنا چاہتے ہیں؟

وزیر اعلیٰ کے "خشک سالی راحت فنڈ" میں چندہ وصول کرنے نیز راحتی منصوبہ جات کے کاموں کی دیکھ ریکھ کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹیو سیل سچوالیہ جیمخانہ، پہلا منزلہ، جنرل جگن ناتھ راؤ بھونسلے مارگ، مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲ میں ۲۱ جنوری ۱۹۸۰ء سے جاری کیا گیا ہے۔

"وزیر اعلیٰ راحت فنڈ" میں چندہ دینے والے افراد اور ادارہ جات کی جانب سے عطیات کی وصولی سنیچر اور اتوار کو چھوڑ کر صبح ۱۱ بجے سے شام ۵ بجے تک کی جائیگی۔

اگر آپ عطیہ، چیک کی صورت میں دینا چاہتے ہیں تو اپنا چیک؛
"Chief Minister's Relief Fund"
"मुख्यमंत्री सहाय्यता निधी"
کے نام جاری کریں۔ مذکورہ بالا نام سے راحت فنڈ میں دی جانے والی رقم پر انکم ٹیکس قانون کی دفعہ ۸۰ جی کے تحت رعایت حاصل ہوگی۔

مہاراشٹر میں خشک سالی کی صورتِ حال
ایک وضاحت

مہاراشٹر میں سوکھے کے متعلق اخبارات میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بعض خبروں کے بارے میں حکومتِ مہاراشٹر نے قدرے وضاحت فرمائی ہے جو درج ذیل ہے۔

بات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ
ر اسکیم (E.G.S) کئی طرح سے ایک
ہے۔ حکومت نے یہ ذمہ داری بخوشی قبول کی
علاقوں کے ایسے غیر ہنرمند لوگوں کو روزگار
کام کے متلاشی ہیں اور ان کے لئے روزگار کے
ریعے کا انتظام کرے۔ اس اسکیم کی دوسری
ہے کہ اس قسم کے روزگار عموماً سیدھے ہی حکومت
یا ضلع پریشدوں کی طرف سے شروع کئے
ں لئے ان کاموں پر درمیانی کنٹراکٹروں کو
ورت نہیں ہوا کرتی۔ کام کرنے والوں کو کام
ر مقدار کے مطابق تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ دوسرے
ں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تنخواہوں کو پیداوار
ڑ دیا جاتا ہے۔
یم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقامی
رکت اور شمولیت ہوتی ہے نیز اس میں مقامی
یسے اصحاب کی نمائندگی ہوا کرتی ہے جو ان کاموں
ری میں اور عمل آوری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس
سعت اور پھیلاؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا
ں کم از کم ۶ لاکھ مزدور روزانہ اس اسکیم کے تحت
ں۔ اس نوعیت کی اسکیم ملک کی کسی دوسری
عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔

بعض خود مختار ایجنسیوں یا افراد کی جانب سے اس اسکیم کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے چنانچہ انھوں نے اس پر نیچے مندرجہ الفاظ میں تبصرے کئے ہیں:

(الف) مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں بے روزگاری ۱۲ فی صد کی حد تک گھٹ گئی ہے۔ اگرچہ آبادی میں ۱۷ فیصد اضافہ ہوا۔

(ب) کمزور ترین طبقے کے افراد جنھوں نے ضمانتِ روزگار اسکیم کے تحت کام کرنا پسند کیا انھیں اس کام پر عمل درآمد کے وقت سے ہی اچھا خاصا فائدہ حاصل ہوا ہے۔

(ج) ضمانتِ روزگار اسکیم نے ان علاقوں میں جہاں مزدور پیشہ افراد کی تعداد زیادہ ہے اس پروگرام کی ترقی پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔

(د) ضمانت روزگار اسکیم نے کاشتکار مزدوروں کی کم ترین تنخواہ کے اسکیل کو قائم کرنے پر اچھا اثر ڈالنے میں مدد دی ہے اور اس طرح ان کی بدحالی سے فائدہ اٹھانے اور لوٹ کھسوٹ کرنے کے رجحان کو ختم کیا۔

ہم نے مختلف تعمیری مشوروں کو نیز اخباروں کے آرٹیکلوں میں جلاکی رنگی کرتا ہیوں کو نوٹ کرلیا ہے اور اس بات کی بہترین کوشش کر رہے ہیں کہ اسکیم مذکورہ پر عمدگی کے ساتھ

قومی راج

عمل درآمد کیا جائے اور کام کرنے والے مزدور مطمئن رہیں اور ان کے لئے کام کے مستقل ذرائع پیدا کئے جا سکیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے اس اسکیم کو نئے چیلنجوں کا مقابلہ پیش آ رہا ہے، جہاں ہماری طرف سے اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ اس اسکیم کے پس پشت جو ابتدائی فلسفیانہ خیالات اور تصورات تھے وہ بحال رہیں وہیں اس بات پر بھی توجہ دی جا رہی ہے کہ اسکیم پر عمل آوری کے دوران جو نئے مسائل پیدا ہوں انھیں بھی بر وقت مؤثر طور پر حل کر دیا جائے۔

سوکھے کی وجہ سے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں عمل درآمد کے سلسلے میں نیچے مذکورہ فیصلے کئے گئے ہیں۔

(الف) جہاں تک ممکن ہو کام ۵ سے ۸ کلو میٹر کے اندر دئے جانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

(ب) پرکولیشن تالابوں کے قاعدے اور نرم کر دئے گئے ہیں۔

(ج) ہر گاؤں میں ایک مزید تالاب رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

(د) چھوٹے آبپاشی اور درمیانی آبپاشی کے منتخبہ منصوبے جو بجٹ میں شامل نہیں ہیں ان کو ان گاؤں میں اس اسکیم کے تحت جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہے جہاں کثرت کے ساتھ مزدور موجود ہیں۔

(ہ) ضمانت روزگار اسکیم کے پروگرام کے سلسلے میں لوگوں کی بھرتی کرنے اور کام پیدا کرنے والے دفاتر کے اختیارات کو وسعت دینے کے کام علاقائی کمشنریوں کو سونپ دئے گئے ہیں۔

(و) جو اشیا ر ٭ کا ؤ ڈیپ ٭ (تخمینہ کار محکمے) کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں ان کی الگ الگ منظوری عطا کرنے کا اختیار کلکٹروں کو دے دیا گیا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ملازمت کے مواقع کی کمی کے سبب بعض دیہی علاقوں سے یعنی تعلقہ سنگمنیر (ضلع احمد نگر) تعلقہ مان (ضلع ستارا) اور تعلقہ بنار (ضلع ناشک) سے لوگوں کی کثیر تعداد ترک وطن کر چکی ہے۔
حکومت کے پاس مختلف قسم کے ایسے کاموں کی تفصیلات موجود ہیں جن کے ذریعے آئندہ ملازمت کے طلبگاروں کو ملازمت پر لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دیہاتوں سے دیہی مزدوروں کا شکر کے کارخانوں کی طرف جانا ایک عام بات رہی ہے جن کا ترک وطن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں نقل مکانی سے ان مزدوروں کو روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہونے کے ساتھ گنے کے رس نکلے ہوئے پھوس سے ان کے چوپایوں کو خوراک بھی مل جاتی ہے۔

ضلع احمد نگر کے سنگمنیر تعلقہ ضلع ستارا کے مان تعلقہ اور ضلع ناشک کے بنار تعلقہ میں جن کا ذکر بعض اخبارات میں آیا ہے، ضمانت روزگار اسکیم کے تحت کاموں کی کافی تعداد جاری ہے۔ بلکہ ایسے کئی کام موجود ہیں جہاں مزدوروں کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ کام پر لگائے جائیں گے۔

ایسے دیہاتوں کی تعداد تقریباً ... ر۱۲ ہے، جہاں پینے کے پانی کی قلت ہے۔ ان کے سلسلے میں نیچے مذکورہ اقدامات کئے جا چکے ہیں:

طریقہ کار	دیہات
۱: بورنگ کنویں۔ دستی پمپوں کے ساتھ	۴۱۴۰
۲: بورنگ کنویں پاور والے پمپوں کے ساتھ	۸۲۴
۳: عارضی طور پر پائپ کے ذریعے پانی کا بندوبست	۱۶۹۹
۴: پائپ کے ذریعے پانی کا بندوبست بعجلت تمام	۱۷۱۳
۵: عارضی طور طریقے پر کنوؤں کو گہرا کرنا، کنوؤں کی کھدائی	۳۷۵۶
۶: پرائیویٹ کنوؤں کو سرکاری اختیار میں لینا	۴۸۵
۷: پانی پہنچانے والے ٹینکروں / بیل گاڑیوں کے ذریعے پانی کی فراہمی	۳۴۸۱

جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں ان کی تعداد بہ نسبت ان دیہاتوں کے کہیں زیادہ ہے جہاں پانی کی قلت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دیہات ایسے ہیں جہاں ایک طریقہ کی جگہ کئی طریقے استعمال کرنے پڑے ہیں تاکہ پانی آسانی کے ساتھ پہنچایا جا سکے۔

دیہاتوں کے لیے پانی کی فراہمی کا کام ہیک وقت کئی منصوبوں پر عملدرآمد چاہتا ہے:

۱:- موجودہ پانی کی فراہمی کی اسکیموں کو عملاً جاری رکھنا۔

فراہمی کی جو اسکیمیں جاری ہیں ان پر زیادہ تیزی
کرنا۔
رنگ کنوؤں کو زیادہ گہرا کر کے بجلی کے
کے ذریعے زیادہ پانی حاصل کرنا۔
نی کی فراہمی کی عارضی اسکیموں کو عمل میں لانا اور
کو زیادہ اختیارات سونپنا تاکہ وہ دس لاکھ
لک کی منظوری عارضی طور پر پانی کی فراہمی کے
سکیں۔
رمت اور دیکھ ریکھ کے فنڈ کا قیام اور ریاستی
سے فنڈ مذکور کے لئے ۵ فیصد رقم کا مطالبہ

یادہ سے زیادہ ۲۵۰۰، اور کم سے کم ۱۰۰، آبادی
توں کے لیے بورنگ کنوؤں کے پروگرام
نا۔
مشنری اور اوزار و آلات وغیرہ میں اضافہ
ی۔ ایس۔ ڈی کے ذریعے ۳۵۰ پرائیویٹ
رگس (R/G) (۵۰ سرکاری رگس کے علاوہ)
کے ذریعے کنوؤں کی کھدائی کا کام انجام
سکیں۔

پانی کی فراہمی

حال ۴۴۰ دیہاتوں میں ۳۷۴ ٹینکروں / بیل گاڑیوں
فراہمی کی جارہی ہے۔ اسی طرح متاثرہ دیہاتوں میں
فراہمی آب اسکیمات اور ٹینکروں کے ذریعے پانی
ی جاری ہے۔ حکومت نے جاریخ کے لئے دستوں کا تقرر کیا
ں میں ٹینکروں / بیل گاڑیوں کے ذریعہ فراہمی آب کے
ریں گے۔
تی پمپوں کی ریاست بھر میں تنصیب کی جاچکی ہے۔ یہ
وؤں پر کی گئی ہیں۔ تقریباً ۶۲۰۰ بجلی کے پمپوں کی
عمل میں آچکا ہے۔ ان پمپوں میں سے ۱۰۰ / ۶۵ دستی
بجلی کے پمپ چالو حالت میں ہیں۔ اس لحاظ سے دستی
سے چلنے والے پمپوں کا فیصد علی الترتیب مجموعی تعداد کا ۹۵ اور ۹۱

ان دستی پمپوں اور بجلی سے چلنے والے پمپوں کی ریپیرنگ کا کام ضلعی
سطح پر متعین کردہ عملہ، حکومت کے مقررہ قوانین کے مطابق انجام
دیتا ہے۔
فراہمیٔ آب کی اسکیم اور دستی پمپوں کو صحیح ڈھنگ سے چالو رکھنے کے
لئے اور ضلع پریشد کو مناسب فنڈ مہیا کرنے کی غرض سے حکومت نے
۳۵۰ روپئے فی دستی پمپ کی منظوری دی تھی۔ یہ منظوری گذشتہ
خشک سالی کے دوران دی گئی تھی یعنی نومبر ۱۹۸۵ء تا اکتوبر ۱۹۸۶ء
کے دوران۔ مزید برآں نومبر ۱۹۸۶ء میں حکومت نے دیکھ ریکھ، اور
ریپیر فنڈ" کی اسکیم کی شروعات بھی کی ہے اور منجملہ منصوبہ بندی
کا ۵ فیصد اس فنڈ پر عمل آوری کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ نیز ضلع پریشد
کو بھی اس بات کی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس فنڈ میں اپنے ذاتی
وسائل سے ۲۰ فیصد جمع کریں بیس دی، پی سے جو رقم "تفریحی ٹائر
سسٹم" کے تحت وصول کی جاتی ہے اسے اس فنڈ میں جمع
کرنا ہوگا۔
عثمان آباد اور مراٹھواڑہ کے ضلعوں میں گراؤنڈ سروے اینڈ
ڈیولپمنٹ ایجنسی کی طرف سے لگائے گئے بور کنوؤں سے جو پانی حاصل
کیا جاتا ہے اس کے متعلق تفصیلات یوں ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۶ء کی پوزیشن

نمبر شمار	ضلع کا نام	کھودے گئے بور کنوؤں کی تعداد	جن تعداد میں کامیاب ہوئے	کامیابی کا فیصد
۱	مراٹھواڑہ	۲۴۹۰۴	۱۷۷۵۴	۷۱٫۲۸
۲	عثمان آباد لاتور	۶۲۰۳	۵۱۲۶	۸۲٫۶۴

ان پر نصب کردہ دستی پمپوں کی تعداد	نصب کردہ بجلی پمپوں کی تعداد
۱۶۶۰۵ ۴۶۳۱	۱۳۹ ۴۹۵

مذکورہ بالا گوشوارہ سے یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ عثمان
آباد ضلع میں کھودے گئے کامیاب بور کنوؤں کی تعداد ۸۰ فیصد سے بھی
زائد ہے۔
ایسے بور کنوئیں جو دیہی فراہمیٔ آب پروگرام کے تحت کھودے
جانے والے ہیں۔ ان کی کھدائی کے متعلق فیصلہ متعلقہ ضلع کی ڈسٹرکٹ
کوآرڈینیشن اور مانیٹرنگ کمیٹی کرے گی۔

اورنگ آباد ضلع کے نائی گاؤں قصبہ میں جس فراہمیٔ آب اسکیم کا
تذکرہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ بات صحیح ہے کہ عارضی پائپ کے ذریعے

پانی کی فراہمی کی اسکیم جاری ہے اس پر تقریباً ۶۳ ر ۲ لاکھ روپئے خرچ ہونے والے تھے اس کے لئے مارچ ۱۹۸۲ء میں کام شروع کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ تاہم وہاں کے باشندوں کو پانی نہایت قلیل مقدار میں دستیاب ہورہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن جگہوں سے پانی حاصل کیا جاتا تھا وہاں اب پانی کی قلت پیدا ہوگئی ہے اب اس بات کی تجویز زیر غور ہے کہ جن پائپوں کے ذریعہ عارضی طور پر پانی فراہم کیا جاتا۔ ہے ان پائپوں کو مستقل شکل دیدی جا.

آب پاشی

جہاں تک آبپاشی کا تعلق ہے ۳۴ بڑے اور ۸۴ درمیانی آبپاشی کے پروجیکٹ زیر تعمیر ہیں اور ان پر جون ۱۹۸۵ء میں ۵۸۱۶ کروڑ روپیہ کی لاگت کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ ان پروجیکٹوں پر یکم اپریل ۱۹۸۶ء تک ۳۸۱۰ کروڑ روپے خرچ کیے جاچکے ہیں۔ ۱۲۷ بڑے اور درمیانی پروجکٹوں کے لیے جون ۱۹۸۵ء تک ۶ر۶۲ لاکھ ہیکٹرس کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ ان کی تکمیل پر ۲۰۱۵۵ لاکھ ہیکٹرس کی مزید صلاحیت پیدا ہوجائے گی۔ بڑے اور درمیانی پروجکٹوں کے لیے ۱۹۸۶/۸۷ء میں رکھی گئی گنجائش ۲۹۳ کروڑ روپئے کی ہے۔

جون ۱۹۸۶ء تک اجتماعی آبپاشی کے لئے ۳۳ر۲۳ لاکھ ہیکٹرس کی صلاحیت بڑے درمیانی اور چھوٹے ریاستی سیکٹر) پروجکٹوں کے ذریعہ پیدا کی جاچکی ہے۔

۴ بڑے اور ۵ درمیانی آبپاشی کے پروجیکٹ ناسک ضلع میں زیر تعمیر ہیں۔ ان میں سے کاروا میں بڑا آبپاشی پروجیکٹ جاری ہے اس سے سنیر تعلقہ مستفید ہورہا ہے۔ یہ پروجیکٹ ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے اور ۲۰ر۱۱ کروڑ روپئے میں سے مارچ ۱۹۸۶ء کے آخر تک ۳۵ر۲ کروڑ روپئے اس پروجیکٹ پر خرچ کئے جاچکے ہیں۔

فی الحال ریاست میں تقریباً ۱۰ لاکھ آبپاشی کے لئے کھودے گئے کنویں موجود ہیں۔ جی۔ ایس۔ ڈی۔ اے نے بھی اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ۴۲ر۱۷ لاکھ آبپاشی کے لیے کنووں کی کھدائی کی جاسکتی ہے

۲۴ر اضلاع میں واقع ۱۸۹ تعلقہ جات میں ۱۴۲۱۱ دیہات خشک سالی سے متاثر ہوئے ہیں ان میں سے ۸۲، دیہاتوں میں ٹنکاں

طور پر ٹینکروں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی کی جارہی ہے۔ اکولہ، بلڈھانہ، گڈچرولی، زنباگیری اور سندھودرگ کے اضلاع میں سے کسی بھی ضلع کے دیہات میں ٹینکروں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی نہیں کی جارہی ہے۔ عثمان آباد ضلع کے صرف ۲۶ ر دیہاتوں میں ٹینکروں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی کی جارہی ہے۔

عثمان آباد، اورنگ آباد اضلاع میں کسی بھی مقام سے ایسی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی ہے کہ جانوروں کے لیے چارہ کی کمیابی ہے اور یہ کہ چارہ کی کم یابی کے باعث جانور بڑی تعداد میں فروخت کئے جارہے ہیں۔

اورنگ آباد اور ناسک اضلاع سے ایسی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی ہے کہ وہاں آباد لوگ بڑی تعداد میں دوسرے مقامات پر کام کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۸۷ء کو خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں ضمانت روزگار اسکیم کے تحت جاری کاموں کی تعداد ۴۴۳۸ تھی اور صلاحیت روزگار ۸۹ر۶ لاکھ مزدور تھی جب کہ صرف ۱۷ر۵ لاکھ مزدور کام پر حاضر ہوئے۔

پس اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ریاستی حکومت موجودہ خطرناک خشک سالی کے حالات پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے اور ان حالات سے متاثر افراد اور جانوروں کی تکالیف پر بھرپور توجہ دے رہی ہے۔

حکومت جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ تمام اقدامات کررہی ہے جو متاثرہ افراد کو راحت پہونچا سکیں۔ اس طرح کے ناگفتہ بہ حالات میں چند کوتاہیوں کا سرزد ہونا بعید از قیاس نہیں ہے اور آزاد اور حساس اخبارات ان کوتاہیوں کی طرف ضرور توجہ مبذول کرواتے ہیں لیکن حکومت کی مشنری جس پرخلوص جد وجہد سے لوگوں کی مشکلات اور پریشانیوں کا سد باب کرنے میں منہمک ہے اسے ضرور بالضرور قابل ستائش گردانا جانا چاہیے۔

○

○

ـدی اُدّے مہنت
ـبٹ انفارمیشن آفیسر، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

اورنگ آباد ضلع میں خشک سالی کا
مُقابلہ کرنے کیلئے حکومت کے مؤثر اقدامات

حکومتِ مہاراشٹر نے ریاست میں خشک سالی کے حالات کا جنگی پیمانہ پر مُقابلہ کرنے کے لئے ایک اسکیم بنائی ہے۔ اس لحاظ سے اورنگ آباد ضلع میں خشک سالی کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت قدم اٹھا رہی ہے۔ تاکہ عام آدمی بھی حکومت کی فراہم کردہ سہولتوں سے پوری طرح مستفید ہو سکے۔
مندرجہ ذیل مضمون میں حکومت نے جو اقدامات کئے ہیں ان کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ـذشتہ چار سالوں میں اورنگ آباد ضلع میں بہت کم ـہوئی۔ اس کا اثر کھیتی کی فصل پر اور زمین پر ہوا لیکن ـتِ مہاراشٹر نے حسبِ روایت ان حالات کا مقابلہ ـکے لئے اپنے آپ کو مکمل طور پر تیار کر لیا ہے۔ حکومت ہر ـدامات کر رہی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے " ضمانت روزگار ـلیم " کے تحت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام فراہم ـنے کے احکامات جاری کر دیتے ہیں۔ تاکہ عام آدمی بھی ـسالی کا بھرپور مقابلہ کر سکے۔

ضمانت روزگار اسکیم پر عمل آوری :

وزیرِ اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان کی دُور اندیشی بھی عام آدمی کے مسائل حل کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔ اور آج اورنگ آباد ضلع میں کل ۲۷۵ مقامات پر کاموں کی شروعات کی جا چکی ہے۔ ان مقامات پر ۱۹۶۰۱ مزدوروں کو روزگار حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اقدامات کافی ہیں۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ضلع کے آفیسر

[illegible]

شری راجیو سنہا نے عوام کے نمائندوں کی طلب کردہ ایک میٹنگ میں خشک سالی کے حالات کا جائزہ بڑی سنجیدگی سے لیا۔ ضلع میں جس شخص کو روزگار چاہیے اسے روزگار دینے کے لیے اورنگ آباد ضلع میں تعلقہ یونٹ کی تشکیل کی گئی ہے۔ تحصیل کے مزدوروں کو اس تحصیل میں کام دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ ۷ لاکھ ۵۰ ہزار افراد کو کام فراہم کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ۱۱۰۰ سینچائی کے کام، ۴۸ نئی کھیتی تیار کرنے کے کام، ۵۷ درخت لگانے کے کام، ۲۴ راستے تیار کرنے کے کام جاری کیے گئے۔

۴۸۴٫۲ ملی میٹر بارش

اس سال ضلع میں صرف اوسطاً ۴۸۴٫۲ ملی میٹر بارش ہوئی۔ اس میں سے اورنگ آباد تعلقہ میں ۴۲۵٫۰۰ ملی میٹر، پیٹھن تعلقہ میں ۴۶۷٫۱۶ ملی میٹر، سلوڑ تعلقہ میں ۵۱۵٫۲۰ ملی میٹر، [illegible] گاؤں تعلقہ میں ۶۴۹٫۵ ملی میٹر۔ بیجاپور تعلقہ میں ۲۸۵٫۶ ملی میٹر، گنگاپور تعلقہ میں ۳۵۶٫۶ ملی میٹر، کنڑ تعلقہ میں ۴۰۲٫۳ ملی میٹر، خلدآباد تعلقہ میں ۴۲۲٫۴ ملی میٹر بارش ہوئی۔ اسی وجہ سے کافی مقدار میں کھاد اور بہترین بیج فراہم کرنے کے باوجود خاطر خواہ فصل نہیں اگ سکی۔

۲ لاکھ ۴۳ ہزار ہیکٹر میں فصل کی بوائی:

اورنگ آباد ضلع میں ربیع کی فصل ۳ لاکھ ۹۲ ہزار ۷۰۰ ہیکٹرس میں لگائی جاسکتی ہے۔ امسال دو لاکھ ۴۳ ہزار ۱۹۷ ہیکٹرس میں ربیع کی فصل کا کام شروع کیا گیا۔ ربیع کی فصل میں جوار کی فصل ایک لاکھ ۹۲ ہزار ۸۵۷ ہیکٹرس میں اگائی گئی۔ اکتوبر میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ آئندہ ماہ بارش ہو اس امید پر کسانوں نے ربیع کی فصل کی بوائی کا کام کیا تھا۔ لیکن اکتوبر تک بارش نہ ہونے کے سبب بوئے ہوئے بیج سے پوری طرح سے کونپلیں نہیں نکل سکیں۔ ان نازک حالات کے پیش نظر حکومت نے یہ احکامات جاری کیے کہ کسانوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہونا چاہیے۔ اسی لیے پیسے واری پر عمل درآمد کیا گیا۔ اورنگ آباد ضلع میں کل ۱۳۴۴ گاؤں ہیں۔ ان میں سے ۶۸۳ گاؤں خریف فصل کے اور ۶۴۱ گاؤں ربیع فصل کے ہیں۔ یہاں ۱۰۷۵ دیہات ایسے ہیں جہاں بارش ہوتی ہے۔ ضلع حکام نے اس کی پیسہ واری مقرر کی ہے۔ اسی طرح سے ۲۰۷ دیہاتوں میں جہاں بارش ہوتی ہے ان کی پیسہ واری ۶۰ یا ۶۰ سے کم مقرر کی گئی ہے۔ ۴۸ گاؤں میں ۶۰ سے زیادہ اور جہاں بارش نہیں ہوتی اس خطے کے ۲۲ گاؤں کی پیسہ واری ۵۰ پیسے سے کم رکھی گئی۔ اس طرح سے ۲۳۲ دیہاتوں کی پیسہ واری ۵۰ پیسے سے زیادہ رکھی گئی ہے۔

فراہمی آب کی ترکیبیں:

بارش کی کمی کی وجہ سے امسال بھی پینے کے پانی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ضلع پریشد کے چیف ایگزیکیٹو آفیسر شری آنند کلکرنی نے ماہ اکتوبر، نومبر میں سب تعلقوں کا دورہ کیا۔ انھوں نے ہر تعلقہ میں عوامی نمائندوں اور افسران کی میٹنگ طلب کی، اور پینے کے پانی کے حالات کا جائزہ لیا۔ شری اروند کلکرنی نے ہر گاؤں کے حالات کے بارے میں ایک کتاب تیار کی ہے اور حسب منصوبہ ان گاؤں میں جن میں پینے کے پانی کی قلت ہے، فراہمی آب کے لیے مختلف ترکیبوں کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں کام کی شروعات بھی کر دی گئی۔

فی الحال اورنگ آباد ضلع میں ۲۸ گاؤں میں پینے کا پانی ۱۱ ٹینکوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ضلع کے ۶۵ گاؤں میں کنوئیں کی گہرائی کا کام اور ان کی درستی کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ ۴۳ گاؤں میں ٹینکر یا بیل گاڑی کے ذریعے پانی کی فراہمی کی جائے گی اور ۱۷ خانگی کنوؤں کے ذریعے بھی لوگوں کو پانی ملا کرے گا۔

امسال ۶۳۱ گاؤں میں پینے کے پانی کی فراہمی کا انتظام چیف ایگزیکیٹو آفیسر نے کیا ہے۔ اس طرح سے امسال موسم

(باقی صفحہ نمبر ۱۴ پر)

یا فنڈ، صرف خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کی راحت کیلئے خرچ کیا جائیگا

وزیر اعلیٰ کی یقین دہانی

وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان نے فرمایا کہ
شک سالی راحت فنڈ کے لئے جمع کی گئی رقم
شک سالی کے راحت کے کاموں کے لئے ہی
رف کی جائے گی۔ آپ تاجروں، لیبر
رگنائزیشن، تجارتی اداروں کے نمائندوں، ایم ایل اے
م، پی حضرات سماجی خدمت گاروں سماجی
ر رضاکار تنظیموں سرکاری عہدیداروں کی
ا جنوری کو منترالیہ (بمبئی) میں منعقدہ
یٹنگ سے خطاب فرمارہے تھے۔ اس میٹنگ
میں خشک سالی راحت فنڈ کے استعمال کے بارے
میں بات چیت کی گئی۔

علیٰ نے فرمایا کہ خشک سالی کی وجہ سے عوام
یاستی ضمانت روزگار اسکیم کے تحت روزگا
ے گا۔ حکومت نے ایسے کاموں کے لئے کچھ
کئے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ حکومت نے
، سرکاری عہدیداران کو احکامات بھی دئے
شری چوان نے فرمایا کہ پینے کے پانی کی فراہمی اور
میں راحت کے کاموں کو اولیت دی جائے گی۔
یا کہ متاثرہ علاقوں کے عوام کی ان کے علاقوں
ام کی مانگ ہے۔ یہ ہمیشہ ممکن نہیں ہے آپ
م کچھ کلومیٹر تک مسافت کرنے پر تیار ہوجائیں
ہیا کیا جائے گا۔ حکومت اس صورت میں
ورٹ مہیا کرنے پر غور کررہی ہے۔
اعلیٰ نے فرمایا کہ حکومت نے خشک سالی اور
کے کاموں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ۷ سے ۱۰
ائم کی ہیں۔ یہ کمیٹیاں متعلقہ عوام سے رابطہ

قائم کریں گی۔ آپ نے فرمایا کہ آپ ان کمیٹیوں کے کاموں کا
بذات خود مشاہدہ کریں گے، اور آپ جب بھی بمبئی میں
رہیں گے۔ ان دنوں آپ روزانہ ایک گھنٹہ صبح ۶ بجے سے
۷ بجے تک خشک سالی راحت فنڈ کے لئے موصول
ہونے والے چیکوں کو قبول کریں گے۔

ب۔ پی۔ سی۔ سی کے صدر شری مرلی دیورا، ایم پی نے
فرمایا کہ خشک سالی راحت کام کے لئے زندگی کے تمام شعبوں
سے تعلق رکھنے والے مختلف اداروں کی طرف سے حکومت
کو مدد مل رہی ہے۔ آپ نے مشورہ دیا کہ سچیوالیہ جمخانہ
میں ایک دفتر جاری کیا جاسکتا ہے۔ جہاں وہ شری شرد پوار
اور شری میتی پربھا راؤ روزانہ بیٹھ کر راحت کے کاموں
کا معائنہ کریں گے۔

مہاراشٹر کے سابق نائب وزیر اعلیٰ شری رام راؤ آدِک
نے مشورہ دیا کہ مہاراشٹر کے ۲۰۰۰ چیریٹی ٹرسٹوں کو
اپنے چھ مہینوں کی آمدنی راحت کے کاموں میں دینا چاہیئے

قومی راج

ریاست میں واقع صنعتوں کو راحت کے کاموں کے لئے ایک مقررہ نشانہ مقرر کرنا چاہیئے۔

کامگار آگر شا سبھا کے صدر مسٹر گلاب جوشی نے اس موقع پر سبھا کی جانب سے وزیر اعلیٰ راحت فنڈ میں ۱۱ لاکھ روپے کے عطیہ کا اعلان کیا۔ آپ نے خشک سالی سے متاثرہ دیہات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی قبول کی۔

آل انڈیا فلم پروڈیوسرس کونسل کے صدر راج نہلا نے فرمایا کہ فلم اسٹاروں اور مشہور کرکٹروں کے درمیان میچ منعقد کرا کے راحت کے کاموں کے لئے ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کی جانی چاہیئے۔ اگر گورنمنٹ اس میچ کو ٹی۔ وی سے ٹیلی کاسٹ کرے تو بہت سے ادارے اس میچ کو پیش کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ جس سے اس فنڈ میں مدد ملے گی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ آنے والی ہندی فلموں کے اس سلسلے میں ایک یا دو چیریٹی شو منعقد کئے جائیں تو اس فنڈ کے لئے رقم جمع کی جا سکتی ہے۔

شریمتی باکل پاٹل نے مشورہ دیا کہ ڈربی کی طرح گھوڑوں کی ایک خصوصی ریس منعقد کرا کے خشک سالی راحت فنڈ کے لئے رقم جمع کی جا سکتی ہے۔

سابق وزیر مملکت شری شیواجی راؤ پاٹل نے گنوں کی فصل کے بعد وہاں افریقیائی گھاس اگانے کے لئے پانی کی فراہمی کی حکومت سے درخواست کی جس سے چارے کے مسئلہ کا حل کیا جا سکتا ہے۔

مہاراشٹر سہکاری ساکھر کارخانہ مہا سنگھ کے صدر شری دشونتانا پاٹل نے وزیر اعلیٰ راحت فنڈ میں ۴ لاکھ روپے کا چیک پیش کرتے ہوئے یقین دلایا کہ شکر کے امداد باہمی کارخانے اس سلسلے میں مزید مدد کریں گے۔

میٹنگ میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس کے چیرمین ڈاکٹر بھابھا، لیبر لیڈر شری راہیجا، شری یشونت چوان، شری ایچ۔ این۔ ترویدی، شریمتی اہلیہ رنگنیکر، شری منوہر جوشی شیوسینا، مسٹر رنگا ایچ۔ ایم۔ ڈی، سابق شری بھاؤ راؤ شیٹے اور دیگر ممتاز حضرات نے راحت کے کاموں کے بارے میں مفید مشورے دیئے۔

صفحہ نمبر ۱۲ سے آگے

اورنگ آباد ضلع میں خشک سالی۔۔

گرما میں "گر جاپروجیکٹ" کا پانی خلد آباد شہر میں فراہم کیا جائے گا۔ ضلع کے ایڈمنسٹریشن نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

چارے کا مسئلہ :

بارش نہ ہونے کی سبب گزشتہ ۲ دو سالوں سے چارے کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ امسال قریب میں واقع مہاراشٹر راجیہ سہکاری ادیواسی وکاس منڈل سے ۵۰۰۰ میٹرک ٹن چارہ منگوایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھنڈارہ ضلع سے بھی چارہ منگوایا جا رہا ہے۔ اگر حالات بہتر ہوئے تو، شکر کارخانوں سے، جنگلاتی محکموں سے جانوروں کے لئے چارہ کا انتظام کیا جائے گا۔ اس بات کا فیصلہ ضلع ایڈمنسٹریشن نے کر لیا ہے۔

افسران کی کمیٹی :

ضلع کلکٹر نے ضلعی سطح پر خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لئے افسران کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس سلسلے میں ہر ہفتہ، پیر کے روز، اس معاملے پر بحث کی جائے گی۔ اسی طرح سے افسران کی ہر ماہ عوام کے نمائندوں سے ان معاملات میں گفتگو ہوا کرے گی۔

خشک سالی کے حالات پر قابو پانے کے لئے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اورنگ آباد ضلع میں ٹھوس اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

ریاض احمد خان

مہاراشٹر میں پانی کی سہولت

مہاراشٹر میں خشک سالی کی وجہ سے دیہاتوں اور چند بڑے بڑے شہروں میں پینے کے پانی کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔
دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں صاف پانی مہیا کرنے کی غرض سے حکومت نے جو اقدامات کئے ہیں بطور خاص ان میں سے چند کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے جہاں موسم ہر سال الگ الگ ڈھنگ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کبھی کبھی برسات کے موسم میں شروع ہوتے ہی موسلا دھار مینہ برسنے لگتا ہے۔ تو کبھی درمیان میں یا آخر وقت میں بارش کثرت سے ہونے لگتی ہے کہیں سیلاب آجاتے ہیں اور کہیں بارش نہ ہونے کی وجہ سے سوکھا پڑجاتا ہے۔ سوکھا زدہ علاقوں کی ملک میں کمی نہیں ہے یہاں ایسے بھی علاقے موجود ہیں جہاں مسلسل چار چار، پانچ پانچ سال تک بارش نہیں ہوتی جس کی وجہ سے نہ صرف انسانی زندگی خطرے میں پڑجاتی ہے بلکہ جانوروں کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ صاف ستھرا پانی مہیا نہ ہونے کی وجہ سے انسان اور جانور دونوں ہجرت شروع کردیتے ہیں اور ان علاقوں کا رخ کرتے ہیں جہاں صاف ستھرا پانی میسر ہوسکے۔

جس طرح ملک کے دوسرے اضلاع میں صاف ستھرے پانی کی قلت محسوس ہوتی ہے بالکل اسی طرح ریاستِ مہاراشٹر کو بھی اس مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

مہاراشٹر کے کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں متواتر چار چار پانچ پانچ سال تک بارش نہیں ہوتی ایسے مقامات پر صاف ستھرے پانی کا مہیا کرنا بہت مشکل ہے جس کی ادائیگی کے لئے حکومت کی پوری مشینری حرکت میں رہتی ہے اور ہر ممکن اقدام کرتی ہے کہ کسی طرح صاف پانی حاصل کیا جاسکے تاکہ دیہاتوں اور دور دراز علاقوں میں بسنے والے لوگ اس سے مستفیض ہوسکیں۔ حکومت خود نہیں چاہتی کہ پانی کی وصول یابی کے لئے انسانوں کو نقل مکانی کرنا پڑے۔ یہ بات یقینی ہے کہ جب دیہاتوں میں صاف پانی کا ملنا دشوار ہوگا تب وہاں کے بسنے والے لوگ پانی کی تلاش میں بڑے بڑے شہروں کا رخ کریں گے جس سے ان کی مشکلات کا کچھ حل تو ضرور نکل آئے گا کیونکہ انھیں شہروں میں صاف ستھرا پانی مہیا ہوسکے گا مگر شہر کی انتظامیہ کے لئے مزید مشکلیں پیدا ہوجائیں گی جو بذاتِ خود ایک مسئلہ ہوگا جس سے نبرد آزما ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ریاست مہاراشٹر ایک جغرافیائی اہمیت کی حامل ہے اس ریاست کا مغربی حصہ پہاڑی علاقہ میں ہے جس میں تھانے، رائے گڈھ، سندو درگ، رتناگیری کے اضلاع شامل ہیں۔ ایسے ہی ضلاع سے لگا ہوا ضلع کولہاپور ہے۔ مہاراشٹر میں یہ اضلاع ایسے ہیں جہاں بارش بکثرت ہوتی ہے۔ مگر انہیں اضلاع کے مشرقی حصہ میں ہی مہاراشٹر کا وہ علاقہ ہے جہاں پانی کی قلت ہر ہر قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ تقریباً ۱۸ لاکھ ۵ ہزار ۱۰ مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ رقبہ ایسا ہے جہاں سالانہ بارش کا اوسط ۴۰۰ سے ۵۰۰ ملی میٹر تک ہے جن میں دھولیے، ناسک، پونے، مغربی اورنگ آباد، بیڑ، احمد نگر، شولاپور اور سانگلی شامل ہیں۔ یہ اضلاع ہر سال خشک سالی کا شکار ہوتے ہیں جہاں صاف ستھرے پانی کی بھی اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

ریاست مہاراشٹر ۱۵، ۳۰۷ ہیکٹر اراضی پر مشتمل ہے جس میں سے صرف ۱۹۹ لاکھ ہیکٹر زمین قابل کاشت ہے۔ کم و بیش ریاست میں ۱۸ تعلقے ایسے ہیں جہاں پر مستقل پانی کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

حکومت مہاراشٹر کے سامنے دیگر ضروری امور کے ساتھ ہی ساتھ ایک اہم مسئلہ صاف ستھرا پانی مہیا کرنا بھی ہے جس کے بغیر ہمارے دیہات، ہمارے گاؤں میں بسنے والے لوگوں کی زندگی تکلیف دہ بن کر رہ گئی ہے

صاف پانی کی فراہمی آج بھی محسوس ہو رہی ہے بلکہ یہ ضرورت برسوں سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اس وقت جب ملک آزاد نہیں ہوا تھا۔ اس اس مسئلہ پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ ملک کے آزاد ہوتے ہی حکومت نے چاہا کہ عوام کو کم از کم بنیادی سہولتیں ضرور مہیا کی جائیں جنہیں صاف پانی کا مہیا کرنا حکومت نے اپنا اولین فرض سمجھا اور جب ملک میں پہلا پنجسالہ منصوبہ عمل میں آیا تب اس بات کی طرف خاص طور سے توجہ دی گئی۔ اور حتی الامکان صاف پانی مہیا کرنے کی اسکیمیں تیار کی گئیں اور ان پر عمل آوری شروع ہوئی۔

پہلے پنجسالہ منصوبے میں مہاراشٹر کے دیہی حصوں میں صاف پانی کی فراہمی کے لئے ٹھوس قدم اٹھائے گئے ہیں۔ پنجسالہ منصوبے اور سوکھے سے متاثرہ علاقوں کے لئے پروگرام کے تحت کئے گئے کاموں کے نتیجہ میں پنجسالہ منصوبے کے آخر تک ریاستی سرکار نے ۱۶,۲۳۲ گاؤں میں صاف پانی کی فراہمی طے کر دی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور نئی بستیوں کی تعمیر سے بہت سے گاؤں اور بستیوں میں ابھی تک صاف پانی کی پریشانی ہے۔ بار بار پڑنے والے سوکھے کی وجہ سے زمین اور زیر زمین کے سوت سوکھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے پانی کی مشکل اور زیادہ ہو گئی۔ اس دشواری کے پیش نظر ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ریاستی سرکار نے دیہی علاقوں میں صاف پانی کی پریشانی کو حل کرنے کے لئے ایک اہم پروگرام کو ہاتھ میں لیا ہے۔

سنہ ... کے بعد ریاست کے دیہی علاقوں میں صاف پانی کی

فراہمی منصوبے پر ۱۵۹ کروڑ روپے خرچ کئے ہیں۔ اگرچہ مقامی ذرائع سے ریاست کے صاف پانی کی فراہمی کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا ہے، تب بھی اس کے ذریعہ کم از کم نو ہزار گاؤں میں صاف پانی کی فراہمی کا انتظام ہو سکے گا۔ تقریباً پانچ ہزار گاؤں میں بجلی کے پمپ لگائے جائیں گے تاکہ صاف پانی کی فراہمی میں آسانیاں پیدا ہو سکے اور یہی اسکیم کی خصوصیت ہے۔

اسی طرح چھٹے پنجسالہ پروگرام کے تحت حکومت نے صاف پانی اور SANITATION کے لئے ۳ سو کروڑ روپے کی رقم مختص کی ہے اور حکومت ہند کی طرف سے اس ضمن میں ۹۲ ر۵۷ کروڑ روپے ادا کئے گئے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں جو CENSUS یا اعداد و شمار کی گئی تھی اس کے مطابق ۸۷۷، ۳۵ گاؤں میں سترہ ہزار ایک سو بارہ دیہات ایسے ہیں جہاں پانی کی وصولیابی بڑی مشکل ہو گئی ہے ان میں ۱۶,۲۳۲ دیہاتوں کو دیہی پینے کے پانی کی فراہمی منصوبہ ... پروگرام کے تحت پانی کی فراہمی جزوی اور کلی طور پر کی گئی ہے باقی ۸۸۰ دیہات ایسے رہ گئے ہیں جنہیں ساتویں پنجسالہ پروگرام کے تحت پانی کی فراہمی

قومی راج

کی سہولت دیجائے گی۔ ساتویں پنجسالہ پروگرام کے تحت International Drinking Water Supply and Sanitation Decade جو ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۱ء پر محیط ہے تقریباً ارادہ ہے کہ تمام دیہی علاقوں کو صاف پانی مہیا کیا جا سکے گا۔ اس نشانے کو پورا کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک سروے کیا گیا تھا جس سے ظاہر ہوا کہ ریاست کے چالیس ہزار سات سو ساٹھ دیہاتوں میں سے ۲۲۶۲۹ دیہات ایسے رہ جاتے ہیں جہاں صاف پانی کی فراہمی باقی رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لئے حکومت نے اس منصوبہ کے آخر تک ۲۰ ہزار گاؤں میں پانی مہیا کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

کیونکہ صاف پانی کی فراہمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے حکومت نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران ۶۵۰ کروڑ روپئے کی رقم مختص کی تاکہ اس مسئلہ کا حل بخوبی نکالا جا سکے مگر فنڈ کی حصولیابی میں کمی کے باعث اس سمت صرف ۲۵۸٫۴۸ کروڑ روپئے مہیا کئے گئے۔ یہی صاف پانی کی دیہاتوں میں فراہمی پر اثر انداز ہوئی۔ اور تقریباً ۳ سے ۴ ہزار دیہاتوں کو آٹھویں پنجسالہ منصوبے میں پورا کرنا ہوگا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے اور ساتویں منصوبے کے پہلے سال رہی باوجود حکومت کے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے صاف پانی کا فراہم مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا جس کی خاص وجہ یہ رہی کہ گذشتہ ۱۹۸۷ء میں اور اس سال موسم برسات میں بارش کی کمی کی وجہ صاف پانی کی فراہمی اپنے نشانے تک نہ پہنچ پائی جس کی وجہ سے اس سال جون تک پندرہ ہزار دیہاتوں کو پانی کی فراہمی میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ریاستی حکومت نے District Implementing Authorities کو ہدایت جاری کی کہ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے اپنے تمام رسوخ استعمال میں لائے۔

اسی مسئلہ کو کلی طور پر حل کرنے کے لئے حکومت نے دوسرے علاقوں سے پانی کی پائپ کے ذریعے فراہمی پر زور دیا اس کے علاوہ بجلی کے پمپ نصب کئے گئے تاکہ زیر زمین سے پمپ فراہم کیا جا سکے۔ دیہاتوں میں کھدائی کر کے BORE WELLS لگوائے گئے اور پرانے اور فرسودہ ہینڈ پمپوں کی فوری درستی کے احکام جاری کئے اس کے علاوہ کنووں کو مزید گہرا کرنا۔ ذاتی کنووں کو اپنی تحویل میں لینا اور ٹینکرس یا بیل گاڑی سے پانی فراہم کرنا بھی ضروری گردانا گیا۔ حکومت نے زیر زمین سے

یوم جمہوریہ کے موقع پر مہاراشٹر کی باعث فخر اعزازات سے سرفرازی

آنجہانی جنرل اے، ایس ویدیا آرمی اسٹاف کے سابق چیف کو ملک کے دوسرے، پر وقار اعزاز، پدم وبھوشن سے دیگر تین منتخبہ افراد کے ساتھ امسال یوم جمہوریہ کے موقعہ پر نوازا گیا۔ ملک کا اول اعزاز یعنی بھارت رتن سے اس سال کسی کو بھی نوازا نہیں گیا۔

پنجاب پولیس کے موجودہ چیف شری جے۔ ایف۔ ریبیرو، (جو بمبئی کے پولس کمشنر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں) سابق مرکزی سکریٹری برائے داخلہ شری آر۔ ڈی۔ پردھان (جو مہاراشٹر کے چیف سکریٹری کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے ہیں) بمبئی کے رہنے والے فزیشین ڈاکٹر فروخ ایرچ اودواڈیا، اور کیمکل انجینیر پروفیسر منوہن شرما ملک کے ان ۱۲ افراد کی فہرست میں شامل ہیں جنھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

بمبئی کے سماجی کارکن کیپٹن ہورمزدین جمشید جی، منچہر جی ڈیسائی خواتین کی شطرنج چیمپین بھاگیہ شری ساٹھے، نامور کرکٹ کے کھلاڑی دلیپ وینگسرکر اور بمبئی کی مشہور اسٹیج ایکٹریس اور فلم ڈائرکٹر شریمتی وجیا فروخ مہتہ کے نام ان ۳۲ افراد کی فہرست میں شامل ہیں جنھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۳۱۰۶۷ کروڑ روپئے ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۱۳۱۶۹۷ کروڑ روپئے خرچ کئے جائیں گے۔ حکومت کو اس بات کا قوی یقین ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے آخر تک نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہاتوں میں صاف ستھرا پانی بآسانی دستیاب ہو سکے گا۔

پانی حاصل کرنے کے لئے BUNDING PERCULATION TANKS کو UNDER GROUND BANDHARAS جیسے غیر قدرتی ذرائع سے پانی فراہم کیا اور اس طرح مہیا کئے گئے پانی کو سوکھے علاقوں میں پہنچانے کا بندوبست بھی کیا۔

ریاستی حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ جون ۱۹۸۶ء تک تیرہ ہزار ۱۵۰ گاؤں ایسے ہیں جہاں صاف پانی کی قلت سے پانی وافر مقدار میں پہنچایا جائے۔ ڈسٹرکٹ اتھارٹیز کے ماسٹر پلان کے تحت مارچ ۱۹۸۶ء تک ۱۱،۲۲۳ گاؤں میں پانی مہیا کئے جانے والا تھا جو مارچ کے آخر تک صرف ۸،۲۸۸ گاؤں ہی تک نشانہ پورا ہو پایا اس سمت کام بڑے پیمانے پر جاری ہے اور امید کی جاتی ہے کہ امسال دسمبر کے آخر تک نشانہ پورا ہو سکے گا۔

کیونکہ اس نشانے کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے کافی مقدار میں روپئے مختص کئے گئے ہیں اس کے علاوہ حکومت نے ضلعی سطح پر فنڈ کی کمی کو محسوس نہ ہونے کی ذمہ داری لی ہے۔

سوکھے علاقوں میں صاف پانی مہیا کرنے کی غرض سے حکومت نے BORE WELL پروگرام کو ترجیح دی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ کنویں کھودے جا سکیں اور صاف صاف پانی مہیا کیا جا سکے۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے حکومت اپنی اور پرائیوٹ کنٹریکٹروں سے مستعار لی گئی مشینوں سے کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ حکومت کے پاس فی الوقت گراؤنڈ واٹر سروے اور ڈولپمنٹ ایجنسی کی ۱۵ مشینیں ہیں ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۲۲۰ اس طرح کی مشینیں پرائیوٹ طور پر BORE WELL کے کام کے لئے لی گئی ہیں اور کام تیزی سے چل رہا ہے۔ اسی سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران باسٹھ ہزار سات سو چھیاتر بورویل کھودے گئے جن سے ۴ ہزار ۵۳ گاؤں میں صاف پانی مہیا کیا گیا۔ ان بورویل کی نگرانی اور مرمت کا کام حکومت نے ضلع پریشد کے ذمہ دے دیا ہے۔

۱۹۸۱ء کے CENSUS کے مطابق شہری آبادی ۲۱،۴ ملین ہے چھٹے پنجسالہ پروگرام کے آخر تک ۲۲۰ شہروں کو صاف پانی مہیا کر دیا گیا ہے صرف سات شہر ایسے رہ گئے ہیں جہاں پر اس کام میں کمی رہ گئی ہے جلد ہی مہاراشٹر کو یقین ہے کہ چند ہی مہینوں میں شہروں میں پانی کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ چھٹے پنجسالہ پروگرام کے تحت شہروں میں پانی کی فراہمی کے لئے ۴۱۰،۴۲ کروڑ روپئے خرچ کئے گئے تھے اور ساتویں منصوبے کے تحت اس اسکیم پر ۹۰۰ کروڑ روپئے خرچ کرنے کا نشانہ طے کیا گیا ہے تاکہ کم از کم چھوٹے اور بڑے شہروں کے پانی کا مسئلہ کلی طور پر حل کیا جا سکے۔

کے۔ کے۔ کھلر

روٹی، کپڑا اور تعلیم

انسانی وسائل کا ترجھاشی فارمولا

آزادی کے کئی سال بعد تک ہندستانی بچے بیرونی اناج کھاتے رہے۔ تعلیم کا ڈھانچہ وہی لارڈ میکالے والا جو کلرک بنانے میں ماہر تھا چلتا رہا۔ پنڈت نہرو کی رہنمائی میں بالآخر یہ سب بدلا۔ ۱۹۶۷ء میں ملک میں پہلا سبز انقلاب آیا۔ ۱۹۶۸ء میں تعلیمی پالیسی بنی۔ یہ دونوں کوئی اتفاقی حادثے نہیں تھے بلکہ ان کے پیچھے منظم کوششوں کا ہاتھ تھا۔ کاشتکار کو کاشت کے جدید طریق سے آگاہ کرایا گیا۔ زراعتی گر سکھائے گئے۔ سینچائی کے بہتر وسائل مہیا کیے گئے۔ بیرونی اناج پر انحصار کم ہوا۔ اور گھٹتے گھٹتے آج یہ عالم ہے کہ ہمارا اناج باہر جاتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں دوسرا سبز انقلاب آیا جب ایک ہی سال میں ۲۲۰ لاکھ ٹن کا پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اور اناج کی پیداوار ۱۲۸۴ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۵۱۵ لاکھ ٹن ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زراعتی تعلیم پر توجہ دی گئی۔ ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کے زیر اثر ہر صوبے میں کم از کم ایک زراعتی یونی ورسٹی کھولنا منظور ہوا۔ زراعتی کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ زراعت اسکولوں کے نصابوں میں شامل ہوئی۔ یاد رہے قدیم ہندستان میں زراعت تعلیم کا ایک حصہ تھا۔ کھیتی باڑی کرنا اسکولوں کے پروگراموں میں شامل تھا۔ ہیونگ سانگ جو ساتویں صدی میں چین سے ہندستان آیا تھا، اپنی کتاب "سی، یو، کی" (Si, Yu, Ki) میں لکھتا ہے کہ جب وہ نالندہ کے پاس کسی گاؤں میں اسکول میں گیا تو اسے بتایا گیا کہ بچے کھیتی باڑی سیکھنے کے لئے پاس والے کھیتوں میں گئے ہوئے ہیں۔ پس اکبر نے اسکولوں میں زراعت کی تعلیم لازمی کر دی تھی۔

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ بھارت کے آئین میں کیا لکھا ہوا ہے:

آرٹیکل ۴۵ کہتا ہے کہ: "مملکت اس آئین کی تاریخ نفاذ سے دس سال کی مدت کے اندر سب بچوں کو چودہ سال کی عمر پوری کرنے تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کی توضیح کرنے کی کوشش کرے گی۔"

آرٹیکل ۴۶ میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں اور دوسرے زیادہ کمزور طبقوں کے تعلیمی اور معاشی مفادات کا ذکر ہے۔ اس میں صاف طور پر واضح کر دیا گیا ہے:

"مملکت خاص توجہ کے ساتھ عوام کے زیادہ کمزور طبقوں اور خاص طور پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے تعلیمی اور معاشی مفادات کو فروغ دے گی اور ان کو سماجی ناانصافی اور ہر قسم کے استحصال سے بچائے گی۔"

صاف ظاہر ہے کہ آئین بنانے والوں کے دماغوں میں کمزور طبقے وہی تھے جو دیہات میں رہتے ہیں۔ آج بھی اکہتر فیصد سے زیادہ لوگ دیہات میں بسے ہوئے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں تعلیم کو زراعت کے ساتھ جوڑنا ویسے بھی ضروری بلکہ لازمی ہو گیا تھا

زراعت اور افزائش حیوانات کو جدید اور سائنسی طریقوں سے منظم کرنا حکومت کی پالیسی بن گیا دودھ دینے والے جانوروں اور بار بردار مویشیوں کی نسل کو برقرار رکھنے کے بہتر انتظامات کئے گئے۔ جنگلی جانوروں کا تحفظ کیا گیا۔ اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اتنا زیادہ اضافہ ہوا جس کی تفصیل ایک چھوٹے سے مضمون میں نہیں کی جاسکتی۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ تعلیم کی شرح ۱۹۴۷ء میں جو صرف ۱۷ فیصد تھی آج ۳۷ فیصد ہے۔ چین کو چھوڑ کر ہندستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ تعداد زیادہ لیکن شرح کم۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا ہوگا کہ ہندستان کی آبادی اس زور سے بڑھ رہی ہے کہ ان پڑھوں کی تعداد بھی دنیا میں سب سے زیادہ ہمارے ہی ملک میں ہے۔ عالمی بنک کی ایک رپورٹ کے مطابق "۲۰۰۰ میں ۱۵ سے ۳۵ عمر کے ان پڑھ لوگوں

کا ۵۲ فیصد حصہ ہندوستانیوں کا ہوگا!

خواندگی اور ناخواندگی کی اس شرح کو لے کر ہم کس منہ سے اکیسویں صدی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ سوائے پاکستان، افغانستان، اور نیپال کے ہمارے تمام پڑوسی ملک تعلیم میں ہم سے کہیں آگے ہیں حالانکہ ہم نے تعلیم پر ڈیفنس (DEFENCE) کے بعد سب سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ تعلیمی اداروں کی تعداد ۱۹۵۰ء میں جو ۲۶۳ لاکھ تھی ۱۹۸۳ میں ۹ر۶ لاکھ ہوگئی۔ ان تعلیمی اداروں میں ۷۳ فیصد ادارے پرائمری اسکول ہیں اور بیشتر گاؤں میں ہیں۔ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۳۰۴۲ ہزار سے بڑھ کر ۱۲۳ ہزار ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۰ میں ہر پندرہ ہویں پرائمری اسکول کے لیے ایک مڈل اسکول تھا۔ آج ہر چوتھے پرائمری اسکول کے لیے ایک مڈل اسکول ہے، ۱۹۴۷ء میں صرف ۱۷ یونیورسٹیاں تھیں آج ۱۷۰ ہیں۔ تقسیم سے پہلے کل ملا کے صرف ۵۶۰ کالج تھے۔ آج ان کالج کی تعداد ۶۰۰۰ کے قریب ہے۔ پالی ٹیکنک جو پہلے تھی ہی نہیں آج ۱۵۰۰ کے قریب ہیں۔ تعلیم بالغان جو بالکل نہیں تھی اس کے آج ۵ لاکھ سینٹر ہیں لیکن جیسے کہا گیا ہے، ان پڑھ لوگوں کی تعداد بھی ساتھ ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں صرف ۶ کروڑ ان پڑھ تھے۔ آج ۲۸ کروڑ ہیں۔ عورتوں میں ناخواندگی کی تعداد بھی بہت قابل غور ہے حکومت کی کوشش تھی کہ ۱۹۹۵ء تک سارے ملک میں کوئی ان پڑھ نہ رہے اور نہ کوئی بے روزگار رہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کسی بھی اسکیم کو کارگر نہیں ہونے دیتی۔ نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶) جو ابھی مئی کو پارلیمنٹ سے پاس ہوئی ہے، کے مطابق ملک میں ناخواندگی کو ختم کرنے کی تاریخ اب ۱۹۹۵ ہے۔

یہ سب کچھ تب ہو سکتا ہے جب عام تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم بھی دی جائے۔ ۱۹۵۰ میں قومی سائنسی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ:

"سائنس کے ذریعے ملک کے عوام کے لیے وہ تمام فوائد حاصل کئے جائیں گے جو سائنسی علوم کو اپنانے اور عمل میں لانے سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔"

سائنس اور ریاضی نئے تعلیمی ڈھانچے میں لازمی مضامین قرار دئے گئے ہیں نئی تعلیمی پالیسی میں اس چیز پر خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ "آر اینڈ ڈی" یعنی تحقیق اور ترقیات پر بھی زور دیا گیا ہے۔ سائنس برائے عوام ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک بار کہا تھا کہ سائنس نے آسمان پر اڑنا اور سمندر میں غوطے لگانا تو سکھا دیا ہے لیکن زمین پر چلنا نہیں سکھایا۔ جب تک سائنس ہماری زراعت اور چھوٹی انڈسٹری کے کام نہیں آتی یہ کسی کام کی نہیں ہے۔ سائنس سے جب تک انسان کو ملازمت نہیں ملتی اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سائنس سے کم سے کم آدمیوں کی مدد سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کی جانی چاہیے۔

مہاتما گاندھی نے اس حالت کو سمجھتے ہوئے اپنی "نئی تعلیم" یعنی بیسک ایجوکیشن کی مہم وار دھا سے ۱۹۳۶ میں چلائی تھی جو صنعت انسان کا روزگار چھینتی ہے وہ اس صنعت کے خلاف تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جس شخص کے پاس دو ہاتھ دو پاؤں اور صحت مند جسم ہے وہ اپنے لیے آپ ہی روزگار پیدا کرسکتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی اور نئی سائنسی پالیسی دونوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کا مقصد اچھا انسان اور اچھا کردار بنانا تو ہے ہی لیکن جو تعلیم انسان کو روزگار سے محروم رکھتی ہے وہ تعلیم اپنے مقصد میں ناکامیاب ہے۔ آج ہندستان میں اناج بہ افراط ہے لیکن پھر بھی بے روزگاری ہے۔ اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت نے آئی۔ ٹی۔ آئی، جونیئر ٹیکنیکل اسکول کے تحت ایسی پندرہ سو سے زیادہ جاری کی ہیں تاکہ گاؤں کی صنعت کی طرف سے لاپرواہی نہ برتی جائے۔ آج اگر ریسرچ درکار ہے تو وہ گاؤں میں گاؤں کی چیزوں پر، گاؤں والوں پر بیل گاڑی پر، سائیکل رکشا پر، کولہو پر، چاک پر، منگر پر، کنوؤں پر، تاکہ ان تمام چیزوں کو بہتر بنایا جاسکے اور گاؤں کی زندگی بہتر بنائی جاسکے۔ ایسی تعلیم اور ماحول تیار کیا ہے تاکہ گاؤں سے پڑھ کر لوگ شہر کا رخ نہ کریں بلکہ شہروں سے پڑھ کر گاؤں میں بس جائیں۔ آج کا نعرہ دلی چلو نہیں

ر دلی سے چلو' ہونا چاہیئے۔ اگر گاندھی جی کی تعلیمی پالیسی عمل میں
ئی جاتی تو آج گاؤں کی حالت یہ نہ ہوتی اور نہ ہی ملک میں اتنی
بے روزگاری ہوتی۔ نئی تعلیمی پالیسی میں گاندھی جی کے آدرشوں سے
، متاثر ہوکر نیا ڈھانچہ بنایا گیا ہے۔

اس وقت ملک کی ضرورت ایسی سائنس اور ٹیکنالوجی ہے جو اس
ب کے ماحول میں فٹ ہو لیکن موزوں ٹیکنالوجی۔ جب روزگار بنا
ہے اور غریب کی روٹی چلتی رہے۔ ٹیکنالوجی سادہ، آسان، کم
پچ اور پائیدار ہو۔

نئی تعلیمی پالیسی ملک کے سائنس دانوں
کے لیے ایک چیلنج ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی بناؤ جس سے گاؤں کی آمدنی
بڑھ سکے، جس سے شہروں سے چیزیں خریدنے کی نوبت ہی نہ آئے —
ہر ہے یہ ٹیکنالوجی سستی اور سود مند ہوگی۔

گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ:
"ملک کی خوش حالی اور اس کے کلچر کا صرف گاؤں کو دیکھ کر
سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آج بھی دو لاکھ ایسے گاؤں
ہیں جہاں اسکول یا اسپتال نہیں ہیں۔ ایک ایسی یوجنا
بننی چاہیے جو صرف ان دو لاکھ گاؤں کی ہو۔"

بڑے بڑے شہروں یعنی دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس کے گرد و نواح میں
لاکھوں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑھتے ہوئے کینسر کی مانند سلموں
(slums) میں گندی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے لیے ان کی
تعلیم، ان کی اہمیت، ان کی خوراک کے لیے علیحدہ یوجنا بنانے کا
وقت آگیا ہے۔

یہ بات نہیں کہ حکومت ایسی صورت حال سے بے خبر ہے۔ بلکہ
بے زمین مزدوروں اور تعمیرات کے کاریگروں اور بارجینل کسانوں
کے لیے تو درجنوں یوجنائیں ہیں جو ان کی اور دیہی ترقی سے متعلق
ہیں۔

جن شہروں میں موزوں ٹیکنالوجی شروع کی گئی ہے وہ ہیں چمڑا۔
مٹی کے برتن۔ دیاسلائی۔ صابن۔ تیل۔ شہد۔ ناریل کا پھل۔۔۔
[illegible] وغیرہ وغیرہ۔
طبی طور طریقوں میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ تپ دق کا کنٹرول
شروع ہو گیا ہے۔ ملیریا، فلیریا پر اب قابو پا لیا گیا ہے۔

بچوں کی شرح اموات بھی کافی کم ہو گئی ہے لیکن جتنی دیر منصوبہ
بندی لوگ اپنے آپ نہیں کریں گے حکومت کی ہر ترقی پسند پالیسی،
ہر ترقی پسند یوجنا فیل ہو جائے گی۔

ملک کا سب سے محنتی انسان زراعتی مزدور ہے۔ کھیتی باڑی
کے علاوہ ڈیری، مرغی پالن جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والا بھی
زراعتی مزدور کہلاتا ہے۔ اس کا کوئی اپنا کھیت نہیں ہوتا وہ دوسرے
کے کھیت میں کام کرتا ہے۔ بونے یا کاٹنے کا یا پھر آبپاشی کا۔ ایسے
مزدور ہمارے ملک میں تقریباً ۶ کروڑ ہیں۔ تعلیم کے سیکٹر میں یہ لوگ
سب سے پیچھے ہیں۔ سب سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ نئی تعلیمی
پالیسی میں یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کے لیے IRDP یا NREP کے
تحت تعلیم کا لازمی طور پر انتظام ہونا چاہیے۔ ایک سروے کے مطابق
یہ انکشاف ہوا ہے کہ زراعتی مزدور ۳۶۵ دنوں میں ۲۰۰ دنوں سے
زیادہ مزدوری نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ان دنوں جب اسے کام نہیں
ملے تو وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ
گورنمنٹ کی طرف سے ان دنوں کے لیے وظیفے مقرر ہیں۔ علم کی
کمی ان کو دن بدن غریب سے غریب تر بناتی جا رہی ہے — اب
وقت آگیا ہے کہ اس کہاوت کو کہ "ہندوستانی مزدور مقروض
پیدا ہوتا ہے اور مقروض ہی مر جاتا ہے" ختم ہونا چاہیئے۔

۱۹۷۶ میں اندرا گاندھی نے بندھوا مزدور کو ختم
کر کے ان کو آزاد کر دیا۔ اس بات سے آج کوئی منکر نہیں کہ پڑھا
لکھا مزدور ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن سکتا ہے۔ نئے بیس
نکاتی پروگرام کے تحت زراعتی مزدور کی حالت بہت سدھری ہے
لیکن اس کی صحت اور تعلیم کی حالت آج بھی ناگفتہ بہ ہے
اب وہ زمین کا مالک تو ہو گیا ہے (کیونکہ کاریگر کام کرنے والوں کو
زمینیں مفت دی گئی ہیں) لیکن وہ ان پڑھ ہے۔ آج بھی اسے اس
چیز کا احساس نہیں ہے کہ تعلیم ایک [illegible] ہے یعنی ایسا
سرمایہ جس کے استعمال سے انسان ایک اور قسم کا سرمایہ تیار
کر لیتا ہے جسے وہ ہر وقت تاعمر استعمال کر سکتا ہے۔

حال میں ایک کتاب چھپی ہے "ایگریکلچر ٹوواردز ۲۰۰۰ A.D" اس
کے مصنف نے لکھا ہے کہ عالمی اقتصادی ترقی کے لیے ۴۰
کھرب ڈالر چاہییں جو حقیقی ضرورت کا نصف ہے۔ تعلیم کے میدان

میں اگر ساری دنیا سے ناخواندگی دور کرنا ہے تو ۱۰ اکھرب ڈالر چاہئیں جو حقیقی ضرورت کا ایک چوتھائی ہے۔ آج ساری دنیا فوجی ساز و سامان پر سچ ہزار کھرب ڈالر خرچ کر رہی ہے۔ لیکن انسان کی حفاظت کے لئے انسانی وسائل کے لیئے اور انسان کے لئے کتنا کم۔ ایک نیوکلیائی آبدوز پر تقریباً دو کھرب ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن ایک اسکول پر صرف ۵۰۰۰۰ روپئے۔ گاؤں میں تو اتنے بھی نہیں ہوتے وہاں تو لوگ زمین اور دیگر قسم کی اشیاء مفت میں دے دیتے ہیں لیکن آج لینے کے لیے نہ تو گاندھی ہے نہ جواہر لال، نہ ونوبا بھاوے مگر آچاریہ بھلے جنھوں نے تعلیم بالغان میں ایک نیا تجربہ کیا تھا۔

ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تجربہ نہایت ہی کامیاب تھا اور ملک گیر پیمانے پر لاگو ہونا چاہیے۔ آچاریہ بھلے کے تجربے نے غریب اور زراعتی مزدوروں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے میں کافی اہم رول ادا کیا تھا۔ آچاریہ بھلے کو یقین تھا کہ ہندوستان کے دیہی نوجوان جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں نہایت محنت کش اور ایماندار ہیں۔ انھیں آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر قربانی کا مادہ شہری نوجوانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ۱۵ سے ۳۵ سال تک ایسے دیہی نوجوان گیارہ کروڑ کے قریب ہیں۔ قوم کی خوشحالی اس طبقے کی خوشحالی پر مبنی ہے۔

انھیں چیزوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے انسانی وسائل کا محکمہ بنا جس میں تعلیم۔ کھیل کود، صحت۔ نوجوانوں کے معاملات۔ خاندانی بہبود، عورتوں کی بہبود، ماحولیات۔ فنونِ لطیفہ اور براڈکاسٹنگ شامل ہیں۔ ساتویں پلان میں انسانی وسائل کے فروغ پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ کھلی یونی ورسٹیاں کھولی جائیں گی۔ ہر ضلع میں ماڈل اسکول جہاں دیہات کے غریب بچے مفت اور اعلیٰ تعلیم پائیں گے۔ ہندوستانی کلچر کو فروغ دینے کے لیے اور دریائے گنگا کی صفائی کے لئے خاص پروگرام بنائے گئے ہیں۔

اگلے سالوں میں انسانی وسائل کا سینٹر پرائمری اسکول ہوگا جہاں انسان بنتا ہے، جہاں اس کا کردار بنتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے انسان خود بخود اُگتا ہے اس **ہندوستانی سنگھاڑوں کی طرح ہے جو لاکھوں سال سے ہندوستان کے تمام تالابوں میں اُگتا آیا ہے۔**

جب اسکول انسانی وسائل کے فروغ کا سینٹر ہوگا تو بھارت میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کی جڑیں اور بھی مضبوط ہونگی فرد کی عظمت اور قوم کا اتحاد بھی یقینی ہوگا اور پھر وہ دن دور نہیں جب کہ بھارت صحیح معنوں میں ایک ایسی سماج وادی غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنے گا جو تمام دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔

انسانی وسائل کو فروغ دینے والے سینٹر اکیسویں صدی کے ایسے مندر ہوں گے جو ہر راہ کو بتائیں گے کہ انسان کا مستقبل اپنے ہاتھ میں ہے۔

انسان کے ذہن نے ماحول پر فتح تو پالی لیکن ماحول کو انسانی ماحول بنانا ابھی باقی ہے۔ اب بھی اس ماحول میں حیوانیت ہے۔ **صرف تعلیم ہی حیوان کو انسان بنا سکتی ہے۔**

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
(ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی)
رہائش:- بیت الشرف، بندر روڈ، کلیان (ضلع تھانے)
مہاراشٹر ۴۲۱۳۰۱

افسر مودودی

اردو کا ایک گمنام شاعر

ہندوستان کے شہرۂ آفاق شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب نے بجا فرمایا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جب مشاہدۂ حق کا ذکر بغیر مینا و شراب کے سہارے نہیں ہو سکتا تو آج کے اس ادبی مذاکرہ کا آغاز منتظمین جلسہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنے کے بغیر کس طرح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مجھ پر یہ لازم آتا ہے کہ سب سے پہلے میں جلسۂ یوم افسر کے کارپردازان کا بالعموم اور اس کے فعال اور سرگرم رکن میرے محترم دوست ڈاکٹر وحید اشرف کچھوچھوی صاحب کا بالخصوص صدق دل سے شکریہ ادا کروں جنہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو پائین سے اٹھاکر صدر میں بٹھایا۔ یہ درحقیقت ان کی کرم فرمائی ہی نہیں بلکہ میری خوش قسمتی ہے۔ حالانکہ مجھے اس بات کا احساس بلکہ شدید احساس ہے کہ میں اس منصب کے لائق ہرگز نہیں تھا کہ میں اس جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دینا قبول کرتا جبکہ سامعین کرام میں مجھ سے بہتر اور قابل تر حضرات موجود ہوں۔ دیگر یہ کہ میں نہ گجرات کے زبان و ادب سے خاطر خواہ واقف ہوں اور نہ گجری زبان و ادب کی تدریجی نشوونما اور ریاست گجرات میں اس کے صحیح موقف سے آگاہ ہوں۔

بہر حال بقول حافظ شیرازی ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کے پیش نظر اور احباب پر تمکنت کے اصرار اور فرمائش اور نارتھ انڈین کلچرل ایسوسی ایشن (بروڈہ) کے ارباب حل وعقد کی یاد دہانی اور خواہش کا احترام کرتے ہوئے انکار کی جسارت نہ کرسکا، اور اس طرح اردو کے ایک سچے حامی اور ادب کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے آپ سب حضرات کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں اور گجری زبان و ادب کی تدریجی ترقی اور (فسرہو دودی) کی شاعری کے تعلق سے چند کلمات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

زبان اردو بنیادی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساعی کی رہین منت ہی نہیں بلکہ اس کی ترقی و اشاعت میں کشمیر کے برہمن، اتر پردیش کے کائستھ، مہاراشٹر کے سنت، بمبئی کے پارسی، پنجاب کے سکھ، کلکتہ کے عیسائی گجرات کے ناگر اور ہندوستان بھر کے مسلمان سب برابر کے شریک ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ یہ زبان ہر حال میں قومی یکجہتی کا ایک ذریعہ ہر اعتبار سے اتحاد و اتفاق کا ایک حربہ اور ہر پہلو سے تہذیب و ثقافت کا ایک مظہر ہے اور بقول سر تیج بہادر سپرو ......

"یہ زبان اردو ہندو اور مسلمانوں دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مقدس ورثہ کی حیثیت سے ملی ہے جو ناقابل تقسیم ہے!"

اسے ستم ظریفی سمجھئے یا اپنی خوش بختی کہ یہ زبان محمد تغلق اور بعد میں علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں نواح دہلی سے کوچ کرتے ہوئے راجستھان اور گجرات کے راستوں سرزمین دکن میں براجمان ہوئی اور راجستھانی، گجراتی، مہاراشٹری، تلنگی، اور کنڑی زبانوں سے خلط ملط ہوگئی اور گجرات کے حلقہ میں گجری اور دکن کے علاقہ میں دکنی کے نام سے موسوم ہوگئی اور اس طرح گجرات کے مقامی زبانوں کے الفاظ و تراکیب گجری زبان کا اٹوٹ حصہ بن گئے اور دکن کے علاقہ واری بولیوں کا ڈکشن، اور حرفی تحریفات دکنی زبان کا جزو لاینفک بن گئے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرزمین گجرات ایک طرف صوفیوں کی تعلیمات کی آماجگاہ رہا ہے تو دوسری جانب بادشاہوں کے احکامات کا گہوارہ، ایک طرف اسلامی علوم و فنون کا مخزن رہا ہے تو دوسری جانب گجری زبان اور تہذیب و ثقافت کا آئینہ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سلاطین گجرات نے نہ صرف مقامی زبانوں کی نشو و نما اور ترویج و تحفظ کی خاطر ہر ممکنہ کوششیں کیں بلکہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور یہ مثال مقامی زبان اردو عام طور پر گجری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس زبان کے فروغ میں جہاں اردو کے باوا آدم ولی گجراتی نے اپنی اردو شاعری کے ذریعے زبردست حصہ لیا وہاں اردو کے بین الاقوامی شاعر غالب دہلوی نے اپنے گجراتی شاگردوں کے توسط سے اپنی پوری توانائی صرف کی، اور بالفعل زبان اردو ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں گجرات کی اردو زبان سے مختلف نہیں رہی اور مخزن الشعراء کے مؤلف مولوی عبدالحق کے الفاظ میں .....

"اور ان کی (اہل گجرات کی) زبان کسی طرح دہلی اور لکھنؤ کے عام شعراء سے کم نہیں، بلکہ بعض ان میں استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔"

یہ امر ناقابل تردید ہے کہ اول اول عرب تاجروں اور سیاحوں کی بدولت عربی الفاظ گجراتی زبانوں میں داخل ہوگئے بعد میں مسلم حکمرانوں کے عہد حکومت میں خصوصیت کے ساتھ فارسی الفاظ و تراکیب کا رواج عام ہوگیا، اور یہ سلسلہ مغلیہ حکومت میں اس قدر بڑھا کہ یہاں کی زبان و تہذیب بلکہ زندگی کا ہر شعبہ مسلمانوں کی آمد سے متاثر ہوا نتیجتاً یہاں نہ صرف

سلامی مراکز کا قیام عمل میں آیا بلکہ صوفیوں کی خانقاہیں بھی
بر تعداد میں عالمِ وجود میں آئیں، اور اس طرح اہلِ گجرات
جہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کو جذب کیا وہاں صوفیوں
تعلیمات و ارشادات کو بھی زندگی کا حصہ تصور کیا اور
نعل اردو زبان کا سرمایہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ استاد محترم
فیسر نجیب اشرف ندوی صاحب اپنی تالیف لغاتِ گجری
یوں رقمطراز ہیں......

"گجرات والوں کے لئے یہ بات قابلِ فخر ہے
کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما سے لے کر عہد
مغلیہ کے تقریباً ابتدائے زوال تک یہ علاقہ اردو
کی حیثیت اہم اور لائقِ عزت مقام کا حامل
رہا ہے۔"

یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین
رات میں ابتدائی اردو شاعری بیشتر اخلاق اور تصوف
، متعلق بھی ہے اور اس دور کے کارناموں میں شاہ
سلی جیو گام دھنی (متوفی ۹۰۲ ہجری) کا ہندی آمیز
دو دیوان بنام جواہر الاسرار، شاہ وجیہہ الدین علوی متوفی
۹۱۱ھ کے گجری اردو میں اقوال و ملفوظات اور میاں
وب محمد چشتی (متوفی ۱۰۲۳ھ) کی قدیم گجری میں
نوی خوب ترنگ قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ادبی شہ پارے
ہ لیکن ولی گجراتی نے اپنی سخنوری اور سخندانی سے
دو زبان کو سادگی و صفائی کے ساتھ رعنائی و دلکشی بخشی۔
نہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ سرزمین گجرات میں خصوصیت
ے سورت، بھڑوچ اور احمد آباد جیسے شہروں میں مشاعرہ
ر قوالی کی محفلیں اور بزمیں منعقد ہونے لگیں اور اس طرح
دو شعر و شاعری عوام میں مقبول ہو گئی۔ انیسویں صدی کے
نصف آخر میں بڑودہ بھی اردو شعر و سخن کا ایک اہم مرکز
ن گیا، اور مہاراجہ سیاجی راؤ گائیکواڑ (سوم)
ے زمانے میں اردو نعتیات و قوالی اور شعر و شاعری اپنے
شباب پر پہنچی اور اردو شعر و ادب کا بڑودہ میں اس قدر
م رواج ہو گیا کہ اردو مدارس و مکاتیب کے قیام کے

ساتھ ہی فارسی زبان کی تعلیم و تدریس کا بھی اہتمام کیا گیا اور
مہاراجہ سیاجی راؤ بڑودہ یونیورسٹی میں اردو، اور
فارسی کا شعبہ قائم کیا گیا جو آج بھی بدستور جاری ہے اور
جہاں پڑھائی کے ساتھ اشاعتی پروگرام کا بھی اہتمام
ہے۔ یہاں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر
نواب علی، پروفیسر لوکھنڈ والا، پروفیسر
رحمٰن، پروفیسر وحید اشرف، اور پروفیسر
محمود صدیقی جیسے اساتذہ نے نہ صرف اردو
فارسی کے شعبہ کو ترقی دی بلکہ طلبہ میں اردو، عربی اور فارسی
کا ذوق بھی پیدا کیا ہے۔ جو قابلِ تعریف ہے۔ اس ضمن میں
اس بات کا ذکر کرنا خارج از موضوع بحث نہ ہوگا کہ بڑودہ
میں اس سے قبل کچھ ایسی نامور شخصیتیں تھیں جو صاحبِ سیف
ہی نہیں بلکہ صاحبِ قلم بھی تھیں جن میں خواجہ سعید
شیدا، میر ابراہیم علی خان وفا اور سید
احمد حسن فدا قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر کے
صاحبزادے سید محمود حسین افسر نے بڑودہ کے
علمی و ادبی حلقوں میں نام و نمود پیدا کیا اور اردو شعر و ادب
کو چار چاند لگا دیئے اور تھوڑے ہی وقفہ میں "استاد الشعراء"
اور کبھی "افسر الشعراء" کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ یہ
سچ ہے کہ احمد حسن فدا نے بڑودہ میں سکونت اختیار
کرتے ہی معاصرین کی معیت میں زبان اردو کی ترویج کی
خاطر بزمِ مشاعرہ کی داغ بیل ڈالی اور ان کے خلف الرشید
محمود حسین افسر نے اردو شاعری میں استادی
کا درجہ حاصل کیا اور کل ہند مستشرقین کے اجتماع (منعقدہ
بڑودہ ۱۹۳۳ء) میں ان کو ایک طلائی تمغہ ان کے استادانہ
کلام کے پیشِ نظر بطور انعام دیا گیا۔

سید محمود حسین تخلص افسر
(۱۸۶۶ء - ۱۹۴۵ء) کا سلسلہ نسب خواجہ قطب الدین
مودود چشتی سے ملتا ہے اسی لئے وہ اپنے تخلص کے ساتھ
مودودی لکھنا سعادت کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد
بڑودہ آئے اور مہاراجگان سے اعزازات حاصل کئے اور
ممتاز عمائدین شہر میں ان کا شمار ہونے لگا۔ افسر

کے والد بزرگوار سید احمد حسن متخلص فدا ایک نامور حکیم ہی نہیں بلکہ عظیم شاعر بھی تھے۔ افسر نے اپنے والد کی ایماء پر مروجہ علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی اور شاعری میں کمال حاصل کیا حتیٰ کہ وہ علامہ آرزو لکھنوی کے والد ماجد ذاکر حسین یاس کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے

اور ان سے استفادہ کیا۔ استاد محترم کے بارے میں یوں لکھتے ہیں؎

•

یوں تو ہونے کو سخنداں ہیں بہت اے افسر
یاس سا کوئی مگر دہر میں استاد نہیں

•

رسالہ جلوۂ یار (میرٹھ) کے ایک شمارے میں مرزا داغ دہلوی کا شاگرد بتلایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُنہوں نے جلال لکھنوی کی طرح مرزا داغ کو بھی اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کیا ہو۔ افسر نے استاد شعرائے اردو سے بھی استفادہ کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تعلی کی جھلک ان کے کلام سے دکھائی دیتی ہے؎

•

مرے کلام میں کس طرح نقص ہو افسر
کہ خوب سیکھا ہے اس فن کو باکمالوں سے

•

اساتذہ کی بہت صحبتیں اُٹھائی ہیں
یہی سبب ہے کہ افسر جو خوش بیاں ہوں میں

•

صد شکر تو مقلد استاد بن گیا
افسر تری زبان کا ہوا اعتبار اب

•

کس طرح کہوں میں کہ سخنور میں ہوں
اک ذرۂ ناچیز سے کم تر میں ہوں
پہچان لیں واقف نہ ہوں جو اہلِ سخن
احباب جسے کہتے ہیں افسر میں ہوں!

•

گلشن میں بلبلوں سے بھی گرم سخن رہا
افسر ملا نہ کوئی مرا ہم زبان کوئی

•

جلتے ہوئے نقیروں سے کٹ جاتے ہیں دشمن
افسر کی زبان میں بھی ہیں تلوار کے انداز

•

کہاں ہے آج اس دنیا میں افسر قدرداں کوئی
یہ لعل بے بہا ہیں رائیگاں نہ کم سخنداں ہیں

•

افسر مودودی نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل اور نعت گوئی میں اپنا مقام بنایا۔ ان کی شاعری میر تقی میر، مرزا غالب دہلوی اور فانی بدایونی سے مختلف رنگ میں پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں نہ میر کا سیلاب الم ہے، نہ غالب کا فلسفیانہ تفکر، اور نہ ہی فانی کا تصورِ غم۔ بقول خود؎

•

اضطرابِ دلِ ناشاد ہے وارستۂ فکر
سر ہمارا کبھی منت کشِ زانو نہ ہوا

•

عشقیہ شاعری بھی حکیم مومن خان مومن اور مرزا داغ دہلوی کے تغزل سے بالکل الگ ہے۔ افسر کے کلام کی شوخی غم کے تصور کو خوشی سے قبول کرواتی ہے اور ناصح کو وہ یوں کہتے ہیں؎

•

دل کے دینے سے نہ روک اے ناصح
اس میں تیرا ہے کہ نقصان میرا

•

افسر کے جذبۂ انانیت اور احساسِ خودداری میں تمنا کا بھی اظہار ہوتا ہے؎

•

بزمِ غم میں احتیاج شمع کیا
دل جلے ایسے کہ خود بن جائے شمع

•

دل کے عوض میں مجھ کو غم جانگزا دیا
بندہ نواز آپ نے کیا لے کے کیا دیا

•

افسرؔ نے دبستانِ لکھنؤ کی ہر لحاظ سے تقلید اور پیروی کی ہے لیکن شوخی و بذلہ سنجی کو استبذال سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ؎

•

پیغام بر کو بھیج دیا فرطِ شوق میں
اب فکر ہے کہ یار کا ناحق پتا دیا

•

دیکھوں نہ اس کو اور نصیب اس کا وصل ہو
دل آرزو پسند ہے آنکھ آبرو پسند

•

عاشق اس شوخ پہ کیوں نہ ہو جائے
مدعی نامہ بر نہ ہو جائے

•

افسرؔ مودودی کے چند شعر پیش خدمت ہیں جن سے ان کے افکار و خیالات کی بلندی اور زبان و بیان کی دل نشینی کا اندازہ ہوتا ہے ؎

•

چلا جاتا ہے بند آنکھیں کیے ہر ایک اے افسرؔ
عدم آباد کا رستہ بھی کیا ہموار ہوتا ہے

•

کس نے موسیٰ سے کہا طور پہ جانے کے لیے
آگ لینے کو گئے تھے کہ لگانے کے لیے

•

لذت بہ قدر تلخیٔ آزار بھی نہیں
یعنی کہ سہل مردن دشوار بھی نہیں

•

سرک آئے ہیں گیسو عارضِ پرنور حضرت پر
کہ کاجل جم گیا ہے منزلِ خورشید کی چھت میں

•

کافور ہو گئی ہے سیاہی گناہ کی
چھینٹے دیئے ہیں جب عرقِ انفعال کے

•

تم کو لاکھوں میں انتخاب کیا
مجھ کو میری نظر نہ ہو جائے

•

ڈاکٹر وحید اشرف کچھوچھوی اپنی تالیف افسرؔ مودودی حیات و شاعری میں افسرؔ کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں ......

افسرؔ کا کلام کیفیت کے اعتبار سے حزنیہ، موضوع کے اعتبار سے عشقیہ، طرزِ ادا کے اعتبار سے شوخی آمیز اور زبان کے اعتبار سے سادہ مگر بامحاورہ ہے۔ جس کے امتزاج نے افسرؔ کی شاعری کو ایک مخصوص لہجہ اور آہنگ عطا کیا ہے ‘‘

مختصراً ان کے کلام میں آمد اور برجستگی اور زبان و بیان کی سادگی نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو بہت بلند کر دیا ہے۔ ان کی رجائیت پسندی نے انہیں عزم و حوصلہ کے ساتھ توانائی عطا کی ہے۔ آخر میں مولانا شبلی نعمانی کی نظم کے انداز میں افسرؔ کی غزل بھی ملاحظہ ہو۔ جس میں موضوع کے لحاظ سے یکسانیت ہے۔ تاہم صنف سخن کی حیثیت سے نظم اور غزل کے فرق کو واضح کرتی ہے

مولانا شبلی نعمانی کی نظم

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ شر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے درہائے خاک ہونگے زرفشاں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

افسر مودودی کی غزل

ہمارے حال پر ہوگا نہ کوئی مہرباں کب تک
رہے گا در پئے آزار یارب آسماں کب تک

رکے گا ناقہ لیلیٰ نہ ہوگی دید لیلیٰ کی
ارے مجنوں امید التفات ساربان کب تک
کہے گا اب اگر ناصح تو میں بھی کچھ سنا دوں گا
رہے گی میرے قابو میں مگر میری زبان کب تک
وہ ایسے ہی تو ہیں اپنے کئے سے باز آئیں گے
یہ کہئے ہم ملائے جائیں ان کی ہاں میں ہاں کب تک
بتو! اک دن ستم ایجاد کرنا بھول جاؤ گے
بتاؤ تو سہی آخر حد آہ و فغاں کب تک

الغرض افسر مودودی کے مراسم در روابط، احسن مارہروی، سائل دہلوی، جلال لکھنوی، وحشت کلکتوی، جلیل مانک پوری، آثر لکھنوی، شبلی نعمانی، یاس لکھنوی، مولوی عبدالحق، لالہ سری رام، امیر مینائی، داغ دہلوی، حفیظ جالندھری، فانی بدایونی، اور آرزو لکھنوی جیسے مخدومین ادب سے تھے۔ یہ سب ان کے قدر دان تھے۔ اور بڑودہ کے حلقۂ احباب میں سید ابراہیم علیخاں وفا، میر احتشام علی خاں جاوید، منشی عبدالکریم انور، حکیم فخر الدین ناظم، منشی قطب الدین نیر، شرف الدین خاکی، محمد عثمان عیش، اور جسٹس طیب جی قابل ذکر ہیں۔

اس تقریب کے ضمن میں یہ گوشش گذار کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ بڑودہ کے دو بلند پایہ شاعر فدا اور افسر کے بارے میں سید وحید اشرف کچھوچھوی کے قلم سے دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ایک دیوان فدا، اور دوسری افسر مودودی، یہ دونوں تالیفات نہ صرف قابل قدر اضافہ ہیں بلکہ گجری اردو کے تعلق سے قیمتی سرمایہ ہیں۔

ہم غربت کے خلاف کامیابی سے جنگ اسی وقت لڑ سکتے ہیں جبکہ ہم نئے خیالات قبول کریں۔ توہمات کو چھوڑ دیں۔ ترقی کی خاطر عزم اور لگن سے کام کریں اور مشکلات میں ہر قربانی دینے کے لئے کمربستہ ہوں۔ اس عظیم کام میں ہاتھ بٹانا ہر فرد کا فرض ہے۔ ہم محض تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ غربت کے خلاف جنگ میں ہم سب سپاہی ہیں۔

۔۔ انجہانی شریمتی اندرا گاندھی

۶۔ ایشور راج ماتھر
سابق صدر ناظم، اطلاعات و رابطۂ عامہ، حکومت مہاراشٹر
۳۸۸/A، روڈ نمبر ۲۲،
جوبلی ہلز حیدر آباد ۵۰۰۰۳۴
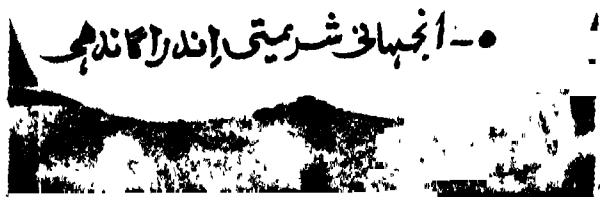
دکنی اردو اور مراٹھی پر ایک دوسرے کے اثرات

تہذیب و تمدن کے فروغ میں زبان کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ شاعری، گیت، لٹریچر اور عام بول چال کی زبان ہی وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے تہذیب کے مختلف پہلو عوام پر آشکار ہوتے ہیں۔ زبان کے ارتقاء میں جغرافیائی حالات، لوگوں کے رہن سہن، آب و ہوا اور دیگر امور کا بے حد اثر ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اردو زبان کے ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن میں اس زبان کا پروان چڑھنا مختلف قسم کے حالات میں ہوا۔ شمالی ہند میں اردو نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے فارسی کی شیرینی، ہندی کی لچک اور عربی کے استحکام کو اپنے ساتھ لیتی ہوئی، لشکری، برج بھاشا اور دوسرے منازل طے کرتے ہوئے ایک ایسی زبان کا درجہ حاصل کر لیا ہے جو سارے ہندوستان میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے دکن میں اردو زبان مقامی زبانوں یعنی تیلگو، تامل، کنڑ اور مرہٹی زبانوں سے متاثر ہوئی

دکن جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسی سرزمین ہے جو تینوں طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے ۔ اسی لئے شمالی ہند کی حکومت کے اثرات دکن پر اس حد تک نہیں ہوئے جہاں تک کہ ہونے چاہیئے ۔ جس طرح سکندر اعظم کے حملے کا اثر شمالی ہند کے تہذیب و تمدن پر بالکل ہی معمولی سا رہا ۔ اسی طرح دکن میں شمالی ہند کے حکمرانوں کی تہذیب و تمدن کا اثر دکنی تہذیب و تمدن پر اتنا شدید نہیں رہا ، جتنا کہ ہونا چاہیئے ۔ اسی سے صاف ظاہر ہے کہ جو صوبیدار اپنے لشکروں کے ساتھ دکن میں آئے ۔ وہ مقامی لوگوں کی مدد سے مرکز سے آزاد ہو گئے ، اور جو تمدن دکن میں پروان چڑھا اس پر شمالی ہند کی بہ نسبت مقامی تہذیب و تمدن کا زیادہ اثر رہا ۔

ہندوستان میں سترھویں صدی کے آخر میں مغل ، مراٹھے اور انگریز ۔ سیاسی اقتدار کے حامل تھے ۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا ۔ جنوبی ہند میں مراٹھا اتحاد Maratha Confederacy حیدر علی ، ٹیپو سلطان میسور میں نظام الملک حیدرآباد میں شجاع الدولہ اودھ میں علی وردی خان بنگال میں ، رنجیت سنگھ پنجاب میں ، سورج مل بھرت پور میں اپنے آپ کو آزاد حکمران قرار دے چکے تھے ۔ مراٹھے حکمرانوں اور مغل بادشاہوں میں ہمیشہ تصادم رہا اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں مغل مراٹھا یا انگریز حکومتوں سے باری باری امداد حاصل کرتی رہیں ۔ اس سیاسی جدوجہد کا اثر تہذیب و تمدن اور خاص طور سے زبان پر بہت زیادہ ہوا ۔ جہاں سیاسی میدان میں جنگیں ہوتی تھیں وہاں تمدنی سطح پر غیر شعوری طور پر ایک تہذیبی اختلاط کی بناء پڑ رہی تھی اور ایک نئی زبان اور تہذیب اور نیا معاشرہ پیدا ہو رہا تھا ۔

گوالیار ، اندور ، بڑودہ ، ناگپور ، کولہاپور ، اور دیواس کی مراٹھا سلطنتوں میں کوئی تیس لاکھ لوگ بستے تھے ۔ مراٹھا حکمرانوں نے آگے چل کر ایک اتحاد قائم کیا اس کے بہت دور رس اثرات ہوئے ۔ جہاں پر مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی ، اور بعد میں دوسری ہندوستانی زبانوں سے مل جل کر اُردو کی شکل اختیار کرلی تھی ۔ وہاں پر مراٹھوں کے دفتر مراٹھی میں جاری تھے ۔ عام بول چال میں فارسی اور اُردو بولنے والوں کا واسطہ مراٹھی بولنے والوں سے ہمیشہ پڑتا ۔ دکنی مسلمان حکمرانوں کے بہت سے سپہ سالار ، مراٹھا اور ہندو تھے ۔ اسی طرح چھترپتی شیواجی مہاراج اور پیشواؤں کے اعلیٰ فوجی عہدیدار مسلمان بھی تھے ۔ اس دور میں فوجی طاقت کے علاوہ اقتصادی معاملوں میں دخل رکھنے والے لوگوں کا بھی بہت بڑا اثر اور رسوخ ہوا کرتا تھا ۔ نظامِ حکومت چلانے میں معاشی اور اقتصادی پالیسی کے ترتیب دینے میں اور روزمرہ کا دفتری کاروبار چلانے میں مراٹھا اور ہندو افسروں کا بڑا حصّہ رہا ہے ۔ اس طرح سے فوج اور روزمرہ کی حکومت کے کاروبار میں غیر شعوری طور پر ایک نئی زبان کا ارتقاء ہو رہا تھا ۔ مراسلت کی زبان فارسی اور مراٹھی دونوں ہی ہوا کرتی تھیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فارسی کے الفاظ اور اُردو کے الفاظ مراٹھی زبان میں رائج ہونے لگے ۔ دکنی اُردو میں مراٹھی کے الفاظ استعمال ہونے لگے ۔ آج بھی مراٹھی زبان میں فارسی اور اُردو کے بہت سے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ۔ وہ بھی اسی معنی و مفہوم میں جو کہ فارسی میں ہوتے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ دکنی بول چال کی اُردو میں مراٹھی کے الفاظ کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔

لفظ " دفتر " جو اُردو اور فارسی میں عام طور پر رائج تھا ۔ وہ مراٹھی زبان میں بھی اپنا لیا گیا ، اور آج بھی دفتر کے فارسی ، اُردو اور مراٹھی معنی وہی ہیں ۔ شمالی ہند میں جہاں پر مراٹھوں کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا ، مراٹھی الفاظ کا استعمال بالکل ہی نظر نہیں آتا ۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کے اُردو بولنے والے لوگ دکنی اُردو میں " نکو " جیسے الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں ۔ مراٹھی محاورہ مثلاً بیگی بیگی ، (جلدی جلدی) ابھی تک بوڑھی عورتیں استعمال کرتی ہیں ۔

لیکن یہ پرانی دکنی زبان میں رائج تھا۔ اسی طرح دکنی اردو نے مراٹھی روایت "چ" جو کہ زور دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اپنا لیا۔ عام طور پر شمالی ہند کے لوگ دکنی اردو میں مراٹھی محاورہ کے وزن پر "نہ ہاریچ یا بیچئے"، "ہونیچ چاہیئے" کا استعمال بول چال کی زبان میں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، اور اظہار تعجب بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح لفظ "بیضہ" جو انڈے کے لئے فارسی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مراٹھی زبان میں عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی کا "فرد نویس" مراٹھی میں "فرنادیس" بن گیا۔ لفظ "صاحب" جو اردو اور فارسی میں کسی کو عزت بخشنے کے لیے یا ادب کا اظہار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مراٹھی زبان میں بھی اپنا لیا گیا۔ انتہائی ادب سے شیواجی مہاراج اپنی ماں کو "آئی صاحب" سے مخاطب کرتے۔ اسی طرح کاٹ کر، عمل بجاونی، محصول، خزانہ، بازار، مراٹھی اور اردو میں نہ صرف رائج ہیں بلکہ روزمرہ کی زبان میں کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کے معنی اور مطالب بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مراٹھی الفاظ، ترکیب، محاورہ اور الفاظ کے ہیر پھیر میں اور جملوں کے بنانے میں مراٹھی زبان کا کافی اثر رہا ہے، اور یہی مراٹھی اثر اور تیلگو اور کنڑ جیسی مقامی زبانوں کے اثر کی وجہ سے دکنی اردو با اعتبار محاورہ، عام بول چال میں شمالی ہند کی اردو سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

دکن میں صوفیائے کرام اور بھکتوں نے اپنی عام فہم زبان سے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ صوفی، بھکت اپنے کلام، گیت، بھجن، ہری کیرتن اور شاعری (جو زیادہ تر بھکتی اور روحانیت سے تعلق رکھتی تھی، اور جس کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی۔ ایک نئی اور عام فہم زبان کے ارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ یہ نئی زبان جس کو دکنی اردو کہا جا سکتا ہے۔ ایک خوش آئند مجموعہ تھی جس میں مراٹھی، ہندی، فارسی، تیلگو اور کنڑ زبانوں کا میل ملاپ ہوا اور عوام نے اس کو اپنایا۔ ایک طرف تو حکمرانوں کے دربار دں میں جہاں پر مراٹھا حکمرانوں اور مسلم بادشاہوں کا میل ملاپ ہوتا اور سرکاری خط و کتابت ہوتی، مراٹھی اور اردو زبانیں بھی ایک دوسرے کو متاثر کرتیں۔ شاہی آداب اور انداز گفتگو اور درباری ماحول بھی ایک دوسرے پر خوش آئند نقوش چھوڑ جاتیں۔

بھکت اور صوفیائے کرام نے عوام کو ایک ایسی ملی جلی گنگا جمنی زبان سے واقف کروایا۔ جس میں مراٹھی اور فارسی کے الفاظ اپنی شیرینی و چاشنی کی وجہ سے مقبولیت حاصل کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر ہندوستان کی جنتا روحانی رہنماؤں، گرو، مرشد اور خدا کی راہ میں چلنے والے سادھو، سنتوں کی بے حد معتقد ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کا ان پر خاص اثر ہوتا، اور وہ ان کے بتلائے ہوئے راستوں پر چلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے۔ اس سلسلہ کی کڑیوں میں شرڈی کے سائیں بابا، ناگپور کے تاج الدین بابا، گجانن مہاراج، مانک پربھو، سنت تکا رام وغیرہ شامل ہیں۔ ان سنتوں کے چیلے ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے عوام ہوتے اور ان سے خاص روحانی وابستگی اور محبت خلوص رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو کے فروغ میں ان بھکت، صوفی، اور روحانی رہنماؤں کا خاص حصہ رہا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں جنگ بھی خاص انداز میں لڑی جاتی تھی۔ سورج کے غروب ہوتے ہی جنگ بند کر دی جاتی تھی اور فوجیں اپنے اپنے پڑاؤ میں بسیرا لیا کرتی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں فوجی خواہ وہ مراٹھا ہوں یا مسلمان اپنی اپنی ضروریات زندگی خریدنے کے لئے بازار جاتے، اور بازاروں میں جو زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ وہ مراٹھی اور فارسی اور اردو کی ایک ملی جلی شکل ہوتی جو دونوں کی سمجھ میں آتی۔ دکنی اردو کے ارتقاء میں بازاروں، تاجروں اور فوجی سپاہیوں کا بھی خاص حصہ رہا ہے۔

دکن میں مراٹھا اور نظام بھی دو بڑی طاقتیں تھیں۔ ان دونوں میں سیاسی تعلقات بھی بنے رہتے تھے۔ شاہی

فرمان لکھنے، سیاسی خط و کتابت اور دربارداری میں
ایک دوسرے کی نقل اور برابری کرنے میں لگے رہتے۔
شاہی دربار میں شعراء، فرد نویس اور فرمان لکھنے والے
لوگ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے کہ وہ اس طرح کی ملی جلی زبان
استعمال کریں جو دونوں سرکاروں میں اچھی طرح سمجھی جا سکے۔
اس سلسلہ میں ایک نمونہ دکنی اردو کا پیش ہے۔

اکرم پنڈت پنتا پردھانا
آنچ دابا خلاص نظام صلابت خاں

سلام بعد از سلام
دنتی عرض ایسا ہیشہ کر تو لکھا بھٹے کیشی چ محبت اک
ٹھیونا سا ٹھم پناس اکشا چ جاگیر آن اپلے تبھے اں لیلیے تھم کے
تیسے بھیالا گئے چہ لاک تو برتا اچھے سیرت کروا۔ اچھا محبت
سپاون کراوی۔ نہ کلیس اچھی خاص تاکید اسی کی اہاس
ہونے ور حملہ کرنے بھاگ پڑیل۔ سو دیا ناس بہت کیا لہناس

نظام صلابت خاں

دکن کے حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا ذکر بھی
اس سلسلہ میں ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بھی ایک اہم
کڑی تھی جو اردو اور مراٹھی کے فروغ میں ممد و معاون ثابت
ہوئی۔ مہادیو گوبند راناڈے نے اپنی کتاب "RISE OF
MARATHA POWER" میں تحریر فرمایا ہے .....

"شمالی ہند میں مسلمانوں کی زبان اور ان کے ادب
نے سارے شمالی ہند میں اپنا اثر قائم کیا تھا، اور یہ اثرات ہر
گھر میں، ہر بازار میں ظاہر ہوئے۔ اردو زبان کے فروغ میں
معاون ہوئے۔ لیکن اس دور میں تبدیلیاں مہاراشٹر میں
نہیں ہوئیں۔ مقامی زبان اور مذہب مسلم حکومت کے
باوجود فروغ پاتے رہے۔ دکنی مسلم جو کہ فاصلہ کی وجہ سے
دلی اور شمالی مغربی سرحد سے بہت دور تھے۔ اپنی فوجوں
میں افغان، خلجی، اور ترک و ازبیک وغیرہ فوجیوں کی
بھرتی نہیں کر سکتے تھے۔ جس طرح مغلوں نے کی۔ دکن میں
مسلم حکمران ان مقامی لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرتے
تھے۔ ان پر اپنی حکومت کی حفاظت اور سلطنت کی باگ ڈور
سنبھالنے کی ذمہ داری عائد کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں حسن
گنگو بہمنی (جنہوں نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی) کا
ذکر کرنا ضروری ہے۔ حسن نے جو ایک گنگو نامی برہمن کا ملازم
تھا۔ اپنا لقب حسن گنگو بہمنی اختیار کیا، اور اپنے مالک
کی یاد میں اپنی سلطنت کا نام بہمنی سلطنت رکھا، اور
گنگو برہمن کو مالیات کے محکمہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس طرح
دفتر مال اور خزانوں کے اعلیٰ عہدوں پر برہمن، کھتری اور کائستھ
ہمیشہ فائز رہے۔ دکن میں پر بھو ان ہی فرائض کو انجام دیتے رہے
دکنی ہندو اور مسلمان حکمران مذہبی اختلافات اور مذہبی
عداوتوں کو کبھی انتہا تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مسلم فوجی
وجے نگر کی ہندو سرکار کے تحت ملازمت اختیار کرتے
اور مراٹھا صلہ دار اور برگیس مسلم حکمرانوں کے تحت فوجی
ملازمت اختیار کرتے۔ دوسرے بہمنی بادشاہ کے
دو سو صلہ دار باڈی گارڈس کا کام کرتے تھے ..... اور
سولہویں صدی میں فوجی افسروں میں گھاڈگے، گھوڑپڑے،
جادھو، نمبالکر، مورے، شندے، ڈافلے اور مانے
کے نام سے پہچانے جاتے تھے جو دس سے بیس ہزار گھوڑے
سوار فوج کے سپہ سالار ہوتے۔

دکن میں مسلم حکمران ہندو عورتوں سے شادی کرتے
اور اپنی حرم سرا میں رکھتے تھے۔ بہمنی سلطنت کے نویں
بادشاہ نے سون کھیڑا کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی۔ بیجاپور
کے پہلے بادشاہ یوسف عادل شاہ نے مکند راؤ نامی ایک
سردار کی لڑکی سے شادی کی، اور اس کی بیوی عام طور سے
بابوجی خانم کے نام سے مشہور تھی۔ برید شاہی سلطنت
کے پہلے فرمانروا نے سابا جی مراٹھا کی لڑکی سے شادی کی،
جو کہ بہمنی حکمرانوں کا ایک مشہور امیر تھا۔ دکن کے مسلم حکمرانوں
نے ہندوؤں کے مندروں کو انعام اور جاگیریں عطا کیں۔ ہندو
اور مراٹھا ڈاکٹر دواخانوں میں متعین کئے جاتے تھے۔ ۱۶ ویں
صدی کے وسط میں مرار راؤ گولکنڈہ کے چیف منسٹر تھے اور

ن پنڈت گولکنڈہ کے آخری بادشاہ کے عہد میں منسلک تھے
ن ہی کاوشوں کی وجہ سے گولکنڈہ کے بادشاہوں اور
شیواجی مہاراج کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے
ت دونوں نے مل جل کر مغلوں کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔
ہیں دیشپانڈے، دیشمکھ اور ڈیسائی مالگذاری وصول کرنے
کے لئے مختلف ضلعوں پر مقرر کئے جاتے تھے۔ ان میں قابل
کرنام دادو پنت، نرسو کالے، یسو پنڈت ہیں۔ جنہوں نے
اپور کی سلطنت میں مالگزاری کے محصول وصول کرنے
کے طریقوں میں نئی اصلاحات کیں۔ Grant Duff
نے آٹھ مراٹھا خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ جو شیواجی مہاراج
کی پیدائش سے پہلے کافی اثر و رسوخ حاصل کر چکے تھے۔
سترھویں صدی کے اوائل میں گولکنڈہ، بیجاپور، احمدنگر،
ر بیدر میں سول اور فوجی محکموں میں مراٹھا سیاست دانوں
مراٹھا فوجیوں اور پہاڑی قلعوں کے انتظام میں مراٹھا
جاگیرداروں کو بہت بڑا دخل رہا۔ شیواجی مہاراج نے
تمام مراٹھا حکمرانوں کو متحد کرکے۔ انھی تہذیب و تمدن کو ہندوستان
کے بہت بڑے حصہ پر پھیلایا۔

غرض کہ دکن میں کوئی تین صدیوں تک مراٹھا اور مقامی
مسلم حکمرانوں کے درمیان معاشی، سیاسی، اقتصادی،
تہذیبی تعلقات بہت گہرے رہے۔ ان تعلقات کے اثرات
تہذیب و تمدن، معاشرت، بول چال، لہجہ اور زبان پر
بہت دور رس ثابت ہوئے۔ یہ اثرات شمالی ہند
میں اتنے گہرے نہیں تھے جتنے کہ دکن میں اور انہی اثرات کی وجہ
سے دکنی اردو، رہن سہن اور دکنی زبان با اعتبار محاورہ
لہجہ اور دوسرے تہذیبی و تمدنی امتزاج کی وجہ سے شمالی
ہند کی زبان سے مختلف ہے۔ دکن کی گنگا جمنی تہذیب
اور عام فہم دکنی اردو حقیقی معنوں میں ہندوستان کی
تہذیبی یکجہتی کا انمول نمونہ ہے اور اس ورثہ کو سنبھال
کر رکھنے کی ذمہ داری ہر ہندوستانی پر عائد ہوتی ہے۔

●●

غزل

آختر شاہجہانپوری
رنگین چوپال، شاہجہانپور ۲۴۲۰۰۱
(یو۔پی)

مطمئن ہے مری تقدیر کا لکھنے والا
ایک بھی حرف نہیں اس میں مٹانے والا

دست بستہ یہاں ہر شخص کھڑا ہے لیکن
کوئی آئے بھی تو حق بات کا کہنے والا

وہ گھٹا زلف، قمر چہرہ، قیامت پیکر
وادیٔ خواب ہے ہر روز سجانے والا

یوں تو سب ہو گئے آزاد قفس سے لیکن
ایک طائر بھی فضا میں نہیں اڑنے والا

ظلم اور جور کی تم ساری حدیں پار کرو
میں کہاں اپنے عقیدے سے ہوں پھرنے والا

یہ بھی اچھا ہوا خود اس کے قدم جم نہ سکے
چند لمحوں میں تو میں بھی تھا بکھرنے والا

ڈوبنا ہی جو مقدر ہے تو پھر اے اختر
چھوڑ دو ہاتھ سے تنکا بھی سہارے والا

ساودھان

سماجی ناانصافیوں سے متاثرہ خواتین کیلئے جائے پناہ

"اپنی حفاظت اپنے ہاتھ"۔ اس قول کے ساتھ سماجی ادارہ "ساودھان" جاری کیا گیا۔ اس سماجی ادارے کا خاص مقصد یہ ہے کہ آج کے دور میں عورتوں کے ساتھ جو ناانصافی کی جاتی ہے۔ طوائفوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ جہیز حاصل کرنے کے لئے لڑکیوں پر ان کے سسرال والوں کی جانب سے جو ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں ان تمام برائیوں کے خلاف جدوجہد کرے۔

ہم بھارت کی اس عظیم تہذیب کے بارے میں بہت کچھ باتیں کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں گائتری، سیتا، جھانسی کی رانی جیسی عورتیں پیدا ہوئیں اور آج اس بیسویں صدی میں تکنیکی لحاظ سے ہم نے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے۔ لیکن عورتیں انھیں پرانی دقیانوسی مصیبتوں کی شکار ہیں ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں کئی شعبوں میں پیش پیش ہیں لیکن جب ہماری نگاہیں دوسری جانب جاتی ہیں تو یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ہمارے سماج میں آج بھی ایسی عورتیں ہیں جنھیں ان کے سسرال والے جہیز کی خاطر پریشان کرتے ہیں یا انھیں جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایک جوان عورت اپنے خوشحال گھر کے بارے میں کیسے کیسے سنہرے خواب دیکھتی ہے لیکن افسوس کہ اس کا یہ خواب اکثر شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں پاتا کیونکہ اسے اسی پرانے فرسودہ پیشے کی طرف ڈھکیلا جاتا ہے۔ ان سماجی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام برائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے "ساودھان" نامی یہ سماجی ادارہ اپنی کوششوں اور کاوشوں کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

شری ونود گپتا جن کا تعلق راجستھان سے ہے۔ جو ایم ایل سی بھی رہ چکے ہیں اور جو "ساودھان" کے سکریٹری ہیں آپ اپنی خدمات مہاراشٹر کو وقف کر چکے ہیں "ساودھان" کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے شری گپتا جی نے کہا کہ ہر دوسرے روز "ساودھان" کو عورتوں پر ظلم و ستم کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔

"ساودھان" کی بنیاد سنہ ۱۹۸۲ء میں بمبئی میں ڈالی گئی تھی لیکن اس کام کا دائرہ خاص بمبئی شہر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام بڑی تیزی سے مہاراشٹر ہی میں نہیں بلکہ بھارت میں پھیل رہا ہے۔

اس ادارے کا بنیادی مقصد عورتوں کو طوائفانہ

• اس تصویر میں نیپالی لڑکی "دینا" اپنے شوہر دیجے کے ساتھ نظر آرہی ہے اس کو "ساودھانہ" کی مدد سے ایک کوٹھے سے نجات دلائی گئی اور کیرالا کے ایک نوجوان دیجے سے اس کی شادی کردی گئی۔ وہ بیچہ کھیتی کا کام کرتا ہے اس کام کے لئے اس کو ایک ٹریکٹر بھی دیا گیا ہے۔

*

زندگی سے نکالنا اور انھیں سماج میں اچھا مقام دلانا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ان کی شادی کا بندوبست کرتا ہے اور ان کی ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ آج دنیا میں ۶ر کروڑ عورتیں بحیثیت طوائف کے زندگی گذارنے پر مجبور ہیں اور لگ بھگ ۳ لاکھ عورتیں جو اس پیشے میں ہیں مہاراشٹر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملک کے علیٰحدہ علیٰحدہ صوبوں سے لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر بمبئی لایا جاتا ہے اور اس کے بعد کسی دلال کی معرفت انھیں فروخت کردیا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں جس دام فروخت کی جاتی ہیں اس پر لڑکی کو سود دینا پڑتا ہے۔ اس طرح دلال بلکہ ہر کوئی اپنا اپنا حصہ حاصل کرتا ہے۔ بیچاری لڑکی بے سہارا ہوتی ہے نتیجتاً اس کے پاس کوئی رقم نہیں بچتی اور وہ ہمیشہ کے لئے برباد ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی لڑکی اس پیشے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے تو کوٹھے والیاں اس کو آزاد کرنے کی بہت قیمت مانگتی ہیں۔

قیمت کا ادا کرنا اس لڑکی کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ بہرحال پولیس کی مدد سے "ساودھانہ" ایسی لڑکیوں کو آزاد کراتی ہے۔ تقریباً دو سو لڑکیوں کو اس ادارے کے ذریعے نجات دلوائی گئی جن میں سے ۳۵ لڑکیوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اب وہ خوشحال زندگی بسر کررہی ہیں

اکثر یہ لڑکیاں بنگال، نیپال، آندھرا پردیش، گجرات، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو اور مہاراشٹر سے لائی جاتی ہیں۔ نجات دلانے کے بعد یا تو انھیں ان کے والدین کے سپرد کردیا جاتا ہے یا ان کی شادیاں کردی جاتی ہیں۔ ان کی شادیوں میں عموماً بڑی بڑی ہستیاں بھی شرکت کرتی ہیں۔ ... سے چند لوگوں نے ان کی شادی میں "کنیا دان" بھی کیا ہے بقیہ لڑکیوں کو کسی ایسی اسکیم میں کام پر لگایا جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ کچھ آمدنی حاصل کرسکیں۔ مثال کے طور پر بہت سی لڑکیاں پیڑیا یا جیوڑا بنانے کا کام کرتی ہیں "ساودھانہ" کے پاس ایک ایسا منصوبہ بھی ہے جس کے تحت انصاف چاہنے والی عورت کو انصاف بھی دلایا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر چند ایسے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن میں "ساودھانہ" کی مدد شامل تھی۔

ایلشے ۲۳ سالہ سپریا پالو کو اس کی

• زیرِ نظر تصویر میں ساوتری عرف "ساودھا" جس کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے دلہن بنی بیٹھی ہے۔ ساوتری عرف "ساودھانہ" کے ذریعے آزادی حاصل کی۔ اس کی شادی ایک بنگالی نوجوان رگھوناتھ پال کے ساتھ آریہ سماج کے رسم کے مطابق ۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو ہوئی۔ رگھوناتھ پال بمبئی کے ایک ہوٹل میں ملازم ہے۔

ساس اور دیور نے شادی کے فقط ۳ ماہ بعد یعنی اپریل میں جہیز کے سلسلے میں جلانے کی کوشش کی حالانکہ اس وقت وہ حاملہ تھی "ساودھانو" نے اس کی زندگی کو خوشحال بنانے کی کوشش کی۔

اسی طرح ایک شخص مہر نور کو پڑھئے اپنی داستانِ غم سنائیے۔

وہ اشانامی ایک طوائف سے محبت کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص آشا سے دوستانہ تعلق رکھے چنانچہ مہر نور نے اس کوٹھے والے کو پیسے دینا شروع کیا اس طرح سے مہر نور نے آشا کو کوٹھے سے باہر لانے کے لئے ایک بڑی رقم خرچ کی لیکن پھر بھی وہ آشا کو کوٹھے سے آزادی نہ دلا سکا۔ کوٹھے والا جانتا تھا کہ مہر نور کو آشا سے محبت ہے لیکن اس بات کو ذہن میں رکھ کر کوٹھے والا ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا کوٹھے والا مہر نور سے ہمیشہ یہی کہتا کہ "آشا" کے لئے ۳۰۰ روپے کا ٹکٹ ہے۔ اگر تو اسے چاہتا ہے تو ۵۰۰ روپے میں خرید سکتا ہے۔ مہر نور ایک ٹریول کمپنی میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا لیکن آخرکار اسے اپنے کام سے ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ اس کی حرکتوں کی وجہ سے کمپنی کو نقصان ہوا۔ دوسری طرف کوٹھے والے کی لالچ بڑھتی گئی۔ بعد میں "آشا" کو چھوڑ دینے کے لئے اس نے مہر نور سے ۱۸۰۰۰ روپے کی رقم مانگی جس کی وجہ سے مہر نور نے اپنا ویڈیو بھی فروخت کیا لیکن فوراً پکڑا گیا اور آٹھ دن کے لئے اسے جیل جانا پڑا۔

بعد میں مہر نور کو "ساودھانو" کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔ شری گپتا نے فوراً پولیس ڈیپارٹمنٹ کے انسپکٹر "داگھ" کی مدد سے "آشا" کو آزاد کرایا اور اس طرح مہر نور اور آشا کی شادی شری سدھاکر راؤ نائک سابق وزیر برائے سوشیل ویلفیر نے کروادی۔

"ساودھانو" ایک سماجی ادارہ ہے جو سماجی ناانصافیوں کے خلاف لڑتا ہے "ساودھانو" کا اگر کوئی ممبر بننا چاہے تو اسے فیس ادا کرنی نہیں پڑتی البتہ بحیثیت اس ادارے کے والینٹر کے انھیں مصیبت زدہ عورتوں کو سماج میں اونچا مقام دلانے کی کوشش کرنا پڑتی ہے اور بھی انکے مسائل کو انسانیت کے نقطۂ نظر سے حل کرنا پڑتا ہے۔ یہی اس ادارے کا مقصد ہے۔ (انجلی راناڈے)

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے رجسٹری سے آنا لازمی ہے)

تبصرہ

تبصرہ نگار: ریاض احمد خاں

نام کتاب: حدیثِ دلکش
شاعر: حامد القادری بارہ بنکوی
ناشر: بزمِ افکارِ نو، جوگیشوری مولین اندھیری ویسٹ ممبئی ۵۸
قیمت: ۳۵ روپے

"حدیثِ دلکش" حامد القادری بارہ بنکوی صاحب کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ یوں تو ہندستان سے بیسیوں مجموعۂ کلام شائع ہوتے رہتے ہیں مگر وہ مجموعۂ کلام جو تمام تر نعتوں پر مشتمل ہو بہت ہی کمیاب ہیں اور اسی لئے نظر نہیں آتے۔ اکثر شعری مجموعوں میں ایک عدد حمد ہوتی ہے اور ایک نعت اسکے بعد تمام تر غزلیں اور نظمیں۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ حامد القادری صاحب کا حدیثِ دلکش ایک منفرد مجموعہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

سب سے پہلے تو مبارکباد کے مستحق ہیں اراکین "بزمِ افکارِ نو" جن کی کاوشوں سے یہ مجموعۂ کلام ہم تک پہنچ سکا ہے۔ نہ معلوم ہمارے شہر بمبئی میں ایسے کتنے ہی گمنام شعراء ہوں گے جن کی طرف کسی بزم کی نظر نہیں پہنچی اور آج تک وہ گمنام ہی رہے ہیں۔ بزمِ افکارِ نو کا یہ نیک کام واقعی قابلِ ستائش و تقلید ہے۔

عرضِ حال میں حامد القادری صاحب نے بہت سی تفصیلات دی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ شروع میں آپ نے اپنے شوقِ شاعری میں حضرت علی حیدر فتاحی بارہ بنکوی کی صحبت اور شاعری سے استفادہ کیا اور بعد میں حضرت عبدالعزیز صاحب عزیز بارہ بنکوی سے اپنے کلام کی اصلاح لینے کا شرف حاصل کیا۔ اس بات کا یقین ہے کہ حامد القادری صاحب کو نعت لکھنے کا جذبہ حضرت مولانا ابوالوفا صاحب عارف شاہجہان پوری کی نیک صحبت سے پیدا ہوا۔ کیونکہ بقول ان کے ہفتوں مولانا کی صحبت میں رہتے اور ملک کے طول و عرض میں انہیں کے ساتھ سیاحت کرتے تھے۔

"مقدمہ" میں جناب مولانا خلیق الرحمٰن صدیقی صاحب نے دو بڑی عمدہ باتیں بتلائی ہیں۔ اول تو یہ کہ دنیا کی ہر زبان کا ادب کسی نہ کسی حیثیت سے اسلام سے متاثر ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ اردو کی تشکیل محض دو تہذیبوں یا مختلف زبانوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی تشکیل میں اسلامی عقاید اور اسلامی تصورات کا بھی بڑا دخل ہے۔ مولانا نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ جناب حامد القادری صاحب کی نعتوں میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ حرمین شریف کی زیارت کی وجہ سے ہے جس کی جھلک ان کی نعتوں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔

مجموعۂ کلام میں پہلی نعت ہر لحاظ سے حامد القادری کے دلی جذبات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔

نہ تو گل میں ہے وہ شگفتگی نہ تو چاند میں ہے وہ دلکشی
ترا حسن سب سے ہے ماورا تجھے لاؤں کس کی مثال میں

اسی طرح حضرت حامد القادری صاحب کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

چشمِ بینا ہو تو دیکھے کوئی طیبہ کی بہار
پھول تو پھول ہیں کانٹوں پہ جوبن آج بھی ہے

عرصۂ حشر میں حیران تھے بہت ہم لیکن
وہ تو یہ کہیے کہ ہاتھ آگیا دامانِ رسولؐ

باغِ جہاں کا ہر شجر منتظرِ بہار ہے
غنچہ و گل کے ہونٹوں پر نغمۂ سرمدی ہے آج

دراصل "حدیثِ دلکش" اردو ادب میں ایک اضافے سے کم نہیں ہے جہاں تک کتابت اور طباعت کا سوال ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتابت بھی عمدہ ہے اور طباعت بھی بے عیب۔ سرورق دلکش، اندرونی ہر صفحہ بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ نفاست کا ہر صفحہ پر خیال رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت میں سنسار پبلشنگ ہاؤس بائیکلہ بمبئی ۲۷ کا تعاون شریک ہے۔ ۳۵ روپے میں یہ کتاب بزمِ افکارِ نو۔ کوہِ نور ٹی اسٹال مقابل تاشقند بیکری جوگیشوری مولین اندھیری ویسٹ بمبئی ۴۰۰۰۵۸ سے نیز مکتبہ رحمانیہ روم نمبر ۲۱۔ پہلا منزلہ۔ مسجد چال۔ ڈاکٹر ای موزس روڈ، جیکب سرکل بمبئی ۴۰۰۰۱۱ سے خریدی جا سکتی ہے۔

ظفر گورکھپوری
ایف ر۴ نیو میونسپل کالونی
دیونار، بمبئی ۴۰۰۰۴۳

ایکتا

میں کون ہوں تمہیں شاید ابھی نہیں معلوم

میں کوئی ہندو نہ مسلم، کوئی اچھوت نہ شودر
نہ کوئی شیخ، نہ سید نہ میں برہمن ہوں،
بدلتے وقت کے سینے کی تیز دھڑکن ہوں

•

میں کون ہوں تمہیں شاید ابھی نہیں معلوم
نہ کوئی آنکھ ہوں میں اور نہ کوئی ہاتھ نہ پاؤں
میں کچھ نہیں ہوں بس ایک کھولتے لہو کے سوا
لہو جو لال ہے پُرجوش ہے، پوتر بھی ہے
لہو جو بھائی ہے ماتا پتا ہے مِتر بھی ہے
لہو جو مشک ہے اور غازۂ بہار بھی ہے
لہو جو آگ ہے بجلی ہے اور شرار بھی ہے
لہو جو پھول ہے خنجر کی تیز دھار بھی ہے

•

میں کون ہوں تمہیں شاید ابھی نہیں معلوم
مرے قدم کے تلے ہیں تمام سیمائیں
کہ اک نہیں مری ستّر کروڑ باہیں ہیں
کہاں سے وار کروگے کہاں سے آؤگے،
کہ میرے پہرے پہ بیٹھی ہزار راہیں ہیں
کہاں چھپوگے کہ یہاں انگنت نگاہیں ہیں،

•

میں کون ہوں تمھیں شاید ابھی نہیں معلوم
ہزار بار مجھے تم نے آزمایا ہے
گواکی سڑکوں پہ لداخ کے حصاروں میں
زمین نیفا پہ ڈھاکہ کی رہ گذاروں میں
گھروں کے موڑ سے سرحد کی ہر لکیر تلک
سیال کوٹ سے میدانِ کاشمیر تلک
میں کون ہوں تمھیں شاید ابھی نہیں معلوم

میں فیصلہ ہوں نئے وقت کی عدالت کا
میں ایک حکم ہوں فرمان ہوں حقیقت کا
میں اک پہاڑ ہوں اک وطن کی طاقت کا
جسے تقاضوں نے جنا ہے وہ اجالا ہوں
چلوں تو تیغ ہوں رک جاؤں تو ہمالہ ہوں

•

میں کون ہوں تمھیں شاید ابھی نہیں معلوم
میں کوئی جسم نہیں ہوں جو قید ہو جائے
کوئی زبان نہیں ہوں جو کاٹ لی جائے
تمھاری گندی سیاست کا دست خوں آلود
مرے وجود میں خنجر چبھو نہیں سکتا
میں ایکتا ہوں مرا قتل ہو نہیں سکتا

میں ہوں سورج کا نمائندہ اجالوں کا سفیر

★ رئیس الدین رئیس
۱۰/۱۲۷۵ - دہلی گیٹ - علیگڈھ

دِل کا دَریا رات اگنی کنڈ میں ڈھلنے لگا
میری ہی لپٹوں سے میرا ہی بدن جلنے لگا

...ب ماضی کی چمک میں حال کو بھولا ہوں میں
جیسے توڑا آج کے خوابوں کو ہو کل نے لگا

...ھن کی دیوی نے بلی مانگی جب پہلے پوت کی
باپ کی نظروں میں اپنا لاڈلا کھلنے لگا

...ر بھر مجھ کو رہی ہر لمحہ خود اپنی تلاش
حد تو یہ ہے رات کو سوتے میں بھی چلنے لگا

...ھٹتے بڑھتے سائے سب آنے لگے میری طرف
طاق میں رکھا دیا بجھنے لگا جلنے لگا

...دنا اک بے نام کیفیت رلاتی ہے مجھے
درد یہ کیسا مرے جی جان میں پلنے لگا

حبس جب بھی یاس کا چھایا فضا میں اے رئیسؔ
آس کا پنکھا مجھے پھر سے ہوا جھلنے لگا!

سیّد حیاتؔ وارثی
باغ انور - لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۳

نکہتیں گل کی ہیں، نسبت سے مہکتا میں ہوں
روشنی اس کی ہے فانوس میں جلتا میں ہوں

...ا کے جلووں کا بھی انداز بدل جاتا ہے،
زاویئے جتنے نگاہوں کے بدلتا میں ہوں

...ہوں سورج کا نمائندہ اجالوں کا سفیر
روشنی ملتی ہے محفل کو پگھلتا میں ہوں

...ش سائے کو مرے اوڑھ کے سو جاتے ہیں
اور صحرا کی طرح دھوپ میں تپتا میں ہوں

...ب عمل ہے تو کوئی ردِ عمل بھی ہوگا
ہے تھکن چہروں پہ احباب کے چلتا میں ہوں

...زخموں نے مجھے بخشا ہے شعورِ جادہ
ڈگمگاتا ہے کوئی اور سنبھلتا میں ہوں

اس تعلق کو حیاتؔ اب بھی نہ سمجھی دنیا
ہے غبار آنکھوں میں ان کی تو مہکتا میں ہوں

• سیّد صفدر رضا کھنڈوی
املی پورہ، نزد امام باڑہ،
کھنڈوہ (ایم پی)، ۴۵۰۰۰۱

سرور و کیف نیا، بال و پر میں آئے گا
مزہ اڑان کا لمبے سفر میں آئے گا

ہمارا خون جو مٹی کے کام آیا ہے
وہ ایک ذائقہ بن کے ثمر میں آئے گا

خلوص، صدق، مساوات، عدل، ہمدردی
یہ کام آخری رختِ سفر میں آئے گا

وہ کائنات کو کر دے گا درہم و برہم
ایک ایسا زلزلہ شمس و قمر میں آئے گا

ہوا کے دوش پہ چل کے، یا دُور درشن سے
ہمارا نام بھی اک دن خبر میں آئے گا

گواہی دیں گے رضاؔ فن کی حرفِ حق ایک دن
ضرور وصف یہ دستِ ہنر میں آئے گا

کب زمیں پر رہنے والا آسماں ہو جائے گا

● وقار وارثی

۱۵۲۵ رسول آباد کالونی۔ احمد آباد ۲۸

آشنائے رہِ ظلمات نہیں تھا میں بھی
ذات کے شہر میں پھرتا رہا تنہا میں بھی

صرف بے معنی سی اک گونج تھی آوازوں کی
کس کی آواز میں آواز ملاتا میں بھی

گننے والا مری سانسوں کو جو ملتا کوئی
اپنی ٹوٹی ہوئی سانسوں سے الجھتا میں بھی

ان گنت لمحوں میں کیا یاد رہا ہوگا تجھے
ہوں ترے ذہن کا بھولا ہوا لمحہ میں بھی

تجزیہ کربِ جدائی کا کیا ہے تو نے
کاش اس وقت ترے سامنے ہوتا میں بھی

میں نہیں ہوتا جو خود رفتۂ احساس آنا
ڈھونڈھ لیتا ترے آنچل کا سہارا میں بھی

کیا کیا جائے کہ ہے زیست فقط ہوش، وقار
ورنہ مجذوب کے انداز دکھاتا میں بھی

● خطاء الرحمٰن طارق

۹۴/۹ فاطمہ بائی بنگلہ۔ کے۔ کے روڈ،
جیکب سرکل۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۱

کہاں ایسا تکلّف ہے گھروں میں
بڑے آرام سے ہیں دفتروں میں

سبھی سلطان بننا چاہتے ہیں
عجب سودا سمایا ہے سروں میں

سکندر ساری دنیا چاہتا تھا
یہ بے چارہ ہے میری ٹھوکروں میں

بظاہر شخصیت میری صفر ہے
مگر شامل ہوں میں بھی صفدروں میں

پرندے جب نہ دیتے پھوڑ پائے
تو گر دن داب لی اپنی پَروں میں

ادب میں کنڈلی مارے ہوئے ہیں
بری عادت ہے اچھے شاعروں میں

ابھی طارق تمہاری عمر کیا ہے؟
ابھی سے کس لئے نوحہ گروں میں

● صلاح الدّین نیّر

۲-۶-۳/۹۱ بازار نتادیب لال،
حیدرآباد ۵۰۰۰۶۲

کب مرا ٹوٹا ہوا گھر پھر مکاں ہو جائے گا
کب زمیں پہ رہنے والا آسماں ہو جائے گا

آپ تو جائیں گے لیکن یہ کبھی سوچا نہ تھا
زندگی کا ہر سہارا بے زباں ہو جائے گا

کس کو اب پہچان لوگے کس کو ڈھونڈو گے یہاں
ہر پرانہ زخم ہی جب بے نشاں ہو جائے گا

پھر میں سو جاؤں گا تنہائی کی چادر اوڑھ کر
سایۂ ابرِ رواں جب سائباں ہو جائے گا

عمر کٹ جائے گی لیکن آپ کے آنے تلک
پیار کا رشتہ ہی کیا سب کچھ دھواں ہو جائے گا

انتظارِ دوست کی جس وقت بھی ٹوٹے گی آس
میرا مرنا جینا سب کچھ رائیگاں ہو جائے گا

میری شائستہ نگاہی سے بھی جو ہے بدگماں
اک نہ اک دن وہ بھی مجھ پر مہرباں ہو جائے گا

ان کے زخموں کو میں لے جاؤں گا نیّر اپنے گھر
درد بڑھتے بڑھتے جب بھی بے کراں ہو جائے گا

وزیر اعلیٰ شری ایس. بی. چوان "یوم شہیدان" کے موقع پر منعقدہ ایک پروگرام میں جسے سیوک سنگھ اور مہاتما گاندھی سمارک سمیتی کی جانب سے مشترکہ طور پر منترالیہ بمبئی کے قریب واقع ایک باغ میں منعقدہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے۔ میئر شری دتا نلاوڑے، سابق وزیر شری بھاؤ سنگر یاگنک اور سابق میئر باپوراؤ شیٹے بھی نظر آ رہے ہیں۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی، مہاراشٹر کے بچوں کے ساتھ تصویر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔
ان بچوں کو یوم جمہوریہ کی تقریبات کے جزو کے بطور بہادری کے انعامات سے نوازا گیا تھا۔ انعام یافتگان کے نام یہ ہیں (۱) سوشیل اننت بابلے، (۲) سبھاش جنس راونگلے (۳) سنگیتا اے پرتی، (۴) وکاس دتارام ساٹم (۵) سواتی ہریش امروتے

"گیت منچ" کے منعقدہ پروگرام میں جسے ... ۱۰،۰۰۰ طلباء نے شیواجی پارک پر بطور ایک گروپ گیت کے پیش کیا تھا۔ وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان خطاب فرماتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس پروگرام کو طلباء میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے محکمۂ تعلیم اور روزگار کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان کی شریک حیات شریمتی کسم تائی چوان، پروفیسر رام میگھے، وزیر برائے تعلیم شریمتی چندریکا کینیا، وزیر مملکت برائے تعلیم اور بمبئی کے میئر شری دتاجی نالاوڑے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری جانب کی تصویر میں طلباء گیت گاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔
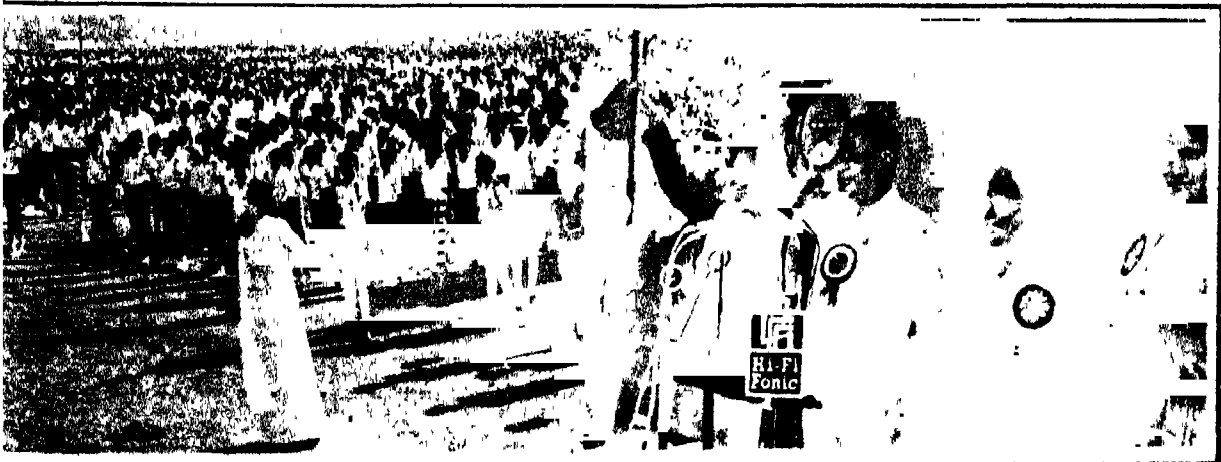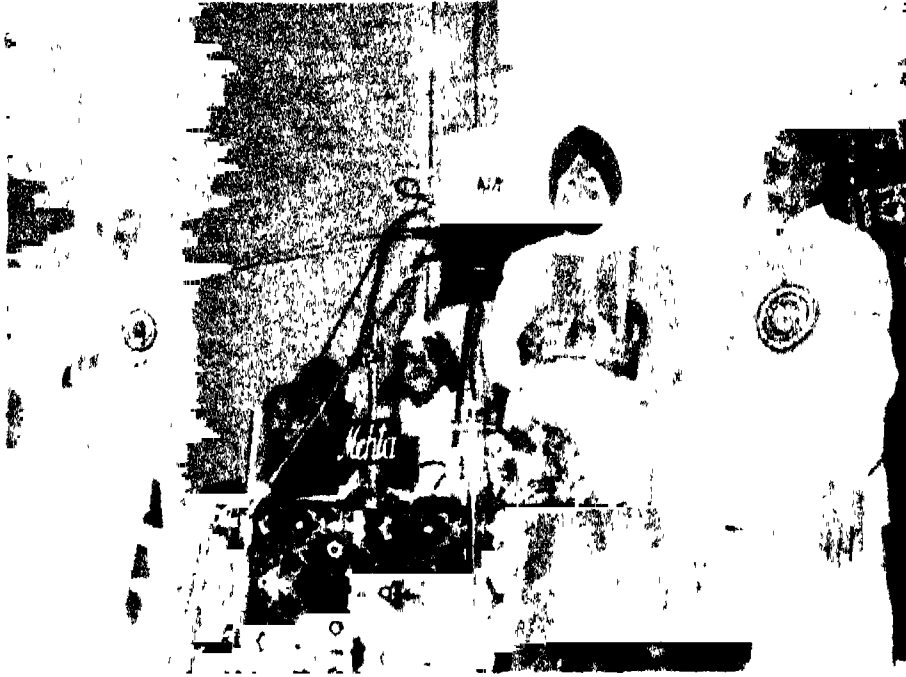
رہنمد شری گیانی ذیل سنگھ نے ۲۴ر
ے کے روز دربار ہال میں منعقدہ
تقریب میں حکومتِ مہاراشٹر کی
سے شائع ہونے والے جرائد
راجیہ، مہاراشٹر ٹائمز، قومی راج
) کے آنجہانی ملیتھیلی شرن گپت کی
الریوم پیدائش پر شائع کردہ خصوصی
وں کا اجرا کیا۔
تصویر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ
ن، گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما
وزیر مملکت برائے اطلاعات و
بلہ عامہ ڈاکٹر شری کانت جچکا نظر آ رہے

گذشتہ ۸ر فروری ۱۹۸۷ء کو ناندیڑ میں ادبی سرکل کے زیرِ اہتمام ایک "مہاراشٹر اردو کانفرنس" کا انعقاد عمل میں آیا جس کے افتتاحی اجلاس کی تصویر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان تقریر کرتے ہوئے۔ دائیں سے بائیں، شری حلیم جاوید، شری شفیع احمد قریشی، شری سید احمد، وزیر مملکت برائے اوقاف و ہاؤسنگ شری مجروح سلطان پوری، شری اختر الزماں ناصر، شریمتی فاطمہ انیس، ڈاکٹر ظ انصاری نظر آ رہے ہیں۔
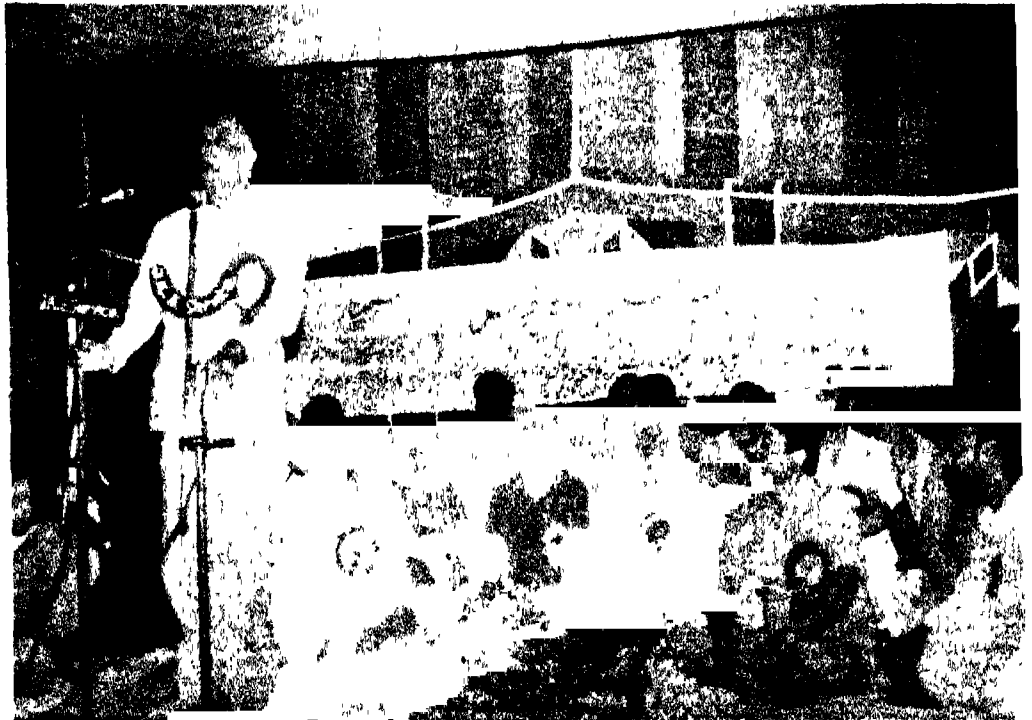
گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر ایس۔ ڈی شرما،
شیواجی پارک میں یوم جمہوریہ کی پریڈ
کا معائنہ کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر شری کانت جچکار، وزیر مملکت برائے
اطلاعات و رابطہ عامہ ۲۲ جنوری کو منترالیہ
میں "یوجنا" جریدہ کے "قومی یکجہتی" کے خصوصی
نمبر کا اجرا کرتے ہوئے "یوجنا" کی مدیرہ شریمتی
ودیا جوشی اور ڈائرکٹر جنرل برائے اطلاعات
و رابطہ عامہ شری پرمود مانے بھی دیکھے جا سکتے ہیں

جے جے ہوسپٹل میں بنائے گئے شری یانس پرساد جین آڈیٹوریم کا افتتاح صدر ہند شری گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں ۲۴ر فروری ۱۹۸۷ء کو ہوا۔ تصویر میں بائیں سے دائیں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان، شری ایس۔ یو۔ جین (چیئرمین) ڈاکٹر سبرت کاپڑیا (نائب چیئرمین) صدر ہند شری گیانی ذیل سنگھ، گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور ڈاکٹر بی۔ کے گوئل نظر آرہے ہیں۔
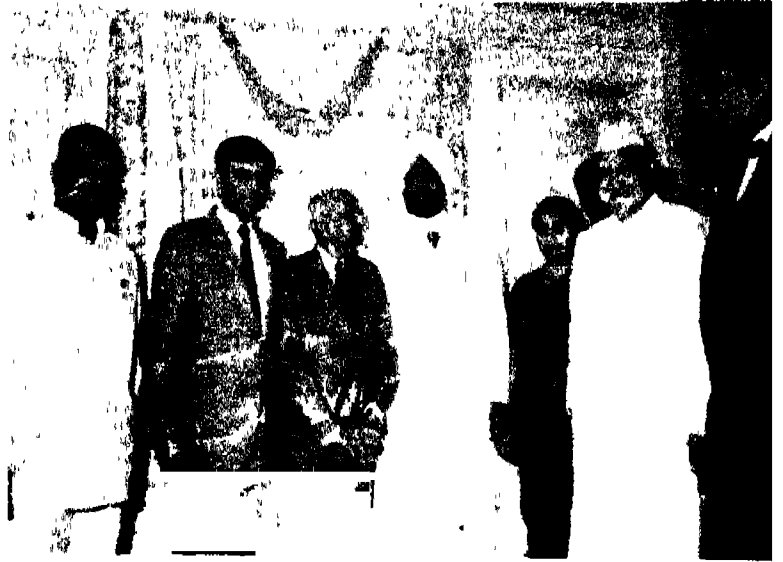
۷ار فروری ۱۹۸۷ء کو گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما ناٹک کار شری رانگنیکر کو "شری رام گنیش گڈکری پرسکار" دیتے ہوئے تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

"ماحولیات و صحت" اس موضوع پر انوائرمینٹل میڈیکل ایسوسی ایشن آف انڈیا نے سائن ممبئی میں مورخہ ۲۲ر فروری کو ایک سیمینار کا افتتاح وزیر ماحولیات ڈاکٹر دی۔ سبرامنین نے روایتی دیپ روشن کرکے کیا، یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔

فنری سوشیل کمار شندے وزیر برائے مالیات ۲۶ رجنوری کے دن پونے میں پولیس پریڈ گراؤنڈ پر پولیس فورس کی پریڈ کا معائنہ فرماتے ہوئے آپ کے ہمراہ ڈیویژنل کمشنر شری چندر اکشور مودی اور پولیس کمشنر شری بھاسکر راؤ مسار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔
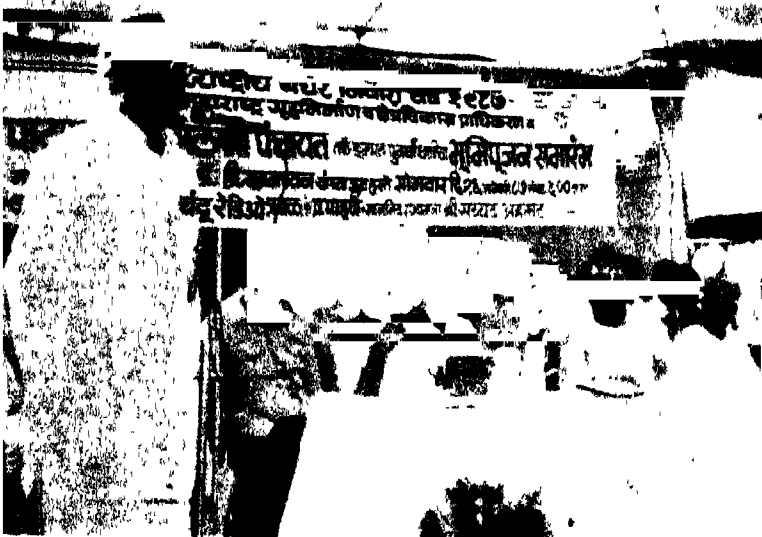
ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ کی جانب سے بائیکلہ بمبئی میں خستہ حال عمارتوں کی تعمیر نو کا کام انجام دیا جانیوالا ہے۔ ۲۶ رجنوری ۱۹۸۷ء کو وزیر برائے ہاؤسنگ ڈاکٹر دی سبرامنین کے ہاتھوں بھومی پوجا کی رسم ادا کی گئی۔ اس موقعہ پر وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ شری سید احمد بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

الکٹر شری کانت چکار
ر مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ و انتظامیہ
جی، مالیات، و پروٹوکول

حدِّ صفر تخمینہ جات

آج کی ضرورت

ریاستی انتظامیہ کا دار و مدار بجٹ پر ہے۔ بجٹ ہی کے ذریعہ صنعت وحرفت کی ترقی ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اچھی صنعتیں آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں اور ریاست کے لئے محصول فراہم کرتی ہیں۔ نتیجہ میں ریاست مالی طور پر مستحکم ہو کر بہتر مالی منصوبہ بندی کے قابل بنتی ہے۔ بہتر مالی منصوبہ بندی نہ صرف صنعت وحرفت بلکہ سماجی بہبود میں بھی بہتری پیدا کرتی ہے۔

فی الحال غیر واضح ہوتے ہوئے بھی ان نقطوں کو حقیقی معنوں
ں سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر صحت عامہ کو لیجئے
راس کے تحت بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا گیا تو یہ ممکن ہے کہ
حت علالت کی تعداد میں کمی ہو۔ اسی طرح اگر تعلیمی معیار میں
اعلیٰ منصوبے عمل میں لائے جائیں تو دفتروں میں اعلیٰ
بیت کے ملازمین دستیاب ہوں گے۔ اگر زرعی معاملوں میں
زین تجاویز پر عملدرآمد کیا جائے تو فصل دوگنی تین گنی ہو سکے گی۔

موجودہ لائحۂ عمل کے
ت آج تک یہ ہوتا آیا ہے
ر محکمہ محکمۂ مالیات کو اپنی مالی
ردیات پر مبنی تجاویز پیش
یا ہے۔ اس کی بنیاد پہ جاری
ال میں رائج اسکیمات پر لاگت

کے اندازاً تخمینہ جات۔ سالانہ تخمینہ جات کو بنیادی تصور کرتے ہوئے بے جا افراطِ زر اور توسیعات کے لئے لازماً مالی ضرورت کے پیش نظر اضافی اخراجات تجویز کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ از سر نو نئی اسکیمات بھی پیش کی جائیں۔

بہر صورت، ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر محکمہ کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ماضی کی جاری اسکیمات جاری رکھی جائیں چاہے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بمبئی کے محصول شعبہ میں خلاصی کی ۲۹ آسامیاں ہیں۔ یہ خلاصی کمشنران کے لئے دورہ کے دوران کہیں ٹھہرنے کے لئے خیمہ بناتے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ اب سرکاری قیام گاہیں تعمیر کی جا چکی ہیں اور کم از کم ۲۰ سالوں سے کمشنر

> زیر نظر مضمون میں ڈاکٹر ایس آر چکار، وزیر مملکت برائے مالیات نے نئے طریقۂ کار کے تحت متوقع اور غیر متوقع پیش آنے والے مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا موقف ہے:
>
> "افسران تجربات سے سیکھیں۔"

حضرات نے خیموں میں قیام کرنا ترک کر دیا، آج بھی خلا کی اسکیم جاری ہے۔ موجودہ طریقۂ کار کے تحت کر دی جائیں۔ محکمہ منظور شدہ مالیات میں کمی نہیں چاہتا۔ اسی لئے ایک ہی محکمہ میں ایک اسکیم سے دوسری اسکیم پر سرمایہ منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجۃً اسکیم در اسکیم محکمہ جاتی ضروریات اور مالی فراہمی میں توازن قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کئی اسکیمات پر ضرورت سے زیادہ اور کئی اسکیمات پر بہت ہی کم سرمایہ حاصل ہوتا ہے اور یہ غیر متوازن صورت سال بہ سال قائم رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاری اسکیمات کی لاگت پر اکثر بجٹ میں ضرورت سے زیادہ رقم مہیا کرنی پڑتی ہے یہی موجودہ طریقۂ کار کی اصلی خامی ہے۔

بجٹ

مخصوص لوازمات	لائق ردو بدل معاملات
ملازمین	مقام ملازمت۔ اختیارات، عہدہ و فرائض
اُن کے موروثی حقوق	اُن کی ذمہ داریاں اور اقتدار
اُن کے اخراجات بصورت تنخواہ، بھتہ سفری اور مہنگائی بھتہ	اُن کے متوقع محاصل
عبوری اخراجات برائے رہائش گاہ، فون، اسٹیشنری اور گاڑی	ان کا استعمال
رپورٹنگ طریقہ	اُن میں موجود مواد

حد صفر تخمینہ جات مخصوص لوازمات میں ردّ و بدل کے بہترین گنجائش پیدا کرتے ہیں۔

(۱) کابینہ (۲) سکریٹریٹ (۳) غیر حساس (۴) حساس (۵) معترض (۶) غیر رضامندی کی وجوہات کی تلاش (۷) رضامندی کی تجاویز (۸) مناسب فوائد کی فراہمی (۹) تفتیشی صورت (۱۰) آسان (۱۱) مشکل (۱۲) براہ راست جواب (۱۳) دیگر متعلقہ فوائد کی فراہمی کے ذریعہ کٹوتی۔

پہلا مرحلہ

مرکزا اخراجات میں کوئی دخل اندازی نہیں — فوائد میں اضافہ

اخراجات — فوائد

۱ : ۱ سے

۱ : ۲ تک

دوسرا مرحلہ

مرکز، اخراجات کو پسندیدہ بنانا	اضافی فوائد کو پائیدار بنانا

اخراجات		فوائد
۱	:	۲ سے
۰٫۵	:	۲ تک

اس طرح کل تخمینہ جاتی فوائد میں بہتری پیدا ہوگی۔

اخراجات		فوائد	فی صد تبدیل شدہ تناسب
۱	:	۱	۱۰۰
۱	:	۲	۲۰۰
٫۵	:	۲	۴۰۰

یہی بدلتے حالات کا تقاضہ ہے

حدِ صفر بجٹ

پیٹر پاھیر، حدِ صفر بجٹ کے موجد ہیں۔ پھر بھی یہ کوئی
ایجاد نہیں بلکہ ایک مسلسل طریقۂ کار ہے۔ اس طریقۂ کار کے
ت تمام مطالبات کا تفصیلی جائزہ کیا جاتا ہے تاکہ اس بات کا تعین
جاسکے کہ ہر عہدہ دار کو اپنے حلقۂ اختیار میں انتظامات کے لیے واقعی
سرمایہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔ مطلب یہ کہ ہر عہدہ دار جس کے
ت سرمایہ کی فراہمی ہوتی ہے اس کے لیے یہ نہایت ضروری
ہے کہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف رہے کہ وہ کس بات کے
لیے رقم خرچ کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔

اسے ابتدا (حدِ صفر) سے تمام تفصیلات مثلاً تعدادِ ملازمین،
یا ضروری، مقصد اور کام کی تکمیل کے لیے درکار وقت وغیرہ
جائزہ تیار کرنا چاہیے۔ مزید یہ کہ ہر عہدہ دار سے اپنے حلقۂ
ر کے لیے درکار اخراجات کا حساب کتاب طلب کیا جانا
ہیے۔ یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اسے اس کے
ئض، ذمہ داریاں، اختیارات اور جواب دہی کے بارے میں
علم نہ ہو۔

بجٹ میں متعین لوازمات کے ساتھ ساتھ رد و بدل کی گنجائش
مہیا کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سرکاری ملازمین میں نہ کٹوتی کی
کتی ہے اور نہ ہی انھیں بڑی تعداد میں برطرف کیا جاسکتا ہے۔

متعین لوازمات میں ان کی تنخواہیں اور اجرت شامل ہیں۔
(مہاراشٹر میں سالانہ تنخواہ کے طور پر ۱۰٫۲۲ کروڑ روپیہ خرچ کیا
جاتا ہے) لیکن ان کے تعلق سے مقامِ ملازمت، اختیارات
ذمہ داری اور فرائض میں زیادہ بہتری پیدا کرنے کے لیے
کمی و بیشی کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ملازمین کا معدوفی حق ایک متعین جز ہے لیکن ان
کے فرائض اور عہدوں میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ عبوری
سرکاری اخراجات مثلاً سرکاری رہائش گاہ، اسٹیشنری، گاڑیاں، فون
وغیرہ متعین لوازمات ہیں لیکن ان کے استعمال میں تبدیلی لائی جاسکتی
ہے۔ غرضیکہ حدِ صفر تخمینہ جات در اصل ایسی تبدیلیوں کی آزمائش ہے
یہ مالی ضروریات کے تحت اخراجات اور فوائد کے مابین بہتر
تناسب کا ذریعہ ہے۔

مہاراشٹر میں ہمارا ارادہ ہے کہ ہم شروعات تمام اسکیمات کی بہ لحاظ
ہنگامی ضرورت درجہ بندی سے کریں۔ پہلے مرحلے میں فہرست
میں سب سے آگے سے بتدریج وہ تمام اسکیمات منسوخ کی
جاسکتی ہیں اگر متعلقہ محکمے کے ذرائع ان تمام اسکیمات کے مالی فراہمی
کے لیے ناکافی ہوں۔ دوسرے مرحلہ میں دیگر اسکیمات روکی جاسکتی
ہیں اگر وہ اخراجات کے لحاظ سے فائدہ مند نہ ہوں اور اس طرح
محفوظ رقم کسی دوسری نئی اسکیم پر خرچ کی جاسکتی ہے لیکن اس
سلسلہ میں ایک حد حاشیت دی جاسکتی ہے۔ چند اسکیمات عوامی مفاد

کی خاطر چاہے وہ فائدہ مند ہوں یا نہ ہوں، جاری رہیں گی۔ یہ طریقہ سال بہ سال جاری رہنا چاہیئے۔ اور درحقیقت اس کی شروعات ہو چکی ہیں۔

حالانکہ صرف مہاراشٹر میں حدِ صفر بجٹ کا تجربہ کیا جا رہا ہے لیکن ہمیں علم ہے کہ یہ مسائل سے مبرا نہیں۔ اس آزمائشی طریقۂ کار کی کامیابی کے لیئے کئی ایک باتیں ضروری ہیں مثلاً بڑی مہارت سے اختیارات اور ذمہ داریوں کی از سرِ نو تشکیل، سرکاری ملازمین اور ان کی یونین کی جانب سے تعاون نیز سیاستداں اور منتظمین کے مابین تعلقات، چند اہم مطلوب باتیں ہیں۔

اس کے علاوہ کئی اور بھی سوال سامنے آئے ہیں مثلاً قانون ساز اسمبلی میں بجٹ پر عموماً بحث کے دوران حزبِ مخالف اور کبھی اکثر اوقات مالیاتی ادارہ کے اراکین میں سے چند وزیرِ مالیات کی تجاویز کی بغیر کسی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں نئی اسکیم کے تحت اس طریقۂ کار میں تبدیلی لازمی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ نئی اسکیم پر عمل آوری سے ملازمین کے کئی مفاد پرست لوگ مثلاً کنٹراکٹر، سپلائر، لائسنس یافتہ اور سیاستدانوں پر کاری ضرب لگے گی۔ کیا وزراء حضرات ایسی چند اسکیمات کی منسوخی کے لیئے رضامند ہوں گے جن کا تعلق ان کے حلقۂ انتخاب سے ہے؟

حدِ صفر تخمینہ جات انتظامی امور کے ذمہ دار شخص کو مکمل اختیارات کی پیشکش کرتا ہے لیکن رائج سرکاری قوانین کے تحت اسے ضروری رعائت حاصل نہیں۔ یہ قوانین تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر نتائج امید افزا ہوئے تو ذمہ دار شخص کو انعام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر نتائج برے ہوں تو کیا وہ شخص سزا قبول کرے گا؟

اخراجات اور نتائج کے درمیان وقت اور فاصلوں کی گنجائش ایک الگ مسئلہ ہے۔ عموماً ایک سال کے لیئے تخمینہ جات وقف ہوتے ہیں لیکن کئی اسکیمات ایسی ہیں جن کے نتائج کا اندازہ ایک سال میں نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسے معاملوں میں ان اسکیمات کو جاری رکھنے یا منسوخ کرنے کا فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کون تفصیل تیار کرے گا؟ اور تفصیلی رپورٹ قطعی آخری ہوگی یا اس میں تبدیلی کرنا ہوگی؟

آخر میں یہ سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟ کابینی وزراء کی سطح پر یا سکریٹری سطح پر؟ اگر وزیر کو قطعی اختیار حاصل ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کابینہ اس کے اختیارات میں دخل اندازی نہیں کرے گی۔ اگر کہیں یہ منصوبہ ناکام رہتا ہے تو ایسے طریقے بھی ہیں جن سے وزراء سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔ انھیں الگ کیا جا سکتا ہے، انھیں انتخابات میں شکست ہو سکتی ہے یا پھر انھیں اسمبلی میں تنقید کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے یا انھیں پارٹی ٹکٹ سے محروم کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سکریٹریوں سے کس طرح جواب طلب کریں؟

◆◆

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کے

۵،۱ لاکھ طلباء کے امتحانات کی فیس معاف

حکومتِ مہاراشٹر نے ریاست میں سوکھے سے متاثرہ ۱۹ ضلعوں کے کل ۴،۹،۵۴۳،۱ طلباء کو ان کے تعلیمی سال ۸۶-۱۹۸۵ کے لیے امتحان کی فیس سے مستثنیٰ قرار دیدیا ہے۔

ان طلباء کے امتحانات کی فیس ۴۳ ۵ ر۳۲ ر۹۵ روپئے وزیرِ اعلیٰ کے خشک سالی راحت فنڈ سے ادا کی جائے گی۔

فیس ادا کر دینے والے طلباء کو فیس متعلقہ اداروں سے واپس کر دی جائے گی۔ وہ مستحق طلباء جنھوں نے ابھی تک فیس واپس نہیں لی ہے وہ متعلقہ اداروں سے اس سلسلے میں معلومات کر سکتے ہیں۔

حکومت نے معاشی طور پر کمزور طبقات (ای۔ بی۔ سی) بے زمین مزدور اور دس ایکڑ خشک زمین رکھنے والے کسانوں کے زیرِ تعلیم بچوں کے سال برائے ۸۷-۱۹۸۶ کے امتحان کی فیس کی معافی کے اعلان کا حکم نامہ جاری کر دیا ہے۔ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات کی فیس وزیرِ اعلیٰ کے خشک سالی راحت فنڈ سے ادا کی جائے گی۔ فیس معافی کے متعلقہ طلباء کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر انھوں نے فیس بھر دی ہے تو وہ اپنے متعلقہ تعلیمی ادارے کے توسط سے ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل افسر سے فیس کی واپسی کے سلسلے میں ملاقات کریں۔

سوکھی زمین سوکھے ہونٹ

زمین کو چاہئے پانی اور ہاتھوں کو چاہئے کام

حکومت کی جانب سے دونوں کے لئے راحتی اقدامات

پچھلے ۳ سالوں سے مہاراشٹر خشک سالی کی لپیٹ میں ہے۔ ۱۲۳۱۴ دیہاتوں اور ۹۴ شہری علاقوں کو خشک سالی کی وجہ سے فراہمی آب کا خطرہ درپیش ہے۔ ۱۵ کروڑ سے زائد افراد اور اسی لاکھ سے زائد مویشی خشک سالی سے متاثر ہوئے ہیں۔ خشک سالی کا جنگی پیمانے پر مقابلہ کرنے کے لئے سرکار ۵۰۰ کروڑ سے زائد رقم خرچ کرنے کے لئے مختلف اقدامات کر رہی ہے۔

پینے کے پانی کی فراہمی

• ۱۲۳۱۴ دیہات اور ۹۴ شہری علاقوں کے ۱۶ء۱ کروڑ لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کرنے کیلئے فوری اقدامات کئے گئے ہیں۔ عارضی اور مستقل صورت میں ۱۵ ہزار سے زائد مختلف منصوبوں کا تخمینہ اور اس کے لئے منصوبہ بند اور غیر منصوبہ بند کل ملاکر خرچ تقریباً ۲۸۸ کروڑ روپئے

• ہینڈ پمپ اور بجلی پمپ کے کنویں، چھوٹے کنویں، وقتی طور سے کنوؤں کو گہرا کرنا، عارضی اور مستقل صورت میں نلوں سے پانی کی فراہمی کو قبضہ میں لینا، نجی کنوؤں کو قبضے میں لینا، ٹینکر اور بیل گاڑیوں کے ذریعہ پانی کی فراہمی اور دیگر منصوبے شامل ہیں۔

فراہمیٔ روزگار کیلئے مقدور بھر کوشش

• تقریباً ۹ لاکھ مزدوروں کے گذر بسر کے لئے ۲۰۲، روزگار کی الحال کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد چار لاکھ پانچ ہزار۔

• گاؤں کے جھرنے، یا چھوٹے تالاب، بڑے اور درمیانی آبپاشی منصوبوں کے تحت کام، نالا باندھنے کا کام، درخت اگانا، COW DEP جیسے کاموں کو ضمانت روزگار اسکیم کے تحت فوقیت، جہاں کام کے لئے مواقع دستیاب نہ ہوں وہاں راستوں کے کام کروانے کے لئے منظوری۔

جانوروں کیلئے چارہ

• خشک سالی سے متاثرہ علاقہ کے ۸۰ لاکھ ۲۳ ہزار مویشیوں کے لئے ۱۴۲ لاکھ میٹرک ٹن چارے کی ضرورت۔

• مہاراشٹر راجیہ شیتی مہامنڈل، کرشی ودیا پیٹھ، بجلی پیدا کرنے والے مراکز، ادیواسی وکاس مہامنڈل وغیرہ کے ذریعہ ایک لاکھ دو ہزار میٹرک ٹن چارے کی گنجائش، فاضل چارے کی دیگر ریاستوں سے درآمد، فی مویشی ۴۰۰ روپئے کے حساب سے کسان کو زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپئے چارے کے لئے فراہمی ... ۲۷۰ مویشیوں کے لئے حفاظتی مراکز، ان تمام کاموں کے لئے اندازاً خرچ ۵۲ کروڑ روپئے۔

فصل کی حفاظت اور دیگر اقدامات

• خریف اور ربیع فصلوں کی حفاظت، زرعی پیداوار کے نقصان کی تلافی کے لئے مقدور بھر کوشش

• تمام طرح کی سرکاری وصولیابی کا التوا

• قحط زدہ علاقوں میں زمین کے محصول کی وصولی کا التوا

• بجلی کے بل بقایا ہونے کی صورت میں بھی کسانوں کے بجلی پمپ کو بجلی کی فراہمی منقطع نہ کرنے کے احکام۔

• قحط زدہ دیہی عوام کی ہر طرح کی ضروری امداد کے لئے حکومت کوشش کر رہی ہے۔ اپنے دیہی بھائیوں کے دکھ درد بانٹنے کے لئے افراد اور اداروں کے ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔

- بدر نظیری

معرفت ظفر اسٹورس، پوسٹ گرارو ملز گیا (بہار)

"قومی راج"، کا ایک شمارہ "مہاتما گاندھی نمبر" دیکھنے کو ملا۔ یقیناً اس نمبر کے لئے آپ لوگوں نے بہت تگ و دو کی ہوگی۔

گاندھی جی کی پوری زندگی کے خاکے اور تصویریں آپ نے شمارہ ہذا میں شامل کرکے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ خصوصاً اردو رسم الخط میں گاندھی جی کا خط "بہ خطِ گاندھی جی ایک نایاب اور کمیاب شے ہے۔ یہ ایک دستاویز کی حیثیت سے ہر قاری اپنے پاس محفوظ رکھیگا

"مہاتما گاندھی اور سول نافرمانی" بہت اچھا مضمون ہے۔ یہ طویل ہوتے ہوئے بھی طبیعت پر گراں نہ گزرا۔

نظموں اور قطعات کے حصے تشنہ سے لگے۔ لیکن بعض غزلیں بہت اچھی ہیں۔

میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

⊙ ⊙

- شیخ امیر شیخ بدیروی

بدیرہ، بھولجی ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

قومی راج۔ ار جنوری ۱۹۸۶ء "جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں" خصوصی نمبر دستیاب ہوا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ قومی راج پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں جہیز کی زنجیریں بندھی ہیں انہیں توڑنا چاہیے۔ واقعی قومی راج عوام کا خدمت گذار ہے جو بہت ہی کم قیمت میں دستیاب ہوتا ہے حکومت مہاراشٹر نے جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں خصوصی نمبر نکال کر عوام کا بہت بڑا مسئلہ حل کیا ہے۔ ملک کے ہر نوجوان کیلئے یہ سبق آموز چیز ہے۔

قومی راج کے اراکین ادارہ نے اس رسالہ پر بڑی محنت کی ہے اور بہت ہی حسن و خوبی اور سلیقہ سے شائع کیا ہے۔

میں قومی راج کے عملے کو مبارکباد دیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ انہیں اس مخلصانہ خدمات کا صلہ دیں۔

- امتیاز الدین زبیری

صدر انتظامیہ کمیٹی دارالمطالعہ (رجسٹرڈ)

اٹاوہ (یوپی)

رسالہ قومی راج بابت جنوری ۱۹۸۶ء "جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں" خصوصی نمبر ایک صاحب کے ذریعہ موصول ہوا۔ رسالہ کافی معیاری ہے اور قارئین دارالمطالعہ نے اس کو کافی پسند کیا۔ اس سلسلے میں آپ سے بصد گذارش ہے کہ آپ اپنے یہاں کا یہ رسالہ اور دیگر معلوماتی لٹریچر ہماری لائبریری کو بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

⊙ ⊙

- مہدی پرتاپگڈھی

معرفت اگزیکیٹو انجینیر، اریگیشن ڈیپارٹمنٹ

پرتاپ گڈھ (یوپی)

تازہ شمارہ میں "گھوکھرو کے پھول" پر تبصرہ پسند آیا تبصرہ میں ظفر گورکھپوری کے کچھ اشعار بھی دے گئے ہوتے تو بہتر ہوتا۔ ظفر صاحب کی نظم "بیلا" بھی متاثر کرتی ہے "جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں" سے متعلق خصوصی شمارہ اس لئے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ جہیز ہمارے سماج کے لئے کوڑھ سے بھی بدتر بیماری ثابت ہو رہی ہے اس برائی کے سدباب کے لئے ہر معقول انسان کو آواز اٹھانی چاہیے۔ آپ نے وقت کے تقاضے کو پورا کیا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

⊙ ⊙

- احمد امام بالاپوری

چوڑی محل، وارڈ نمبر ۵، بالاپور (اکولہ) ۴۴۴۳۰۲

"قومی راج"، کا "جنگلی جانور نمبر"، پڑھنے کو ملا سر ورق پر "جنگلی جانور نمبر"، لکھا دیکھ کر مسرت ہوئی۔ مگر ۶۸ صفحات کے اس نمبر میں صرف چھ مضامین جانوروں سے متعلق ملتے ہیں۔ ان میں بھی "تغدار" اور "ہد ہد" پر دو، دو مضامین ہیں۔ البتہ "مکڑی"، سے متعلق عبداللہ صاحب کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ اسی طرح شری کے۔ ایم۔ شیخ کا لکھا ہوا "مہاراشٹر میں تغدار" کے لئے رہائش گاہ بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ صوفی حیدری صاحب نے بھی "زرافہ" سے متعلق اچھی معلومات دی ہیں۔

منظومات کا حصہ کم مگر معیاری ہے۔

ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو، چھ زبانوں میں
ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

جلد نمبر ۱۴ ۱۰ اپریل ۱۹۸۷ء شمارہ نمبر ۴ سالانہ: دس روپئے فی شمارہ: ایک روپیہ

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر: پرمود ناسنے
مینیجنگ ایڈیٹر: ریاض احمد خاں
ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان
سب ایڈیٹر: عبد اللہ

ریاستی لیجسلیچر کے مشترکہ اجلاس سے

گورنر مہاراشٹر کا خطاب

سوکھے سے متاثرہ علاقوں میں جنگی پیمانے پر

راحتی کام جاری

مہاراشٹر کی قانون سازی کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ افتتاحی بجٹ اجلاس سے گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ء کو مراٹھی میں خطاب کیا۔

گورنر مہاراشٹر نے اپنے خطبے میں ریاست کے بیشتر علاقوں میں خشک سالی کی صورتحال کو تشویشناک بتاتے ہوئے کہا کہ یہ مسلسل تیسرا سال ہے جبکہ ریاست کو اس قسم کی صورت حال کا متواتر سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حکومت نے اس سلسلے میں جو اقدامات کئے ہیں ان پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر شرما نے کہا کہ اس سے نمٹنے کے لئے جنگی پیمانے پر متحدہ اقدام کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر شرما نے مزید بتایا کہ حکومت مہاراشٹر پر وسیع پیمانے پر راحت رسانی کے کام کے سبب زبردست مالی بوجھ پڑ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ چھٹے منصوبے کے دوران ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں کی ۸۵ ویں فیصد آبادی کو پینے کا پانی فراہم کرنے کا عزم کیا ہے۔

پاور پمپ، بورنگ، کنووں کی کھدائی کے ایک وسیع پروگرام پر عمل ہو رہا ہے اور اب تک ۲۹۸۴ پمپ نصب کئے جا چکے ہیں۔

ڈاکٹر شرما نے یہ بھی فرمایا کہ حکومت مہاراشٹر تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو پیشہ بنانے پر روک لگانے کے لئے انسدادِ عطیات بل" ہاؤس میں پیش کئے جانے کی تجویز رکھتی ہے جو مرکزی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کے موثر نفاذ کے سلسلے میں ریاستی حکومت کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ گورنر نے کہا کہ عطیات کی وصولی پر پابندی یا تو داخلہ کے وقت یا پھر دوسری اونچی جماعت میں ترقی کے موقع پر عاید کی جائے گی۔

علاوہ ازیں گورنر نے ریاست کے سرحدی تنازعے کا ذکر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ دونوں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی گذشتہ جون اور ستمبر کے مذاکرات کے پس منظر میں یہ تنازعہ باہمی طور پر افہام و تفہیم کی فضا میں خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شرما نے فرمایا کہ ان کی حکومت سرحدی علاقوں کے کرناٹک ذریعہ تعلیم والے اسکولوں میں ہشتم

جماعت تک مراٹھی کی تعلیم لازمی نہیں کرے گی۔

ڈاکٹر مشرا نے فرمایا کہ خریف اور ربیع کی فصلیں سوکھے کی وجہ سے شدید متاثر ہوئی ہیں۔ آپ نے انکشاف کیا کہ بارش کی کمی کی وجہ سے تقریباً ۱۶ ہزار گاؤں اور ۱۰۵ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی قلت کا اندیشہ ہے ان باتوں کے پیش نظر حکومت نے بڑے پیمانے پر راحتی اقدامات کئے ہیں اور متاثرہ افراد کی امداد کے لئے منصوبہ بند طریقے پر موثر قدم اٹھایا ہے جس کے نتیجے میں ریاست کے کندھوں پر مالی بوجھ کافی بڑھ گیا ہے۔

گرمیوں میں پانی کی قلت کا سامنا کرنے کے لئے ایک ماسٹر پلان تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ذخائر آب سے پینے اور سینچائی کے مقاصد سے پانی کی سپلائی ترجیحی بنیادوں پر کرنے کے لئے احکامات جاری کر دئے گئے ہیں۔

وزیراعلیٰ کی چیرمین شپ میں ریاستی سطح پر ایک آل پارٹی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو خشک سالی کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً قدم اٹھاتی رہے گی۔ اس کے علاوہ اضلاع کی سطح پر ہر ضلع کے انچارج وزیر کی چیرمین شپ میں اور تعلقوں کی سطح پر مقامی لیجسلیچروں کی چیرمین شپ میں آل پارٹی کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئی ہیں۔

بہت سے منصوبے اس خیال سے جاری کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو کام ملے۔ ان منصوبوں پر فی الحال ۸ لاکھ ۲ ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ ۷۰ کروڑ کام کے دنوں اور معاوضے کے سلسلے میں حکومت نے ۲۲۲ کروڑ روپے مختص کئے ہیں۔

آب پاشی، جنگل بانی، نہروں کی تعمیر اور جہاں یہ کام ممکن نہ ہوں وہاں راستوں کی تعمیر کے کام شروع کئے گئے ہیں۔

بوروبل (ہینڈ پمپ)، کنوؤں کی کھدائی اور پانی تلاش کے لئے سیٹلائٹ فوٹو اور جدید سائنسی ترقیات سے مدد لی جارہی ہے۔

ڈاکٹر مشرا نے سماج کے ہر طبقے اور تمام سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی کہ وہ سوکھے کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے تعاون دیں۔

صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری

"میں نے جون ۱۹۸۶ء میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ۸۸-۱۹۸۷ء سے حکومت صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری کا ارادہ رکھتی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہے کہ اکتوبر ۱۹۸۶ء سے اس کا تجربہ شروع کر دیا ہے۔ اس فیصلے کے فوراً بعد ہی صفر کی بنیاد پر بجٹوں کی تیاری کے سلسلے کا آغاز کر دیا ہے اور نہایت تندہی سے حکومت اس کام میں لگ گئی۔ اس کام کی تمہید کے طور پر وزیروں کی پوری کونسل، اور سکریٹریوں کی پوری جماعت کا ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا اور منترالیہ کے افسران کے لئے ٹریننگ کے پروگراموں کا ایک سلسلہ اور میدانی عمل کی ترکیب (فیلڈ فارمیشن) کی ترتیب و تنظیم کی گئی تھی۔ مہاراشٹر ملک کی اولین ریاست ہے جس نے اتنے بڑے پیمانے پر صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری میں پہل کی۔

چار مہینے کی مختصر مدت میں صفر کی بنیاد پر تیار[کردہ] بجٹ کو عوام کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ انتظامیہ [ک]ی اصلاح کے سلسلے میں جس کام پر توجہ دیا جانا ایک طویل عرصے سے ضروری ہو چکا تھا۔ آخر کار اسے عمل میں لایا گیا تاکہ مختلف ترقیاتی اسکیموں اور پروگراموں کو اولیت دی جا سکے اور ان اسکیموں اور پروگراموں کو شناخت کیا جا سکے جو از کار رفتہ اور اس کے لئے ترک کئے جانے کے قابل ہو چکے ہیں۔

انتظامی محکموں نے بہت سے ایسے علاقوں کی شناخت کی جہاں بدل کے طور پر ان پر کئے جانے والے خرچ پر دوبار

اسکیمیں یا پروگرام عمل میں لائے جا سکتے ہیں یا ایسی سرگرمیوں کو جو اب کم درجہ میں قابل ترجیح ہیں ترک کیا جا سکتا ہے۔ یا انھیں بعض دوسری سرگرمیوں کے ساتھ جوڑ دیا جا سکتا ہے

مجھے یقین ہے کہ معزز ممبران اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جس سلسلے کو حکومت نے شروع کیا ہے وہ ایک عظیم اقدام ہے۔ اس کا نتیجہ مسلسل کوششوں کی بدولت چند برسوں کے بعد ہی سامنے آئے گا اور اس اقدام سے جو مقاصد پیش نظر رکھے گئے ہیں یعنی عوام کو کم خرچ بالانشیں خدمت سے نوازا جائے گا ان کی تصدیق کی جا سکے گی۔ جیسا ہمارے معزز وزیر اعظم نے اپنی بجٹ پر تقریر کے دوران

۲۸ فروری ۱۹۸۸ء کو فرمایا تھا "خرچ پر قابو رکھنے کے لیے بعض سخت باتیں بھی انتخاب کرنی پڑتی ہیں"۔ دوسرے لفظوں میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا ضروری ہوتا ہے"

حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے خرچ اخراجات کی پالیسی پر بھرپور نظرثانی کریں۔ صرف سطح کو کھرچنا کارآمد نہیں ہوگا ایڈہاک طور پر ادھر ادھر قطع و برید سے جیسا کہ ماضی میں عارضی راحت رسانی کے لیے کیا جاتا رہا ہے کوئی پائیدار نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ضائع ہونے والے یا متوقع آور بے نتیجہ خرچ کے لیے گنجائش نہیں رہی۔ اب ہمیں ہر روپے کے عوض جو بطور سرمایہ ہم کسی مقصد پر لگاتے ہیں، کوشش کرنی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں۔ ویدی نتائج جو آنکھوں سے دیکھنے میں آئیں بہ نسبت فقط رقم خرچ کر دینے کے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ خرچ کو زیادہ نتیجہ خیز اور بارآور بنائے۔

ہمیں فخر ہے کہ مہاراشٹر کو ان کوششوں سے حاصل کرنے میں جن کا ذکر معزز وزیر اعظم نے کیا ہے اولیت حاصل ہے میں اس ہاؤس کو صفر کی بنیاد پر بنائے گئے بجٹ بابت ۱۹۸۸ء حکومت کے فیصلوں سے جو اس سال کے دوران عمل میں آئیں گے آگاہ کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس معزز ہاؤس کی جانب سے مجھے اس دشوار گذار امر پر عمل آوری کے سلسلے میں بھرپور تائید حاصل ہوگی۔"

●

(وزیر مالیات شری سوشیل کمار شندے کی تقریر جو آپ نے ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو ریاستی اسمبلی میں بجٹ بابت ۸۹-۱۹۸۸ء کے دوران کی تھی)

●●

قلمی معاونین سے

"قومی راج" (ماہنامہ)
درج ذیل خصوصی نمبروں کی تیاری کے لئے **بہترین** مضامین
مقالات اور نظموں
کی صورت میں تخلیقات کا خواہاں ہے۔

- (۱) :- یوم مہاراشٹر خصوصی نمبر
(۱۰ / مئی ۱۹۸۸ء)
- (۲) رابندر ناتھ ٹیگور
۱۲۵ ویں یوم پیدائش
(۱۰ / جون ۱۹۸۸ء)
- (۳) سانے گروجی
- (۴) کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل
(۱۰ / جولائی ۱۹۸۸ء)

اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ "قومی راج" کے ان خصوصی نمبروں کی تاریخ اشاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے رشحات قلم ۱۵ روز قبل ارسال فرمائیں۔

مضامین اس پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۵ واں منزلہ،
نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ،
مقابل منترالیہ،
بمبئی ۴۰۰۰۳۲۔

صفری بنیاد پر بنائے گئے بجٹ کا نتیجہ تخفیف ملازمین نہیں ہوگا

حکومت کی وضاحت

ریاستی حکومت نے یہ بات پھر دہرائی ہے کہ صفر بنیاد والے بجٹ کے نتیجہ میں ان ملازمین کی تخفیف نہیں پیش آئیگی جو زائد قرار پائیں گے بلکہ انہیں حکومتی سرگرمیوں کے نئے علاقوں میں دوبارہ ملازمت دی جائیگی۔

اس وضاحت کی ضرورت پریس میں شائع شدہ بعض ایسے رپورٹوں کے سبب لازمی ٹھہری جن میں صفری بنیاد پر اختیار کئے گئے ریاستی بجٹ کے نتیجے میں سرکاری ملازمین کی کثیر تعداد کی تخفیف کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا۔

جب حکومت مہاراشٹر نے صفری بنیاد پر بجٹ پیش کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا تھا اس وقت حکومت نے اس بات کا اشارہ بھی کر دیا تھا کہ صفری بنیاد پر تبصرے کے نتیجے میں زائد عملے کو محکمہ تنظیم عامہ (جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ) کے "زائد سیل" میں پولنگ کے طریقے پر دوسرے مقامات کے لئے پھر ملازمت دی جائے گی۔

صفری بنیاد پر بجٹ تیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مالی اور انسانی دونوں وسائل کو کم ترجیحی کاموں اور اسکیموں کی بجائے زیادہ ترجیحی کاموں پر اور پروگراموں پر لگایا جائے۔ پھر جب بھی کم ترجیحی کاموں یا اسکیموں، اور پروگراموں کے متعلق یہ معلوم ہوگا کہ وہ اپنے فائدہ پہنچانے کی مدت پوری کر چکے ہیں تو عملے کی کچھ تعداد لازمی طور پر زائد قرار پائے گی۔

عوامی خرچ جس شرح سے بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں کے ٹیکس دینے پر رضامندی کی شرح سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہے۔ ساتھ ہی حکومت سے لوگوں کی توقعات بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ کاری کے بہت تھوڑے وسائل کو بڑھانے کی مانگ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حکومت مہاراشٹر کو یقین ہے کہ صفری بنیاد کے بجٹ، سرمایہ کاری کے تھوڑے وسائل کو زیادہ بااُمید بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ حکومت کا مقصد یہی رہے گا کہ ٹیکس ادا کرنے والوں کو زیادہ با صلاحیت خدمات کمترین خرچ میں فراہم کی جائیں۔

مہاراشٹر بجٹ بابت ۸۸-۱۹۸۷ء

سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے مہاراشٹر بجٹ میں مجموعی طور پر ۵۴،۴۶ کروڑ روپے کا خسارہ ظاہر کیا گیا ہے۔ وزیر مالیات شری سوشیل کمار شندے نے یہ بجٹ ریاستی اسمبلی میں ۲۵ مارچ ۱۹۸۷ء کو اور اسی تاریخ کو مالیات کے وزیر مملکت ڈاکٹر شری کانت جچکار نے اسے کونسل میں پیش کیا۔

وزیر مالیات شری سوشیل کمار شندے نے ارکان ایوان کو بتلایا کہ اس خسارہ کی بھرپائی مختلف قسم کے ٹیکس نافذ کرکے کی جائے گی۔

آپ نے فرمایا کہ اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے جزوی طور پر موٹر سائیکل اور ٹرالی سائیکلوں پر ٹیکس عائد کرنے کے نئے طریقوں سے حکومت کو مزید ۹.۵ کروڑ روپے کی آمدنی

وزیر برائے مالیات شری سوشیل کمار شندے ریاستی بجٹ برائے ۸۸-۱۹۸۷ء پر آخری نظر ڈالتے ہوئے آپ کے بائیں طرف وزیر مملکت برائے مالیات ڈاکٹر شری کانت جچکار بھی نظر آرہے ہیں۔

ٹیکس میں دی گئی راحتیں

وزیر موصوف نے ممبران اسمبلی کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اوپر مذکورہ اضافی آمدنی کے ذریعوں کو تلاش کرتے ہوئے حکومت نے ہر لمحہ اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے کہ انصاف پر مبنی راحتی اقدامات کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیئے اور انہیں یکسر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ نے معزز ممبران کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ جون ۱۹۸۶ء میں اضافی بجٹ پیش کرتے وقت میں نے کئی راحتوں کا اعلان کیا تھا۔ اب اور مختلف راحتیں دی جا رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انسانی خون اور ان سے بنی ہوئی اشیاء پر موجودہ ۱۰ فیصد سیلز ٹیکس ختم کیا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر معذور افراد کے استعمال میں آنے والی بیساکھی جس پر فی الحال ۱۰ فیصد کی شرح سے ٹیکس لاگو ہے اسے ختم کیا جا رہا ہے۔ مکمل طور پر نابینا افراد کو بھی پروفیشنل ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا جا رہا ہے۔

متوقع ہے جب کہ دیگر ٹیکسوں سے ۲۷ کروڑ روپے آمدنی ہوگی ان اضافی ٹیکسوں سے ۴۶ کروڑ روپے اور صفر کی بنیاد پر بجٹ کے ذریعے ۵۰ کروڑ کی جو بچت ہوگی اس سے خسارہ میں کمی ہو جائے گی جبکہ ۴۶ء۱۸ کروڑ روپے کا خسارہ باقی رہے گا۔ وزیر موصوف نے فرمایا کہ اسے وسائل کی کمی کے پیش نظر ریاستی اور مرکزی ٹیکسوں کی وصولی و بخشی کے ذریعے پورا کرنا ممکن ہو سکے گا۔

شیشے کے سامان، چینی کے سامان، چکنی چکدار مٹی سے بنائے گئے سامان اور پروسیلین سے بنے گلیزڈ ٹائلس اور اس سے تیار کردہ اشیاء پر دس فیصد سیلز ٹیکس، یکساں انداز میں عائد کرنے کی تجویز رکھی گئی ہے۔ اب تک ان اشیاء کے لئے تین روپے قیمت کے سامانوں پر چار فیصد اور اس سے زائد قیمت کے سامانوں پر پندرہ فیصد سیلز ٹیکس عائد تھا۔ ان رعایتوں کی وجہ سے سالانہ خسارہ ۸۰ء۱ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ اس رعایت پر ۲۶ مارچ ۱۹۸۷ء سے عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے۔

شری شندے نے فرمایا کہ ایسے تیار ملبوسات جن پر اب تک کوئی ٹیکس نہیں عائد تھا اور جن کی قیمت ۳۰ روپے تک ہوتی تھی انہیں قابلِ ٹیکس کر دیا گیا ہے۔ اس سے قبل ۳۰ روپے سے زائد قیمت کے ملبوسات پر ۲ فیصد کی شرح سے ٹیکس نافذ کیا گیا تھا۔ اب یکساں شرح ٹیکس بحساب ۴ فیصد تمام اقسام کے تیار ملبوسات پر لاگو کر دیا گیا ہے۔ اس اضافی ٹیکس سے ۹۳ء۰ کروڑ روپے کی آمدنی متوقع ہے۔

شری شندے نے فرمایا کہ ہوزیری پر ۴ فیصد ٹیکس لاگو ہے لیکن بمبئی سیلز ٹیکس ایکٹ کے تحت جاری کئے گئے اعلان نامہ کے سبب ستمبر ۱۹۷۹ء سے اس پر صرف ایک فیصد سیلز ٹیکس عائد تھا۔ آپ نے حالیہ بجٹ میں اس رعایت کو ختم کر دینے کا اعلان فرمایا اور قانونی طور پر ۴ فیصد کی شرح سے ٹیکس نافذ کر دیا ہے اس سے حکومت کو ۲۱ء۲ کروڑ روپے کی آمدنی متوقع ہے۔

شری شندے نے دودھ سے تیار شدہ چیزوں پر ذائقہ دار دودھ ملا ہوا دہی سمیت ٹیکس کی موجودہ چار فیصد شرح کو چھ فیصد کر دینے کی تجویز پیش کی ہے جس سے ۹۰ء۰ کروڑ روپے کی آمدنی متوقع ہے۔ شری شندے نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ دودھ سے بنی اشیاء پر مذکورہ ٹیکس دودھ، دہی، لسی پر نافذ العمل نہیں ہے اور وہ ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں۔ بجٹ میں لبریکنٹ (مشینوں کے لئے استعمال کئے جانے والے تیل) پر چار فیصد کی بجائے آٹھ فیصد ٹیکس عائد کرنے کی تجویز رکھی ہے۔ اس سے حکومت کی سالانہ آمدنی میں ۶۱ء۱ کروڑ روپے کا اضافہ ہوگا۔

ڈٹرجنٹ پر موجودہ چھ فیصد کی جو شرح تھی اور جس سے دھلائی کے صابن مستثنیٰ تھے، اسے چار فیصد کر دیا گیا تھا لیکن اب اس رعایت کو ختم کرتے ہوئے آٹھ فیصد کی شرح سے ٹیکس نافذ کر دینے کی تجویز رکھی گئی ہے۔ اس سے سالانہ آمدنی میں ۲۸ء۲ کروڑ روپے کی آمدنی متوقع ہے۔

ق کوراج

نئے ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل آوری کا عزم

حکومت ہند نے اگست ۱۹۸۶ء میں ایک نئے ۲۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا ہے تاکہ غریبی کا خاتمہ ہو نیز پیداوار میں اضافہ اور سماجی و معاشی نابرابری ختم ہو۔ اس پروگرام پر اپریل ۱۹۸۷ء سے عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ پروگرام مذکورہ کے ہر نکتہ کے نشانہ کی تکمیل کا عزم مصمم کیا گیا ہے اور حکومت ہند کے ساتھ مشوروں کی روشنی میں ان کی حتمی شکل طے پا جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کرنے میں مہاراشٹر، قومی کوششوں میں ممتاز مقام حاصل کرے گا۔

بجلی پیدا کرنے یا بجلی تقسیم کرنے والے اداروں کو فروخت
یئے جلنے والے الیکٹرک کے سامان پر ٹیکس کی موجودہ
یصد کی شرح کو بڑھا کر ۶ فیصد کیا گیا ہے اس سے ۳٫۳۶
ڑ روپے کی سالانہ آمدنی متوقع ہے۔

مصنوعی سلک فائبر، سوت، دھاگہ، فائبر، اسٹیل
ں اور اسٹیپل فائبر دھاگہ (کیشول گوڈر یا نوجن) جن کا دستی
ر بنائے جانے کے لئے بطورِ خام اشیاء استعمال کیا جاتا ہے
ن پر اب تک ۴ فیصد کی شرح سے ٹیکس لاگو تھا۔ اس شرح
ب ۶ فیصد کر دیا گیا ہے۔ اس سے ۰۸ر۹ کروڑ روپے کی آمدنی
ع ہے۔

شری شندے نے فرمایا کہ اب پان مسالہ کا استعمال
ا ئی کے معمول ازاد میں بڑھ گیا ہے۔ اس پر اب تک ۲
د کی شرح سے ٹیکس عاید کیا گیا تھا۔ آپ نے ہر صورت میں
مسالہ کے بطور استعمال ہونے والی شئے پر ۱ فیصد
ں لگائے جانے کی تجویز رکھی ہے جس سے ایک کروڑ روپے
مدنی متوقع ہے۔

وزیر موصوف نے فرمایا کہ ایسے ٹیکسٹائلس، شکر اور تمباکو
ں ایڈیشنل ڈیوٹیز آف ایکسائز (گوڈس آف اسپیشل
پورٹس) ایکٹ ۱۹۵۷ء کی فہرست میں دکھلایا نہیں گیا ہے،

انھیں سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے اس لئے کہ اب تک ان اشیاء پر مزید ایکسائز ڈیوٹی کا بوجھ عائد نہیں تھا۔ ان اشیاء پر ۴ فیصد کی شرح سے ٹیکس نافذ کرنے سے ۵ کروڑ روپے کی مزید آمدنی متوقع ہے۔ سوت سے تیار کردہ الاسٹک کے سوتی کپڑے، پولیتھین اور سوتی کپڑوں سے تیار شدہ بلیٹ پر بھی ۴ فیصد ٹیکس لگانے کی تجویز ہے۔

حکومت مہاراشٹر نے ہمیشہ ہی ریاست کے پسماندہ علاقوں میں قائم صنعتوں کو ترغیباتی سہولیات سے نوازا ہے۔ ایک عمدہ ترغیبی سہولت کے تحت مختلف میعادوں کے لئے ٹیکس کی مختلف شرحیں لاگو کی گئی ہیں جو صنعتوں کے محلِ وقوع پر منحصر ہیں۔ لیکن اس ترغیبی اسکیم سے انکم ٹیکس ایکٹ برائے ۸۴-۱۹۸۳ء میں ایک ترمیم کے سبب مستفید ہونا کٹھن تھا۔ ایکٹ مذکور کی دفعہ ۴۳ ب کے تحت قانونی لوازمات کو بطور اخراجات کے منہا کرنے کی اجازت اسی وقت دی گئی ہے جب کہ اس سلسلہ میں ادائیگی حقیقتاً کر دی گئی ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا تھا کہ کوئی یونٹ اگر سیلز ٹیکس سے مستفید ہو رہا ہو تو اس طرح پس انداز رقم کو آمدنی کے زمرے میں شمار کرتے ہوئے اسے قابلِ ٹیکس قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے میں بمبئی سیلز ٹیکس ایکٹ کی وضاحت

دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کا مسئلہ

کئی سال سے دیگر دیہی پروگراموں کے ساتھ ساتھ، حکومت دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دے رہی ہے۔ دیگر ریاستی حکومتوں کے مقابلے میں حکومت مہاراشٹر نے اس جانب نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور موجودہ سالانہ منصوبہ جات میں اس زمرے کی ہر کوشش کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ چھٹے منصوبہ کی مدت کے دوران ۱۵٫۸۸۳ گاؤں کا ۲۱۸٫۳۳ کروڑ روپے کی رقم کو خاص اس مقصد کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

تجویز کردہ نئے ٹیکس ایک نظر میں

سیلز ٹیکس کے ذریعے

اشیاء کے نام	فیصد	اضافی یافت کروڑ روپے میں
۱: تیار ملبوسات اور ہوزیری	۴	۳٫۱۲
۲: شیشے کے سامان، چینی کے سامان اور چکنی مٹی کے گلیزڈ ٹائلس	۱۰	۰٫۹۴
۳: دودھ سے تیار شدہ چیزیں (بشمول ذائقہ دار دودھ اور بنایا ہوا دودھ)	۲	۰٫۹۰
۴: مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہونے والا لیبریکینٹ	۸	۱٫۶۱
۵: دھلائی کے صابن اور ڈٹرجینٹ مصنوعی سلک فائبر، سوت اور دھاگے، اسٹیپل، فائبر، اسٹیپل سوت اور اسٹیپل فائبر کے دھاگے	۶	۹٫۸۰
۶: پان مسالہ (جس شکل میں پایا جانے والا)	۱۰	۱٫۰۰
۷: ٹیکسٹائل فرنشنگز اور تمباکو	۴	۵٫۰۰

میں یہ گنجائش پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح سے پس انداز سیلز ٹیکس کی رقم ان ڈیلروں کے لیے حقیقتاً ادا کردہ سیلز ٹیکس کے زمرہ میں شمار کی جائے جن پر قرضہ جات کا بوجھ کسی ڈیلر کی جانب سے ادا کیے جانے والے ٹیکس کے مساوی ہو اور جو اسکیم یا کسی دوسرے متعلقہ علاقائی ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعے تعمیر کردہ ہوں۔

مرکزی حکومت کی جانب سے دستوری طور پر کی جانے والی تبدیلی لانے تک، جس کے تحت ۲۵۰ روپے کا پروفیشنل ٹیکس عاید کیا جانے والا ہے، اس ضمن میں ہم قدرے کوشش کرکے اپنی آمدنی میں مزید ذاتی روزگار کرنے والے افراد کا بھی احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ممبران اسمبلی کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے فرمایا کہ پچھلے سال، ایکٹ میں مذکورہ فہرست میں ایسے کتنے ہی ذاتی روزگار کرنے والے افراد کو شامل کیا گیا تھا۔ آپ نے یہ تجویز پیش کی کہ اب ویڈیو لائبریری اور ویڈیو پارلر چلانے والے افراد کو بھی ایکٹ مذکورہ کے تحت احاطہ میں لے لیا جانا چاہیے اور ۲۵۰ روپے کا ٹیکس ان پر بھی عائد کر دیا جانا چاہیے۔ اس طرح ۳۰ کروڑ روپے کی آمدنی متوقع ہے۔

اس سے قبل ریاستی حکومت نے مالی اور انسانی وسائل کو از سر نو بروئے کار لانے کے لیے صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری کے بابت وزیر موصوف پہلے ہی حوالہ دے چکے ہیں۔ اس صفر کی بنیاد پر بجٹ سے ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۵۰ کروڑ روپے کی بچت کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔

ایک ہی بار یکمشت ادا کیا جانے والا ٹیکس موٹر سائیکل اور ٹرائی سائیکل پر عاید کیا گیا ہے۔ اس کی شرح ۴۵۰/ روپے ان موٹر سائیکلوں کے لئے ہوگی جن کا وزن بنا کوئی دوسرا بوجھ لادے ۵۰ کلوگرام سے کم ہوگا اور یہ شرح ۹۷۵ روپے اور ۱۲۵۰ روپے ان موٹر سائیکلوں کے لئے ہوگی جن کا وزن علی ترتیب ۵۰ کلوگرام تا ۱۰۰ کلوگرام اور ۱۰۰ کلوگرام سے زائد ہوگا۔

دیہی بے روزگار افراد کے لیے راحتیں

ریاست مہاراشٹر ملک کی وہ اولین ریاست ہے جس نے دیہی افراد کو روزگار فراہم کرنے کی قانونی ذمہ داری، چند شرائط کی حدود میں لی ہے۔ حکومت ان ذمہ داریوں کو ہر طرح سے نبھا رہی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۲۳۸٫۷۵ کروڑ کے خرچ کا تخمینہ لگایا گیا ہے جس میں سے ۱۴۳٫۵۰ کروڑ روپے "ضمانت روزگار اسکیم کے لئے ہیں۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ۵۲۵ کروڑ روپے کی رقم قبائلی ذیلی منصوبہ کے لئے مختص کردی گئی تھی۔ درج فہرست جاتیوں اور نو بدھشٹوں کو مناسب طور سے امداد پہنچانے کے لئے امسال ۱۰۱٫۴۶ کروڑ روپے کی رقم ۸۹،۳۸۵ خاندانوں کو مستفید کرنے کے لئے رکھی گئی ہے۔

ٹرالی سائیکلوں کے لئے ٹیکس کی شرح ۱۲۵۰/ روپیہ ہوگی۔ ایسی موٹر سائیکلیں اور ٹرائی سائیکلیں جو ایک ٹریلر یا سائڈ کار کو کھینچنے کے لئے استعمال میں لائی جاتی ہیں ان پر ۴۵۰ روپے کا ٹیکس عائد کیا گیا ہے۔ جو اور مذکورہ شرح کے علاوہ ہوگا۔ حادثہ کی وجہ سے ملکیت کے بدل جانے پر گاڑی کو ریاست سے باہر لے جانے کے سبب، یا پتہ کی تبدیلی کی وجہ سے ٹیکس کی رقم واپس کرنے کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے۔ ان اقدامات سے ۵۹ کروڑ کی مزید بازیافت یا آمدنی متوقع ہے۔

تلخیص و ترجمہ: ضیاء الحق قاسمی

●

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان کی حکومت کا ایک سال

دشوار کن حالات میں لائق ستائش کارنامے

مہاراشٹر ترقیاتی کوششوں میں سب سے آگے ہے۔ کیونکہ خوش قسمتی سے ریاست کی لیڈر شپ   ایسے ترقی پسند   ہاتھوں میں ہے جو چھوٹے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے بہت سے فیصلے کئے ہیں چنانچہ نہ صرف انتظامی مشنری ان فیصلوں پر پوری سرگرمی اور جانفشانی سے عمل کر رہی ہے بلکہ ان کی عمل آوری میں خود لوگ آزادانہ طور پر اور راضی خوشی اپنا تعاون دے رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان، سانگلی ضلع میں خانہ پور تعلقہ کے کرڈے گاؤں میں کسانوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان نے ضمانت روزگار اسکیم کے تحت لاتور ضلع میں نیلنگا تعلقہ میں جاری نہر سازی کے کام کا معائنہ فرمایا۔

وزیراعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے دوسری مرتبہ ۱۴ رمارچ ۱۹۸۶ء کو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت ریاست مسلسل تیسرے سال شدید خشک سالی کی گرفت میں تھی۔ لیکن شری چوان نے وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جلد از جلد خشک سالی پر غالب آنے کا پکا ارادہ کیا اور ریاست کی ترقی کی رفتار کو بڑھانے کی ٹھان لی۔

وزیراعظم کا مدد کرنے کا وعدہ

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے اس نمائش کی افتتاحی کارروائی میں شرکت فرمائی جو "مہاراشٹر نرملا، مہاراشٹر بہارلا" کے نام سے گذشتہ سال یکم مئی کو منظم کی گئی اور منائی گئی تھی تاکہ ریاستِ مہاراشٹر کے وجود میں آنے کی سال بھر تک منائی جانے والی ۲۵ سالہ جشن سیمیں کی اختتامی تقریب بھی جشن سیمیں کے شایانِ شان ہو۔ اس کے بعد دو دن وزیراعلیٰ کی درخواست پر وزیراعظم نے پونے، ناشک، اورنگ آباد کے ان چند علاقوں کے دوروں میں گذارے جو خشک سالی سے متاثر ہیں۔

وزیراعظم نے شدید خشک سالی میں مبتلا ان چند علاقوں کو بچشم خود دیکھا اور کہ ریاستی حکومت اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے کتنی ہوشمندی سے عمل درآمد میں مصروف ہے ایک جلسۂ عام میں وزیراعظم نے خشک سالی سے متاثر لوگوں کی راحت کے لئے (۵۰) کروڑ روپئے کی نقد اور جنس کی شکل میں مدد کا اعلان فرمایا اور اس طرح وزیراعلیٰ کی طرف سے لوگوں کو فائدہ رسانی کے لئے کئے گئے اقدامات کی ستائش کی۔

خشک سالی کے خلاف اٹل جنگ

وزیراعلیٰ کی خشک سالی کے خلاف مصمم جنگ اور ثابت قدمی کے ساتھ کارروائی کی کوششوں کا اظہار ان احکامات سے ہوتا ہے جو انھوں نے فوری عملدرآمد کے لئے جاری کئے ہیں جیسے بیجوں کی مفت فراہمی، دستیاب پانی کو منصفانہ تقسیم کے لئے مہیا کرنا جانوروں کے لئے کیمپ اور چارہ کا انتظام، جنگی پیمانے پر پینے کے پانی کی فراہمی، طالب علموں کے امتحانی فیس کی معافی، روزگار ضمانت اسکیم کے تحت مزید کاموں کا شامل کرنا، کام کرنے والوں کو گیہوں کی تقسیم اور ان کے لئے حدودِ عمر میں تخفیف، بیلوں کو کام سے لگانا، خواتین مزدوروں کی تنخواہیں، مرکز سے زیادہ امداد کی درخواست وغیرہ۔ ان احکامات کو صادر کرنے کے ساتھ ساتھ وزیراعلیٰ نے جہاں خشک سالی کے متاثر ہونے والوں کو راحت عطا کرنے میں ترجیح دینے کا حکم دیا ہے وہیں یہ بھی فرمایا ہے کہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ متاثرین زندگی کو ناقابل برداشت نہ سمجھیں۔

حال ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو پانی پینے کے لئے مخصوص ہے اور موجودہ خشک سالی اور آئندہ پانی کی ضرورت کے پیش نظر پینے کے لئے ہی محفوظ کیا گیا ہے۔ اگر اسے آبپاشی کے کام میں استعمال کیا گیا تو اس خلاف ورزی پر بہت سخت اقدام

ناشک ضلع میں سنر تعلقہ کے
مانے گاؤں میں فراہمی آب اسکیم کی ایک تصویر

کیا جائے گا۔ اسی طرح ۸ مہینے تک پانی کے استعمال کی جو تاکید وزیر اعلیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً کی جاری ہے اس کا اعلان حال ہی میں سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ اس طرح یقین ہے کہ پانی کی منصفانہ اور مناسب تقسیم عمل میں آئے گی اور یہ قدرتی وسیلۂ زندگی سبھوں کو دستیاب ہوگا۔

ریاستی سطح پر ایک جمیع پارٹی کمیٹی بنائی گئی ہے جس کے چیرمین وزیر اعلیٰ ہیں تاکہ راحت کے کام کے لئے کی جانے والی کوششوں میں ربط و یکسانیت رہے۔ اسی طرح ایک سوکھے سے راحت کا سیل " الگ سے محصولیہ محکمہ بمبئی میں ۲۱ رجنوری ۱۹۸۶ء سے قائم کیا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے سچے دل سے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ سوکھے سے راحت کے لئے جمع کی جانے والی رقمیں انھیں مقاصد کے لئے خرچ کی جائیں گی جن کے لئے وہ جمع کی گئی ہیں۔

پندرہ ضلعوں کا دورہ

شری چوان بنفس نفیس سوکھے سے متاثر ضلعوں کا دورہ کرتے رہے ہیں تاکہ سوکھے سے متعلق پیش آنے والے حالات بچشم خود دیکھیں کہ سوکھے سے کس حد تک پریشانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اور شخصی طور پر ان راحت کے کاموں کا معائنہ کریں جو ایسے مقامات پر جاری کئے گئے ہیں۔ نیز روزگار ضمانت اسکیم کے تحت شروع کئے گئے کاموں پر کام کرنے والوں سے ملاقات کریں۔ انھوں نے اب تک ۱۵ ضلعوں کا دورہ کیا ہے۔ ان دوروں میں وزیر اعلیٰ نے کئی ایک بروقت فیصلے دئے تاکہ ان رکاوٹوں پر عبور حاصل کیا جا سکے جو راحت کے اتنے زبردست کام پر عمل کرنے میں پیش آتے ہیں اور تاکہ متاثر لوگوں کو تیزی کے ساتھ راحت دی جا سکے اس طرح بروقت فیصلوں پر عمل درآمد کئے جانے کی نگرانی انھوں نے اپنے ۳ کابینی ساتھیوں کے سپرد کی ہے یعنی وزیر مالیات شری سوشیل کمار شندے، وزیر صحت شری بھائی ساونت اور وزیر محصول شری شیواجی راؤ دیشمکھ جنھوں نے حال ہی میں پونے اور سولاپور ضلعوں کے دورے کئے۔

شری چوان نے روزانہ گھنٹہ خاص طور سے ریاستی سطح کی جمیع پارٹی سوکھا راحت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے محفوظ کیا ہے جس کے وہ خود چیرمین ہیں تاکہ شخصی طور پر سوکھے سے راحت کے سلسلے میں وصول ہونے والے چیک اشخاص سے اور منتر الیہ کے اداروں سے بذات خود وصول کریں۔

ریاست کی انوکھی کپاس اجارہ دارانہ اسکیم کو تین سال کے لئے یعنی ۳۰-۶-۱۹۸۹ تک کی توسیع مرکز کی طرف سے دی گئی ہے چوان حکومت نے اس اسکیم کی توسیع کے سلسلے میں مرکز سے پر زور

درخواست کی تھی اس خیال سے کہ یہ اسکیم مفید ہو اور موثر بھی ہو وزیر اعلیٰ نے یہ فیصلہ دیا کہ کپاس کی قیمت کپاس اگانے والے کسانوں کو ایک واحد قسط میں ادا کی جائے بخلاف اس طرح کے جس میں تین سابقہ قسطیں ادا کی جاتی تھیں۔

صنعتی پیش رفت

ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی بھی ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر شری ہارٹ کی چیرمینی میں قائم کی گئی ہے تاکہ کپاس اسکیم اچھی صلاحیت کے ساتھ عمل کیا جا سکے۔

زراعت کے ساتھ ساتھ ریاست نے صنعتی ترقی میں ایک نمایاں پوزیشن حاصل کی ہے۔

صنعتی ترقی میں محنت کا مقام خاص اہمیت رکھتا ہے محنت کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ریاستی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اپمیریس مل جو بند ہے اسے یکم مئی ۱۹۸۶ء سے وہ اپنی تحویل میں لے اور اس طرح ۶ ہزار مل مزدوروں کو بے روزگاری کی پریشانی سے بچائے۔ یہ مل ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء سے دوبارہ چالو ہو چکی ہے۔ ریاستی حکومت نے جلگاؤں کی خاندیس مل اور بمبئی کی شری نواس مل کو بھی اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے ریاستی حکومت کے اس مستحکم فیصلے کا اعلان بھی کیا کہ ملوں کو وہ زائد زمین جو ان کے پاس ہے بیچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

شری چوان نے اس بات کا بھی اعلان فرمایا کہ وہ اس بات پر خاص طور سے توجہ دیں گے کہ وہ مل مزدور جو طویل ہڑتال کے دوران کام سے نکال دیے گئے تھے انھیں مل کے انتظام کاران ملوں میں پھر سے کام پر لے لیں۔

۱۹۸۶ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں مہاراشٹر کو مرکز سے صنعتی لائسنسوں کے حاصل کرنے میں اول درجہ ملا۔ چنانچہ اسے (۹۰) منظوری کے خطوط (۵۳) صنعتی لائسنس (۳۰) ڈی. جی. ٹی. ڈی رجسٹریشن سرٹیفکس حاصل ہوئیں۔ نئے کارخانہ داروں کی ترقی کے لیے چوان حکومت نے ایک خاص مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ریاست مہاراشٹر کی مہاراشٹر اسٹیٹ اسمال اسکیل انڈسٹریز ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے تحت ہوگا۔

الکٹرانکس کی حوصلہ افزائی

ریاست میں الکٹرانکس کی صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے کوششیں کی جاری ہیں اور ان خاص اشیاء پر جو یہ صنعت بناتی ہے سیل ٹیکس کو کم سے کم کر دیا ہے اس کی وجہ سے الکٹرانکس

خوراک اور شہری رسد کے مرکزی وزیر شری ایچ. کے. ایل بھگت سے منترالیہ میں .. فروری کو وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان سے عوامی تقسیم کاری نظام پر گفتگو کی۔ زیر نظر تصویر میں ڈاکٹر ... ممبر بھی ... وزیر خوراک اور شہری رسد شری ولاس ساونت وزیر مملکت برائے خوراک اور شہری رسد بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سامان کے بنانے میں ٹھوس اضافہ ہوا ہے اورنگ آباد میں ایک "الکٹرانک ڈیزائن اور ٹکنالوجی کا مرکز" کھولا گیا ہے تاکہ مراٹھواڑہ جیسے پسماندہ علاقے میں الکٹرانکس کو ترقی دی جائے اور وہاں جدید اور ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی ٹریننگ کے لئے سہولتیں حاصل ہوں۔ ۲ء۶ کروڑ روپے کی اس اسکیم کے تحت ریاست میں الکٹرانک کی صنعت کو تیز رفتار ترقی دینے کے لئے تربیت یافتہ ماہرین کے ذریعے ٹکنولوجسٹ کی ایک ٹیم تیار ہوگی۔

تعلیم کے لئے نئے زاویے

جولائی ۱۹۸۶ء میں وزیر اعلیٰ نے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے قائم کرنے کا اعلان کیا جو مشہور ماہر تعلیم اور یونیورسٹی کے ریٹائرڈ صدر نشین ڈاکٹر مدھوری بین شاہ کی چیرمینی میں ہوگی تاکہ وہ مہاراشٹر میں تیز رفتاری کے ساتھ اس نئی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں سفارشات پیش کرے جس کا اعلان وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کیا ہے اور موجودہ نصاب میں پیشہ ورانہ تعلیم کے تناسب میں اضافہ تجویز کرے پہلا نودیہ ودیالیہ ریاست میں مارچ ۱۹۸۶ء میں قائم کیا جا چکا ہے ایسے ودیالیہ، ودربھ، مہاراشٹر اور مغربی مہاراشٹر میں مختلف مرحلوں میں قائم کئے جائیں گے۔

بمبئی کی ترقی

بمبئی شہر کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے جو نہ صرف مہاراشٹر کی بلکہ پورے ملک کی ترقی کی آئینہ دار ہے۔ ریاستی حکومت نے کئی ایک پراجیکٹوں کا آغاز کیا ہے تاکہ بمبئی کے باشندوں کو آسائش مل سکے۔ مانخورد، بیلاپور ریلوے لائن ان میں سے ایک ہے۔ مرکز نے اس اسکیم کے لئے ضروری فنڈز کی اجازت دیدی ہے۔ رقم کا حصول ڈبنچروں کی فروخت کے ذریعے مختلف مرحلوں میں ہوگا۔ مرکزی حکومت نے ۱۹۸۶ء کے مالی سال کے دوران ۱۵ کروڑ روپئے فنڈ کے حصول کی اجازت عطا کی ہے۔

ریاستی حکومت نے کئی ایک منصوبوں کی ابتدا کر دی ہے تاکہ مکانات کے سلسلے میں باشندگان بمبئی کی ضرورتیں پوری ہوں اور ان میں رہنے والوں کی سہولت، مکانوں کی مرمت کے خرچ کی سیلنگ میں اضافہ ہو پرانی اور شکستہ بلڈنگوں کی از سر نو تعمیر کی حوصلہ افزائی یا مالکانہ حقوق کے ساتھ کمروں کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کمزور طبقوں کے لئے ہاؤسنگ اسکیم وغیرہ شامل ہیں۔

ریاست کے مختلف علاقوں کی ترقی میں جو چیزیں رکاوٹ [illegible] ہوئی ہیں انھیں دور کرنے کے لئے حکومت نے ٹھوس اقدامات کی ابتدا کر دی ہے۔

ریاست کے سالانہ پلان برائے ۱۹۸۶ء میں ۲۵۰ کروڑ رو[illegible] کا انتظام علاقائی عدم توازن کو دور کرنے کے لئے کیا گیا ہے ساتویں منصوبے میں ۱۵۰۰ کروڑ روپئے فقط اسی ایک مقصد [illegible] تحت رکھے گئے ہیں۔ مختلف علاقوں کی ترقی کے حصول کے [illegible] سے مل کر ریاست کی تشکیل ہے۔ خاص ترقیاتی پروگرامو[ں] کو جیسے ۳۵ نکاتی پروگرام ودربھ کے لئے، ۴۲ نکاتی پروگرا[م] مراٹھواڑے کے لئے، ۱۲ نکاتی پروگرام کوکن کے علاقہ کے لئے تشکیل کیا گیا ہے۔ حکومت نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ آئندہ پراجکٹو[ں] اور ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس بات کا خیا[ل] رکھا جائے گا کہ ان پر عمل کرنے میں نئے مختلف علاقوں میں [عدم] توازن پیش نہ آئے۔

شروع سے ہی اصول پر عمل

شری چوان ایک قابل اور باصلاحیت منتظم کی حیثیت [سے] مشہور ہیں۔ اس عہدے پر آنے کے بعد شری چوان نے بہت اقدامات کئے تاکہ حکومت کی ہر سطح پر نظم ضبط قائم ہو اور حکو[متی] مشینری کو باصلاحیت اور جوابدہ بنایا جائے۔ شروع [سے] ہی اصول پر عمل درآمد کا سلسلہ رکھا گیا ہے اور حکوم[ت] اس بات پر غور کر رہی ہے کہ ان اصولوں کو کمپیوٹروں کے ذریعے محفوظ کر لیا جائے۔ احکامات صادر کئے جا[تے] ہیں کہ کسی چیز کا مطالعہ دو مہینوں میں ملیٹرون کی مدد سے مکمل کر لیا جائے تاکہ ریاستی انتظامیہ کے ۸ محکمو[ں] [میں] کمپیوٹروں کا استعمال ہونے لگے۔

صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری

ریاستی حکومت کے تمام محکموں کو ہدایات دی جا چکی

وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان
ضمانت روزگار اسکیم کے تحت
پرکولیشن ٹینک کا کام کرنے والے مزدوروں
سے گفتگو کرتے ہوئے
یہ کام ناندیڑ ضلع میں قندھار
تعلقہ کے گاؤں مارتیلونی میں جاری ہے

۱۹۸۶ء کے بجٹ سال سے اپنے اپنے بجٹ صفری بنیاد پر بنانا شروع کریں۔

اس لحاظ سے مہاراشٹر کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ وہ سارے ملک میں صفر کی بنیاد پر بجٹ تیار کرنے والی پہلی ریاست ہے

صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری میں غیر ضروری اسکیموں پر پیش آنے والے اخراجات کی کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے۔ نیز ان پروجکٹوں کو ترک کر دیا جاتا ہے جو اب مفید نہیں رہے لیکن وہ عملہ جو ان غیر مفید پروجکٹوں کو ترک کرنے کے بعد زائد شمار ہوگا اسے تخفیف کے تحت خارج کر دینے کے بدلے کسی دوسرے مقام پر جذب کر لیا جائے گا۔ ریاستی حکومت نے اس بات کی وضاحت نہایت واضح طور پر اور صاف الفاظ میں کر دی ہے تاکہ اپنے ملازمین کے ذہن سے یہ خوف دور کر دے کہ بڑے پیمانے پر تخفیف پیش آنے والی ہے۔

اگرچہ وزیر اعلیٰ باصلاحیت اور نظم و نسق کی پابند انتظامیہ کے سلسلے میں پورا زور صرف کرتے ہیں پھر بھی وہ ایسے ملازمین حکومت کے سلسلے میں ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو ریاستی انتظامیہ کے اہم اجزا ہیں۔ مرکز نے اپنے مقرر کئے گئے چوتھے تنخواہ کمیشن کی بعض سفارشات کو اپنے ملازمین کے لئے اس وقت منظور کر لیا تھا جب اسے تنخواہ کمیشن کی رپورٹ موصول ہوئی تھی۔ ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں اپنے ملازمین کی طرف سے مانگ اور مطالبات کا انتظار کئے بغیر یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے اپنے ملازمین کے لئے تنخواہ کی ۲۰ فیصدی کے حساب سے اور کم از کم ۷۵/ روپئے کی حد تک عبوری راحت کی ایڈہاک منظوری دیدی ہے۔ یہ عبوری راحت مرکزی شرح کے مساوی کر دی گئی ہے۔ شری چوان کی حکومت نے ریاستی ملازمین اور دوسرے ملازمین کے سلسلے میں ۱۵ دن کی ایڈہاک بونس کی مزدوری بھی ۸۶-۱۹۸۵ء کے لئے عطا کی ہے

کسانوں کی تسکین

اسی سال کے ماہ فروری میں شیتکری سنگھٹن نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا تھا کہ سنگھٹن مذکور وزیر اعلیٰ سے ان کی رہائش گاہ ورشا میں ملاقات کرے گی اور اپنے مطالبات پورا کروا لینے کے لئے وہاں دھرنا دے گی لیکن شری چوان نے اس معاملہ کو نہایت ماہرانہ انداز میں سلجھایا جس سے کسانوں کو اطمینان ہو گیا اور انھوں نے تحریک کو ختم کر دیا۔

شری چوان نے کسانوں سے یہی کہا کہ کپاس کی آخری قیمت

انڈین آئیل کارپوریشن کے ڈائرکٹر شری بی۔ کے بخشی نے وزیراعلیٰ "خشک سالی راحت فنڈ" میں وزیراعلیٰ کو ۵ لاکھ روپے کا ایک چیک پیش کیا۔ یہ رقم ٹینکر کی خریداری کے لئے پیش کی گئی ہے۔

شری ایم۔ کے۔ باگیا، چیرمین و مینجنگ ڈائرکٹر، ہندوستان پٹرولیم نے وزیراعلیٰ کو "خشک سالی راحت فنڈ" کے لئے ۵ لاکھ روپے کا ایک چیک پیش کیا۔

شری پی۔ پی۔ بھنڈاری، ڈائریکٹر و چیرمین گولڈن تمباکو، نے کامگار آکرش سبھا کی جانب سے وزیراعلیٰ شری ایس۔ بی چوان، کو "وزیراعلیٰ خشک سالی راحت فنڈ" میں ۶ لاکھ روپے کا ایک چیک پیش کیا۔

جو انھیں پیش کی جائے گی ایسی ہوگی جوان کے لیے تسلی بخش ہوگی اس کے علاوہ اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ باہمی کوششوں کے ذریعے حکومت کے نمائندے اور سینکری سشنگھ کے نمائندے مرکز پر زور ڈالیں کہ وہ مہاراشٹر سے برآمد کیے جانے والی کپاس کی گانٹھوں کے کوٹے میں اضافہ کرنا منظور کرے۔

عام آدمی کا اعتماد

اوپر جو کچھ مذکور ہوا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں ایک طرف چوان حکومت نے سوکھے کے مسائل کو حل کرنے کو اعلیٰ ترین توقیت دی ہے وہیں دوسری طرف اس نے ریاست کی ہمہ جہتی ترقی پر بھرپور نگاہ بھی رکھی ہے اور ترقی کے مختلف سیکٹروں میں یکساں پیش رفت میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ جہاں بہت سے مشہور ادارے اور اشخاص سوکھے سے راحت رسانی کے کام میں اپنی استعداد کے مطابق ہاتھ بٹا رہے ہیں وہیں مدد دینے کے ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جن میں بمبئی میں جوتوں پر پالش کرنے والے لڑکوں نے ۱۰۰ روپے اپنے اخراجات میں کمی کرکے پیش کیا ہے۔ کولہاپور کے آرٹس اور کامرس کالج کے طلبا نے اپنے سالانہ جلسہ کے خرچ میں کمی کرکے سوکھے سے متاثر لوگوں کی مدد کے لیے بچائی ہوئی رقم پیش کی ہے۔ ایک زنانہ ضمانت نیم کی زنانہ مزدور شریمتی پاروتی ابو دایوار کی طرف سے ۳۰۱ روپے کی رقم پیش کی گئی جو اس نے سوکھے سے متاثر اپنے مزدور بھائی بہنوں کی طرف سے سوکھے سے متاثر لوگوں کی مدد کے لیے اکٹھا کی تھی اور یہ رقم اس نے وزیر اعلیٰ کے خشک سالی راحت فنڈ میں دی۔ ایسی مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوکھے سے متاثر لوگوں کی دستگیری اور مدد کے لیے شری چوان کی اپیل نے عوام کے ہمدردانہ جذبات کو ابھارنے میں بہترین کامیابی حاصل کی ہے اور ریاست کے عوام کو شری چوان کے انتظامیہ پر بھرپور بھروسہ اور اعتماد ہے۔

مہاراشٹر جیسی ایک وسیع ریاست کے انتظامیہ کو سنبھالتے ہوئے جس میں بہت سے پیچیدہ اور کٹھن مسائل بھی ہیں۔ شری چوان نے قومی امور سے متعلق اپنے حساس ہونے کی کیفیت کا لائق ستائش ثبوت دیا ہے۔ اپنی تقریروں کے دوران انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ عوام قومی یکجہتی اور یکتا، داخلی امن و استحکام اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو اپنائیں تاکہ ان میں باہم برادرانہ جذبات پیدا ہوں جو دائمی امن و امان کے لیے نیز ہمہ جہتی ترقی کے لیے نہ صرف مہاراشٹر میں بلکہ پورے ملک میں ضروری ہیں:

ہمیں چاہیے کہ ترقی کے لیے جو کوششیں جاری ہیں ان میں دامے درمے، قدمے، قلمے، سخنے ہاتھ بٹائیں۔

(ترجمہ عبداللہ)

بڑے پیمانے پر راحت رسانی کے کام

وی۔ رنگاناتھن، سکریٹری محکمۂ ریلیف سے ایک ملاقات

خشک سالی سے نمٹنے کا حکومت کا پکا ارادہ

لگاتار دوسرے سالوں کے قحط بارانی نے حکومت کو ۱۹۸۶ء کے فصل خریف کے دوران کافی چوکنا اور محتاط بنا دیا تھا۔ ریاست کے تمام ضلعوں اور تعلقوں پر جون ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے سے برسات کے طور طریقوں اور حالات پر گہری نظر رکھنے کے بعد آخر کار ستمبر ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ لگاتار تیسرے برس بھی یہ سال قحط بارانی کا سال ہوگا۔

اس بات کے پیش نظر راحت رسانی کے اقدامات بڑے پیمانے پر فوراً ہی شروع کر دیئے گئے اور کافی زور اس بات پر دیا گیا کہ خریف کی کھڑی فصل سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور فصل ربیع کے لئے تمام ضروری باتوں کا انتظ

تھری وی۔ رنگاناتھن،
سکریٹری محکمۂ راحت رسانی
اور بازآبادکاری مالیات و
جنگلات۔

خشک سالی کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مرکزی ٹیم، اکولہ ضلع میں بالاپور میں واقع ایک کھیت پر دیکھی جاسکتی ہے۔

****

صرف ۱۱۹ لاکھ ہیکٹر میں بوائی کی گئی تھی۔ ان مقامات میں بھی بہت اچھی بوائی ہوئی تھی ... ستمبر ۱۹۸۶ء میں ہی فصل سوکھنے لگی تھی اس لئے اولین توجہ خریف کی کھڑی فصل کے بچانے پر دی گئی۔ آب پاشی کے ذخیروں سے جہاں تک ممکن ہوسکا کسانوں کو ترجیحی بنیاد پر پانی فراہم کیا گیا تاکہ خریف کی کھڑی فصل کو بچایا جاسکے اور ان ذخیروں میں سے بھی پینے کے لئے صرف ضرورت کے مطابق پانی محفوظ رکھا جاسکے مزید یہ کہ کاشتکاروں کو دریاؤں اور ندیوں سے بے روک ٹوک پانی استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی تاکہ فصل خریف بچائی بھی جاسکے۔ اس کے علاوہ اس بات کی ہدایت بھی جاری کی گئی تھی کہ جہاں جہاں بجلی کے پمپ سیٹ لگے ہوئے ہیں ان کی بجلی نہ کاٹی جائے خواہ ان پر پہلے ہی کی رقمیں کیوں نہ باقی ہوں۔

یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ زراعتی پمپ سیٹس سے پانی کا مہیا کیا جانا قطعاً بند نہ ہونے پائے۔

کاشتکاروں کی حالت دو سال کے لگاتار سوکھے کے سبب ابتر ہوچکی تھی اس لئے زمین کے لگان کاشت کے لئے دئے گئے تم بدلی قرضہ جات اور سرکاری بقایوں کی وصولیات معطل کردی گئی تھیں۔

اور فرٹلائزروں اور بیجوں کو فراہم کرنے کے بارے میں کیا کیا گیا؟

چھوٹے اور حاشیوں والی زمینوں پر کاشت کرنے والے (مارجینل کسانوں کو) جن کی فصلیں ۸۶-۱۹۸۵ء میں سوکھے کے سبب نقصان سے دوچار ہوئی تھیں بیج بطور عطیہ دئے گئے اور ان سے کوئی رقم نہیں لی گئی تاکہ وہ خریف ۱۹۸۶ء کی جگہ ربیع ۸۷-۱۹۸۶ء کی فصل سے فائدہ اٹھائیں اس مقصد کے تحت جملہ خرچ ۵۳۰ء۱۷ کروڑ روپیہ پیش آیا تھا۔

قحط بار سے متاثر کسانوں کے بچوں پر تو سے کو زد پڑی ہوگی۔ ان کے ساتھ کیا رعایتیں برتی جارہی ہیں؟

گذشتہ سال کی طرح امسال یعنی ۸۷-۱۹۸۶ء تعلیمی سال میں بھی تسلیم شدہ اسکولوں، کالجوں اور تکنیکی اداروں کے ان طالب علموں کی فیس جن کا تعلق خشک سالی سے متاثرہ

جہاں فراہمیٔ آب کا کوئی اور ذریعہ دستیاب نہیں ہے۔ وہاں پانی ٹینکروں کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ لاتور ضلع کے اوسا تعلقہ کے بورپھل گاؤں میں ایک ٹینکر کے ذریعے پانی پہنچایا جا رہا ہے۔

لگانے کے لیے آئی تھی۔ اس طرح زراعتی مزدوروں اور کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ملازمت دینے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ جب ضمانت روزگار اسکیم کے تحت کام شروع کیا جاتا ہے تو زیادہ زور پیداواری کاموں پر دیا جاتا ہے جیسے آبپاشی، جنگل کاری، ڈھلانوں پر بند باندھنا، کٹاؤ سے کاشت والی زمینوں کا تحفظ۔ پانی رس رس کر بہنے والے تالابوں کی تعمیر، دیہاتی تالابوں وغیرہ کی تعمیر، تاکہ یہ تالاب آئندہ پیداواری کام دے سکیں اور آئندہ میں پیش آنے والے اس جیسے قحط باراں کی سختیوں کو ہلکا کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ جہاں یہ پیداواری کام کرنے کرانے کے امکانات نہیں ہوتے وہاں غیر پیداواری کام جیسے سڑکوں کی تعمیر کی اجازت دے دی جاتی ہے تاکہ قحط سے متاثر افراد کو کوئی ذریعہ معاش میسر آئے اس خیال سے کہ زیادہ تعداد میں پیداواری کام انجام پائیں اس بات کی اجازت دی جا چکی ہے کہ بڑے اور درمیانی نوعیت کے آبپاشی کے غیر ابراتہ پروجیکٹوں کے بعض حصے تعمیر کروائے جائیں چنانچہ ان کی انتظامی منظوری بھی عطا کی جا چکی ہے

امور ہاتھ میں لیے گئے ہیں ان میں سے بعض خاص نوعیت کے کام نیچے مذکور ہیں۔

ایسے بڑے، درمیانی اور چھوٹے آب پاشی کے کام جن کے لیے ریاستی پلان کے علاوہ بجٹ میں کوئی انتظام نہیں ہے انہیں روزگار ضمانت اسکیم کے تحت منظور کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ اگر مناسب جگہ دستیاب ہو تو ایک گاؤں میں اب ایک سے زیادہ تالاب بھی بنانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس کی منظوری بھی دی جا چکی ہے کہ کٹاؤ سے زمین کی حفاظت کا کام مخصوص کردہ پانی کے شیڈ کے باہر جہاں اس کی ضرورت سمجھی جائے انجام دیا جا سکتا ہے جہاں سخت چٹانی علاقوں میں نہر کا کام کرنا مقصود ہو وہاں مادی محنت میں سہولت کی غرض سے جسمانی محنت کا تناسب ۵۰: ۵۰ کر دیا گیا ہے۔ اب رسنے والے تالابوں کو ۲ ایم سی فیٹ تک کی بلندی پر لے جانے کی اجازت دی جا چکی ہے۔

نیز ایک زرعی اسسٹنٹ کو دو مرکزوں کے سپروائزر (دیکھ بھال) کرنے کی ذمہ داری اور ۳۰۰ مزدوروں پر کام پر لگانے کی اجازت بھی دی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ڈویژنل کمشنروں کو روزگار ضمانت اسکیم کے سلسلے میں مزید عملہ مقرر کرنے کے اختیارات دیے جا چکے ہیں۔

اوپر مذکور انتظامات کے مطابق کیا کافی کام مہیا ہوا کرتا ہے؟

تاکہ قحط باراں سے متاثر لوگوں کو کافی کام میسر آسکے کسی

لاتور ضلع میں اودگیر تعلقہ میں
نیکناال پرکولیشن ٹینک کا کام پوری تیزی
سے جاری ہے۔

چونکہ راحتی کاموں کا لگاتار اور مستقل جائزہ لیا جاتا ہے اس لیے وہ رکاوٹیں جو زیادہ کاموں کو بیک وقت کرنے میں پیش آتی تھیں معلوم ہو گئیں اور انھیں دور کرنے کے احکامات فوری طور پر صادر بھی کر دیئے گئے۔ ان تمام طور طریقوں کے اختیار کرنے کی خاص غرض جیسا کہ وزیر اعلیٰ وقتاً فوقتاً بتلا چکے ہیں یہ ہے کہ ملازمت برائے راحت، روزگار ضمانت اسکیم کے تحت ان سب متاثر افراد کو دی جائے جنھیں اس کی ضرورت ہے۔

"ضمانت روزگار اسکیم" کے تحت کتنے کام جاری ہیں؟

موجودہ حالت میں ۹۴۶۹ کام روزگار ضمانت اسکیم کے تحت قحط باراں سے متاثر علاقوں میں جاری ہیں۔ ان کاموں میں تقریباً ۹٫۰۰ لاکھ لوگوں کے لگائے جانے کے امکانات ہیں لیکن فی الحال حاضر مزدوروں کی تعداد ۶٫۶۵ لاکھ ہی ہے۔

پینے کے پانی کی قلت دور کرنے کے کیا طریقے اختیار کیے گئے ہیں؟

ریاست میں جغرافیائی حالات اور بارش کا طور کچھ ایسا ہے کہ بہتیرے گاؤں میں پینے کے پانی کی قلت رہا کرتی ہے چونکہ سنہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں بارش بہت تھوڑی ہوئی اس لیے بعض قریوں میں پینے کے پانی کی قلت ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء ہی سے محسوس ہونے لگی تھی۔ اس وقت پینے کے پانی کی قلت سے ۹۲۸۱۱ دیہات اور ۹۴ شہری علاقے دوچار ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ آئندہ مہینوں میں بارش کے شروع ہونے تک پینے کے پانی کی کمی میں اضافہ ہو۔ اس لیے پینے کے پانی کی قلت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک "ماسٹر پلان" (کنٹیجنسی پلان) تیار کیا گیا ہے جس کے ذریعے اس دشواری سے نمٹا جا رہا ہے یعنی بورنگ کنووں کی تعمیر جو دستی پمپوں اور بجلی کے پمپوں سے چلائے جاتے ہیں مستقل اور عارضی دونوں طرح کے ہیں "رنڈ کیوں" کی تعمیر، موجودہ کنووں کو گہرا کرنے کا کام، پرائیوٹ کنووں کو سرکاری اختیار میں لے لینا جہاں اوپر مذکورہ طریقے کام نہیں دیتے ہیں وہاں پینے کا پانی ٹینکروں، بیل گاڑیوں کے ذریعے پہونچایا جا رہا ہے۔ فی الحال آخر الذکر طریقے پر ۳۱۰۵۲ قریوں میں پینے کا پانی ٹینکروں، بیل گاڑیوں کے ذریعے مہیا کیا جا رہا ہے۔ پہلے کم از کم ۲۵۰ اشخاص کی آبادی والے ہر گاؤں کے لیے اصولاً ایک بورنگ کنواں ہوا کرتا تھا۔ اب اس اصول کو اور بھی نرم کر دیا گیا ہے اور جہاں ۱۰۰ اشخاص کی آبادی ہو وہاں بھی

یک بورنگ کنواں بنایا جا سکتا ہے۔

متاثر لوگوں کو پینے کا پانی مہیا کرنے پر حالیہ مالی سال ں ۱۲۰ کروڑ روپیہ کے خرچ ہونے کے امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۰۸ شہری علاقوں میں پینے کا پانی مہیا کرنے کی اسکیمیں روع ہیں جن پر ۱۲/۵ کروڑ روپیہ خرچ ہونے کے امکانات ہیں۔

قحط باراں سے متاثر علاقوں میں جانوروں کی دیکھ بھال کی کیا کیفیت ہے؟

بارانی قحط سے متاثر ہونے والے مویشیوں کی تعداد ۱۰۳/۱۰ لاکھ ہے ان کے مسئلوں کو حل کرنے کے لئے ئی طریقے زیر عمل ہیں۔ یعنی گھاس حاصل کرنے کا مقامی ریعہ اور ریاست کے باہر سے انتظام کیا گیا ہے۔ گھاس اگانے ے لئے بلا اجرت پانی دیا جا رہا ہے۔ مویشیوں کے لئے دوسرے ارے حاصل کئے جا رہے ہیں اور مویشیوں کے کیمپ بھی کھولے گئے ہیں۔

مویشیوں کے لئے گھاس کا انتظام مہاراشٹر اسٹیٹ فارمنگ کارپوریشن، زراعتی یونیورسٹیوں اور تعلقہ بیج فارموں کے ذریعہ یا گیا ہے۔ ایک ایکڑ پر جانوروں کے لئے گھاس اگانے کے لئے آب پاشی کا پانی مفت ایسے کسانوں کو دیا جا رہا ہے جہاں پانی دستیاب ہے۔ ٹرائبل ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور محکمہ جنگلات جس گھاس کی خریداری کرتے ہیں وہ مویشیوں کے لئے کام میں لیا جاتا ہے جو کہ انسانی غذا کے قابل نہیں ہوتا لیکن جانوروں کی خوراک کے قابل ہوتا ہے اسے جانوروں کے چارہ کے بطور استعمال میں لیا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس طرح ان تمام وسائل کے ذریعے تقریباً ۹۰۰۰۰ میٹرک ٹن چارہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں گنے کی کھڑی فصل پانی نہ ملنے کے سبب سوکھ رہی ہے ان گنے کو جانوروں کے چارہ کے طور پر دئے جانے کے احکامات صادر کئے جا چکے ہیں۔

ضرورت مند کاشتکاروں اور غیر کاشتکاروں کو تقاوی قرض ۴۰۰ روپیہ کی شرح تک فی جانور کے حساب سے اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰۰ روپیہ فی کاشتکار کے حساب سے دیا جا رہا ہے۔ حاشیوں پر دامع "مارجنیل" اور چھوٹے مالکان زمین کے بارے میں اس تقاوی قرض کا (۵۰) فیصد بطور سبسڈی (مدد) شمار ہوگا اس طرح سے یہ سبسڈی پہلی مرتبہ دی جا رہی ہے۔

متاثرہ علاقوں کے جانوروں کے بچاؤ کے لئے دوسرے کون سے طریقے اختیار کئے گئے ہیں؟

جب کبھی اور جہاں ضرورت ہوتی ہے کلکٹروں کے ذریعے مویشی کیمپ کھولے جاتے ہیں۔ رضاکار تنظیمیں اور کوآپریٹو شکر کارخانے اور مویشی کیمپ کھولنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ جو مویشی کیمپ شکر کے کارخانے یا دوسری رضاکار ایجنسیاں کھولتی ہیں۔ ان کو حکومت ہر مہینہ فی جانور ۱۰۰/- روپے کا گھاس دیتی ہے۔ اب تک پرائیوٹ اور کلکٹری دونوں ملا کر ۱۲ مویشی کیمپ کھولے جا چکے ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متاثر چوپایوں کی حفاظت کے لئے مناسب اور کافی بندوبست کیا جا رہا ہے۔

آپ نے بتلائی گئی تفصیلات کے مطابق سارے اقدامات کا تعلق تندرست جسم والوں سے ہے جو کمزور، غیر تندرست یا معذور ہیں۔ ان قحط باراں سے متاثر لوگوں کے بارے میں کیا اقدامات کئے گئے ہیں؟

اس پہلو پر بھی بخوبی توجہ دی جا رہی ہے ان کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان میں بوڑھوں اندھوں اور معذوروں میں ماہ جون ۱۹۸۶ء تک نقد رقوں کی تقسیم، بیماران کا علاج، معالجہ صحت کی دیکھ بھال، جراثیم سے پاک پانی کی فراہمی۔ ٹیکہ لگانے کے پروگرام اور انجکشن توڑیا غیر اسہالی اور دوسری دواؤں، اور چیزوں کا مہیا کیا جانا شامل ہیں۔

راحتی پروگرام کے مالی مضمرات کیا ہیں اور مرکز سے کتنی امداد طلب کی گئی ہے؟

قلتِ آب کی وجہ سے پانی کی
بہم رسانی کے لئے یہ طریقہ بھی ضروری
ہوگیا ہے۔ اورنگ آباد ضلع میں پیٹھن
تعلقہ کے چھنگت پورا گاؤں کا ایک منظ

* * * * * * * * * * * * *

جیساکہ تفصیل کے ساتھ اوپر مذکور ہے وہ عظیم الشان راحتی پروگرام جس پر ستمبر ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتے سے حکومت عمل درآمد کر رہی ہے تاکہ قحط زدگی کا مقابلہ مؤثر طور پر کیا جا سکے اس میں یہ چیزیں شامل ہیں۔

کھڑی فصل کو بچانا، فصل ربیع میں بوائی کے ساتھ فرٹلائزرز اور بیجوں کا مہیا کرنا تقریباً ۱۲،۰۰۰ گاؤں اور ۱۰۸ شہری مرکزوں کو پینے کا پانی فراہم کرنا۔ متاثر لوگوں کے لیے راحتی روزگار کا انتظام کرنا، متاثر مویشیوں کو گھاس چارہ بہم پہونچانا اور ان کے لیے مویشی کیمپ قائم کرنا، سماج کے کمزور اور معذور طبقوں کی دیکھ بھال کرنا وغیرہ۔ اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے بہت بڑی رقم درکار ہے۔ ریاستی حکومت اکیلے اس بے پناہ خرچ کو پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ پھر اس بے مثال خرچ میں پہلے کے لگاتار دو سال کی قحط زدہ حالت کو بھی جوڑئے جس نے ریاستی حکومت کے مالی وسائل پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالا۔ اب خشک سالی کا اور مالی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے ہے۔

اسو راحتو کام میں رضاکار ایجنیاں
کیا رول ادا کرسکتو ہیں؟ کیا انو سے
توری راج

مدد طلب کو جا رہے ہیں؟

رہنما کار ایجنسیاں تین طرح سے مدد کرسکتی ہیں۔

۱:- راحتی پروگرام پر عمل درآمد کرنے میں مدد دے کر
۲:- اشیا سے مدد دے کر
۳:- نقداً مدد دے کر۔

قحط زدہ گاؤں کی فہرست مختلف ضلع کلکٹروں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ رضاکار ایجنسیاں پینے کے پانی کی فراہمی، گھاس کی فراہمی اور راحتی ملازمت جیسے کاموں کا بندوبست کر کے مدد دے سکتے ہیں۔ متاثرہ آبادی کو ٹیکے لگانا یا ٹیکے مہیا کرنا ورکروں کے ذریعے جو راحتی کیمپوں میں کام کر رہے ہیں ضروری ہے اور رضاکار ایجنسیاں یہ کام اپنے ذمے لے سکتی ہیں۔ نیز گروٹامنی ٹیبلٹس فراہم کر کے بھی مدد دے سکتے ہیں۔ رضاکار ایجنسیاں جنگل کاری کا کام ہاتھ میں لے سکتی ہیں کیونکہ ماحول کا اجڑا ہوا بھی لگاتار قحط کا ایک سبب ہوا کرتا ہے وہ مویشیوں کے کیمپ بھی کھول سکتی ہیں۔

اشیا کی شکل میں مددیوں دی جاسکتی ہے۔ ایسے سامان بطور عطیہ دینا جیسے رگس، کمپریسر، رسی وتالاز ...

ٹنکیس، پلاسٹک، ٹینک پائپس، وغیرہ جن کی ضرورت فراہم کئے گئے پانی کو نکالنے کے لئے ہوا کرتی ہے۔ مویشیوں کا چارہ، دوائیں، وٹامن، ٹیبلٹس وغیرہ۔ نقد کی شکل میں مدد سماج کے تمام طبقے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دے سکتے ہیں۔ ملازمت پیشہ اپنی تنخواہوں اور آمدنیوں کا ایک حصہ دے سکتے ہیں۔ ہمدرد اور مخیر حضرات اچھی خاصی رقم عطا کر سکتے ہیں۔

آخری سوال یہ ہے کہ ریاستوں کے بعض حصے اکثر قحط باراں سے دوچار ہوا کرتے ہیں۔ اس طور پر قحط باراں سے متاثر ہونے والے علاقوں کے لئے کیا کوئی مستقل حل سوچا گیا ہے؟

ریاست کے بعض حصوں میں بارش کی لگاتار کمی اور بارانی قحط کی حالت بار بار پیش آتی رہتی ہے۔ ایسے علاقے ریاست کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہیں۔ چنانچہ ایسے حصوں کو قحط سے متاثر علاقوں کا نام دیا گیا ہے۔ ایسے قحط باراں والے علاقوں کا ۱۱ فیصد جنگلات پر مشتمل ہے اور جنگلات سے متعلق جو قومی پالیسی متعین ہے اس کے لحاظ سے یہ رقبہ بہت کم ہے۔ اس جنگلاتی علاقے نے جو عموماً کم ہوتا یا گھٹتا رہتا ہے معیشت حیوانات کے نازک توازن کو الٹ پلٹ کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں زمینی کٹاؤ، سیلاب، زیر زمین آبی ذخیروں کی تباہی اور پینے کے پانی کی شدید کمی پیش آتی ہے اس کے برعکس وہاں ضرورت ہے ایسے درختوں کی جن کے پتے جانوروں کی خوراک ہیں۔ گھاس کی، چھوٹے عمارتی درختوں کی اور پھلوں، بیجوں کی جن کی مانگ آبادی میں اضافہ کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

اس لئے تجویز یہ ہے کہ ایسے اکثر قحط باراں سے متاثر علاقوں کے بارے میں بڑے پیمانے پر جنگل بانی کا پروگرام بنایا جائے مرکزی حکومت نے بھی اپنے نظر ثانی کردہ قاعدوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مدد کا کم سے کم ۲۵ فیصد حصہ ملازمت پیدا کرنے والے ایسے معاملات کے لئے ہو جو سماجی، جنگلاتی پروگراموں کے لئے وقف ہوں کیونکہ آگے چل کر ان سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ حصے خود قحط روک بن جائیں گے۔ اس پروجکٹ کے تحت ۴ لاکھ ہیکٹر کا رقبہ ۱۰ برس کی مدت میں جنگل میں تبدیل ہو جائے گا اور اس پر ۲۸۶۴.۲۵ کروڑ روپئے کی لاگت آئے گی۔

اس کے علاوہ ایک کمیٹی ڈاکٹر سبرامنین کی چیرمینی میں مقرر کی گئی ہے یہ کمیٹی نئے سرے سے ریاست کے ان علاقوں کی نشاندہی کرے گی جو خشک سالی سے متاثر رہا کرتے ہیں انکی راحت رسانی پر ہونیوالے خرچ کا تخمینہ لگائے گی خشک سالی سے متاثر علاقوں کے لئے جن پروگراموں پر اب تک عمل کیا گیا ہے انکا جائزہ لے گی اور ان علاقوں کے مسئلوں کو حل کرنے کے لئے طویل مدتی طریقے پیش کرے گی۔
یہ کمیٹی اپنی عارضی رپورٹ نومبر ۱۹۸۴ء میں پیش کر چکی ہے توقع ہے کہ اس کی آخری رپورٹ جلد پیش ہوگی۔

(ترجمہ: [illegible])

وزیر برائے محصول شری ولاس راؤ دیشمکھ سے ایک انٹرویو
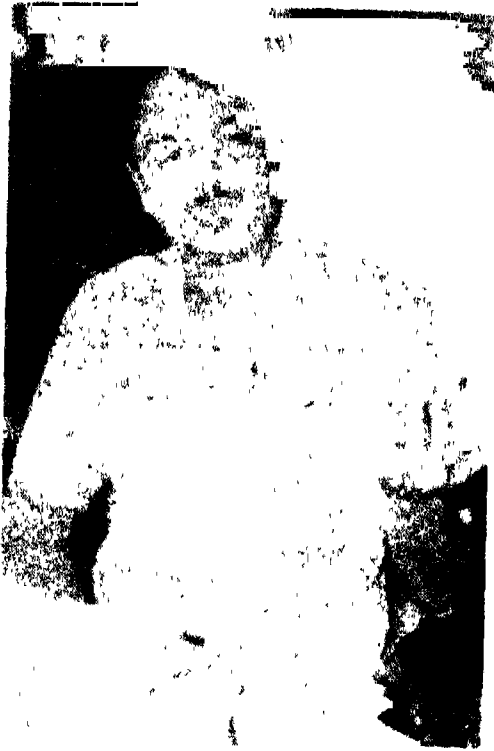
زبردست راحتی اقدامات سے خشک سالی پر قابو پالیا جائے گا

مزید مرکزی امداد متوقع

ریاست مہاراشٹر میں ۲۷ اضلاع کے تقریباً ۱۳۳۱۰ دیہی علاقے خشک سالی کا شکار ہیں۔ ان علاقوں میں صورتحال کس قدر تشویشناک ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے وزیراعظم شری راجیو گاندھی سے درخواست کی تھی کہ وہ بذاتِ خود مہاراشٹر کے ان علاقوں کا دورہ کریں اور بہ چشمِ خود صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ وزیراعظم کے دورہ کے بعد ممکن ہے کہ اس صورتِ حال سے پیدا شدہ مسائل سے نمٹنے کے لئے مطلوبہ ۲۹۵ کروڑ روپیہ کی مرکزی امداد کے علاوہ مزید امداد حاصل ہوجائے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار وزیر محصول شری ولاس راؤ دیشمکھ نے خشک سالی اور راحتی پروگرام سے متعلق لوک راج (قومی راج) کے ایک خصوصی شمارہ کے لئے انٹرویو کے دوران کیا۔

ایک گھنٹہ طویل بات چیت کے دوران نوجوان وزیر نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ واضح کیا کہ خشک سالی سے متعلق راحتی اقدامات پر عمل درآمد کے لئے کسی بھی قسم کی مالی دشواری کا سامنا نہیں ہے اور اگر ایسا ہوا بھی تو ریاستی منصوبہ میں شامل دیگر اسکیمات کے عملدرآمد کو روک دیا جائے گا اور ان کاموں پر خرچ کی جانے والی رقم راحتی کاموں کے لئے استعمال کی جائے گی۔

آپ نے مزید یقین دلایا کہ ریاست کے ۱۴ اضلاع کے ۸۹ تعلقہ جات میں جنہیں سوکھے سے متاثرہ علاقے قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وی۔ سبرامینم کی رپورٹ کے فوراً بعد چند مؤثر اقدامات کے ذریعہ صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی۔

س:۔ خشک سالی سے کتنے اضلاع متاثر ہوئے ہیں؟

ج:۔ مہاراشٹر کے ۳۰ اضلاع میں سے ۲۷ اضلاع خشک سالی سے متاثر ہوئے ہیں۔ تقریباً ۳۹۳۵۴ دیہی علاقوں میں سے ۲۳۴۱۰ دیہی علاقوں میں خشک سالی کی صورتحال موجود ہے۔ خشک سالی کی صورتحال کا اندازہ پیسہ واری فصل کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اگر عام علاقوں میں پیسہ واری ۵۰ ہو تو یہ علاقہ سوکھے سے متاثر سمجھا جاتا ہے۔ ریاست کے تقریباً ۸۹ ایسے علاقے جہاں سوکھے جیسے حالات پائے جاتے ہیں، وہاں مزید رعایت دیتے ہوئے پیسہ واری ۶۰ بھی ہو تو، ان علاقوں کو خشک سالی سے متاثرہ علاقے قرار دیا گیا ہے۔

س:۔ کتنے اضلاع میں صورتحال تشویشناک ہے؟

ج:۔ تقریباً ۲۷ اضلاع خشک سالی سے متاثر ہیں جہاں صورتحال کافی تشویشناک ہے احمدنگر، ناشک، عثمان آباد، لاتور اور سولاپور کے علاقوں میں خشک سالی کے سنگین حالات پائے جاتے ہیں۔

س:۔ کتنے اضلاع یا تعلقوں میں بار بار سوکھا پڑتا ہے؟

ج:۔ مہاراشٹر کے تقریباً ۱۴ اضلاع اور ۸۹ تعلقوں کو خشک سالی کے آثار رکھنے والے علاقے قرار دیئے گئے ہیں۔ ان علاقوں میں سوکھے سے

وزیراعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان، ...ور ضلع کے نیلنگا تعلقہ میں لودرتیرنا پروجیکٹ ...ں ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ...ام کرنے والے مزدوروں سے بات چیت ...رتے ہوئے۔ شری ویلاس راؤ دیشمکھ، زیر برائے مالیات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

متعلق خصوصی اقدامات سے ذریعہ زرعی پیداوار، آبپاشی وسائل وغیرہ میں اضافہ سے زمین مزدوروں اور کاریگروں کو روزگار کی فراہمی، کھاد اور کھیتی میں بہتری لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں اس حصول مقصد کے لئے ۴۰ تعلقہ جات مرکزی امداد کے تحت اور ۱۵ ریاستی امداد کے تحت لائے گئے ہیں۔

حکومت نے ڈاکٹر دی. سبرامنین، وزیر برائے ہاؤسنگ کی زیر صدارت ایک خصوصی کمیٹی بھی قائم کی ہے۔ کمیٹی کی عبوری رپورٹ ماہ نومبر ۱۹۸۴ء میں پیش کردی گئی تھی، اور فی الوقت قطعی رپورٹ جاری سال کے مارچ مہینہ کے آخر تک پیش کردی جائے گی۔ اس رپورٹ کے پیش ہوجانے کے بعد خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں سوکھے کی روک تھام سے متعلق حکومت نے چند اہم اقدامات تجویز کئے ہیں۔

س :- خشک سالی کی وجوہات کیا ہیں ؟

ج :- خشک سالی کی عموماً چار وجوہات ہیں۔ اوّل ہے بارش کی مقدار جو کہ ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کہیں بارش کم ہوتی ہے۔ کئی علاقوں میں بارش ہوتی ضرور ہے لیکن بے موسم۔ دوسری بڑی وجہ بڑے پیمانے پر اندھا دھند درختوں کی کٹائی ہے۔ غیر معمولی بارش بھی بڑے پیمانے پر درختوں کی کٹائی کا نتیجہ ہے۔ تیسری وجہ سطح آب میں بتدریج کمی ہے۔ زیر زمین پانی کے ذخیروں کی بڑے پیمانے پر اونچائی پر منتقلی سے پانی کی قلت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چوتھی اور آخری سب سے بڑی وجہ سطح زمین کی زرعی قابلیت میں خرابی پیدا ہونا ہے۔ ان تمام حالات کی وجہ سے مسلسل خشک سالی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔

س :- ایسے کتنے دیہی علاقے ہیں جہاں پینے کے پانی کی قلت پائی جاتی ہے ؟

شری ولاس راؤ دیشمکھ، انٹرویو کے دوران کسی خاص نکتہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے۔

ج :- گذشتہ سال قلیل بارش کی بنا پر ایک جائزہ کے مطابق مارچ ۱۹۸۵ء کے اخیر تک ۹۱۴۳ر۱۳ دیہی علاقے پینے کے پانی کی قلت سے متاثر ہوئے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ آئندہ دو ماہ میں ۱۴۴۳۰ مزید دیہی علاقے اس بحران سے متاثر ہوں گے۔ حالانکہ چند دیہی علاقوں میں اطمینان بخش فصل کی کاشت ہوئی ہے۔ پھر بھی جاری سال میں تقریباً ۲۷۹۲۱ دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی قلت کا سامنا رہے گا۔

س :- اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے حکومت نے کیا اقدامات تجویز کئے ہیں ؟

وزیر محصول، شری دلاس راؤ دیشمکھ، تلہار تحصیل کے بالکمیڈ علاقہ میں اکولہ ڈسٹرکٹ سینٹرل کوآپریٹیو بنک کی امداد سے جاری ٹیوب ویل کے تعمیری کام کا معائنہ فرمارہے ہیں۔

ج :- راحتی کاموں میں پینے کے پانی کی فراہمی کو اوّلیت دی گئی ہے۔ ہر متاثرہ ضلع میں ایک ماسٹر پلان مرتب کیا گیا ہے اور مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل درآمد کیا جارہا ہے۔

(۱) پینے کے پانی کی فراہمی کی موجودہ اسکیم پر مستحکم طور پر اور تیز رفتاری سے عمل درآمد۔

(۲) دستی پمپ والے کنوؤں کی تعمیر

(۳) موجودہ بڑے بور کنوؤں پر بجلی کے خودکار پمپ کی تنصیب۔

(۴) عارضی فراہمیٔ آب اسکیم

(۵) موجودہ کنوؤں کو مزید گہرا کرنا۔

(۶) پڈکی کی تعمیر

(۷) نجی کنوؤں پر قبضہ کو تحویل میں لینا

(۸) ٹینکر اور بیل گاڑیوں کے ذریعہ پینے کے پانی کی فراہمی

حکومت نے ۳۵۰ کھدائی مشینیں حاصل کی ہیں۔ ہر متاثرہ ضلع میں کم ازکم ۱۰ یا ۱۲ بور کنوئیں تعمیر کئے جائیں گے۔ یہ مشینیں حکومت ہند سے حاصل کی گئی ہیں۔ جن سے ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ فٹ گہرائی تک کھدائی ہوسکتی ہے۔ زیرزمین ذخیرۂ آب کی کھوج کے لئے سیٹلائیٹ کا استعمال بھی زیرغور ہے۔ آبی زمین سروے اور ترقیاتی ایجنسی کے ذریعہ متاثرہ کسانوں کو فیضیاب کرنے کے لئے کھیتوں میں آب پاشی کی سہولت مہیا کرنے کی غرض سے کنوؤں کی تعمیر زیرغور ہے۔ اس حصول مقصد کے لئے ۱۵ کروڑ روپیہ کی خطیر رقم درکار ہوگی۔

تعلقہ اور ضلعی سطح کی کمیٹیوں نے بھی متاثرہ علاقوں میں پینے کے پانی کے مسئلہ کا جائزہ اپنے طور پر لینا شروع کردیا ہے۔ ڈیویژنل کمشنران کو عارضی فراہمیٔ آب اسکیمات پر عملدرآمد کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ مزید برآں حکومت نے مستقل فراہمی آب کے انتظام کے لئے درکار سرمایہ مہیا کرنے کا یقین بھی دلایا ہے۔ ان اسکیمات پر اخراجات کا تخمینہ ۳۰ کروڑ روپیہ ہے۔ کئی ایسے علاقے بھی ہیں جہاں مستقل فراہمیٔ آب کی سہولت موجود ہے۔ اس کے باوجود یہاں پینے کے پانی کی قلت پائی جاتی ہے۔ ایسے علاقوں میں ٹینکر کے ذریعہ پینے کا پانی فراہم کیا جاتا ہے۔

س :- متاثرہ عوام کو راحتی کام کے تحت روزگار کے کیا مواقع حاصل ہیں؟

وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان ضلع عثمان آباد میں لوہارا (خورد) کے مقام پر ضمانت روزگار اسکیم کے تحت خواتین مزدوروں سے ان کی تکالیف کے بارے میں جانکاری حاصل کر رہے ہیں۔ مرکزی وزیر شری شیواجی راؤ پاٹل اور مہاراشٹر کے وزیر محصول شری ولاس راؤ دیشمکھ بھی آپ کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

ج :- متاثرہ اضلاع میں عوام کو روزگار کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے ریاست کی پر وقار ضمانت روزگار اسکیم پر عملدرآمد تیزی سے جاری ہے۔ متاثرہ افراد کو ان کے رہائشی جگہوں سے ۵ تا ۸ کلو میٹر کے علاقوں میں ہی روزگار دیا جاتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہے ایسے تعمیری کام جن کی بدولت عوام کا ایک بڑا طبقہ فیضیاب ہو سکتا ہے اور مستقبل میں قلت دور ہو سکتی ہے بلا تاخیر عمل میں لائے جاتے ہیں۔ ایسے کاموں میں تقطیر آب تالابوں کو تعمیر کرنا، زمین کو ہموار کرنا، قابل کاشت زمین کی دیکھ بھال کرنا، چھوٹے پیمانے کے آبپاشی کے کام انجام دینا شامل ہیں۔ بعض حالات میں غیر تعمیری کام مثلاً سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کی بھی اجازت دی جاتی ہے۔ آج ضمانت روزگار اسکیم کے تحت روزانہ تقریباً ، لاکھ افراد برسر روزگار ہیں۔

س :- ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ملازمین کو کتنی اُجرت دی جاتی ہے؟

ج :- ضمانت روزگار اسکیم کے تحت مزدوروں کو اُجرت کام کی نوعیت کی بنیاد پر دی جاتی ہے جو معینہ زون میں مقررہ شرح اجرت کے مطابق ہوتی ہے۔ ایسے مزدوروں کو یومیہ ۵ تا ۱۵ روپیہ تک اُجرت دی جاتی ہے۔ کسی بھی مزدور کو یومیہ ۵ روپیہ سے کم اُجرت نہیں دی جاتی ہے۔

س :- ریاستی حکومت نے مرکز سے کتنی مالی سہولت طلب کی ہے؟

ج :- ریاست حکومت نے پینے کے پانی کی قلت دور کرنے کے لئے مرکز سے مالی امداد حاصل کرنے کی درخواست کی ہے۔ بہت جلد مرکز کو تیسری یاد داشت بھیجی جائے گی۔ مرکزی نمائندوں نے ابھی حال ہی میں مہاراشٹر کا دورہ مکمل کرنے کے بعد متاثرہ علاقوں میں قلت آب اور دیگر مسائل کا اندازہ لگایا۔ چنانچہ حکومت مہاراشٹر کو توقع ہے کہ اسے مرکز سے مزید امداد کی رقم حاصل ہو جائیگی۔

س :- حکومت ہند نے اب تک کتنی امداد دی ہے؟

ج :- حکومت ہند نے اب تک ۳۶٫۲۷ کروڑ روپیہ بطور امداد عطا کئے ہیں۔ گو کہ یہ رقم ناکافی ہے، ریاستی حکومت کو یقین ہے کہ مسائل پر ہمدردانہ غور و خوض کے بعد مرکزی حکومت مزید امداد مہیا کرے گی۔ یہ امداد مرکز کے مقررہ اصول کے تحت دی جاتی ہے — مہاراشٹرا کے علاوہ دیگر کئی ریاستوں نے جو خشک سالی کی صورتِ حال میں گھرے ہوئے ہیں۔ مرکز سے امداد کی درخواست کی ہے۔ حکومت مہاراشٹر نے وزیر اعظم سے درخواست کی ہے وہ مہاراشٹر کا دورہ کریں اور بنفسِ نفیس خشک سالی کے حالات اور راحتی کاموں پر عملدرآمد کا جائزہ لیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ ماہ کسی بھی دن وزیر اعظم مہاراشٹر کے دورہ کے لئے تشریف لائیں گے۔ قوی امید کی جاتی ہے کہ ہمیں مرکز سے مزید امداد حاصل ہو سکے گی۔

س :- خشک سالی سے راحت کے لئے کھولے گئے وزیر اعلیٰ راحت فنڈ میں عوام کہاں تک ہاتھ بٹا رہے ہیں ؟

ج :- عوام کی جانب سے بھرپور تعاون مل رہا ہے۔ شکر امداد باہمی اداروں نے روپیہ فی ٹن کی بجائے دو روپیہ فی ٹن گنا صفائی دینا منظور کیا ہے۔ ریاست کی امداد باہمی بینکوں نے ۵۱٫ا کروڑ روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔ راحت فنڈ میں کتنی رقم جمع ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، پھر بھی توقع ہے کہ جلد ہی ۱۰ کروڑ روپیہ کا نشانہ پورا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ جنس کی شکل میں یعنی ٹینکریں، رسّی، پلاسٹک ڈبے وغیرہ کثیر تعداد میں بطور امداد مل رہے ہیں۔

س :- راحتی اقدامات پر ٹھیک طور سے عملدرآمد کا اندازہ کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ اور ان کے کابینی رفقاء آج کل متاثرہ علاقوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ ان دوروں سے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں ؟

ج :- وزیر اعلیٰ شری چوان نے اب تک ۱۵ متاثرہ اضلاع کا دورہ کیا ہے۔ اپنے دورہ کے دوران وزیر اعلیٰ خود ضمانت روزگار کاموں کا معائنہ کرتے ہیں۔ متعلقہ مزدوروں سے بات چیت کرتے ہیں، اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وزیر اعلیٰ ضمانت روزگار مزدوروں کا رجسٹر بھی دیکھتے ہیں۔ اس طرح متاثرہ افراد کو بھروسہ ہو جاتا ہے کہ حکومت عوام کی تکالیف دور کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہے۔ سرکاری افسران کو بھی اپنے فرائض بخوبی انجام دینے کے لئے تاکید کی جاتی ہے

اکثر اوقات دورہ کے دوران ہی وزیر اعلیٰ نے جگہ پر ہی فیصلے صادر فرمائے ہیں، اور متاثرہ عوام کو مستفید کیا ہے۔ بور کنوؤں کی تعمیر اب ایسے دیہی علاقوں میں بھی کی جا سکتی ہے جہاں آبادی صرف ۱۰۰ نفر پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل یہ ۲۵۰ نفر پر مشتمل آبادی کی حد بندی رکھی تھی۔ چھوٹے آب پاشی تالابوں کی تعمیر کا کام جنہیں انتظامی منظوری حاصل ہو چکی ہے۔ فوری طور پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ کام بجٹ میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ ایسے تالاب پونے، ناشک، عثمان آباد، احمد نگر اور لاتور وغیرہ میں تعمیر کئے جا چکے ہیں۔ پہاڑی اور دور افتادہ علاقوں میں غیر تعمیری کام ہونے کے باوجود ضمانت روزگار اسکیم کے تحت سڑکوں کی تعمیر کی جاتی ہے۔ ضمانت روزگار مزدوروں کو اناج کے کوپن دیے گئے تھے جن کی مدت ختم ہو چکی ہے ان کوپن کے تحت مزدوروں کو گیہوں اور جوار

تقسیم کیاجاتا تھا - اب وزیر اعلیٰ نے ان کوپن کی مدت بڑھاکر ۳۱ر مارچ ۱۹۸۳ء کر دی ہے۔ یہ کوپن اب مزدوروں کے لئے دوبارہ قانونی طور پر قابل استعمال ہوں گے۔

وزیر اعلیٰ کے برمحل فیصلوں اور یقین دہانیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان کے تین کابینی رفقاء، وزیر برائے مالیات شری سوشیل کمار شندے، وزیر برائے صحت شری بھائی ساونت اور میں خود بہ حیثیت وزیر برائے محصول دورے پر رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ برمحل فیصلوں، اور یقین دہانیوں کے باوجود متاثرہ علاقوں کے افراد ان فیصلوں پر عمل درآمد کی بابت غیر مطمئن ہیں چنانچہ مذکورہ بالا تینوں وزراء کے دورہ کا مقصد یہی ہے کہ قحط زدہ علاقوں میں سرکاری فیصلوں پر ٹھیک طرح عمل درآمد کا بہ نفس نفیس مطالعہ و جائزہ لیں۔ اب تک پونے اور سانگلی اضلاع کا دورہ مکمل ہوا ہے۔ ان دوروں کے نتیجہ میں عوام میں اعتماد بحال ہو سکے گا سرکاری فیصلوں اور احکامات پر فوری عمل کیا جارہا ہے۔

س:۔ بہ حیثیت وزیر محصول، موجودہ پھیلی خشک سالی کی صورتحال میں عوام کیلئے آپ کا کیا پیغام ہے؟

ج:۔ بے شک حالات سنگین ہیں۔ لیکن ہمیں ان حالات کا سامنا جرأت مندانہ طور پر کرنا ہے۔ حکومت اپنے تئیں مقدور بھر جدّوجہد کر رہی ہے تاکہ متاثرہ عوام کو روزگار، پینے کے پانی، اناج وغیرہ جیسی سہولیات دستیاب ہوں، ساتھ ہی جانوروں کے لئے چارہ اور ان کے پانی کا ٹھیک انتظام ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ راحتی اقدامات میں مالی دشواریاں حائل نہ ہوں گی۔ اگر ایسا کبھی ہوا تو حکومت ریاستی منصوبہ کو روک کر راحتی اقدامات کے تحت اسکیمات پر عملدرآمد کو اولیت دے گی اور ان راحتی اقدامات کے لئے رقم مہیا کرے گی۔ متاثرہ عوام اپنے حوصلے بلند رکھیں، حکومت ان کے ان مشکل و پریشان کن حالات میں ان کے ساتھ ہے۔

تعلقوں اور اضلاع میں برموقع راحتی اقدامات پر عمل آوری کے لئے تشکیل کردہ تعلقہ اور ضلع سطحی کمیٹیوں میں نہ صرف برسر اقتدار پارٹی بلکہ حزب مخالف کے اراکین بھی شامل ہیں۔ خشک سالی کے پُرآشوب دور میں عوام کی تکالیف دُور کرنے کے لئے کسی بھی قسم کی امداد اور مؤثر تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اخبارات سے میری گذارش ہے کہ وہ راحتی اقدامات پر عملدرآمد میں اگر کوئی خامی پائیں تو بیشک تنقیدی نظریہ اپنائیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بہترین طور پر انجام دیئے گئے کاموں کی تعریف بھی کریں۔ خاص طور سے ان سرکاری ملازمین کی کوششوں کو سراہیں جو مسلسل راحتی اقدامات کے ذریعہ متاثرہ عوام کی پریشانیوں کو دُور کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو ان سرکاری عملہ کی حوصلہ افزائی ہوگی اور وہ اپنی کوششوں میں مزید تیزگامی لائیں گے

(ملاقاتی:۔ آر۔ جی۔ ماتیدیو

(ترجمہ:۔ زیب النساء اقبال

فوری توجہ کیلئے ہمیشہ "حوالہ نمبر" (جو آپ کے پتہ کے اوپری حصہ پر درج ہوتا ہے) ضرور تحریر فرمائیں۔ اپنا پتہ صاف لکھیں اور اُردو کے ساتھ ہندی، مراٹھی یا انگریزی میں بھی تحریر فرمادیں۔
(ادارہ)

خشک سالی آثار

رکھنے والے اضلاع/تعلقہ جات

مہاراشٹر کے ۱۴ اضلاع کے تقریبًا ۹۸ تعلقوں کو "خشک سالی" کے آثار رکھنے والے علاقے کہا جا سکتا ہے۔ جس میں مرکزی امداد کے تحت ۴۷ اور ریاستی امداد کے تحت ۱۵ تعلقے آتے ہیں۔

مرکزی امداد کے تحت

تعلقہ جات

اضلاع۔

احمد نگر

(۱) احمد نگر
(۲) آکولہ
(۳) جام کھیڑ
(۴) پارنیر
(۵) پاتھرڈی
(۶) سنگمنیر
(۷) شیوگاؤں
(۸) شری گونڈہ
(۹) کرجت
(۱۰) نیواسا
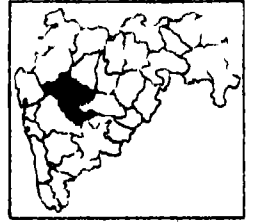
سولاپور

(۱۱) اقل کوٹ
(۱۲) بارشی
(۱۳) کرمالا
(۱۴) ماڈھا
(۱۵) منگل ویڈھا
(۱۶) موہول
(۱۷) سنگولا
(۱۸) سولاپور (شمالی)
(۱۹) سولاپور (جنوبی)
(۲۰) پنڈھرپور

ناشک

(۲۱) چاندوڑ
(۲۲) نادگاؤں
(۲۳) سنّار
(۲۴) ایولہ
(۲۵) مالیگاؤں
(۲۶) کلون
(۲۷) دن ڈوری
(۲۸) بگلن
(۲۹) ناشک
(۳۰) نپھاڑ

سانگلی

(۳۱) جت
(۳۲) اٹپاڑی
(۳۳) خانہ پور
(۳۴) میرج
(۳۵) سواتے مہاکل
(۳۶) تاس گاؤں
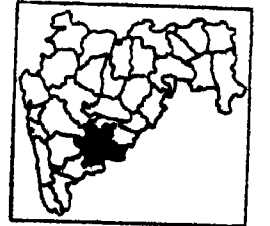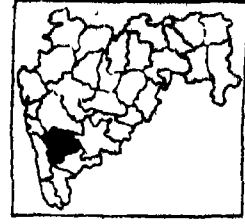
ستارا
(۳۷) کھنڈالا
(۳۸) کھٹاؤ
(۳۹) مان
(۴۰) کورے گاؤں
جلگاؤں
(۶۰) اول آباد
(۶۱) املنیر
(۶۲) چالیس گاؤں
(۶۳) پرولہ
(۶۴) پاچورہ
پونے
(۴۱) جنیر
(۴۲) امبے گاؤں
(۴۳) کھیڑ
(۴۴) شیرور
(۴۵) دونڈھ
(۴۶) بارہ متی
(۴۷) اندا پور
(۴۸) پُرندر
(۴۹) حویلی
جالنہ
(۶۵) امبڑ
بیڑ
(۶۶) گورائی
(۶۷) پٹودا
(۶۸) بیڑ
(۶۹) منجل گاؤں
(۷۰) کیج
(۷۱) اشتی
دھولے
(۵۰) ساکری
(۵۱) دُھولے
(۵۲) شندکھیڑے
(۵۳) نندوربار
عثمان آباد
(۷۲) بھوم
(۷۳) پرنڈا
(۷۴) کلمب
اورنگ آباد
(۵۴) گنگاپور
(۵۵) ویجاپور
(۵۶) کنڑ
(۵۷) پیٹھن
(۵۸) اورنگ آباد
(۵۹) خلد آباد
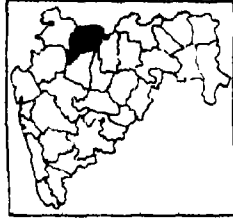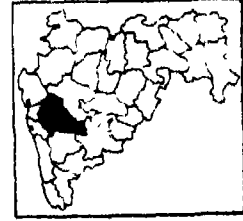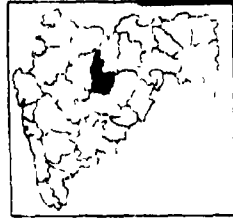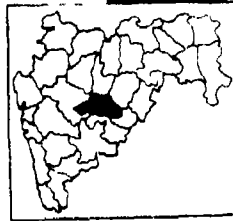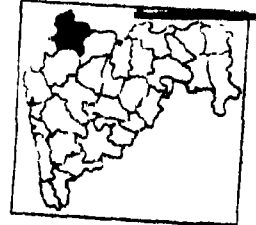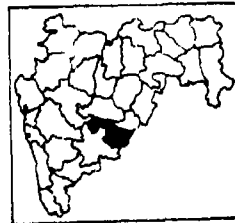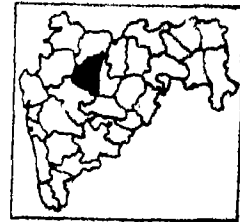
ریاستی امداد کے تحت تعلقہ جات

اضلاع	
احمد نگر	(۱) کوپر گاؤں (۲) راہوری (۳) شری رام پور
سولاپور	(۴) مال شیرس
ناشک	(۵) اگت پوری
ستارا	(۶) پھلٹن
جلگاؤں	(۷) بھڑگاؤں (۸) امڈول
بلڈانہ	(۹) موٹالہ (۱۰) نندورا (۱۱) شیگاؤں (۱۲) کھام گاؤں
عثمان آباد	(۱۳) تلجا پور (۱۴) عثمان آباد
لاتور	(۱۵) احمد پور

• بنود راؤ

خشک سالی کے باوجود ترقی

جس وقت مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے ایک سال قبل ریاست کی باگ ڈور دوبارہ سنبھالی تھی اس وقت ایسا لگا گویا انہوں نے انتظامیہ کی ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی ہو جیسی ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران وہ آدھے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ "غریبوں کی ریاست" جسے انہوں نے آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی سربراہی میں شروع فرمایا تھا، بڑی آسانی کے ساتھ وہ ان کے سابقہ گڑھ یعنی ۲۰ نکاتی پروگرام کی عمل آوری میں لگ گئے اور حسب سابق ان کی ہر دلعزیزی کے لئے مقدر بھر کوششیں شروع کردیں۔ ان کی سابقہ نیک نامی کے باعث جب دوبارہ عہدے پر ان کی تقرری ہوئی تو ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

ضمانت روزگار اسکیم کے تحت پونے ضلع کے شیرور تعلقہ میں پمپل خالصہ مقام پر پرکولیشن ٹینک بنائے جانے کا کام جاری ہے۔

ریاست میں پھیلی خشک سالی سے نمٹنے کے لیے شری ایس۔ بی۔ چوان، وزیر اعلیٰ مہاراشٹر نے رضا کار اداروں، صنعت کاروں اور مزدوروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ تصویر میں شری نہال احمد، حزب مخالف کے لیڈر، شری مرلی دیورا، صدر بی۔ پی۔ سی۔ سی (آئی) شری شرد پوار، شری شنکر راؤ جگتاپ، اسپیکر ریاستی اسمبلی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ تصویر میں شری سشیل کمار شندے، وزیر برائے مالیات، ڈاکٹر ڈی۔ سبرامنین، وزیر برائے مکانات، پروفیسر رام میگھے، وزیر برائے تعلیم و دیگر معزز حضرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس مرتبہ ایک بات یعنی خشک سالی ایسی ہے جس کے لئے ایک نہایت اصلاحیت منتظم کی درحقیقت شدید ضرورت تھی کیونکہ پچھلے ۳ سالوں سے خشک سالی نے ریاست کو جکڑ رکھا ہے صرف اناج ہی نہیں بلکہ پانی، غلے اور جانوروں کے چارہ کی کمی بھی سنگین مسئلے بنے ہوئے ہیں۔ ۱۰۰۰۰ گاؤں فی الحال خشک سالی کی گرفت میں ہیں اور بعد کے چند مہینوں میں ریاست کے ۳۰ اضلاع کے ۴۰۰۰۰ گاؤں میں سے ۲۶ اضلاع کے ۱۵۰۰۰ گاؤں خشک سالی کی لپیٹ میں آجائیں گے۔ ان علاقوں میں فصل خریف تو بری طرح متاثر ہوئی ہی تھی بے وقت کی برسات نے فصل ربیع سے مزید ۱۲ لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت سے محروم کر دیا۔

خشک سالی سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ سے بھی زیادہ افراد متاثر ہوئے ہیں ہزاروں گاؤں پینے کے پانی کی نادیدہ لیابی سے پریشان ہیں جو لازمۂ حیات ہے۔ لاکھوں زراعت پیشہ مزدور کاشتکار کام کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ علاوہ ازیں ۸۰ لاکھ سے زائد مویشیوں کے لئے گھاس اور چارے کی فراہمی بھی ایک اہم سوال بنا ہوا ہے۔

اس سہ رخی مسئلہ کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے حکومت نے سماج کے تمام طبقوں سے مدد مانگی ہے تاکہ جنگی پیمانے پر اس صورت حال کا مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ مسئلہ بہترین انسانی ہمدردی اور انتظامی صلاحیت کو دعوت دیتا ہے چنانچہ اس کا حل بھی ویسے ہی انسانی اور انتظامی پیمانے پر ہونا چاہیے۔

اس لئے شری شنکر راؤ چوان ایک طرف لوگوں کو روزگار دلانے پر توجہ دے رہے ہیں تو دوسری طرف پینے کے پانی اور چارے کی فراہمی میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں اور اس کے لئے عطیات جمع کرنے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ان عطیات کے مناسب اور بہترین استعمال کے لئے بھی جامع پروگرام وضع کیا ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف مالی امداد کی بلکہ بصورت جنس بھی عطیات کی اپیل کی ہے تاکہ متاثرہ علاقوں میں زیادہ سے زیادہ ٹینکر نہ صرف پانی کے نقل و حمل میں لگائے جا سکیں بلکہ پانی ذخیرہ کی حیثیت سے بھی جمع کیا جا سکے۔ اس کے لئے صنعت کاروں، مزدوروں، دفتروں میں کام کرنے والوں، عوامی اداروں، رضا کار اداروں، سماجی کارکنوں، اساتذہ اور دیگر افراد سے بھی پرزور اپیل کی گئی ہے کہ وہ حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے ہر ممکن تعاون پیش کریں۔

ایسے موقعوں پر پہلے بھی مہاراشٹر کے فراخ دل عوام نے ہمیشہ ساتھ دیا تھا اور اب بھی وزیر اعلیٰ کے "راحت فنڈ" میں عطیات دے کر وزیر اعلیٰ کے بازو مضبوط کر رہے ہیں۔

خشک سالی سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے وہ ایک سنگین مسئلہ ہے اس سلسلے میں شری شنکر راؤ چوان نے نہ صرف انتظامیہ میں بہتری لانے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ عام شہریوں کی زندگی میں بھی بہتری لانے کے خواہش مند ہیں اور اس کے لئے وہ ایک ایسا با اصول

اور مستحکم انتظامیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو جمہوری قدروں پر عامل ہو اور جو صرف سرکار کے لئے بطور آقا کے ہو بلکہ پورے ملک کے روپ میں بطور ملازمین کے فائدہ مند ہو۔

وزیر اعلیٰ نے اپنے مشیروں کو صفر کی بنیاد پر بجٹ کی تیاری کی اصلاح دی تاکہ غیر ضروری اخراجات ساقط کئے جاسکیں اور ملازمین حکومت پر ان کی زد نہ پڑے اور جو بچت ہو اس سے بے روزگاری اور غریبی دور کرنے میں اور مکانات کی تعمیر نیز اسکولوں اور اسپتالوں وغیرہ کی تعمیر میں مدد ملے۔

کمزور طبقات پر وزیر اعلیٰ خاص توجہ دیتے ہیں جس کی دو مثالیں نیچے درج ہیں۔ اگرچہ حکومت کے معاملات میں اس نوع کے دوسرے کئی امور ایسے ہیں جو مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔

پہلی مثال ایسی ہے جس میں انھوں نے عام زراعت کے لئے پانی اسی طرح کاشتکاروں کے لئے بھی سال بھر مہیا کرنے کا حکم فرمایا جس طرح گنے کی کاشت کرنے والے دولت مندوں کے لئے ہوا کرتا ہے (کاشتکاروں کو پہلے صرف آٹھ مہینے پانی مہیا کیا جاتا تھا) اس طرح انھوں نے کاشتکاروں کو سہولت دے کر سماجی انصاف قائم کیا ہے اور ضرورت مند کاشتکاروں کو آب پاشی کے لئے پانی کی فراہمی کے ذریعہ نفع پہونچایا۔

دوسری مثال ایسی ہے جس میں ان کی کوششوں کی بدولت کپاس کے کاشتکاروں کو کپاس کی مناسب قیمت ملنے لگی۔ وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے حکم فرمایا کہ جس وقت حکومت کپاس کے کاشتکاروں سے کپاس خریدے تو اس کی پوری قیمت تین قسطوں میں نہیں بلکہ یکمشت ادا کی جائے۔ یہ طریقہ کپاس کے کاشتکاروں کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس حکم کے ساتھ انھوں نے حکومت کی طرف سے خریداری کو جاری رکھنے کا بھی حکم فرمایا۔ نہ صرف یہ بلکہ حال ہی میں یہ بات علم میں آئی کہ جب شری چوان نائب پرکیپ میں تھے اس وقت مرکزی حکومت سے انھوں نے گذارش کی تھی کہ مہاراشٹر سے برآمد کرنے کے لئے ۴ لاکھ کپاس کی گانٹھیں منظور کی جائیں اور اس ۴ لاکھ کے کوٹے میں سے دو لاکھ گانٹھوں کی برآمد فوری طور پر منظور کی جائے تاکہ مہاراشٹر اسٹیٹ کاٹن گروورس فیڈریشن کو بین الاقوامی مارکیٹ میں موجودہ بڑھے ہوئے نرخ کا فائدہ ملے اور گذشتہ برسوں میں جو ۳۵۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔

قومی راج

کوئی بھی ملک تبھی ترقی کر سکتا ہے جب وہاں امن دور دورہ ہو اور ایسے عناصر کو دبا جائے جو کہ ترقیاتی کاموں خود غرضی کی بنا پر پھیلنے پھولنے نہیں دیتے۔

شری چوان ایک ایسے شخص ہیں جن کے ارادے مستحکم ہیں جو ایک مذہبی آدمی ہیں جن کے نزدیک مذہب تخریبی کاروائی کے لئے نہیں جیسا کہ آج کل استعمال ہو رہا ہے [illegible] مذہب انسان کی بقا کے لئے اور اس کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہے۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت نے ایک کمیٹی کی ہے تاکہ ایک یونیورسٹی کے قائم کرنے کے لئے تجویزیں پیش [illegible] یونیورسٹی کو جو سنت گیانیشور کے نام پر قائم کی جائے مذہب کے تقابلی مطالعے لئے اور ان میں جو باتیں اچھی اور یکساں انھیں اپنایا جائے اور باہمی مقابلہ آرائی کی کدورتوں سے [illegible] کیا جائے۔ [illegible] پروجیکٹ کے سلسلے میں شری [illegible] ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں [illegible] چوان ایسا مستحکم اقدام کر رہے ہیں جو نہ صرف مہاراشٹر بلکہ پورے ہندوستان کے لئے ایک زبردست عطیہ ہوگا۔

تلخیص و ترجمہ:- فیروزہ فیاض

موہن لال وشنوی
سینیر تکنیکی معاون اردو
نیشنل بوٹینیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ

جانوروں کے چارے کی ایک نئی دریافت

بدروکائی اسپائی رولینا پلینٹینسس

Spirulina platensis

لاطینی زبان میں "اسپائی رولینا پلینٹینس" سے مراد دنیا کے ادنیٰ پودوں کی ایک خاص قسم سے ہے جسے ہم عام زبان میں کائی کہتے ہیں۔ اس میں واحد خلیے کا لحمیہ یعنی Single Cell - Protain ہونے کے علاوہ اس کے دوسرے کارآمد اجزا پائے جانے کے انکشافات نے نباتاتی ماہرین کی توجہ غیر معمولی طور پر اپنی طرف مبذول کی ہے۔ ایسے ادنیٰ پودوں کو جو پانی میں پیدا ہوتے ہیں عموماً انھیں Algae کہتے ہیں۔

Cultivation of Spirulina platensis, a protein-rich blue-green alga in sewage for animal feed at N.B.R.I. Lucknow.

آکسائڈ کو جذب کرتی ہے اور سورج کی روشنی۔ ہے شعاعی عمل کے ذریعے قوت حاصل کرتی ہے۔

خام حالت میں اس میں لحمیہ تقریباً ۶۰ سے ۷۰ فیصد ہوتا ہے اور دوسرے غذائیت کے اجزا بھی اعلیٰ پیمانے پر موجود پائے گئے ہیں اس میں امونیا آمیز تیزابی مادہ حیاتین ب - ۱۲ کیروٹین ٹریٹونین اور لائسین جیسے اجزا بھی بہت کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے "اسپائی رولینا" جیسی کائی نے موجودہ دور سائنس میں نباتی سائنسدانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اسے خوراک یا چارے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے جدید تحقیق و ترقیاتی تکنیک رائج کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نباتی وکیمیاوی تجزیات کی رو سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ دوسرے پودوں کی ایک بہت لمبی فہرست کے مقابلے میں اس کائی کے نتائج میں چونکہ قدرتی رنگ و ساخت کی وجہ سے ایک انفرادیت پائی جاتی ہے جیسے کہ اس میں ۴ فیصد تک کا "نیوکلک ایسڈ" یعنی خلیے کے مرکزی حصے تیزابیہ پایا گیا ہے جب کہ دوسرے پودوں میں چاہے وہ گیہوں ہو یا کچھ اور ۱۰ سے ۲۰ فیصد تک پایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ "اسپائی رولینا" پوری طور پر بے ضرر ثابت ہوا ہے۔

لعاب دار اجزا سے بنے اس واحد خلیہ نما کائی کے پودے کی دیواریں آسانی ہضم ہوتی ہیں جبکہ دوسری ہری کائی کی سیلین ضرر رساں ہوتی ہیں۔ اس طرح ظاہر ہے کہ "اسپائی رولینا" کو انسانوں اور جانوروں کے لیے بیک وقت اشیائے خوردنی کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور بنانے والے نے بھی شاید کوئی چیز بے مصرف نہیں بنائی ہے۔

یہ بات اور ہے کہ آگے چل کر شاید انسانوں کے لیے غذا کے طور پر استعمال کیے جانے والے یہ ادنیٰ پودے صاف پانی ہی میں تشکیل پائیں۔ آخر یہ دستاویزی ثبوت تو موجود ہے کہ زمانۂ قدیم سے "چاڈ" جھیل کے مقامی لوگ کچھ مخصوص ادنیٰ پودوں کا استعمال غذا کے طور پر کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ ایسی تحریریں بھی موجود ہیں کہ یہ مخصوص کائی جانوروں، مرغیوں اور مچھلیوں کی مکمل غذا ہے۔ اس میں لحمیہ کی ستر فیصدی مقدار کے علاوہ حیاتین سے پُر چکنائی کا تیزابی مادہ بھی موجود ہے۔

اسپائی لینا کے ریشے کافی لمبے ہوتے ہیں اور اس کی فصلی کاشت آسانی "کیٹرچین" کے عمل سے حاصل کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اسے اکٹھا کرنے کے لیے نہ صرف نہایت آسان ہے بلکہ اس میں محنت، طاقت اور خرچہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں ادنا پودوں پر کافی کام ہو رہا ہے اور وہاں کے مقامی وسائل کے مطابق کیے جا رہے تجربات کے زیر اثر کافی بڑے پیمانے پر اس کائی کی فصلی کاشت حاصل کرنے کے جدید طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ کچھ ایک اقسام جنھیں خوردنی کی اقسام کی کائی کہتے ہیں کی کاشت مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ یہ سب باعث طوالت اور کافی مہنگا کام ہے۔ اسپائی رولینا میں اجزائے غذائیت پائے جانے اور مقوی ہونے کی وجہ سے اور سب سے بڑھ کر اس کی کم خرچ کاشت کے طریقوں کے زیر اثر کئی ملکوں نے اس کی کثیر کاشت حاصل کرنے کا کام شروع کیا ہے اور کئی طرح کے دیسی کارخانے اور منصوبے بنائے ہیں۔ فرانس، الجیریا، میکسیکو تائیوان، تھائی لینڈ اور ہندوستان میں بھی کئی طرح کے منصوبے اور دیسی طرز کے کارخانے لگائے گئے ہیں تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ کاشت حاصل ہو سکے۔

Dried Spirulina biomass

Preparing the
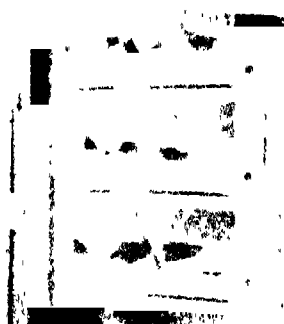
Feed

این بی آر آئی میں
”اسپائی رولینا“ کی کاشت

صاف صاف پانی میں اسپائی رولینا کی مصنوعی طریقے پر
مخصر کاشت کافی مہنگی ہوگی کیونکہ اس صورت میں کئی طرح کے
محلول اور کافی معدنی اشیاء کی ضرورت پوری کرنا پڑے گی
اور کم خرچ بالانشینی کا نقطۂ نظر سامنے رکھتے ہوئے، نیشنل
بوٹینیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں الجی تجربہ گاہ کے ڈاکٹر

پی۔ این سکسینہ، ڈاکٹر ایم۔ آر احمد، ڈاکٹر ڈی۔ وی آملہ اور ڈاکٹر
رادھے شیام نباتی سائنسدانوں پر مشتمل ایک ٹیم نے کافی
تحقیق و تفتیش کے بعد سکندر باغ کے اندر لگائے گئے کارخانے
میں اس پودے کی اطمینان بخش کاشت حاصل کی ہے۔ ان
سائنسدانوں نے تجربہ گاہوں اور میدانی تحقیقی مرکز کے باہمی
تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صاف پانی کے مقابلے میں گندے
نالوں اور بدررو پانی سے اس پودے کی کاشت نہ صرف آسان
ہے بلکہ بہت ہی کم خرچے سے کی جاسکتی ہے۔ صاف پانی میں
کلورین وغیرہ کی آمیزش کئے جانے کی وجہ سے اس میں قدرتی
طور پر موجود نائٹروجن اور دیگر اجزاء نہیں ہوں گے۔ اس
کے مقابلے میں بدررو پانی سے اس کی عمدہ کاشت اور فصل حاصل
کرکے دوبارہ اسی پانی میں اس کائی کی سلسلہ وار کاشت کی جاسکتی
ہے۔ اس پانی کو مچھلیاں پالنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے
اور سب سے بڑھ کر یہی پانی کھیتوں میں سینچائی کے لئے بھی
مفید ثابت ہوا ہے۔

گویا ابتدا سے اخیر تک اسپائی رولینا کی کاشت کے
سلسلے میں استعمال کئے گئے کیمیا و محلول ہمارے کام آتے ہیں
اور ہمیں نقصان کا قطعی سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

جانوروں کے نہایت عمدہ چارے کے لئے موزوں خام
اسپائی رولینا کی کاشت کے لئے کاربن اور قلوی مرکبات کی
آمیزش کے لئے اس میں ایک فیصدی سوڈیم بائی کاربونیٹ
اور ۰.۱ فیصدی سوڈیم نائٹریٹ۔ کھلے تالاب میں استعمال کیا
جاتا ہے۔

ادارہ میں بنائے گئے دو مخصوص تالاب جو کہ
۳۰ میٹر لمبے اور ۵ میٹر چوڑے ہیں جن کا کل دائرہ ۱۵۰ مربع م
اس میں ۲۰ ہزار لیٹر بدررو پانی ۱۵ سینٹی میٹر گہرا سما سکتا
اس طرح دو اور تالاب جو ۱۰ میٹر لمبے اور ساڑھے سات میٹر چو
ہیں جس میں دس ہزار لیٹر بدررو پانی ۱۵ سینٹی میٹر کی گہرائی میں
رہ سکتا ہے اور اس طرح اسپائی رولینا کی حیات الکثرت کا
کھلے میں حاصل کی جاتی ہے۔ ایک ساتھ چاروں تالابوں
۱۵ سینٹی میٹر کی گہرائی میں ساٹھ ہزار لیٹر اور ۲۵ سینٹی میٹر
گہرائی میں ۱ لاکھ لیٹر بدررو پانی ۴۵۰ مربع میٹر کے دائرہ پر ش
ہے۔

کاشت کے لئے تالابوں کا استعمال ادوار میں کیا
ان میں بدررو پانی کو حرکت دینے۔ پھیلنے اور نسائج
طرح پھیلنے کے لئے ہوا کا داب دیا جاتا ہے جس کے لئے
لائن لگائی گئی ہے اور مناسب جگہوں پر اس میں سوراخ
گئے ہیں۔

اس کام کے لئے ایک آلہ بھی لگایا گیا ہے۔ اسپائی
کو چھاننے کا ایک منظم طریقہ ہے جو ایک چھوٹی نہر نما بڑی
ذریعہ کیا جاتا ہے اور اس کی آخری ٹونٹی مچھلیوں کے تالاب
جاکر کھلتی ہے۔

اسپائی رولینا کے نتائج کو سب سے پہلے ۲۰ سے
ڈگری سینٹی گریڈ کے درجۂ حرارت پر شیشے کے بڑے بڑ
مرتبانوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ انھیں برقی روشنی میں
۱۰ دن تک رکھا جاتا ہے جب نسائج کچھ گاڑھے ہو جا
تو انھیں باہر چھوٹے حوضوں میں تبدیل کیا جاتا ہے اور
میں پیداوار بڑھانے کی کثافت بتدریج بڑھ جاتی ہے جو گر
میں عموماً دس دن میں اور جاڑوں میں ۲۰ دن میں ہوتی ہے
حیات الکثرت کاشت کے لئے بڑے تالابوں میں منتقل کیا
تالابوں میں بوائی سے پہلے بھی کیمیاوی مرکبات کو حل ہو
لئے پانی کو بھرپور پھینٹا جاتا ہے۔ یہ فی گھنٹہ ۳ سے ۵
تک ہوا کے داب کے آلہ سے بھی کیا جاتا ہے اور بڑے
برشوں سے ایک آدمی کے ذریعہ بھی کرایا جاتا ہے۔ اس کو
پولیسٹر یا نائلن میں سے چھان کر بہتر ہوتی ہے کیونکہ سوتی کپڑ
میں کہیں کہیں ریشہ پھنس جانے کی زیادہ گنجائش رہتی۔

تو

یں حاصل فصل کو دھوپ میں پلاسٹک کی چادروں پر سکھانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے سکھائی گئی اسپائی روولینا کو کسی طرح کا نقصان نہیں ہوتا اور اس کا ذخیرہ آسانی سے کیا جاتا ہے۔

ادارہ میں ۵۰۴ مربع میٹر کے ان تالابوں میں اس کی اوسط ریکارڈ کاشت ایک ہزار کلو گرام سالانہ ہے۔ تالاب کے ایک مربع میٹر کے قطر میں فی دن تقریباً ۸٫۷ گرام کی کاشت کی جا سکتی ہے۔ جو جانوروں کے لئے ایک اعلیٰ غذا ہے۔

اس طرح ایک ساتھ لگاتار لگ بھگ چھ مہینوں تک اسپائی روولینا کی افزائش ہوتی ہے اور اس کی فصل حاصل کرنے کے بعد اس کے بدرو پانی کو مچھلیوں کے تالاب میں ڈال دیا جاتا ہے دوسری طرف تالابوں کو صاف کر دیا جاتا ہے اور دوبارہ کاشت و فصل حاصل کرنے کے لئے تازہ نتائج کا استعمال ۔

تازہ کیمیاوی مرکب درجہ بدرجہ اس طرح عمل میں لائے جاتے ہیں جیسے ابتداءً استعمال کئے گئے تھے۔

۲۶۰ مربع میٹر کا ایک تالاب مچھلیوں کے لئے بنایا گیا ہے جس میں کارپ مچھلیاں ہیں اور جن کی غذا اسپائی روولینا ہی ہے اس تالاب میں مویشی کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ اور دوسرے تالابوں کا بدرو پانی بھی اس تالاب میں وقتاً فوقتاً ڈالا جاتا ہے تاکہ قدرتی طور پر حشرات و نباتات میں توازن و میلان برقرار رہے۔

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ پانی میں افزائش پانے والے یہ ادنیٰ پودے ہمارے کام کے پودے ہیں۔ فارم میں سکھائی گئی اسپائی روولینا مرغیوں کو کھانے میں دی جاتی ہے اور اس سے نہ صرف مرغیاں تندرست ہوتی ہیں بلکہ انڈے کا رنگ اچھا اور اس کی طاقت بھی بڑھ گئی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آنے والی زندگی میں یہ مخصوص ایلگی کے پودے شاید ہماری غذا میں بھی شامل ہو جائیں۔ آخر نباتات ہی سے حاصل ہم کتنی دیگر چیزیں استعمال کرتے آئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح گندے، گدلے اور بدرو پانی کا بے جا استعمال نہیں ہوگا بلکہ بجا طور پر استعمال کرکے ہم شہروں کے علاوہ گاؤں کی بہتری کے لئے وہاں کے جانوروں کو بھی فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ نباتات انسانی زندگی میں زمانۂ قدیم ہی سے نہیں بلکہ دنیا میں وجود میں آنے کے پہلے ہی سے ایک اہم کردار ادا کرتے آئے ہیں اور آج کے دور میں ہم آپ نئی معلومات اور نئے تجربات سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔

موضوع سے ذرا ہٹ کے یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح تلسی داس نے رامائن میں "آوسر" لفظ کا استعمال کیا ہے اسی طرح غالب کا یہ شعر بھی بھرپور اہمیت کا حامل ہے اور اس سائنسی مضمون کی زینت بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

تلسی داس اور غالب اگرچہ سائنسداں نہیں تھے مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ان میں رموز کائنات کے گوشوں کو گہرائی سے دیکھنے اور پرکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اردو ادب میں ایسی دو ایک نہیں بلکہ کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اس وقت ہم غالب کے اس شعر ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ضروری گذارش

رقم خریداری روانہ فرمانے والے حضرات سے: منی آرڈر کوپن پر اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر ضرور تحریر فرمایئے۔ عموماً منی آرڈر کوپن پر لوگ نام، پتہ نہیں لکھتے جس کی وجہ سے شکایتی خط آنے پر کافی چھان بین کے بعد پرچہ جاری کیا جانا ممکن ہوتا ہے۔ اگر کوپن پر پتہ لکھا ہو تو فوراً "قومی راج" جاری کر دیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

سادھو

مراٹھی کہانی: جی۔ اے کلکرنی

ترجمہ: سلام بن رزاق

۹/۱۱، ایل۔ آئی۔ جی

وی۔ بی۔ بھاوے نگر۔ کرلا (ویسٹ)

بمبئی ۴۰۰۰۷۰

وہ تھکا ماندہ سادھو اس گاؤں میں [illegible] باہر نکلا ہوا تھا مگر [illegible] نے گاؤں سے [illegible] اعتماد سے قدم [illegible]۔ لگا جیسے گاؤں [illegible] اور [illegible] کوچے اس [illegible] دیکھ [illegible] ہو۔

گاؤں کے کنارے [illegible] عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ [illegible] بوڑھے [illegible] تھیں۔ [illegible] عورتوں [illegible] نظر پڑتے ہی وہ [illegible] ہو گیا۔ اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں [illegible] مزید گہری ہو گئیں [illegible]۔

[illegible] ان بدحال لوگوں پر ترس آیا۔ ان میں سے ایک ایک کے مستقبل کا احوال وہ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً اس کی نگاہیں اس دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں جو کنویں کی مینڈھ پر جھکی ڈول سے پانی کھینچ رہی تھی اس کے جھلمل کرتے لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک نوبیاہتا دلہن ہے۔ اس کا جسم ہلدی کی گانٹھ جیسا چمکدار اور پرکشش تھا۔ وہ اتنی نوعمر تھی کہ شباب کی آمد آمد کے باوجود اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت باقی تھی۔

سادھو کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا اور ہلدی کی گانٹھ جیسا پرکشش بدن مردہ ڈھور کی مانند پھولنے لگا۔ سادھو نے گھبرا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور بھرائی آواز میں راہگیر سے بولا۔

"اس لڑکی کو دیکھتے ہو۔ وہ ابھی کنویں میں ڈوب کر مر جائے گی۔"

پھر بغیر [illegible] کے تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ سڑک کے پہلے موڑ پہ پہونچا تھا کہ عقب سے بے تحاشہ چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر اس نے مڑ کر دیکھا۔ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس نے اپنی نگاہ پیش بیں سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے ایک خستہ حال جھونپڑی دکھائی دی جس میں ایک سیاہ فام لوہار اپنے وزنی ہتھوڑے سے لوہا کوٹ رہا تھا۔ سامنے بڑا سا الاؤ دہک رہا تھا جس سے آگ کی چنگاریوں کا فوارہ سا اڑ رہا تھا۔

الاؤ کی سرخ روشنی میں وہ لوہار یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ابھی ابھی سمندر منتھن کے بعد اسی آگ سے کسی مورتی کی طرح برآمد ہوا ہو۔

پاس ہی ایک چھوٹا بچہ بڑے انہماک سے شعلوں کی زبانوں سے اڑنے والی چنگاریوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سادھو نے یہ سب دیکھا مگر اسے بڑا تاسف ہوا کہ اس نے ادھر کیوں نگاہ کی۔ پیش آنے والے حادثے نے اسے ایک دم مضطرب کر دیا اور اس نے پاس کھڑے ہوئے شخص سے کہا

"آہ اب یہ بچہ جھلس کر مر جائے گا" اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص سادھو کی اس بات پر پہلے تو چونکا پھر دور جاتے سادھو کو کوئی سڑی سمجھ کر اس پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی اور استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ وہ بچہ اسی شخص کا تھا۔ اور پچھلے کئی روز سے اسی طرح روزانہ آکر وہاں بیٹھتا تھا اور لپ لپاتے شعلوں کا تماشا دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ اتنے میں لوہار اٹھا اس نے انگلی سے پیشانی اور گردن کا پسینہ صاف کیا اور اکڑی ہوئی شریانوں کو ڈھیلا چھوڑتا ہوا پانی پینے کے لئے اندر چلا گیا سادھو تیز تیز قدم اٹھاتا کسی ان دیکھی ان جان زنجیر سے بندھا چلا جا رہا تھا۔ سامنے نکڑ پر املی کا پیڑ تھا وہ جانتا تھا کہ اس درخت کے سرسبز سائے تک پہونچتے نہ پہونچتے بچے کی چیخ سنائی دے گی اور ویسا ہی ہوا۔ جوں ہی اس نے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں قدم رکھا پشت سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی سادھو کے قدم رکے نہیں وہ چلتا رہا اب وہ گاؤں کے باہر آچکا تھا اور اس کا اعصابی تناؤ بھی کم ہو گیا تھا اسے یقین تھا کہ اس سامنے والی ٹیکری کے دامن میں وہ مندر ضرور ہوگا۔ چند قدم طے کرتے ہی اس کی نظر مندر پر پڑی۔ وہ ایک پرانا بوسیدہ مندر تھا جس کے ستون ڈھے چکے تھے۔ مورتی ٹوٹی پڑی تھی اور چاروں طرف تاراجی کا راج تھا۔

اس نے سوچا اب اس مندر کے ایک گوشے میں مرگ چھالا بچھائے وہ سکون اور اطمینان سے اس کی راہ دیکھتا رہے گا۔ وہ اس مسافر کی سی طمانیت محسوس کر رہا تھا جو ایک طویل عرصے کے بعد کسی گھنے درخت کے سایے میں پہونچ گیا ہو۔

اس نے مرگ چھالا پر فرش بچھایا اور اس پر اطمینان سے آسن جما کر بیٹھ گیا۔ اب باہر درخت کے پتوں کی سرسراہٹ کے سوا وہاں کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی غالباً اس ویران مندر میں ایک عرصے سے کسی متنفس کا گذر نہیں ہوا تھا۔ فرش پر دھول کی دبیز چادر بچھی تھی جس پر دروازے سے مرگ چھالا تک صرف اسی کے قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گذر رہا تھا۔ سادھو دروازے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بہت پہلے آگاہ ہو چکا تھا کہ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ خواہ مخواہ کی بے صبری سے ہونے والا وقوعہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا اور نہ ہی کسی کے ڈرنے گھبرانے سے وہ پل بھر کے لئے ٹل سکتا ہے۔

بڑی دیر کے بعد باہر خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی چرچراہٹ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک خونخوار قسم کا نوجوان ہاتھ میں چمکدار خنجر لئے دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ نوجوان دروازے میں کھڑا اندر مندر کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"بھرت اندر آجا۔ میں یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔ مندر کے سناٹے میں سادھو کی آواز گونجی۔

نوجوان اپنا نام سنکر پہلے تو چکرایا۔ پھر سادھو پر اس کی نظر پڑی اور وہ پنے تلے قدم اٹھاتا سادھو کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے آثار تھے۔ سادھو کو اس کا نام کیونکر معلوم ہوا؟ آخر اس نے کرخت آواز میں پوچھ ہی لیا۔

تو کیسے جانتا ہے کہ میرا نام بھرت ہے؟

وہ جانتا تھا کہ بھرت اس سے یہ سوال ضرور پوچھے گا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جواب میں اسے بالکل خاموش رہنا ہے۔ مگر اس سوال نے اس کی یادوں کے پرسکون تالاب میں ایک ہلچل مچا دی۔

جس طرح وہ حال سے بطن میں چھپی مستقبل کی تصویر دیکھ لیتا ہے اسی طرح اب ماضی بھی ساکار ہو کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

جب گھر میں بچہ ہوا تھا تو اس نے اس کا نام بھرت رکھا تھا مگر بچے کی پیدائش کے چند روز بعد ہی اس کی بیوی گھر اور خاندان کی پرواہ کئے بغیر بچے کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ لڑکا بھی آٹھویں میں قدم رکھتے نہ رکھتے گھر سے فرار ہو گیا یوں گھر کا پورا شیرازہ بکھر گیا۔ تب سے وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہا ہے۔ اس نے مستقبل کی آنکھ سے بارہا اپنے بیٹے کی جگہ اسی خونخوار نوجوان کو اسی بوسیدہ مندر میں خنجر بکف دیکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے اس کی رگوں سو

برف جم چلی تھی۔

وہ انجانے میں اس گاؤں کے پاس سے کتنی بار گذرا ہوگا مگر کبھی وہ مندر اسے دکھائی نہیں دیا اور نہ کبھی اس گاؤں میں اسے داخل ہونے کی اس کے دل میں کبھی خواہش جاگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واقعات اپنے وقت ہی پر رونما ہوتے ہیں۔ نہ ایک پل ادھر نہ ایک پل اُدھر۔ جیسے ہر نقش پتھر پر کندہ کر دیا گیا ہو۔ اس نے تصور میں اس نوجوان کے ہاتھ میں چمکتا خنجر بھی دیکھا تھا مگر ایک عجیب ناگزیر طاقت اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ وار کرنے والا اور وار سہنے والا دونوں وقت کے اس بے کراں جال میں کس قدر بے بس ہیں، بے بس ہیں اس لئے دونوں ہی بے قصور ہیں۔

سادھو کو خاموش دیکھ کر بھرت بولا۔

" تو جانتا ہے اس بستی پر میری حکمرانی ہے۔ میرے عتاب سے لوگ کانپتے ہیں اور میرا ذرا سا کرم انھیں نہال کر دیتا ہے تو شاید نہیں جانتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

سادھو ایک بات جانتا تھا۔ پچھلے کتنے برسوں سے مستقبل کا ایک ایک راز اس پر افشا ہو چکا تھا۔ جب وہ اپنے اننت سفر پر گھر سے باہر نکل رہا تھا تبھی یا اس سے پہلے اس وقت جب وہ اپنے بیٹے بھرت کا نام تجویز کر رہا تھا یا اس سے پہلے جب وہ خود پیدا ہوا تھا۔ یا اس سے بھی پہلے جب اس کے باپ کا جنم ہوا تھا۔ یا اس سے بھی پہلے جب پہلا انسان وجود میں آیا تھا۔ وہ ہر منظر کو عجیب بے تعلقی سے دیکھتا آیا تھا جیسے کوئی ناٹک دیکھ رہا ہو ۔۔۔ اس کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح بے شمار انسانوں کی پیدائش اور ان کی قسمتوں کی ناگزیریت کے ساتھ کھینچی ہوئی ایک لکیر ۔۔۔ زندگی کا ہر بھید اس پر کھل چکا تھا اور اب جو کچھ ہونے والا تھا اس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ متواتر مستقبل کا تعاقب کرنے لمحۂ موجود ایک جست میں مستقبل کی حدود پار کر جانے والا تھا وقت کے بہاؤ میں لمحہ بھر کو ایک گرہ پڑنے والی تھی اور پھر سب کچھ شانت اور پہلے کی طرح پُرسکون ہو جانے والا تھا۔

" تجھ جیسے شخص کا زندہ رہنا بے حد خطرناک ہوگا۔ بھرت نے کہا میں تجھے قتل کرنے آیا ہوں۔ تیری زبان سے موت بولتی ہے۔ تیرے الفاظ تباہی اور نحوست کا علامیہ ہیں۔"

سادھو نے نہایت اطمینان سے کہا۔

تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے مگر سچ صرف یہی نہیں ہے لفظ کو واقعہ بنا دینے کا اختیار کسی کو نہیں۔ میرے الفاظ کسی واقعے کا علامیہ بن ہی نہیں سکتے۔ تیرا یہ سوچنا غلط ہے کہ میں جو بولتا ہوں اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل جو ہونے والا ہوتا ہے وہ مجھے قبل از وقت دکھائی دیتا ہے اور میں اسے لفظوں میں محض بیان کر دیتا ہوں میرا بولنا ناگزیر ہے یہی میرا شراپ ہے۔

مندر کی شکستہ دیوار سے دھوپ کی ایک کرن اندر رینگ آئی اور فرش پر دھول کا بالشت بھر ٹکڑا کندن ہو گیا۔ تاریکی کچھ کم ہوئی۔ سادھو کہہ رہا تھا۔

" اور سن اپنے اس شراپ کے کارن میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بدنصیب ہوں کیونکہ اسی کے سبب میں امید و خواب کی فریب خوردہ مسرتوں سے حظ نہیں اٹھا سکتا مگر میں دوسروں کے مقابلے میں بے حد مطمئن ہوں کیونکہ میں نے خواہشات کی نفی کر دی ہے اس لئے دکھوں کی بھی نفی ہو چکی ہے۔ جب لالچ ہی نہیں تو ڈر بھی نہیں۔ اور جب ڈر نہیں تو دکھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تو مجھے قتل کرنے آیا ہے۔ مگر میں موت سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ میرے من میں تیرے تعلق سے بھی کوئی میل نہیں۔ اس دھوپ کے ٹکڑے کو تو غور سے دیکھ! کیسا سنہرا رنگ ہے اس کا۔ تھوڑی دیر میں میری زندگی کے آخری لمحے کی طرح لہو رنگ ہو جائے گا۔ اس کے سرخ ہوتے ہی سمجھ لے میرا وقت بھی آن پہنچا۔ البتہ میں تجھ سے یہ کہوں گا کہ تو جلدی سے اپنا کام ختم کر اور نہ ہی زندگی کے چند لمحے تجھ سے مستعار مانگنے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ نہ تیرے چاہنے سے یہ قتل مقررہ وقت سے پہلے عمل میں آ سکتا ہے۔ نہ میرے چاہنے سے ایک پل کے لئے ٹل سکتا ہے۔

سادھو بولتے بولتے رک گیا۔ اس کی نگاہیں بھرت پر گڑی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے بھرت کا چہرہ سیاہ، بے جان۔ اور بے رونق ہو گیا۔ اس کے گردن کے گرد کالے ناگ کی کنڈلی جیسی پھانسی کی رسّی کے نیل پڑنے لگے۔ سادھو نے بہت پہلے جب بھرت ابھی بچہ تھا اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں دیا۔

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا
مخدوم محی الدین ایوارڈ برائے ۱۹۸۵ء
قرۃ العین حیدر کو

حیدرآباد۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا باوقار کل ہند مخدوم ادبی ایوارڈ برائے ۱۹۸۵ء صنف فکشن پر اردو کی نامور اور بین الاقوامی شہرت کی حامل افسانہ و ناول نگار قرۃ العین حیدر کو دیا جائے گا۔

ریاستی اردو اکیڈمی کی مجلس عاملہ نے جس کا اجلاس ۱۱ مارچ کو دفتر اردو اکیڈمی حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا متفقہ طور پر فیصلہ کیا۔ اس ایوارڈ کے لیے ملک بھر کے مختلف حصوں سے فکشن کے نقاد ور افسانہ و ناول نگار اور ممتاز ادبی شخصیتوں سے آراء منگوائی گئی تھی۔ جن کی اکثریت نے قرۃ العین کا نام اس ایوارڈ کے لیے تجویز کیا تھا جس سے مجلس عاملہ نے مکمل اتفاق کرلیا۔ یہ ایوارڈ جو ملک کے بہترین ادبی ایوارڈس میں شمار ہوتا ہے اور جو دس ہزار روپے نقد اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔

یہ ایوارڈ سال ۱۹۸۰ء میں اردو کے نامور شاعر مخدوم محی الدین کی یاد میں قائم کیا گیا تھا۔ اب تک علی سردار جعفری (شاعری) عصمت چغتائی (فکشن) وحید اختر (تنقید و تحقیق) اور سید وقار الدین (صحافت) یہ ایوارڈ حاصل کرچکے ہیں۔

ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈمی جناب محمد خلیل الرحمن نے اکیڈمی کے اس فیصلے کی اطلاع دی ہے۔

قومی راج کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھئے اور دوستوں کو خریداری کے لئے توجہ دلایئے۔
(ادارہ)

ے نظر آنے لگے اور اب اسی گردن میں پھانسی کا ے رہا تھا۔ اور المیہ یہ کہ اس پھانسی کا سبب تھا۔ وہ لمحے بھر کو مضطرب ہوگیا اور یہ جانتے ب ناگزیر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے ہی ی کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ تبھی اس ے آنسوؤں پر قابو پالیا اور انھیں پلکوں کے یا۔

ی بات بھرت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا غصہ پہونچ چکا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہوگیا۔ آنکھوں ا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا خنجر والا ہاتھ سر سے ی کوندی اور پورا خنجر آنکھیں موندے، شانت ر کے سینے میں دستے تک پیوست ہوگیا۔ ادھو ی کا جسم ابل پڑا اور فرش پر بہتی خون کی لکیر اس پ کے ٹکڑے کو مزید سرخ بنانے لگی۔

کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

ہ اللہ پٹیل، اعجاز مدنی (لائبریرین برہانی کالج آف یش پینلے) کو بمبئی یونیورسٹی نے ان کے گرانقدر ردو غزل میں تصوف ولی سے اقبال تک، پر ڈاکٹر ی ڈگری تفویض کی ہے۔
یر نگرانی ڈاکٹر آدم شیخ صاحب (صدر شعبۂ اردو ۔ چیرمین ا۔ دو بو۔ ڈ بمبئی یونیورسٹی) لکھا گیا تھا۔
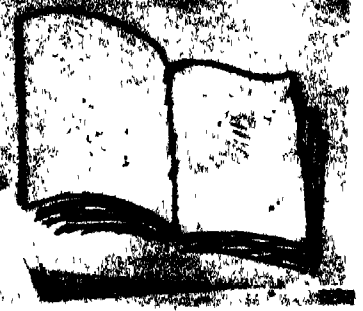
شعری مجموعہ۔ اجالوں کا سلسلہ

شاعر۔ رویندر جین

"اجالوں کا سلسلہ" مشہور موسیقار رویندر جین کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل یہ شعری مجموعہ رویندر جین کی کاوش بے پناہ کا آئینہ دار ہے۔ رویندر نے اپنا شعری سفر آج سے تقریباً ۳۰ سال پہلے شروع کیا تھا۔ اردو زبان کے ساتھ ان کی وابستگی ہم سب کے لئے اس لئے باعثِ افتخار ہے کہ انھوں نے اپنے شعری ذوق کی آبیاری کے لئے اس زبان کو نہ صرف سیکھا بلکہ اس کے محاورے کو روح میں اتارا۔ موسیقی کے ساتھ ان کا شغف بہت پرانا ہے۔ آہنگ اور صوتی دروبست سے آشنائی ان کے شاعری کے رنگ و روپ کو نکھارنے میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں کی بحریں مترنم ہیں اور اسی لئے آسانی کے ساتھ وردِ زبان ہو جاتی ہیں۔

رویندر جین کا شعری ذوق خاصہ استوار ہے۔ وہ اپنی شاعری کو لفظوں کی رنگولی سے سجاتے ہیں۔ پھر ان میں اپنے لمس کی خوشبو شامل کرتے ہیں انکے لفظوں کی ترتیب و تنظیم انکی شاعری کو موسیقی کی جھنکار بخشتی ہے اور قاری کی بصارت و بصیرت کو مہمیز کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لسیاتی جذبوں کو بھی انگیز کرتی ہے۔ ان کی شاعری عالم ارواح کی شاعری نہیں وہ فلسفیانہ آہنگ کے شاعر بھی نہیں ان کی شاعری عام انسانی زندگی اور اس کے تجربوں کا احاطہ کرتی ہے اور ہر اعتبار سے Readable ہے اس کے مطالعے سے ذہنی فرحت کا احساس ہوتا ہے ان کے یہاں مسائل تصوف کا بیان بھی اس قدر آسان صورت میں ہوا ہے کہ نظر ٹھہر جاتی ہے۔

ان کی شاعری تہہ در تہہ زندگی کے حزن و ملال اور درد داغ و آرزو کی جستجو ہے مگر وہ کہیں رکنے ٹھہرنے کے قابل نہیں سفر مدام سفر ہی ان کے نزدیک زندگی ہے۔ جہدِ مسلسل اور کاوش مسلسل ہی عین حیات ہے۔ وضعداری اور شرافت اور حسنِ سلوک کا اظہار جا بجا ان کی شاعری میں بادِ صبا کے خوش گوار جھونکوں کی طرح لذتِ کام و دہن اور انبساط و روح کا باعث ہوتا ہے۔

اردو کے اس سچے عاشق کے اس شعری مجموعہ کی پذیرائی ضروری ہے جس نے اپنی محبت، لگاوٹ اور رغبت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

سب زبانوں کے ہیں لعل و گہر اپنے اپنے
چاشنی سب میں کہاں ہے مگر اردو کی طرح

سو صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کو اندر کرن پبلیکیشنز باندرہ بمبئی نے زیورِ اشاعت سے آراستہ کیا ہے۔ قیمت ۲۵ روپئے ہے۔

کتاب بزم فکر و فن، گلند اپارٹمنٹس کا مارونڈا اندھیری بمبئی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

حقیر آستانی

اے مرے اہلِ وطن

جانے کب سے جل رہا ہے اپنا گھر اپنا چمن
آہ و زاری کر رہے ہیں طائرانِ خوش لحن
خود سے شرمایا ہوا ہے زندگی کا بانکپن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

دوستی کی، بھائی چارے کی، وطن کی بات ہو
آؤ پھر صدیوں پرانے اپنے پن کی بات ہو
اپنی نفاقی پہ اک عالم ہے کب سے خندہ زن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

مذہب و ملت کے جھگڑے فرقہ وارانہ فساد
آئے دن گھیراؤ آئے دن یہاں کوئی جہاد
اب زمیں کا اب زماں کا ناگ ہے پھیلائے پھن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

اتحادِ باہمی ہی ملک کی بنیاد ہے
کس طرح لوٹے گئے ہر بار کچھ تو یاد ہے
اپنی دھن میں تا بہ کے رہ پاؤ گے یوں ہی مگن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

اے وطن کے دوستو! سارا وطن خطرے میں ہے
ایک دو گوشے نہیں سارا چمن خطرے میں ہے
اپنے گھر میں قید ہے شہزادیٔ گنگ و جمن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

صورتیں اپنی ہیں وابستہ وطن کے نام سے
تا بہ کے چلتے رہیں گے بے خبر انجام سے
یوں تو سب کچھ ایک دھرتی ایک ہی سب کا گگن
تا بہ کے یہ خوابِ غفلت اے مرے اہلِ وطن

مان لوں کیسے فیصلہ دل کا

مرزا ساز قاسمی
۱۴۹-کیو/۴ اے
فیت والا کمپاؤنڈ۔ پائپ روڈ
کرلا۔ بمبئی ۔۔۔۔۴۰۰۰

بے لباسی میں جب سجیں گے لوگ
دل دکاں ہوگا اور بکیں گے لوگ

تم کو تم ہی سے چھین لیں گے لوگ
پھر بھی بدلہ میں کچھ نہ دیں گے لوگ

اپنی منزل کا خود تعین کر
ساتھ کب تک ترے چلیں گے لوگ

مان لوں کیسے فیصلہ دل کا
ڈر رہا ہوں کہ کیا کہیں گے لوگ

اپنی ہستی کے خود غلام ہیں جو
کیا کسی کے لیے مریں گے لوگ

تم جفا شیوہ خود نہیں، نہ سہی
یہ تمہیں مجبور کریں گے لوگ

زندگی ایسے موڑ پہ ہے جہاں
موت کی چھاؤں میں جئیں گے لوگ

تنگ نظروں کا اک سمندر ہے جہاں
دل میں گھر کر کے کیا رہیں گے لوگ

وقت اس کو اتار پھینکے گا.....
اپنے جس خول میں چھپیں گے لوگ

ہو گئی سرد آگ جذبوں کی
آگ میں اپنی اب جلیں گے لوگ

اپنے لفظوں میں کر طلب پیدا
سازؔ تجھ کو کبھی سنیں گے لوگ

★ **قمر سرسوی**
ادبی کتب خانہ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳

اب تو دل مائل ہے خاروں کی طرف
ہم بھی راغب تھے بہاروں کی طرف

سب کی نظریں ہیں نظاروں کی طرف
کون دیکھے غم کے ماروں کی طرف

گم ہے پیمانوں میں مفہوم حیات
اک نظر ان مے گساروں کی طرف

تشنہ کامانِ مئے الفت کو دیکھ
دیکھنا کیا بادہ خواروں کی طرف

قدردانِ بہاراں کے لیے
گامزن ہو خارزاروں کی طرف

ذوقِ غرقابی سے جو محروم ہیں
دیکھتے ہیں وہ کناروں کی طرف

جذبۂ خود اعتمادی چاہیے
ہم نہیں تکتے سہاروں کی طرف

دل میں لے کر ہمتِ طوفاں نواز
بڑھ رہا ہوں غم کے دھاروں کی طرف

اُٹھ گئے ہی رُخ کا ملا پر تو قمرؔ
جب نظر کی چاند تاروں کی طرف

قاضی حسن رضا
قاضی پورہ۔ لکھنؤ
(یو۔پی) ۲۲۶۰۰۳

درد بہہ کر مری پلکوں پہ ٹھہر جائے گا
اپنی اوقات سے کم ظرف گزر جائے گا

روز و شب خون ٹپکتا ہے مری آنکھوں سے
ایک دن عمر کا پیمانہ بھی بھر جائے گا

جو دھواں آیا ہے کھڑکی سے مکاں کے اندر
رفتہ رفتہ وہ مرے دل میں اتر جائے گا

کیسے چاہوں کہ ہو اندھیرا مرے گھر میں
میرا احساس ہی خوشبو سا بکھر جائے گا

میری بے بالی و پری نے مجھے مٹا دیا رضا
میں جہاں جا نہ سکا دستِ ہنر جائے گا

جانے کہاں ہو ختم یہ خوابوں کا سلسلہ

عزیز بگھروی
۲۵۰۳ - بارہ دری شیر افگن
بلیماران - دہلی ۱۱۰۰۰۶

سب جلنے کو تو جل جاتا ہے
کب رسی کا بل جاتا ہے
رہ جاتے ہیں ہیرے موتی
کھوٹا سکہ چل جاتا ہے
قدرت کا قانون اٹل ہے
سورج چڑھ کر ڈھل جاتا ہے
خوشیاں بن جاتی ہیں ماتم
غم خوشیوں میں ڈھل جاتا ہے
سب کی آگ بجھانے والا
اپنی آگ میں جل جاتا ہے
منظر بے ترتیب چمن کا
ذوقِ منظر پر کھل جاتا ہے
زخموں کے بھرنے سے پہلے
تیرِ ستم پھر چل جاتا ہے
کیسا ہے کردار ہمارا
ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے
وقت بدلتا ہے جب کروٹ
سب کا طور بدل جاتا ہے

دانشمند عزیز وہی ہے
جو بر وقت سنبھل جاتا ہے

نیر آتشی
۱/۲ ویسٹ پٹیل نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

جھکا جھکا کے نظر اضطراب سے پہلے
شراب اس نے پلائی شراب سے پہلے
جو دیکھنی ہوں مری مستیاں تو لے ظالم
نقاب الٹ دے رخِ ماہتاب سے پہلے
یہ بھولپن کی ادائیں یہ بے رخی یہ غرور
قیامت آ گئی تیرے شباب سے پہلے
مری وفاؤں کو دیکھا تو مہرباں نکلے
جو دیکھا کرتے تھے مجھ کو عتاب سے پہلے
شمار میرے گناہوں کا کر رہے ہیں وہ
حساب کیسا یہ روزِ حساب سے پہلے
اڑائی نیند مری کرکے وصل کا وعدہ
دکھا رہے ہیں مجھے خواب خواب سے پہلے
غزل کی شان تمہی سے نہیں ہے اے نیر
کچھ اور بھی تھے سخنور جناب سے پہلے

نظر جالنوی
نزد میجسٹک سینما ضلع جالنہ مہاراشٹر

پیاسے کے سامنے ہے سرابوں کا سلسلہ
شاید کہ زندگی ہے عذابوں کا سلسلہ
سرزد کوئی خطا ہو تو حد بھی سزا کی ہو
کب تک رہے گا جاری عتابوں کا سلسلہ
ہر بات سن کے پہلے وہ کرتے تھے مطمئن
اب بند کیوں ہوا ہے جوابوں کا سلسلہ
رشتے تمام ٹوٹ گئے دکھ میں دوستو
کیا پوچھتے ہو خانہ خرابوں کا سلسلہ
اک صفحۂ کتاب پہ ان کا عمل نہیں
رکھتے ہیں جو نظر میں کتابوں کا سلسلہ
قدرت کی مصلحت سے ہر دو میں رابطہ
کانٹوں سے منسلک ہے گلابوں کا سلسلہ
تعبیر کوئی سامنے آتی نہیں نظر
جانے کہاں ہو ختم یہ خوابوں کا سلسلہ

یدالحق سعید انصاری اٹاوی
معرفت فخرالدین عبدالجبار
ہسپتال روڈ، اٹاوہ (یوپی)

کائی تیرے پائے ناز پہ جس دم جبیں میں نے
محسوس جیسے چھو لیا عرشِ بریں میں نے

عیش و طرب ہے تلخ تر میرے لئے ساقی
ما ہے جب سے تیرے غم کا جامِ انگبیں میں نے

رے اشکوں کی قیمت جوہری ہی جان سکتا ہے
ہیں بھر غم سے بے بہا دُرِّ ثمیں میں نے

با رکھے ہیں ہر نوکِ مژہ پر دیپ اشکوں کے
ئی ہے شبِ تاریکِ غم کتنی حسیں میں نے

ال ماسوا اب تیرے دھوکے میں نہ آؤں گا
ے دیکھا ہے ہاں دیکھا ہے دل میں بالیقیں میں نے

✶

★ آفاق فاخری
جلال پور۔ فیض آباد۔ یوپی ۲۲۴۱۴۹

بہہ گئے خون کے دریاؤں میں آنچل کتنے
جل گئے اب کے برس چہروں کے جنگل کتنے
دھوپ، جیون کی بڑی تیز ہے بچنا یارو
دیکھنا، سونے سے چہرے ہوئے پیتل کتنے
لوگ نیزوں پہ سجائے ہوئے سر آتے ہیں
جگمگا اٹھے ترے شہر میں مقتل کتنے

تجھ کو ناقدریٔ فن کی یہ شکایت کیوں ہے
پوجتا کوئی نہیں ایسے ہیں پیپل کتنے

✶

• ابوالفیض سیّد ابادی
ہیڈ ماسٹر مولانا ابوالکلام آزاد مڈل اسکول
موریا۔ گھاٹ، گیا (بہار)

گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں کیوں ارمان شہر میں
ہر چہرہ لگ رہا ہے پریشاں شہر میں

دشمن کہوں کسے میں کسے دوست کہہ سکوں
خنجر بکف ہیں سارے شناساں شہر میں

انسانیت نمائشی ڈبوں میں بند ہے
بس نام کا ہی رہ گیا انساں شہر میں

ہر جسم بے لباس ہے ہر ذہن بے قرار
ملتا نہیں ہے درد کا درماں شہر میں

ہر سمت دارو دورہ ہے خود غرضیوں کا فیض
ویراں خلوص کا ہے گلستاں شہر میں

✶

قطعات

• واحد پریمی
نزد گنوری اسکول،
بھوپال (ایم پی)

۱

صبح کے بدلے میں کیوں شب کے ہو خوگر اے دوست
یہ اندھیرا تو نہیں اپنا مقدر اے دوست
خونِ دل صرف کریں حسنِ چمن کی خاطر
آؤ بن جائیں اُجالوں کے پیمبر اے دوست

۲

وہ سرزمیں کہ انسانیت جہاں ہو مقیم
وہاں کے ذرّے بھی ہوتے ہیں مہر و مہ سے عظیم
جو طوق کو بھی سمجھتے ہیں ہار پھولوں کا
وہی تو لوگ ہیں دراصل قابلِ تعظیم

۳

نگارِ وقت کا شہکار کامیاب ہوں میں
جو پڑھ سکو تو پڑھو اک کھلی کتاب ہوں میں
ہر ایک لمحہ جو جلتا ہو دوسروں کے لئے
تمہارے شہر کا اک ایسا آفتاب ہوں میں

۴

جب رکو تو روک دو تم گردشِ حالات کو
جب چلو تو سیرِ راہ و کہکشاں کرتے چلو
آنے والے قافلے گم کردۂ منزل نہ ہوں
اس طرح ہر نقشِ پا کو جاوداں کرتے چلو

احمد مقبول

۳۲۵، مہاراجہ نگر، مکھیم پور کھیری (یو پی)

کچھ نہ کچھ دیتے تو ہیں، الجھن سہی
دوست پھر بھی دوست ہیں دشمن سہی
دیکھ تو لیتے ہیں خود کو کم سے کم
زندگی ٹوٹا ہوا درپن سہی
ہیں تو ہم پھولوں کی طرح خندہ لب
گریۂ شبنم سے تر دامن سہی
ہے غمِ دنیا کا بھی کچھ اس پہ حق
دل تمہاری یاد کا مسکن سہی
خارزارِ زندگی جیسا کہاں
خوبصورت لاکھ یہ گلشن سہی
درد بڑھ جائے گا رہنے دیجئے
پرسشِ غم، کارِ مستحسن سہی
آدمی کھاتا رہے گا ٹھوکریں
ذرّہ ذرہ خاک کا روشن سہی
کہنے والے کہہ ہی لیں گے دل کی بات
گو لبِ اظہار پہ قدغن سہی
فن، برائے فن نہیں احمد قبول
لاکھ ہیں ناآشنائے فن سہی

اثر بن یحییٰ انصاری

ولی پورہ ـ دھولے ـ (مہاراشٹر)

یہ ناز و ادا یا رو، نوخیز جوانوں میں
گھُن لگنے لگا اب تو شیشے کے مکانوں میں
بلوؤں کا تعلق کیا، انسان کی فطرت ہے
مخلوق کوئی ہوگی ان اونچی اڑانوں میں
کیا نور برستا ہے کیا جشنِ چراغاں ہے
اس شہرِ خموشاں کے دربند مکانوں میں
کعبہ کے نقوش ابھرے پیشانیٔ زاہد پر
یا دان کی پرودی ہے تسبیح کے دانوں میں
ناکردہ گناہوں کی ملتی ہیں سزائیں کیوں
ایسی ہی روایت تھی کیا اگلے زمانوں میں
وہ کون تھا کل جس نے آواز مجھے دی تھی
وہ کس کی صدا تھی جو کل گونجی تھی کانوں میں

کیا آج اثر اس نے الٹا ہے نقاب اپنا
شدّت کی جو گرمی ہے برفیلی چٹانوں میں

رونق سیمابی

۲۔ دہرا ابل، تلجگا روڈ، نزد کریم ٹاکیز
ساکچی، جمشید پور
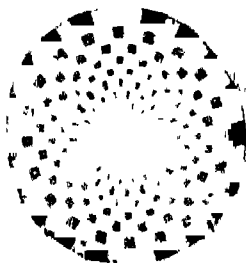
ہم جہاں میں ملتے تھے پہلے وہ گھر نہ تھے ایسے
وہ آنگن اور وہ دہلیز و در نہ تھے ایسے
وہ صبح، صبحِ بنارس تھی، شام، شامِ اودھ
وطن کے پچھلے وہ شام و سحر نہ تھے ایسے
جنھوں نے دی تھی فن و فکر کو نئی تہذیب
وہ اہلِ فن تھے، وہ اہلِ ہنر نہ تھے ایسے
اساس لمحۂ تعمیرِ کائنات سہی
جو لمحے بیت گئے معتبر نہ تھے ایسے
یہ قرب و دوری جو اک مسئلہ ہے بارِ سفر
وہ لوگ اور تھے وہ ہم سفر نہ تھے ایسے
شگفتہ دل جو ہے یہ آج رنگ و بوئے چمن
نظارے باعثِ زخمِ نظر نہ تھے ایسے
وہ لمحے زیست کے مائل تھے ٹوٹنے پہ سہی
وہ ٹوٹتے ہوئے لمحے مگر نہ تھے ایسے
نفس نفس کی یہ آئینہ داریاں توبہ!
وہ حادثے کبھی حیرت اثر نہ تھے ایسے
کرم نواز بالآخر ہوئے جو ہیں رونق
کبھی جو حالِ دلِ زار پر نہ تھے ایسے

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی طرف سے

ایک لاکھ روپئے کے انعامات

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے سال برائے ۱۹۸۶ء کے لئے ادیبوں شاعروں مصنفوں، صحافیوں، خوش نویسوں، اردو اور مراٹھی کو قریب لانے والوں اور زبان دانوں کے اساتذہ اور خادموں کو ایک لاکھ روپئے تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے گیارہ سالوں کے عرصے دئے جانے والے اکادمی کے یہ سب سے بڑی رقم ہے۔

گیارہ ہزار کا قومی ایوارڈ

پہلی بار اردو اکادمی نے پچھلی تجویزوں کی تعمیل میں ایک قومی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے اور پروفیسر آل احمد سرور (عمر ۷۶ سال) کو اتفاق رائے سے ان کی مجموعی خدمات پر گیارہ ہزار کی رقم کا ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

شاعری کا پہلا انعام (رقم پانچ ہزار روپئے) گوکھرو کے پھول کے مصنف ظفر گورکھپوری کو دیا گیا۔ دوسرا انعام (رقم تین ہزار روپئے) پربھنی کے شری سید میر ہاشم (کتاب درد نارسا) اور مالیگاؤں کے شری سید عارف (دھوپ کا آخری ٹکڑا) کو حاصل ہوا۔

نثر کا پہلا انعام مقابلے میں شریک کسی کتاب کو نہیں دیا جا سکا نثر میں دوسرا انعام "مد و جزر" افسانوی مجموعہ کی قلم کار شریمتی ثریا صولت حسین (ناگپور) سالواں پھیرا۔ شریمتی واجدہ تبسم اور صدیوں کے بعد کے لوگ کے شری (عرفان عارف) کو مساوی رقم تین تین ہزار روپئے تقسیم کیا گیا۔ یوں نثر کا پہلا اور تیسرا انعام کسی کو نہیں ملا۔

"کمان اور زخم" کو پہلا انعام

تنقیدی ادب کی تازہ ترین تصنیف "کمان اور زخم" کے مصنف پروفیسر فضیل جعفری کو چار ہزار روپئے کے اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ شری غلام نبی مومن (کلیان) کی تصنیف جدید ہندوستانی سماج معلم و تعلیم" کو دوسرا انعام (رقم تین ہزار روپئے) اور دو کتابیں "کوکن کے سپوت" (شری انجم عباسی) اور شری شمیم کرہانی "حیات و شاعری" (شری خواجہ علی انجم) کو تیسرا انعام (دو دو ہزار روپئے) دیئے گئے۔

صحافت کے تین انعام

پورے مہاراشٹر میں صحافت کے پہلے انعام کے قابل کوئی نام تجویز نہیں ہوا۔ لہٰذا ریاست کے تینوں علاقوں میں نکلنے والے تین ہفتہ واروں سٹی ٹائمز (مالیگاؤں کے) شری خیال انصاری ندائے پربھنی کے شری محمد عبد السمیع اور ہمہ گیر (ناگپور) کے شری نثار اختر انصاری کو دوسرے انعام کے طور پر دو دو ہزار روپئے مساوی رقم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

خوشنویسی کے دو انعام

اکیڈمی نے پہلی بار خوش نویسی کے لئے انعام کا اعلان کیا مقابلہ میں کئی نمونے آئے چنانچہ شری علیم اللہ اور شری عرفان علوی (ادارہ انقلاب) کو خوش نویسی کے دو اول انعام (دو دو ہزار کی مساوی رقم) تقسیم کئے۔

اردو مراٹھی یکجہتی کے لئے انعام

اردو اور مراٹھی کو قریب ترلانے کے لئے مجموعی خدمات شری شریش بجھٹ (ناگپور) اور ڈاکٹر عبد الستار دلوی (بمبئی) کو تین تین ہزار روپئے اور شری سدانند نائک کو ایک ہزار روپئے کے انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا اردو کی عوامی مجموعی خدمات کیلئے شری رشید انجینیر (بھیونڈی) کو ۳ ہزار روپئے اور ڈاکٹر خضر شیخ (سولاپور) اور خضر حیات (ناگپور) کو دو دو ہزار روپئے کے اور شری شیخ عظیم اچلپوری کو ایک ہزار روپئے کے انعامات دیئے گئے۔

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما ۲۴ مارچ کو مہاراشٹر کے قانون سازی کے ایوانوں کے مشترکہ افتتاحی بجٹ اجلاس کو خطاب کرنے جارہے ہیں آپ کے ہمراہ ودھان پریشد کے چیئرمین شری جینت راؤ ٹلک اور ودھان سبھا کے اسپیکر شری شنکر راؤ جگتاپ بھی نظر آرہے ہیں۔

خبریں - تصویروں میں

نیدرلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر آر.ایف. لیوبرس کی ۱۴ مارچ کے روز سانتاکروز ایئرپورٹ پر آمد کے وقت گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے استقبال کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر

وزیر اطلاعات و رابطۂ عامہ ڈاکٹر شری کانت جچکار نے ۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو تیراپنتھ سماج کے رضاکار کارکنوں کی شانمکھانند سبھا گرہ میں عزت افزائی کی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر۔ بمبئی کے تیراپنتھ یووک پریشد نے اس پروگرام کا انعقاد کیا تھا۔

گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ۲۷ فروری کو سماجی کارکنوں کو "دلت مترا" ایوارڈ تقسیم کئے۔ زیر نظر تصویر میں وزیر برائے سماجی بہبود شری شیو اجی راؤ موگھے، وزیر مملکت برائے سماجی بہبود شریمتی رجنی ساتو بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ انعامات حاصل کرنے والے شری للکسن پڈالے، شری ماروتی ونا شیو اور مسز بھی مالی راؤت بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

***

شری لکشمن مانے مصنف "اوپرا" کی قیادت میں نومیڈک ٹرائبس ایسوسی ایشن کی شودھ یاترا، پونے کے شنی وار واڑہ میں ۲۷ فروری کو پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان اس موقع پر حاضرین سے مخاطب ہیں۔ مشہور کمیونسٹ لیڈر شری این۔ جی گورے، پونے کے میئر شری الہاس دھولے اور ڈبلیو ایم۔ ڈی سی کے چیرمین شری الہاس پوار بھی تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

شری وی پی نرسمہا راؤ مرکزی وزیر برائے ترقیات انسانی وسائل اور شریمتی سائی مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم اور پروفیسر رام سنگھ وزیر تعلیم مہاراشٹر ۱۴ فروری کو دہلی میں ریاستی وزراء تعلیم کی کانفرنس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

وزیراعلیٰ شری شنکرراؤ چوان نے وزیراعظم کے ثقافتی مشیر شریمتی پاپل جیکر اور شری کیا. راجو سیٹھی سے ۱۱ فروری کو نیشنل ہینڈی کرافٹ کمپلیکس کے نئی بمبئی میں قائم کرنے کے متعلق گفتگو کی۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔

وزیراعلیٰ شری شنکرراؤ چوان ضلع دھولے کے مراٹھی جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے، فروری کو اس رسم کی ادائیگی کے موقع پر لی گئی تصویر میں شری سدھیداس پاٹل وزیر مملکت برائے محصول، صدر ایسوسی ایشن کشن راؤ پوار اور ڈائرکٹر جنرل برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ شری پرمود مانے بھی نظر آ رہے ہیں۔
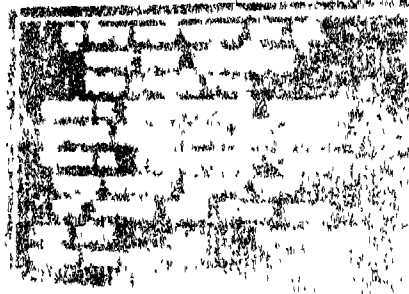
سوکھی
زمین
سوکھے
ہونٹ
دونوں کو چاہیئے پانی اور خوراک جو ہم ہی مہیا کر سکتے ہیں۔
سرکار اور عوام کے تعاون سے آیئے اُن لوگوں کی مدد کریں۔
ان کیلئے پانی، کام اور زندگی کو فراہم کریں۔
مہاراشٹر سخت ترین خشک سالی سے دوچار ہے۔
ریاست کے ۱۲،۳۱۳ دیہات اور ۴۹ شہری مراکز حالیہ خشک سالی کا شکار ہیں، ۵۶ء۱ کروڑ افراد اور ۲۳ء۸۰ لاکھ مویشی خشک سالی سے متاثر ہوئے ہیں۔
ریاستی سرکار، صورت حال پر قابو پانے کے لئے جنگی پیمانے پر برسر پیکار ہے۔ مگر اس سلسلے میں عوام کا تعاون بڑے پیمانے پر درکار ہے۔ آیئے مل جل کر خشک سالی سے متاثرہ دیہاتوں کے اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے آگے بڑھیں۔
"وزیر اعلیٰ کے راحت فنڈ میں"
دِل کھول کر چندہ دیجئے
ڈائرکٹوریٹ جنرل برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ، حکومت مہاراشٹر
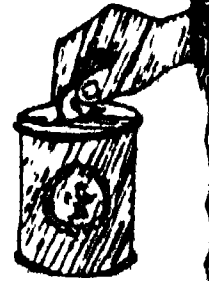
شانتی آیش
ڈی۔ ۲۲۹ اندرا نگر
لکھنؤ (یوپی) ۲۲۶۰۱۶

قومی راج جب سے نکلنا شروع ہوا ہے میرے مطالعے میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں سرکاری سطح پر نکلنے والے رسائل میں "قومی راج" سرفہرست ہے جس نے ہمیشہ قومی یکجہتی کو عملی طور پر پیش کیا ہے۔ گذشتہ تیرہ برس میں اس جریدے کے، میں بے شمار ایسے نمبر دیکھ چکا ہوں جو بلا مذہب و ملت کئی زبانوں کے صوفیوں، سنتوں، کویوں، شاعروں اور راجاؤں سے متعلق تھے اس کا تازہ کارنامہ "میتھلی شرن گپت نمبر" ہے جسے اردو والے بہت کم جانتے ہیں۔ آپ نے صرف ایک زبان سے بالا ہو کر دوسری زبانوں کے اہل قلم و مفکرین کو اردو والوں سے متعارف کرا کے بلاشبہ ایک بڑی قومی خدمت انجام دی ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔
آپ کی تقلید اسی جوش کے ساتھ دوسرے سرکاری رسائل کو بھی کرنی چاہیے۔ بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ۔

●

★ ایشور راج ماتھر
سابق صدر ناظم اطلاعات و رابطۂ عامہ حکومت مہاراشٹر
۳۸۸/A روڈ نمبر ۲۲
جوبلی ہلز، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۴

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ قومی راج برابر وقت پر مل رہا ہے۔ اس کی کتابت اگرچہ اب [illegible] اور مضامین کا معیار روز بروز اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصی نمبر واقعی بلند پایہ ہوتے ہیں جن میں کانگریس کا صد سالہ خصوصی نمبر اور چو ان چھتا کا خاص نمبر اور شریمتی اندرا گاندھی کا خصوصی نمبر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے نہایت تندہی اور محنت سے مواد کو جمع کیا ہے اور ان کو نادر تصویروں کے ساتھ انتہائی قابل مطالعہ انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا اس لیے آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

— ● —

★ ایس ایم شریف
۱۰/۱ روم نمبر ۱، پارک سائیڈ وکرولی بمبئی

قومی راج نہایت شاندار طریقہ پر شائع ہو رہا ہے ہمیں ہر ماہ قومی راج ملتا رہتا ہے اس کا مطالعہ قاری کے لیے کافی مفید اور نہایت معلوماتی ہے۔ گذشتہ شمارہ میں جہیز کے متعلق بہت ہی اچھے مضامین تھے۔ حکومت کی اسکیموں کا خلاصہ۔ ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کے معیار کو برقرار رکھنے والا پرچہ کہا جا رہا ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اگلا شمارہ خصوصاً ایس۔ ایس۔ سی طلبہ کی رہنمائی کے لیے ووکیشنل گائیڈنس کے لیے بھی کچھ صفحات معلوماتی شائع کیجیے۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ قومی راج دن دونی رات چوگنی ترقی کرے (آمین)

— ● —

★ رزاق شاہد
تاج پورہ، عمرکھیڑ ضلع ایوت محل (مہاراشٹر) ۴۴۵۲۰۶

"جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں" خصوصی نمبر نکال کر آپ نے بحیثیت مدیر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اس شمارہ میں آج کے سلگتے ہوئے مسئلہ "جہیز" کے متعلق سیر حاصل اور حقیقت پر مبنی معلومات ہیں جو قارئین کے لیے سبق آموز بھی ہیں اور باعث عبرت بھی۔ حصۂ نظم بھی کافی جاندار ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ کی ادارت میں رسالہ معیار کے اعتبار سے نقطۂ عروج کی منزلیں چھونے کے لیے آخری زینے طے کر رہا ہے جو اردو دنیا کے لیے خوشگوار استعجاب کا باعث ہے۔
دعا ہے کہ خدا قومی راج کو علمی، سماجی اور سیاسی فکروں کا صحیح ترجمان بنائے نیز اسے ثباتِ دوام و قبولیت بخشے۔

— ● —

★ سراج علی خاں ولد نور خاں
گھر نمبر ۲۱۰-۱-۵ محلہ نگر گلی، نزد پانی کی ٹنکی
نانڈیڑ ضلع ناندیڑ (۴۳۱۶۰۴)

قومی راج فروری ۱۹۸۶ء کا شمارہ موصول ہوا۔ قومی راج کا سلسلہ ہے جو تعریف کے قابل ہے اس کا ہر مضمون اور خاص کر غزلیں بہت پسند آئیں۔ یوں تو میں اور بھی رسالے پڑھتا ہوں لیکن قومی راج کی بات ہی کچھ اور ہے جس میں دل کو موہ لینے والی خوبی ہے۔

— ● —

"خشک سالی راحت فنڈ"

میں دِل کھول کر چندہ دیں!

وزیرِ اعلیٰ کی اپیل

دوستو!

جیسا کہ آپ جانتے ہیں پچھلے تین برسوں سے مہاراشٹر کے بیشتر علاقوں میں سوکھا پڑا ہوا ہے ریاست کے تیتس اضلاع میں سے ۲۶ اضلاع خشک سالی کا شکار ہیں۔ ۴۰,۷۶۰ موضع جات میں سے ۱۸,۴۱۲ موضع جات میں خریف کی فصل بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ نیز فصلِ ربیع کے وقتی پیسہ واری جائزے کے مطابق ۱۶ ضلعوں کے ۴,۱۵۱ گاؤں جن میں فصلِ ربیع کی بوائی ہوا کرتی تھی خشک سالی سے متاثر پائے گئے ہیں۔ وقت پر بارش نہ ہونے اور ناکافی بارش ہونے کی وجہ سے فصلِ ربیع میں ۱۲ لاکھ ہیکٹر اراضی زیرِ کاشت لائی نہ جا سکی ان باتوں سے کم از کم آپ لوگوں کو اندازہ ہو سکے گا کہ صورتحال کتنی سنگین ہے اور ریاستی زرعی پیداوار کی حالت کیا ہے۔

خشک سالی سے دو کروڑ سے بھی زیادہ افراد متاثر ہوئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹,۳۸۰ موضع جات اور ۴۹ شہری مراکز میں بھی خشک سالی کی بنا پر قلتِ آب کا خطرہ لاحق ہے۔ خشک سالی سے متاثر علاقوں کے لاکھوں زرعی مزدوروں اور کاشتکاری میں لگے ہوئے لوگوں کو ملازمت دینی پڑے گی اور ۸۰ لاکھ سے اوپر مویشیوں کے لئے گھاس چارے کا انتظام کرنا ہوگا۔

ریاستی حکومت نے اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے کئی منصوبے تیار کئے ہیں اور ان پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ ان پر سہ طرفہ مقابلے کی ضرورت ہے اوّل تو زرعی مزدوروں اور کاشتکاروں کو روزگار، دوئم پینے کے پانی کی فراہمی اور سوئم مویشیوں کے لئے چارہ کی فراہمی اور ریاستی حکومت نے موجودہ صورتحال کا پوری طرح مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے علاوہ ازیں اس سنگین صورتحال کے مقابلے کیلئے حکومت کی تمام تر کوششیں ناکافی ہونگی جب تک کہ تمام طبقات کا تعاون حاصل نہ ہو۔ مجھے تمام طبقات کی جانب سے تعاون ملنے کا مکمل یقین ہے۔ خشک سالی کا مقابلہ کرنے کیلئے مالی امداد کے علاوہ پانی کی فراہمی کیلئے ٹینکر اور پانی کا ذخیرہ کرنے کیلئے ٹینک جیسی دیگر چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔

مہاراشٹر اور خاص کر بمبئی کے عوام ایسے حالات میں اپنی اعلیٰ روایات کے مطابق فراخدلی سے عطیات دیتے آئے ہیں اسی لئے میں مزدوروں، سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین، صنعت کاروں، عوامی اداروں، عوامی بیکروں، ٹرسٹوں، سماجی رہنما کاروں اور سماج کے دیگر تمام طبقات سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ شدید خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کے افراد کی امداد کیلئے کامیابی کے ساتھ احاطہ کرنے کی غرض سے "وزیرِ اعلیٰ راحت فنڈ" میں دِل کھول کر چندہ دیں۔

ایس۔ بی۔ چوان
(وزیرِ اعلیٰ مہاراشٹر)

PRINTED AT THE GOVT. PHOTOZINCO PRESS, PUNE—1987

یوم مہاراشٹر
خصوصی نمبر

قومی راج

جلد ۱۴ — ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے — شمارہ ۵

چیف ایڈیٹر: پرمود مانے — ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان
مینجنگ ایڈیٹر: ہاشم احمد خاں — سب ایڈیٹر: عبداللہ

۱۰ مئی ۱۹۸۶ء

اس شمارے میں

نظمیں، غزلیں

زر سالانہ دس روپے
قیمت فی شمارہ ایک روپیہ

ہمارا سرورق:
جائیکواڑی آبپاشی پروجیکٹ اور دیا نیشورگا رڈن کا پلیکس کا ایک منظر۔ مجوزہ "سنت پیٹھ" یہیں پر بنایا جائے گا۔

مراسلت کا پتہ:- ایڈیٹر "قومی راج"
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر،
۱۵ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

ترسیل زر کا پتہ:- اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹ نزد سروجنی بلڈنگ
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲
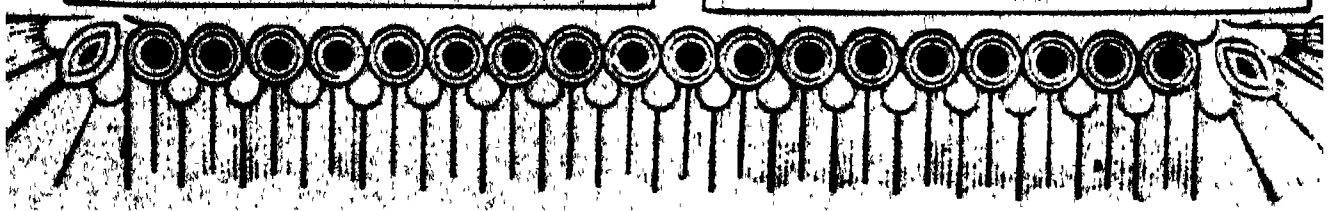
یومِ مہاراشٹر کے موقع پر

گورنر کا پیغام

بھائیو اور بہنو!

مہاراشٹر کی تشکیل کی ۲۷ ویں سالگرہ کے موقعہ پر میں ریاست کی عوام کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس روز کی ہماری زندگی میں ایک الگ اہمیت ہے۔ اس روز ۲۷ سال قبل یعنی یکم مئی ۱۹۶۰ء کو مہاراشٹر کی تشکیل ہوئی۔ اس وقت کے وزیراعظم شری پنڈت جواہرلال نے امید ظاہر کی تھی کہ نئی تشکیل شدہ ریاست ملک کو مضبوط بنانے میں اہم کردار نبھائے گی مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ پنڈت جی کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے اور اس ربع صدی کے دوران یہاں خاطرخواہ ترقی ہوئی ہے۔

پچھلے ۲۷ سالوں میں ریاست نے معاشی، سماجی اور تعلیمی شعبوں میں ترقی کے نئے ریکارڈ قائم کئے اس کے علاوہ کئی ایسی اسکیمیں وضع کیں جو اپنی نوعیت کی پہلی اسکیمیں تھیں جیسے ضمانت روزگار اسکیم اور اجارہ داری، کپاس حصولیابی اسکیم وغیرہ۔

ریاست ان اسکیموں کے جاری کرنے پر فخر محسوس کرتی ہے کیونکہ قومی سطح پر ان اسکیموں کو سراہا گیا۔ ہمیں اپنی ریاست کی اعلٰے روایتوں کو برقرار رکھنا چاہیئے اور اس مبارک موقعہ پر عہد کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے مقدور بھر کوشش کریں گے۔

ریاست میں پچھلے ۲۷ برسوں میں حاصل کردہ ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں خشک سالی کے باب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جس سے ان دنوں ریاست دوچار ہے۔ پچھلے ۳ برسوں سے مسلسل خشک سالی کا دور دورہ ہے۔ حالانکہ مہاراشٹر کی تشکیل کے بعد سے ہی خشک سالی ریاست کے کسی نہ کسی حصے میں رہی ہے مگر امسال اس کی شدت کا احساس بہت زیادہ ہے۔

ریاست کے ۲۷ اضلاع کے تقریباً ۲۴ ہزار مواضع خشک سالی کا شکار ہیں۔ ناکافی بارش کی بنا پر ریاست کے ۱۶۰۰۰ دیہاتوں اور ۱۰۵ شہری مراکز میں پینے کے پانی کی قلت پیدا ہو گئی ہے۔

اور اس تعداد میں مزید اضافے کی گنجائش ہے۔ حکومت نے اس سلسلے میں سہ رخی مقابلے کی تیاریاں کی ہیں تاکہ پینے کے پانی کی قلت اور مویشیوں کے لئے چارے کا بندوبست کیا جائے۔

ریاست کے کاموں کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لئے تعلقہ، ضلعی اور ریاستی سطح پر آل پارٹی کمیٹیاں وضع کی گئی ہیں۔

جس طرح ماضی میں خشک سالی کا مقابلہ حکومت نے کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ امسال بھی حکومت خشک سالی اور قدرتی آفات پر قابو پانے میں کامیاب رہے گی۔

مہاراشٹر نے امن کو برقرار رکھنے میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ گو چند قابلِ افسوس حادثات بھی ہوئے ہیں۔ مگر یہ حکومت اور یہاں کے عوام ہی کا حوصلہ ہے کہ انھوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت فرقے اور ذات پات کے بھائی چارہ کی فضا کو قائم رکھا اور ہنگاموں کو ہونے سے بچالیا۔
ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی اعلیٰ روایات کو برقرار رکھیں اور اس مبارک موقعہ پر ملک کے سامنے رکھے مقاصد کو حاصل کرنے کا عہد کریں۔

میں ایک بار پھر تمام لوگوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جے ہند ۔ جے مہاراشٹر

یومِ مہاراشٹر کے موقع پر شیواجی پارک پر پولیس پریڈ کا منظر
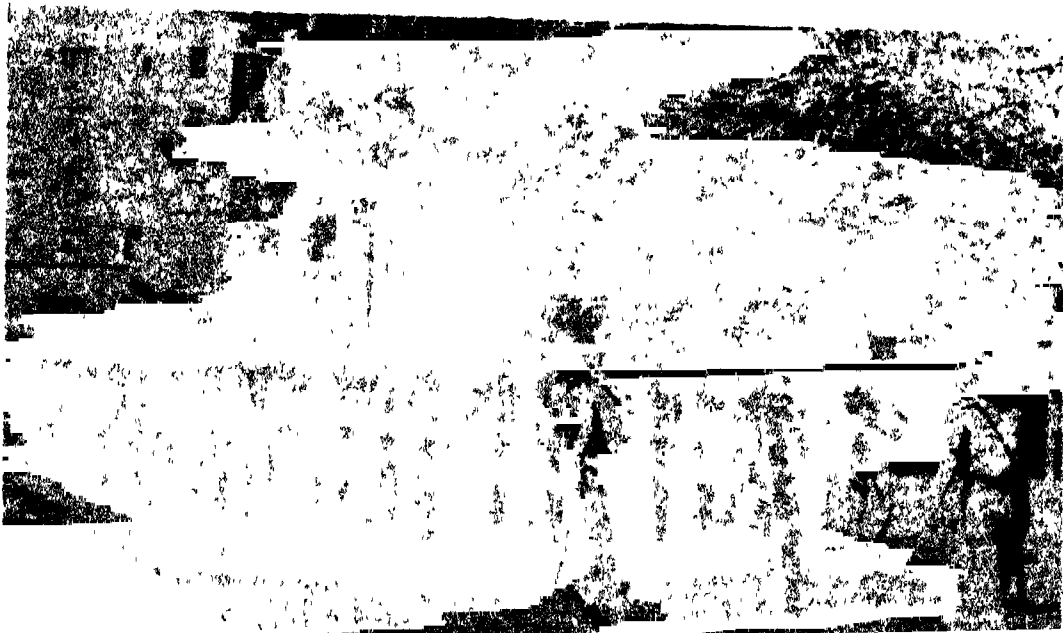
یوم مہاراشٹر کے موقع پر

وزیراعلیٰ کا پیغام

میں ریاست مہاراشٹر کی تشکیل کی ۲۰ویں سالگرہ کے موقع پر عوام کو اپنی دلی مبارکباد اور نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ہم یقیناً ان قابل تعریف ترقی کے کاموں پر اظہار فخر کرنے میں حق بجانب ہیں جنھیں ریاست مہاراشٹر نے مختلف امور میں گذشتہ ۲۰ سال میں حاصل کیا ہے۔ یہ ترقیاں حکومت اور عوام دونوں کی اجتماعی جدوجہد کے سبب ہی ممکن ہو سکی ہیں۔ ریاست مہاراشٹر حکومت کی ترقی پسند پالیسیوں اور سرگرمی کی وجہ سے ملک بھر میں ایک عالیشان مقام پر فائز ہے۔ ملک کے ایک اہم حصے کی حیثیت سے مہاراشٹر نے ملک کی طاقت بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پچھلے ۲۵ سالوں کے دوران ترقیوں کی راہیں طے کرنے میں ہمیں بہت سے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جب بھی ہم نے اپنی پالیسیوں اور پروگراموں کا جائزہ لیا تو معاشی ترقی کے حصول کی خاطر ہمیشہ سماجی انصاف کو پیش نظر رکھا۔

حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ معاشی اور قدرتی وسائل سے جو فائدے حاصل ہوں ان سے ریاست کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جہاں تک ممکن ہو شامل رکھا جائے اور مستفید کیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ ترقی پسندانہ فیصلہ جو دستیاب دموجود پانی کے وسائل کی تقسیم کے بارے میں حال ہی میں کیا گیا ہے اسے حکومت مہاراشٹر کے قابل تعریف فیصلے کی حیثیت سے شمار کیا جانا چاہیئے۔ حکومت نے یہ اہم دوررس فیصلہ حال ہی میں کیا ہے کہ جہاں جہاں پانی کی کمی ہے ان علاقوں کو نئے آبپاشی کے پروجیکٹ کے ۸ مہینے کی بنیاد پر (بجائے ایک سال کی بنیاد پر جیسا کہ پہلے دستور تھا) دیا جائے تاکہ پانی کی کمیابی سے متاثر زیادہ سے زیادہ علاقوں کو پانی کی فراہمی کا فائدہ پہونچایا جائے۔

حکومت نے بڑی دوررس نگاہی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا جو اس کی طویل منصوبہ بندی کے جزو کے طور پر ہے تاکہ بارش نہ ہونے کی صورت میں خشک سالی کی جو شدت پیدا ہو جاتی ہے اس سے نمٹا جا سکے۔ میں نے اس آٹھ ماہ کی بنیاد پر پانی کی تقسیم کے فیصلے کے بارے میں اشارہ اس وقت کیا تھا جب میں نے گذشتہ یوم مہاراشٹر کے موقع پر عوام سے خطاب کیا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ ریاست کے تمام ترقی پسند لوگوں نے اور [illegible] نے اس فیصلہ کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

ہمیں اپنے محدود آبی وسائل سے اپنی دستیاب زمین کی پیداوار بڑھانی ہے اس سلسلے میں آبی وسائل اور لینڈ مینجمنٹ کو امتیازی درجہ حاصل ہے اس نئے "لینڈ اینڈ واٹر مینجمنٹ کمیشن" کا قیام عمل میں لانے کا فیصلہ حکومت نے کیا تاکہ وہ اس کے متعلق منصوبہ پیش کرے۔

[illegible]

ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس یک لسانی ریاست کے قیام کے بعد یہاں آباد لوگوں میں قدرتی طور پر لسانی ہم آہنگی پیدا کریں۔ ریاست کے مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگوں میں متوازی معاشی، ترقی کا احساس بھی پیدا ہو جس سے جذباتی ہم آہنگی اور ریاست میں اتحاد کو تقویت پہونچ سکتی ہے حکومت اس سمت ٹھوس اقدامات کا ارادہ رکھتی ہے۔ جہاں حکومت مختلف علاقوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے اقدامات کر رہی ہے وہیں اس بات کے متعلق بھی یقین کر لینا چاہتی ہے کہ وہاں پھر سے پسماندگی نئے روپ سے نہ ابھرنے پائے اس مقصد کے تحت حکومت نے ایک قانون بنانے کا فیصلہ کیا ہے مجھے امید ہے کہ ہر شخص مذکورہ فیصلے کو سراہے گا اور اس کوشش میں حکومت کو اپنا تعاون پیش کرے گا۔

اس مبارک موقعہ پر دوسرے اہم معاملات میں سے کپاس اگانے والوں کی بات بھی ہے جنھیں فائدہ پہنچانے کی غرض سے ریاستی حکومت کپاس کے اجارہ دارانہ حصول کی اسکیم پر کئی برس سے عمل کر رہی ہے۔
گذشتہ سال تک اس اسکیم کو مرکز کی طرف سے صرف ایک برس کی توسیع ملتی تھی اس سال حکومتِ مہاراشٹر کی کوششوں کی بدولت مرکزی حکومت نے لگاتار ۲ سال کی منظوری دیدی ہے۔
مجھے امید ہے کہ اس اسکیم سے کپاس اگانے والوں کو مستقبل قریب میں اچھی معاشی پیش رفت حاصل ہوگی۔ میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا اور مرکزی حکومت کا دلی طور پر مشکور ہوں کہ انھوں نے اس اسکیم میں طویل عرصے کے لئے توسیع کردی ہے۔
ریاستِ مہاراشٹر نے ریاست کے پسماندہ ضلعوں میں صنعت کاروں کے لئے "ترغیبات کی" پیکج اسکیم کے تحت خصوصی سرمایہ کاری ترغیب کی پوری رقم بطور سبسیڈی عطا کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ وہ اضلاع ہیں جنھیں مرکزی حکومت نے صنعتی طور پر پسماندہ قرار دیا ہے یہ ریاستی سبسیڈی اس سبسیڈی کے علاوہ ہوگی جو مرکزی حکومت دیتی ہے اب تک ریاستی حکومت اپنی خاص سرمایہ کاری کی ترغیباتی رقم میں سے مرکزی حکومت کی عطا کردہ رقم وضع کر کے باقی رقم نئے صنعت کاروں کو دیتی تھی اب نئے صنعت کاروں کو ریاستی اور مرکزی حکومت کی پوری رقمیں ملیں گی مجھے امید ہے کہ ان ۱۷ پسماندہ اضلاع میں صنعتوں کو اچھی ترقی مل سکے گی۔ اس طرح ریاست کے مراٹھواڑہ اور ودربھ علاقوں میں نئے شکر کے کارخانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ممبران اور حکومت کے سرمایہ کے شیئرز (حصص) میں اب تک ۲:۱ کا جو تناسب رہا ہے اسے ۵:۱ کر دے۔ امید ہے کہ اس سے مراٹھواڑہ اور ودربھ جیسے زراعتی بنیاد والے پسماندہ صنعتی علاقوں کو کافی مدد ملے گی۔

یہ مسلسل تیسرا سال ہے جب کہ ریاست کے ایک بڑے حصے کو بھیانک خشک سالی کا سامنا ہے اس سے ہماری ریاست کے ۲۷ اضلاع میں واقع ... ۲۳۴۲ گاؤں بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔

حکومت نے ضرورت مندوں کو کام دینے، متاثر گاؤں میں پینے کا پانی پہونچانے اور جانوروں کو چارہ مہیا کرنے کی غرض سے ایک جامع منصوبہ بنایا ہے، اس زبردست خشک سالی سے نمٹنے کے لیے حکومت نے کئی اہم فیصلے کئے ہیں اور ان پر سختی کے ساتھ عمل بھی ہو رہا ہے۔ اگرچہ خشک سالی کی مدت کا ایک بہت بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے پھر بھی موسم گرما کے دو مہینے زیادہ شدید ثابت ہو سکتے ہیں میں نے ریاست کے عملاً تمام متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا ہے اور ان علاقے کے لوگوں کو اس ناگہانی آفت سے ہمت اور کشادہ دلی سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا ہے میں دلی طور پر ان لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اور ریاست کے تمام لوگ دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں اور بھرپور تعاون پیش کر رہے ہیں تاکہ متاثرہ لوگوں کی کمی میں مدد نہ ہونے پاوے حکومت عوام کے اس تعاون کی بے حد ممنون ہے۔

اس خیال سے کہ مستقبل میں ایسی خشک سالی پیش نہ آئے بلکہ "خشک سالی روک" اقدام کے طور پر حکومت نے بعض کم مدتی اور طویل مدتی اسکیموں کے بارے میں فیصلے کئے ہیں۔ حکومت کی شاندار ضمانت روزگار اسکیم کے تحت کسانوں کو بڑے پیمانے پر کام مہیا کیا جا رہا ہے روزگار مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ پیداواری کام انجام دینے پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔ جہاں مناسب سمجھا گیا پیداواری کام کے مقررہ قاعدے نرم کر دئے گئے تاکہ ضرورت مندوں کو کام مل سکے حکومت نے ضمانتِ روزگار اسکیم کے تحت ایک اہم فیصلہ یہ کیا ہے کہ خشک زمینوں پر باغبانی کرائے۔ اس سے قحط زدہ اور پہاڑی علاقوں میں چھوٹے اور حاشیہ پر واقع زمینوں کے کسانوں کو مالی طور پر استحکام حاصل ہو سکے گا اسی طرح ایک طویل مدتی قحط روک اقدام کے طور پر حکومت نے سماجی جنگل بانی کا ایک زبردست پروگرام جاری کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے اس پر عمل در آمد شروع ہو چکا ہے۔

اس بات کا دہرانا ضروری ہے کہ صنعتی اور معاشی ترقی کے لئے سماجی ہم آہنگی، قومی اتحاد و یکجہتی کو برقرار رکھنا بہت اہم ہے اگرچہ ہمارے ملک، نے مختلف ترقیاتی میدانوں میں بہت سے نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ ہمیں ان اندرونی اور بیرونی طاقتوں پر بھرپور توجہ رکھنی ہوگی جو ملک کے شیرازہ کو بکھیرنے کی درپے ہیں۔ ہمیں ایسی تمام طاقتوں سے ہوشیار رہنا ہوگا۔

ہمارا نصب العین ہے کہ ہم ہمہ جہت ترقی کریں اور تمام لوگوں کو انصاف دیں۔ آئیے اس مبارک موقع پر ہم سب مل کر اپنے ملک کو طاقت ور بنانے کا پختہ ارادہ اور عزم کریں۔

دوسرا تھانے کھاڑی پل

بمبئی نہ صرف مہاراشٹر کی راجدھانی ہے بلکہ بھارت کے تمام شہروں میں ممتاز بھی ہے۔ آزادی کے بعد یہاں ترقی کی رفتار میں بہت تیزی پیدا ہوئی ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں بمبئی کی آبادی محض ۱۵ لاکھ تھی جو اب بڑھکر ۸۲ لاکھ کے قریب ہو چکی ہے۔ اسی طرح موٹر گاڑیوں کی تعداد ۳۵۰۰۰ ہزار تھی جو اب ۴ لاکھ کے قریب ہو گئی ہے۔ بمبئی پورٹ کی سالانہ ٹریفک سنہ ۱۹۵۱ء میں ۸۷ لاکھ ٹن تھی جو تجاوز کرکے اب ۱۸۰ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر سہولتوں کی فراہمی کی بنیاد پر بمبئی ہندوستان کا اولین تجارتی مرکز بن گیا ہے۔

بمبئی کی جغرافیائی وجوہات کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبادی کے تحت پھیلاؤ کی گنجائش نہیں ہے جو ایک دشوار گذار مسئلے کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ آبادی زیادہ تر شمال کی جانب بڑھتی جا رہی ہے جبکہ تجارتی مراکز اور دفاتر اب بھی جنوبی علاقے میں ہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ٹریفک کا مسئلہ بھی سنگین ترین ہوتا جا رہا ہے۔

ان مسائل پر توجہ دیتے ہوئے ۱۹۵۰ء میں ایک ٹریفک اسٹڈی گروپ، بمبئی عظمیٰ کے ترقیاتی منصوبے کے لئے وضع کیا گیا۔ اس اسٹڈی گروپ کی سفارشات میں تھانے کھاڑی پر ایک پل کی تعمیر کی بھی سفارش شامل تھی تاکہ بمبئی کی آبادی کو مشرق کی جانب موڑا جا سکے اور شہر پر بڑھتے ہوئے ٹریفک کو روکا جا سکے۔

تھانے کھاڑی پل کی تعمیر سے قبل، بمبئی آگرہ روڈ۔ تھانے سے ہوتے ہوئے ٹریفک کو گزرنا پڑتا تھا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی ٹریفک کا دباؤ بھی تیزی سے بڑھتا گیا اور اسے دور کرنے کا واحد ذریعہ تھانے کھاڑی پل کی تعمیر تھا۔ اسی نظریے کے تحت سنہ ۱۹۶۰ء میں حکومتِ مہاراشٹر نے سائن ہنڈیل کراسنگ تک چار دھاریوں والی سڑک (LANE) پر مشتمل ۱۸۳۶ میٹر لمبا پل تعمیر کرنے کی تجویز رکھی گئی۔

موجودہ تھانے کھاڑی پل کی تعمیر کا کام سنہ ۱۹۶۳ء میں شروع کیا گیا اور سنہ ۱۹۷۳ء میں یہ پل ٹریفک کے لئے کھول دیا گیا۔

بمبئی سے پونے کی جانب جاتے ہوئے اس پل کی وجہ سے ۱۱ کلومیٹر کی دوری ٹریفک کے لئے کم ہو گئی اور واشی نیز تھانے بیلاپور صنعتی پٹی۔ نئی بمبئی تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگے۔

تیز رفتار ترقی کی بنا پر موجودہ پل خصوصاً مستقبل میں ٹریفک کے لئے ناکافی محسوس ہوتا ہوا نظر آیا۔ لہٰذا حکومت مہاراشٹر نے ۲۰۰۱ء میں سڑکوں کا جال بچھانے کے پروگرام کے مدِ نظر نیز نئی بمبئی، نہوا شیوا پورٹ، فرٹیلائزر کامپلیکس (واقع تھل) اور بمبئی میٹروپولیٹن ریجن کے لئے سنٹرل روڈز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سی۔ آر۔ آر۔ آئی) نئی دہلی کو ۱۹۷۸ء میں اپنا مشیر مقرر کیا۔

سی۔ آر۔ آر۔ آئی نے اپنی رپورٹ ۱۹۸۳ء میں پیش کی جس میں ٹریفک کے لئے چھ دھاریوں والی سڑک (LANE) والے پل کی تعمیر کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

حکومتِ مہاراشٹر نے فوراً اس تجویز کو مانتے ہوئے دوسرے تھانے کھاڑی پل کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ اس پل کی تعمیر سے موجودہ پل پر ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ ختم ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ تھانے کھاڑی پر ایک پل ریلوے کیلئے بھی منظور کیا گیا۔ ریل انڈیا ٹیکنیکل اینڈ اکنامکس سروس لمیٹڈ نئی دہلی (آر۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس) اس سلسلے میں ٹیکنیکو اکونومک

قوس راج

وزیرِ اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان، دوسرے تھانے کھاڑی پل کی ۳۰ رمارچ کو بھومی پوجا کرتے ہوئے۔
تصویر میں وزیرِ محصول شری ولاس راؤ دیشمکھ، وزیر برائے شہری ترقیات۔ ڈاکٹر دی سبرامنین اور وزیرِ مملکت برائے مراسلات شری اشوک پاٹل بھی نظر آرہے ہیں۔

ریلوے پل کی تعمیر کا تحقیقی کام سپرد کیا گیا۔
آر۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس۔ اے نے اپنی رپورٹ ۱۹۸۴ء میں پیش کی۔ اس رپورٹ پر بہت سنجیدگی سے غور کیا گیا اور ایک علیحدہ کھاڑی پر مجوزہ مانخورد۔ بیلاپور ریل لنک کے لیے تعمیر کیا جو کہ دوسرے تھانے کھاڑی پل سے ۱۳۰ کلومیٹر جنوب ہوگا۔

دوسرے تھانے کھاڑی پل پر لاگت کا تخمینہ ۸ء۴۰ کروڑ ہے جس کی انتظامی منظوری نومبر ۱۹۸۵ء میں حکومت نے دے دی تھی۔ جوڑنے والی سڑکوں کی تعمیر کا کام کا تخمینہ ۶۶ لاکھ روپے ہے تیز رفتاری سے جاری ہو چکا۔ تعمیر سے قبل ان سڑکوں کی تعمیر مکمل ہو جائے۔ واشی جوڑنے والی سڑک کی لمبائی ۷۰۰ میٹر اور بمبئی کی جانب والی سڑک کی لمبائی ۲۲۰ میٹر ہے۔ بمبئی کی جانب والی کی ڈیزائن۔ ہائی وے ریسرچ ڈویژن آف مہاراشٹرا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ناشک کے ذریعے تیار کی گئی ہے۔

سی۔ آر۔ آر۔ آئی کی سفارشات کے مطابق ۲۰۰۰ء تک موجودہ ٹریفک کے لیے چار دھاریوں والی سڑک دھاریوں والی سڑک بنانے کا کام مستقبل میں شروع کیا ان تمام کاموں پر لاگت کا تخمینہ ۱۰ کروڑ روپے ہے۔
جنوری ۱۹۸۶ء میں اس سلسلے میں پبلک ٹینڈر ان کی اپنی ڈیزائن کے ساتھ منگوائے گئے تھے۔ ۲۵ نے فارم خریدے تھے مگر محض گیارہ ٹھیکہ داروں نے سب سے کم ٹینڈر مسرز یو۔ پی اسٹیٹ برج کارپوریشن ۰۰۰ر۳۲۸۶۰ چنانچہ ۱۷ فروری ۱۹۸۷ء کو کام کی کا حکم دے دیا گیا۔ کام کی تکمیل کے لیے ۶۰ مہینوں کی مدت ہے۔

یہ پل چونکہ بے حد صنعتی کثافت سے معمور فضا میں ہوگا، اس کے علاوہ کھاڑی کی نمی بھی مدِ نظر ہے اس لیے اس میں خصوصی اقدامات کیے جائیں گے تاکہ موجودہ پل کی ماحولیاتی کثافت کا اثر پل پر نہ پڑنے پائے۔ اس لیے پل کو بنانے کے لیے اسٹرکچروں کی پائیداری کے لیے خصوصیات کو اہمیت دی جائے گی۔

۱) اقل ترین درجے کے (یعنی طاقت) کا نکریٹ میں اقل ترین سیمنٹ کنٹینٹ اور زیادہ

سیمنٹ کا تناسب۔

۲: سیلاش زون میں سیکریفیشل کور کے ساتھ کانکریٹ کے اندر اسٹیل کا علاحدہ غلاف مہیا کرنا۔

۳: نیو یا بنیاد کے لیے ہلکے فولادی غلاف مہیا کرنا۔

۴: سیلاش زون میں زمینی ڈھانچے اور نیو میں مخصوص سیمنٹ (سی۔۳۔اے کنٹینٹ) کا استعمال۔

۵: ہلکے اسٹرکچرل ممبرز کے استعمال پر پابندی۔

۶: استعمال کے لیے اشیا کا ذخیرہ رکھنے کی مدت میں زیادہ سے زیادہ کمی

۷: زنگ نہ لگنے کے لیے اینٹی کوروسیو اقدام۔

۸: ایپوکسی مارکوٹنگ کا استعمال۔ (ضمنی ڈھانچے کی بنیاد کے لیے)۔

۹: روغن پرلٹے سوپر سٹرکچر

۱۰: ڈیک سلیب اور وبیرنگ پر پیسٹ میمبرن کا استعمال۔

۱۱: ڈیک سلیب میں بجائے روایتی پری پریسڈ کانکریٹ سے پری پریسڈ کانکریٹ باکس سکیشن کا استعمال۔

۱۲: کانکریٹ تیار ہونے کے بعد اور سٹرنگ کرنے سے قبل ایم۔ ٹی اسٹیل سے پری اسٹریسنگ یونٹ فراہمی کی گنجائش۔

۱۳: بڑے جوڑوں (JOINTS) کی تعداد کم کرنے اور خصوصی جوڑوں کے لئے ماڈرا سٹاٹک اسٹرکچرل نصب کرنا۔

۱۴: پی ایس سی باکس گرانڈر میں ہائی ٹینسل اسٹیل اسٹرینڈ گراؤٹنگ کی گنجائش کے ساتھ۔

اس کی تعمیر ایگزیکیوٹیو انجینئر تھانے کریک برج ڈویژن نمبر ۲ جمہور بمبئی اور چیف انجینئر (اسپیشل پروجیکٹ)، پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ بمبئی کی مشترکہ نگرانی میں کیا جائے گا۔

یو۔پی اسٹیٹ برج کارپوریشن لمٹیڈ ڈیزائن کے بارے میں ایس۔ کی یو۔پی کنسلٹنٹ لمٹیڈ کے صلاح و مشورے سے کام کرے گی اور اس
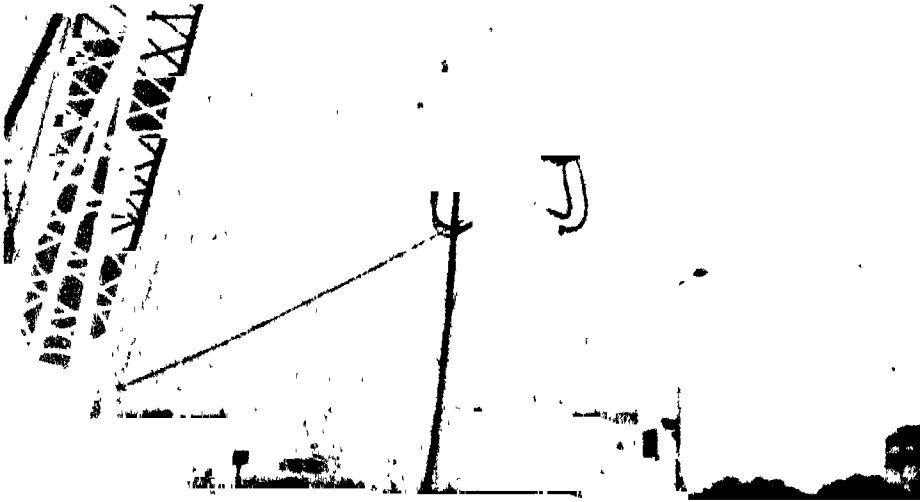
اے ۳۸۔سی قطر کیسنگ وبیرو ہمیرسے مٹی میں دباتے ہوئے۔

سروش یزدانی اطراپور ۴۴۴۳۰۱ براہ کا

امن چاہتے ہیں

ہم اس لیے امن چاہتے ہیں، زمیں شاداب و گل
ہم اس لیے امن چاہتے ہیں، فلک ضیا ریز و نغم
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، ہو ارتقا کی
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، زمیں ہو حد د کا

ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، کہ اور تزئین آب و گ
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، خوشی سے رقصاں زمیں کا
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، کہ شام دلکش ہو صبح نکہت
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، ہو رنگ و نکہت کا کیں ع

ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، زباں پر لا شگفت
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ جنگ جو کری
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ شر تیغ بر
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ تار بندگی نہ

ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، وقار غنچہ ہو خار و خ
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، وفا کی خوشبو ہو ہر
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، شعور و افکار ضو فشاں
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، عروج آدم کے پاسبا

ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ حسن اخلاق
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، زباں ادھر ہو
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ شر ہو
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ گاؤں بن جا

ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، ہماری دنیا میں جب
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، حیات گل پوش و خو
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، شعور و ادراک و
ہم اس لیئے امن چاہتے ہیں، نہ جہل افلاس سے

★

فلاپس کے ساتھ
کیبنگ اور شو
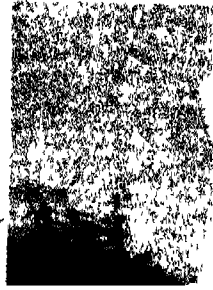
کا معائنہ سپرنٹنڈنگ انجینئر ڈیزائن سرکل (بریج) کریں گے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی صلاح کاروں سے بھی مشورے لئے جائیں گے۔
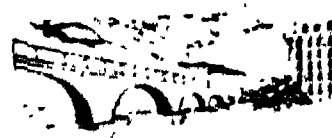
حکومت دوسرے تھانے کھاڑی پل کی ٹیکنیکل ضرورتوں کو پورا کرے گی

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے ۳۰ مارچ کو دوسرے تھانے کھاڑی پل کے ٹیکنیکل اسٹاف کو اس کے ذریعہ کئے جانے والے ٹیکنیکل کاموں کی بابت اپنے تمام تر تعاون کا یقین دلایا۔ شری چوان چھبورٹول ناکہ کے قریب دوسرے کھاڑی پل کی گڑھی پاڑوا کے دن بھومی پوجن کی رسم میں اپنے خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔
وزیر پبلک ورکس شری ویلاس راؤ دیشمکھ نے اس تقریب کی صدارت کی۔

شری چوان نے اس پل کے انجنیئرنگ اسٹاف سے ایسے نامساعد حالات میں پل کے مکمل کرنے کے لئے خود کو تیار کرنے کی اپیل کی۔ آپ نے فرمایا کہ ماضی کی غلطیوں کو اس پل کے کاموں میں دہرایا نہیں جائے گا۔
مجوزہ کام کا معائنہ وقت بہ وقت غیر ملکی ماہرین کے ذریعے کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ پل میں استعمال کئے جانے والی اشیاء کی کوالٹی کنٹرول کے تحت جانچ کی جائے گی۔

آپ نے ٹکنیکل اسٹاف کو کام پوری توجہ کے ساتھ کرنے کی تلقین کی۔ تھانے کھاڑی کے نئے دوسرے پل نے ممبئی میٹروپولیز اور مہاراشٹر کی خاص سڑک سے ایک بڑا رابطہ قائم ہو جائے گا اس پل کی تعمیر کا کام اترپردیش برج کارپوریشن لمیٹیڈ کے سپرد کیا گیا ہے جو کہ ۱۹۹۲ء میں مکمل ہو جائے گا۔

شری ویلاس راؤ دیشمکھ وزیر پبلک ورکس نے فرمایا کہ موجودہ پل کی مرمت شروع ہو چکی ہے اور کھاڑی کے نمک اور آلودگی کی وجہ سے اس کا مناسب تحفظ کیا جا رہا ہے۔
نئے پل میں آمدورفت کے چھ راستے ہوں گے اور دو فٹ چوڑا فٹ پاتھ ہوگا۔ پل تو بھی راج

میں استعمال ہونے والی اسٹیل کی بیرنگ کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ وزیر شہری ترقیات ڈاکٹر دی بسر املین، وزیر مملکت برائے پبلک ورکس شری اشرک پاٹل، وزیر مملکت برائے شہری ترقیات شری ویلاس ساونت بھی اس موقع پر موجود تھے۔

حکومت مہاراشٹر کے پی ڈبلیو ڈی کے چیف انجنیئر آر۔ بی بیڑے نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مینیجنگ ڈائرکٹر شری وجیندر سنگھ نے اس موقع پر حاضر ہونے والوں کا یوپی برج کارپوریشن لمیٹیڈ کی طرف سے استقبال کیا پی ڈبلیو ڈی کے سپرنٹنڈنٹ شری جی۔ کے دیشپانڈے نے شکریہ ادا کیا۔

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان اور موجودہ وزراء نے بعد ازاں موجودہ پل کی مرمت کے کاموں کا معائنہ کیا۔ اور حال ہی میں درآمد کی جانے والی مشینری کو بھی دیکھا۔

مہاراشٹر میں سڑکوں کے ترقیاتی کام

ولاس راؤ دیشمکھ
وزیر برائے محصول، کوآپریشن
رفاہِ عامہ اور ٹرانسپورٹ

اشوک پاٹل
وزیر مملکت برائے رفاہ عامہ و بہبودیٔ نوجوانان
اسپورٹس، ثقافتی امور اور سیاحت

ریاست مہاراشٹر کی تشکیل یکم مئی ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء تک اس کے چار علاقوں میں سے ودربھ اور مراٹھواڑہ بالترتیب مدھیہ پردیش اور حیدرآباد کے حصے تھے۔ اس وقت کا روڈ سسٹم اتنا بہتر نہ تھا۔ ریاست میں سڑکوں کی کل تعداد ۳۹۲۴۲ کلومیٹر تھی جس میں سے ۱۴۳۹۰ کلومیٹر سڑکیں کچی تھیں۔

ریاستی سڑکوں کے ترقیاتی منصوبہ جات

ریاست کے لئے بابت ۸۱-۱۹۶۱ء سڑکوں کے ترقیاتی منصوبے کے تحت ۱۱۳۶۸۲ کلومیٹر کا مختلف درجوں کی سڑکوں کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ اس نشانے کے برخلاف ریاست میں سڑکوں کی استعداد محض ۳۹۲۴۲ کلومیٹر یعنی منصوبہ کے ابتدا میں محض ۳۵ فیصد نشانہ موجود تھا۔ منصوبہ کے تحت ہر سنٹر اسکوائر میل پر سڑکوں کی بہتری کو ۲۶ سے ۵۲ میل تک لے جانا تھا۔

ٹریفک طریقہ کار میں تبدیلی کی بنا پر بڑے اور چھوٹے

آبپاشی اسکیموں کی تکمیل کے بعد ریاستی سڑک منصوبہ جات بابت ۸۱-۱۹۶۱ء پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں ریاستی حکومت نے ضمانت روزگار اسکیم۔ دیہی علاقوں کے بے کار نوجوانوں کے لئے خشک سالی کی بنا پر شروع کی۔ اس وقت قبائیلی ضمنی منصوبہ بھی جاری کیا گیا۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بابت ۸۱-۱۹۶۱ء پر ۱۹۷۶ء میں نظر ثانی کی گئی اور سڑک کی لمبائی کا نشانہ ۱۳۲۲۹۸ کلومیٹر تک بڑھا دیا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۸۱ء میں نشانوں اور کارہائے نمایاں کی تفصیل مندرجہ ذیل تفصیل نمبر ۱ میں دی گئی ہے۔ نظر ثانی

شدہ نشانہ کے مطابق [illegible] فیصد نشانہ کو پورا کر دیا گیا مگر پھر بھی روڈ سسٹم میں کئی خامیاں رہ گئی تھیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

سڑکوں کی درجہ بندی	یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو سڑکوں کا طول سطح بندی کردہ	غیر سطح بند	کل	۱۹۶۱-۸۱ء پلان کے مطابق اصل نشانہ	۱۹۶۱-۸۱ء نظر ثانی کردہ نشانہ	سڑکوں کا طول یکم اپریل سنہ ۱۹۷۰ء میں سطح بندی کردہ	غیر سطح بند	کل	فیصد تعمیر بمقابل نظر ثانی کردہ نشانہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
قومی شاہراہیں	۲,۳۱۲	..	۲,۳۱۲	۵,۰۰۷	۲,۹۵۶	۲,۹۴۵	...	۲,۹۴۵	۱۰۰
ریاستی شاہراہیں	۹,۰۲۶	۷۷۸	۹,۸۰۴	۱۳,۴۶۸	۲۰,۳۷۴	۱۸,۱۰۷	۸۴۲	۱۸,۹۴۹	۹۳
بڑے ضلعی راستے	۸,۲۲۶	۲,۸۳۰	۱۱,۰۵۸	۲۷,۴۲۶	۲۹,۰۲۴	۱۸,۵۲۸	۶,۷۰۵	۲۵,۲۳۳	۸۷
دیگر ضلعی راستے	۳,۳۸۱	۳,۵۷۳	۶,۹۵۴	۳۲,۶۸۱	۳۵,۷۱۴	۱۱,۲۰۹	۱۴,۰۹۵	۲۵,۴۰۴	۷۱
دیہی شاہراہیں	۱,۹۰۵	۷,۲۰۹	۹,۱۱۴	۲۵,۱۰۰	۴۴,۲۳۰	۹,۰۷۳	۱۹,۰۳۲	۲۸,۱۰۵	۶۴
جملہ	۲۴,۸۵۲	۱۴,۳۹۰	۳۹,۲۴۲	۱,۱۳,۶۸۲	۱,۳۲,۲۹۸	۵۹,۹۶۲	۴۰,۶۷۴	۱,۰۰,۶۳۶	۷۶
غیر جوڑے ہوئے	..	..	-	-	..	۶,۶۵۴	۲۳,۸۴۱	۴۰,۴۹۵	..
میزان کل	..	..	..	..	۱,۳۲,۲۹۸	۶۶,۶۱۶	۶۴,۵۱۵	۱,۴۱,۱۳۱	..

گوشوارہ نمبر ۲

شاہراہوں کی درجہ بندی	۱۹۸۱-۲۰۰۱ کے مطابق نشانہ (کلومیٹر)	جس حد تک طویل شاہراہوں پر عمل ہو چکا ہے (کلومیٹر)	فیصد عمل آوری
قومی شاہراہیں	۳,۰۲۴	۲,۹۴۱	۹۷
بڑی ریاستی شاہراہیں	۴,۵۹۹	۴,۴۲۶	۹۶
ریاستی شاہراہیں	۲۸,۲۸۲	۲۶,۳۰۳	۹۳
بڑے ضلعی راستے	۴۴,۰۴۷	۳۶,۳۰۴	۸۲
دیگر ضلعی راستے	۵۰,۷۹۴	۳۳,۶۰۹	۶۶
دیہی شاہراہیں	۷۶,۶۰۲	۴۸,۷۱۳	۶۴
جملہ	۲,۰۷,۳۴۸	۱,۵۲,۲۹۶	۷۳

قومی لاج

۲۰۰۱-۱۹۸۱ء سڑک منصوبہ

سڑکوں پر ٹریفک تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہتر روڈ ٹرانسپورٹ کی توقعات بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ مواضع جات کو سڑکوں سے جوڑنے کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لہذا روڈ ٹرانسپورٹ میں مزید بہتری کی ضرورت پائی جاتی ہے تاکہ ملک کی ترقی کا دھارا رسائی سے بڑھتا رہے۔ ان باتوں کے مدِنظر قومی سطح پر ایک ماسٹر پلان برائے ترقی سڑک بابت ۲۰۰۱-۱۹۸۱ء تشکیل دیا گیا۔ قومی خطوط کو پیش نظر رکھتے ہوئے سڑک ترقیاتی منصوبہ میں ریاست مہاراشٹر کے لئے ۱.۲ لاکھ کلو میٹر (تقریباً) کا نشانہ رکھا گیا۔ یہ ایسے غیر منصوبہ جاتی سڑکوں سے الگ ہے جو کہ ان ۲۰ سالوں میں ضرورت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ اس منصوبہ کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہر گاؤں میں کم از کم ایک میل سڑک تعمیر کی جائے جس میں آبادی وغیرہ کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں حاصل کردہ نشانہ یکم اپریل ۱۹۸۶ء تک ٹیبل نمبر ۲ میں درج ہے۔

مذکورہ اعداد و شمار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حالات اطمینان بخش ہیں لیکن کئی روڈ ایسے ہیں جو کئی اعتبار سے خامیوں سے بھرے ہیں جن میں سی۔ ڈی کے کام بڑے اور چھوٹے پلوں کے کام بھی شامل ہیں۔ ان تمام سڑکوں کو مرمت اور ٹھیک کرنے کے لئے تقریباً ۷۰۰۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہے۔

سڑکوں کے ترقیاتی کاموں پر صرفہ میں تیسرے پنج سالہ منصوبہ سے اضافہ ہوا ہے۔ مگر ریاست کے دیگر اہم کاموں اور پروگراموں کو فوقیت دیتے ہوئے سڑکوں کے کاموں کا فیصد فی صد منصوبے میں کم کر دیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ ٹیبل نمبر ۳ سے ہوگا۔

ریاست مہاراشٹر میں چھٹے پنج سالہ منصوبے میں سڑک کے ترقیاتی کاموں پر ۳۲۴.۰۰ کروڑ اور ساتویں پنج سالہ منصوبے میں ۵۰۰.۰۰ کروڑ روپے مختص کئے ہیں۔ جن میں سے ۱۵۰.۰۰ کروڑ روپے علاقائی سڑکوں کی پسماندگی کو دور کرنے پر لگائے جائیں گے اور ۵۰.۰۰ کروڑ روپے بمبئی میٹرو پولیٹن ریجن ایریا کے سڑک پروجیکٹوں کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔

ریاست میں دیہی راستے

۱۹۷۸ء میں ایک پرشور دیہی راستہ کا پروگرام شروع کیا گیا تھا تاکہ ان دیہاتوں کو جہاں کی آبادی ۱۰۰۰ سے اوپر ہے، پختہ راستے مہیا ہوں۔ بعد میں یہ اسکیم اقل ترین ضروری پروگرام کے تحت دیہاتوں کو جوڑنے کے پروگراموں کے ساتھ ایک جزو بن گئی۔ ۱۹۶۱ء میں ۳۶۱۶۱ دیہاتوں میں سے ۸۶۹۱ دیہات کو کسی راستہ سے (۲۴ فیصد) جوڑ دئے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۸۱ء تک اس حالت کی بڑی حد تک اصلاح ہو گئی۔ ۳۶۰۳۳ دیہات میں سے ۲۸۶۲۹ (۷۹ فیصد) جوڑے جا چکے تھے۔

ضمانت روزگار اسکیم نے بھی جس کی ابتدا حکومت نے ۱۹۷۲ء میں کی تھی، مناسب آبادی والے دیہاتوں کو، دیہاتی راستوں کے پھیلاؤ کے ساتھ جوڑنے میں بڑی مدد دی۔ تقریباً ۴۰۲.۵۰ کروڑ ضمانت روزگار اسکیم کے تحت راستوں کے سلسلے میں خرچ کئے جا چکے ہیں۔

سکاؤ پروگرام (پیدل راہداری کے پل)

چھٹے پنج سالہ پلان کے بعد اس ریاست نے ایک خاص پروگرام اگرچہ وہ کسی قدر مختصر بنیاد پر ہے، ریاست کے پہاڑی حلقوں میں تعمیر کرنے کا شروع کیا ہے۔ خاص طور سے کوکن کے ضلعوں میں آمد و رفت کا مسئلہ ایک خاص صورت اختیار کئے ہوئے ہے کہ ان حلقوں میں اگرچہ چھوٹی چھوٹی ندیاں، کھاڑیاں اور نالے ہیں لیکن وہ کافی گہرے ہیں۔ اس خیال سے کہ پیدل چلنے والے نیز بیل گاڑیوں کے لئے ہر موسم میں آنے جانے کی سہولت رہے، پیدل راہداری کے راستے بنائے گئے ہیں۔

چھٹے پنجسالہ پلان میں تقریباً ۵۰۰ ایسے "سکاؤ" بنائے گئے تھے جن پر ۲۵.۷ کروڑ روپے کی لاگت آئی تھی۔ ساتویں پنجسالہ پلان میں اس پروگرام کے لئے ۸ کروڑ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے راہداری کے راستوں کے لئے زبردست مانگ ہے لیکن چونکہ صرف کوکن میں ۱۰۰۰ ایسے سکاؤ بنانے کی ضرورت ہے، اس لئے مالی دشواریوں کی بنا پر اس میں زیادہ پیش رفت ممکن نہ ہو سکی۔

قومی

گوشوارہ نمبر ۳

سال	منصوبہ	اخراجات		فیصد
		ریاستی اسکیموں پر	شاہراہوں کی ترقی پر	
		(روپے کروڑوں میں)		
۱۹۶۱-ء تا ۱۹۶۵-۶۶ء	تیسرا پنجسالہ منصوبہ (پلان)	۴,۲۱٫۱۶	۲۹٫۵۹	۷٫۰۳
۱۹۶۶-ء تا ۱۹۶۸-۶۹ء	تین سالانہ پلان	۳,۸۰٫۶۴	۲۷٫۵۷	۷٫۲۴
۱۹۶۹-ء تا ۱۹۷۳-۷۴ء	چوتھا سالانہ منصوبہ	۹,۱۶٫۲۶	۵۱٫۴۹	۵٫۶۲
۱۹۷۴-ء تا ۱۹۷۹-۸۰ء	پانچواں سالانہ منصوبہ	۲۸,۴۸٫۲۸	۱,۲۹٫۹۰	۴٫۵۸
۱۹۸۰-ء تا ۱۹۸۴-۸۵ء	چھٹا سالانہ منصوبہ	۶۱,۷۵٫۰۰	۲,۵۰٫۰۰	۴٫۰۴

ہریجن بستیوں کے ساتھ جوڑے جانیوالے "لنک روڈ"

یہ ایک قابلِ ذکر پروگرام ہے جو دیہاتوں کے پسماندہ حلقوں کے
ے کے لئے ہے۔ اس پروگرام کے تحت ہریجن بستیوں
بڑے راستوں سے جوڑے جانے کا خاص انتظام کیا گیا ہے
سر دست یہ پروگرام ۱۰۰۰ سے اوپر آبادی والے گاؤں کے لئے
میں لایا گیا ہے۔ اب تک ۵۸۷۷ ہریجن بستیوں میں سے ۲۰۲۰
ستیاں جوڑی جا چکی ہیں۔

خاص میٹروپولیٹن علاقے

چند برسوں کے اندر بمبئی دنیا کے بہت بڑے شہروں میں سے
ک شہر بن چکا ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق بمبئی کی
دی ۸۲٫۳۷ لاکھ ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ بمبئی کی شہری
دی جو ۱۹۸۱ء میں ۱۰۱ لاکھ تھی سنہ ۲۰۰۱ء کے شروع ہوتے ہوتے
۱ لاکھ سے زیادہ ہو جائے گی۔ صرف گاڑیوں کی آمد و رفت ہر دست
ر لاکھ ہے اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس بات کے امکانات
با کر ٹرافک ۹ تا ۱۰ لاکھ ہو جائے گی۔ سینٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
نے راستوں کا ایک جال بچھا دینے کے سلسلے میں ایک بڑا "تشہیر مہم"
ال کا انتظام کیا تھا تاکہ سنہ ۲۰۰۰ء کے شروع ہوتے ہوتے بمبئی

میٹروپولیٹن علاقہ کے لئے ضروریات کے مطابق راستے تیار
ہو جائیں۔ اس سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ایک ماسٹر
پلان تیار کیا ہے جو آزاد راستوں، ایکسپریس شاہراہوں اور
دوسرے بڑے راستوں پر مشتمل ہوتی اور جو ساحلی راستوں
سے جوڑنے والے راستوں کے آس پار لے جا سکے۔ اس پر
خرچ کا اندازہ ۵۰۰ کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔ ساتویں پلان کے
دوران صرف ۵۰ کروڑ روپے کا انتظام کیا جا سکا تھا اور وہ بھی
بعض ایسے ضروری کاموں کے لئے جن کا تعلق مغربی جزیرے کے
آزاد راستے سے، ایکسپریس شاہراہوں کو ترقی دینے سے،
دوسرا ہتھانے کریک پل بنانے سے اور سیورڑی نہوا شیوا
لنک (جوڑنے) سے تھا اور اس سلسلے میں اسی رقم سے بندوبست
کیا جا رہا ہے۔

قومی شاہراہیں

ریاست مہاراشٹر سے گزرنے والی ۹ قومی شاہراہیں ہیں،
جن کا طول ۲۹۴۱ کلومیٹر ہے۔ اس میں سے ۱۸۸ کلومیٹر میونسپل
حدود میں واقع ہیں۔ سب سے بڑی قابلِ ذکر شاہراہ بمبئی
آگرہ روڈ یعنی قومی شاہراہ نمبر ۳ ہے۔ اس کے بعد بمبئی پونے،
بنگلور روڈ، قومی شاہراہ نمبر ۴، اور مغربی مہاڈ پناجی روڈ قومی
شاہراہ نمبر ۱۷ ہیں۔ ان میں سے اکثر شاہراہیں وسیع کی جا چکی ہیں۔

ی راج

اس محکمہ نے جن قومی شاہراہوں پر کام کیا ہے ان میں سے بعض قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔ کاروا اور کینٹری بل، پونے شہر سے باہر مغربی سمت نکاسی، نچلے بور گھاٹ وغیرہ میں قطار بندی۔

حکومت ہند نے نمبر ۱۷ (بی) نہوا اشیوا پورٹ کامپلیکس کو قومی شاہراہ نمبر ۴ سے جوڑنے کے لئے ۱۲ کلومیٹر کی گلی کا اعلان ضلع رائے گڑھ میں بطور ایک نئی قومی شاہراہ کے کیا ہے تاکہ نہوا اشیوا پورٹ کو ترقی دینے کے سلسلے میں اس سے ٹرانک کی ضروریات میں کام لیا جا سکے۔

دوسرے پروگرام

آبپاشی کے پروجیکٹوں تک لے جانے والے راستوں کے سلسلے میں ریاست نے ورلڈ بینک سے اور انٹرنیشنل ڈولپمنٹ ایسوسی ایشن کی مدد سے ان راستوں کو ترقی دینے کی تجویز پر عمل آوری شروع کی ہے۔ ان پروجیکٹوں کے ذریعے جائیک واڑی، پیرنا، بھیما، کرشنا، وارنا، کوکرڈی بالائی پین گنگا، بالائی وردھا، اور مولا اور گرنا آبپاشی کے پروجیکٹ کو جدید روپ دینا مقصود ہے۔

یہ محکمہ صنعتی ترقی کے سلسلے میں راستوں/پلوں کی کام کر رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت سیمنٹ کارخانوں فائدے کے لئے چندرا پور اور گڑھ چرولی ضلعوں میں کام کیا جا چکا ہے۔ ضلع رائے گڑھ میں تھل وائی شیٹھ پروجکٹ اور ناگوٹھانے کے پیٹرو کیمیکلس کامپلیکس سلسلے میں بھی کام پر عمل آوری جاری ہے۔ چھٹے پلان پروگرام پر ۵۴ء ۷ کروڑ کی لاگت آئی تھی۔ ساتویں پنج سالہ کے دوران محکمۂ صنعت کے منصوبہ بند اسکیموں میں اس پروگرام کے لئے ۸۰ء ۱۰ کروڑ روپے مہیا کئے گئے۔

گوشوارہ نمبر ۴

(۳۰ ستمبر ۱۹۸۰ء تک پوزیشن)

درجہ آبادی	مجموعی تعداد دیہاتوں کی	[illegible]	کل موسمی راستوں سے جوڑے گئے	غیر موسمی راستوں سے جوڑے گئے	غیر جوڑے گئے دیہات	فیصد کل جوڑے موسمی را
۱۵۰۰ سے زائد	۶,۱۸۱	۶,۱۱۰	۵,۴۶۸	۶۳۴	۷۹	۸۸
۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰	۵,۱۴۳	۲,۵۷۲	۳,۶۹۶	۱,۱۴۰	۳۰۷	۷۲
جملہ	۱۱,۳۲۴	۸,۷۵۳	۹,۱۶۴	۱,۷۷۴	۳۸۶	۸۱

بمبئی کرشی اپتن بازار سمیتی و امداد باہمی بمبئی

بمبئی کرشی اُتپن بازار سمیتی کا قیام حکومتِ مہاراشٹر کے محکمۂ زراعت و امداد کے مکتوب بابت اے پی ایم/ ۱۳۶۶ — ۳۸۷۶۱۵/۱۱۹ مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کی تجویز کے تحت عمل میں آیا۔

بازاروں کے علاقوں میں کھیتی کی اور دیگر پیداواروں کی خرید و فروخت اور بازاروں کو منظم و منضبط کرنا اور ایسے بازاروں سے متعلق قائم کی جانے والی یا ایسے بازاروں سے متعلقہ سمیتیوں کو قوت عطا کرنا، بازار سمیتیوں کی ضرورت کے لئے اقدامات کرنا، بازار سمیتی کے خاص مقاصد ہیں ؛

صدر بازار اور ضمنی بازاروں کے حلقہ جات

بمبئی کرشی اتپن بازار سمیتی کا قیام ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کی تجویز کے مطابق عمل میں آیا تھا۔ سمیتی کے حلقہ اثر میں بمبئی عظمیٰ میونسپل [illegible] کا علاقہ اور تھانہ ضلع کا ٹرامبے گاؤں ہی شامل تھے۔ حکومت مہاراشٹر کے پونہ کے متعلقہ ڈائرکٹر کی جانب سے [illegible] ملنے والی ہدایتوں کے مطابق صدر بازار کا احاطہ اور بمبئی عظمیٰ کے ضمنی بازاروں کے احاطے ان کے ناموں کے سامنے درج کیے [illegible] کے لئے اعلان کیے گئے ہیں :

ر	بازار کا حلقہ	قانون کے نفاذ کی تاریخ	مخصوص کردہ کھیتی کے مال کی تقسیم	بازار کس کی ملکیت ہے
	صدر بازار کا حلقہ ٹرامبے	یکم مارچ ۱۹۷۷ء	پیاز ۔ آلو	بازار سمیتی
	ہاتمبے چلے مارکیٹ	یکم اپریل ۱۹۷۷ء	سنترہ ۔ موسمبی	میونسپل بازار
	لیٹن روڈ بمبئی	یکم مارچ ۱۹۷۷ء	آم	کارپوریشن
	سنت گاڈگے مہاراج مارکیٹ	یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء	تمام پھل	" "
		یکم اپریل ۱۹۷۷ء	سنترہ ، موسمبی	" "
		یکم مارچ ۱۹۷۷ء	آم	" "
	سنت ساوتا مارکیٹ بائیکلہ بمبئی	یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء	تمام پھل	" "
		یکم نومبر ۱۹۸۰ء	سبزیاں	" "
	مہر مارکیٹ بائیکلہ	یکم نومبر ۱۹۸۰ء	سبزیاں	" "
	کرافورڈ [illegible] ناناپاٹل مارکیٹ دادر بمبئی	۸ر نومبر ۱۹۸۰ء	سبزیاں	نجی بمبئی میونسپل کارپوریشن

صدر بازار اور ضمنی بازاروں کا احاطہ

صدر بازار کے احاطہ میں پیاز اور آلو کی کھیتی کی اِن فصلوں کا تھوک بیوپار ہوتا ہے۔ اس بازار کا احاطہ ۲ ۹ ۷، ہیکٹر کے قطعہ اراضی پر محیط ہے۔ اس میں آلو اور پیاز کی تھوک خرید و فروخت کی تمام تر سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ بازار کے احاطے میں ۲۳۸ گالے ہیں۔ ہر گالے کا رقبہ ۶۵۰ مربع فٹ ہے۔ بازار کے اس احاطے میں ۷ بلاکس ہیں اور ہر بلاک میں ۲۴ سے ۴۴ گالے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ہر بلاک میں صفائی گھر، چائے خانہ، پینے کے لئے ٹھنڈے پانی کا انتظام اور سیکیوریٹی وغیرہ کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ کام کرنے والوں کی سہولت کے لئے ''دے برتج'' دوبنک پوسٹ آفس، پولس چوکی، گوشت اور سبزی کے علاوہ ہوٹل، دواخانہ، کسانوں کے لئے ''دارالاقامہ''، مہمان خانہ، کانفرنس ہال، کمیونٹی ہال وغیرہ کا انتظام ہے۔ اسی طرح بازار کے احاطے میں تقریباً ۲۵۲۰ مربع میٹر کا ایک بڑا نیلام گھر ہے جس کی گنجائش ۵۰، میٹرک ٹن ہے۔ صدر بازار میں لائسنس ہولڈروں کی تعداد ۳۰ ستمبر ۸۶ء کے اواخر تک ۲۱۱۵ تھی۔

دوسرے درجہ کے بازاروں کے احاطے

(۱) **مہاتما پھلے مارکیٹ:** اس مارکیٹ کی عمارت بمبئی عظمیٰ میونسپل کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ یہ عمارت تقریباً ایک سو پندرہ سال قبل تعمیر کردہ ہے۔ اس مارکیٹ میں موز کے علاوہ تمام پھلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس مارکیٹ کی ناکافی جگہ اور بدانتظامی کے سبب کھیتی کے مال کی خرید و فروخت کا انتظام معقول طور پر نہیں کیا جا سکتا ہے لہذا کھیتی کے مال کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوتا ہے فی الحال مذکورہ بازار کے احاطے میں بازار سمیتی کی جانب سے پینے کے پانی کا انتظام، صفائی گھر، حفاظتی بندوبست ناپ تول وغیرہ کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس مارکیٹ میں انگور اور آم بڑے پیمانے پر آتے ہیں۔

(۲) سنت گاڈگے مہاراج، سنت ساؤتا اور پھلے مارکیٹ بائیکلہ

بائیکلہ میں واقع سنت گاڈگے مہاراج مارکیٹ میں خصوصاً پھلوں کی خرید و فروخت کا تھوک بیوپار ہوتا ہے۔ سنت ساؤتا منڈی میں سبزیوں کی خرید و فروخت کی تھوک تجارت ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں مارکیٹس بمبئی عظمیٰ میونسپل کارپوریشن کی ملکیت ہیں۔ لیکن بھائیکلہ کی ا[illegible] مارکیٹ بھی ملکیت ہے۔ یہاں بھی سبزیوں کی تھوک خرید و فروخت ہوتی ہے۔ تینوں ہی بازاروں کی جگہ ناکافی ہونے کے سبب معقول انتظامات میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً یہاں جاکر تاجروں ا[illegible] دیگر کرایہ داروں سے بات چیت کرکے ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان مارکیٹوں میں فی الحال پینے کے پانی کا انتظام کھیتی کا مال لانے والی لاریوں کو کھڑا کرنے کا انتظام، چوکیدار وغیرہ کی سہولیات بازار کمیٹی نے فراہم کی ہیں۔ مذکورہ تینوں مارکیٹوں میں لائسنس ہولڈروں کی تعداد ۳۰ ستمبر [illegible] اواخر تک ۱۳۴۰ تھی۔

۳۔ کرانتی سنگھ نانا پاٹل مارکیٹ (اِلبا زا مارکیٹ)

یہ مارکیٹ بمبئی عظمیٰ میونسپل کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ سبزیوں کی تھوک خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یہاں کے سلسلہ کرایہ داروں (لائسنس ہولڈر) کی تعداد ۳۰ ستمبر ۸۶ء تک ۱۰۶۶ ہے۔ اس مارکیٹ میں کھیتی کا مال رکھنے کے سمیتی نے دو بڑے شیڈس تعمیر کئے ہیں۔ اسی طرح پانی کا انتظام، صفائی گھر اور حفاظتی انتظامات کی سہولیات کی گئی ہیں۔

مال بیچنے کا طریقہ: بڑا سے کے صدر بازار کے احا[طے میں] آلو کی متعینہ پیداواروں کی خرید کی تھوک تجارت ہوتی ہے۔ یہ بیوپار متعلقہ آڑھت کی دکان نیلام گھر میں ہوتا ہے۔ نو منتخب شدہ سمیتی کے اختیارات سے قبل ''عام نیلامی'' کا طریقہ اپنایا نہیں جاتا تھا۔ خرید و فروخت کے اشاروں'' کے طریقے سے ہوتی تھی۔ اس غیر اصولی طریقہ کو ختم کرنے کے لئے سمیتی نے بے حد کوشش کی اور صدر بازار میں برسہا برس سے مروج اس غیر قانونی طریقہ کا قلع قمع فی الحال اس بازار کے احاطے میں ''عام نیلامی کا طریقہ''

پھلوں اور سبزیوں کا بیوپار ممبئی عظمیٰ میں پہلے ہی سے میونسپل کارپوریشن اور نجی ملکیت کے بازاروں میں ہوتا ہے۔ پیاز اور آلو بوریوں میں بھر کر آتے ہیں جب کہ سنترہ، موسمبی، آم اور دیگر پھل پیٹیوں، ٹوکریوں، گونیوں یا ٹرک میں بھر کر بغرض فروخت لایا جاتا ہے۔ اسی طرح سبزیوں، ترکاریوں کو بھی بیگ، بائگ، کرانڈی، گونی یا ٹرک میں لاد کر لایا جاتا ہے۔ مال فروخت ہو جانے کے بعد اس کی سودا چیٹھی تیار کر کے اس کی ناپ تول اور بھاؤ تاؤ کا اندراج تسلیم شدہ ناپ تول کرنے والے "کاٹا پٹی" (ناپ تول اندراج رجسٹر) میں کرتے ہیں۔ کاٹا پٹی کے مطابق بل تیار کئے جاتے ہیں اور اس بل کی رقم مالک کو یا کسان کو آڑھت دار کے معرفت ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر ادا کر دی جاتی ہے۔

انتخاب: ممبئی کرشی اتپن بازار سمیتی کا قیام عمل میں آنے کے بعد سرکار کے نامزد کردہ ۲۸ ممبران کی سمیتی ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو قائم ہوئی تھی۔ اس سمیتی کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد ۸ مارچ ۱۹۸۴ء سے حکومت نے بازار سمیتی پر ایڈمنسٹریٹر کا تقرر ۲۵ مارچ ۱۹۸۶ء تک کے لئے کیا تھا۔ درمیان ہی میں مہاراشٹر کرشی اتپن خرید و بکری قانون بابت ۱۹۶۳ء، اور ۱۹۶۷ء میں مناسب اصلاح و ترمیم کر کے انتخابات کا قانون جاری کیا گیا اور پہلی ہی مرتبہ انتخاب کروا کے بازار سمیتی کے لئے نو منتخب شدہ اراکین کی سمیتی ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ء سے عمل میں لائی گئی۔

ممبئی کے بازاروں کی مخصوص حالت کے پیش نظر مہاراشٹر بھر کی تمام سمیتیوں کو اس بازار سمیتی میں نمائندگی حاصل ہونے کی غرض سے سمیتی کے ڈھانچے میں تبدیلی کر کے ہر محصول علاقہ سے دو کسان منتخب کئے گئے ہیں۔ سمیتی میں کل ۱۹۔ اراکین ہیں اور ان اراکین میں سے شری وجے راؤ بلور راؤ کے کو سبھاپتی کے عہدہ کے لئے بالاتفاق رائے منتخب کیا گیا ہے۔

۴۔ منتخب شدہ سمیتی کی اصلاحات

ممبئی کرشی اتپن بازار سمیتی ۲۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو عمل میں آتے ہی قلیل عرصہ میں سمیتی نے فوری فیصلے کر کے تمام کاج میں نمایاں اصلاحات کی ہیں جن کی مختصر معلومات حسب ذیل ہیں:

۱۔ صدر بازار کے احاطہ میں "عام نیلامی طریقہ" رائج کیا گیا۔

۲۔ کھیتی کی پیداوار اور مال کا وزن ٹھیک اور صحیح ہونے کے لئے ایک ۶۰ ٹن کا نیا وزن کانٹا نصب کیا گیا ہے اور ۲۰ ٹن والا نیا وزن کانٹا بھی درست کر کے نصب کیا جا رہا ہے۔

۳۔ ستمبر ۱۹۸۵ء کے اواخر تک صدر بازار کے احاطہ میں واقع ۲۴۸ گالوں میں سے صرف ۸۰ اگالے فروخت ہوئے تھے۔ گالوں کی فروخت کم ہونے کے اسباب تلاش کر کے خامیوں کو دور کر کے منتخب شدہ سمیتی مزید گالوں کو فروخت کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کر رہی ہے۔

۴۔ ہیڈ آفس میں ٹیلکس نصب کر کے بازار کی قیمتوں سے بھارت کے صدر بازاروں کو مطلع کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

۵۔ کرانتی سنگھ نانا پاٹل منڈی دادر میں بانس کی چھت کے نیچے تھوک بیوپار چلتا تھا۔ بانس کی چھت خستہ ہونے سبب اس کی بار بار مرمت کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہاں کے بیوپاری، خریدار اور دیگر افراد دھوپ ہوا، اور بارش سے پریشان ہوتے تھے۔ ان کی جائز تکالیف اور پریشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے نئی منتخب شدہ سمیتی نے فوری فیصلہ کیا اور دائمی طرز کی شیڈ تعمیر کرنے کی منظوری دی ہے اور شیڈ کی تعمیر کا کام تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔

۶۔ حفاظتی انتظامات کی دشواریوں کو جان کر حکومت مہاراشٹر نے نئی اصلاحات کے ذریعہ مکمل طور پر حفاظتی انتظامات کی سہولیات صدر بازار ٹرامبے کے احاطہ میں بہم پہنچائی ہیں۔

۷۔ ممبئی عظمیٰ کے تمام چھوٹے بازاروں میں مطالبات پر غور و خوض کر کے پینے کے پانی کا انتظام، صفائی ستھرائی، معقول طور پر وزن اور ترازو کا انتظام، مختلف اقسام کی ضروری تعمیرات، دفتری اصلاح، موٹر گاڑیوں کی مناسب درستگی، ٹرافک جام مسئلہ کا حل، مناسب تعداد میں چوکیداروں کا تقرر، حساب کتاب کے محکمہ کے لئے ضروری کمپیوٹر و دیگر سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔

۸۔ دورِ جدید کے تقاضہ کے پیش نظر کام کو جلد از جلد ختم کرنے کی غرض سے صدر دفتر میں ضروری مشینیں نصب کی گئی ہیں۔

۹۔ واشی اور بمبئی کے درمیان اہم کاموں کے لئے فوری رابطہ کی خاطر اور منترالیہ میں اہم ترین کاموں کے لئے فوری نپٹانے کی غرض سے ہاٹ لائن کی تنصیب کے لئے ضروری کارروائی جاری ہے۔

۱۰۔ کسانوں کے اقامت خانوں میں پہلے کرایہ پانچ روپے تھا جس کو گھٹاکر صرف ایک روپیہ کردیا گیا ہے۔

۱۱۔ کسانوں کی اقامت گاہ اور مہمان خانوں میں تمام ضروری سہولیات موجود ہیں۔

۱۲۔ دفتری کام کاج تیز رفتاری سے نپٹانے کے نظریہ سے نمایاں اصلاحات کرکے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دی گئی ہیں۔ ان میں افسران اور ملازمین کی نشستوں کے انتظامات، دفتر کی سجاوٹ، ویٹنگ روم اور ریسٹ روم، ویسے ہی ٹائپنگ کے لئے علاحدہ انتظام کے لئے خرچ کی منظوری دے کر اس کے مطابق فوری کارروائی کی جارہی ہے۔

۱۳۔ <u>ٹرک ٹرمینس</u>، بمبئی منڈی میں واقع کھیتی کے مال کے متحرک مارکیٹ ٹرانسپورٹ کے ٹرک کو ہی نئی بمبئی میں لے جانے کی غرض سے وہاں مناسب انتظامات کئے جارہے ہیں۔ پہلے قدم کے طور پر ۸ ہیکٹر کے قطعۂ آراضی پر ایک ٹرک ٹرمینس تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں آفس، بلڈنگ، ہوٹل، گرڈ اون، لاجنگ بورڈنگ، دو پٹرول پمپ، دو ترازو، گیریج، گاڑیاں دھونے کی جگہ۔ اور ٹرک کھڑا کرنے کی جگہ اور دیگر سہولیات مہیا کی گئی ہیں۔

۱۴۔ حکومت کے درخت لگاؤ پروگرام کے تحت اسی قسم کی مہم شروع کرکے درختوں میں بہت زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۵۔ میفکو مارکیٹ کا کچھ حصہ بازار سمیتی کی طرف ہے اس کے کرایہ کے بارگراں سے چھٹکارا پانے کے لئے میفکو کو مارکیٹ واپس کرنے کا فیصلہ سمیتی نے کیا ہے۔

۱۶۔ متحرک بازار کی ترقی کے دوسرے دور میں مارکیٹ ۱۔ کے سامنے ۹۸ء۲۲ کروڑ روپیوں کا پروجیکٹ منظور کیا جا چکا ہے۔
سمیتی کو قرض دیئے گئے بینکوں سے تقریباً ۵ء۱۲ کروڑ روپے جاری سال میں منظور ہوئے ہیں۔

معاشی حالت

۸۵-۱۹۸۴ء اور ۸۶-۱۹۸۵ء ان دونوں برسوں کی معاشی حالت کا تقابلی جائزہ حسب ذیل ہے

نمبر شمار	تفصیلات	۸۵-۱۹۸۴ء	۸۶-۱۹۸۵ء
الف	آمدنی		
(۱)	بازار فیس	۱،۵۱،۸۱،۰۵۰ء۲۶	۱،۹۳،۰۹،۷۰۲ء۰۷
(۲)	دیگر	۲۰،۳۲،۴۹۲ء۱۸	۴۹۵۷۰۴۲ء۷۹
	کل (الف)	۱،۷۲،۱۳،۵۴۲ء۴۴	۲۴۲۶۶۷۴۴ء۸۶
ب	خرچ		
(۱)	انتظامی اخراجات	۴۳،۰۶۸۵۰ء۲۵	۴۴،۴۲،۴۸۴ء۸۵
(۲)	دیگر	۷۵،۸۰۴۰۹ء۰۰	۸۴،۱۲۶،۰۵ء۴۵
	کل (ب)	۱۸۸۷۲۵۹ء۲۵	۱۲۸۵۵۰۹۰ء۳۰
ج	اضافہ	۵۳۲۶۲۸۳ء۱۹	۱۱۴۱۱۶۵۴ء۵۶

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان کسانوں کے ہوسٹل اور گودام بلڈنگ کا کونڈھری ضمنی بازار سمیتی میں افتتاح کر رہے ہیں۔ شری بھگونت راؤ گاٹیکواڑ، وزیر برائے زراعت اور ڈاکٹر شری کانت جیکاڑ، وزیر مملکت برائے مالیات بھی نظر آرہے ہیں۔

درج بالا جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاری سال میں گزشتہ سال کی بہ نسبت معاشی طور پر ہمہ گیر ترقی ہوئی ہے۔ بازار سمیتی کی معاشی حالت میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں جاری سال میں ۷۰ لاکھ روپے کا خطیر اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح سمیتی کے پاس موجود سرمایہ کا مناسب طور پر استعمال کرنے کے سبب اور دیگر آمدنی بڑھانے کے لئے بھرپور کوشش کرنے کی وجہ سے تقریباً ۲۹ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ بازار سمیتی کی آمدنی میں ہونے والا اضافہ سمیتی کے اراکین کے انتخاب کے بعد ہی ہوا ہے۔ یہ بات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ سالِ رواں میں سمیتی نے کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کر کے اور غیر ضروری اخراجات میں کمی کر کے آمدنی میں اضافہ کیا ہے۔ نیز پرانے بقایاجات کی وصولی کی مہم کو تیز کر کے سمیتی نے بہت ساری رقومات وصول کرلی ہیں۔

سالِ رواں کے اواخر تک کا اضافہ ۱۱ء۱۴۲ لاکھ روپے ہے جو گزشتہ سال کے اضافہ کے مقابلے میں دوگنا ہے۔

نگرانی فیس

سالِ رواں میں نگرانی فیس، آمدنی، وصولی اور جمع شدہ رقومات کا جدول حسبِ ذیل ہے

نمبر شمار	تفصیلات	سن ۸۵-۱۹۸۴ء	سن ۸۶-۱۹۸۵ء
۱۔	نگرانی فیس کی وصول شدہ رقم	۹,۹۰,۴۹۹ ر ۵۵	۱۱,۰۷,۱,۷۴۷ ر ۸۴
۲۔	وصول شدہ رقم	۷,۶۰,۶۷۱ ر ۵۲	۹,۰۷,۸۸۷ ر ۷۲
۳۔	حکومت کی تجوری میں جمع کردہ رقم	۷۴۹۴۵۲ ر ۵۱	۸۱۶۶۰۰ ر ۹۷

درج بالا جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ سالِ رواں میں نگراں فیس کی وصولی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور حکومت کی تجوری میں جمع کردہ رقم میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ق گ راج

زیرِ غور منصوبے

بمبئی گریٹر اپین بازار سمیتی بھارت کی ایک قابلِ ذکر سمیتی ہے اس سمیتی کے ماتحت بازار میں بہت ساری سہولیات ہونے کے باوجود مستقبل میں متعدد اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے بازار سمیتی نے اقدامات کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ اقدامات حسب ذیل ہیں:

۱۔ کھیتی کے جو مال فی الحال قانون کے تحت آتے ہیں ان کے علاوہ دیگر پیداواروں کو بھی قانون کے تحت لانا مثلاً اناج، دالیں، کھانے کا تیل، سوکھا میوہ، شکر، رَوا اور آٹا گڑ، گھی وغیرہ۔ سمیتی نے حکومت کے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔ حکومت جلد ہی اس کو منظور کر کے کھیتی کے علاوہ مذکورہ مال کو بھی قانون کے تحت لاکر احکامات جاری کرے گی۔

۲۔ پیاز، آلو، پھل اور سبزیوں کے علاوہ دیگر کھیتی کا مال اور اشیاء کے تھوک بازار کو نئی بمبئی میں ترابے مقام پہ لے جانے کی تجویز حکومت کے زیرِ غور ہے۔ یہ تھوک بازار تین ادوار میں قائم ہوگا۔ پہلے دور میں مارکیٹ نمبر ۱ میں شکر، گڑ، مسالے کی چیزیں وغیرہ کے لئے ۶۶۰ گالوں کی تعمیر کا کام آخری مراحل میں ہے۔ اس پروجیکٹ کی کل لاگت ۲۲.۹۸ کروڑ روپے ہے۔ جس میں سے ۱۳.۵۵ کروڑ روپے کی رقم قومیائے گئے بینکوں سے بطور قرض حاصل کی گئی ہے۔

۳۔ جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے کہ بمبئی ضلع میں پھلوں اور سبزیوں کا تھوک بیوپار بالکل ناکافی اور بے ترتیب جگہ میں کیا جاتا ہے۔ بمبئی ضلع میں پھل اور سبزیوں کے تھوک کاروبار کے لئے مرکزی مقام کی جو کہ جدید ترین سہولیات سے آراستہ ہو، کسانوں کی مانگ بہت پرانی ہے۔ جس کے لئے اکانجور میں تقریباً ۱۵۰ ایکڑ زمین پر اور واشی نئی بمبئی میں جدید انداز کا پھلوں، سبزیوں کا تھوک بازار تعمیر کرنے کے لئے سمیتی حکومت سے زمین حاصل کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کر رہی ہے۔

۴۔ ترابے کے صدر بازار کے احاطے میں راستوں کی درستی، پانی کی ٹنکی کی تعمیر وغیرہ منصوبے ۸۷-۱۹۸۶ء میں تکمیل کو پہنچانے کی تجویز سمیتی کے زیرِ غور ہے۔

۵۔ سمیتی کے طریقۂ کار سے متعلق اور بمبئی کے تھوک بازاروں میں مال کی برآمد، قیمتوں سے عام لوگوں کو مطلع کرنے کے لئے سمیتی کی طرف سے دوردرشن پر ہفتہ وار پروگرام نشر کرنے کے لئے بمبئی دوردرشن کے ساتھ بات چیت جاری ہے۔

مضمون نگار حضرات سے گذارش

- فل اسکیپ کاغذ کے صرف ایک طرف صاف اور خوش خط تحریر فرمائیے۔
- کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کے بجائے اصل مسودہ روانہ فرمائیے۔ اور آخر میں اپنا نام اور پتہ ضرور لکھ دیجیے۔
- صرف غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمائیے۔ مضامین کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھیے۔
- غیر طلبیدہ تخلیقات کا معاوضہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ ادارہ کرتا ہے اس سلسلہ میں توجہ یا کسی یاددھانی کی ضرورت نہیں ہے۔

(ادارہ)

مہاراشٹر میں ڈیری صنعت

محکمۂ ڈیری ترقیات نے گذشتہ ۲-۳ سالوں میں دودھ کی پیداوار میں خاصا اضافہ کرلیا ہے۔ یہ اضافہ ریاست کے کچھ حصوں میں خشک سالی کی صورتحال کے باوجود کیا گیا۔ سال ۱۹۸۵ء-۸۶ کے دوران دودھ کی کل پیداوار تقریباً ۱۰ ، کروڑ لیٹر تھی۔ ریاست میں خشک سالی کی حالت اور پینے کے پانی کی کمی کے باوجود ۱۹۸۶ء-۸۷ کے دوران دودھ کی حصولی میں اکثر کمی وبیشی واقع ہوتی رہی یہ کامیابی دراصل ریاستی حکومت کی باعمل پالیسی کی مرہون منت ہے۔

۱: دودھ کی قیمت خرید کے معاوضہ کا تعین۔
۲: تمام موسموں میں کسانوں کو مارکیٹ کی ضمانت۔
۳: ڈیری وغیرہ کی سہولتیں مہیا کر کے پروڈیوسروں کی طرف سے دودھ کی متواتر فراہمی۔
۴: دودھ کی پیداوار کے پروگرام پر عمل آوری
۵: سائنٹیفک طریقۂ کار کے ذریعہ دوغلی نسل کے پروگرام پر عمل آوری۔

...علاقوں میں ۱۶٫۲۵ لاکھ لیٹر دودھ جراثیم سے پاک کرنے کے بعد مہیا ...تا ہے اسکے علاوہ ۴٫۵ لاکھ لیٹر خام دودھ روزانہ بمبئی عظمیٰ دودھ ...سکیم سے دیہی علاقوں میں روانہ کیا جاتا ہے سنگمنیر اور بارامتی ...ڈیریاں اگلے سال سے کام کرنا شروع کردیں گی۔ ۲ لاکھ لیٹر ...دھ کی ایک زائد مقدار روزانہ صاف کی جاتی ہے۔ آکولہ میں ...پاوڈر پلانٹ کے تنصیب کا کام جاری ہے۔ پاوڈر ...راج

پلانٹ مکمل ہوجانے کے بعد ۳۵ یومیہ سے بڑھ کر ریاست میں یومیہ پیداوار ۵۰ ایم ٹی تک ہوجائے گی۔ بھیونڈی تعلقہ میں گوٹرے کے مقام پر دودھ کی تقسیم کا ڈپو اگلے سال کام کرنا شروع کردے گا۔ بمبئی عظمیٰ میں صارفین خاص طور سے آفس جانے والے بڑی تعداد میں ہیں اور یہاں ایسے دودھ کی پیداوار کی سخت ضرورت ہے۔

مذکورہ ضرورت پر دھیان دیتے ہوئے محکمہ ایسے دودھ کی مہر بند ڈبوں میں فراہم کرنے والے پروجیکٹ جاری کرنے پر غور کر رہا ہے۔ ایسا پروجیکٹ ضلع احمد نگر کے سنگمنیر میں جاری کیا جائے گا۔ گذشتہ مالی سال کے دوران مزید آرے سریتا قائم کرنے کا پروگرام شروع کیا گیا جس سے علاقائی دودھ کی تقسیم میں اضافہ ہوگا۔ آرے سریتا قومی شاہراہوں پر بھی قائم کی جائے گی۔ آرے سریتا پروجیکٹ امسال جاری رہیں گے

اور مستقبل میں بھی۔

دیگر ریاستوں میں دودھ اور دیگر مصنوعات کی فروخت

زائد دودھ اور دودھ کی مصنوعات کو دیگر ریاستوں میں فروخت کرنے کی ایک اسکیم بنائی گئی ہے۔ فی الحال ۵۰۰۰۰ لیٹر دودھ دیگر ریاستوں میں روانہ کیا جارہا ہے علاقائی فروخت میں اضافہ کو دیکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اقدامات کئے گئے ہیں:

۱۔ دودھ کی نقل و حمل کی شرحوں میں اضافہ
۲۔ علاقائی فروخت میں اضافہ کے لئے کوآپریٹیو سوسائٹی قائم کرنے کے لئے ترغیبات

دیگر مصنوعات:

بمبئی میں انرجی کی پیداوار کا دوسرا پروجیکٹ مکمل ہو چکا ہے اور کام کرنے لگا ہے۔

اسکول کے طلباء کو دودھ کی فراہمی:

فی الحال حکومت اسکول کے طلبا کو دودھ کی فراہمی پروگرام کے تحت مفصل علاقوں میں تقریباً ۶۲۰۰۰ لیٹر دودھ تقسیم کررہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ہر طالب علم کو روزانہ ۱۵۰ ملی لیٹر دودھ دیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت تقسیم کاری پرائمری طلبا کو شامل کرکے ۴۰۰۰۰ لیٹر یومیہ تک بڑھ جائے گی۔

تعلیم اور تربیت:

ڈیگری مقام پر مویشی پالن اور ڈیری مینجمنٹ کا دو سال کی مدت کا ایک ڈپلومہ کورس جاری کیا گیا ہے۔

قومی راج

شرح خریداری

ایک سال کے لئے ۱۰ روپئے۔ دو سال کے لئے ۲۰ روپئے
تین سال کے لئے ۲۷ روپئے۔ ۴ سال کے لئے ۳۶ روپئے
اور
پانچ سال کے لئے ۴۵ روپئے

رقم بذریعہ منی آرڈر بھجوائیے۔ کوپن پر پورا نام پتہ اور پن کوڈ نمبر، اردو کے ساتھ ہندی، مراٹھی یا انگریزی میں بھی صاف صاف لکھئے تاکہ صحیح پتے کا اندراج کیا جا سکے۔

پتہ کی تبدیلی کی اطلاع نمبر خریداری کے ساتھ دیجئے۔ رائے لکھیئے اور دوستوں کو خریداری کے لئے توجہ دلائیے۔

ترسیلِ زر کا پتہ

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
بیرک نمبر ۱۹، نزد سروچی بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
فون نمبر: ۲۰۲۱۵۳۰

★

مراسلت کا پتہ

ایڈیٹر "قومی راج"
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۵ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲

فون نمبر: ۲۰۲۰۶۵۱ ، ۲۰۲۲۹۵۷

مہاراشٹر میں بجلی کی صورتحال

مہاراشٹر ملک بھر کی صنعتی ریاستوں میں سرفہرست ہے یہاں ریفائنریز، پیٹرو کیمیکلز، فرٹیلائزر، ٹیکسٹائلز، المونیم اور فارماسیوٹیکلز جیسی صنعتی یونٹوں کا جال سا بچھا ہے۔ اس ریاست نے یہاں زرعی پمپوں کی بڑی تعداد ہونے کی وجہ سے خود کو زرعی طور سے ترقی یافتہ ریاست میں ڈھال لیا ہے۔ صنعت اور زراعت کے بھاری بھرکم دباؤ کی وجہ سے مہاراشٹر میں بجلی کی ضرورت بڑھتی چلی جائے گی۔ زرعی اور صنعتی پیداوار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بجلی کی یہاں زبردست مانگ ہے جس کی وجہ سے ریاستی حکومت اپنے دیگر منصوبوں میں بجلی کی پیداوار کے پروگرام پر عمل آوری کو فوقیت دے رہی ہے۔

بجلی کی پیداوار کی صلاحیت

ساتویں پلان کے شروع میں ریاست میں بجلی کی پیداوار ۶۰۷۸ ایم ڈبلیو سی تھی سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ساتویں پلان کے پہلے سال میں اس نے ۸۶۲ میگاواٹ مزید شامل کئے گئے سال ۸۷-۱۹۸۶ء اس میں ۱۵۴۲٫۵ میگاواٹ کا نشانہ جوڑا گیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء تک ۷۰۳۲٫۵۰ میگاواٹ تک بجلی حاصل کر لینے کی صلاحیت کی توقع ہے۔ ریاست میں سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۲۷،۴۰۰ لاکھ یونٹ تھی جو کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے ۲۵۱۱۹۰ لاکھ یونٹ سے موازنہ کرنے کے بعد ۸٫۷ فیصد زائد تھی۔

علاوہ ازیں مہاراشٹر اسٹیٹ الیکٹرک سٹی بورڈ پاور اسٹیشن نے ۲۱۲۲۵ ملین یونٹ بجلی پیدا کی جو کہ ریاست کی کل بجلی کی پیداوار کے ۷۷ فیصد ہے۔ سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے ریاست میں ۳۱۲۵۷۰ لاکھ یونٹ بجلی حاصل کی گئی۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر اسٹیٹ الیکٹرک سٹی بورڈ (ایم ایس ای بی) پاور اسٹیشن نے ۲۳۳۶۷۰ لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی جو کہ ریاست کی بجلی کی کل پیداوار کا تقریباً ۸٫۴۷ فیصد ہے۔

بجلی کی فراہمی

ریاست بجلی کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ بجلی کی فراہمی کے پروگرام پر بھی کاربند ہے۔ بجلی ریاست کے مختلف حصوں میں بجلی اسٹیشن کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے۔ ای ایس ای بی نے اس سلسلہ میں ٹرانسمیشن اور تقسیم کاری کی لائین بناتی ہے۔ بجلی بنانے کا کام کرتی ہے۔

دیہی علاقوں کو بجلی پہنچانے اور پمپوں کو بجلی کی فراہمی

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں کو بجلی پہنچانے کے کام کو ترجیح دی ہے سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے لئے ۵۰۰۰ دیہاتوں کو بجلی پہنچانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ریاست میں ۴۰۶۷ ٹاؤن اور ... گاؤں (۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق) میں مارچ ۱۹۸۷ء تک ۳۳۵۱۷ گاؤں اور دیہاتوں میں بجلی فراہم کی گئی جو کہ ۹۵٫۷ فیصد کارکردگی کا ثبوت ہے۔

(باقی صفحہ نمبر ۳۵ پر)

از شری ڈی۔ وی۔ نرورکر
ڈائریکٹر سماجی جنگل بانی، ریاستِ مہاراشٹر

مہاراشٹر میں سماجی جنگل بانی عوامی پروگرام بن چکا ھے

کوئی پانچ برس پہلے مہاراشٹر نے سماجی جنگل بانی کے پروگرام پر عمل آوری کا آغاز بڑے پیمانے پر کیا تھا۔ تب سے اُن دیہاتوں کی تعداد جن میں درخت لگائے گئے، اور جہاں پودکاری کی گئی اور پودوں کو دیگر مقامات پر لگانے کے لئے دیا گیا، اُس میں کافی ترقی ہو چکی ہے لیکن سب سے اہم ترقی یہ ہوئی کہ عام آدمی کی طبیعت میں درخت اُگانے کا میلان جو پیدا ہوا اور پودے لگانے کی طرف وہ مائل ہوئے، اُس کی بڑی اہمیت ہے۔ سماجی جنگل بانی سے پہلے لوگوں میں یہ خیالات جاگزیں تھے کہ فلاں فلاں درخت اُن کے دادا نے یا پردادا نے لگایا تھا۔ اِس لئے اُن کی فکر انھیں زیادہ ہوا کرتی تھی اس لئے اُن درختوں کو لوگ آبائی نشانی کے طور پر باقی رکھتے تھے۔ بعض ایسے درخت بھی تھے جن کے ساتھ لوگوں کا مذہبی یا ثقافتی رجحان بھی تھا۔ اس لئے یہ درخت صرف اس لئے باقی رکھے جاتے تھے کہ اُن کی حسبِ معمول پُوجا کی جایا کرے۔

اس کے علاوہ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ جنگلات اور درختوں کی دیکھ ریکھ اور حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لوگ صرف اتنی بات سے مطمئن تھے کہ جنگلات کے علاقوں پر اپنے حقوق قائم رکھیں اور جنگلاتی پیداوار کو قانونی یا غیر قانونی طور پر لے جائیں۔ لیکن سماجی جنگل بانی پروگرام نے نہ صرف ریاست میں بلکہ دوسرے حصوں میں بھی ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی۔ اب لوگوں میں یہ احساس بیدار ہو رہا ہے کہ ماحولیات میں توازن کا برقرار رکھنا کتنا ضروری ہے اور یہ کہ ان سے کتنی اچھی آمدنی کی امید بھی کی جا سکتی ہے۔ پہلے کسی نئے "فارم" پر چند درختوں کو لگا دینا کافی سمجھا جاتا تھا اب درختوں کو تیز ہواؤں کو روکنے اور دوسری زراعتی فصلوں کے ساتھ "فارم بندی" کے طور پر لگانے کا خیال بڑھ رہا ہے۔

بعض اوقات زمینوں کو درختوں کے لئے ہی پوری طرح مخ
کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب درخت لگانا بطور ایک فصل کے ا
کیا جا چکا ہے۔ لوگوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ قدرت کی ت
تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے اور ایندھن۔ گھاس، چارہ، چھو
پیمانے پر عمارتی لکڑیاں، پھل وغیرہ کے حصول کے لئے درختو
فصل کی حیثیت سے لگانا بھی ضروری ہے۔ چھوٹے کسان اپنی
زمینوں پر بھی، فارم کے آس پاس جنگل بانی کا کام کرنے لگے ہیں
سے انھیں محنت کا معاوضہ چاہے وہ کتنی ہی حقیر شکل میں ہو، مل
ہے۔ اب کسان یہ بھی سمجھنے لگے ہیں کہ درختوں کی فصل اسی ط
حفاظت کا کام انجام دیتی ہے جس طرح کوئی بیمہ پالیسی۔ کیونکہ یہ بچت
فکسڈ ڈپازٹ کے انھیں ضرورت کے موقعوں پر کام آتے ہیں

ورت کے مطابق لگایا اور کاٹا گیا۔

مایاں تبدیلیاں

ماجی جنگل بانی سے نہ صرف لوگوں کے خیالات میں تبدیلی آئی
لہ درختوں کے اقسام میں بھی جو لگائے جاتے ہیں۔ اور ایسے درخت
سے بڑھتے ہیں، زیادہ تر لگائے جاتے ہیں بہ نسبت ان درختوں
کی بڑھنے کی رفتار سست ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ جلد بڑھنے
درختوں سے آمدنی کی جلد تر امید ہوتی ہے۔
دوسرا نمایاں فائدہ جنگل بانی کا یہ ہے۔ اب تک جنگل بانی کی
ی، جواب تک صرف جنگل کے سرکاری حکام کی ذمہ داری
اتی تھی، اب وہ نظریہ بدل چکا ہے۔ اس بات کی کوشش
ں ہے کہ اب کسان خود پودکاری کریں۔ اور آزادانہ طور پر خود
سری کا انتظام، پودکاری، دیکھ ریکھ، کٹائی۔ بذات خود انجام
ب اسکول کے بچے، عورتیں، سماجی تنظیمیں بھی، سماجی جنگل بانی
منوائی اختیار کر چکی ہیں۔
ب یہ ضروری نہیں رہا کہ صرف حکومت ہی جنگل بانی کے کام پر
ے۔ عوام میں سے ہر درجہ کے لوگ اب اس اہم کام میں حصہ
ے لگے ہیں۔ محترم وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بھی فرمایا کہ
جنگل بانی اور درخت کاری اور درختوں کی حفاظت اب
تحریک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس پروگرام کا سب سے بڑا مقصد
کہ دیہات کے لوگوں کو اپنی ضروریات کے لئے ایندھن، چھوٹے
پر عمارتی لکڑی اور جانوروں کے لئے گھاس چارہ مل جاتا ہے
سرکاری جنگلات پر اس کا بوجھ نہیں پڑتا اور ساتھ ہی دیہات کے
ت مندوں کو اس کے ذریعے کام سے لگے رہنے بلکہ ملازمت
کچھ مواقع مل جاتے ہیں۔

حقیقی کارکردگی

اس سلسلہ میں محکمہ سماجی جنگل بانی نے جو بڑا پروگرام انجام دیا ہے وہ
ڑ سماجی جنگل بانی پروجیکٹ ہے۔ ۴۰ر۶۵ کروڑ روپے کا
جیکٹ جس کی امداد یونائیٹیڈ اسٹیٹ ایجنسی برائے بین
می ترقیات کی جانب سے کی جا رہی ہے، وہ خود اس پروجیکٹ
نے والی لاگت کا نصف حصہ ریاستی حکومت کے مساوی
نت کر رہی ہے۔ ۱۹۸۴ء کی بارش کے بعد دیہاتوں کی اچھی
تعداد یعنی ۴۲۲۴۰ گاؤں اس پروجیکٹ کے تحت لائے
راج

جا چکے ہیں جبکہ ۱۰۶۰ مزید گاؤں ۱۹۸۷ء کے موسم باراں تک
اس پروجیکٹ کے تحت لائے جانے والے ہیں تاکہ ۴۳۰۰ گاؤں اس
سے فیض یاب ہو جائیں۔ اب تک ۶۷ر۵۹۵۹۹ ہیکٹر زمین پر
مختلف ماڈل کے درخت اس پروجیکٹ کے تحت لگائے جا چکے
ہیں۔ مزید ۲۲۰۲۰ ہیکٹر زمین پر آنے والے موسم باراں میں پودے
لگائے جانے والے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت ہر انتخاب کردہ
گاؤں کو اس کی اجتماعی زمین پر "بلاک" پودکاری کے لئے زمین عطا
کی جاتی ہے جس کی دیکھ ریکھ ابتدائی تین سال تک محکمہ سماجی جنگل بانی
کرتا ہے اس کے بعد وہ حصہ گرام متعلقہ کو دے دیا جاتا ہے۔ آگے
چل کر گاؤں کے اس جنگل کو لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے
ایک مستقل اثاثہ بنا دیا جاتا ہے۔

اس طرح کے گاؤں کے باشندوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ
وہ اس دیہاتی جنگل کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داریوں کو نبھائیں اور خود اپنی
زمینوں پر ایسے اقسام کے درخت لگائیں جو آئندہ چل کر ان کو ایندھن
جانوروں کے گھاس چارہ، چھوٹے قسم کی عمارتی لکڑیوں وغیرہ کی
ضروریات پوری کر سکیں۔ اس مقصد کے تحت مناسب درختوں
کے پودے تقسیم کئے جاتے ہیں۔

تحقیق اور تربیت

جنگل بانی اور سماجی جنگل بانی کے درمیان کافی فرق ہے۔ اول
الذکر ادارہ انتظامی کارروائیوں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دیتا ہے
جب کہ مؤخر الذکر ادارہ توسیعی فرائض انجام دیتا ہے۔ چونکہ سماجی
جنگل بانی کے کارکن زیادہ تر محکمہ جنگلات سے چنے جاتے ہیں۔
اس لئے ان کے فرائض میں جو تبدیلیاں پیش آتی ہیں۔ انکی مناسب
تربیت ان کارکنوں کو دینی پڑتی ہے۔ اس مقصد کے تحت ایسے
تربیتی پروگرام منظم کئے جاتے ہیں جن کے ذریعے کارکنوں کو سماجی
جنگل بانی کا پیغام دیہات کے لوگوں تک مؤثر طور پر پہنچانے میں
سہولت ہو۔ ٹریننگ۔ کم۔ ورکشاپ کے دوروں کا انتظام
بھی کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعے اس تحریک کا فائدہ جنگل
بانی کے محرکوں کو پہنچے۔

عوام میں پرچار

اس پروگرام میں عوام میں پرچار کا رول کافی اہم ہے فلموں، سلائیڈز، ٹیلی ویژن، ریڈیو، پریس، نمائشوں وغیرہ کے ذریعے، دیہاتی عوام کو درخت لگانے اور سماجی جنگل بانی پروگرام کے مقاصد سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

دوسرے پروگرام

بعض دوسرے اہم پروگرام بھی سماجی جنگل بانی پروگرام کے علاوہ مہاراشٹر میں عمل میں لائے جا رہے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ دیہاتوں میں ایندھنی درخت لگانے کی اسکیم

مرکز کی جاری کردہ یہ اسکیم ۱۹۸۳ء سے زیر عمل ہے۔ اسکے تحت تیزی سے اگنے والے درختوں کی پودکاری کی جاتی ہے۔ ایسے درختوں کے پودے دیہاتیوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ سال رواں سے حکومت نے اس پروگرام میں آزادانہ کام کرنے والی تنظیموں کو بھی شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے تحت آزاد ایجنسیوں کی زمینوں پر ان کے تعاون سے پودکاری کیا جانا مقصود ہے۔ پھر ان درختوں سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ ان دیہاتیوں کے کام میں لگایا جانا مقصود ہے جو دیہات مذکور میں کمزور طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ جنگل بانی کے سلسلے میں جو زبردست پروگرام زیر نظر ہیں اور جس پر ۸۴-۱۹۸۳ء سے عمل ہو رہا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) اسکولوں اور سماجی تنظیموں کے ذریعے نرسریوں کا قیام۔
(۲) مغربی گھاٹ ترقیاتی پروگرام۔
(۳) سنٹرل نرسری۔
(۴) کسان نرسری۔
(۵) دیہی بے زمین روزگار ضمانت پروگرام۔
(۶) دیہی روزگار کے سلسلے میں قومی پروگرام۔
(۷) راستوں اور نہروں کے کنارے درخت کاری کی اسکیم۔

ان سب امور میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ عوام اپنا بھرپور تعاون پیش کریں۔۔

• بجس الہ آبادی
معرفت حکیم محمد مسیح
چھوٹی سریا گنج، مظفر پور (بہار)

غزل

اس عصرِ نو میں خوئے شرافت عجیب ہے
اہلِ ریا کی بزمِ سیاست عجیب ہے

میری متاعِ آرزو گم ہو کے رہ گئی
خوبانِ شہر کی یہ شرارت عجیب ہے

فنکاری ایسی دیکھی زبان و ادب کے ساتھ
سادہ دلوں کے قتل کی صورت عجیب ہے

میٹھی چھری سے کم نہیں میٹھی زبان بھی
کہتے ہیں شہر یار دل کی فطرت عجیب ہے

باتوں میں انکی دیکھی ہے کچھ ایسی دلکشی
راحت رسا بنی مگر حرکت عجیب ہے

کل محوِ گفتگو تھا جو ہے آج ہم سے دور
دنیائے انبساط سے رحلت عجیب ہے

ملتا ہے درس اس سے ہر اک لاشعور کو
بجس شعورِ زیست کی دولت عجیب ہے

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
کالی (دولت خاں)
ایوت محل ۴۴۵۲۰۴

اُردُو اور مَراٹھی کے تہذیبی رشتے

مختلف قوموں کے باہمی ارتباط و اختلاط اور آپس میں میل جول سے ایک دوسرے کا تہذیبی و معاشرتی لحاظ سے متاثر ہونا فطری عمل ہے۔ یہ روابط باہمی کے انمٹ اثرات کچھ نقوش فنون و ادب پر بڑے گہرے مرتسم ہو جاتے ہیں۔ عمل ارتسام کا یہ تواتر ادب کی تاریخ سازی کرتا ہے۔ اسے نیا موڑ دیتا ہے اور نئے آہنگ سے آشنا کرتا ہے

اس ضمن میں جب ہم مہاراشٹر کی ادبی فضا میں اردو اور مراٹھی [...]کا جائزہ لیتے ہیں تو دونوں زبانوں کے فن پاروں کو ایک [...]ے کی ادبی تہذیب سے متاثر پاتے ہیں۔ تہذیب کا یہ [...]ی سلسلہ بڑے لمبے عرصے پر محیط ہے۔ چنانچہ مراٹھی کے [...]وفی شاعر شاہ مرتضیٰ معروف بہ मृत्युंजय (م ۱۶۵۰ء) کی पंचीकरण مراٹھی اردو لغت اس تہذیبی رشتے کی غماز ہے [...]اب کے متعلق شاعر خود کہتا ہے۔

شاہ مرتضیٰ برہمنی :: جس میں نہیں من مانی
بیچی کرن کا موج کئے :: ہندو مسلمان ایک کر دیئے لے

شاہ مرتضیٰ نے اس کے علاوہ بھی مراٹھی میں کئی کتابیں [...]ف کی ہیں جن میں سے "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" "[illegible]" وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں पंचीकरण مراٹھی۔ اردو کی پہلی لغت ہونے کی وجہ سے اس کی [...] ادبی اہمیت و انفرادیت مسلم ہے۔ اس لغت نے مراٹھی اردو کے تہذیبی رشتے کو مضبوط بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

سولہویں، سترہویں صدی میں مہاراشٹر کی سرزمین پر جس قسم کے روحانی، مادی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی افکار اور نظام ہائے زندگی کا شجر پروان چڑھ رہا تھا اس کی آبیاری صوفی سنتوں کی اپنی مقدس تعلیم کے ذریعہ کی تھی اس سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراشٹر کے کبیر شیخ محمد (م ۱۶۶۴ء) اپنی روحانی تعلیم عوام تک پہونچانے کے لئے مراٹھی، اردو دونوں زبانوں کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک نئی صنف [illegible] سے آشنا کیا جو خالصتاً مراٹھی طرز [illegible] ہے۔ شیخ محمد کی ایک مختصر سی تصنیف "[illegible]" سے چند اردو ابھنگ بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) ہندو مسلمان کیا چیز معنی	[illegible]
تو شے دل بیچ سے نکل کفر انا	[illegible]

۱۔ شاہ مرتضیٰ (मृत्युंजय) "पंचीकरण" (مطبوعہ، مسودہ، مراٹھی ساہتیہ پریشد پونا ۱۹۷۳ء) ص ۱
[...]ی راج

(۲) لاالہ کلمہ اول چیز ٭ الا اللہ उभोवादे برہم بیج
محمد الرسول اللہ کو بیج ٭ हवफिता लावी

(۳) دوئم چیز وضو غسل نماز ٭ बांडा अपिद्या
अहंकार बडव

قبول پڑیں گے سنت فرض ٭ अपिमाण पावी

(۴) شیخ محمد بھئے मिती ٭ पुरती ज्याते कृपा बहुत

ज्योती पुरता बोधे ह धो ٭ اللہ کے مہر سوں ۲ے

شیخ محمد نے اردو۔ مراٹھی اشعار مشترکہ اشعار بھی لکھے ہیں جن میں ایک مصرعہ اردو کا اور دوسرا مراٹھی کا ہے۔ اس طرز کے ذریعہ انھوں نے دونوں ادبی تہذیبوں کو ایک جگہ لانے کی کوشش کی تھی اس طرز کے بارے میں شاعر نے خود کہا تھا۔

دونوں انکھیا کا انچ دیکھنا
दो मासी वर्णिला एकचि जाण
دھنی کے تئیں پچھیا نو برحال
तो पुसता अधोगति जाल
اللہ، حضرتا، مولیٰ
मुसलमान विखवी तुला
ناپید سوں کتنے پیدا اللہ
कधोंची कारण आतो तुला

شیخ محمد قادریہ سلسلے کے ایک جلیل القدر بزرگ محمد غوثؒ کے مرید راز محمد کے لڑکے تھے۔ راز محمد رشد و ہدایت کی مسند عالیہ پر متمکن ہو کر زہد و ریاضت اور توحید و معرفت کے اسرار و رموز سالکان تشنگان کو سمجھایا کرتے تھے۔ ان کے مریدین میں کئی نام غیر مسلموں کے بھی ملتے ہیں مثلاً چاند صاحب بود ھلے یہ ہندو سنت تھے لیکن راز محمد سے نسبت ارادت استوار ہو جانے کے بعد سے چاند صاحب قادری کہلائے۔ دیوگری کے دامن میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ چاند صاحب کے شاگردوں میں جناردن پنت جیسے معروف سنت بھی شمار کیے جاتے ہیں جو ایک ناتھ کے گرو تھے۔ شیخ محمد نے اس سلسلے کو اپنی کتاب "योगसंग्राम" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

बन्य थोरं धोयो त्याची आबोपंत बोधले
त्याचे शिष्य चाले एकोअनार्दन

شیخ محمد نراکار، نرگن خدا کی پرستش کرنے کے باوجود سگن ساکار روپ کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں

ज्याची एक छाती रेखा तो अव्यक्त मात्रा सका
माय भवितधिया तुझा ताकारला

ادھر اردو ادب میں شیخ محمد کے معاصر محمد نوشہ گنج بخش (م ۱۶۹۴ء) مجسم تنزیل الہ کے قائل نظر آتے ہیں۔ اگرچہ آپ کا یہ تصور "ہمہ اوست"، کے دائرہ میں آتا ہے لیکن اس کی حدیں خدا کے سگن ساکار والے تصور سے جاملتی ہیں۔ اپنی ایک نظم نامہ میں وہ کہتے ہیں۔

آپے نرگن۔ آپے سرگن۔ آپے دبھنا پیر
آپے سور، آپ پرکاسا، آپے آپ، آپ غیر

۲ شیخ محمد (مرتبہ دی بی بیندرے) "शेख मोहम्मदबाबा कविता संग्रह" بمبئی ۱۹۶۱ء ص ۱۱۴
۳ ایضاً ص ۱۱۵
۴ شیخ محمد (مرتبہ دی بی بیندرے) "योगसंग्राम" بمبئی ۱۹۵۹ء ص ۲۰
۵ ایضاً ص ۲۱
۶ محمد نوشہ گنج بخش (مرتبہ) سید شرافت نوشاہی گنج شریف لاہور ۱۹۷۵ء ص ۱۰۲

شیخ محمد نے "योगसंग्राम" اٹھارہویں باب میں حقیقی
...یح کی ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ ۔
رام سے مراد دشرتھی رام نہیں ہے ۔ اپنے والدین کو کاندھے
...ر مقامات مقدسہ کی زیارت کرانے والے شراون کمار
...شرتھ کا تیر لگا تھا تو مرتے وقت اس کی زبان پر رام کا
...فا۔ اس واقعہ کے ظہور پذیری کے وقت تو دشرتھ کا لڑکا رام
...د میں بھی نہیں آیا تھا ۔ " ؎

...ن ثابت ہوا کہ شیخ محمد کا رام وہ ورا را لورا ہستی ہے جو دائم
...ہے شیخ محمد کے مندرجہ بالا خیالات کا پرتو تو دکنی شاعر
...ب کی مثنوی من سمجھاون کے ان اشعار میں دکھائی دیتا

...فت کراول اوس کی جے رام ہیگا
...ی رام سوں ہم کو آرام ہیگا
...دا رام کے نام سوں کام ہیگا
...من دھیان اس کا صبح شام ہیگا
وو ہی گل وو ہی مل وو ہی جام ہیگا
وو ہی ساقیٔ بزم گل فام ہیگا ؎

شاہ تراب نے رام اور رحیم کے فرق کو ان اشعار میں مٹا
...کبیر داس کی یہ آواز
بھائی رے دوئی جگدیش کہاں تے آیا!
اللہ نام کریا کیسو ہری حضرت نام دھرایا

...ان کے یہاں دب جاتی ہے اور صرف رام کے نام ہی میں
...ات الٰہیہ مدغم ہو جاتے ہیں ۔ مسلم معاشرے میں یہ تصور
...نے میں بڑی جسارت کی ضرورت تھی ۔ شاہ تراب نے
...ی اسے پیش کر دیا ۔ ان اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے
...پہنچے ہیں کہ شاہ تراب نے ہند و اساطیر فلسفہ ویدانت
...کی سنت وانی کی شراب طہورہ کو تصوف کے جاموں
...دیا ہے اور ذات واحد، ساقیٔ بزم گلفام کا تخیل اپنی
...میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر مذہب کے تصور الٰہ پر

وہ منطبق ہو جائے یہی اور مذہبی اتحاد کی اس سے بڑھ کر اور کیا
مثال ہو سکتی ہے ۔

شاہ تراب نے اپنی مثنوی مراٹھی سنت کوی سمرتھ رامداس
کی "मनाचे श्लोक" کے جواب میں لکھی ہے اگرچہ داس بودھ
سے بھی استفادہ کیا گیا لیکن مناچے شلوک کا اس پر بڑا گہرا اثر
ہوا ہے ۔ شاہ تراب نے بعض جگہ خالصتاً مراٹھی
اصطلاحات اور محاورات جوں کے توں رکھ دیئے ہیں مثلاً

بدی کے تخم باغ من کے میں یو مت
بسر گیان کو کا سو جی ذوپ سو مت ؎

"कुंभकर्णाची झोप" یہ مراٹھی محاورہ ہے بے خبری کو
طویل نیند سونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

ابھی تک تو تذکرہ ہوا صرف مسلمان شعراء کا لیکن مراٹھی کے
چند ایسے کوی سنت بھی گذرے ہیں جنھوں نے اپنی تعلیمات کو
پھیلانے کے لیئے اردو شاعری کا بھی سہارا لیا ہے چنانچہ مراٹھی قدیم
کی صوفی شاعرہ وینا بائی (م ۱۶۷۸ء) کی شاگردہ بیا بائی رامداسی
کا اردو کلام بھی ملتا ہے اس کے علاوہ علاقہ ودربھ کے امرت رائے
دیال ناتھ اور دیونا تھ نے مراٹھی کے علاوہ اردو و فارسی میں بھی
اپنی تعلیمات پیش کیں ۔

جہاں تک اصناف شاعری کا تعلق ہے تو مراٹھی اور اردو
کے اصناف میں بین فرق دکھائی دیتا ہے ۔ پواڑے کا اردو میں چلن
نہیں اور مرثیہ مراٹھی کو نہیں بھایا لیکن پھر بھی بعض جگہ مراٹھی میں
مرثیے اور اردو میں پواڑے کا پتہ چل ہی جاتا ہے چنانچہ مراٹھی
میں مرثیہ کے انداز میں روایتی "[illegible]" لکھی گئی ہیں عبداللہ
نامی مراٹھی شاعر کی یہ پُرسوز روایتی ملاحظہ ہو ۔

"तीर लागुन प्राण बाळाचा तो गेला
दुःख भारे तो बा-या मोकलता, बा-या मोकलता

ے شیخ محمد योगसंग्राम ص ۶۵
۸ شاہ تراب چشتی مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، من سمجھاون حیدرآباد ۱۹۶۴ء ص ۱
۹ ایضاً ص ۴

انور خان
48/22 - کنگھی والی چال
شیخ برہان قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی نمبر ۸

سفید پوش مسیحائیاں

کل بڑی عجیب بات ہوئی۔

میں دفتر سے ابھی ابھی لوٹا تھا۔ چائے کا پیالہ میرے ہاتھوں میں تھا۔ بھینی بھینی خوشبو جو بس چائے سے ہی مخصوص ہے۔ نتھنوں کی راہ دماغ تک پہنچ کر دن بھر کے تھکے ماندے اعضا کو تازہ دم کر رہی تھی۔ دریچے سے باہر دونوں وقت گلے مل رہے تھے اور شفق کے پس منظر میں دور اونچائی پر پرواز کرتے پرندے بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ تب ہی اچانک، بالکل اچانک میں نے خود سے کہا کہ یار تم یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ تم بہت تنگ دل، چھوٹے ذہن کے، حاسد، تشدد پسند مگر بزدل، کمینے اور معمولی آدمی ہو۔ آئینے میں دیکھو تمہارا چہرہ کس قدر مسخ ہو گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں سے منافقت ٹپکتی ہے۔ تمہارا توندیل جسم جھوٹ کے کوڑا کرکٹ کا انبار بن چکا ہے۔ یہ سچ اتنی سرعت اور شفافی کے ساتھ میرے سامنے آیا اور وہ بھی ایسے خوش گوار موڈ میں جب ذہن سارے دفاعی ہتھیار رکھ چکا ہوتا ہے۔ مجھے اس کڑوے سچ کو قبول کرتے ہی بنی۔ پھر ایک اور عجیب بات ہوئی۔ جیسے ہی میں نے اس سچ کو قبول کیا میرا سارا بدن ہلکا پھلکا ہو گیا جیسے دل و دماغ سے گرانی اور جسم سے کثافت اتر آئی ہو۔

ض یہ مان لینے میں حرج ہی کیا ہے کہ میں ایک
، جانور ہوں۔
س شام جب میں اپنے دوستوں سے ملا تو بہت

بات ہے بہت چہک رہے ہو"؟ ایک دوست نے پوچھا
نے الیگزنڈر بلاک کی یہ نظم سنی ہے" میں نے اس سے کہا

ہم بڑی رازداری سے
ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں
ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں
ایک دوسرے کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتے۔
ہم ایک دوسرے سے سرکشیدہ ہیں
ہم کوشش کریں تب بھی

نفرت کے بغیر نہیں رہ سکتے

نفرت کرنا ہماری عادت ثانیہ بن چکی ہے

میرے دوستوں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ان کے چہرے غصے سے تمتما اٹھے اور آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اس شام محفل جلد برخواست ہو گئی۔

اگلی شام ہوٹل کے باہر بجلی کے کھمبے سے ٹکا ہوا، میں تنہا کھڑا ہواؤں سے محو گفتگو تھا کیونکہ میرے دوستوں نے ٹھکانہ بدل دیا تھا۔ ساری شام میں اکیلا کڑھتا رہا کہ دوستوں کی محفل ضرور کسی اور جگہ جمی ہوئی ہوگی۔ قہقہے، لطیفے، چھیڑ چھاڑ کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں گی اور میں ادھر اکیلا کھڑا ہوں۔ کوئی بھیڑ گلے سے الگ ہونا نہیں چاہتی تو کیا میرا حشر بھی گووند جیسا ہوگا؟ اس روز بھی چہرے ایسے ہی تمتما اٹھے تھے اور آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں جب گووند اپنی بہن کی سالگرہ میں نشے میں جھومتے ہوئے میز پر چڑھ گیا تھا اور بلند آواز میں کہہ رہا تھا

" دوستو! آج میں بہت خوش ہوں اور اپنی بہن کا تہہ دل سے شکرگزار۔ میری بہن فاحشہ ہے، مگر اس نے اس ذلیل سماج میں جہاں سیم و زر کی خداوندی ہے۔ ہمیں معزز بنایا ہے۔ خدا اسے ایسے بہت سارے سال نصیب کر دے۔"

محفل بکھر گئی تھی۔ سب لوگ اسے نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ بھلا ایسی باتیں بھی کہنے کی ہوتی ہیں؟ اور وہ بھی سر محفل!

لیکن کوئی بھیڑ گلے سے الگ نہیں رہ سکتی۔ اسے گلے سے ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔ گووند کی بہن نے اُسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دیا تھا جہاں وہ تین ہفتے رہا۔ اس کے بعد بھی گووند کئی سال زیر علاج رہا ——— وقفے وقفے سے اسے بیس الیکٹرک شاک لینے پڑے حالانکہ بے چارہ پہلے ہی شاک کے بعد کہنے لگا تھا کہ ہم سب معزز ہیں، میری بہن بھی!

الیکٹرک شاک کے تصور نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ سچائی انسان کو کس قدر تنہا کر دیتی ہے؟ ارشمیدس بازار میں ننگا دوڑ رہا ہے اور لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر الیکٹرک شاک کا رواج ہوتا تو یقیناً اسے بھی اپنے گلے سے ایڈجسٹ کرنا پڑتا۔

"یوریکا" میں چلایا

خواتین کے رسالے پر جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر میری بیوی شمیم نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کے خیال میں، میں کوئی ODD آدمی ہوں۔ سماج ذرا سا بھی انحراف برداشت نہیں کرتا۔ تصور میں بھی نہیں۔ پھر میں نے اسے اس سچائی کی بابت بتایا جو مجھ پر منکشف ہوئی تھی اور اس شام کا جو دوستوں کے ساتھ گزری تھی۔

ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے پیسہ پیسہ جوڑ کر اپنی گرہستی بنائی ہے۔ اب کہیں چار سال ہوئے ایک ایسے علاقے میں فلیٹ لے پائے ہیں جہاں متوسط خوش حال طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر بھی ایک عجیب سا خوف شمیم کو ہمیشہ گھیرے رہتا ہے کہ تنکا تنکا جوڑ کر بنایا ہوا یہ آشیانہ کہیں اچانک اجڑ نہ جائے۔

"اتنا سوچتے کیوں ہو"؟ وہ ہمیشہ مجھ سے کہتی ہے "سوچ آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے"

اس رات جب ہم بستر پر یکجا ہوئے تو شمیم نے مجھے سمجھایا کہ دیکھو بہت زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ جو سچائی تم پر اب منکشف ہوئی ہے ہمارے دور کی ایک پامال سچائی ہے جس سماج میں ہم رہتے ہیں۔ اس میں کامیاب آدمی کی اہمیت ہے۔ اس لئے ہمیشہ بس اتنا یاد رکھو کہ تم ایک ایمان دار، ذہین، خوش مزاج اور محنتی آدمی ہو۔ تمام کمینگیوں، ذلالتوں اور خباثتوں کے باوجود۔ یہ ہمارا بنیادی اصول ہے اور تم ہماری تہذیب کے صحیح اور سچے نمائندے ہو۔

تو دوستو میں ہر وقت خود کو یقین دلاتا رہتا ہوں کہ میں ایک مخلص، شریف، ایمان دار اور محنتی آدمی ہوں، تمام کمینگیوں اور ذلالتوں کے باوجود۔ میں جو اپنی مرتی ہوئی تہذیب کا ایک صحیح اور سچا نمائندہ ہوں۔ کیونکہ تمام تہذیبیں مجھے ہر لمحے انحطاط پذیر معلوم ہوتی ہیں۔ جو ہر لمحے کسی نئی تہذیب کو جنم دے رہی ہوتی ہیں، اور کچھ بعید نہیں کہ میں خود کو یقین دلانے میں کامیاب ہو بھی جاؤں کہ مجھے الیکٹرک شاک سے واقعی ڈر لگتا ہے۔ پر اس سچائی کا کیا کروں جو پل پل چھن چھن میرے اندر ابلتی رہتی ہے۔ میں اس شمیم سے کہتا ہوں کہ سارے آئینے ہٹا دو، یا کم از کم انہیں ڈھانپ ہی دو مگر وہ مسکرا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔ مجھے

قومی راج

ں میں اپنا عکس نظر آتا ہے اور میں گھبرا کر اس کی
پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں ۔ تم کس کس کی آنکھوں پر ہاتھ
۔ وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہتی ہے ۔ ان گنت آنکھیں
ر آنکھ میں تمہیں اپنا چہرہ دکھائی دے گا ۔ خود کو فریب
یکھو کر یہ کامیابی کے لئے ضروری ہے ۔ شاید وہ سچ
۔ لیکن مجھے اس پر اور بے شمار دوسرے لوگوں پر تعجب
ہ ان کی کھوپڑیاں چٹخ کیوں نہیں جاتیں یا شاید انہوں
پنے صحیح چہرے نہیں دیکھے ۔ آخر انسان خود کو
فریب دے سکتا ہے ؟

ب میں بہت تھک گیا ہوں ۔ احباب پوچھتے ہیں تمہارے
ے جلد سفید کیوں ہو گئے ۔ ؟ چہرے پر جھریاں کیسے
؟ تم اس قدر بکھرے بکھرے کیوں لگتے ہو ؟ میں انہیں
ینا چاہتا ہوں مگر ان کے ماتھوں پر بل پڑنے لگتے ہیں۔
ں شعلہ بار آنکھیں کہتی ہیں یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے مگر
ئی اور بات نہیں کہہ سکتے ؟ کہو کہ تمہاری صحت
نہیں رہتی یا گھریلو ذمہ داریوں نے تمہاری کمر جھکا دی
عالمی سیاست کا گھن تمہاری روح کو چاٹ رہا
ہیں زندگی بے معنی نظر آ رہی ہے ۔ کوئی فلسفیانہ بات
یں کرتے کہ ہم تم سے مرعوب بھی ہو جائیں اور مطمئن
یکن اب میں واقعی تھک گیا ہوں ۔ اگر میں ایک
عام ، چھوٹا سا فرد ہوں تو اس سے آخر فرق ہی کیا
۔ اس چھوٹی سی بات سے لوگ ہراساں کیوں ہوں ؟
رے سچ بولنے سے آخر ان کی شخصیت میں کیا فرق
ہے ۔ ؟ کیا پتہ پڑتا بھی ہو کہ آئینہ خانے میں ایک
بھی بال آ جائے تو ہر آئینے میں بال آ جاتا ہے ۔ شاید اب
مجھے سمجھ میں آ رہا ہے ۔ لیکن اب میں بہت تھک چکا
بھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ کسی چوراہے پر کھڑا ہو جاؤں
چیخ کر لوگوں کو بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو آپ کو
وں ۔ جو آپ مجھے سمجھتے ہیں ۔ میں تو عام سا تشدد پسند ،
، حاسد اور چھوٹا سا آدمی ہوں مگر ایک ملک شاک ۔۔۔!
! اس کے تصور سے ہی میرا ذہن جھٹکے کھانے لگتا ہے۔
ب کیوں یہاں جمع ہیں ۔۔۔ ؟ یہ شمیم کی آنکھوں میں
یاری کیسی ۔۔۔ ؟ کیا یہ لوگ ابھی سے مجھے ہسپتال

میں داخل کرنے کا سوچ رہے ہیں ؟ ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا
مگر شاید یہ لوگ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے ——
مجھے چلانا چاہیئے ۔ اس سے پہلے کہ میرا ذہن برقی جھٹکوں سے
مختل ہو جائے مجھے اس سچائی کا اعلان کر دینا چاہیئے جو
مجھ پر منکشف ہوئی ہے ۔ میں دوڑ کر ٹیبل پر چڑھ گیا ہوں —
تو کیا گووند بھی اسی لئے —— مگر میں یہ سچائی کا اعلان
کن لوگوں کے سامنے کر رہا ہوں ۔ ارد گرد کے چہروں پر میں نظر
ڈالتا ہوں اور میرا دل ڈوب جاتا ہے ۔ یہاں سے وہاں تک
ہر چہرہ منافق ہے ۔ مگر شاید ان میں کوئی —— ان میں کوئی —

● ●

بقیہ صفحہ نمبر ۲۵ سے آگے ،
مہاراشٹر میں بجلی کی صورتِ حال

دیہاتوں کو برقیانے کے پروگرام کے تحت زرعی پمپوں کو بجلی فراہم کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے ریاست میں چھٹے پانچ سالہ پلان کے اخیر میں ۳۵۶ ر ۹۳۵ پمپوں کو بجلی فراہم کی گئی تھی سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۸۰۱ ر ۸ ر ۷ پمپوں کو بجلی فراہم کی گئی ۔ سال ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۰۰۰ ر ۹۰ پمپوں کا نشانہ مقرر کیا گیا جس میں ۷۶۶ ر ۴۰۰ ر ۱ پمپوں کا خاص نشانہ مقرر کیا گیا ۔ اس طرح مارچ ۱۹۸۷ء کے اخیر تک ۴۷۰ ر ۴۲ ر ۱۱ زرعی پمپوں کو بجلی فراہم کی گئی ۔

ریاست میں بجلی کی صورتحال

ریاست میں بجلی کی پیداوار کی استعداد ۵ ر ۳۶۷۰ میگاواٹ ہے جبکہ ۴۵۰۰ میگاواٹ کی مانگ ہے ۔ اسی طرح یومیہ ۸۵ ملین یونٹ انرجی درکار ہے ۔ اسی طرح ماہانہ ۲۵۰۰ ملین یونٹ خرچ کی جاتی ہے ۔ فی الحال صارفین کو کسی بھی طرح بجلی کی کٹوتی کا آرڈر نہیں کیا گیا جبکہ عام صنعتوں میں ۱۰ - ۱۵ فیصد بجلی کی کٹوتی کے آرڈر پر عمل آوری جاری ہے ۔ کاشتکاروں کو ۲۴ گھنٹے بجلی کی فراہمی کسی بھی پابندی کے بغیر دی جا رہی ہے ۔ ریاست میں بجلی کی صورتحال اطمینان بخش ہے ۔ بہت کرناٹک ، گجرات جیسی ریاستوں کو اُن کے مرکزی علاقوں میں بجلی کی سہولت دینے کی استعداد رکھتی ہے ۔

تبصرہ نگار
ریاض احمد خاں

عنوان :- مدوجزر
افسانہ نگار :- ثریا صولت حسین
طباعت :- شمسی فائن آرٹس. محمد علی روڈ ناگپور
قیمت :- ۱۵ روپئے

"مدوجزر" ثریا صولت حسین کے ۱۵ افسانوں، پانچ انشائیوں اور مزاحیہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ "مدوجزر" کے پہلے ثریا صولت حسین کے افسانے نظروں سے گذرے ہیں جن سے اندازہ ہو گیا تھا کہ افسانے کی تکنک، پلاٹ اور منظر کشی ثریا کے لئے نئی نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ لکھتے وقت یا پلاٹ کو لینے کے لئے انھیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ وہ اپنے افسانوں کو روزمرہ کی زندگی کے تجربوں سے تخلیق کرتی ہیں حالانکہ افسانوں کے پلاٹ میں جدت نہیں ہوتی ہے مگر خوبی ضرور ہوتی ہے کہ اسے مکمل کئے بغیر کتاب کو رکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ جہاں تک خیالات کے اظہار کا تعلق ہے ثریا سیدھے اور آسان الفاظ استعمال کرتی ہیں جس سے ان کی تحریر میں معنویت اور تاثر پیدا ہو جاتا ہے جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی تحریر سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"مدوجزر" میں شائع شدہ افسانہ "بیگم" ایک نفسیاتی افسانہ ہے۔ بیگم صاحبہ کی عمر جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے ان کے دماغ میں یہ بات گھر کرتی جاتی ہے کہ اب وہ حسین اور جمیل نہیں رہیں۔ نیز یہ کہ اب نواب صاحب ان میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس خیال کو مزید تقویت کالی کلوٹی "ستارہ بیگم" جو بیگم کی خاص اور ذاتی خدمت گار ہے کی ابھرتی جوانی پہونچاتی ہے۔ حالانکہ نواب صاحب ایک شریف النفس شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ بیگم کو خوب اچھی طرح معلوم ہے مگر کیونکہ عمر کے تقاضے انھیں کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اس وجہ سے بیگم نواب صاحب سے ہی بدظن ہو جاتی ہیں۔ کہانی کے اس الجھاؤ کو ثریا صولت حسین نے بڑی خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے جس سے نواب صاحب اور بیگم کی ازدواجی زندگی میں دوبارہ خوشیاں لوٹ آتی ہیں۔

اسی طرح "ایک صلیب اور" میں گولڈی اپنی خوشی کو ترک کر فادر پیٹر کے خواب کو پورا کرنے کا عزم کرتی ہے کیونکہ گولڈی کی خوشی اس کی ذاتی خواہش ہوتی ہے اور فادر پیٹر گولڈی کو سبھی دکھی دلوں کی شہزادی بنانا چاہتے ہیں اس کہانی میں گولڈی کے جذبۂ ایثار اور قربانی کی ثریا صولت حسین نے عمدہ عکاسی کی ہے۔

انشائیوں اور مزاحیہ خاکوں میں "نیند پری"، "یوراز"، "اندھے عقائد"، "رنگ بہار" اور "ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں" اپنی نوعیت کی پر اثر تحریریں ہیں۔

"نیند پری" کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ کسقدر مہربان نا وفا شعار ستم شعار۔ کوئی تیز و طرار تو کوئی سست رفتار۔ کو سنجیدہ تو کوئی شرارتی ہوتی ہے۔

ناگپور کی بزرگ شخصیت جناب منشا الرحمن خاں منشا نے تعارف میں ثریا صولت حسین کی ادبی خدمات اور ان کی تخلیقات کے بارے میں معلومات بہم پہونچائی ہیں۔

ثریا صولت حسین نے اس کتاب کا انتساب اپنے شوہر سید صولت حسین کے نام کیا ہے۔

"مدوجزر" ایک صاف ستھری کتاب ہے اور قیمت کے لحاظ سے بھی معقول یعنی صرف پندرہ روپئے۔ عمدہ کاغذ اور بہتر طباعت اس کتاب کی خصوصیت ہے۔

اسے حاصل کرنے کے لئے ثریا صولت حسین بنگلہ نمبر ۲ نزد ریلوے کوارٹرس سول لائن ناگپور ۔۔۔ اور شمسی فائن آرٹ پریس محمد علی روڈ ناگپور سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی خوبصورت طباعت کے لئے شمسی فائن آرٹ پریس بھی قابل مبارکباد ہے۔

تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدیں بذریعۂ رجسٹری مرحمت فرمائیں

دیہی علاقوں میں لوگ بھیانک خشکسالی میں جھلس رہے ہیں
آپ انہیں اپنے تعاون اور ہمدردی کا سایہ فراہم کریں
وزیر اعلیٰ کے امدادی فنڈ میں فراخدلی سے عطیہ دیں۔

میں نے پانی کو کبھی سر سے گزرنے نہ دیا

• عروج زیدی
محلہ گھیر کوٹھیاں
رامپور - یوپی

ڈال سے ٹوٹے ہوئے اشکوں کو بکھرنے نہ دیا
ہم نے تاروں کو شبستاں میں اترنے نہ دیا

میرے ماحول میں جب تک تھے اجالے رقصاں
یہ حقیقت ہے مرا ساتھ نظر نے نہ دیا

اہلِ تہذیب کو تنقیص مبارک ، لیکن
ہمیں الزام کسی خاک بسر نے نہ دیا

غمِ جاناں سے اس احسان کا بدلہ کیا ہے
نقش پائے غمِ دوراں کو ابھرنے نہ دیا

یہی آوارگیٔ شوق کا ممنون ہوں میں
ایک بھی سجدہ طلب در پہ ٹھہرنے نہ دیا

نقشِ ہستی میں کوئی رنگ تو میں بھر لیتا
اتنا موقع بھی مجھے شام و سحر نے نہ دیا

نبضِ طوفاں پہ مری انگلیاں رہتی ہیں عروج
میں نے پانی کو کبھی سر سے گزرنے نہ دیا

• غنی اعجاز
انجمن اردو مصنفین ، ڈاکٹر انصاری روڈ
اکولہ (ودربھ)

جھوٹی تسلیوں پہ رضامند ہو گئے
اپنی ہی خواہشات کے پابند ہو گئے

سوئے جو ہم تو آنکھ کا کاجل چرا لیا
کس درجہ بہرہ دار ہنرمند ہو گئے

رخ پر تھے اور بھی کئی چہرے چڑھے ہوئے
ہونے کو بے نقاب تو ہر چند ہو گئے

کوہِ گراں بھی لا نہ سکے زلزلوں کی تاب
جھپکی پلک زمین کا پیوند ہو گئے

ڈستا رہے گا خوف کا جنگل تمام رات
یعنی فصیلِ شہر کے در بند ہو گئے

حیرت ہے یہ موسم کا چلا کون سا جادو
وہ زہر ہلاہل تھے مگر قند ہو گئے

اعجاز آندھیاں بھی بڑا کام کر گئیں
جتنے جنوں زدہ تھے خردمند ہو گئے

• شفیق عباس
۱۹۲ - ڈی ۔ این ۔ روڈ
بمبئی ۱

ماسوا اپنے کسی اور پہ ایمان نہیں
تو مجھے بھول سکے گا ، مرا ایقان نہیں

فاصلے وقت کے رشتوں کی صلابت ٹھہرے
میں کبھی دور ہوا تجھ سے ؟ نہیں جان ! نہیں

جا بجا شہر میں چرچے سنے سرگوشی کے
کوئی کہتا تھا کہ دیواروں کے ب کان نہیں

اک تڑپ سب کو جو ٹکرا کے گزر جاتی ہے
ماسوا میرے کسی اور سے پہچان نہیں

نوکِ ہر خار پہ بیتابیٔ دیدہ پر کھا ہنوز بار
ظرفِ دیدار رہیت یا تک تو مری جان نہیں

یاں فقط اپنے مذاہب سے وفاداری ہے
میری بستی میں کہیں کوئی بھی انسان نہیں

ہو تشفی بھی تری ، میرا بھرم بھی رہ جائے
سن لے ہر بات ، قسم تجھ کو مگر مان نہیں

ذوقِ نظارہ نگر چھوڑ کے نکلا ہوتا
اب کے شاید کسی منظر میں کوئی جان نہیں

حسبِ منشا ملے ہر مال تقاضا کیسا
یہ مرا فن ہے کوئی بنئے کی دوکان نہیں

جس پہ بیٹھا تھا اسی شاخ کو کاٹا ہے شفیق
جو بھی کچھ لوگ کہیں ، میں کوئی نادان نہیں

قومی را

...یر عثمانی
(ریٹائرڈ پرنسپل)
نیازیان، امروہہ (یو پی)
244221

...ضمین بر غزل نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

...کا انجام خوشی ہو وہ لال اچھا ہے   صاف کہنے کی نہیں ہے جو مجال اچھا ہے
...و کرنے کا ان سے یہ خیال اچھا ہے   غیر کے نام سے پیغامِ وصال اچھا ہے
چھیڑ کا جس میں مزہ ہو وہ سوال اچھا ہے

...کہتے ہیں یقیں چاہے کرو یا نہ کرو   دوسرا کوئی زمانے میں نہ تم سا ہے نہ ہو
...پر حسنِ مجسم کے نہ اتنا بگڑو   اپنی تعریف سے چڑتے ہو اگر جانے دو
چشم بد دور ہمارا ہی جمال اچھا ہے

...نے میں مجھے کچھ راز کہیں اور نہ ہو   کان میں ان کے کسی نے نہ کہا ہو کہ چلو
...بیمار بنا ہے تم اسے دیکھو تو   وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

...پر ان کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی   ان کی بڑھتی ہوئی وحشت نہیں دیکھی جاتی
...ہوئی جاتی ہے صورت نہیں دیکھی جاتی   دیکھنے والوں کی حالت نہیں دیکھی جاتی
جو نہ دیکھے وہی مشتاقِ جمال اچھا ہے

...بد سے بچانے کو لیا اس کو چھپا   تاکہ مخلوقِ خدا کا نہ ہو انگشت نما
...لِ فلکی سامنے اس کے ہے کیا   یا دکھا دو مجھے تم پاؤں کا ناخن اپنا
یا یہ کہہ دو مرے ناخن سے ہلال اچھا ہے

...ب روؤں کے بھلا اشک کہیں بہتے ہیں   مرگِ عاشق کے وہ صدمے کہیں سہتے ہیں
...ہیں مرنے کی ان کی وہ لگے رہتے ہیں   دل میں ہیں تو خوش ہیں تسلی کو مرے کہتے ہیں
آپ مرنے کے نہیں آپ کا حال اچھا ہے

...دیر آپ کسی پر بھی بھروسہ نہ کریں   حال کو اپنے خدا کے لئے خستہ نہ کریں
...ہی اپنی جفاؤں کا کبھی شکوہ نہ کریں   آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

• عتیق احمد عتیق
454 نیا پورہ
مالیگاؤں 423203
(ناسک) مہاراشٹر

غزل

چھو گیا تشنہ لبوں جو منہ سے پیالہ پیاس کا
ایک قطرے میں سمٹ آئے گا دریا پیاس کا

پانی پانی ہو گیا تو دیتا صحرا پیاس کا
خشک ہونٹوں سے مرے لپکا جو شعلہ پیاس کا

نو بہ نو سمتوں کو بھی گلہائے خوں سے بھر دیا
طے کیا کچھ اس جتن سے ہم نے رستا پیاس کا

اپنے ہی دم خم کو چلنے ہے کڑکتی دھوپ میں
جلتے لمحوں کا شجر، پھیلا کے سایا پیاس کا

دکھ کی پتھریلی چٹانیں، بہہ نکلتے توڑ کر
دل کے جھرنوں میں کہاں تھا اتنا بوتا پیاس کا

سچ تو یہ ہے وہ مری ہی جستجو کا کرب تھا
لے اڑا مجھ کو سرابوں تک جو لہرا پیاس کا

برف کی یہ سل نہ ٹوٹی تیشۂ مے سے تو ہم
دھوپ ہی پی کر کریں گے حل معمہ پیاس کا

قطرے قطرے، دانے دانے کو سراپے ہے عتیق
بھوک کی ٹہنی پہ بیٹھا اک پرندہ پیاس کا

ہم آئینے کے سامنے آئے تو ڈر گئے

★ محمد صابر کامران
گاندھی آئی ہاسپٹل کالونی
ای ۱۹ رام گھاٹ روڈ
علیگڑھ

★

غزل

کیسا یہ تیرے شہر کا بازار ہے بھائی
ہر شخص سرابوں کا خریدار ہے بھائی

اس شہر کے حاکم کے لئے کچھ بھی نہ کہنا
اس شہر میں وہ صاحب کردار ہے بھائی

اس راہگذر میں تو نہ تھا سائباں کوئی
ڈرنے کا سبب سایۂ دیوار ہے بھائی

یہ شہر کسی ملک کی سرحد تو نہیں ہے
ہر شخص یہاں برسرِ پیکار ہے بھائی

ہے کتنی عجب بات کہ اس بزم طرب میں
موضوعِ وفا باعثِ تکرار ہے بھائی

آیا ہے ابھی غیر ممالک سے وہ صابر
وہ دوست مرا صاحبِ دنیا ہے بھائی

★ راشد صدیقی
۲۹۵ خونی پور
گورکھپور

غزل

آئے نظر نہ مجھ کو زمانے گذر گئے
وہ لوگ جو کہ اپنے تھے جانے کدھر گئے

ایسی چلی چمن میں تعصب کی اک ہوا
گل کے ورق ورق کی طرح ہم بکھر گئے

خود اپنی شکل اپنی ہی صورت کو دیکھ کر
ہم آئینے کے سامنے آئے تو ڈر گئے

دیتے ہیں جو فریب مجھے، ان کو کیا خبر
مجھ سے ہی جانے کتنے مقدر سنور گئے

جو لوگ تھے فریب زمانہ سے آشنا
اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مر گئے

صدیاں کرینگی یاد ہمارے وجود کو
ہم پیکرِ خلوص عجب کام کر گئے

یہ بھی تو شانِ عشق ہے راشد کہ اسکے گھر
جانا نہ چاہیئے تھا ہمیں واں مگر گئے

★ رفیق جعفر
۹۱/۱۱ مالونی کالونی ۶
(باندرہ پلاٹ) پوسٹ کھاروڈ
بمبئی ۴۰۰۰۹۵

غزل

یا کوئی شعر کہوں یا کہ فسانہ لکھ
سوچتا ہوں کہ ترے نام میں کیا کیا آ

یہ مرا شہر نگاراں ہے فقط شہر ہو
جی میں آتا ہے اِسے پیاس کا دریا

عصر حاضر پہ کہوں شعر یہ منظور ہے
شعر کے نام پہ کیا جہل کا قصہ لکھ

کوئی حرکت کی تڑپ ہو نہ دلوں میں
ایسی قوموں کے لئے لفظ میں مردہ

وہ بھٹکتا ہی رہے گا یونہی سڑکوں
تیرے احساس کو میں ایک تماشہ لکھ

خشک سالی سے راحت کے لئے فنڈ تیزی کے ساتھ جمع کیجئے

وزیراعلیٰ کی اپیل

وزیراعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ افراد کی راحت کے لئے نقد اور اشیاء فراہم کرنے میں تیزی دکھانے کی ضرورت پر زور دیا۔ آپ ۲۷ اپریل کو منترالیہ میں ریاستی سطح کی خشک سالی راحت کمیٹی کی ایگزیکیٹو اور ۴۳ ضمنی کمیٹیوں کے کنوینر اور چیرمینوں کی منعقدہ میٹنگ سے خطاب فرما رہے تھے۔

وزیراعلیٰ نے فرمایا کہ عوام بڑی تعداد میں ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے بے چین ہیں مگر ان لوگوں تک رسائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ۴۳ ضمنی کمیٹیوں کے قیام کا مقصد عوام کو راحت کے کاموں میں شامل کرنا ہے۔ آپ نے ضمنی کمیٹیوں سے ان کا کام تندہی کے ساتھ کرنے کی اپیل کی۔ وزیراعلیٰ نے فرمایا کہ وہ جب بھی منترالیہ میں ہوں گے تو وہ ایک گھنٹہ شام ۵ بجے سے ۶ بجے تک روزانہ خشک سالی سے راحت کاموں کے لیے موجود رہیں گے

ابتدا میں وزیر محصول شری ولاس راؤ دیشمکھ نے تعارفی تقریر میں فرمایا کہ پینے کے پانی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ اور پینے کا پانی ۳۰۰ دیہاتوں کو ٹینکروں کے ذریعہ فراہم کیا جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اے اور بی کلاس کے میونسپل شہر جن میں پینے کے پانی کی مستقل سہولتیں دستیاب ہیں وہ بھی خشک سالی کی وجہ سے پینے کے پانی کی کمی کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خشک سے متاثرہ علاقوں میں راحت کاموں کے لئے ۵۰۰ سے ۵۵۰ کروڑ روپئے کی ایک خطیر رقم درکار ہے۔ آپ نے ضمنی کمیٹیوں کو ان کے کام بڑی تندہی اور ذمہ داری کے ساتھ کرنے کی تلقین کی۔

شری دیشمکھ نے فرمایا کہ راحت کے کاموں کے لئے ایک سازگار ماحول قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاستی کونسل میں حزب مخالف کے لیڈر شری آر ایس گوائی نے اپنی تقریر میں بمبئی شہر سے خشک سالی راحت فنڈ کے لیے کم از کم ۴۰ کروڑ اور زیادہ سے زیادہ سو کروڑ روپئے جمع کرنے کا مشورہ دیا۔

بی پی سی سی (آئی) کے صدر شری مرلی دیورا نے اپنی تقریر میں اب تک موصول شدہ عطیات کی تفصیلات دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس فنڈ میں ۱۰ کروڑ ایک لاکھ اور ۸۵ ہزار کی رقم جمع کی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ۳ ٹینکر، ۴ سیمنٹ ٹینکر ٹرک، الکٹرک پمپ وغیرہ اب تک حاصل ہو چکے ہیں اور ایک کرکٹ میچ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا آپ نے فرمایا کہ شریمتی لتا منگیشکر، اور شری امیتابھ بچن، ایم۔ پی نے فنڈ بڑھانے کے لئے ایک پروگرام پیش کرنے کی پیشکش کی ہے

راجیہ سہکاری ساکھر کارخانہ مہاسنگھ کے وائس چیرمین شری شیواجی راؤ جی پاٹل نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ شکر کے امداد باہمی کے کارخانوں کی طرف سے اب تک ۶۲ کروڑ روپئے کی امداد دی جا چکی ہے اور جلد ہی ایک کروڑ روپئے کی مزید امداد دی جائے گی۔

اس میٹنگ میں حاضر ہونے والوں کے نام اس طرح ہیں۔ شری این۔ ڈی۔ پاٹل، شریمتی شرایو ٹھاکر، شری پی کے انا پاٹل۔ شری ہشو ایڈوانی، شری دیسے کلانتری، شری گلاب

(باقی صفحہ نمبر ۴۲ پر)

ڈی راج

گورنر کے ہاتھوں
کوی بھوشن کی "شیواجی پرشاستی" کا افتتاح

شیواجی مہاراج کی تمام مذاہب کی یکساں عزت اور تمام دھرم کے فرقوں کو ان کے عقائد کے مطابق آزادی کی اپنائی گئی سیکولرازم پالیسی کی روشنی میں ہمارا دستور مرتب کیا گیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار یکم مئی کو یہاں گورنر شنکر دیال شرما نے کیا۔

گورنر موصوف گذشتہ شام راج بھون میں شیو جینتی کے موقع پر مہاکوی شیواجی مہاراج پر لکھی ہوئی منتخبہ نظموں کے مراٹھی ترجمہ کی کتابچہ "شیوراج پرشاستی" کا افتتاح بھی فرمایا۔

گورنر موصوف نے حکومت مہاراشٹر کو اس کتابچہ شائع کرنے پر مبارکباد دی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ مہاکوی بھوشن کی شیواجی مہاراج کو پیش کی گئی خراج کو اب عام آدمی بھی پڑھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر شرما نے فرمایا کہ بنڈیل کھنڈ کے باشی مہاکوی بھوشن نے شیوراج بھوشن لکھی ہے جو کہ چھترپتی شیواجی مہاراج کی زندگی کے حالات پر مبنی ہے۔

مہاکوی بھوشن نے اپنی شاعری کے ذریعے شیواجی مہاراج کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ شیواجی مہاراج کے حالات اور ان کے نظریات پیش کرکے ہم عوام میں قومیت کے جذبے کو مزید بیدار کرسکتے ہیں۔

شریمتی اندرا گاندھی کا حوالہ دیتے ہوئے گورنر موصوف نے فرمایا کہ شیواجی نہ مہاراشٹر اور نہ ہی بھارت بلکہ وہ ساری دنیا کے لیڈروں میں سے ایک تھے۔

شیواجی مہاراج کو ایک عظیم قوم پرست اور سچا سیکولر لیڈر قرار دیتے ہوئے گورنر موصوف نے فرمایا کہ ہم اس عظیم شخصیت کے بتلائے ہوئے اصولوں ہی پر چل کر ہم اسکو بہترین طریقے سے خراج عقیدت پیش کرسکتے ہیں۔

تقریب کے صدر وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان نے شیواجی کی تعلیمات کو ہماری روزانہ کی زندگی میں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کوی بھوشن کے متعلق وزیر اعلیٰ نے فرمایا کہ انھوں نے شیواجی کو قریب سے دیکھا تھا اس لئے اس شاعر نے اس عظیم لیڈر کی گوناگوں شخصیت کو اپنی تاریخی نظم میں بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

شری دنیش افضل پورکر سکریٹری انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ شری پرمود مانے ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز نے شکریہ ادا کیا۔

تقریب میں شاہر وٹھل اومبے اور پارٹی کی جانب سے شیواجی کی زندگی کے متعلق نغمات پیش کئے۔

اس موقع پر لجسلیٹو اسمبلی کے چیرمین شری شنکر را جگتاپ، وزیر مملکت برائے انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈاکٹر شری کانت جچکار بمبی کے میئر ڈاکٹر رمیش پربھو اور چیف سکریٹری شری سکھتنکر بھی موجود تھے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے جلسۂ تقسیم انعامات میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے۔ آپ کے دائیں طرف گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور شری سید احمد بھی نظر آ رہے ہیں۔

ادیب و شاعر ملک کے لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام انجام دیں

——— گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما

آزادی کے معنی ہمارے ملک کے عظیم لیڈروں کے نزدیک سیاسی
زادی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ یہاں وہ اقتصادی اور نظریاتی
زادی بھی لانا چاہتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار گذشتہ شام کو بمبئی
ے سدھم کالج ہال میں گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے
ل ہی میں بمبئی میں منعقدہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے تقسیم انعامات کے جلسہ
یں کیا۔ گورنر موصوف نے فرمایا کہ شیواجی مہاراج کی جنگ کسی دھرم
کے خلاف نہ تھی بلکہ وہ ظلم و ستم کے خلاف لڑ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے
دورِ حکومت میں تمام دھرم کے لوگوں کو ان کے عقائد کے مطابق آزادی
دے رکھی تھی۔ گورنر موصوف نے فرمایا کہ ہمارے ملک کے ادیبوں اور
شاعروں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام کے دلوں
کو جوڑنے کا کام انجام دیں
اس موقع پر گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے مہاراشٹر اسٹیٹ

اردو اکادمی کی جانب سے شیواجی مہاراج پر شائع کردہ ایک کتابچہ کا
اجراء بھی فرمایا نیز آپ نے اکادمی کے سال ۱۹۸۶ء کے انعامات یافتگان کو
انعامات بھی تقسیم کیے۔

وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے اپنی صدارتی تقریر میں انعامات
حاصل کرنے والوں کو مبارکباد دی نیز آپ نے حاضرین جلسہ کو شیوجینتی اور
یوم مہاراشٹر کی مبارکباد دی۔ آپ نے مسلمانوں سے ماہِ صیام کے مہینے میں
ملک و ریاست کی سلامتی اور خوشحالی کی دعا کرنے کی درخواست کی۔ وزیر اعلیٰ
نے اس موقع پر فرمایا کہ اردو زبان کی یہ خوبی ہے کہ وہ بھارت میں بسنے
والے مختلف فرقوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے آپ نے مزید فرمایا کہ
آج اگر ہم ایک ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی
اس موقعہ پر وزیر اعلیٰ نے اردو گھر قائم کرنے میں حکومت کی ہر
ممکن امداد کی یقین دہانی کی۔

اس موقع پر مولوی قمر سیمابروی اور ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاء نے
وزیر اعلیٰ کی خدمت میں شیواجی سے متعلق کہی گئی ان کی نظموں کا خوبصورت
فریم پیش کیا۔

اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر ظ انصاری نے نظامت کے فرائض انجام
دیے جبکہ وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ اوقاف شری سید احمد نے شکریہ ادا کیا۔

بی راج

گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کے ڈائرکٹر
شری۔ آر۔ بی الوا سبکدوش

ڈاکٹر شری کانت جِکار، وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز نے ڈائرکٹر گورنمنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری شری آر بی الوا کو گرمجوشی کے ساتھ رخصت کیا شری الوا یکم مئی ۱۹۸۶ء کو گورنمنٹ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ان کے اعزاز میں ۲۹ اپریل کو صبح منترالیہ میں وزیر موصوف کے چیمبر میں ایک سادہ سی تقریب منعقد کی گئی۔

شری الوا بمبئی یونیورسٹی کے ڈبل گریجویٹ ہیں۔ آپ نے مختلف عہدوں پر حسن وخوبی اپنے فرائض انجام دئیے ہیں سبکدوشی کے وقت آپ محکمہ کے ڈائرکٹر کی پوسٹ پر فائز تھے آپ حکومت کی ملازمت میں بطور گزیٹیڈ افسر شامل ہوئے آپ کو یکم مئی ۱۹۶۰ء کو گجرات سے نئی تشکیل شدہ ریاست مہاراشٹر میں منتقل کیا گیا۔ آپ نے گورنمنٹ سنٹرل پریس بمبئی میں مختلف عہدوں اور پونے اور ناگپور کے پریسوں میں کام کیا ہے۔

اس مدت کے دوران آپ کو کولمبو پلان اسکالر شپ اور [illegible] آپ کو [illegible] کے لیے [illegible] ڈی پرنٹنگ پر [illegible] کے لیے [illegible] آپ کی [illegible] مشینوں سے [illegible] کے لئے آپ نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

آپ ڈسپلن کے بے حد پابند تھے آپ طباعت کے کاموں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ آپ کی رہنمائی میں گورنمنٹ پرنٹنگ پریس نے بہترین طباعت کے لئے قومی سطح کے انعامات حاصل کئے ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۴۸ سے آگے

بقیہ اپیل وزیر اعلیٰ

شری بی کے کیڈیا۔ شری این این پی۔ شری سریا بھان واہاڈنے شری بی اے ڈیسائی، شری آر۔ پی۔ گمنی پوریا، شری دھرم چاند چوپڑ دیا۔

اس موقع پر وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان کو خشک سالی راحت فنڈ کے لیے مندرجہ ذیل افراد نے چیک پیش کئے۔ ۵۲۶۹۰۱ روپئے کا چیک شری شیواجی راؤ پاٹل کی جانب سے ۹،۴۴،۸۱ روپے کا چیک ہوتاتما کسان امیر کو آپریٹو شوگر فیکٹری ولا، ضلع سانگلی کی جانب سے ۱۰،۱۳۱،۰۰۰ روپے کا چیک نندا کن کو آپریٹو شکر کارخانہ ہنگری ضلع دھولے کی جانب سے اور ۲۵،۰۰۰ روپے کا چیک اپیا کی جانب سے شری این این سیتی نے دیا۔

اس موقع پر شری شنکر راؤ جگتاپ اسپیکر ریاستی لیجسلیٹو اسمبلی شری سوشیل کمار شندے وزیر محصول شری بھائی ساونت، وزیر صحت عامہ ڈاکٹر وی سبرامنین وزیر ریاست شری پربھاکر داوڑے، محمد رالیم۔ پی سی ڈی آئی کے شری کے جی پرانجپے چیف سکریٹری، شری ڈی رنگاناتھن سکریٹری ریلیف اور دیگر حضرات بھی موجود تھے۔

پاسیہ تلسی کی گولڈن جوبلی تقریبات کے سلسلہ
۲ر مئی کے روز برلا او شری سبھا گرہ میں
ر سند شری گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں سابق
ر اعظم شری مرارجی ڈیسائی کو "امنیا ایوارڈ"
یا۔ گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما بھی تصویر میں
ر آرہے ہیں۔

یوم مہاراشٹر کے موقع پر گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر
شنکر دیال شرما، کمار شوجیت سدو، کو
"جیون رکشا" ایوارڈ دیتے ہوئے۔

شری کاشی پرشاد دوبے، سابق ایڈیٹر مہاراشٹر
س" (ہندی) اور لوک راجیہ" (انگلش) کو انکے
ہدے سے سبکدوش ہونے پر الوداعیہ دیا گیا۔
ر یکٹر جنرل برائے اطلاعات و رابطہ عامہ
ری پر سوماتے ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے
ری کاشی پرشاد دوبے کو اس موقع پر تحفہ
ش کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں

گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے یکم مئی کو بہترین خدمات انجام دینے پر پولیس افسران کو پولیس میڈل سے نوازا۔ مندرجہ بالا تصویر میں کالبا دیوی ڈویژن کے اسسٹنٹ پولس کمشنر شری ایس آر مشرا گورنر کے ہاتھوں میڈل حاصل کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں

"خشک سالی راحت فنڈ میں دل کھول کر دیجئے"۔ وزیر اعلیٰ کی اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے محکمۂ پولس کے جونیئر پولس ڈائریکٹر جنرل نے ۵۰،۰۶۴،۴۳ روپے اس مد میں بطور عطیہ دئے۔ اس رقم کا ڈرافٹ خرید کر وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ تصویر میں پولس جنرل شری سوریہ کانت جوگ، وزیر اعلیٰ کو پیش کر رہے ہیں۔ شری جے بی ساجن، مملکت برائے داخلہ بھی تصویر میں نظر آ رہے ہیں۔

۲۰ اپریل کو مسٹر دیمیترا ڈرووتو وک فیڈرل سکریٹری (منسٹر) برائے اطلاعات یوگوسلاویہ کی ممبئی تشریف آوری پر وزیر مملکت برائے میزبانی ڈاکٹر شری کانت جچکار آپ کا استقبال کرتے ہوئے۔

وزیراعلیٰ کے خشک سالی راحت فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیں

وزیراعلیٰ کے "خشک سالی راحت فنڈ" میں چندہ وصول کرنے، نیز راحتی منصوبہ جات
کے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹیو سیل

سچیوالیہ جیمخانہ، پہلا منزلہ جنرل جگن ناتھ راؤ بھوسلے مارگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲

میں ۲۱ رجنوری ۱۹۸۶ء سے جاری کیا گیا ہے۔

اگر آپ اپنا عطیہ چیک کی صورت میں دینا چاہیں تو اپنا چیک

"Chief Minister's Relief Fund"

کے نام جاری کریں۔ انکم ٹیکس قانون دفعہ ۸۰ جی کے مطابق مذکورہ بالا نام سے "راحت فنڈ" میں دی جانے والی رقم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔

وزیراعلیٰ راحت فنڈ میں چندہ دینے والے افراد اور اداره جات کی جانب سے عطیات کی وصولی سنیچر اور اتوار کو چھوڑ کر روزانہ صبح ۱۱ بجے سے شام ۵ بجے تک کی جاتی ہے

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

...س شمارے سے اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ...یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم ...ری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجیے تاکہ رسالہ آپ کی ...ت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمادیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمادیں۔

(ادارہ)

• مسعود عالم

بیت السرور، ۱۵۸ - کارٹر روڈ، باندرہ - بمبئی ۵۰

"قومی راج" مہاراشٹر گورنمنٹ کی کارکردگی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں جدّوجہد اور ترقی کی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ ادبی حصّہ سطحی ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی لکھنے والوں کو اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر حاصل ہوتی ہے۔ علمی و ادبی تخلیقات علوم و فنون پر بصیرت اور دسترس کے بعد مقام حاصل کرتی ہیں۔ کیوں نہ آپ کا ادارہ صفِ اوّل کے دانشوروں کی فہرست مرتّب کرے اور ان سے مضامین حاصل کرنے کی کوشش۔ "قارئین کی رائے" کے تحت جو خطوط شائع ہوتے ہیں بیشتر وہ لوگ ہیں جو اپنا نام اور خط میگزین میں دیکھ کر دوستوں کو دکھاتے پھرتے ہیں۔

"الیکٹرانک عہد" میں ادب کا معیار بھی بدل رہا ہے پھر ونا سپتی ادبی تحریروں سے رسالہ کو بھرنا، بس دفتری خانہ پُری محسوس ہوتا ہے۔

آپ مصلحتوں سے بلند ہو سکیں تو میرا یہ معروضہ "قومی راج" میں چھاپ کر ردِّ عمل ملاحظہ فرمائیں۔

• محمد عارف احمد خاں

مکان نمبر ۹ - ۲۰ - ۱ ، باغ یمین ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

"قومی راج" بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ یہ ہر نوعیت اور ہر لحاظ سے بلند اور معیاری ہے۔ ہر ماہ بروقت دستیاب ہو رہا ہے۔ سرکار کی نئی اسکیموں اور پروگراموں کے ساتھ ریاستی معلومات، غزلیں، ادبی مضامین سے اُردو داں حضرات کو کافی معلومات ملتی ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ "قومی راج" کے تمام معاونین کی عمریں دراز کرے اور "قومی راج" دن بہ دن ترقی کرتا رہے

میری جانب سے مبارکباد

• محمد صادق (معاون مدرس)

سوشیل سوسائٹیز ہائی اسکول، سائی، تعلقہ
سازگاؤں، ضلع رائے گڑھ (۴۰۲۱۱۷)

"قومی راج" کا "یوم جمہوریہ نمبر" باصرہ نواز ہوا۔ میوارام گپت کا مضمون "شہیدِ وطن سردار بھگت سنگھ" کافی پسند آیا۔ مہاراشٹر کے ثانوی مدارس میں پڑھائی جانے والی "کمار بھارتی" میں ان کا اسی طرح کا ایک مضمون شاملِ نصاب ہے۔ جس کا عنوان "شہیدِ وطن - اشفاق اللہ خاں" ہے جو ہندوستانیوں کے خوابیدہ ذہنوں میں آزادی اور وطن دوستی کا صُور پھونکتا ہے۔ میوارام گپت نے اپنے مضمون میں اشفاق اللہ خاں کے ساتھ ساتھ پنڈت رام پرشاد بسمل کا بھی تذکرہ کیا ہے جو "کاکوری سازش" میں اشفاق اللہ خاں کے ساتھ پیش پیش تھے اور اُن کے دوست اور بھائی سے بڑھ کر تھے۔ اگر میوارام گپت، پنڈت رام پرشاد بسمل سے متعلق بھی اپنے قلم کا جادو دکھائیں تو یہ اُردو میں زبردست اضافے کا باعث ہوگا۔ ان سے اُمید کروں گا کہ وہ اس جانب خصوصی توجّہ دیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبدالرحیم صاحب کا مضمون "اُردو ڈراما اور قومی یکجہتی" بھی خوب سے خوب تر کی غمازی کرتا ہے۔ سیّد صاحب نے جہاں چھوٹے بڑے ڈرامہ نگاروں کا تذکرہ کیا ہے وہیں شاید روانی میں ایک جگہ بہہ گئے۔ اُردو ڈراموں کی تاریخ "انارکلی" کے بغیر شاید ادھوری رہ جائے۔ جتنی شہرت اور مقبولیت اُردو ڈراموں میں "انارکلی" نے حاصل کی، شاید اردو کا کوئی اور ڈرامہ اس کی برتری کو پہنچے۔ اس کے علاوہ جناب امتیاز علی تاج کے ڈراموں کا ایک لافانی کردار "چچا چھکن" کا ہے۔ جو ہنسی اور مسکراہٹ کے پسِ پردہ اپنے اندر گہرا طنز چھپائے ہوئے ہے۔ بہرحال دونوں مضمون نگاروں کو پُرخلوص مبارکباد۔

PRINTED AT THE GOVT. PHOTOZINCO PRESS, PUNE—1987

ٹیگور کے اعلیٰ اصولوں کو اپنا نصب العین بنایئے

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۹ رمئی کے دن عوام کو تلقین کی کہ وہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بتلائے ہوئے اصولوں کو اپنا نصب العین اور اس عظیم شاعر کے نظریات کو مشعلِ راہ بنائیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۲۶ ویں سالگرہ کے موقع پر شائع کردہ کتاب — "رابندر ناتھ ٹیگور اور رابندر سنگیت" کی جلدوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ ٹیگور کی پیدائش ایک ایسے دور میں ہوئی تھی جو ادبی، مذہبی اور سیاسی انقلاب سے پُر تھا شری گاندھی نے فرمایا کہ ٹیگور کی زندگی ان تمام انقلابات کا مجموعہ تھی۔

شری پی آر داس منشی وزیر مملکت برائے تجارت نے، جو ٹیگور کی سالگرہ تقریب سے وابستہ گروپ کی رہنمائی کرتے تھے ان صد سالہ سالگرہ کی جلدوں کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر پیش کیا تھا۔

ٹیگور کے لائے ہوئے روحانی انقلاب کا تذکرہ کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ انھوں نے سالہا سال سے خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو نیند سے بیدار کیا تھا۔

وزیر اعظم نے فرمایا ادبیات کے میدان میں ٹیگور ہر موقع پر صدر نشین رہے اور عظمت کی ان بلندیوں پر پہنچے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ وہ ایک ناول نگار، شاعر، ڈرامہ نویس اور مصور تھے۔ ہم ان کی تعریف چاہے جن الفاظ میں کریں پھر بھی ان بلندیوں تک صرف جزوی طور پر ہی پہونچ سکیں گے جو انھوں نے حاصل کی تھیں" وزیر اعظم نے فرمایا کہ ان کی تحریر نے نئے زاویوں کی طرف رہنمائی کی ہے وزیر اعظم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ "گرودیو" آزادی کی جد وجہد سے پوری طرح وابستہ رہے ان کی زندگی ہی میں "شانتی نکیتن" آزادی کا روحانی مرکز بن چکا تھا۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ٹیگور نے انگریزوں کی طرف سے دیئے گئے خطاب "نائٹ" کو واپس کر دیا تھا ان تمام باتوں میں ٹیگور صرف شریک کار ہی نہیں رہ سکتے تھے جو واقعات پیش آرہے تھے ان سے وہ پوری طرح وابستہ تھے۔ بات بالکل قدرتی تھی کہ آپ کی نظم کو قومی ترانہ کا اعزاز بخشا گیا۔

وزیر اعظم نے اپنے خاندان کے ساتھ "گرودیو" کے تعلقات کا ذکر بھی فرمایا بالخصوص کملا نہرو کی موت پر جواہر لال نہرو کو ٹیگور نے جو خط بھیجا تھا اس کا نہایت جذباتی انداز میں تذکرہ کیا۔

اپنے اس خط میں ٹیگور نے کملا نہرو کے اس اہم کردار کی توصیف و تعریف کی جو انھوں نے قوم کی زندگی کو شاندار بنانے اور بلند کرنے میں ادا کی تھی۔

اس موقع پر وزیر اعظم کی خدمت میں ٹیگور کی ایک نایاب تصویر بھی پیش کی گئی جس میں ٹیگور دعا میں مصروف ہیں

علی سردار جعفری

ٹیگور اور ترقی پسند تحریک

جیسے ہم علم و دانش کے مندر کے درشنوں کے لئے گئے ہوں۔ ملک راج آنند اور میں شانتی نکیتنوں کے گیسٹ ہاؤس میں گرودیو سے ملاقات کے لئے ان کے سکریٹری کے ذریعے گرودیو کے پیغام کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دسمبر ۱۹۳۸ء
سری کانفرنس کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں
ت اس انجمن کو قائم ہوئے محض دو سال اور سات
نہ ہوا تھا۔ مگر اس قلیل مدت ہی میں اس نے برطانوی
ج کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہم فخر محسوس کرنے لگے تھے
نوں اور ادیبوں کی یہ انجمن اتنی عظیم الشان حکومت کو ہلا
ہے، ڈرا سکتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں سب
یادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ ٹیگور، پریم چند، اقبال
ل، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور مولانا حسرت
نے اس تحریک کو اپنی سرپرستی سے توقیر بخشی۔
ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ انقلابی
ہی ہونے کے باوجود بھی ایک تحریک چلائی گئی جس نے
یہ کر پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے
ملک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں
میان بھی اتحاد و اشتراک کا وسیلہ بن گئی جو کہ فاشزم

اور آمریت کے خلاف تھی اس وجہ سے پوری دنیا کے ترقی پسند مصنفین سے جڑی ہوئی تھی۔ ٹیگور اس تحریک سے اس کی ابتدا سے ہی وابستہ رہے۔

پہلی ترقی پسند کانفرنس ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی صدارت میں ہوئی۔ دو ماہ کے اندر ہی اندر ہم لوگوں نے انٹرنیشنل رائٹرز ایسوسی ایشن کی دوسری کانگریس کو تحریری اعلان بھیجا جس پر رابندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر چٹرجی، پریم چند، جواہر لال نہرو، نندلال بوس اور دیگر مشہور ادیبوں اور دانشوروں کے دستخط موجود تھے یہ تحریری اعلان یا منشور بعد میں برسیلز کی امن کانفرنس میں ستمبر ۱۹۳۶ء کو بھیجا گیا۔ اس کا متن حسب ذیل ہے:

"آج عالمی جنگ کا ہوا ہمارے سر پر سوار ہے فاشزم نے اناج کے بدلے بندوق کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ثقافتی ترقی کے بجائے اپنی سلطنت کی وسعت پذیری زیادہ عزیز ہے۔ اٹلی نے ابی سینیا کو اپنا محکوم بنانے کے لئے جو طریقہ

ٹیگور غرقِ مطالعہ

اختیار کیا وہ ان سبھوں کے لیے ایک صدمۂ جانکاہ تھا جو عقلیت پسندی اور تہذیب میں یقین رکھتے ہیں۔ سامراجی طاقتوں میں رقابت، تناقض اور جارحانہ وطن پرستی کا رویہ آج کے دور کے ایسے خوفناک رجحانات ہیں جن میں ہم گھرے ہوئے ہیں اپنی اس رائے میں ہم دشمنوں کی جانب سے ہر جنگ کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ [illegible] جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ہم ہندوستان کی جنگ [illegible] کے بھی مخالف ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آئندہ جنگ سے ہماری تہذیب کی مشعل تاریک ہو جائے گی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس کے لئے جو کہ کلکتہ میں ہونے والی تھی ٹیگور سے بہتر کوئی شخصیت نہ تھی جو صدارت کے فرائض انجام دیتی۔ انھوں نے اس بات کی منظوری بھی دے دی مگر بیماری کی وجہ سے وہ کانفرنس میں حاضری کے لئے معذرت چاہی

انھوں نے اپنا صدارتی خطبہ بنگالی میں بھیجا چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک راج آنند اور میں شانتی نکیتن جاکر ٹیگور سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ اپنا خطبہ دوبارہ انگریزی میں لکھیں۔ اس تحریک کے نوجوانوں کی نمائندگی کا شرف مجھے بخشا گیا۔

ہم دونوں بہت خوش اور جذباتی ہو رہے تھے کہ ایک مشہور ترین ادبی شخصیت سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس وقت میں محض ایک طالب علم تھا جب کہ ملک راج آنند ایک مشہور ادبی شخصیت تھے وہ یورپ کی کئی مشہور ادبی شخصیتوں اور دانشوروں سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ ہندوستان میں ان کی علامہ اقبال سے دوستی تھی جن کی مالی امداد کی بنا پر ملک راج لندن میں مزید تعلیم حاصل کر پائے تھے۔ اور میں اب تک علامہ اقبال سے بھی نہ ملا تھا۔ در اصل میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بین الاقوامی شہرت کی مالک ادبی شخصیت سے ملنے جا رہا تھا۔ شہر جس سے میں علی گڑھ کے دنوں میں مل چکا تھا

یک علیٰحدہ حیثیت رکھتے تھے۔ قصہ مختصر ٹیگور کا نام ہم
ۂ باعث کشش تھا اور ہوڑا سے بولی پور کا راستہ کافی
لذارا اس کے کافی عرصے بعد مجھے اور ملک راج آنند کو
ساتھ سفر کرنے کا موقعہ ہاتھ لگا جب ہم ماسکو سے
ا آف ٹالسٹائی جا رہے تھے۔
ے دن غالباً ۱۱ بجے میں نے کرتا پاجامہ اور جواہر جیکٹ پہن رکھا تھا
شال اوڑھ رکھی تھی۔ ملک راج آنند انگریزی سوٹ
ہوئے تھے۔ ملک راج مجھے دیکھ کر SELF CONSCIOUS
ں نے کہا کیا اسی لباس میں شانتی نکیتن کے مہاتما سے
گا یا میں بھی ہندوستانی لباس پہن لوں؟ میں نے بھی
ں   اور اس کے بعد انھوں نے ہندوستانی لباس
دونوں گرودیو کی گھر کی جانب چل پڑے۔
بہت وسیع اور عالیشان نہیں تھی جس میں گرودیو کے
ں تھی۔ گرودیو کوٹھی کے کونے میں بنی ایک چھوٹی
یٹھ کر کام کاج کیا کرتے تھے۔
نظر ہمیں دیوار سے لگا ہوا ٹیبل نظر آیا جس پر کتابیں
ی ہوئی تھیں اور ٹیگور ایک بانس کے مونڈھے پر
ں کا چہرہ ٹیبل اور دیوار کی جانب تھا اور ان کی پیٹھ
ں جانب تھی جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے وہ قدرے
ٹھے اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا جہاں اور بھی
ے ہوئے تھے۔
، اس سے قبل کسی پیغمبر یا مہاتما کو نہیں دیکھا تھا۔ ٹیگور
ی پرکشش تھی۔ ان کا پروقار چہرہ اور اس پر
ں، شانوں پر پھیلی بالوں کی لٹیں۔ انھوں نے گہرے
اوڑھ رکھا تھا جس کی بنیاد پر مجھے عبرانی پیغمبر، اور
زتشت کی یاد آگئی۔ اس وقت مجھے خیال نہیں کہ ٹیگور
ں پہنی تھی یا نہیں۔

ی خاموشی کے بعد ہم نے اس شاعر کی آواز سنی!
ج! میں تم سے اس وقت سے ملنے کی خواہش رکھتا
میں نے تمہارا ناول "قلی" پڑھا تھا۔" اس جملے سے
ہمت بندھی اور وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے
، وہ کچھ کہتے ٹیگور نے مجھے دیکھ کر پوچھا "یہ نوجوان
برا تعارف بہ حیثیت طالب علم اور ابھرتے ہوئے اردو
شاعر کی حیثیت سے کروایا گیا انھوں نے شفقت بھری مسکراہٹ
ڈالی اور کہا خوب! مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے ان کا آشیرواد حاصل
ہو گیا ہے اس کے بعد میری بھی کچھ ہمت بندھی۔
اس وقت ملک راج آنند مجھ سے زیادہ جذباتی ہو رہے تھے اس کی وجہ یہ
تھی کہ وہ ٹیگور کے پیغام، ان کی شاعری، ان کے خیالات سے
زیادہ واقف تھے۔ اس بات کا اندازہ مجھے بعد میں اور زیادہ
ہوا جب انھوں نے اسپین میں خانہ جنگی کا، اور ادیبوں اور دانشوروں
کی بین الاقوامی بریگیڈ کا ذکر کیا جو کہ فاشزم کی طاقتوں کے خلاف لڑ رہے
تھے اور اسپین کے جنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ٹیگور کو ان باتوں
کا علم تھا مگر دو چشم دید گواہ سے بنفس نفیس یہ سب کچھ سننا
پسند کرتے تھے۔
بین الاقوامی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے امن کی بقا کی
تحریک میں ہندوستان کے ادا کردہ کردار کا ذکر اور انسانیت جیسے موضوع
پر گفتگو کے دوران جواہر لال نہرو کا نام بار بار درمیان میں
آتا رہا۔ جن کے لیے آزادی اور امن دو علیٰحدہ چیزیں نہیں
ہیں۔ پھر ٹیگور نے LORCA کا بھی ذکر کیا جس کی روح
بربریت کے اندھے رقص سے مجروح ہو چکی تھی۔
میں بھی بہت مداح تھا۔
گھنٹے بھر کی باتوں کے بعد ٹیگور کا ترقی پسند مصنفین کی
دوسری کانفرنس کو خطاب کرنے کا ذکر نکلا اور ان سے نیا خطبہ
لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ انھوں نے بتلایا کہ وہ اس مغالطے میں رہے
کہ کلکتہ میں جو کانفرنس ہو رہی ہے وہ محض بنگالی مصنفین تک محدود
ہے اور ہم لوگ اس تحریک سے وابستگی کی بنا پر محض مندوبین
کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں۔ پھر انھوں نے یہ سمجھاؤ دیا کہ بنگالی
خطبے کا ترجمہ ہیرن مکرجی سے انگریزی میں کروا لیا جائے۔ انھوں نے
سختی سے ایک بنگالی ادیب و شاعر سے ترجمہ کروانے کی مخالفت
کی اور کہا کہ اگر اس سے کروایا گیا تو متن کے خراب ہونے کے امکانات
ہیں۔ یہ بات میرے لیے باعث دلچسپی رہی کہ شہرت کے اس زینے
پر پہونچنے کے بعد بھی ٹیگور میں معمولی سے انسانی کمزوری موجود تھی
وہ نوجوان بنگالی ادیب اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو لوگ
گرودیو پر اس وقت تنقیدیں کیا کرتے تھے۔
ٹیگور ہیرن مکھرجی کو ان کے صاف ستھرے ذوق اور ذہانت
کی بنا پر پسند کرتے تھے۔ وہ گرودیو کو اپنی طالب علمی کے زمانے

ٹیگور، نوجوان ادیبوں کے ہمراہ
(بیٹھے ہوئے) سیتندرناتھ دت،
ردموہن باگچی، کرونا ندھان بندو پادھیائے
(کھڑے ہوئے)
پربھات کمار موکھوپادھیائے،
منی لال گنگو پادھیائے،
جتندرنا رائن باگچی،
چارو چندر بندھو پادھیائے

سے جب وہ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے جانتے تھے۔ ٹیگور کی اس سفارش کے ساتھ ایک واقعہ بھی یاد آگیا جو کہ سجاد ظہیر سے متعلق ہے۔

جدوجہد آزادی کے دوران یعنی دوسری اور تیسری دہائی میں جب ٹیگور یورپ کے سفر پر نکلے تھے تو اس وقت آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک لکچر کے دوران ایک نوجوان سجاد ظہیر نے گرودیو سے ایک سوال کیا " ایسے دور میں جب کہ ملک اور ملک کے لوگ آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں آپ کے پائے کا شاعر اپنا وقت غیر ممالک کے سفر میں ضائع کر رہا ہے جب کہ اس وقت آپ کو اپنے ملک میں ہونا چاہئے اس کی وجہ کیا ہے "۔
ٹیگور نے اس طالب علم سے کہا کہ وہ ان کی شاعری سے مکمل طور پر آشنا نہیں ہے اور انھوں نے ہیرن مکرجی سے گذارش کی کہ وہ سجاد ظہیر کو ان کی تخلیقات سے روشناس کرائیں۔

ہم انٹرویو سے کافی خوش تھے اور لوٹتے وقت اس خوشی میں اور بھی اضافہ ہوا کہ جب ہم گھر کے برآمدے میں پہونچے تو ایک خوبرو نوجوان اور اس کے ساتھ ایک حسین لڑکی نظر آئی اور انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہم ملک راج آنند اور علی سردار جعفری ہیں؟ اور پھر اپنا تعارف کروایا کہ وہ بلراج ساہنی اور ان کی بیوی دمینتی ہیں۔ دونوں کی نئی شادی ہوئی تھی۔ بلراج ساہنی شانتی نکیتن میں ہندی پڑھاتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور اس کے بعد ہم لوگ گہرے دوست بن گئے۔ بلراج اور دمینتی ہمارے ساتھ کلکتہ چلے اور دوسری ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

ترجمہ:۔
فیروزہ فیاض خان

کبیر

مادی کائنات اور انسانی وحدت

ٹیگور کی شاعری کی بنیاد

بندرناتھ ٹیگور ان عظیم ہستیوں میں سے ہیں جن کی تصانیف زمانہ کی سرحدوں سے ماورا ہیں۔ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا
کہ خلاّقانہ تصنیفوں کے حجم و مقدار کے لحاظ سے بھی کم ہی مصنفوں کو برابری کر سکتے
ہوں انہوں نے ایک ہزار سے زیادہ نظمیں اور دو ہزار سے بھی زیادہ گیتوں کو رچا کر ان
علاوہ کثیر التعداد افسانے، ناول اور ناٹک اور بہت سے مختلف موضوعات (جیسے دھرم، تعلیم و
تربیت، سیاسیات، ادب و تنقید) سے متعلق مقالے انہوں نے تصنیف کئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر
ان تمام موضوعات کی طرف ان کی نظر گئی ہے جو انسانوں کو دلچسپی و کشش رکھتے ہیں۔ تصانیف
کی خوبیوں اور محاسن کے اقدار کا اندازہ کیا جائے تو وہ اس بلند مقام پر نظر آتے ہیں جہاں شاذ و نادر
ہی کچھ بڑی ہستیاں پہونچ سکی ہیں۔ جب ہم ان تصنیفوں کی وسیع البسط کائنات اور اہمیت و
عظمت کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں معلوم ہوتی کہ ان کے مداح و
پرستار انہیں تاریخ میں شاید سب سے بڑا ادیب مانتے ہیں۔

ہم صلاحیتوں والی بڑی ہستی کے ظہور کے اسباب
کیونکہ یہ اسباب عموماً معمولی محرکات و ترغیبات
غیر معمولی عظمت رکھنے والے فرد کی یہ بھی خصوصیت
سماج یا قوم کے لاشعور یا تحت الشعور کو متحرک کرنے
و جذبات کو متشکل کر دیتا ہے اسی طرح اپنی قوم کے
کا ایک گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے اسی سے یہ بات

سمجھی جا سکتی ہے کہ جب کسی عظیم و تابناک شخص کا ظہور ہوتا ہے
تو لوگ کیوں عقیدت و حیرت سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں سماج
کا دل اس کے الفاظ اور کارناموں میں اپنے ان خوابوں کی تعبیر
و تکمیل دیکھتا ہے جن کی ہلکی سی تھرتھراہٹ تو اس نے محسوس کی
ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کر سکا ہے۔ پرعظمت شخصیتیں بھی اسی
داخلی تعلق سے فیضیاب ہوتی ہیں۔ قوم کے دل و دماغ کو متحرک و

متاثر کرنے والی نیم پختہ آرزوؤں اور نیم واضح تمناؤں سے وہ قوت حاصل کرتا ہے دونوں لحاظ سے رابندر ناتھ عظمت و بندگی کے بے مثال نمونے ہیں ان کی غیر معمولی قابلیت میں کوئی شک و سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ساتھ ہی معمولی لوگوں کی زندگی ... سے بھی عقیدت انھوں نے پیار کیا تھا اور جن کے لیے وہ جئے تھے ان کا سمبندھ و تعلق بہت گھنا اور گہرا تھا۔

اپنے مقام پیدائش اور زمانہ کے لحاظ سے بھی رابندر ناتھ خوش نصیب تھے مغربی قوموں کے داخلہ سے ہندوستان کی زندگی کے پرسکون بہاؤ میں سخت ہلکورے پیدا ہو گئے تھے اور سارے دیس میں ایک نئی بیداری کے آثار پیدا ہو چلے تھے اس کے ابتدائی دھکوں اور صدموں نے ہندوستان کے دل میں جو چکا چوند پیدا کر دی تھی اور اس زمانہ کے مصلحوں اور رہنماؤں کو مغرب کی اندھی تقلید و نقالی کا شکار بنا دیا تھا۔ رابندر ناتھ کا جنم اس وقت ہوا جب پہلے پہل کی یہ اندھی عقیدت ختم ہو رہی تھی لیکن مغربی قوموں کے لائے ہوئے آدرش اور نظریے ابھی کارفرما اور طاقت ور تھے اس لئے یہ زمانہ ایک ایسی مخصوص پرعظمت شخصیت کے ظہور کے لیے عین مناسب تھا جو اپنے اندر مشرقی اور مغربی اقدار زندگی کی ایک پوری اکائی اور وحدت کو جنم دے سکے۔ صرف زمانہ ہی نہیں بلکہ مقامی ماحول بھی رابندر ناتھ کے لئے مناسب تھا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں غالبًا بنگال نے مغرب کے صدمات کا شاید زیادہ اثر لیا تھا۔ بنگال میں بھی اس زندگی کی نئی نئی کھڑکھڑاہٹ اور تڑپ کا سب سے زیادہ اثر کلکتہ ہی میں نظر آیا۔ رابندر ناتھ کی نطانت و ذہانت کی نشو و نما میں ان کے پریوار کی فضا اور ماحول بھی سازگار ثابت ہوئے۔ ان کا خاندان بیداری ہند کے ابتدائی رہنماؤں میں تھا۔ جس نے ان قدیم تہذیب کے ورثہ کو چھوڑے بغیر ہی نئے زمانے کے تقاضوں کو قبول کیا تھا۔ برہمن ہونے کے ناطے رابندر ناتھ نے قدیم ہند کی روایتوں کو بڑے صحیح اور فطری انداز سے اپنا لیا۔ وہ صرف ادب ہی سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ زندگی کے ان آدرشوں سے بھی متاثر ہوئے جو دھرم اور تہذیب نے مرتب کئے تھے۔ وہ زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے منجھلے زمانہ (قرن وسطیٰ) کے مغل دربار کی مشترکہ تہذیب کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر سکتے تھے ان دو باتوں میں وہ اُن دنوں کے دوسرے برہمن زمینداروں سے شاید زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن ان میں بہتوں کے برعکس نئی دنیا اور نئے زمانہ کے تقاضوں سے بھی وہ باخبر تھے۔ قدیم اور قرن وسطیٰ کی ہندوستانی روایتوں سے شرابور ان کا خاندان بیک وقت مغربی تعلیم و تادیب اور طرز زندگی کو قبول کرنے میں سب سے آگے آگے تھا رابندر ناتھ کا ہندوستانی ورثہ بہت بھرپور تھا اور ان کے دل میں کھلے ڈھنگ سے یا چھپے ڈھنگ سے کوئی تذبذب یا تصادم نہیں تھا۔ ان کے خاندانی پس منظر کو دھیان میں رکھا جائے تو اس بات کو سمجھنا مشکل نہ ہوگا ان کی خوش ترتیب خوش ترکیب شخصیت اس بھید بھاؤ سے آزاد تھی جو ان کے بہت سے ہم عصروں کو نیم مفلوج کر رہا تھا اور جو ان کی قوتوں کو سلب کر رہا تھا۔

سچ مچ رابندر ناتھ اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ قدیم اور وسطیٰ کے ہندوستان کے اقدار کو چھوڑے بغیر ہی انھوں نے اپنے نئے ہندوستان اور نئے زمانہ کی للکار کو قبول کیا۔ جو لوگ اپنی ہی تہذیب سے روگرداں ہو چلے تھے اور مغرب سے حاصل شدہ تحریکوں ہی پر تکیہ کرنے لگے تھے وہ قومی زندگی کی سرزمین سے اکھڑ سے گئے اسی سے ان کی زندگی کے بہاؤ کے سرچشموں میں پانی کی کمی ہو گئی اور ان کے روحانی سرمایہ کا خاتمہ ہو گیا یہی سبب ہے کہ ان میں سے کسی عالم، فاضل اور لائق و فائق ہونے کے باوجود بھارت کی زندگی اور ادب پر گہرا اور مستقل اثر نہیں چھوڑ سکے حقیقی معنوں میں عظیم و تابناک شخص قوم کی انتہائی داخلی زندگی اور تحریکوں کے ساتھ اپنا مضبوط رشتہ جوڑ کر ہی قوت و توانائی حاصل کر سکتا ہے دوسروں میں اس رشتہ کا فقدان تھا۔

ایک اور دوسری چیز تھی جس سے رابندر ناتھ کو عوام کی زندگی کے ساتھ متحد و متصل ہونے میں مدد ملی۔ زندگی کے ابتدائی زمانہ میں پدما ندی کی دھارا میں وہ مہینوں ایک بجرے میں رہے اور اس طرح دیس کی دیہاتی تہذیب سے بہت قریب ہو گئے۔ دیس کے اس آنچل میں زندگی کے جو مجموعی تجربے انھیں ہوئے اس کی جڑیں دیس کے ابتدائی اور قدیم تاریخ تک پہونچی ہوئی تھیں۔ قرن وسطیٰ میں پنپنے والی شہری تہذیب سے کہیں زیادہ یہ ابتدائی قدیم تہذیب لوگوں کی زندگی میں اپنی ابتدائی جڑیں جما چکی تھی اس طرح سے رابندر ناتھ ایک ایسی دنیا میں داخل ہوئے جو شہر والوں کے لئے اجنبی تھی۔ قومی شعور کی کچھ گمبھیر اور سنجیدہ ترین تہوں میں ان کی چیتنا کی جڑیں پہونچ گئیں۔ معمولی عوام کے بھرے پُرے جیون کا لمس ہی رابندر ناتھ کی قوت متخیلہ کی جان ہے اور یہی سبب ہے کہ انھیں ترغیب شعری کی کمی کبھی نہیں ہوئی۔

رابندر ناتھ کی زندگی اور ان کی تصنیفوں پر غور کرتے وقت انکی

تابناک تخیل اور حیرت ناک قوتِ تخلیقی سے بار بار حیرت زدہ ہوئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا وہ مرکزی لحاظ سے شاعر تھے لیکن ان کا اظہار کی اور ان کی دلچسپیاں صرف شاعری تک محدود نہیں تھیں ادب کے مختلف شعبوں اور میدانوں میں ان کی دین کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کرچکے ہیں ادب کو اگر ہم ہمہ گیر معنوں میں استعمال کریں تو بھی ہم پاتے ہیں کہ یہ میدان رابندر ناتھ کی تمام اپج کو سمیٹ نہیں سکتا وہ سنگیت کے ماہر اور بہت بڑے مصور تھے اس کے علاوہ دھرم اور تعلیم کی ماہیتوں سیاسیات اور سماج سدھار اخلاقی ترقی و اقتصادی تعمیر ان سب میدانوں میں ان کی دین غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اتنے دائرہ ہائے عمل میں ان کا کام اس قدر عظیم ہے کہ وہ ہند جدید کے معماروں اور خلاقوں میں گنے جاسکتے ہیں۔

زندگی کو مکمل اور ناقابل تقسیم اکائی ماننے ہی میں رابندر ناتھ کی قوت کا راز چھپا ہوا ہے آدرشوں اور تہذیبوں کے تصادم، یا تفرقہ پردازی نے ان کی قوت کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کئے۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ کلا (فن) اور جیون (زندگی) کو انھوں نے الگ الگ چیزیں نہیں مانا انیسویں صدی کے اواخر میں فلسفہ جمالیات کے ایک نئے اصول نے یورپ پر غلبہ کرلیا تھا۔ بہت لوگ ایسے تھے جن کے نزدیک صرف فن کی خاطر فن کو اپنانا چاہیئے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ زندگی سے بھی فن کا تعلق ہو۔ ہوائی محل یا ہاتھی دانت کے میناروں کے فنی کوششوں کے نشان اور نمونہ بن گئے تھے اس اصول کے پجاری کہنے لگے تھے کہ شاعر اور فنکار حقیقتاً خواب یا سپنے دیکھتا رہتا ہے، رابندر ناتھ نے اس عقیدہ کو کبھی قبول نہیں کیا کہ فن حقائق زندگی سے بے نیاز ہے۔ انھوں نے حسن کی تلاش ضرور کی ہے لیکن زندگی کے مظاہرہ کی ہی شکل میں۔ ساتھ ہی ان کو اس امر کا بھی یقین تھا کہ زندگی میں مدھرتا یا شیرینی اس وقت تک نہیں آتی جب تک وہ حسن سے مزین نہ ہوجائے۔ رابندر ناتھ کی نظر میں شاعر کا مذہب ہی انسانی مذہب ہے۔

۲

رابندر ناتھ دنیا کے سب سے بڑے گیت کاروں میں گنے جاتے ہیں۔ دلوں کے دکھ درد اور جذبات کی اتنی سچی ترجمانی اور اتنی جیتی جاگتی تصویریں ان کے گیتوں میں ہوتی ہیں جو سنگیت سے مل کر ایک ایسی شاعری تخلیق کرتی ہیں کہ الفاظ کے بھول جانے پر بھی ان کے گیتوں کا سنگیت پڑھنے والوں کے دل پر چھایا رہتا ہے اور اسے ہلکورے دیتا رہتا ہے۔ دکھ درد اور تصویر جذبات اور موسیقی کا اس طرح سے گھل مل جانا ان کی ابتدائی شاعری ہی سے نظر آتا ہے ــــ **خوابِ آبشار** کی رچنا اس وقت ہوئی جب وہ بیس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن وہ بنگالی زبان بلکہ شاید کسی بھی زبان کے بہترین گیتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے یہ نظم صرف اپنی سنگیت اور شدت اثر کے کارن ہی مخصوص محاسن کا نمونہ نہیں ہے بلکہ خیالات اور جذبات کی چابک دستانہ مصوری کے کارن بھی دنیا کی بلند ترین نظموں میں گنے جانے کے قابل ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس نظم میں فطرت یا عنصری کائنات اور انسان کو یکتا اور وحدت کو اس طرح منسلک کردیا گیا ہے کہ یہ رشتہ اٹوٹ بن جاتا ہے۔ مادی کائنات اور انسان کی وحدت رابندر ناتھ کے شاعرانہ کارناموں کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے اور یہ بات ان کی آخری دم تک بنی رہی۔

دھرتی کو اتنے زندہ طور پر پیار کرنے والا کوئی دوسرا شاعر شاید کبھی پیدا نہیں ہوا۔ رات یا دن یا موسموں کے طواف کے شاید ہی کوئی جزویات پہلو یا لمحے ایسے ہوں گے جس کی نغمہ سرائی رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی نظموں میں نہ کی ہو ان کی سہل کارانہ شاعری نے بنگال کے مناظر کی چھب اور اس کی تال سُر کو اپنے وجدان میں اتار اتار لیا ہے کالیداس کے زمانہ ہی سے بھارت کے شاعروں نے برکھا رُت کا گن گان لاثانی امنگ ترنگ کے ساتھ کیا ہے اپنے سیکڑوں گیتوں اور نظموں میں رابندر ناتھ نے برسات کے بدلتے ہوئے روپوں کی تصویریں کھینچی ہیں برکھا رت سے متعلق ان کی شاعرانہ دین ہماری قومی وراثت کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ آمد برشگال کے ٹھیک پہلے تپتی ہوئی دھرتی کا عالم انتظار پہلے لہرے کے بعد بھیگی مٹی سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو نئی نئی اگی گھاس کے ہرے ہرے اکھوں میں زندگی کی تھرتھراہٹ کالے کالے بادل جو صبح کے آسمان کی شفاف روشنی کو دھندلا دیتے ہیں اور شام کے سایوں میں جادو بھر دیتے ہیں۔ رات کے سناٹے اور شام کے ٹھہراؤ میں بارش کی جھجھاہٹ اور ٹپٹپاہٹ ایسی سیکڑوں دوسری تصویریں رابندر ناتھ کی من موہنی شاعری میں جاگ اٹھتی ہیں اس میں انھوں نے قلب انسانی کے دکھ سکھ کا تانا بانا بن دیا ہے یہاں تک کہ فطرت اور انسان ایک دوسرے کے دلی حالات و کیفیات کو آئینہ دکھانے لگے ہیں اور ان دونوں کا فرق آنکھ سے اوجھل ہوجاتا ہے۔

رابندر ناتھ نے دوسرے موسموں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ موسم سرما اور فصل بہار کی مختلف کیفیتوں کا چربہ انھوں نے اتار لیا ہے نو بہار کا امنڈتا اور ابھرتا ہوا جوش چڑھتے اترتے جاڑے دن کا بندھنوں سے آزادی پانے کا بہاؤ دلی رفتار سے دنیائے رنگ و بو کا پھوٹ پھوٹ پڑنا۔ مناظر کی کھنک اور ایسے ہی مناظر قدرت کے دوسرے رموز ان کی بہت سی نظموں اور گیتوں میں دکھائی اور سنائی دیتے ہیں ان میں نہ صرف بسنت کا آنند اور جوش نمو ہی نہیں بلکہ ان کا آنی اور فانی ہونے کے جذبات کا اظہار بھی ہوا ہے تخیل اور پختگی کے بہاؤ سے معمور موسم سرما کا صاف و شفاف نیل گگن رابندر ناتھ کی بہت سی نظموں میں خاص طور سے جھلک رہا ہے۔ ان کے ایک نہایت کامیاب گیت۔ ناٹک کی رچنا موسم سرما کے کردار کو۔ لے کر ہی کی گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت و حرکت اور جذبہ عمل کی تحریک سے بندھنوں کو توڑنے کے جذبات کی مصوری کی گئی ہے۔ ٹھنڈک اور تراوٹ اور گرمی سب سے ان کا تخیل آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ اپنی ایک مشہور نظم میں رویندر ناتھ نے موسم گرما کو ایک ایسی سخت ریاضت کرنے والا تپسوی مانا ہے جو سانس روکے نئی زندگی کی آمد کا انتظار کر رہا ہے۔

رابندر ناتھ کو دھرتی سے اٹوٹ رشتہ میں محض محاسن فطرت نے نہیں باندھا بلکہ انھوں نے دھرتی کو اس لئے بھی پیار کیا کہ وہ آدمی کا وطن ہے بے شمار نظموں اور گیتوں میں انھوں نے انسان کے لئے اپنا پریم انڈیل دیا ہے۔ انسان کے دل کی شاید ہی کوئی ایسی آرزو حسرت، تمنا، دکھ درد اور خواب ہو جس نے ان کے تخیل اور وجدان میں تھرتھری نہ پیدا کی ہو سکھ دکھ سے بھری انسانی زندگی کی گہری پریم لیلا کی ہزاروں حالتیں اور کیفیتیں ایسے الفاظ میں ظاہر ہو گئی ہیں جنھیں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا نہ اس درد دل کا انتظار رنگاں کی نا قابل برداشت تکلیف کی زندہ مصوری پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی ہے انھوں نے مادی کائنات یا فطرت کو جذبات سے متحرک انسان کے ہمسفر کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ جانتے تھے کہ زندگی طرح طرح کے تصادم اور الجھتی ہوئی آرزوؤں سے بھری ہوئی ہے اور بے شمار عیوب نقائص سے خالی نہیں ہے لیکن یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ غلطیوں، برائیوں، اذیتوں اور تمناؤں کے کارن ہماری یہ دنیاوی زندگی ہمارے لئے اور بھی پیاری بن جاتی ہے۔

رابندر ناتھ نے سنسار کو محض ناٹک کا ایک ایسا اسٹیج نہیں مانا جہاں انسان زندگی میں تکمیل حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے بلکہ اسے ممتا سے بھری ہوئی ماں کے روپ میں بھی دیکھا ہے جو زندگی کے بوقلموں تجربوں میں معنویت و ماہیت کی تلاش میں لگے ہوئے انسانوں کی نگرانی اور داشت پرداخت کرتی رہتی ہے۔ رویندر ناتھ کوئی سنیاسی یا تارک الدنیا انسان نہیں تھے اور نہ وہ محض لہو و لعب یا بھوگ بلاس یا تلذذ جسمانی کو اپنا مذہب بنائے ہوئے تھے ایک طرف تو انھوں نے اس نظریے کی تردید کی جو تقاضائے جسمی اور رنگا رنگ لطف اندازی کو نا قابل قبول بتاتا ہے دوسری طرف انھوں نے محض حواس خمسہ کے تلذذ یا محض عیش و عشرت کو سب کچھ کبھی نہیں مانا۔ زندگی کے عرفان کے حصول کی سادھنا میں سچائی سے لگے رہنے کو ہی وہ زندگی کی حقیقی شان اور عزت مانتے تھے۔ زندگی کی اس پہلو داری، ہمہ گیری و تکمیل کو حاصل کرنے کی گہری آرزو بار بار ان کی نظموں میں یوں ابھرتی ہے وشنے دھرا نامی اپنی معرکہ آرا نظم میں انھوں نے دھرتی کے بھرے پرے جیون اور کائنات کی ازلی قوت کے ابلتے ہوئے تلاطم کے ساتھ انسان کے داخلی تعلق کا گیت گایا ہے اپنے ایک شہرۂ آفاق گیت جنت الوداع میں انھوں نے محروم حرکت حیات جنت کے سکون اور سکھ کا دنیاوی زندگی کے با حرکت سکھ دکھ کے طوفانوں سے مقابلہ کیا ہے رویندر ناتھ نے ہمیں کسی طرح کے بھرم یا دھوکے میں نہیں رہنے دیا اور صاف صاف بتا دیا کہ وہ کس زندگی کو پسند کرتے ہیں۔

شاعری میں رابندر ناتھ کے خاص کارنامے ان کے گیت ہیں لیکن مناظر فطرت سے انھیں جو محبت ہے اور زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی سے جو ان کے وجدان کا گہرا تعلق ہے اس کی وجہ سے ان کی بہت سی نظموں میں ایک رچا ہوا اور بھرپور ناٹک کا پہلو اور خاصہ پیدا کر دیا ہے رویندر ناتھ کے گمبھیر اور سنجیدہ انسانی دھرم اور انصاف کے لئے ان کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ وہ سماجی اور سیاسی موضوعات کے لئے اپنے اندر ایک شدید کشش رکھتے ہیں کسی طرح کا کوئی مخصوص تجربہ خواہ وہ ہنگامی نہ بھی ہو لیکن اسے بھی اگر انھوں نے اپنے قلم سے چھو دیا ہے تو وہ تجربہ بہت بلند ہو گیا ہے اور اس کی اہمیت ہمہ گیر ہو گئی ہے اپنے ہی لوگوں کے غلط روایات عمل اور برائی سے بھرے ہوئے محرکات کے خلاف انھوں نے کئی ایک تیز طنز بھی لکھے ہیں لیکن ایسی نظموں میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جنھیں ان کی حقیقی انسان دوستی ان کے غم و غصے کی سطح سے اوپر اٹھا نہ گئی ہو۔

ں کہ حب وطن کے جذبے سے ان کی جو نظمیں لبریز ہیں ان میں بھی
مانی قوم کی تمناؤں کا اظہار رہا ہے۔ رویندر ناتھ کے لئے دیش پریم
ع اور فطری صفت تھی جس میں اپنے وطن اور ہموطنوں کے لئے اتھاہ
تھی لیکن دوسرے دیسوں اور قوموں کے لئے نفرت یا دشمنی کا شائبہ
ن تھا۔ اس کی ایک بہت خوبصورت مثال ان کی نظم گر دگو بندمیں
ہے اس میں اپنے وطن اور ہموطنوں کے لئے ان کا گمبھیر پریم تمام
نسانی کے لئے ایک بیکراں جذبہ محبت بن گیا ہے رویندر ناتھ نے
ت کو کبھی بھی قبول نہیں کیا کہ جہاں بھی اور جس میں بھی ماہیت انسانی
ہے وہ کبھی ان کے لئے غیر یا بدیسی ہو سکتا ہے۔ اپنی مشہور نظم پردا ہی
) میں انھوں نے کہا ہے کہ کبھی جگہ میرا گھر ہے اور سنسار کے سبھی حصو
ر وطن ہے۔ تمام نوع انسانی میں روح وحدت کا احساس بڑے سندر
سے ہمارے قومی ترانے میں ظاہر ہوا ہے۔ اس میں رابندرناتھ
ارت، بھاگیہ، ودیدھاتا کے روپ میں ہمارے سنسار کے جن من گن
ا لک کا خیر مقدم کیا ہے۔

سن کے لئے رابندرناتھ کا یہ پریم انجانے اور غیر شعوری طور پر بھگوان کے لئے پریم
۔ دھار لیتا ہے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے تخیل میں زندگی کے قرب و محبت کے تصور
ڈھا ہوا ہے اس میں مناظر فطرت اور انسان ایک ہو گئے ہیں انھوں نے یہ کبھی بھی نہیں
بھگوان انسان کی زندگی سے دور یا الگ کوئی ہستی ہے ان کے لئے پریم ہی بھگوان
سنسان کے لئے ماں کی ممتا محبوبہ کے لئے عاشق کا پریم اس عظیم پریم کی محض مثالیں
یہ پریم ہی پرماتما ہے یہ پریم محض پر رمز جذباتی اضطراب کی شکل میں ہی ظاہر نہیں
۔ عام انسان کے آئے دن کی زندگی اور سفر زندگی میں بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے رابندرناتھ
ر بار کہا ہے کہ زندگی کے سچے سادھارن سمبندھوں اور روزمرہ کی
ہیں جو ہم عمل کی قربانی دیتے ہیں اور جن کے سہارے سنسار ٹکا ہوا
ان سب میں بھگوان کو مجسم کر دینا چاہئے اس میں کوئی شک نہیں کہ
ندرناتھ ویشنو شاعری اور تصوف کے رمز و کنایات سے بہت زیادہ
ہیں ان کی شاعری اور ان کے گیت ایسے جذبات اور ایسی تصویروں
ہرتے ہیں اور ان کے کلام کا موضوع کچھ اس قسم کا ہے کہ ہمیں پر رمز
ی کرنے والوں کے ابھرتے اور ابلتے ہوئے جذبات کی یاد آجاتی ہے
ساتھ ساتھ ان میں روزمرہ جاری رہنے والا سفر زندگی کی اصلیت
قت کے لئے بھی ایک شدید بیداری کا ثبوت ملتا ہے ان کے الفاظ
نقروں میں بیان کی ایک سچائی ملتی ہے جو ذاتی احساس و تجربے کے

بغیر ممکن نہیں۔ داخلی درد کی مصوری کے نکات مناظر فطرت کی بوقلمونی
سے کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ساری دنیا کے شعری ادب میں ایسی
مصوری کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ان کی رمزیہ شاعری کی خصوصیت کا کچھ اور چرچا یا ذکر ونکر مناسب
ہے جب گیتانجلی کا انگریزی ترجمہ پہلے پہل شائع ہوا پہلی جنگ عظیم سے
برباد شدہ اور جھلسے ہوئے سنسار نے اس کے پریم اور شانتی کے پیغام
کے لئے مغربی ملکوں نے انتہائی تپاک سے اس کا استقبال کیا اس میں
کوئی شک نہیں اس پتلی سی کتاب کی نظمیں ایک گمبھیر شانتی (امن و
سکون) کے جذبہ سے لبریز و لبالب ہیں۔

گیتانجلی میں رابندرناتھ کی شاعری کا جو موضوع ہے وہ ہماری روز
مرہ کی زندگی اور اس کے چھوٹے چھوٹے تجربات سے ہی لیا گیا ہے ان
نظموں کی زبان ٹکسالی ہے اور مصوری جذبات بہت نرم اور سہج
ہیں پھر بھی حسن اور دور رس رمزیت کی ایک ایسی صفت ان میں
پنہاں ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یورپ اور امریکہ کے پڑھنے والوں
کے لئے یہ نظمیں ان کی ابتدائی تصنیفوں کی فطری طور پر ترقی یافتہ شکلیں
ہیں۔ مناظر فطرت اور انسان کے لئے ان کا پریم انجانے طریقوں سے بھگوان کے
لئے ان کے پریم میں جا ملا تھا۔ ان کی نجی زندگی کے گمبھیر داخلی درد رسی نے
ان کی مصوری جذبات اور ان کے موضوعات کو بہت مدھر اور گہرا
بنا دیا تھا ان کے وجدانی تجربات و محسوسات کے ارتقائی عمل نے
ان پر در حقیقت آئینہ کر دیا تھا کہ ہر زندگی ایک پر رمز کائنات ہے
انسانی زندگی کے غم اور اس کے سوز و گداز اور رقت انگیزی نے ان
کی تخلیقوں میں ایک نئی ہمدردی اور لس ماہیت کی صفت پیدا کر دی تھی

رابندرناتھ کے دور آخر کے بہت سے گیتوں کی ایک خصوصیت
یہ رہی ہے کہ وہ انتہائی حد تک نرم اور آسان ہیں ان کے آغازی دور
کی تصنیفوں میں سنسکرت زبان کی بہت سی تلمیحات اور صوتی جھنکار
کا زیادہ سے زیادہ استعمال ملتا ہے بہت سی نظموں میں قدیم سنسکرت
ادب کے موضوعات اور طرز احساس کی نشان دہی ملتی ہے اس میں
کوئی شک نہیں کہ انھوں نے پرانے کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے اس بات
کا کھلا ثبوت ملتا ہے کہ پرانوں کا معمور خزانے سے ان کی تخلیقوں کا گہرا
تعلق ہے انسان اور پرماتما کے متعلق انھوں نے اپنی نظموں میں صنائع
و بدائع کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ آدمی کی معمولی سی معمولی حالت کو بھی
نظم کا جامہ پہناتے ہوئے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ صداقت کو اپنے
احساسات کی زبان عطا کی ہے ان کی زبان عوام کی بولی کی طرح

سبج سادہ اور واضح ہے بعد کے بہت سے گیتوں میں اور نظموں میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ کسی داخلی تجربے سے ہم دوچار ہیں۔ الفاظ آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو گئے ہیں۔ موسیقی کی دھنوں کی طرح ان میں وہ قوت اور صفائی آ گئی ہے جو ہمیں سکوت حیرت میں ڈال دیتی ہیں

ہم یہ بھی بھول نہیں سکتے کہ ر بندر ناتھ اپنی پوری زندگی میں صداقت کے متلاشی رہے ہیں۔ ان کے وجدان اور ضمیر کی روشنی نے الفاظ کی بھول بھلیاں اور یا گھمنڈ کے ظاہری طمطراق کو جسے ہم اپنے خیالات و جذبات کے افلاس کو چھپانے کے لیے کام میں لاتے ہیں بالکل ہی مٹا کر رکھ دیا ہے ان کی تصنیفوں میں وہ ہمت مردانہ اور شجاعت تخیل کے وہ صفات ملتے ہیں جس سے وہ لوگ ناواقف ہیں جنھوں نے اصلی بنگالی زبان میں ان کی رچناؤں کو نہیں پڑھا ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ترجموں کے لیے ان کی کچھ چنی ہوئی تصنیفات ہی لی گئی ہیں جس میں اصل کی قوت اور شکتی کچھ کھو سی گئی انسان اور اس کی فطرت و زندگی سے متعلق رابندر ناتھ کی دلچسپی ان کے حیات کے آغازی دور سے دکھائی دینے لگتی ہے **سندھیا گیت** میں جوان کے آغازی دور کی نظموں کا گلدستہ ہے ہم انھیں انسانی وجود کے مسائل کو لے کر انھیں حل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ انسان کی خود غرضی جب پریم کا بانا پہن لیتی ہے تو اس سے ایک قبح سی پیدا ہو جاتی ہے۔ نوخیز جوانی ہی میں رابندر ناتھ نے اس قبح یا بدصورتی کی تصویر کھینچی ہے "**نیئے ویدیہ**" تک آتے آتے ان میں فلسفیانہ عنصر گمبھیر اور گاڑھا ہوتا ہے لیکن اقلیت اور جذباتیت کی ہم آہنگی کا حسین ترین روپ ہم شاید "بلاکا" ہی میں پاتے ہیں بلاکا کی کچھ نظمیں فکر اور داخلی کرب کی ہم آہنگی لئے ہوئے ہیں اور اس ہم آہنگی سے نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ درشن شاستر (علم فلسفہ) کے اصول خالص موسیقی سے گونجتی ہوئی نظموں کا روپ دھار لیتے ہیں

اپنی زندگی کے آخری دنوں تک رابندر ناتھ نئے احساسات و تجربات اور نئے اسالیب نگارش کے لیے پرخلوص طور پر کوشاں رہے۔ ساٹھویں سال کے بعد تو ان کی گیت رچناؤں کی جیسے باڑھ سی آ گئی تھی اور وہ گیت ان کے زمانۂ شباب کی بلند ترین تخلیقوں سے لگا کھاتے ہیں اس زمانہ کی نظموں میں سنجیدہ سوز و گداز اور جذبات کی سرخوشی کا ایک نیا شر اور الاپ ہے جو دکھ سے تپ کر پاکیزہ ہو چکا ہے اس دہائی میں انفرادیت کے جو بھرپور شر اور ذاتی مانوسیت کے جو جذبات ملتے ہیں ان سب کا مقام ان کی زندگی کی ازلی دہائی میں ایک گہرے اور گمبھیر مذہب انسانی نے لے لیا ہے پہلے ان کی رچناؤں میں جذبات اور زبان کا جو شاندار سنگم ہے اس کی جگہ پر اب جذبات و زبان کی ایک بے مثال کفایت شعاری اور اختصار نے لے لیا ہے آخری زمانے کی ان کی کچھ نظموں میں قوت احساس اور بیان اور روحانی خود اعتمادی کا ایک ایسا عالم ہے جس کی بصارت افروزی ہمیں تعجب میں ڈال دیتی ہے اس کے علاوہ زندگی کے آخری مقصد کے سلسلے میں انھوں نے کچھ سوال نئے سرے سے اٹھائے ہیں اور ساتھ ہی بڑے پرسکون اور صاف و شفاف انداز سے زندگی کو اس کی تمام کمیوں اور امکانات کے ساتھ قبول کیا ہے۔

۳

رابندر ناتھ کی نظموں میں انسان کی سب سے بڑی کارکردگی اس بات میں ہے کہ وہ اپنی نجی تکلیف اور سنسار کے ہیجان کرب پر فتح حاصل کرے۔ خود غرضی کے کارن پیدا ہونے والے دکھوں اور انفرادی یا ذاتی تکلیفوں اور غموں پر انسان فتح حاصل کرے وہ اس گمبھیر غم و تکلیف سے بھی اوپر اٹھتا ہے جو زندگی کی عارضیت کا ناگزیر پھل ہے "**رخصتی کی بد دعا**" میں کچ جب دیویانی کو بد دعا کے بدلے اسے آشیرواد دیتا ہے اور اس کی بھلائی کی تمنا اور آرزو کا اظہار کرتا ہے تو وہ حقیقتاً غیر انسان سے انسان ہو اٹھتا ہے **برہمن** میں گرو نے محسوس کیا ہے کہ انسان کی عظمت و اہمیت نسل و نسب و خاندانی غرور میں نہیں ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ بغیر کسی فرق و دوری بغیر کسی داخلی تذبذب کے وہ سچائی کو قبول کر لے "**جانے نہیں دونگی**" میں شاعر نے اس بات کو سمجھایا ہے کہ کبھی کبھی ایک چھوٹا بچہ بھی فطرت انسانی کی معصوم سچائی کو ظاہر کر سکتا ہے جب کہ زیادہ سمجھداری پر گھمنڈ کرنے والے مرد و عورت اس امر میں ناکامیاب رہ جاتے ہیں۔

"**گاندھاری کی درخواست**" اور "**کرن اور کنتی کی بات چیت**" میں ممتا آرزو اور خوف کے اوپر عظمت انسانی یا شان انسانیت کی فتح کی بڑی خوبصورت ترجمانی کی گئی ہے۔ انسانی تعلقات کے محاسن اور سوز و گداز و رقت کے جذبات کو ہم رابندر ناتھ کی نظم میں پاتے ہیں

رابندر ناتھ نے عموماً روایات نما یا روایاتی مواقع اور موضوعات ہی کو اپنایا ہے۔ قدیم بھارت کا ادب ان کی روح ثانی تھا یوں تو

نے جس موضوع کو بھی چھو لیا ہے اس میں ایک نیا پن پیدا ہو گیا
میگھ داس" کے لئے رابندر ناتھ کو گہری عقیدت مندی
ر وہ کالیداس سے اور ان کی شاعری کی مو ہنی سے برابر متاثر
ہے لیکن جب انھوں نے کالی داس سے کبھی کوئی موضوع لیا ہے،
ایک ایسا موڑ دیدیا ہے کہ ان کی اپنی خصوصیت کی جھنکاریں
ج ہیں۔ رابندر ناتھ کے لئے "میگھ دوت" کسی پرانی کتھا
ی کا اپنی محبوبہ کو بھیجا ہوا پیغام نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام
پریمیوں کی شدید آرزو اور تمنا ہے۔ "نا مبادلے تکن"
اب" میں ایک ختم ہو چکے ماضی کی فضا کو انھوں نے پھر سے لوٹایا
یہ امر واضح کر دیا ہے کہ ماضی پھر سے ہم لوگوں کے آج سے
۔ و دلی جذبات ہی میں بس رہا ہے۔ ماضی و حال اور پران
یہ کے تعلق کو جس جا بک دستی سے "کام دیو کے جل کر خاک ہونیکے
جیسی نظموں میں شاندار طور پر ظاہر کیا گیا ہے وہ شاید ہی کہیں
ھنے کو ملے۔ ماضی کی روایتوں کو پھر سے لاکر انہیں جان ڈال دینے
ح پھونک دینے کا رجحان انکے آخری زمانے کی نظموں میں نہیں ملتا
ضت کا بگڑ جانا" میں پران کی ایک قدیم کتھا کی بہت پُر معنی
، گئی ہے اور اسے بہت سندر روپ دیا گیا ہے اس نظم میں
س کے اوپر نئی زندگی کے ابھار کی آخری فتح کا اعلان کیا گیا ہے

را بندر ناتھ نے محض موضوعات و مواقع کو لے کر ہی نئے تجربے
کئے بلکہ شاعری کے روپ کو بھی اور اس کی تکنک کو بھی انھوں نے
ھنگ سے پیش کیا ہے۔ اپنے سے پہلے کے شاعروں کے مرعوب
سے وہ کبھی خائف نہیں ہوئے۔ بنگال کے ویشنو کا ویہ سے انھوں
تکلف استفادہ کیا ہے اور خود ہی بہاری لال جیسے بنگالی
ں کا احسان مانا ہے اپنے زمانے کی فضا سے کوئی شاعر اچھوتا
رہ سکتا اس طرح کی کوششیں کامیاب کم ہی ہو پاتی ہیں اور حقیقت
ں کوششیں اوسط درجے کے شاعرین خود اعتمادی کی کمی ظاہر
ں۔ رابندر ناتھ کا ارتقا اپنے زمانے کے سماج کے زیر اثر ہی
ں ارتقا کے اس عمل نے ہی انھیں ایسا توانا بنا دیا کہ وہ اپنے
دوں میں سب سے اوپر اٹھ سکے ایک بار نظم کی داغ بیل متعین کر لینے
ر وہ اپنی نظم کے موضوع اظہار اور نظم کی صورت گری کے
ب وہ نئے تجربے کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے اور تجربے کے
امات سے تحریک حاصل کرتے تھے جن کی طرف ان سے پہلے بنگلہ
ری میں دھیان نہیں دیا گیا تھا سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اُس

بحث کو بہت حد تک ختم ہی کر دیا کہ شاعری کا موضوع کیا ہے اور کیا
نہیں ہے "چھنڈیکا" میں انھیں ایسے موضوعات و مواقع کا جائزہ
کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جن میں بادی النظر میں کسی طرح کا بھی امکان
شعری نظر نہیں آتا لیکن اپنی شاعرانہ قابلیت کے بوتے پر وہ موضوع
کو انکی سطح سے اوپر اٹھا دیتے ہیں اور حسن کی روشنی سے اسے جگمگا
دیتے ہیں۔ انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کا یہ دعویٰ ہے کہ گمبھیر سے
گمبھیر کیفیت و تجربے کی صحیح ڈھنگ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے اور
روز مرہ کی زندگی کی حقیقتوں کو رمزیت کی روشنی سے جگمگایا جا سکتا
ہے رابندر ناتھ کے اس دور شاعری کی بہت سی نظموں پر صادق
آتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے ہنسی اور رونا تفریح اور جوش گھل
مل کر آرزو و تمنا شدید لعن طعن اور طنز کی ملی جلی دنیا تخلیق کر دیتے ہیں
"کرشن کلی" "مناسب جگہ" اور "وہ وقت" وغیرہ
نظموں میں انسان کی رغبت و رجحان داخلی جوش اور ترنگ اور
درد اور سوز و گداز کے حیرت انگیز نئے داؤں گھات ملتے ہیں۔

ابندر ناتھ کی شاندار صلاحیت شعری خاص رد سے غنائی
نظموں کی تخلیق کے لئے تھی لیکن کبھی کبھی ہم ان میں سماج کی برائیو
کے خلاف شدید تلخ نوائی بھی پاتے ہیں وہ جانتے تھے کہ مروجہ قیاس
کے مطابق روحانیت سے متعلق بھارت کا جو دعویٰ ہے وہ بہت کچھ
تو سوچ نہ سکنے اور سمجھنے کی طرف سے بے نیازی و بیگانگی کے سوا
کچھ بھی نہیں اپنی نظم "ہن، ٹن، چھٹے" میں رابندر ناتھ نے نہات
بے دردی سے گمبھیرتا کے اس گھٹا ٹوپ اندھار کو تتر بتر کر دیا ہے
جو ایک دماغی اور ذہنی خلا کو چھپائے رہتا ہے "دو بیگھے" میں انھوں
نے ان بے جان روایتوں اور بے معنی سہاروں کا کھلا مذاق
اڑایا ہے جنھوں نے زندگی کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا رکھا ہے "دیوتا کا
کاشتکار" میں انھوں نے قربانی دینے کا عقیدہ اور فرض انسانی سے
متعلق جذبات کے نقائص و تضادات کی تصویر کشی کی ہے اور دکھایا
ہے کہ کس طرح رسم پرستی اور وہم پرستی کے اوپر سچائی کو فتح حاصل
ہوتی ہے۔ ظاہر پرستی میں آدمی سچ کو کھو بیٹھتا ہے۔ "اہانت
شدہ" اور "خاکی عبادت گاہ" میں انسان کی توہین کے
خلاف اپنے آپ کو نفرت اور عتاب کی حساس ترین رگیں چھوتے ہوئے
پاتے ہیں۔ روزی حاصل کرنے کے لئے اپنائی ہوئی محنت مشقت یا
طبعی رجحان پر کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا ماننے کے لئے وہ ہرگز تیار
نہیں تھے۔

اپنے آخری دنوں میں رابندر ناتھ کو جو جسمانی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں اس کا اظہار آخری زمانہ کی نظموں میں اتنا واضح اور شدید ہے کہ جس کی مثال کہیں شاید ہی دیکھنے کو ملے "**تھکے شعور کی شام**" "**قرضے کی ادائیگی**" وغیرہ نظموں میں زبان اور انداز بیان کی پختگی قابل دید ہے۔ شروع زمانہ کی ان کی نظموں میں بیفکری اور لہو ترنگ نظر آتی ہے۔ آخری زمانہ کی نظموں میں نہ صرف شعوری باقاعدگی اور اظہار میں کفایت شعاری ملتی ہے بلکہ ان میں تکمیل کی آخری منزلیں اور معنویت و تاثیر کی تکمیل ملتی ہے شاعر نے سنسار اور زندگی سے اپنا سمجھوتہ کرلیا ہے۔ سنسار میں دکھ اور درد ہے۔ زندگی میں موت کی پرچھائیں برابر پیچھے لگی رہتی ہے لیکن ان سبھی کمیوں کے باوجود زندگی ایک بہت پُر معنی چیز ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ "**حسن کی خوشگوار دعا**"، "**ارض شیریں کی خاک**" وغیرہ نظموں میں موت کی گھاٹی کی چھاؤں میں زندگی کی فتحیابی کا جذبہ ہے

کسی شاعر کے ذہنی ارتقا پر روشنی ڈالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے تجربہ کے نئے نئے میدانوں میں ارتقا شعور کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو کچھ قانونوں کے ماتحت اپنا عمل کرتا ہے لیکن جہاں تک شاعری کا سوال ہے داخلی تحریکوں پر پُر رمز ڈھنگ سے جوار بھاٹا آتا رہتا ہے اور اس کی تشریح نہیں ہوسکتی۔ کبھی کبھی کسی شاعر کی بلند ترین نظمیں تو اس کے عنوان شباب کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور بعد کے زمانہ کی نظمیں بسا اوقات سادھارن اور روایتی ہوتی ہیں رابندر ناتھ ٹیگور پر بھی یہ امر کسی حد تک عائد ہوتا ہے ان کی جوانی کی کچھ نظمیں بہت بلند ہیں اور بعد کی کچھ نظمیں ایسی ہیں جو شاید وجدان کی کسی شدید تحریک سے نہیں کہی گئی ہوں لیکن یہ کہنا پڑے گا کہ اسّی برس کی اتنی لمبی عمر میں اپنے وجدان کی تحریک کو جس طرح زندہ رکھا وہ انھیں جگوں جگوں تک زندہ رہنے والے عظیم ترین شعرا کی صف میں بٹھا دیتا ہے جس بھرپور ابھارتا بناک درخشندگی سے معمور قوت حیات سے وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوسکے اس کے پیچھے ان کی اکھنڈ اور مکمل شخصیت ان تمام عناصر کو اور سلسلوں کو انھوں نے اپنے اندر فراہم کرلیا تھا جن سے آج کے ہندوستان کی مرکب اور مخلوط تہذیب کی تعمیر ہوئی ہے یہ بلند مقام عزت و شان انھیں کو حاصل ہے کہ انھوں نے بھارت کے مختلف اپہلوز زندگی کے تمام زاویوں کو لیا اور انھیں جگمگا دیا سنسکرت ادب سے انھوں نے بہت کچھ لیا اور بنگلا کی لغات اور چھند کو بھرپور کردیا۔ ویشنوں گیت کی شعریت اور تصوف سے پُر رمز حقائق کو متحد کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے دور وسطیٰ کے ساونت شاہی آئین زندگی میں جو درباری زندگی رونما ہوئے اس کی تشریح میں انھوں نے پوری ہم آہنگی، ہمدردی، اور چابک دست تخیل سے کام لیا اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی زندگی سے انھوں نے اتنا کچھ اور ایسا کچھ لیا جس کا استعمال ادب میں پہلے نہیں ہوا تھا۔ بنگال کے گاؤں دیہاتوں کے مناظر اور وہاں کی زندگی کے جذبات کا تانا بانا ان کی شاعری میں بڑی پُرکاری سے بنا گیا ہے بنگالی ادب میں انھوں نے یورپ کے آدرشوں اور طرز فکر کا سندر امتزاج پیدا کیا "بلاکا" کے نام سے ان کی نظموں کا جو مجموعہ ہے ان کی بہت سی نظموں میں قوت و حرکت کی صفات دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا ایک نہایت صحت مند اثر ہے۔ نوع انسانی نے قدیم زمانے ہی میں سمجھ لیا تھا کہ ہر چیز اور سب کچھ آئی جانی ہے اس حقیقت کو ہر شے نے جو ایک چھپی رہتا رہے اس کی مورتی بناکر رابندر ناتھ نے اس میں ایک نئی معنویت بھر دی ہے۔

قصہ مختصر قدیم ہندوستانی تہذیب کی وراثت مغل دربار کے خاص طور طریقے بنگال کے عوام کی زندگی کے سچے حقائق اور جدید یورپ کی قوت عمل اور توانا اقلیت کے امتزاج سے رابندر ناتھ کی شاعری رونما ہوئی وہ سبھی جگوں اور سبھی تہذیبوں کے حقدار ہیں ان مختلف عناصر اور سلسلوں کے مل جانے نے ان کی شاعری کی آفاق گیر، دلکش اور لوچ دار بنا دیا ہے۔

ہمایوں کبیر

۲۲ر اپریل ۱۹۵۸ء
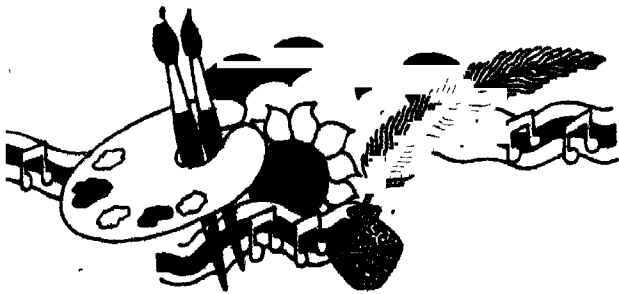
مہاکوی ٹیگور اور

گیتانجلی

مجھے بخوبی یاد ہے جب میں ابھی نادان بچی ہی تھی میری ماں اپنی بھاری بھرکم آواز میں کچھ ایک ایسے گیت گایا کرتی تھی جنہیں میں سمجھ تو نہ سکتی تھی، البتہ وہ میرے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر میری ماں نے بتایا کہ یہ گیت شری رویندر ناتھ ٹیگور کے ہیں۔

اُن دنوں روی بابو کے گیتوں کا چرچا ہر ایک کی زبان پر تھا۔ کشتی کھیتے ہوئے ملاح، ہل چلا رہے کسان، سکولوں کے طلباء، گھر کے کام کاج میں مصروف عورتیں، امیر غریب غرضیکہ ہر کوئی رویندر ناتھ ٹیگور کے گیتوں کا دِلدادہ تھا۔ اگر لوگ مسرور ہوتے تو بھی روی بابو کے گیتوں سے لُطف اندوز ہوتے اور اگر مغموم تو بھی اس کے پر تسکین گیت ان کے مجروح دِلوں کے لئے مرہم شفا کا سا اثر رکھتے تھے۔ جب کبھی مہاکوی نے بھارت کی پکار سنی تو اس نے حب الوطنی کے پُرجوش ترانے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ جنہیں سن کر دیش کے نوجوان تڑپ اُٹھے، اور بھارت ماں کی بیڑیاں کاٹنے کے لئے ایک نیا جوش اور اُمنگ لے کر میدان عمل میں کُود پڑے۔

مسز سروجنی نائیڈو
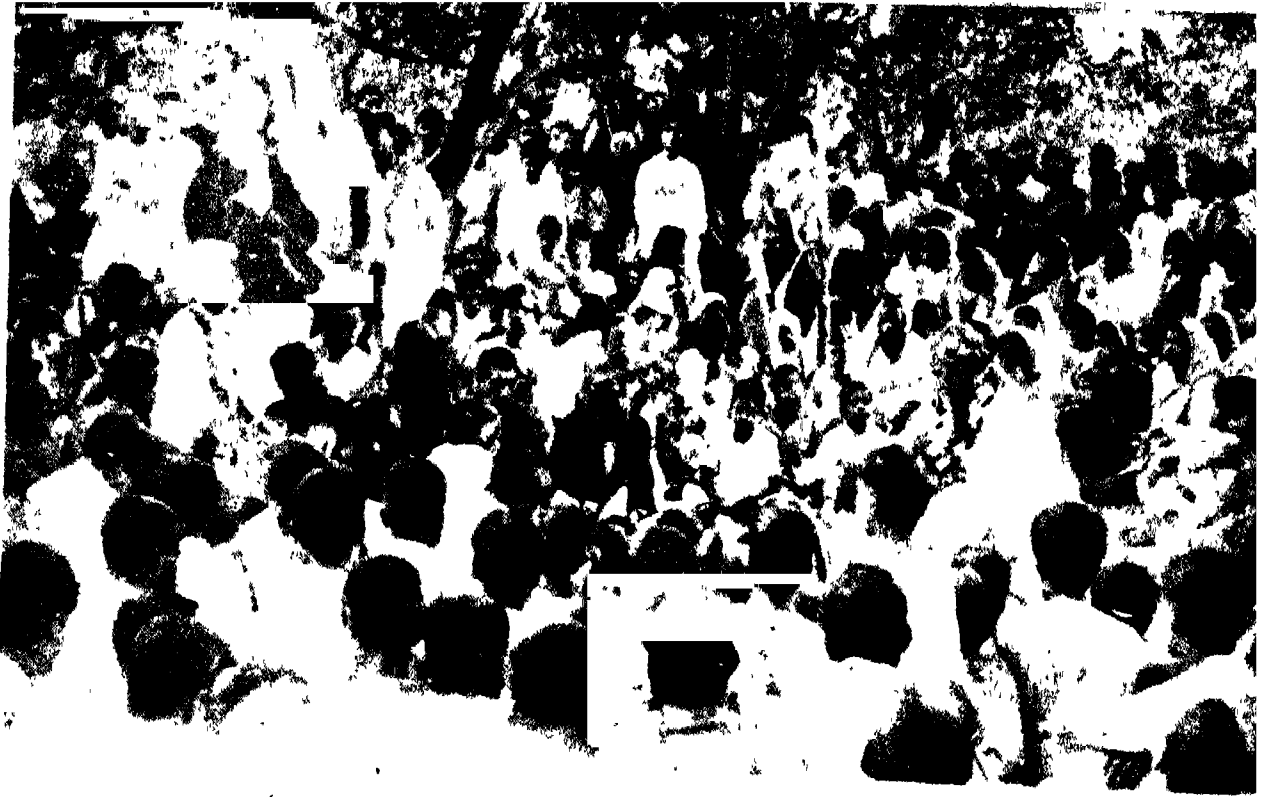
ردیو رابندرناتھ ٹیگور کو "نوبل پرائز" ملنے پر شانتی نکیتن میں اُن کے اعزاز میں منائی جانے والی تقریب کے موقع پر لی گئی ایک تصویر۔
(آبھا اننو مون گپتا کے شکریہ کے ساتھ)

مجھے وہ دن بھی یاد ہیں، جب میں دُنیا کی سیاحت پر
تھی۔ تب دورانِ سفر میں نے دیکھا کہ ٹیگور ہی
دوستان کا وہ ستارہ ہے جو دُنیا کے ہر خطہ میں چمک رہا
ہے۔ مغرب کے لوگ اس کی گیتانجلی پر دل وجان سے فدا
ہو چکے تھے، اور وہ اس وقت کا بے تابی سے انتظار کر رہے
تھے جب بھارت کا رِشی اپنا جیون سندیش دے کر
جنگِ عظیم سے پسے ہوئے مجروح لوگوں کو شانتی کے میٹھے نغمے
سنا کر ان کے دلوں کو ڈھارس دے گا۔

اسی دوران میں جب مجھے ناروے کی ترائیوں میں سے
گزرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے پہاڑیوں کے دامن میں جا بجا بسی
ہوئی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں جہاں چھ مہینے سوائے تاریکی
کے اور کچھ نہیں ہوتا، دیکھا کہ کسان لوگ اپنے بیوی بچوں کے
ساتھ روی بابو کے نغمے الاپا کرتے تھے۔ یا یوں کہیئے کہ ان
تاریک دِنوں میں وہاں کے کسان جس توشہ پر گزران کرتے
تھے، وہ ٹیگور کے شہ پارے ہی تھے۔

جب گیتانجلی شائع ہوئی تو اتفاق سے میں اِنگلینڈ
میں ہی تھی۔ مسٹر ڈبلیو۔ بی۔ یِیٹس (W.B. YEATS)
جو نہ صرف آئرلینڈ کا ہی بلکہ موجودہ نسل کا جلیل القدر
شاعر ہے۔ دیوانہ ہوگیا۔ جب اس نے گیتانجلی کو ترجمے کی
شکل میں دیکھا۔ سچ جانیئے وہ گیتانجلی پر دیوانہ مرتا تھا۔
اس کا یقین تھا کہ اس میں شکستہ روحوں کے لئے
پیغامِ اُمید کا دریا موجزن ہے۔

ایک سال میں نے سردیوں کے دن سکنڈے نیویا میں
ہی گزارے۔ یہ تو دنیا جانتی ہے کہ ٹیگور کو گیتانجلی لکھنے پر ایک
لاکھ بیس ہزار روپیہ کا نوبل پرائز اہلِ سویڈن کی طرف سے ہی
پیش کیا گیا تھا۔ اس لئے قدرتاً تمام سویڈن ٹیگور دیتا سے شرابور
تھا۔ وہاں میری میزبان وہ ادیبہ تھی جس نے گیتانجلی کا ترجمہ
اِنگلستان کے حلقہ ادب کے سامنے رکھا تھا۔ میں نے وہاں
محسوس کیا کہ سویڈن کا ہر فرد بشر ٹیگور کے نغموں کے سیلاب
میں بہتا جا رہا ہے، اور کہ ان کی زندگی پر ٹیگور کے رنگ برنگے
گیت چھا رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ ذی شان خراج ہائے تحسین جو دنیا کے ہر
کونے سے شری رویندر ناتھ ٹیگور کو ادا کیے گئے
جنہوں نے اپنی ذہانت، قابلیت، شاعری اور فلسفہ سے
ہندوستان کی وقعت اور عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔۔۔

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر
ڈائریکٹر، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی ۱

رابندر ناتھ ٹیگور ۔
ایک علمی، آفاقی شخصیت

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک ایسے متمول اور عالم گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں سرسوتی (علم کی دیوی) اور لکشمی (دولت کی دیوی) دونوں کا سایہ تھا۔ اسے حسنِ اتفاق سمجھئے کہ ٹیگور کا جنم کلکتہ میں اس وقت ہوا جب الٰہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو پیدا ہوا۔ ایک نے قلم کے ادب میں اپنا سکہ بٹھایا تو دوسرے نے میدانِ سیاست میں اپنا لوہا منوایا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر ہند میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء - ۱۹۴۱ء) اور علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء) جیسی دو تاریخ ساز ادبی شخصیتوں نے نہ صرف دنیائے ادب میں بلند مقام پیدا کیا بلکہ اپنی دانش و حکمت، اپنے شعر و ادب اور اپنی حب الوطنی اور وطن دوستی کے ذریعے اہالیانِ ہند کے دلوں میں گھر کر لیا۔ درحقیقت دونوں نے مذہبی رواداری کے ذریعے امنِ عالم کا پیغام دیا، دونوں نے مساوات و برابری کی خاطر طبقاتی اختلافات کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ دونوں نے مشرقی روایات کی آگہی پیدا کر کے مشرق اور مغرب کے اقدارِ زندگی کے ملاپ کی سعیِ پیہم کی اور دونوں نے برطانوی سامراجیت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کیا حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا لیکن افسوس ہے کہ دونوں ہی اپنی زندگی میں ہندوستان کی آزادی دیکھ نہ سکے۔ اگرچہ دونوں نے قومی یکجہتی سے بھرپور "جن گن من" اور "سارے جہاں سے اچھا" جیسے قومی ترانے دئے۔ ایک اور راشٹر گیت "وندے ماترم" ہے جسے بنکم چندر چٹرجی نے لکھا ہے۔

نستم ظریفی یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء میں ٹیگور کو نوبیل لاریٹ
(Noble Laureat) بنائے جانے کے کچھ سال قبل کلکتہ
رسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر آشوتوش
جی نے ڈی لٹ کی ڈگری کے لئے سفارش کی تو سینٹ
(Sena) کے اراکین نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ ٹیگور کو
نہیں آتی۔ یہی خیال ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے بارے میں
معترضین کی رائے میں اقبال کی اردو صرفی لحاظ سے غلط ہے۔
ل کسی نے صحیح کہا ہے کہ جو شخص خداداد قابلیت کا مالک
ہے وہ معمولی دل و دماغ کے انسانوں کا رہین منت نہیں
ہے۔

بقول پروفیسر ہمایوں کبیر:
ٹیگور اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب مغربی تہذیب نے
ہندستان کے ثقافتی ماحول میں ہیجان پیدا کر دیا تھا
اور بظاہر سارے ملک میں بیداری کی ایک نئی لہر نے
جنم لیا اور اندھی تقلید کی بجائے مغربی اصول زندگی کو
اپنانے کے لئے متوازن طریقہ کار اختیار کیا گیا اور
اس طرح مشرقی معاشرت کی آگہی اور توقیر میں اضافہ
ہونے لگا اور بنگال کے خطہ کلکتہ میں خصوصی طور پر
جہاں مغربی اثرات کو زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا
مغرب اور مشرق کا بجا اختلاط ایک حقیقت اور آدرش
کی صورت میں نظر آنے لگا۔

سن ستاون کی پہلی جنگ آزادی کے بعد کے ان تمام
ات اور حالات کو ٹیگور نے دیکھا تھا جن میں نیشنل کانگریس
مجاہدین آزادی کی انجمن کا قیام، جلیانوالہ باغ میں قتل عام
ردناک المیہ، خلافت جیسی ہندو مسلم اتحاد کی تحریک
ح جیسا آزادی کا اندولن اور عدم تشدد یا گاندھی جی کا
قابل ذکر ہے اور جن کے اثرات کو انھوں نے براہ راست
س کیا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹیگور
ہمیشہ سیاست سے الگ رہنا چاہا کیوں کہ وہ ایک ہمہ جہت
شخصیت کے حامل تھے اور انسان دوستی اور قومی رواداری
جذبات کے پیش نظر وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں اپنے آباؤ اجداد کی

رہائش گاہ کلکتہ سے تقریباً دور بولپور چلے گئے اور آہستہ آہستہ
اپنے مرحوم والد بزرگوار کے ایک چھوٹے آشرم کو مکتب
میں تبدیل کیا جو بعد میں 'وشو بھارتی' یعنی عالمگیر برادری کو دوسرے
لفظوں میں ۱۹۲۱ء میں 'شانتی نکیتن' کے نام سے مرکزی
یونیورسٹی تسلیم کی گئی۔ یہ یونیورسٹی اپنی نوعیت کی پہلی اعلیٰ
درسگاہ ہے اور اس کا نظام تعلیم ایک مخصوص لائحہ عمل کا حامل ہے۔
ابتدا میں 'وشو بھارتی' اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص رہی اور
صرف ان ہی طلبہ کا داخلہ ہوتا تھا جنھوں نے اپنی زندگی کو طلب علم
کی خاطر وقف کیا ہو۔
دوم، اس کے نظام تعلیم میں امتحانات کی نہ کوئی اہمیت تھی
اور نہ کوئی سند دی جاتی تھی۔
سوم، طلبہ یعنی طلبا و طالبات دونوں کو اپنی مساعی پر اعتماد کرنا ہوتا
تھا لیکن فوری مدد کے لئے وہ اپنے اساتذہ سے رجوع ہو سکتے
تھے۔
چہارم، مجوزہ نصاب تعلیم کی ترغیب دی جاتی تھی لیکن طلبہ کو اپنی
قابلیت اور استعداد کے مطابق دو یا دو سے زائد مضامین کے
انتخاب کی اجازت تھی۔
پنجم، ذریعہ تعلیم بنگلہ تھی لیکن بیرونی طلبہ کو زبان کے تعلق سے
آسانیاں بہم پہنچائی جاتی تھی۔
ششم، داخلہ ان ہی طلبہ کا ہوتا تھا جو میٹرک یا انٹرنس کامیاب
شدہ ہوتے۔ البتہ بعض حالات میں طلبہ کو اس شرط سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا۔
ہفتم ابتدائی سطح پر نصاب تعلیم پانچ حصوں پر مشتمل تھا:
۱۔ زبان، ۲۔ فلسفہ، ۳۔ تاریخ، ۴۔ آرٹ اور ۵۔ موسیقی
زبان کے ذیل میں مندرجہ ذیل زبانوں کی تعلیم کا اہتمام تھا:
سنسکرت، پالی، پراکرت، بنگلہ، ہندی، مراٹھی، گجراتی،
میتھلی، سنہلی، فرانسیسی، جرمنی، عبرانی، لاطینی اور تبتی۔

تحقیق کے ذیل کے مضامین مختص تھے:
سنسکرت، پالی، پراکرت، فلسفۂ بدھ مت اور قدیم تاریخ ہند
اور ثقافت۔

۱۹۲۷ء میں اسلامی علوم و ثقافت کا شعبہ قائم کیا گیا اور ۱۹۳۵ء
میں چینی زبان و ادب کا شعبہ بھی جاری کیا گیا۔ شانتی نکیتن کے مقاصد
میں مشرق کی تمام زبانوں اور ثقافتوں کی اعلیٰ سطح پر تعلیم اور تحقیق کا اہتمام
کرنا اور ہندستانی ادبیات و تاریخ، تہذیب و تمدن، علوم و فنون کا

قومی راج

سید حیات وارثی
جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندی اردو سنگم
باغ انوار ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے حضور

اٹھا تھا ابر جو بنگال کی فضاؤں سے
وہ ایشیا پہ برس کر جہاں میں پھیل گیا
تمام کشتِ ادب اس سے ہو گئی سیراب
عمل کے علم کے انسانیت کے پھول کھلے
دیا زمانے کو گیتانجلی کا آئینہ
جلائی شمعِ عمل شانتی نکیتن میں
وطن کو جس نے دلایا ہے عالمی اعزاز
لسانیات کی تفریق ختم کی جس نے
اسی کا مشرق و مغرب شمال اور جنوب
حدودِ ارض کے توڑے ہیں دائرے اس نے
وہ شب سے لڑتا رہا عمر بھر سحر کے لئے
وہ جس کی فکر کا پرتو ترانۂ قومی
تمام صوبے ہیں گل اور ملک گلدستہ
وہ اتحاد کا تیر تھا ہے پیار کا سنگم
جمالِ ہند ہے بنگال کا اجالا ہے

ہم احترام سے ٹیگور اس کو کہتے ہیں

بالخصوص مرکوز کرنا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی اشاعت کا خصوصی انتظام بھی تھا۔ علاوہ ازیں مشرق اور مغرب کی ثقافتوں، قدروں اور اصولوں کو قریب تر لانا اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی سعی کرنا اور انجام کار عالمگیر امن اور ذہنی یکجہتی پیدا کرنا مین مقاصد میں سے تھا۔

۱۹۲۰ء سے 'شانتی نکیتن' کے کامیاب شدہ طلبہ کا کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ قانونی طور پر جائز قرار دیا گیا اور وہ ڈگریاں بھی حاصل کرنے کے مجاز ہو گئے۔ اگرچہ یہ تبدیلی ٹیگور کے تصورات سے ٹکر کھاتی ہیں۔ آخری دم تک ٹیگور اس بات کا ہمیشہ اعادہ کرتے رہے کہ 'شانتی نکیتن' کو سیاست سے دور رکھا جائے اور اس کے دروازے بلا تخصیص مذہب و قوم، بلا لحاظِ نسل و زبان اور بلا امتیاز مسلک و فرقہ تمام افراد کے لئے وا رہیں تاکہ عالمگیری برادری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا اب معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور جیسی سیکولر اور آفاقی شخصیت نے اپنے قول و فعل سے تمام مذہبوں تہذیبوں، فلسفوں کا نہ صرف احترام کیا بلکہ ان کی روشنی میں مذہبی رواداری اور انسان دوستی کے ساتھ باہمی ہمدردی کا سبق دیا۔ ہندوؤں کو ان کی بھگود "گیتا" اور "رامائن" کی روایات سنا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ عیسائیوں کو انجیل اور عیسیٰ مسیح کی تعلیمات کا واسطہ دیا سکھوں کو گرنتھ صاحب اور گوبند سنگھ کے فرمودات کے ذریعے باہمی ہمدردی کی طرف مائل کیا اور مسلمانوں کو قرآن اور سیرتِ رسول کے فلسفیانہ نکات یاد دلا کر مائل بہ عمل کیا اور اس طرح ٹیگور نے حصولِ امنِ عالم اور عالمگیری برادری کے لئے تعصب اور تفرقہ اندازی کے خلاف مشترکہ محاذ کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ انسان دوستی اور قومی یکجہتی کے لئے آمادہ کیا۔

بہت اغلب ہے کہ سر محمد اقبال نے اپنے معاصر سر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے یادگارِ زمانہ لوگوں کے لئے یہ شعر موزوں کیا ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوسف ناظم

گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور

علم جغرافیہ کے حساب سے تو سورج ایک ہی ہے جو ہر روز مشرق سے نکلتا اور ہر روز شام میں مغرب میں ڈوب جاتا ہے لیکن وہ بھی تو آخر سورج ہوتے ہیں جو زمین کی کوکھ سے نکلتے ہیں اور جن کی روشنی ان کے ڈوبنے کے بعد برسوں برقرار رہتی ہے۔ ایسا ہی ایک سورج آج سے کوئی سوا سو سال پہلے بنگال کی سرزمین سے طلوع ہوا (بنگال ہندوستان کے مشرق میں واقع ہے) مقام طلوع کا نام تھا شیالدہ، مہینہ تھا مئی کا اور تاریخ تھی ۸ مئی ۱۹۶۱ء ویسے

تو یہ راجہ خاندان کے فرد تھے لیکن ان کے دادا راجہ دوارکا ناتھ کا جب انگلستان میں انتقال ہوا تو ان کے ذمے ایک کروڑ روپیہ قرض تھا۔ جو ٹیگور کے والد مہرشی جی نے ادا کر دیا اور خود سادہ زندگی گزارنے لگے۔ ٹیگور کے حصے میں بھی یہی زندگی آئی لیکن شاید ایسی سادہ زندگی کی بدولت وہ دولت بھی ان کے ہاتھ آئی جس سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

ٹیگور کیا نہیں تھے۔ شاعر وہ تھے۔ ڈرامہ نگار وہ تھے ...ر وہ تھے۔ موسیقار، ناول نگار، افسانہ نویس، سیاح، ...لیم فلسفی بھی کچھ تھے۔ سورج کی کرنیں بھی تو بکثرت ہوتی ... یہ کہ شہر بننا چاہتے تھے نہیں بن سکے۔ اچھا ہی ہوا ورنہ کمرۂ ...ت میں مقید ہو کر رہ جاتے۔ انھیں وکالت نہیں اپنی ان صلاحیتو...ں سے انصاف کرنا تھا جو قدرت نے انھیں ودیعت کی تھیں ...نہ بھی فیاضی کے ساتھ ۸ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی نظم ...اپنے گھر والوں کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہاں کوئی کم عمر لڑکا شعر گوئی کی طرف راغب ہوتا تھا تو وہ اس طرح چھپتا پھرتا تھا جیسے وہ کوئی نازیبا بات کر رہا ہو اور لڑکیوں کا تو شعر و ادب میں داخلے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن بنگال میں اس قسم کی پابندیاں یا قواعد رائج نہیں تھے۔ بنگالی ادب اسی لیے عالمی ادب سے آنکھیں ملانے میں پیش پیش رہا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی پہلی نظم بھی ان کے اہل خاندان نے سنی اور داد و تحسین کا سلسلہ گھر کے دیوان خانے ہی سے شروع ہوا۔ اس دیوان خانے کی داد سے ان کے دیوان کے مرتب ہونے میں کافی سہولت ہوئی۔

رابندر ناتھ نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔ یوں یہ عمر بہت زیادہ طویل
نہیں ہے لیکن پیداوار کے لحاظ سے طویل کہی جاسکتی ہے کہ اس میں عہد طفولیت
کے دن بھی شامل تھے۔
انھوں نے ۸ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیے۔ موسیقی، مصوری
اور مسلسل مطالعے کو اپنی مصروفیت بنائے وہ زندگی کی دوڑ میں
عام آدمیوں سے کم سے کم ایک دہائی آگے تو نکل ہی جائے گا۔ گرو
دیو کے ساتھ یہی ہوا۔ اس عمر کو علمی اور ادبی اعتبار سے ۱۰۰ سال
سمجھنے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے۔

فنون لطیفہ میں دو فنون کی حد تک تو مہارت حاصل کرنے
والے اہل فن تو شاید بہت لوگ ہوں گے لیکن ۳ فنوں میں دسترس
حاصل کرنا تو ملک گیری کی طرح کوئی حرکت ہوئی۔ گرو دیو کو موسیقار
بننے کا موقع اس وجہ سے ملا کہ ان کے گھر کا ماحول شاعرانہ سے زیادہ ترنمانہ
تھا اور ترنم بھی کیسا بے حد پکا۔ ان کے بڑے بھائی پکے گانے گایا کرتے
تھے اور بنگالی گیتوں کی دھنیں بھی بناتے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور گھر بیٹھے
موسیقار اور نغمہ نگار بن گئے۔ ساز، آواز، ریاض، بیاض سبھی کچھ تو
موجود تھا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے استاد ان کے گھر آتے تھے
رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۳، ۱۴ سال ہی کی عمر ہی سے موسیقی کے درس
لینے شروع کر دیئے اور سن بلوغ تک پہونچتے پہونچتے گیت لکھ لینا ان
کے بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا (گو کہ وہ لکھتے سیدھے ہی ہاتھ سے تھے)

مصوری کی انھوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بعض
صورتوں میں باضابطہ تعلیم بے ضرورت ہوتی ہے۔ مصور بننے کا خیال
انھیں ذرا دیر سے آیا۔ ذرا کیوں کافی دیر سے آیا۔ جس وقت انھوں نے
مصوری شروع کی وہ ۶۷ سال کے تھے۔ اس عمر میں لوگ از کار رفتہ
ہو جاتے ہیں اور ان گرو دیو کو دیکھیے کہ ایک نئے دشت کی سیاحی
پر نکل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنی تصویریں بنالیں کہ ایک نمائش کا
سامان ان کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ ساری تصویریں ان کی اپنی نظموں
کی تصویریں ہیں۔ ٹیگور شعر کو نغمہ اور تحریر کو تصویر بنانے کا فن جانتے
تھے لیکن ان کی مصوری کی عمر ماہ و سال کے حساب سے صرف ۱۳ برس
تھی۔ ۱۹۴۱ میں تو گرو دیو کی وفات ہو گئی۔

رہا شاعری کا معاملہ تو رابندر ناتھ ٹیگور نے خلیج بنگال میں جتنی
لہریں ہر سال اٹھتی ہیں اتنے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی شعر ضرور کہے ہونگے

آپ کو شاید اس بیان میں مبالغہ نظر آیا لیکن یہ اعداد و شمار ان کے کلام
کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ان کی لکھی ہوئی نظموں اور گیتوں کی تعداد ۳ ہزار
ہے۔ اب اندازہ کر لیجئے کہ ان نظموں اور گیتوں میں کتنے مصرعے ہوں گے
انھیں گننا ایسا ہی ہے جیسے آسمان کے تارے گننے کی کوشش کرنا لیکن
اگر کسی نے گن لیے تو سمجھیے اس نے دونوں کام ایک ساتھ کر لیے۔ رابندر
ناتھ ٹیگور واقعی آسمان کے تارے توڑ لاتے تھے۔ شاعری تو انھوں نے
بہت ہی کم عمری میں شروع کر دی تھی لیکن اہل نظر کا کہنا یہ ہے کہ ٹیگو
کا فن اپنے عروج پر ۱۹۰۰ ہی کے لگ بھگ پہونچا۔ ان کی عمر اس وقت
۴۰ ہوگی جب انھوں نے مشہور نظم "کشنکا" کہی۔ ان کی مقبول ترین تصنیف
"گیتا نجلی" بھی ۱۹۰۵ ہی کے بعد سے مکمل ہوئی اور اسی دہائی میں رابندر
ناتھ ٹیگور نے عالمی ادب میں ایک نمایاں مقام بنا لیا۔ یوں بھی وہ دراز
قد کے مالک تھے۔ ۱۴ سال کی عمر میں بھی اپنی عمر سے بھی کئی سال بڑے
لڑکوں کو قد کے معاملہ میں بھی نیچا دکھاتے تھے اور اب تو ان کا علم
اور ادبی قد پیمائش کی حدود دون سے آگے نکل گیا تھا۔ ۱۹۱۳ میں انھیں
ادب کا نوبل پرائز پیش کیا گیا اور انھیں ۱۹۱۵ء میں حکومت برطانیہ
نے "سر" کے خطاب کا مستحق سمجھا۔ لیکن رابندر ناتھ اس خطاب کو
صرف ۴ سال برداشت کر سکے ۱۹۱۹ میں جلیان والا باغ کا سانحہ
ہوا اور ٹیگور نے انگریزوں کی بربریت کے خلاف احتجاج کرتے
ہوئے "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔

"گیتا نجلی" کا جب انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کا تعارف
ڈبلو۔ بی۔ ایٹس (W.B.YEATS) نے لکھا (لیکن یہ ٹیگور کے لئے
نہیں خود اس انگریز شاعر کے لئے ایک اعزاز تھا)۔ خود ہندوستان
میں فراق گورکھپوری نے ٹیگور کی ۱۰۱ نظموں کا ترجمہ کیا۔ اور اسے
اپنے لئے باعث افتخار جانا۔ نیاز فتحپوری نے بھی گیتا نجلی کے ترجمے
سے اپنے ادبی وقار کو بلند کیا۔
ٹیگور کو نوبل پرائز اور سر کے خطاب کے ذریعے جو خراج عقیدت
ملا وہ اپنی جگہ درست لیکن انھیں اگر کسی کی طرف سے سچا خراج
عقیدت ملا تھا تو وہ تھے بنکم چند چٹرجی۔ بنگالی ادب کے بے تاج
بادشاہ بنکم چند چٹرجی اس مقام پر پہونچ چکے تھے جہاں رابندر
ناتھ ٹیگور کو پہونچنے میں ابھی دیر تھی۔ لیکن ایک محفل میں
جب بنکم چندر جی چٹرجی کو میزبان نے پھولوں کا ہار پہنایا۔
اتفاق سے اس محفل میں نوجوان ٹیگور بھی موجود تھے۔ تو بنکم
چند چٹرجی نے اپنے گلے سے یہ ہار اتار کر ٹیگور کے گلے میں ڈال

ادر کہا کہ یہی اس کے مستحق ہیں ۔ محفل چونکہ شادی کی تھی اس
ۓ اس واقعے کے گواہ بکثرت تھے ۔ خود ٹیگور بھی یہ بار سہن کر بادشا
ہ گئے ۔ نوشاہ تو وہ ۲۲ سال کی عمر ہی میں بن گئے تھے ۔ اور
نھیں شریک حیات بھی ایسی ملی تھیں جنھوں نے انھیں گھر کے
ملات میں کبھی نہیں الجھایا اور ان کی شاعری کو کبھی اپنی سوتن
ہیں سمجھا ۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی اپنی کتاب «یادیں» میں بنکم چندر
جی کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی
ائی پر ان کے دانشور ہونے کی تحریر لکھی تھی وہ پورے مجمع
ں ممتاز تھے ۔ اور اپنی تمکنت اور اپنی چال ڈھال سے ایک شہزاد
ھائی دے رہے تھے ۔ رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کے پوچھنے پر بتایا گیا
ہ بنکم چندر ہیں ۔ گیتانجلی کے انگریزی ترجمے کے ۲۸ ایڈیشن تو ۱۹۱۶ء
ک شائع ہو چکے تھے اس کے بعد کا حساب کسی ادیب کو پیش کرنا چاہئے ۔
د. بی. ایٹس نے اپنے مقدمے میں ایک انگریز کا حوالہ دیا ہے جس نے
لدن کہا ہے کہا تھا کہ میں تو ٹیگور کو روزانہ پڑھتا ہوں ۔ اس شاعر کا ایک
ہ پڑھ لینا دنیا بھر کی کلفتوں کو بھول جانے کا نسخہ ہے ۔ اور اس
گریز کے بیان میں ہرگز ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے ۔ گیتانجلی کی کوئی
ظم اٹھائیے وہ آپ کو باندھ لے گی ۔ ایک نظم میں وہ کہتے ہیں جو بچہ
ہزادوں کا سا لباس پہنے ہو اور جس کے گلے میں ہیروں کی زنجیر ہو وہ
ی کھیل کا لطف نہیں اٹھا سکتا ۔ اس کا لباس اس کے ہر قدم کو آگے
ڑھنے سے روک دے گا صرف اس ڈر سے کہ اس کے لباس پر دھول نہ
ڑ جائے ۔ داغ دھبے نہ پڑ جائیں وہ زمین سے الگ رہتا ہے ۔ شاعر اسی
ظم میں بچے کی ماں کو مخاطب کرکے کہتا ہے ۔ اے ماں یہ شاہانہ لباس
چے کو دھول اور مٹی سے دور رکھتا ہے کسی کام کا نہیں ۔ اس
لقفت نے تو بچے کی عام انسانی زندگی کا دروازہ بند کر دیا (گیتانجلی
ظم ۸ صفحہ ۹)

ٹیگور نے بچپن میں جو سادہ زندگی گذاری اسی زندگی کا پرتو
ک چھوٹی سی نظم میں ہے ۔

ٹیگور ڈرامہ نگار بھی تھے «چترا» میں انھوں نے مہابھارت
ی زبان کو اپنے گیتوں کے ساتھ ڈرامے کا روپ دیا ہے ۔ وہ
داکاری بھی کرتے تھے اور والمیکی کے کردار میں تو بھی خوب جچتے
ہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ اپنی شکل و صورت ، وضع قطع ، لباس و
بش اور سر کے بڑے بڑے بالوں کی وجہ سے وہ عام آدمیوں سے
مختلف نظر آتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے اکسنٹرک (ECCENTRIC)
کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا ترجمہ عجیب الخلقت بھی ہو سکتا ہے اور
سنکی بھی ۔ کیا تعجب ہندوستان میں شاعروں نے اپنے سر کے بال
ٹیگور ہی کی ریس میں بڑھائے ہوں (اور یہ ایک رواج بن گیا اور آج
بھی اس کی جڑیں سوکھی نہیں ہیں) ۔

ٹیگور کی وہ نظم جو کسی برطانوی عہد میں ممنوع قرار دی جا چکی
تھی ۔ آج ہمارا قومی ترانہ ہے یعنی «جن گن من» ۔ ٹیگور نے اپنی عمر
کی ایک منزل میں عملی سیاست میں حصہ لیا ہے اور تقسیم بنگال کے
موقع پر جو احتجاجی جلوس نکالے گئے تھے ان میں وہ صرف شریک
نہیں بلکہ قائد تھے ۔ لیکن ان کی اصل دلچسپی کا میدان تعلیم کا میدان
تھا ۔ وہ بنگالیوں کے سر سید احمد تھے ۔ شانتی نکیتن انھیں کی یادگار
ہے اور ایک عظیم یادگار ۔ بول پور گاؤں کا یہ چھوٹا سا اسکول جو ۱۹۰۲ء
میں ایک گمنام غیر معروف اور ایک معمولی آشرم تھا ۔ آج ایک یونیورسٹی
«وشو بھارتی» کے نام سے ہندوستان کی بڑی دانش گاہوں میں
سے ایک دانش گاہ ہے ۔ جس نے بھی شانتی نکیتن کی کھلی فضا میں
سانس لی اس نے اپنے آپ کو خوش نصیب جانا اور ان لوگوں کی خوش
بختی کا کیا کہنا جنھوں نے اس درسگاہ میں اس زمانے میں درس حاصل
کیے جب گرودیو زندہ تھے ۔ گرودیو کا یہ لقب کہئے یا خطاب ، ٹیگور
کو کتنا زیب دیتا ہے یہ ان کے نام کا ایک جز بن گیا ہے ۔

ٹیگور نے دنیا بھر کا سفر کیا ۔ انگلستان ، امریکہ ، چین ، جاپان ،
روس ، جاوا اور سنگاپور اور پتہ نہیں کہاں کہاں کی سیر کی ۔ سفرنامہ
انھوں نے لکھا نہیں اب تو لوگ سفرنامہ لکھنے کی خاطر سفر کرتے ہیں ۔ ان
کی ہر جگہ پر آؤ بھگت ہوئی (آجکل ادیبوں شاعروں کے ساتھ جو
کچھ ہوا کرتا ہے اسے ہی بھگت کا نام دینا مناسب ہے) چین نے
تو انھیں ملک کے سب سے بڑے اعزاز کا مستحق سمجھا ۔ اور انھیں ان
کی ۶۳ ویں سالگرہ کے موقع پر چین کا ایک خطاب (جس میں دو چین
چیم موجود ہیں) ان کی خدمت میں پیش کیا ۔

ٹیگور کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ان کی بڑائی
اس وقت تسلیم کی گئی جب باہر سے یہ اطلاع ملی کہ وہ بہت بڑے شاعر
ہیں ۔ نوبل پرائز کے دیے جانے کے بعد یہاں آنکھیں کھلیں ۔ اس
بات کو صرف گمان کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا بلکہ کچھ حقیقت تو اس میں بھی

(باقی صفحہ ۸۶ پر)

حمید پٹھان (ایڈوکیٹ)

ٹیگور بحیثیت مصوّر

"ٹیگور کے دور کا ہندوستان" عدمِ استحکام کا دور کہا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ بہت سی تبدیلیاں اس دور میں رونما ہوئیں بلکہ جس سرعت کے ساتھ ہوئیں یہی وہ ایک اہم پہلو ہے۔ اس عمل میں بیدار ہندوستانی ذہن کا اہم کردار ہے وہ اس امر سے آگاہ تھے کہ مشرق کی فنی دولت بے پایاں کیا ہے اور مغرب کا سرمایہ مشرق کو کس نوعیت کی فنی جِلا بخش سکتا ہے۔ انھوں نے مغربی تکنیک کو اپنایا جو انگریزی تعلیم کی دین تھی۔

یہ دور تہذیبی و ذہنی ہلچل کا دور تھا جس میں متضاد قوتوں نے رول ادا کیا۔ ملک کا تہذیبی توازن بگڑنے لگا رہا تھا اور فنی کاوشیں کئی سمتوں کی طرف گامزن تھیں۔ احیا پرستی کا جذبہ جدید تقاضوں کی ہمنوائی سے قاصر تھا اور نہ ہی وہ جدید طریقۂ اظہار کے لئے سرمایہ فراہم کر سکتا تھا۔ ایک نئی لہر کی اشد ضرورت تھی جو ہندوستانی فنکار کو جدید فنی آگہی سے آراستہ کردے۔ ٹیگور نے اپنے دور میں جو کچھ کیا وہ اس وقت شاید پیچیدہ مسئلہ کا بہت سادہ حل معلوم ہو مگر بند کمرے میں دروازے کی دراڑ کی روشنی بھی تاریکی سے نبرد آزما ہوکر اندر کے حالات کا اندازہ لگانے میں مدد دیتی ہے۔ یہ سیدھا سادہ حل وقتی ضرور تھا مگر اس کی اہمیت سے کون انکار کرے گا کہ ان تمام کاوشوں کو جو "کاوشِ درشکمِ مادر" بھی کہی جا سکتی ہیں اہم رول ادا کرنے والی قوتیں ضرور تھیں جنھوں نے نئے آنے والے دور سے حال کا رشتہ استوار کر دیا اور فنی کاوشوں کو نئی جہت کا ماحول سازگار کیا۔

ٹیگور کا خاندان اپنے علم و عرفان کے سبب ان تمام حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ٹیگور کے خاندان نے ایک مصوری کے اسکول کی بھی بنیاد ڈالی "بچتر سبھا" جس میں نندلال بوس پر تعلیم دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس دور میں رابندر ناتھ ٹیگور نے نندلال بوس کو اپنے ہمراہ مدراس سے پیما کا سفر کرایا۔ نندلال بوس کو قدرتی مناظر نے بہت اس

ٹیگور کی بنائی تصویر

(جیومیٹرک)

اعظم کی صحبت نے گہرا اثر ڈالا جس کی جھلک نند لال کی تخلیق میں نمایاں ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور جب جاپان کے سفر پر روانہ ہوئے نند لال بوس بھی ان کے ساتھ تھے جہاں انھوں نے جاپانی مصوری کا مطالعہ کیا۔ ٹیگور خاندان کا یہ کارنامہ بھی فنی د اہمیت کا حامل ہے۔ بہاری کمرتی بھی نند لال بوس کی طرح اس وقت کے ماحول سے متاثر ہوئے۔

ٹیگور کسی نئے اسکول کی بنیاد ڈال کر نہیں گئے وہ رنگوں کے ذریعے زندگی کی سادہ حقائق اور ذہن و جذبات کی پردہ کا سنگم چاہتے تھے جہاں مصورانہ اظہار اور شاعرانہ جذبات کا آہنگ ایک نئی نہج اختیار کرے۔

ٹیگور کی مصورانہ کاوشوں نے نئے امکانات کی طرف نشان

§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§§ §§§§§§§§§§

دبی کی۔ فنکار اپنے [illegible] اور انفرادی عمل میں زیا بند رہتا تھا ٹیگور نے غیر ملوث رہ کر ذریعۂ اظہار کی تلاش فنکار کے لیے کیا معنی رکھتی ہے اس کا روپ دکھایا۔ ایک فنکار کو ذہنی و جذباتی عمل و ردِ عمل کو تخلیقی ڈھانچے میں ڈھالنا لازمی ہے اور اسی کشمکش کے دوران ذاتی اظہار اور آوازِ درونِ خانہ کو بھی نظر انداز نہ کرنا ٹیگور کی کاوشوں کا درس ہے۔

ہندوستانی مصوری کے دائرے میں دبستانِ بنگال کی تاریخی اہمیت ہے۔ اس صدی کے آغاز میں اس دبستان نے تہلکہ مچا دیا تھا پورے ملک میں اس کا اثر ایک نہ ایک روپ میں نمایاں تھا اس کی وجہ صرف بنگالی مصوروں کی فنی دسترس ہی کا دخل نہ تھا بلکہ احیاء پرستی اور وطن پرستی دونوں اجزاء شامل تھے۔ یہی وہ محور تھا جس نے مصوروں کو اپنے ہالے میں سمو لیا۔

یورپ میں مروجہ جمالیاتی نظریات و فنی تجربے جن کے لیے یہاں مصور ابھی ذہنی طور پر تیار نہ ہوا تھا اس نے یہ گردانا کہ فنی ورثہ کی احیاء ہی اس کا جواب ہے۔ مگر اس وقت تک یورپ کی جدیدیت ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں سرایت کر چکی تھی۔

احیاء پرست مصور انگریز HAVELL کی سرپرستی میں اپنے کام میں لگے رہے اور عہدِ رفتہ کی عظمت کو اپنے فن پاروں کی زینت بناتے رہے۔

اجنتا، مغل اور راجپوت فن پاروں کی نزاکت، لطافت و آہنگ مصوروں کی مشق و آزمائش کا سامان بنے مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس جذباتی دھارے میں بہنے کو تیار نہ تھا۔

وہ کوئی اس میدان میں واقع نظریہ کی پیروی تو نہ کر سکے مگر آنے والا کل فنی کاوشوں کو کیا موڑ دے گا اس کا انھیں احساس تھا یہ جذبات کی رو میں بہنے والے تو نہیں تھے۔ باشعور انسان تھے نئی سمتِ غیر سے چلنے والی ہوا سے اثر انداز ہوئے وہ بھی اس انداز سے کہ یہاں وہ کسی کو اجنبی بھی معلوم نہ ہوں نہ ہی سطحی جذباتیت کا شکار ہوئے۔

یہ تمام مسلم الثبوت اساتذہ جدید مصوری کو بھلے ہی کسی نگاہ سے دیکھیں یا کسی بھی قسم کی رائے رکھتے ہوں مگر جدیدیت کے مخالف نہ تھے۔

رکی بنائی ہوئی

کلر پینٹنگ (۱۹۳۴ء)

تالی اسکول کا ایک پہلو واقعی قابل توجہ اور اہم گردانا جائے گا بستان کے مصوروں نے گہری کھوج و تلاش میں اپنی زندگی ا اور وہ بھی اس کشمکش میں کہ ہندوستانی فن اور روایات م کریں، جدید تقاضوں کو پورا کریں۔

نگالی اسکول کے بندھے ٹکے خدوخال سے مصوری کی لہر چاہتی تھی۔ اسی دور میں رابندر ناتھ ٹیگور نے ۶۷ سال ں مصوری کا آغاز کیا اور ۸۱ سال کی عمر تک انھوں نے سے زیادہ تصاویر بنائیں۔

انھوں نے بنگالی اسکول سے تو کوئی براہ راست واسطہ مگر اپنے اندر کے شاعر کا وہ ساتھ نہ چھوڑ سکے۔ ان کی ی کو ان کے شاعرانہ احساس و آہنگ کا روپ ہی سمجھنا ۔ وہ رنگ و روپ کے بہاؤ اور آہنگ کو مرکزی حیثیت دیتے تھے وہ آہنگ جو مزاج و روح کی غمازی کرتا ہو۔ مزاج پیکر اور مواد میں پنہاں شاعری کا پُر لطف احساس اور آہنگ زندگی کی رمق اور بہاؤ میں مضمر ہے۔

ٹیگور اپنی تصاویر میں زندگی کے پنہاں پہلو کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ شاید کار ستوامی کی طرح وہ بھی جنگ کے متعلق جانتے تھے یا اظہاری تحریک کی اپج سے واقف تھے۔ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے:

> "میرے اندر ایک قوت حرکت کرتی ہے جو میری تسخیر صرف اپنے لیے کرنا چاہتی ہے۔ زندگی کی یہ دھڑکن جس کی میں بات کر رہا ہوں میری شخصیت کا جزو ہے جس کی حدود میری انا سے پرے ہے۔"

ایک بار جب یہ پنہاں خانوں میں پوشیدہ عنصر کا

حمید انور

ٹیگور — انسانیت کے علم بردار

رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان کے واحد ادیب ہیں جن کی ادبی تخلیقات نے نہ صرف بنگالی ادب کو متاثر کیا ہے بلکہ ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ وہ ہندوستانی ادب کے سب سے اہم معمار ہیں جنھوں نے ہندوستان کے نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔ وہ ایک عظیم دانشور، مفکر ادیب، شاعر اور آرٹسٹ تھے۔ غریب اور کچلے ہوئے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو انھوں نے پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو ادب میں سمویا ہے اپنے ملک کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعے سیدھے سادے طریقے سے اس طرح منظر عام پر لایا ہے کہ وہ ہماری زندگی کی حقیقی آئینہ دار بن گئی ہیں۔ ان کی اسی ادبی دیانت داری اور سادگی نے انھیں اپنے ملک سے باہر بھی ساری دنیا میں مقبول بنا دیا ہے۔

ٹیگور نے ادب کی ہر صنف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین اور شاعری [illegible] سب ہی اصناف پر اپنے قلم کے جوہر دکھلائے ہیں [...]ی سرمایہ انھوں نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے شاید ہی کسی زبان کے ادیب نے اتنا اہم سرمایہ ادب کو دیا ہے۔

دراصل ٹیگور کی ذہنی تربیت اور ان کے ادب کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کے گھریلو ماحول کا بہت بڑا دخل تھا۔ بچپن ہی سے وہ ادب اور شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ نو سال کی عمر میں انھوں نے اپنی پہلی نظم لکھی تھی۔

ٹیگور کا بچپن اکیلے پن میں گزرا وہ گھر سے باہر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ وہ دوسرے بچوں سے مل کر ان سے کھیل نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ ان کا دل چاہتا کہ اور بچوں کی طرح وہ آزاد کھلی فضا میں گھومیں پھریں۔

وہ اپنے گھر کے برآمدے ہی سے بچوں کو کھیلتا کودتا دیکھ سکتے تھے۔ یا پھر باغ ہی ان کی دلچسپی کا مرکز تھا باغ کی مہکتی ہوئی کھلی فضا، سرسبز و شاداب پیڑ پودے رنگ برنگے پھول اور پرندوں کی چہچہاہٹ، بس ان ہی نظاروں سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔

بچپن کی یہی یادیں اور کیفیات تھیں جس نے ٹیگور سے "ڈاک گھر" جیسا عظیم اور شاہکار ڈرامہ لکھوا دیا۔ ایک بچے کے جذبات اور اس کے دل کی تڑپ کو اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ننھا بچہ باہر کی دنیا میں عام بچوں کی طرح آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا ہے لیکن باہر نہیں جا سکتا اپنے گھر کے برآمدے سے ہی باہر کی دنیا کا نظارہ کر لیتا ہے۔

ٹیگور کا گھرانہ ادب، آرٹ، کلچر، شعر و نغمہ اور موسیقی کا مرکز تھا۔ گھر میں بھائیوں میں کوئی موسیقی اور ڈرامے کا رسیا تھا تو کوئی شاعری کا دلدادہ تو کوئی فلسفی، ایک بہن ناول نگار اور ایک بھائی کی بیوی شاعرہ تھیں۔ ٹیگور پر اس ماحول کا کافی اثر پڑا اور وہ اس سے متاثر ہوئے اور بچپن ہی سے لکھنا شروع کر دیا اور شعر کہنے لگے۔

ٹیگور کے دادا دوارکا ناتھ ٹیگور کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ بنگال کے بڑے دولت مندوں میں ان کا شمار ہوتا تھا وہ بڑی آن بان اور شہرت رکھتے تھے اور راجہ رام موہن رائے کے ساتھی تھے جس کی وجہ سے وہ بھی عوامی تحریکوں میں اکثر حصہ لیتے تھے۔

برخلاف اس کے ٹیگور کے والد دیوندرناتھ ٹیگور بڑے خدا ترس اور مذہبی آدمی تھے ان کا زیادہ تر جھکاؤ ایشور بھگتی اور روحانیت کی طرف تھا وہ برہمو سماج کے پرچارک تھے انھیں فلسفہ، ادب اور فنونِ لطیفہ سے بڑا لگاؤ تھا۔ شعر و نغمہ ان کی روحانی زندگی کا ایک جزو تھا۔ لوگ انھیں مہارشی کہتے تھے۔

ٹیگور کو اپنے دادا اور والد سے یہی باتیں ورثے میں ملی تھیں۔ اس طرح ان کی تعلیم و تربیت بھی روحانیت اور اپنشد کی تعلیمات ہی سے شروع ہوئی۔

پھر انھوں نے عیسیٰ، بدھ، محمدؐ، کبیر اور گرونانک کی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔

ٹیگور نے اپنی جوانی کے دس سال سیالدہ میں گذارے یہاں انھوں نے پہلی بار عوام کی غربت اور افلاس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کسانوں اور مزدوروں کی کچلی ہوئی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ان کا دکھ درد بانٹ لیا۔

یہاں رہ کر وہ نیچر سے قریب ہوتے گئے۔ سرسبز و شاداب وادیاں، نیلگوں آسمان، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں، طلوع و غروب کا منظر، شفق کی رنگینیاں، جھرنوں کے نغمے، ہواؤں کی سرسراہٹ وغیرہ سے وہ محظوظ ہوئے۔ فطرت کے اس حسن اور قدرت کے ان حسین نظاروں سے ٹیگور اتنے قریب ہو گئے اور متاثر ہوئے کہ ان کی شاعری میں فطرت کا سارا حسن ڈھل گیا۔

ہندوستانی تہذیب اور کلچر کے بنیادی عناصر BUDDHIST, PURANIC AND VEDIC ہیں ٹیگور نے ان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جب ہندوستان میں اسلام کا فروغ ہوا تو انھوں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور اسلام کے جمہوری نظام سے بہت متاثر ہوئے۔

وہ کہتے تھے روحانی اتحاد ہی ساری دنیا کے انسانوں کو بنیادی طور پر ایک رشتے میں باندھ سکتا ہے اور انسان اس طرح ترقی کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

انھوں نے ہمیشہ روحانی پاکیزگی کو ظاہری حسن پر ترجیح دی وہ مکر و فریب اور اوہام کے خلاف تھے۔

ٹیگور پر راجہ رام موہن رائے اور بنکم چندر چٹرجی کا کافی اثر تھا یہ دونوں نیشنلسٹ تھے۔ ہندوستان کی آزادی ان کا مقصد تھا لیکن ٹیگور ہیومنسٹ تھے۔ وہ گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے جو انسانیت کے عظیم علمبردار تھے وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو مانتے تھے۔ ہریجنوں پر مظالم اور چھوت چھات کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی شروع ہی سے وہ انڈین نیشنل موومنٹ میں حصہ لیتے رہے۔ انھوں نے

ے ابتدائی دونوں سیشن میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا
ں ۱۸۸۶ء ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۶ء میں منعقد ہوئے۔ وہ نیشنلزم
تھے۔

یت اور مرد کے یکساں حقوق کے وہ قائل تھے خاص
بیوہ کی دوبارہ شادی کے لئے پرچار کیا۔ انھوں نے
یٹے راتندر ناتھ کی شادی ایک بیوہ سے کی جب کہ اس
ں اس طرح کا قدم اٹھانا بڑی جرأت کا کام تھا
عورت کے برتاؤ میں امتیاز برتنا ان کے خیال میں مذاہب
انیت کے اصولوں کے خلاف تھا۔

رگی بھر انھوں نے انسانیت کا پرچار کیا نہ صرف اپنی
وں کے ذریعے بلکہ اپنی تقریروں کے ذریعہ بھی۔

ھوں نے ہندوستان کے مختلف کلچرز کا مطالعہ کیا تھا
ہر جو ہندوستان کا تہذیبی ورثہ ہے وہ کہتے ہیں اس
پر سب ہندو مسلم، کرسچین ایک ساتھ مل کر رہ سکتے ہیں۔
دوستان پر کسی ایک مذہب یا نسل کے لوگوں کا حق
ہاں مختلف قومیں اپنی اپنی تہذیبیں لے کر آئیں، اور
ستان کی تہذیب کا جزو بن گئیں۔

انسان کا تصور ان کے پاس آفاقی ہے وہ عالمی برادری
ے تھے۔ وہ کہتے ہیں "ساری دنیا میرا گھر ہے" وہ اپنے

A CITIZEN OF THE WORLD, A UNIVERSAL MAN. -

ں
انھوں نے اپنے تقریباً دو ہزار دو سو گیتوں اور نظموں
یعے ان لوگوں کی آرزوئیں اور نا امیدیوں کی عکاسی کی
ٹیگور کے یہ لافانی گیت ملک کی سرحدوں کو پار کر کے
ں ملک میں بھی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ٹیگور دنیا کے واحد شاعر ہیں جن کے دو گیت دو ملکوں
ہندوستان اور بنگلہ دیش میں قومی ترانے کی حیثیت سے
جاتے ہیں یہ دو گیت ہیں "جن گن من" اور "امار سونار
بنگ آمی تومائے بھالو بھاشی"۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے متوالے نوجوانوں نے بھی ٹیگور
ں کو اپنا آدرش جانا ہے اس طرح ٹیگور کا گیت دو دیشوں
میں قومی ترانے کی حیثیت سے گایا جاتا ہے یہ فخر از آج
ی شاعر کو نہیں ملا ہے۔

۱۹۰۱ء میں ٹیگور کے والد مہارشی نے شانتی نکیتن میں
عبادت کے لئے ایک آشرم اور مندر بنوایا تھا لیکن یہاں کوئی
مورتی وغیرہ ایسی چیز نہیں تھی جس کی پوجا کی جاتی۔ ان کے عقائد
میں مورتی پوجا نہیں تھی وہ ایک خدا کو مانتے تھے اور ہر مذہب
کے سچے اصولوں کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عبادت کا مقصد
ان کے نزدیک نفس کی پاکیزگی تھا۔ آشرم کے دروازے ہر کسی
کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ جو ایک خدا کو مانتا تھا۔

سیالدہ میں کئی سال کام کرنے کے بعد ٹیگور شانتی نکیتن
آ گئے۔ والد کے مشورے سے ٹیگور نے یہاں ایک اسکول قائم کیا
اس اسکول کا بڑا صاف ستھرا ماحول تھا جہاں سارے طالب علم مل
جل کر رہتے تھے ان میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا چاہے وہ کسی
بھی مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتے ہوں سب کا رہن سہن، کھانا
پینا ایک ساتھا۔ طالب علم اپنا کام خود کرتے تھے۔ صبح عبادت سے
شروع ہوتی پھر ناشتے وغیرہ کے بعد تعلیم شروع ہوتی جو درختوں
کے سائے میں کھلی فضا میں ہوتی۔

پڑھائی کے ساتھ کھیل کود اور تفریح کا سامان بھی ہوتا۔ اور
سنگیت اور اداکاری کی تعلیم بھی ہوتی۔

شانتی نکیتن میں اسکول کے قیام کے دوسرے سال ہی ان کی
بیوی کا انتقال ہو گیا۔

پھر دو دو سال کے وقفے سے ایک کے بعد ایک حادثہ رو
نما ہوا پہلے ان کی لڑکی پھر والد اس کے بعد چھوٹے لڑکے نے
انھیں داغ مفارقت دیدیا۔

ٹیگور ایک سخت ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا ہو گئے۔
ان کی شاعری میں ان کے دل کا سارا درد سمٹ آیا۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنا مشہور ناول "گورا" لکھا
جس میں ہندوستان کی زندگی کا نیا فلسفہ پیش کیا گیا ہے یعنی
انسانیت پرستی، اعتدال پسندی اور غیر فرقہ واری بنیادوں
پر ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی ہے۔ ٹیگور کا یہ پیغام ہمارے
عہد کے لئے ایک RELEVANCE کی حیثیت رکھتا ہے

پھر "گیتانجلی" شائع ہوئی۔

ٹیگور نے اپنے لکھے ہوئے گیتوں میں سے ایک سو تین نظمیں
منتخب کر کے ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور "گیتانجلی" کے نام
سے ۱۹۱۰ء میں لندن سے شائع کیا۔

وہ کہتے ہیں "گیتانجلی" میں جو گیت ہیں دراصل یہ میری

روح کی آوازیں۔ ان میں میری زندگی کے وہ سارے دکھ سکھ ہیں جو الفاظ کا روپ دھار چکے ہیں۔

"گیتان جلی" دراصل دو لفظوں سے بنا ہے۔ گیت (نغمہ) اور انجلی (نذر، بھینٹ) شاعر نے اپنے معبود کے آگے محبت اور عقیدت کے پھول بچھا دیئے ہیں اپنے روحانی جذبے کو بڑی خوبصورتی اور لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے اس میں زندگی اور موت کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ موت زندگی ہی کی ایک شکل ہے۔

ان روحانی گیتوں کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ زندگی بیش بہا چیز ہے۔ محبت اور خوشی اس کا مرکز ہے۔ زندگی کی قدر کرنی چاہیئے۔

بیس سال کی لگاتار محنت اور کوشش کے بعد ٹیگور شانتی نکیتن میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے جس کا نام انھوں نے "وشوا بھارتی" رکھا۔ یہاں وہ ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں طلبار کے جمالیاتی اور وجدانی احساسات کی تربیت ہو۔ ان کا مقصد وشوا بھارتی کے ذریعے مختلف اقوام میں ذہنی اتحاد، باہمی یگانگت، عالمگیر اخوت و محبت پیدا کرنا تھا۔ اپنے اس نصب العین کے پرچار کے لئے ٹیگور نے دو تین سال ساری دنیا کا سفر کیا۔

وشوا بھارتی میں اس وقت زبان و ادب، فلسفہ، تاریخ، موسیقی، رقص، پینٹنگ اور مجسمہ سازی کی تعلیم ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ ٹیگور کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ وہ عوام کے قریب آتے گئے۔ کبھی بھی انھوں نے اپنے آپ کو عوام سے الگ نہیں سمجھا۔

وہ کہتے ہیں۔

"شاعر نیچر کا پرستار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی گود میں پلنے والے عوام کی خوشی اور خوشحالی کا آرزومند بھی ہوتا ہے۔ اس دھرتی کی گود میں پرورش پانے والے کو وہ کمتر نہیں سمجھتا۔ وہ اس خشک مٹی کو اپنی "زندگی کے رس" سے سرسبز و شاداب بنا سکتا ہے۔

انسان کی زندگی کا مقصد نیکی اور سچائی ہے اور نیکی اور سچائی کو دنیا میں پھیلانا ہے۔

ٹیگور روحانیت اور مادیت کو علٰحدہ علٰحدہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کو زندگی کا لازمی جز سمجھتے تھے وہ زندگی سے فرار کو پسند نہیں کرتے تھے حرکت اور عمل ہی زندگی ہے" عبادت کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دنیا کو ترک کر دے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ بلکہ انسانوں کے درمیان رہ کر ان کے دکھ سکھ کا ساتھی بنے۔ ان کی بھلائی کے لئے کام کرے خاندان، نسل اور مذہب کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے انسانوں کا پیار ہمدردی اور خوشیاں بانٹ لے۔ یہی زندگی کی سچائی ہے۔"

جو لوگ گیان دھیان میں اس مادی دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں ٹیگور ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

"یہ رام نام جپنا اور تسبیح پھیرنا چھوڑ
دروازہ بند کئے مندر کے سنسان اور تاریک
گوشے میں تو کس کی پرستش کر رہا ہے
آنکھیں کھول اور دیکھ تیرا خدا تیرے سامنے
موجود ہے۔

خدا وہاں ہے جہاں کسان سنگلاخ زمین میں ہل
چلا رہا ہے جہاں سڑک بنانے کے لئے مزدور پتھر توڑ رہا ہے
وہ دھوپ میں اور بارش میں تیرے ساتھ ہے اور
اس کے کپڑے گرد آلود ہیں۔
مکاری کا لباس اتار پھینک
اور اپنے معبود کی طرح
اس دھرتی پر چلا آ"

خدا کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے آنکھیں بند کئے گیان دھیان میں بیٹھنے کے بجائے آنکھیں کھول کے دیکھنا اور اس کی بنائی ہوئی دنیا کو اپنے عمل سے سنوارنا بھی عبادت ہے۔

ٹیگور کا کہنا تھا ضمیر کی آزادی، خود اعتمادی، ایثار اور نفس کی پاکیزگی کے ذریعے ساری رکاوٹوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔

ٹیگور نے اپنی عمر کے آخری حصے میں پینٹنگ کی طرف توجہ دی تین ہزار پینٹنگس انھوں نے بنائیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش ساری دنیا میں ہوئی۔

ان تصویروں کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اپنی نظموں اور گیتوں کو کلر میں سمو دیا تھا۔

ٹیگور بہت بڑے جینیس تھے جنھوں نے ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کے میدان میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

پروفیسر م۔خ۔ شاذلی
کیلاش نگر۔ ناندیڑ۔ (مہاراشٹر)

ٹیگور اور گیتانجلی

ٹیگور کی نہایت عجیب ہمہ جہتی شخصیت کے تعلق سے متعدد یوروپین مصنفین نے توضیحات کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ احاطہ کرنے میں ناکام رہے۔ بھارت کے مصنفین نے اکثر مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ٹیگور پہ زیادہ تر ان کے ہمعصروں ہی نے لکھا ہے۔ سب سے بہتر اور موزوں تبصرہ جان رسکن کا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ " متفرق موضوعات جیسے شادی، تقاریر، مکتوبات، ڈرامہ، روحانیت، تصویرکشی وغیرہ پہ تقریباً اسی (۸۰) کتب کا مصنف سند کے بجائے ایک محرک، ایک ضرورت اور کمالِ فن کے بجائے ایک تاثر بن کر رہ گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ ٹیگور کے قارئین، ٹیگور سے متفق ہونے کے بجائے مسرور ہوئے۔ ان ہی سے تحریک ملی۔ وہ ماہرِ اخلاقیات، بلندخیال ضرور تھے۔ لیکن فلسفی یا سائنس کے آدمی نہ تھے۔ لیکن بے پناہ ادبی قوت، کائنات اور فنِ لطیف کے گہرے مطالعہ کے ساتھ سلگتے ہوئے جذبات نے ٹیگور کی تمام باتوں کو اخلاقی اور سماجی روشنی عطا کردی۔ جس کی وجہ سے وہ انیسویں صدی کی ایک متاثرکن شخصیت بن چکے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ لاتعداد کتب کا مصنف ہونے کے باوجود ٹیگور نے کبھی فلسفیانہ موشگافیاں اور مغربی ادب اور ثقافت کا صدق دل سے مداح ہونے کے باوجود سائنس اور

ٹکنولوجی کی باتیں نہیں کیں۔ لیکن ٹیگور ہی کی شخصیت کے تعلق سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان ٹیگور کی وجہ سے اس قدر قریبی طور پہ متعلق رہے ہیں کہ گو سیاسی تعلق

ختم بھی ہو جاتے ہیں لیکن دونوں ممالک کا ادب اس قدر
قریب اور منسلک رہا ہے کہ کسی بھی یورپی اور ایشیائی ادب
میں اتنی قربت نہیں دکھائی دیتی۔

ٹیگور کی زندگی ابتدا ہی سے کچھ اس طرح نظریاتی
اور عملی طور پر تبدیلیوں کی آماجگاہ بنی رہی کہ وہ ایک زمانہ تک
کسی مستقل فلسفہ یا نظریہ پر مستحکم نہ ہو سکے۔ دادا دوارکا ناتھ
ٹیگور ایک وسیع جاگیر کے مالک بڑے فراخ دست رہے۔ رابندر
ناتھ ٹیگور تک جاگیر کا بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ والد، بڑے
اللہ والے، صوفی منش انسان تھے۔ روحانیت کے دلدادہ،
آخر سنیاس کی طرف متوجہ ہو گئے، اور عوام میں "مہارشی" کہلائے
اکثر مہینوں ہمالیہ کی وادیوں میں صحرا نوردی کرتے رہتے تھے —
سات بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے ٹیگور، ماں کے
انتقال کے بعد صرف نوکروں کی نگرانی میں چلتے رہے۔ کلکتہ منتقل
ہونے کے بعد یہاں جے دیو کی "گیت گوبند" اور بنگالی داس
میگھ دوت سننے کو ملیں۔ پہلی بار ٹیگور اپنی ابتدائی عمر میں
کی شاعری سے متاثر ہوئے۔ بنگال میں گنگا ندی کے اطراف
میدانی علاقہ بنگال کی قدیم تاریخ کا مرکز رہا ہے۔ جہا
زمانہ میں سین حکمرانوں کی حکومت تھی۔ قدرتی مناظر چا
طرف انسان کو متاثر کرتے ہیں۔ ٹیگور کا ابتدائی ذہن اس
میں قدرت اور کائنات سے متاثر ہوا اور قدرت
محبت بھی سیکھی۔

اس دور میں بنگال میں ویشنوی گیت چار دا
مشہور تھے۔ ٹیگور بھی ان گیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
گیتوں کی لہراتی ہوئی لے اور ایچ میں ٹیگور کے لیے بڑ
تھی۔ جذبات کے اسی طوفانی دور ہی میں ٹیگور نے قلم ہا
لیا۔ جو ۵ اگست ۱۹۴۱ء تک یعنی زندگی کے آخری

گیتانجلی کا روسی ترجمہ

گیتانجلی کا جرمن زبان میں

قومی راج

تک چلتا رہا۔ انتقال سے ایک دن پہلے وہ قلم نہیں پکڑ سکتے تھے۔ بہرحال اسی کم عمری میں قلم کی پختگی نے سب کو حیران کر دیا۔ ابتدا میں ٹیگور سنسکرت کے قدیم شاعر بھانو سنگھ کی طرز پہ لکھتے رہے۔ ۱۸۷۷ء میں ٹیگور نے " شاعر کی کہانی " کے عنوان سے مختصر سوانح حیات لکھ ڈالی۔ جو رسالہ " بھارتی " میں شائع ہوئی۔ سوانح ۱۱۸۵ سطور پر مشتمل تھی۔ اس دور میں انگریزی تہذیب و تمدن کے اثرات بھارت میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ عام ہندوستانی بھی اب جنگ و جدل کے بجائے سمجھوتے (Compromise) کے نقطۂ نظر سے سوچ رہا تھا۔ مغرب اور مشرق کے امتزاج پر ۱۸۷۸ء میں " بھارتی " میں ٹیگور کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں ٹیگور کے مشن کے ابتدائی خطوط ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ابھی یہ شاعر ۱۸ سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے سات ہزار سطور شائع ہو چکی تھیں۔ اسی سال ٹیگور انگلینڈ گئے۔ وہاں (BRIGHTON) اسکول میں انہوں نے انگریزی ادب پہ لیکچر سنے۔ شکسپیئر کے بھی کئی ڈرامے پڑھے۔ خطوط کی شکل میں ان کا یہ سفر نامہ " بھارتی " میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے مغرب کی سماجی اخلاقیات کو مشرقی اخلاق سے بہتر قرار دیا۔ جینیس آف والمیکی (Genius of Valmiki) ڈرامہ میں ان ہی نظریات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

اب ٹیگور کے خیالات میں خاموشی، روح، دل، گیت، تنہائی، گہرائی، آسماں کی وسعت، آنسو، آہیں، تارے، دلہن، سنگار، محبت، اور موت جیسے موضوعات جنم لینے لگے۔ اسی طرح اگر ہم ٹیگور کو جدید بنگالی شاعری کا بانی کہتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ نغماتِ صبح، اور نغماتِ شام کے تعلق سے ٹیگور خود کہتے ہیں کہ یہ دور میری شاعری کے لئے سب سے زیادہ یادگار دور ہے۔ جس میں اس دنیا اور اس سے متعلق رہنے کا ایک پُر مسرت تجربہ ہے۔ اسی دور میں ٹیگور نے ناول کا بھی آغاز کیا۔ اسی طرح ڈرامہ کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور خود بھی ایک کامیاب ایکٹر کی طرح کردار ادا کیا۔ ڈرامہ کے ذریعہ ٹیگور نے اپنے خیالات اور نظریات کو عام کرنے کے لئے کافی کامیابی حاصل کی۔ اس کے لئے انہوں نے ڈرامہ کو بہترین ذریعہ بھی قرار دیا۔

۱۸۸۴ء میں ٹیگور کی شادی ہوئی۔ اسی دوران انہوں نے بچوں کے لئے ایک رسالہ " بالک " شروع کیا۔ اسی عرصہ میں ان کے تعلقات بنکم چندر چٹرجی (وندے ماترم کے خالق) سے زیادہ وسیع ہو گئے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے کاکلیں بڑھائیں اور ڈاڑھی بھی چھوڑ دی۔ انگریزی دور میں یہ فیشن بڑا متاثر کن تھا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء کا زمانہ انہوں نے غازی پور اور سیالدہ میں گزارا۔ غازی پور میں گلاب کے پھول مشہور تھے اس وقت ان کی نظموں کا مجموعہ " مانسی " شائع ہوا۔ ان نظموں میں ان کی ادراکی قوت عروج پہ پہنچ گئی تھی۔ ان میں اور بعد کی چند نظموں میں ٹیگور نے زیادہ سے زیادہ سمندری طوفانوں کی منظر کشی کی ہے۔ جو اس دور کی زندگی کے انتشار کی ترجمانی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کا سماجی مطالعہ بھی وسیع ہوتا گیا، اور بعض نظمیں انہوں نے سماجی موضوعات پہ بھی لکھیں خاص طور پر ہندو تہذیب کی قدیم نقصان دہ روایات پہ سخت تنقید کی۔ جس سے بعض لوگوں نے اختلاف بھی کیا۔ یہ برہمو سماج کے اثرات تھے۔ جو ان کے اکثر ڈراموں اور ناولوں میں نمایاں ہیں۔ بنکم چندر چٹرجی جیسے ہندو تہذیب کے دلدادہ لوگوں نے ٹیگور کو مغرب زدہ قرار دیا۔ اسی دوران ٹیگور نے " دھرم پرچار " کے نام سے نظم لکھی۔ جو سنیاسی تحریک پہ سخت تنقید تھی۔ جس کو بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول " آنند مٹھ " میں بڑی اہمیت دی ہے، اور اسی سنیاسی تحریک کے کارکنوں سے انہوں نے وندے ماترم کا گانا گوایا ہے۔

اس کے بعد کے دور میں ٹیگور ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوئے ان کا پہلا سماجی طربیہ ڈرامہ ۱۸۹۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ویسے انہوں نے ڈرامہ کا سلسلہ المیہ کہانیوں سے ہی شروع کیا تھا۔ پہلا ڈرامہ " کنگ اینڈ کوئن " تھا۔ یہاں بھی ہندو سماج میں شادی کے مسئلہ کو اٹھایا۔

وہ سیالدہ آ گئے جہاں ان کی آبائی جائیداد ابھی قدرے باقی تھی۔ جس کے انتظامات کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ ۱۸۹۰ء میں وہ انگلینڈ بھی ہو آئے۔ بنکم چندر چٹرجی کرشن بھگتی کا پرچار کر رہے تھے۔ جس سے ٹیگور کو اختلاف تھا۔ شکتی دیوی

رابندر ناتھ ٹیگور اپنے ہمعصروں کے ساتھ۔ اشوتوش چودھری، راماندچٹو پادھیائے
درمیان میں خود رابندر ناتھ ٹیگور، ترلوک ناتھ سانیال اور شلیندر مجومدار۔

کی پوجا عام ہوئی۔ جس کو بعض لوگ "کالی پوجا" یا "قومی پوجا" کا روپ دینا چاہتے تھے۔ جس کے خلاف ٹیگور نے اپنے جریدے "سادھنا" (۱۸۹۱ء) میں خوب لکھا۔ یہاں تک کہ وہ شاعر کے ساتھ ایک بہترین صحافی بھی ثابت ہوئے۔ اسی جریدہ کے توسط سے ٹیگور نے مختصر کہانیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ جو چار سال جاری رہا۔ اسی عرصہ میں ٹیگور نے سائنس کا بھی مطالعہ کیا۔ جس کی وجہ سے کائنات اور قدرت سے بے پناہ لگاؤ کی شناخت ان کے لئے ایک حقیقت بن گئی۔ اس جھلک شاعری میں بھی انگریزی کے مشہور نیچر پوئٹ (NATURE POET) ورڈس ورتھ کی جھلک نمایاں ہے۔ یعنی قدرت ایک مکمل مسرت ہے۔ خاص طور پر قدرتی مناظر جیسے "تیرا اودا آسمان"، "تیری روشنی"، "یہ تیری بھری پری دنیا"، وغیرہ کے احساس کی شدت نے ٹیگور کی شاعری کو نیا موڑ دیا۔ لیکن یہاں وہ دیومالائی داستانوں سے اپنا دامن بچا گئے۔ "سادھنا" کا دور دراصل ڈرامہ کا دور تھا۔ ۱۸۹۳ء میں آخری ڈرامہ "مالینی" لکھا۔ ان تمام ڈراموں کا تعلق موسمی تبدیلیوں سے بڑے لطیف انداز میں قائم کرتے ہیں۔ جس میں انسان ڈرامہ کے ذریعہ قدرت کے قلب تک پہنچتا ہے۔ اسی دور میں ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی وسیع ہوا۔ ٹیگور کو یہ بھی احساس ہوا کہ بنگلہ زبان کے مقابلہ میں انگریزی زبان میں ایکشن کی زیادہ تیزی ہے۔ اسی وجہ سے ٹیگور کی قافیہ بند آزاد شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ جو بنگلہ شاعری میں

نیا تجربہ تھا۔ ہیئت کے اس تجربہ کے علاوہ انگریزی کی نیچر پوئٹری (NATURE POETRY) کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ٹیگور انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر قدرت سے لگاؤ کا تصور پیش کرنے لگے۔ بلکہ ٹیگور خود بھی قدرت اور کائنات سے قلبی طور پر لگاؤ رکھتے تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ انگلینڈ کے ورڈس ورتھ کے گروپ کی شاعری (LAKE POETS) سے مماثلت ہو جاتی ہے۔ یہاں اکثر نظموں میں ہندوستان کی قدیم سنسکرتی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ چند نظمیں حب الوطنی پر بھی مبنی ہیں۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں قومی تحریک نے بھی کافی زور پکڑ لیا تھا۔ اس دور کی نظموں میں نغمگی کے ساتھ ساتھ سادہ زندگی کے رنج و الم اور مذہبی تجربات کے صوفیانہ اتحاد نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

انیسویں صدی دراصل تمام دنیا میں بڑی بے چینیوں کی صدی رہی ہے اور اس انتشاری دور میں تقریباً تمام ممالک میں شعراء ہی تمام عالم کے لئے غیر مسلمہ قانون ساز بنے رہے۔ اس عرصہ میں ٹیگور نیشنلسٹ تو نہ بنے لیکن بعد کے بیس سال میں انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ انسان کو اپنی قسمت بنانے کے لئے آزادی ضروری ہے۔ وہ ملک کی تعمیری ترقی چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ دیہات سدھار صفائی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیا۔ انگریز البتہ ٹیگور کے تعلق سے ہمیشہ یہی سوچتے رہے آیا وہ سرکار برطانیہ کا وفادار ہے یا نہیں۔ اس انتشاری دور میں ٹیگور کی شاعری بھی قدرے سست پڑ گئی تھی۔

بنگال کا سال اپریل میں ختم ہوتا ہے۔ جب وہاں بڑا طوفانی موسم ہوتا ہے۔ اس طرح ان دنوں تمام ہندوستان کا موسم سیاسی طوفانوں سے متاثر تھا۔ جس کا اثر ٹیگور کی شاعری پر پڑے بغیر نہ رہا۔ جیسا کہ کلپنا وغیرہ نظمیں اسی صورت حال کو اجاگر کرتی ہیں۔ نہ صرف شاعری بلکہ کہانیاں اور ڈرامے بھی متاثر ہوئے۔ سیاست اور مذہب کی تصادمی کیفیت کا عکس نظم "نرک باس" میں ملتا ہے۔ جس میں دانتے کی دوزخ دکھتی ہے۔

یہاں سے ٹیگور کی شاعری کے لئے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس دور کی مشہور نظمیں کنیکا، کتھا، کاہنی، شنیکا، وغیرہ مجموعوں میں شامل ہیں۔ خاص طور پر شنیکا (لمحات) انہیں بے حد پسند تھی۔ کیونکہ ان میں ایک نیا پن، نقطۂ نظر کی تازگی اور جذبات کی آزادی ملتی ہے۔ اجیت چکرورتی نے اس تعلق سے اچھی رائے دی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ذخیرہ شاعر کے اپنے غم کا مذاق ہے۔ یہاں شاعر دو خداؤں کی عبادت کرتا ہے۔ ایک حسن اور دوسرا خدا، دراصل یہ وہ دور ہے۔ جہاں لکھی گئی نظمیں ٹیگور کی گیتانجلی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ٹیگور "شانتی نکیتن" میں مقیم ہو گئے، اور اب ان کی توجہ اسکول، طلباء اور تعلیم کی طرف تھی اور انہوں نے بچوں کے لئے حمدیہ ترانے لکھنے شروع کئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں "نیویدیا" کا مجموعہ شائع ہوا۔ جس نے بے حد شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب دراصل ٹیگور کے ابتدائی سیکولر خیالات اور بعد کے مذہبی جذبات کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اجیت چکرورتی کے خیال میں دراصل ٹیگور کی حب الوطنی اسی "نے ویدیا" سے شروع ہوتی ہے۔ تاہم چند نظموں میں انہوں نے مورتی پوجا پر سخت تنقید کر ڈالی۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

"وہ جو تیرے ٹکڑے کرتے ہیں —
تجھے تقسیم کرتے ہیں — اپنے مدہوش قلب
کے ساتھ زمین پر لوٹتے ہیں"

اسی دوران انہیں احساس ہوا کہ اپنے ملک کے لوگوں کے لئے مذہبی آئیڈیل سامنے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ انسان کی روح اور خدا کے لئے قدیم ترین استعارے استعمال کرتے ہیں۔ یعنی دریا اور سمندر وغیرہ۔ انسانی تکالیف اور پریشانیوں میں بھی وہ جذبات کی پاکیزگی، آزادی کے لئے مردانہ جرأت و ہمت کی دعا کرتے ہیں۔ شانتی نکیتن نے اب ٹیگور کے لئے ایک نیا ماحول، نئے احساسات اور جذبات کی دنیا فراہم کر دی تھی۔ جس نے ٹیگور کو نیا دیا۔ — یا ٹیگور نے اس نئے ماحول کو جنم دیا — ا[illegible]

(سوال کا جواب ہی دراصل "گیتانجلی" ہے۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

"میں نے خود سے کہا کہ ہمیں اپنا ورثہ تلاش کرنا چاہیئے۔ جس کے بدلے دنیا میں ہم اپنا صحیح مقام خرید سکیں۔"

(شانتی نکیتن۔ پیرسن کا دیباچہ)

دراصل یہیں سے ٹیگور کے پاس اب ہر چیز کے پس منظر میں مذہب تھا۔ لیکن یہ مذہب کیا تھا....؟ گاندھی جی کا فونکس کا آشرم یاد آتا ہے۔ وہاں گاندھی جی نے مختلف مذاہب کے بچوں اور نوجوانوں کو داخل کر لیا تھا اور ہر ایک کو اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کی تاکید کی تھی۔ شانتی نکیتن کا مذہب (سیکولرزم) کچھ الگ تھا۔ یہاں کسی طرح کے بھی ہندو تہوار نہیں منائے جاتے تھے۔ صرف حضرت عیسیٰ، گوتم بدھ، حضرت محمدؐ، چیتنیہ، رام موہن رائے اور مہارشی (ٹیگور کے والد) کے جنم دن منائے جاتے تھے۔ ٹیگور اکثر شانتی نکیتن سے باہر رہتے تھے لیکن ان کے شاگرد نندلال بسو، اشیت ہلدار، سی۔ ایف۔ اینڈریوز، ولی پیرسن وغیرہ ہمیشہ موجود رہتے تھے، اور درس و تدریس کے سلسلے جاری رہتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد لیونارڈ ایلمسٹ اور اس کی بیوی بھی آ گئے۔ سیلون لیوی جیسے اسکالر بھی آئے اور قدرتی طور پر ٹیگور کے اندر شاعری جاگ اٹھی۔ جب انہوں نے خود کو معطر پھولوں، بیلوں، صبح صادق، چاندنی راتوں، پرخلوص احباب اور پاکیزہ صفت معصوم طلباء میں گھرے ہوئے پایا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں ان کی بیوی اور سنہ ۱۹۰۵ء میں ان کی لڑکی کا انتقال ہوا۔ وہ الموڑہ چلے گئے۔ پھر ان کا بیٹا بھی فوت ہو گیا۔ ان حالات نے ٹیگور کو تنہائی پسند بنا دیا۔ ان پے در پے صدموں، قومی اصلاحی کام، شانتی نکیتن کی مصروفیات نے ان کی شاعری میں بھی غم گھول دیا۔ چنانچہ اس دور کی نظمیں زیادہ تر چھوٹی نظمیں یا دل کو چھو لینے والے گیت ہیں۔ مجموعہ "سمرن" (یادیں) (۱۹۰۲ء) میں ہیں۔ جن کو (SONNET) کہا جا سکتا ہے۔ جو شاعر کے قلب و ذہن کو لیلہ رات کے بجائے منور کر دیتی ہیں۔ یہ نہ صرف شاعر بلکہ عام رنجیدہ اور غمزدہ قلب کو روشنی بخشتی ہیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ تمام وجد اور شہرت و عزت بغیر محبت اور صحبت کے کس قدر کھوکھلی ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۷ء تک ٹیگور نے اکثر ناول بھی لکھے۔ اسی دور کے آخر میں "گورا" جیسا بے مثال ناول منظر عام پر آیا۔ تھامسن کہتا ہے کہ اب درا ان کے سامنے کرشن اور رادھا نہیں تھے۔ بلکہ بکھرے بال والا ایک خوفناک خدا تھا۔ جو ان سے محبت کرتا تھا۔ ایک خوفناک محبت۔ یہیں سے انہیں بچوں کی نفسیات کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ جس کی بناء پر وہ ہندوستان کے چارلس ڈکنس کہلاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۱ء دراصل صحیح معنوں میں ٹیگور کی جد و جہد کا دور ہے۔ اس دور کے حالات نے ٹیگور کو تیز و تند عملی جد و جہد کی طرف موڑ دیا تھا۔ تقسیم بنگال، بنگالیوں کا اس کا ردعمل، انتہا پسند اور اعتدال پسند کی تحریکات، قومی شعور کی بیداری، سودیشی تحریک وغیرہ نے ٹیگور کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ایک شعلہ فگن انقلابی کی طرح انہوں نے سنہ ۱۹۱۸ء کے خطاب میں سرزمین بنگال کو لرزا دیا اور وہ خود بھی سودیشی تحریک میں کود پڑے۔ پھر بھی وہ کانگریس سے پوری طرح متفق نہ تھے۔ صرف کانگریس کے ایک سیشن میں وہ شریک رہے۔ انہوں نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کی ابتدا کی۔ اسی کے تحت تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا جو بنگالی ادب کا انوکھا حصہ بن گئیں۔ حکومت کی نظر میں مشتبہ افراد کی فہرست میں تھے لیکن یکایک ان کی سب جد و جہد بجھ سی گئی۔ وہ کانگریس کے جذباتی نعروں، کھوکھلے منصوبوں سے جلد ہی بیزار ہو گئے۔ ٹیگور بعد ازاں انقلاب کے بنیادی نکات پر زور دینے لگے لیکن کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ اور ٹیگور تمام سیاسی سرگرمیوں سے مستعفی ہو کر شانتی نکیتن چلے آئے۔ بالکل اسی طرح

گرمی راج

کے مشہور شاعر ملٹن نے مختصر عرصہ کے لیے سیاسی تحریکات میں کام کیا لیکن جلد ہی بیزار ہو کر علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی یکسوئی کے دور میں اس کی عظیم تصنیف "پیراڈائز لاسٹ" (PARADISE LOST) کی تخلیق ہوئی۔ تمام سیاسی تعلقات ختم ہو جانے کے بعد بھی ٹیگور ہندوستان کی قایم سنسکرتی اور سماجی زندگی کی اصلاح پہ زور دیتے رہے۔ دراصل اب شاعر کی بڑھتی ہوئی روحانی زندگی کے لیے شانتی نکیتن ہی ایک بہتر جگہ باقی تھی۔ سماجی اصلاح کا پہلا قدم یہ اٹھایا کہ برہمن سماج کی گدی جسے "ویدی" کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ ایک مخصوص فرقہ میں چلی آرہی تھی۔ ٹیگور نے اعلان کیا کہ کسی بھی ذات کا شخص گدی کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ یہاں سے ٹیگور کا ایک نیا تخلیقی دور شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۶ء تک، شانتی نکیتن کے نام سے انہوں نے اپنے مذہبی خطبات کی سترہ (۱۷) جلدیں شائع کیں۔ ۱۹۱۲ء میں "جیون سمرتی" شائع ہوئی۔ جس کو بہت پسند کیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں ناول "راجہ" شائع ہوا۔ جو ۱۹۲۲ء میں جرمنی اور فرانس میں اسٹیج کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں "ڈاک گھر" شائع ہوا۔ جس نے شاعر کے جذبات اور احساسات کی ایک نئی دنیا سامنے رکھ دی۔ "ڈاک گھر" اور "گیتانجلی" دراصل ایک ہی دور کی تخلیق ہیں۔ اسی لیے دونوں میں ایک قسم کی شرافت، سنجیدگی اور سلامتی کا تصور ملتا ہے۔ "گیتانجلی" کی نظمیں دراصل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

"اسی دور میں میری بے چینی اتنی بڑھی کہ ناقابل برداشت ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں میں نے پہلے ڈاک گھر اور پھر گیتانجلی لکھی"

گیتانجلی شاعر کو قدرتی دنیا سے زیادہ قریب اور زیادہ مانوس کر دیتی ہے۔ ان نظموں میں تشبیہاتی ماحول (IMAGERY) اس طرح ہے۔ بارش، بادل، آندھی، سیلاب زدہ دریا، کشتی بان، چراغ، مندر، بانسری، دنیا، شام کو بسیرا کرتے پرندے، تھکے ماندے مسافر، کھلتے اور مرجھاتے پھول، ڈبلیو بی۔ ایٹس نے گیتانجلی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"یہ گیت دراصل عام سرزمین سے اُگے ہیں۔ جیسے گھاس اور جھاڑیاں"

اسی طرح ایڈورڈ تھامسن تسلیم کرتا ہے کہ

"انگریزی ادب کی نمایاں خصوصیت یعنی قدرت و کائنات سے لگاؤ دراصل قریبی دور کی پیداوار ہے"

ایلزبیتھ دور کے شعراء کا کائناتی مطالعہ نہایت محدود تھا انہوں نے صرف اپنے اطراف کا دیہاتی ماحول ہی دیکھا تھا۔ ٹیگور نے اس تصور کے ساتھ پرند پرندہیں، اور پھول پھول ہیں گیتانجلی لکھی۔ جس کی ہر نظم یہ تاثر دیتی ہے کہ وہ کھلی فضا یا کھلی کھڑکی کے سامنے لکھی گئی ہیں۔

ایٹس لکھتا ہے کہ:

"نسلیں گزرتی رہیں گی مسافران گیتوں کو اپنے راستوں سے گاتے رہیں گے"
"کشتی بان کشتی چلاتے وقت سمندر پہ یہی گیت گائیں گے"
"ایک دوسرے کا انتظار کرتے ہوئے دو عاشق ان گیتوں کو گنگنائیں گے ـــ یہی گیت ہیں خدا کی محبت کے گیت"

گیتانجلی دراصل ٹیگور کی تعلیمی سرگرمیوں کے متوازی چلتی ہے۔ ایک سال بعد ٹیگور پر پھر دہی اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۱۲ء کو کلکتہ میں ساہتیہ پریشد نے ٹیگور کی جوبلی منائی۔ اسی تقریب میں ٹیگور سخت بیمار ہوئے کہ آپریشن کرنا پڑا۔ اتفاق کی بات وہ دوسرے ہی دن انگلینڈ جانے والے تھے آخر ذرا طبیعت سنبھلی اور وہ انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ تھامپسن نے گیتانجلی اور اس کے

نوبل پرائز ملنے کی دلچسپ داستان ٹیگور ہی کی زبانی سنائی ہے

"۔۔۔۔۔ میں سیالدہ چلا گیا، اور وقت گذاری کے لیے گیتانجلی کے گیتوں کا انگریزی ترجمہ کرنے لگا۔ کیونکہ وہ گیت مجھے بے حد عزیز تھے ۔ اور میں ان کو بار بار پڑھ کر مسرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ ترجمے کسی طالب علم کی مشق سے زیادہ نہیں ہیں ۔ لہذا پہلے میں نے ایبیت کو دکھایا۔ انہوں نے کہا یہ اچھا ترجمہ ہے۔ پھر اسٹیمر میں بھی میں ترجمہ کرتا رہا۔ جس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ۔ میں لندن پہنچا، اور ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ یہاں مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہر شخص ایک فریب نظر (PHANTOM) تھا۔ ناشتہ کے بعد ہوٹل بالکل خالی ہو جاتا تھا، اور میں سڑک کی بھیڑ بھاڑ کو دیکھا کرتا تھا۔ میں بڑا ناامید ہو گیا، اور واپس ہونے کے تعلق سے سوچنے لگا۔ اس طرح کی انسانیت کو سمجھنا ممکن نہ تھا، اور کسی غیر ملک میں اس کے قلب تک پہنچنا ابھی ناممکن تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ روتھینسٹن سے ملا جائے۔ میں اس سے ایک بار اونڈرناتھ ٹیگور کے گھر مل چکا تھا۔ لیکن اس کو میں نے نہیں بتایا تھا کہ میں شاعر ہوں۔ وہ مجھے صرف ٹیگور خاندان کے ایک فرد کی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے اس کا ٹیلی فون نمبر تلاش کیا، اور اسے فون کیا۔ وہ فوراً آیا اور میرے لیے نئی قیام گاہ کا انتظام کیا۔ تم جانتے ہو وہ وادئ صحت یعنی ہیمپسٹیڈ، عجیب نام ہے۔ خیر۔ اس نے مجھے وہاں مکان دلا دیا۔ وہ میرا پڑوسی تھا، اور مجھ سے ملنے اکثر آتا رہا۔ ایک دن اس نے کہا کہ اس نے سنا ہے کہ میں شاعر ہوں۔ کیا میں اسے اپنے کام کا کوئی تصور دے سکتا تھا۔! میں نے اس سے کہا میرے پاس کچھ نثری ترجمے ہیں، لیکن جانتا ہوں کہ انگریزی اچھی نہیں ہے۔ بہرحال اس نے وہ ترجمے لے لیے۔ ایک دو دن کے بعد وہ نہایت مسرور انداز میں واپس آیا اور کہا، "وہ نہایت عجیب چیزیں ہیں۔ جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں نے سوچا وہ آرٹسٹ ہے ادب کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ وہ میرے چہرے سے فوراً سمجھ گیا کہ مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔ اس نے اس کی نقولات ٹائپ کروالیں اور ایٹس، اسٹاپ فورڈ بروک، اور بریڈلے کو بھیج دیں۔ بریڈلے نے جواب دیا کہ اسے ایک حقیقی شاعر پا جانے کی کوئی امید نہ تھی۔ دوسرے بھی متاثر ہوئے۔ پس ایتھنسٹن نے اپنے مکان پر ان کا اجتماعی مطالعہ کا انتظام کیا۔ ایٹس نے وہ نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ وہاں مس سنکلائر، نیولسن، موجود تھے۔ یہیں میری ملاقات اینڈریوز سے ہوئی۔ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ایٹس نے چند بہت چھوٹی نظمیں پڑھیں۔ میری حالت قابل رحم تھی۔ ان نظموں کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔! وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگے۔ تم جانتے ہو تم لوگ ناہموار ذہنیت ہو۔ ان لوگوں نے کسی طرح کا تاثر نہیں دکھایا۔ میرے ساتھ کی گئی اس ناانصافی سے میں ایٹس پر ناراض ہوا۔ دوسرے دن مس سنکلائر اور دیگر لوگوں کے خطوط آئے۔ پہلے میں ان کے لہجے سے گھبرا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ نہایت سنجیدہ تھے"!

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ، دراصل ٹیگور کی باقاعدہ تعلیم مکمل نہ ہو سکی تھی۔ گھر پر ہی روایتی طور پر کچھ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پہلے کلکتہ کی اورینٹل سیمینار اسکول میں داخل ہوئے۔ بعد میں نیشنل اسکول میں۔ شاعری تو انہوں نے چودہ سال کی عمر ہی سے شروع کر دی تھی۔ پھر انہیں اینگلو انڈین اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جس کو بعد میں سینٹ زیویرس کالج کہا گیا۔ پھر انہوں نے خود ہی بنگلہ، اور انگریزی کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۷۸ء میں انگلینڈ گئے۔ یونیورسٹی کالج لندن میں داخلہ لیا۔ لیکن ہندستان واپس بلائے گئے۔ البتہ اس قیام کے دوران انہوں نے مغربی موسیقی کا گہرا مطالعہ

یا اور ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی کے ساتھ ایک حسین امتزاج پیدا کیا۔ بس ان کی تعلیم کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

امریکہ اور انگلینڈ کے دورہ سے ٹیگور ۱۹۱۳ء میں واپس ہوئے۔ بمبئی پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم کسی کے استقبال کے لئے کھڑا ہے۔ انہیں خیال بھی نہ تھا کہ وہ لوگ انہی کے استقبال کے لئے آئے تھے — شانتی نکیتن پہنچے۔ وہاں ایک دن تمام مدرسین ایک تار لئے دوڑے اور تمام شانتی نکیتن میں ایک شور برپا ہوا۔ لوگ چلانے لگے۔

"بہت بڑی خوشخبری۔

مسٹر ٹیگور نے نوبل پرائز جیت لیا ہے"

ایک منٹ بعد ٹیگور آئے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ نوبل پرائز کیا ہے؟ لیکن وہ جانتے تھے کہ ہمارے گرودیو نے کوئی بہت بڑا کام کیا ہے اور تمام شانتی نکیتن میں "آمار شانتی نکیتن،، چلاتے پھرتے رہے۔ پھر سب نے گرودیو کے پیر چھوئے۔ ٹیگور کے لئے یہ سانحہ نیا نہیں تھا۔ کیونکہ لندن کے قیام کے دوران ہی بعض لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ گیتا نجلی کی ان نظموں کی ایک نقل نوبل پرائز کمیٹی کو بھیج دی جائے۔ اس کے بعد ٹیگور پھر اپنی شاعری کی دنیا میں کھو گئے اور پھر بہترین مجموعے سامنے آئے "گیت مالا اور گیت لی۔ ان نظموں میں موسیقیت کے علاوہ مذہبی تجربات کا بھی گہرا عکس نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ٹیگور کا قومی نقطۂ نظر سے بین الاقوامی انسانی تصورات تک کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کے بعد ایک اہم مجموعہ "پھالگن،، شائع ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں ہوم یونیورسٹی لائبریری کے قیام سے ٹیگور چاہتے تھے کہ ہندوستانی لوگوں میں تہذیب کی ایک نئی لہر آئے۔ اسی عرصہ میں ۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کا روح فرسا حادثہ پیش آیا۔ جس نے تمام ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹیگور بھی لرز گئے۔ انگریزوں کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ، حکومت سے بہتر تعلقات رکھنے والے ٹیگور بھی کانپ گئے۔ انگریزوں اور لارڈ چیمسفورڈ کو ایک طویل خط لکھ ڈالا جس میں انہوں نے حکومت برطانیہ کی اس بے رحمانہ حرکت پر سخت تنقید کرتے ہوئے ان کو دیا گیا نائٹ ہڈ (KNIGHT HOOD) کا خطاب واپس کر دیا۔ لیکن وہ اپنے انداز فکر پر اس قدر مستحکم تھے کہ اب بھی ۱۹۲۲ء کی تحریک عدم تعاون سے متفق نہ ہوئے۔ ان کو پختہ یقین تھا کہ انصاف، شرافت سے بہتر ہے۔ اسی طرح سچائی، مہربانی سے بہتر ہے۔ وہ اسی نظریہ کے قائل تھے کہ مشرق اور مغرب دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ البتہ ان حالات نے ٹیگور کی شاعری پہ خراب اثر ڈالا۔ وہ پھر امریکہ، اور یورپ کے دورے پہ چلے گئے۔ اس عرصہ میں ٹیگور کے لیے مسلسل رنج و غم کے دن گزرے۔ ۱۹۲۶ء تک ان کے تمام بھائیوں کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کے عزیز دوست اینڈریوز کا بھی انتقال ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء میں جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ جس نے ٹیگور کو خاص طور پر متاثر کیا۔ کیونکہ غیر ممالک کے مسلسل دوروں کے دوران انہوں نے مغربی اقوام کے صرف ظاہری اخلاق و عادات پر ہی توجہ دی تھی۔ پس پردہ

ان حالات کردار کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دنیا بھی مغربی تہذیب اب ان کی نظر میں کھوکھلی ہو چلی تھی — اسی عرصہ میں انہوں نے "تہذیبی انتشار" لکھا (CRISIS OF CIVILIZATION) ۱۹۴۱ء میں زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ لکھتے رہے۔ "جنم دن" اور دیگر مجموعے بھی شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ قلم ہاتھ میں پکڑ نہیں سکتے تھے۔ ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو انہوں نے اس دنیا کو آخری سلام کیا اور اپنے پیچھے انگنت گیت، نغمے، موسیقی، ڈرامے، کہانیاں، ناول، اور ایک عظیم تعلیمی ادارہ شانتی نکیتن چھوڑا، اور جن گن من کو ہمارا قومی ترانہ بنا دیا۔

انہی دنوں لندن میں ٹیگور کے جلسۂ تعزیت کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس کی صدارت تھامپسن نے کی ہے — وہاں مسٹر میسکی (چینی سفیر) ای۔ ایم۔ فورسٹر کنگز لے مارٹن، سریندر ناتھ گنگولی وغیرہ حاضر تھے۔ ہیلن کرک پیٹرک نے تقریر کی۔ بیٹرکس لیہمین نے ٹیگور کی نظمیں پڑھ کر سنائیں

ٹیگور کا ذہن اور وجود ہندوستانی تھا۔ لیکن اس کی ذہانت ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں تمام ممالک میں، تمام زبانوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔

مذکورہ بالا تمام پس منظر سے مقصود یہ ہے کہ انسان کا انداز فکر مضبوط و مستحکم نقطۂ نظر اور پے در پے بدلتے حالات کا صحیح ادراک ہی انسان کو بڑا بناتا ہے۔ اس کے لئے بعض اوقات روایتی تعلیم کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہے لیکن انسان کو حقیقی انسان کے روپ میں ہی سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ کیا جانا بہتر رہتا ہے۔ ورنہ مبالغہ کی دھند میں صحیح اور واضح شخصیت سامنے آنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ٹیگور نے اپنے زمانے کے تمام حالات کا صحیح اور منصفانہ تجزیہ کیا ہے، اور صحیح نتائج اخذ کئے ہیں۔ کسی رو میں بہنے کے بجائے انہوں نے رو کا رخ موڑنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اس وقت ٹیگور پر غیر ممالک میں سب سے زیادہ کام روس میں ہو رہا ہے۔ وہ ٹیگور کی ۱۲۵ ادبی جینتی

پر ترجمے کئے جا رہے ہیں۔ لیکن برسوں پہلے سے ان کے یہاں ٹیگور پر کام کیا جا رہا ہے۔ مختلف ایڈیشنوں میں ٹیگور کی تقریباً ۱۶۴ بار ۲۳ تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ یعنی تقریباً ۱۰ لاکھ کاپیاں چھپ چکی ہیں۔ مختلف تھیٹر کمپنیاں ٹیگور کے ترجمے کئے ہوئے ڈرامے کھیل چکے ہیں۔ ٹیگور پر سینکڑوں روسی مصنفوں نے لکھا ہے۔ حال ہی میں ایک آرٹسٹ جارجی پوپلاوسکی نے ٹیگور کے مجموعوں کے لئے نئے سر ورق تیار کئے ہیں۔ یقیناً موروزوبانے ٹیگور کی موسیقی (رابندر سنگیت) پر مزید اسٹڈی کر کے اس کو روس میں عام کیا ہے۔ ٹیگور خود صرف ۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ء کو روس جا سکے تھے۔ ورنہ انہیں سائنسی ادارہ کی جانب سے ۱۹۲۵ء میں مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں نہایت تیز تھیں۔ اس لئے وہ نہ جا سکے۔ روس کے انقلاب (سیاسی) اور بعد میں سماجی انقلاب سے ٹیگور بے حد متاثر ہوئے تھے۔

بہرحال یہ عجیب بات ہے کہ بھارت کے اس سپوت کے تعلق سے بھارت میں بہت کم کام ہوا ہے۔ امید ہے کہ ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقعہ پر شاید سرکاری بنیادوں پہ مزید تحقیق کا کام ہو سکے۔

"یہ درد فراق ہے۔ جو کل دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اور وسیع آسمان میں بیشمار شکلوں کو وجود میں لاتا ہے۔ یہی غم فراق ہے۔ جو رات بھر خاموشی سے ایک ستارے سے دوسرے ستارے کو تکتا اور ساون کی گھنگھور گھٹاؤں میں سرسراتے ہوئے پتوں میں ایک نغمہ بن جاتا ہے۔

یہی عالمگیر درد ہے۔ جو انسانوں کے گھروں اور رنج و راحت میں، محبت اور تمناؤں میں اپنا گہرا اثر کرتا ہے۔ اور یہی وہ درد ہے۔ جو مجھ شاعر کے دل سے ہمیشہ گیتوں کی شکل میں پگھلتا اور بہتا رہتا ہے۔"

گیتانجلی

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا
۱۱ راسٹار کی ٹاؤن۔ ناگپور ۲

ٹیگور امر ہے

لہے ہر اک بزم میں جس شخص کا چرچا
راصل میں تھا حسن و فن و علم کا شیدا
یائے ادب میں بھی بڑا نام جس کا
ماز درِ قلم جس کا زمانے سے انوکھا
وہ صاحبِ چشم و دلِ بیدار تھا ٹیگور
فن جس پہ کرے ناز وہ فن کار تھا ٹیگور

انداز بیاں اس کا ہے دنیا سے نرالا
تخئیل کی پرواز ہے اس کی بہت اعلا
فن پاروں میں ہے اس کے سجل من کا اجالا
اس بات کا شاہد ہے یہی "کابلی والا"
دُکھ درد سے بھرپور لکھے اس نے فسانے
چھیڑے ہیں عجب حُسن و محبت کے ترانے

تی بھرے انداز میں اس نے جو لکھا ہے
لفظ میں بنگال کا جادو سا بھرا ہے
تیا نجلی جیسا گرنتھ اس نے دیا ہے
یا پہ یقیناً بڑا اُپکار کیا ہے
ٹیگور کا احسان نہ بھولے گا زمانہ
ہاں اس کو کسی آن نہ بھولے گا زمانہ

گیت عظمتِ انسان کے گائے ہیں اسی نے
الفت بھرے نغمات سنائے ہیں اسی نے
پردے رخِ فطرت سے اٹھائے ہیں اسی نے
جینے کے سلیقے بھی سکھائے ہیں اسی نے
بھارت کو گلستانِ عدن اس نے کہا ہے
اس دیش کی دھرتی کو گگن اس نے کہا ہے

ن ہیں کبھی اس نے منو وگیان کی باتیں
نسان سے کیں فطرتِ انسان کی باتیں
اروں کی چمک پھول کے مسکان کی باتیں
اتی ہوئی چڑیوں کی مدھر تان کی باتیں
ٹیگور کے ہر گیت میں گھنشیام کی لے ہے
جو لفظ ہے وہ اپنی جگہ موجِ مے ہے

اللہ رے ٹیگور کے اشعار کی دنیا
رنگین مہکتے ہوئے افکار کی دنیا
نغموں کے برستے ہوئے انوار کی دنیا
ٹیگور کی دنیا ہے حسیں پیار کی دنیا
تاروں کی دمک، اوس کی دھج، پھولوں کی مستی
اک حسن کی دنیا ہے بسی نظموں میں اس کی

الفت جسے کہتے ہیں اُسی ریت کی سوگند
جو دل کو ملا دیتی ہے اس پریت کی سوگند
لہروں میں جو گنگا کی ہے اس ریت کی سوگند
اس راشٹر کی اور راشٹریہ گیت کی سوگند

ٹیگور کا فن زندہ ہے ٹیگور امر ہے
ٹیگور سمجھ لوگوں کا منظورِ نظر ہے

خالی عبادت گاہ

بھجن، پوجا، سادھنا، دُعا سب کچھ پڑا رہے۔
بند دروازے والے مندر کے کونے میں تو کیوں بیٹھا ہے!
تاریکی میں چھپ کر اپنے دل سے
کس کی تو پوجا کرتا ہے پوشیدہ جذبات کے ساتھ،
آنکھیں کھول کر دھیان سے دیکھ تو ——— دیوتا گھر میں نہیں ہیں۔

وہ وہاں گئے ہیں جہاں مٹی توڑ کر کسان کھیتی کرتا ہے۔
جہاں پتھر توڑ کر مزدور راستہ بنا رہا ہے بارہو مہینے محنت کرتا ہے
دھوپ اور بارش میں (وہ) ہیں سب کے ساتھ
خاک دھول اُن کے دونو ہاتھوں میں لگی ہے ———
انھیں کی طرح صاف کپڑے اُتار کر آجا دھول میں

نجات؟ ارے نجات کہاں پائے گا تو، نجات ہے کہاں!
بھگوان خود سنسار کے بندھن میں سب کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں
رہنے دے دھیان کو، رہنے دے پھول کی ڈالی کو
کپڑے پھٹیں، دھول بالو لگے ——— کرم جوگ میں اُن کے ساتھ ایک
ہو کر پسینہ جھڑ کر گرے۔

گیتانجلی ۱۰ جولائی ۱۹۱۰ء

دُعا

جہاں دل خوف سے خالی ہے، جہاں سر اونچا اُٹھا ہے
گیان جہاں آزاد ہے، جہاں گھر کی چہار دیواری نے
دن رات اپنے آنگن میں دھرتی کو چھوٹا بنا کے نہیں رکھا ہے
جہاں تقریر سرچشمۂ دل سے
اُبل پڑتی ہے، جہاں بے روک بہنے والے سرچشمہ کی طرح
دیس دیس میں سمت سمت میں عمل کا دھارا دوڑتا ہے۔
مسلسل ہزاروں کی طرح کی تمیوں کے درمیاں،
جہاں بیچ کردار کے ریگستان ریت کے ڈھیر نے
آزاد خیالی کی نہر کو گرفتار نہیں کر رکھا ہے ———
ہمت و شجاعت کے سو ٹکڑے نہیں کر دئے ہیں، جہاں ابدی طور پر
تم یہ کام ہر خیال اور ہر آنند کے رہبر ہو،
نے پتا، اپنے ہاتھ سے بیدردانہ کر کے
بھارت کو اسی جنت میں بیدار کر دو۔

نئے دیکھ جون، جولائی ۱۹۰۱ء

پران

میں مرنا نہیں چاہتا، اس سُندر سنسار میں
انسانوں کے بیچ میں میں زندہ رہنا چاہتا ہوں
سورج کی روشنی میں پھول کھلے باغ میں
اگر ایک زندہ دل میں مجھے جگہ ملے
اس دھرتی پر سدا بہار پرانوں کا کھیل
جُدائی، وصال، کتنی ہنسی اور آنسوؤں کا سنجوگ
انسان کے دُکھ سکھ نغموں میں پرو کر
اگر ایک لافانی دنیا بنا سکوں

اگر ایسا نہ کر پاؤں تو جتنے دن زندہ رہوں
تمھی لوگوں کے بیچ میں رہ سکوں تم ہو کر۔
تُمھی ہی لوگ صبح و شام میرے نغموں کو گاؤ اور ان کے پھول چُنتے رہو۔
اس لئے نت نئے نغمے چھیڑتا ہوں
نغموں کے پھول کھلاتا ہوں
ہنسی خوشی قبول کرنا ان پھولوں کو، ——— پھر بعد میں
پھینک دینا ان پھولوں کو اگر وہ مرجھا جائیں

نومبر ۱۸۸۶ء

سُونی چوکی

دُھوپ کی گرمی جُھلسانی ہے
آدمیوں سے سنسان دوپہر کی گھڑیوں میں۔
سُونی چوکی کی طرف دیکھتا ہوں،
وہاں تسلیِ قلب برائے نام بھی نہیں ہے
اُس کا بھرا ہوا دل
ناامیدی کی زبان میں ہائے ہائے کر رہا ہے۔
سُونے پن کی آواز سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی اُٹھتی ہے،
اُس کا بھید گرفت میں نہیں آتا
مالک کو کھونے والا کتّا جیسے پُر درد نگاہوں سے دیکھتا ہے،
اُسی طرح، ناسمجھ دل کا درد ہائے ہائے کرتا ہے؛
کیا ہُوا، کیوں ہُوا، دل کچھ نہیں سمجھتا ——
دن رات رائیگاں نگاہوں سے چاروں طرف ڈھونڈھتا ہے۔
سُونی چوکی کی زبان جیسے اور پُرسوز و پُراضطراب ہو گئی ہے
سُونے پن کا خاموش درد چھا جاتا ہے گرہنی (گھر والی) سے محروم گھر پہ۔

شیش لیکھا — ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

روزِ رُخصت

جانے کے دن یہ بات کہہ جاؤں ——
جو میں نے دیکھا ہے، جو پایا ہے اُس کی مثال نہیں ہے۔
اِس بحرِ انوار کے بیچ جو سو پنکھڑیوں والا کنول شوبھا پاتا ہے
اُسی کی شہد میں نے پی ہے، قابلِ مبارکباد ہوں اِس لئے۔
جانے کے دن یہ بات کہہ جاؤں
بھگوان کے کھیل گھر میں کتنا کھیل کھیل کر
بے مثال روپ والے کو دیکھ لیا
اپنی دو آنکھیں کھول کر۔
جسے چھوا نہیں جا سکتا اُنھیں سرتاپا پکڑ لیا ہے
اپنے آپ وہ، اگر مجھے ختم کر دیں تو ختم ہی کر دیں ——
جانے کے وقت یہ بات بتاتا جاؤں۔

گیتانجلی ۹۵ — ۵ اگست سنہ ۱۹۱

ارضِ شیریں کی خاک

یہ جنّت ارضِ خوشگوار ہے شیریں ہے زمین کی دُھول ——
میں نے دل میں اسے اُتار لیا ہے،
یہ مہامنتر آیتِ عظیم
کامیاب زندگی کی آواز ہے۔
روز بروز ماہیتِ حقیقت کا جو کچھ تحفہ میں نے پایا تھا
دھرتی کے میٹھے رس کے کارن اُسے فنا نہیں ہے
اسی لئے یہ منتر کی آواز موت کی سرحد پر گونجتی ہے۔
ہر نقصان کو جھٹلا کر لامحدود نشاط بیکراں میں براجتی ہے۔
جب دھرتی کا آخری لمس لے جاؤں گا
تو کہہ جاؤں گا، تمہاری دُھول کا
تلک لگایا ہے میں نے ماتھے پر،
میں نے دیکھی ہے بقا کی جوت
بُرے دِنوں کے فریب کی اوٹ میں۔
حقیقت کا آنند روپ (پیکرِ نشاط) اس دُھول میں صورت پکڑ گیا ہے
یہی جان کر میں نے دُھول میں اپنا سلام رکھ دیا۔

آروگیہ — ۱۴ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

ہارون رشید علیگ

رابندر ناتھ ٹیگور کے ابتدائی ماہ و سال

کپلنگ نے رابندر ناتھ ٹیگور سے متاثر ہو کر کہا تھا:

"وہ سب سے زیادہ آفاقی،
سب سے زیادہ وسیع النظر
اور سب سے زیادہ
مکمل انسان تھے"

سچ تو یہ ہے کہ پچھلے دو سو برسوں کے دوران ہندستان نے صرف دو ہی ہستیاں ایسی پیدا کیں جن کی عظمت کا ڈنکا دنیا کے کونے کونے میں بجا اور جو دوسروں کے لئے مشعل راہ بن گئیں۔ ایک مہاتما گاندھی اور دوسرے رابندر ناتھ ٹیگور۔

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ خدا کسی ایک شخص کو تمام صفات اور جملہ خوبیوں سے نہیں نوازتا۔ تاہم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند شخصیتیں ایسی بھی پیدا ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کے لئے خدا نے اپنا اصول بالائے طاق رکھ دیا ہوگا۔ ایسی ہستیوں کی فہرست میں یقیناً ٹیگور کا نام پیش پیش ہے۔

ٹیگور بیک وقت شاعر بھی تھے اور ڈرامہ نویس بھی۔ وہ ناول نگار بھی تھے اور موسیقار بھی۔ وہ اداکار بھی تھے اور مصور بھی، فلسفی بھی تھے اور جرنلسٹ بھی، زبردست مقرر بھی تھے اور ایک اعلیٰ ٹیچر بھی۔ عمر کے آخری حصے میں جنگ آزادی کے میدان میں کود کر انھوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ زندگی کا شاید ہی ایسا کوئی خانہ تھا جس میں رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے علم و فن کا رنگ نہ بھرا ہو۔ تاریخ کے صفحات الٹئے تو ایسی ہستی مونا لیزا والے اطالوی مصور لیونارڈو ڈاونسی ہی کی نظر آتی ہے۔

بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ بچے کا ذہن گیلے سیمنٹ کی طرح ہوتا ہے جو شے اس پر گرتی ہے وہ سدا کے لئے اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ٹیگور کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ٹیگور کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ منہ میں چاندی کا چمچہ لئے پیدا ہوئے تھے، زمینداروں کا گھرانہ تھا، وہ بھی برہمن زمیندار، جن کے دبدبے سے سارا علاقہ کانپتا تھا لیکن رابندر ناتھ ٹیگور کے والد یا ان کے بھائیوں نے کبھی بھی زمینداری کا ٹھسا نہیں دکھایا اور نہ ہی برہمن ازم پر نازاں ہوئے۔

ٹیگور ۶ رمئی ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بنگال ان دنوں ذات پات اندھ دھرم و سماج کے جھوٹے بندھنوں میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے جب سماج کے ٹھیکیداروں کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا اور برہمو سماج کی بنیا ڈالی تو ٹیگور کا گھرانہ بھی اس تحریک میں جی جان سے شامل ہو گیا۔ راجہ رام موہن رائے نے آندھی میں چراغ جلایا تھا اور ٹیگور فیملی نے اس چراغ کی حفاظت کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا

رابندر ناتھ کے والد دیویندر ناتھ اور دادا دوارکا ناتھ سماج کی برائیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ٹیگور خاندان نے راجہ رام کی مدد نہ کی ہوتی تو ان کی برہمو سماج کی تحریک اس قدر جلد پروان نہ چڑھتی۔

بنگال میں ذات پات کی تفریق اور اچھوت کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی ہندو یا برہمن مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر دو لقمے کھا لیتا تو غضب ہو جاتا۔ ایک طرح سے اس پر سماجی عتاب نازل ہو جاتا لیکن رابندر ناتھ ٹیگور نے بچپن ہی میں دیکھا کہ اُن کے گھر مسلمان آتے ہیں اور باقاعدگی سے بڑے بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھاتے ہیں۔

گیتانجلی کا اردو ترجمہ کرنے والے پروفیسر ایم ضیاءالدین نے اپنی کتاب کلامِ ٹیگور کے دیباچے میں اس خاندان کے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے :

"رابندر ناتھ ٹیگور کے والد مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور ہندوؤں میں خالص موحدوں کے نئے مذہب برہمو سماج کے سربرآوردہ تھے۔ یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے فنونِ لطیفہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ ٹیگور کے والد حافظ کے اشعار کے دلدادہ تھے۔ ان کی بنگالی سوانح عمری میں حافظ کے اشعار جا بجا زینتِ کلام نظر آتے ہیں۔"

اُس زمانہ میں سمندر پار جانا ہندوازم میں ایک گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ ٹیگور کے دادا دوارکا ناتھ نے یہ طلسم بھی توڑا اور سات سمندر پار کا سفر کیا۔ قارئین ان واقعات سے اُس ماحول کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں جس میں رابندر ناتھ ٹیگور نے آنکھیں کھولی اور پلے بڑھے۔

ٹیگور نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بڑے بھائی دویجیندر ناتھ کو دیکھا جو ایک فلسفی اور پائے کے نثر نگار تھے۔ ایک اور بھائی رجیوتیندر ناتھ بہت اچھے مصور تھے۔ سر ولیم روتھنسٹین نے ان کے فن کو سراہا تھا۔ ایک اور بھائی سول سروس میں داخل ہونے والے پہلے ہندوستانی کا اعزاز حاصل کئے بیٹھے تھے اور پھر ٹیگور کے بھتیجوں ابنیندر ناتھ اور گگنیندر ناتھ سے بہ حیثیت مصور اس وقت ساری دنیا واقف تھی۔

ظاہر ہے جو پودا ایسی زرخیز اور اپجاؤ زمین سے اُگا ہو وہ اُس مٹی کی خوشبو اور قند و نمک تو اپنے اندر ضرور رکھے گا۔ اسی لئے رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریروں اور فنی کارناموں سے بھی خوشبو پھوٹتی رہی۔ وہ بچپن ہی میں اسی بھٹی میں تپ کر کندن ہو گئے تھے۔ خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کا گُر وہ سیکھ چکے تھے۔

یوں کہئے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اُس ماحول میں پرورش پائی جہاں بچے انگوٹھے کے ساتھ علم چوستے تھے لیکن ٹیگور کو بچپن ہی میں ایک بڑا جھٹکا بھی لگا جب ان کی والدہ اس دنیا سے سدھار گئیں۔ والد نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ٹیگور اکیلے پڑ گئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ وہ گھر کے نوکروں اور ملازمین میں گھل مل گئے۔ اُن کے دُکھ سکھ جاننے کی کوشش کی اور ان کے رہن سہن سے واقف ہوئے۔

رابندر ناتھ کو پہلے بنگال اکاڈمی اور سینٹ زیویرس اسکول بھیجا گیا لیکن انھیں تو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہونا تھا۔ اسکول کی چہار دیواری میں وہ ذرا سی آبجو بن کر کیسے رہ سکتے تھے اس لئے اسکول میں ان کی دلچسپی گھٹتی گئی اور گھریلو تعلیم پر وہ زیادہ دھیان دینے لگے۔ بچپن ہی سے آزادی کا تصور ان کے دل و دماغ میں گھر کئے ہوئے تھا۔ وہ خدا کی بنائی ہوئی سرسبز حسین دنیا میں دور تک نکل جانا چاہتے تھے۔ ہر شے کو قریب سے جا کر دیکھنے کی آرزو تھی انھیں۔ چاہے وہ لہلہاتی ہوئی دھان کی فصل ہو، ہواؤں میں جھومتا آم کا پیڑ ہو یا اس کی ڈال پر بیٹھا کوئی خوش الحان پرند ہو۔

اسے رابندر ناتھ ٹیگور کی خوش قسمتی ہی کہئے کہ ان کے والد کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ والدہ کے اٹھ جانے کے بعد ٹیگور اکثر بیشتر اپنے والد کے ساتھ سفر پر نکل جایا کرتے تھے۔ کلکتہ کی شہری آبادی سے باہر نکل کر جب وہ دیہاتوں میں آتے تو انھیں لگتا جیسے منزل مل گئی ہو۔

دیہی علاقوں نے ٹیگور کے شعور کو پختگی بخش دی۔ ان کا فن نکھر آیا۔ کھیتوں میں گیت گاتا کسان، ہواؤں میں اڑتے ہوئے طیور، اور گاڑی کھینچتے ہوئے بیل جن کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں

فضاؤں میں ترنم بکھیرتی ہیں۔ یہ سارے مناظر گویا آہستہ آہستہ ٹیگور کے دل و دماغ میں اترتے گئے۔ ایک خزانہ جمع ہو گیا۔ بعد میں اسی خزانے سے ٹیگور نے دنیائے علم و ادب کو مالا مال کر دیا۔

۱۸۷۷ء میں رابندر ناتھ ٹیگور انگلینڈ گئے تھے۔ وہاں کی فضائیں انہیں کچھ زیادہ راس نہیں آئیں۔ ایک سال بعد جب وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹے تو انگلستان کے متعلق نئے تصورات اور تجربے بھی اپنے ساتھ لائے۔ وہاں انہوں نے سرتھامس براؤن کی کتاب "Religio Medici" پڑھی تھی۔

یوں کہا جائے کہ ٹیگور نے چلنا سیکھنے سے پہلے ہی لکھنا بھی سیکھ لیا تو غلط نہ ہوگا۔ ابھی وہ پندرہ سال ہی کے تھے کہ ان کی تخلیقات رسالوں میں چھپنے لگیں۔ ایک اندازے کے مطابق سترہ سال کی عمر میں ٹیگور کم و بیش سات ہزار اشعار اور بہت سے مضامین کے خالق بن چکے تھے۔

رسالہ بھارتی میں ۱۸۷۷ء میں ان کی نظمیں چھپ چکی تھیں۔ ان نظموں میں ٹیگور نے پرانے ویشنو شاعروں کی تخلیقات کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا تھا۔ وہ بھی اتنی خوبصورتی اور مہارت سے کہ اس زمانے کے شاعروں نے اسے بنگالی شاعری اور ادب کا ایک درخشاں باب تسلیم کر لیا لیکن ٹیگور کو اصلیت کا اندازہ تھا۔ انہوں نے ۱۸۹۶ء میں جب اپنی نظموں کا پہلا انتخاب مرتب کیا تو اس میں ان نظموں کو شامل نہیں کیا اور نہ ہی انہیں کوئی خاص اہمیت دی۔

اپنی شاعری یا تخلیق کو یوں کاٹ کر پھینک دینا یا نظر انداز کر دینا دل جگر کی بات ہے۔ بڑے بڑے شاعر اور ادیب ایسا نہیں کر پاتے۔ انہیں اپنا کوئی شعر یا کوئی جملہ برا نہیں لگتا لیکن ٹیگور نے اس تحلیل اور احتساب سے "ایک دھاگوی" ہونے کا ثبوت دیا۔ اور مرزا غالب کی یاد دلائی جنہوں نے اپنا دیوان تیار کرتے ہوئے یہی کچھ کیا تھا۔

ہم آپ کو یہ بتانا بھول گئے کہ 'بھارتی' نامی جس رسالے میں ٹیگور اپنا کلام چھپواتے تھے وہ کسی اور کا نہیں خود ان کے بھائی کا تھا، وہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ ٹیگور کی نثر نویسی کا فن بھی اسی رسالے سے دنیا پر آشکارا ہوا۔ ان کے ابتدائی مضامین سیکسن اینڈ اینگلو سیکسن ادب، پیٹرک اور لارا، دانتے اور اس کی شاعری اور گوئٹے جیسے موضوع پر تھے جو خاص و عام میں بے حد مقبول ہوئے۔

اس طرح رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ابتدائی ماہ و سال کے دوران اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ پہلے ہندستان اور پھر ساری دنیا سے اپنے علم و ادب کا لوہا منوایا۔ اور اتنی تیزی سے پیش رفت کی کہ ۱۹۱۳ء میں نوبیل انعام پر ہی دم لیا۔ اس طرح وہ یہ اعزاز پانے والے پہلے ہندستانی قرار پائے۔ ۱۷ برس بعد ایک اور ہندستانی سی۔ وی۔ رمن کو ان کی سائنسی خدمات کے لئے ۱۹۳۰ء میں نوبیل پرائز ملا تھا۔ نوبیل انعام کے علاوہ ٹیگور کو اتنے عالمی اعزازات اور انعامات ملے جن کی اگر فہرست تیار کی جائے تو صفحے کے صفحے لگ جائیں۔

آخر میں ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ رابندر ناتھ ٹیگور اپنے ابتدائی ایام میں تو خالصتہً ہندستان کے تھے، لیکن بعد میں ساری دنیا کے ہو گئے۔ کیا امریکہ کیا جاپان اور کیا روس، سبھی ممالک نے انہیں اپنے یہاں مدعو کیا اور انہیں دیکھ سن کر وہاں کے عوام خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ ایسی شہرت اور مقبولیت دنیا میں گنتی کے لوگوں ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

بادل پر بادل امنڈ رہے ہیں اور اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ اے پریم تو نے مجھے دوار کے باہر بالکل اکیلا کیوں بٹھا رکھا ہے؟

دوپہر میں کام کاج کے وقت میں لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اس تاریکی میں میں کیوں تیری ہی آس کرتا ہوں؟

اگر تو مجھے اپنا مکھ نہ دکھلائے گا اور مجھے بالکل ایک طرف چھوڑ دے گا تو نہ معلوم ورشا کی یہ لمبی گھڑیاں کیسے کٹیں گی!

میں آسمان پر دور چھائی ہوئی دھند پر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں اور میرا جیت چنچل ہوا کے ساتھ واویلا کرتا ہوا بھٹک رہا ہے۔

گیتانجلی

ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی
[illegible] فلیٹس۔ ۱۸۰/اے، پائپ روڈ۔
کُرلا، مغربی، بمبئی ۷۰

ٹیگور کی تعلیمی و سماجی سرگرمیاں

انیسویں صدی کا نصفِ آخر اور بیسویں صدی کا نصفِ اول اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی دو مایہ ناز شخصیتیں ٹیگور و گاندھی منصۂ شہود پر آئے، دونوں سراسر مشرقی تھے لیکن مغرب سے اکتسابِ فیض بھی کیا تھا۔ دونوں کی راہیں جُدا جُدا لیکن منزل ایک تھی۔ دونوں کے دل ہندستان اور اس کے غریب عوام کی محبت سے پُر تھے اور دونوں نے اس راہ پر چل کر ملک و قوم کی خدمت کی۔ اس دور کو بجا طور پر ہندوستانی تہذیب کا نشاۃ ثانیہ کہا جا سکتا ہے۔

ٹیگور کی ذات جامع صفات، جامع جہات، جامع حیثیات، ہے۔ وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب، ایک پیامبر، ایک سماجی مصلح، ایک معلمؔ، ایک ماہر تعلیم، ایک موسیقار، ایک مصوّر، ایک آرٹسٹ، ایک ڈرامہ نگار، ایک کہانی کار، اور سب سے اہم ایک محسنِ انسانیت تھے۔ ان کی شخصیت کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کے کسی ایک پہلو پر مختصراً کچھ لکھنا دشوار ہے۔ بقول شاعر ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار توز داماں گلہ دارد

مجھے اس مضمون میں ٹیگور کی تعلیمی و سماجی سرگرمیوں پر روشنی ڈالنا ہے۔ ٹیگور ہندوستان جیسے پسماندہ غریب اور غلام ملک میں یہ دور رس نکتہ ذہن میں ضرور رکھتے تھے کہ ہندوستان کی پسماندگی، افلاس و غلامی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوکر ہی سماجی تبدیلیاں

لائی جا سکتی ہیں ۔ تعلیم ذہنوں کی بیداری اور قلب میں وسعت پیدا کرتی ہے اور یہی قلب کی وسعت بعد میں سماج کی اصلاح میں ممد و معاون ہوتی ہے۔

رابندر ناتھ ابتدا ہی سے انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ بچپن ہی سے ان کو جدید طریقہ تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کلاس روم کا تھکا دینے والا ماحول ان کے دل کو کبھی جیت نہ سکا۔ ان کو اسکول میں گھٹن کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ اس لئے انہوں نے اسکول چھوڑ دیا۔ ایک جگہ وہ اسکول کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہم لوگ کلاس روم میں بطور تب گھر کی مردہ چیزوں کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ جب کہ اسباق کی بوچھار ہم لوگوں پر بلندی سے اس طرح کی جاتی تھی جیسے کہ پھولوں پر ژالہ باری کی جا رہی ہو۔"

اپنی ایک دوسری تقریر میں جو کہ انہوں نے وشوا بھارتی یونیورسٹی کے افتتاحیہ اجلاس میں کی تھی انہوں نے کہا:

" مجھے یاد آتا ہے کلاس روم کا وہ دروازہ جو کہ ہر آنے والی صبح اپنے بڑے سے دہانے کو کھولے ہوئے، طلباء کو ہڑپ کر لیتا تھا۔ اسکول کی ننگی دیواریں، لکڑی کی بنچیں، اور لکڑی کی وہ میز جس پر استاد کھڑا ہو کر زندہ فونوگراف کی طرح اپنے لیکچر دیا کرتا تھا، اس میں شک نہیں کہ وہاں اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن ا[illegible] اچھی [illegible] تات یقیناً [illegible] اسکتا تھا۔

ان کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مندرجہ ذیل اصولوں پر معلوم ہوتی ہے۔

(TAPOVAN) رابندر ناتھ غالباً ہندوستان کے قدیم طریقہ تعلیم سے متاثر تھے۔ جہاں ایک برہمچاری تپوون میں اپنے گرو سے تعلیم حاصل کرتا تھا۔ تپوون یا (FOREST SCHOOL) میں طالب علم کا مناظر قدرت یا نیچر سے گہرا لگاؤ رہتا ہے اور اس سے ان طلبا میں آزاد روی، اور مسرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

" میرے خیال سے ایک اہم اصول یہ ہونا چاہیے۔ زندگی سے ملو جہاں وہ سب سے اہم ہے۔ کلاس روم سے باہر آجاؤ۔ درختوں کو کلاس روم میں مت لاؤ۔ بلکہ کلاس درختوں کے نیچے لے جاؤ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک درخت کا تنہ کلاس روم میں لے آنا آسان ہے۔ لیکن یہ تنہ مُردہ و بے جان ہے کلاس روم میں درخت لانے سے اس میں پھول اور پھل نہیں لگیں گے۔"

ٹیگور کو مغربی کھیل کے ذریعۂ تعلیم (PLAYWAY) زیادہ پسند تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک مثالی طریقۂ تعلیم تھا۔ ٹیگور تعلیم میں آزادی اور خود اعتمادی پر زیادہ زور دیتے تھے اور ان کو اس طریقۂ تعلیم میں یہ باتیں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ میکانکی ڈسپلن جس سے کوئی خوشی حاصل نہ ہو، بچے کی ذہنی نشوونما میں مفید ثابت نہیں ہوتی۔ ان کے خیال میں جدید طریقۂ تعلیم میں کھیل کود، گانا، رقص و ڈرامہ کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ ان چیزوں سے طلبا ایک دوسرے سے قریب آتے ہیں اور ان میں ہم آہنگی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ان میں آزادی و مسرت حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ خود نظمی بھی پیدا ہوتی ہے۔

برا تجربہ

ایک مثالی طالب علمانہ زندگی کا اصل مقصد احساس جمال پیدا کرنا ہے۔ آزادی، منسرت اور حسن سے انسان مکمل ہوتا ہے۔

اس مقصد کے تحت ٹیگور نے ۱۹۰۱ء میں شانتی نکیتن قائم کیا۔ جس وقت یہ اسکول شروع ہوا۔ یہاں صرف پانچ لڑکے پڑھتے تھے اور وہ بھی پرابلم چلڈرن تھے لیکن اپنی افادیت کے پیش نظر دیکھتے دیکھتے یہ ایک بڑا اسکول ہو گیا، شانتی نکیتن میں تعلیم کا طریقہ دوسرے اسکولوں سے بالکل الگ تھا۔ یہاں نہ کرسیاں تھیں، نہ بنچیں، طالب علم اور استاد درختوں کے سائے میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر بیٹھتے تھے۔ یہاں ہر فن کی تعلیم کی الگ الگ شاخیں ہیں۔ مثلاً ایک شاخ سنسکرت کی تعلیم کے لئے ہے جس کا نام "ودیا بھون" ہے۔ تصویریں بنانے اور پتھر کی مورتیاں بنانے کی بھی ایک الگ شاخ ہے۔ سنگیت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ہندوستانی سنگیت کے ساتھ ساتھ وائلن اور پیانو بھی سکھایا جاتا ہے۔ ناچ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ہر قسم کے ہندوستانی ناچوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ٹیگور کے لکھے ہوئے ڈرامے بھی کھیلے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں میں خود ٹیگور بھی کام کیا کرتے تھے۔

ٹیگور کی نظر میں سب مذاہب برابر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر مذہب کا ماننے والا ایک ہی خدا کو مانتا ہے۔ بچے کسی مذہب کے کیوں نہ ہوں وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہ کر خدا سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے شانتی نکیتن میں کسی ایک مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ تمام مذاہب کی اچھی باتیں سنائی جاتی ہیں۔ اس کے عبادت کے لئے کوئی خاص طریقہ نہیں رکھا گیا ہے۔ البتہ تمام لڑکے اور لڑکیاں روزانہ صبح و شام ایک جگہ جمع ہو کر پندرہ بیس منٹ تک خاموش عبادت کرتے ہیں۔

ٹیگور کی نظر میں بچے کی پہلی تربیت گاہ اس کا گھر اور دوسری تربیت گاہ اسکول ہوتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم سے زیادہ اہم اس کے گھر کا ماحول ہوتا ہے نہ کہ ایک غیر ملکی زبان جو کہ ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنائی گئی ہو۔

کتابی علم سے بہتر وہ علم ہے جو کہ حرکت و عمل سے آتا ہے۔ مکمل تعلیم تمام حسوں کی تربیت منجملہ دماغی جس سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ رٹی رٹائی زبانی علم ہے۔ اس طرح کی تعلیم درسی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔

اساتذہ کی محبت

اساتذہ اور طلبا میں گہرا ربط اور گرمجوش تعلقات ہونا چاہئیں۔ بغیر محبت و ہمدردی کے کوئی آدمی اچھا استاد نہیں ہو سکتا۔ بحیثیت ایک معلم یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ ادارہ جو کہ صرف پانچ طلبا سے برسہا برس پہلے شروع ہوا تھا۔ دنیا بھر میں ایک مثالی تعلیمی مرکز بن گیا جس کی وجہ ٹیگور کا خلوص، صدق دلی اور گرمجوشی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بحیثیت معلم وہ کامیاب ہیں اور اس پر انہیں فخر بھی تھا۔

انہوں نے لکھا:

"جب کبھی میں پڑھاتا ہوں۔ میں اسے محبت اور خلوص سے کرتا ہوں۔ میں اپنا دل و جان اسی میں رکھ دیتا ہوں۔"

ٹیگور نے اپنی لگاتار محنت و عمل سے شانتی نکیتن کے اسکول کو بالکل گھر جیسا بنا دیا۔ جہاں چھوٹے بڑے سب مل کر خاندان کے ایک فرد کی طرح مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں طلبا و اساتذہ کے تعلقات بہت ہی غیر رسمی (INFORMAL) ہوتے ہیں۔ ایمرسن نے ایک جگہ لکھا تھا کہ:

"تعلیم کا راز بچوں کی عزت کرنے میں مضمر ہے۔"

اور یہاں ان کو وہ عزت ملتی ہے۔

وشوا بھارتی

ٹیگور چاہتے تھے کہ آگے دنیا بھر میں کبھی جنگ نہ ہو اس لئے وہ شانتی نکیتن کو ایک ایسی یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے جس میں ہر ملک، ہر زبان، اور ہر مذہب کے لڑکے ایک ساتھ رہ کر تعلیم پائیں اور جب

وہ اپنے ملک واپس جائیں تو وہاں کے لوگوں کو مل جل کر رہنے اور دوسرے ملکوں سے محبت کرنے کا سبق دے سکیں۔

آخر ٹیگور کا یہ خواب پورا ہوا۔

دسمبر ۱۹۱۸ء میں شانتی نکیتن میں ایک یونیورسٹی کھولی گئی۔ جس کا نام "وشوا بھارتی" رکھا گیا۔ یہ ایک ایسی یونیورسٹی ہے جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں۔ یہاں نہ صرف ہندوستان کی ساری زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ دنیا کے اور بہت سے ملکوں کی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ یہاں پڑھنے والے طلبا کے ساتھ کھانے پینے یا رہنے سہنے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ یہ سب ایک خاندان کی طرح گھل مل کر رہتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی، اور یہودی ہر مذہب کے لوگوں کے لئے اس یونیورسٹی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں تمام مذاہب کو یکساں عزت کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ٹیگور نے وشوا بھارتی قائم کرکے عالمی برادری کے خیال کو اصلی صورت عطا کی جس میں تمام اہم فلسفوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی میں مشرق و مغرب کے اہم علما کو جمع کیا۔ غالباً یہ عالمی شہریت (WORLD CITIZEN SHIP) کی تشکیل میں پہلی ایماندارانہ کوشش تھی۔ اس طرح کے خیالات دوسرے علما اور فلسفیوں کے یہاں پہلے بھی تھے۔ گولڈ اسمتھ نے بہت قبل خود کو "پوری دنیا کا شہری" مانا تھا۔ لیکن یہ تقدم ٹیگور کو جاتا ہے، کہ انہوں نے اس یونیورسٹی کے طلبا کے ذریعہ اس اندازِ فکر پر زور دیا۔ اس کے تاریخ انسانیت میں وشوا بھارتی کا نام اور مقام ہمیشہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہے گا۔ اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مختلف نقطہائے نظر سے سچائی کی پرکھ تھی۔ اس کا اصل مقصد مشرق کی مختلف تہذیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان سے زیادہ مناسب جگہ اس کے لئے کون ہو سکتی تھی؟ ان تہذیبوں میں ویدک، بدھسٹ، سمٹک، زرتشی، ہندوازم اور اسلام سب ہی تھے۔ ان تہذیبوں کے سنگم کا تقابلی مطالعہ کرنا اور یہ بھی دیکھنا کہ ان تہذیبوں کے میل ملاپ سے مغربی تہذیبوں میں کیونکر ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

وسیع النظری

تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اگر طلبا میں وسیع النظری پیدا نہ ہو سکے۔ وشوا بھارتی نے ٹیگور کے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ ٹیگور کی اپنے طلبا کو نصیحت تھی کہ وہ اپنے دماغ کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھیں۔ انہوں نے لکھا کہ "کٹرپن (Fanaticisim) ذہن انسانی کی موت ہے۔ آدمی کو انسانیت کی وسیع تر سوسائٹی کا ممبر ہونا چاہیئے اور کبھی خود کو محدود رنگ، نسل، مذہب، ذات اور ریاست کے بارے میں نہ سوچنا چاہیئے۔

تعلیم سے متعلق اپنی بہت سی تقریروں اور تحریروں میں مثلاً سکشن ملن، سکشن بیر پھیر، اور سکشن باہس، وغیرہ میں ٹیگور نے اسکولوں میں پڑھائے جانے والے غیر دلچسپ اور بے مقصد مضامین کا ذکر کیا، جن کا طالب علم کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان سے ان کے دماغ بوجھل اور عقل کند ہو جاتی ہے۔ سکشن بیر پھیر میں وہ طلبا کو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دینے پر زور دیتے ہیں اور غیر ملکی زبان کی تعلیم کو مصنوعی قرار دیتے ہیں۔

گاندھی جی کی سودیشی تحریک اور عدم تعاون تحریک کے وقت تعلیم کو "ہندیانے" کی کوشش کی گئی تھی اہم اسکالرس، مصلحین، اور سیاسی رہنماؤں نے ایک نیشنل کونسل آف ایجوکیشن کی بنیاد ڈالی تھی جس کا مقصد ایک متوازن یونیورسٹی کا قیام تھا۔ ٹیگور کا خیال تھا کہ نیشنل یونیورسٹی کا قیام موجودہ یونیورسٹی کی نقل کے طور پر مفید نہیں ہوگا۔

سکشن اندلن کے دیباچہ میں انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اچانک تمام یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ دانشمندانہ عمل نہیں ہوگا۔ وہ نئے طریقہ تعلیم کے سلسلہ میں صبر اور دوستانہ جذبات کو سراہتے تھے۔ وہ وقتی ابال اور خاص طور سے موجودہ طریقِ تعلیم کے بائیکاٹ کے خلاف تھے۔ وہ انتہائی خاموشی سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ راجندر سندر تریدی کو ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ:

"اگر ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو تو بھی ہم

گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور،
مہاتما گاندھی
کے ہمراہ شانتی نکیتن میں۔

لوگوں کو اس میں شامل نہ ہونا چاہیئے۔ اور
اپنے کام میں خاموشی سے لگا رہنا چاہیئے"

یہ دراصل گاندھی جی کے فلسفہ عدم تعاون، اور سودیشی تحریک کے خلاف منفی رویّہ تھا اور یہیں گاندھی جی اور ٹیگور کے نقطہ نظر کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ ٹیگور چاہتے تھے کہ ظلم کا جواب بھی محبت سے دیا جائے۔ اسی لئے انہوں نے لکھا:

> "توڑ پھوڑ کر کے اپنے ہی ملک کو نقصان
> پہنچانے کے بجائے [illegible]

ایک پل

ہندوستان میں برطانوی طریق تعلیم کی بنیادی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ ماضی اور حال، جو شخص ان دونوں کو جوڑ دے گا ہم لوگوں کو بچا لے گا۔ اس پل کا کام کس نے کیا ہے؟ کیا وہ ٹیگور نہیں تھے۔ جنہوں نے دونوں کا حسین امتزاج پیش کیا اور اس میں سے بہتر کا انتخاب کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ نظری علم بے کار ہے اگر عملی زندگی میں اس پر عمل پیرا نہ ہوا جائے۔ اگر موجودہ یونیورسٹی کے تعلیمی نظام اور ملک کی ضروریات میں ہم آہنگی نہیں ہے تو تعلیم فضول ہے۔ اگر یونیورسٹی کا تعلیمی نظام حقیقت پر مبنی نہیں ہے خواہ وہ کسی قدر بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہمارے دل و دماغ اور خیالات کو مفلوج کر دے گا۔

دوسرا اہم نظریہ جو کہ ٹیگور نے پیش کیا یہ تھا کہ شہر اور دیہات کے لئے یکساں طریقہ تعلیم مفید نہیں ہے، ان کے

نزدیک تعلیم دیہی تعمیر نو (RURAL RECONSTRUCTION) کا اہم ذریعہ ہے۔ دیہی ترقی کے کسی کام میں سب سے زیادہ اہمیت [illegible] تعلیم کو ملنا چاہیئے لیکن یہ تعلیم دیہات اور شہر میں مختلف ہونا چاہیئے۔ بہت بعد میں رادھا کرشنن کمیشن نے بھی اس نکتہ پر زور دیا۔ یہ بات مشکور ہے کہ جلد یا بدیر ہم لوگ شاعر ٹیگور کے نقطۂ نظر سے قریب آرہے ہیں۔ سماجی تعلیم کے دیہی مراکز آج زیادہ تر اپنی ساری توجہ زراعتی تعلیم، اخلاق کی درستی، اور مقامی انتظامیہ پر مرکوز کرتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں کے سماجی و معاشی مسائل، ان کے میدانوں، کھیتوں اور بیج کی اقسام پر تحقیقی کام کیا جا رہا ہے۔

ٹیگور حقیقی معنوں میں تعلیمی میدان کے پیشرو تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ۴۰ سالوں میں وہ دیہاتی ماحول میں ایک سادہ ٹیچر کی زندگی گزارتے رہے۔ جب کہ ان کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہ تھی۔ انہوں نے اس عملی طریقہ تعلیم پر زور دیا۔ جس کے بارے میں ان سے پہلے کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ ان کے بعد لوگوں کو اس طریقہ تعلیم کی افادیت کا پتہ چلا۔ گاندھی جی کی وار دھا ایجوکیشن اسکیم جسے بنیادی تعلیم کا نام دیا گیا۔ اس نظریہ کا من وعن چربہ تھی۔ ہر چند کہ اس پر عملی طور سے آج تک کاربند نہیں ہوا جا سکا ہے۔ لیکن اس کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ ہماری حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کا انحصار بھی بیش از بیش اسی اصول پر مبنی ہے۔

ٹیگور کسی طرح ایک صوفی نہ تھے۔ وہ ایک روایتی ہندوستانی کوی تھے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان ایک رابطہ کار کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا نام ربی (سنسکرت روی) یعنی سورج کی روشنی کا آئینہ دار تھا۔ انہوں نے اپنے علم و عمل سے زمانے کو روشنی اور حرارت عطا کی۔ اپنے مادر وطن کی ذہنی و اخلاقی نشوونما کی۔ انہیں اس زمین سے بے پایاں محبت تھی۔ وہ ایک انسان تھے اور انسانی خصلتوں کا مرقع اور ہندوستانیوں سے محبت کرنے والے تھے۔ ساری انسانیت سے ان کا پیار وفا استوار تھا۔ اپنی ساری زندگی وہ سماجی مساوات (SOCIAL JUSTICE) کے لئے کوشاں رہے۔ جو پسماندہ اور مفلوک الحال ہوں ان کو عزت ملے، جو غریب ہوں ان کو اطمینان نصیب ہو۔ جو جاہل ہیں ان کو علم کی روشنی ملے شہریوں کو حکومت خود اختیاری ملے۔ بچوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے مواقع فراہم ہوں۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق ملیں۔ ان کا مذہب، مذہب انسانیت تھا۔ ان کو نفرت تھی۔ ان لوگوں سے جو دوسروں کا استحصال کرتے تھے، جو دوسروں پر ظلم کرتے تھے۔

ٹیگور سماج میں انسان کی انفرادیت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ فرد کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ وہ اس سلسلہ میں حکومت پر بہت زیادہ انحصار کے خلاف تھے۔ ان کا جماعتی ترقی (COMMUNITY DEVELOPMENT) کا پروگرام دو زریں اصولوں یعنی اپنی مدد آپ (SELF HELP) اور روشنی (ENLIGHTENMENT) پر منحصر تھا۔ یہی وہ احساس تھا جس نے ان کو اسکول کے ان دنوں کی یاد دلائی جس میں میکانکی طریقہ تعلیم یعنی رٹنا اور رٹ کر امتحان پاس کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اسی احساس نے بعد میں انہیں ایک ماہر تعلیم اور سماجی مصلح کا رول ادا کرنے پر مجبور کیا۔ کئی سالوں کے بعد جب وہ اپنے تعلیمی تجربات پر شانتی نکیتن میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک متوازی ادارہ قائم کیا جس کا نام "سری نکیتن" رکھا جو کہ منبع تھا جماعتی ترقی کے کاموں کا۔ انہوں نے سماجی خدمات کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ جس کا مقصد ایسے طلبا کی جماعت پیدا کرنا جو ہندوستان کی سماجی و معاشی فلاح کا کام کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک یہ ذہنیت نہیں بدلتی ہندوستان کے لوگوں پر جمود طاری رہے گا۔ وہ اس مسئلہ کو ہندوستانی تعلیم کی بنیاد بنا دینا چاہتے تھے۔ جس سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو۔ انہوں نے بار بار یاد دلایا

"اگر ایک شخص ایک چھوٹے سے
گاؤں کو سدھارنے اور وہاں کے لوگوں
کی غریبی دور کرنے میں اپنی زندگی گزار دے
تو سمجھو کہ اس سے اپنی زندگی بہترین طریقے سے
گزاری کیونکہ دیہاتوں کی ترقی سارے دیس

کی ترقی ہے "

سری نکیتن میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ اور دوسرے
میں مثلاً لکڑی کا سامان بنانا، کپڑا بننا، چمڑے کی چیزیں،
کے برتن بنانا بھی سکھایا جاتا ہے۔

سودیشی سماج

وسط ۱۹۰۴ء میں کلکتہ کی ایک میٹنگ میں جس کی
رت رومیش چندر دت کر رہے تھے۔ ٹیگور نے سودیشی
ماج پر ایک مقالہ پڑھا۔ اس مقالہ میں پہلی مرتبہ قومی لیڈروں
تجا کی گئی تھی کہ وہ لوگ اپنی ساری طاقت دیہی ہندوستان
ٓ میں لگائیں۔ انہوں نے لکھا کہ:

" ہندوستان کا دل تو دیہاتوں میں رہتا
ہے۔ وہاں دیہی مسائل ہی تو ہندوستان
کے مسائل ہیں۔ ہندوستان ترقی اس وقت
کرسکتا ہے۔ جبکہ ان علاقوں میں زندگی کی نئی
روح پھونکی جائے، ان میں تعلیم کا پرچار
ہو اور وہ اپنے مسائل سے آشنا ہوں، اور
ان کا حل وہ خود تلاش کرسکیں "

بعض لوگوں نے سودیشی سماج اسکیم کی
ید کی۔ کیونکہ یہ سیاسی سے زیادہ سماجی تھی اور اس میں
سماج کی ترقی اور سماج کے تعمیر نو کے اصولوں پر زیادہ زور
لیا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ گاندھی جی، ٹیگور کے اس
ا پر آئندہ سب سے پہلے عمل پیرا ہوئے۔

۱۸ء سے ۱۹۴۰ء تک ان کی فکر کا محور صرف ہندوستانی
ن ہے۔ انہوں نے ابتدا میں اپنی فیملی اسٹیٹ اور بعد میں
سری نکیتن میں لوگوں کی مدد کی۔ اسپتال اور اسکول
کئے۔ سڑکیں اور پانی کے ذخیرے بنوائے۔ کوآپریٹو سوسائٹی
بینک قائم کئے اور ایک طرح کی خود مختار حکومت — یا
بی راج قائم کیا۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ دیہات کے
ب عوام ان خون چوسنے والے ساہوکاروں اور ملاؤں سے

بچ سکیں۔ جن سے وہ قرض لے کر کام چلاتے تھے۔ وہ قابل قدر
رقم جو ان کو ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز میں ملی تھی۔ انہوں نے
ساری رقم شانتی نکیتن اور ایک زرعی امدادی بینک
قائم کرنے میں صرف کر دی۔ اس طرح سے انہوں نے ایک تیر
سے دو شکار کئے۔ ان کی سعی سے کسانوں کو اس زرعی امدادی
بینک سے برائے نام سود پر قرض ملنے لگا اور اسکول کی آمدنی کا
ایک مستقل ذریعۂ آمدنی بھی ہوگیا۔

ان کی کوشش تھی کہ کھیتی باڑی میں بہتر ذرائع کا
استعمال ہو۔ اچھے آلات و اوزار کی فراہمی ہو۔ اچھی کھاد اور
عمدہ بیجوں کا استعمال ہو۔ فاضل زمین کا بہتر استعمال ہو سکے —
فاضل مزدوروں کا مسئلہ حل ہو سکے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو
روکا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے خاص فصلوں کے علاوہ
ضمنی فصلوں کی زراعت پر زور دیا۔ صنعت و حرفت، و
دستکاری پر زور دیا تاکہ فاضل وقت میں وہ لوگ اس کام
میں لگ کر بہتر زندگی گزار سکیں۔

ٹیگور حقیقی معنوں میں ایک سماجی مصلح تھے۔ ان
کی اصلاح کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنی لاتعداد
نظموں، عوامی گیتوں، ڈراموں، کہانیوں، مضامین اور تصویروں
میں اپنے خیالات و جذبات عوام کے سامنے رکھے۔ وہ عوام کے
ادیب و شاعر تھے اور ان کی ترجمانی کا انہیں پورا حق تھا۔ لیکن
ٹیگور کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ جس طرح سے ہندوستان
کے کروڑوں عوام سے ان کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح
سے وہ ان سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ ان کو اس بات کا
اعتراف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" ادیبوں کو کسانوں سے مل جل کر انہیں سمجھنا چاہئے
میری طرح کوشش نہ کریں کہ ان کا قلم نہیں چل
سکتا۔ [illegible] سماج سے الگ رہ کر
اپنی [illegible] میں [illegible]
کی [illegible] ہے کہ [illegible]
ہے کہ [illegible] کر رہا ہوں۔ [illegible]
[illegible] سے محبت کرنا
چاہئے۔ اگر ادب [illegible] سے ہم آہنگ
نہ ہو [illegible] "

انہوں نے اپنی مشہور نظم

(SYMPHONY) یا (OIKATAN)

میں ایک طرح کا اعتراف کیا ہے کہ جس میں وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عوام سے بہت زیادہ قریب نہ آسکے لیکن وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ صرف ایک شاعر ہیں جو کہ عوام کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہیں۔ جس نے ان کی زندگی سے خود کو ہم آہنگ کر لیا ہے۔ ان کا ترجمان ہو سکتا ہے جو ٹیگور کی عالم انسانیت سے بے پناہ محبت کے اظہار کی پہلی جھلک (KODI O KOMAL) میں ملتی ہے، جہاں وہ اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اس خوبصورت دنیا کو چھوڑنا مناسب نہیں ہے یہی خیال ان کی نظم "مکتی" میں ملتا ہے جہاں وہ روحانی نجات حاصل کرنے سے زیادہ معمولی عورتوں اور مردوں کے درمیان رہنا پسند کرتا ہے۔ سونار تاری (THE GOLDEN BOAT) کی کچھ نظمیں دردرا (ایک نظم جو کہ مادر وطن کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے) مکتی (SOLVATION) مکتی (MOVEMENT)، وشوا ترتیہ وغیرہ میں وہ عالم انسانیت سے مکمل ہم آہنگی پاتے ہیں۔

(KATHO O KAHINI) کی بیشتر نظموں میں شاعر کی ہمدردی مظلوم اور کچلے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہے، بہت سی نظموں میں ذات پات کی برائیوں کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم نظم ناگر لکشمی ہے۔

گیتا نجلی (۱۹۱۰) میں وہ ان مظلوموں اور کچلے ہوئے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کا استحصال کیا گیا ہے "درواگ دیش" اس ضمن کی سب سے اہم نظم ہے جس میں وہ لوگوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ کوئی کسی کو کمتر اور حقیر نہ سمجھے اس نظم میں ذات پات کی لعنت پر افسوس کا اظہار ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

نظم "آتما شکتی" میں شاعر ذات پات کے سلسلہ کو مطعون کرتا ہے اور تعمیری کاموں پر زور دیتا ہے اور خالص سیاسی مفادات سے باز آنا چاہتا ہے۔

گیتا نجلی کے ایک حصہ میں ان قدامت پسند طاقتوں کو ہدف ملامت بناتے ہیں جو کہ بالخصوص ہندوؤں میں ذات پات کی تفریق، تنگ نظری و تعصب کی گفتگو کرتے ہیں ان کا اصرار ہے کہ ہندوستانیوں کو اس ناانصافی پر تاسف کا اظہار کرنا چاہیئے جو کہ انہوں نے اپنے یہاں پسماندہ طبقات کے ساتھ کی ہے۔ بعض لوگوں نے ٹیگور کی اس نظم کو ایمرسن کی اس لائن کے مقابل ٹھہرایا ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے۔

ٹیگور کے ڈراموں و کہانیوں میں بھی عوام کا احتجاج بتدریج شکل اختیار کرتا ہے۔ ان میں بیداری آہستہ آہستہ آئی ہے۔ ان کے ابتدائی ڈراموں میں عوام ڈرے سہمے ہیں وہ لوگ کمزور اور ناواقف ہیں لیکن آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں ناواقفیت کی جگہ شعور کی کارفرمائی ہے۔ ابتدائی ڈراموں میں ان کے عوام خاموش تماشائی ہیں لیکن بعد کے ڈراموں میں ان کا شعور بیدار ہے۔ وہ اپنے حقوق کو پہچاننے لگے ہیں۔ اپنے سماجی رتبہ سے وہ واقف ہو چلے ہیں SACRIFICE (۱۸۹۰) اور مالنی میں وہ لوگ توہم پرست اور ناواقف ہیں RED OLCANDER'S (۱۹۲۶ء) میں ہر چند کہ وہ اکثریت میں ہیں لیکن احتجاج کا حق نہیں ہے۔ مکتی دھارا (۱۹۲۲ء) میں وہ بغاوت کرتے ہیں لیکن قانون ہاتھ میں لینے کی ہمت نہیں کرتے۔ کیلر یاترا (۱۹۳۳) میں وہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ٹیگور نے سماج کے اس وقت کے رستے ہوئے ناسوروں یعنی جہیز کی رسم، بیواؤں کی شادی، بچپن کی شادی

ذات پات کی تفریق و تنگ نظری پر جی کھول کر لکھا ہے ۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے بنگالی رسائل جیسے آنند بازار پتریکا، سادھنا، بھارتی، بنگا درشن، سبج پتر، بچترا اور پرباشی وغیرہ میں بھی کیا ہے ۔

ٹیگور اس دنیا سے محبت کرتے تھے کیونکہ وہ انسان سے محبت کرتے تھے، ٹیگور انسان سے محبت کرتے تھے کیونکہ ان کو انسان کی انسانیت پر اعتماد تھا۔ وہ انسان کو اس لئے چاہتے تھے کہ انسان حسن مجسم ہے۔ ٹیگور حسن کو اس لئے پسند کرتے ہیں کیونکہ حسن میں سچائی ہے، اور ٹیگور سچائی کے رسیا تھے ۔

ٹیگور نے اپنے ادب سے ہندوستان کے عوام میں منور بیداری پھونکا ۔ دوسرے ہندوستانی رہنماؤں کی طرح انہوں نے بھی آزادی کا بیج بویا۔ یہ پودا بڑھ کر اب شجر سایہ دار ہو گیا ہے ۔ آج ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اس کو مستحکم سے مستحکم تر بنائیں ۔ ٹیگور کے خواب کی حسین تعبیر یہی ہوگی جب ہمارے درمیان جہالت، غربت، اور عدم مساوات دور ہوگی اور عوام کو وہ عزت مل سکے گی جس کے وہ مستحق ہیں اور جس کے لئے ٹیگور زندگی بھر کوشاں رہے

میں تیرے گیت گانے کو یہاں حاضر ہوں تیرے اس مندر کے
ایک کونے میں میرا استھان ہے تیری دنیا میں مجھے کوئی کام نہیں کرنا ہے
میرے بے کار جیون سے بے تانیں کبھی کبھی بے مطلب نکل سکتی ہیں ؛
آدھی رات کے اندھیرے مندر میں جب تیری اُپاسنا کا گھنٹہ بجے،
تب مجھے گانے کے لئے اپنے سامنے کھڑا ہونے کی آگیا پردان کرنا ؛
پربھات وایو میں جب سنہری بینا کا سُر ملایا جاتا ہے تب اپنی سیوا
میں حاضر ہونے کی آگیا دے کر میرا مان کرنا ؛

(گیتانجلی)

ظفر گورکھپوری
۶/۴۳/ایف نیو میونسپل کالونی دیونار بمبئی [illegible]

گُرُودیو

مرا ماتھا کشادہ آسماں
آنکھوں کے گہرے دائروں سے جھانکتے ساتوں سمندر
زمیں کی بانہہ سے حدِ افق تک، مرے تن کی صدیں پھیلی ہوئی ہیں.
یہی تو تم نے چاہا تھا.
مجھے پہچانتے ہو نا؟
وہی بچہ ہوں جس کی شرارت کرتی آنکھوں میں.
کبھی تم نے خدا کی شکل دیکھی تھی.
(تمہاری کلپنا نے جس کو چوما اور گیتوں نے دعا دی تھی.)
مجھے اب گھورتے کیا ہو؟
کسی دن کانچ کے اس فریم سے نکلو.
زمیں پر پاؤں رکھو
میرے اندر کی کالی بستیاں دیکھو
تمہاری خوبصورت، شانت، گیتانجلی زندہ کسی دیوار میں چن دی گئی ہے.
خدا کی شکل پیلی ہو گئی ہے.
مرا آسیب گیتوں کی دعا کو مار دے گا.
کوئی منتر پڑھو مجھ پر گرودیو ـ

مرا ماتھا
مری آنکھیں
مرا تن
نہیں میرے نہیں ہیں یہ
مجھے ان سب پہ شک ہے.
میں اپنے خوف کے اونچے بہت اونچے سے ٹیلے پہ کھڑا ہوں.
میرے اطراف بارودی سرنگیں ہیں.
میں چاہوں بھی تو شاید خودکشی سے بچ نہیں پاؤں.
مجھے یوں گھورتے کیا ہو؟
وہی بچہ ہوں جس کی شرارت کرتی آنکھوں میں
کبھی تم نے خدا کی شکل دیکھی تھی.
کوئی منتر پڑھو مجھ پر گرودیو ـ

★ ڈاکٹر جی۔ وی۔ دیویکر

رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈرامے

ڈراما یعنی "ناٹک"، سنسکرت ادب کی دین ہے۔ نظم و نثر کے خوبصورت ملاپ سے ادب کا ہر دلعزیز صیغہ پیدا کیا جاتا ہے۔ جس کو ڈراما یا "ناٹک"، کہا جاتا ہے۔

جہاں یونانی اور لاطینی ڈراموں کی وجہ سے یورپ کی سب ہی زبانوں میں ڈرامے پائے جاتے ہیں، وہیں ہندستان میں تقریباً دو ہزار سال سے ناٹک کی وِدھا (صیغہ) وجود میں آئی۔ اس کے بانی مہاکوی بھوشن تھے۔ جنہوں نے "سوپن واسودتا"، "اردبھنگ" وغیرہ ڈرامے لکھے۔ ناٹک کی ودھا (صیغہ) چوتھی صدی عیسوی میں عروج حاصل ہوا۔ جب راجہ بکرماجیت کے دربار کے ملک الشعراء مہاکوی کالی داس نے اپنے "شکنتلا" "بکرم اروشی"، وغیرہ ناٹکوں سے سنسکرت ادب کو علمی ادب کی صف میں لاکھڑا کیا۔ اس کے بعد بھوبھوتی وشاکھ دت اور راجہ ہرش بردھن نے اپنے "اتر رام چرت"، "مدرا راکشش"، "نیشیدھ چرت"، وغیرہ ناٹکوں سے مخزنِ ادب کو مالا مال کیا۔

دو شعر ست پس پیمبر انند ہر چند کہ لا نبی بعدی
بیت و قصیدہ و غزل ... فردوسی، مثنوی را رومی و غزلت سعدی

جس طرح فارسی ادب میں "غزل" کو ا... خصوصیت حاصل ہے اور اس کے اشعار اور اصول ہیں۔ بالکل اسی طرح سنسکرت ادب میں "بھرت" نے ناٹک کو ایک عظیم ادبی صیغہ (ساہتیہ ودھا) بنانے کی خاطر "بھرت ناٹیہ شاستر"، کو تصنیف کیا۔ ج... وہ سب اصول شامل ہیں جن کی پابندی ڈراموں کے اور اداکاروں کے لئے ضروری ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے ادب میں ڈراما

پچھلے کچھ ہزار سال سے سنسکرت ادب کا ... شروع ہوا اور اس کی جگہ بنگلہ، تامل، کنڑی، مرا... زبانوں میں اعلیٰ پایہ کا ادب نمودار ہونے لگا۔ ان ... ادیبوں کے نزدیک نصب العین یا بنیاد سنسکرت ... تھا۔ چنانچہ "راماین" کا "مہابھارت" اور دوسر... شاہکاروں کے علاوہ سنسکرت کے "شاکنتل"، ...

شش » چترت شکنتلا یا سی کی گاڑ (جس کی حال ہی
، "نسو" نامی فلم بنائی گئی ہے۔) ان زبانوں میں ان
کوں کے ترجمے ہوتے اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز
جب فورٹ ولیم کالج کی قیادت میں جدید ہندی اور اُردو
انوں کا ادب پھولا پھلا اور پروان چڑھا۔ اس میں بھی
رامے کو ممتاز حیثیت حاصل ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا درست
گا کرنی الحال ڈراموں کو جو ہردلعزیزی حاصل ہے اس کی
یاد آغا حشر کشمیری کے "یہودی کی بیٹی"، "میٹھا زہر"
غیرہ ڈراموں نے ڈالی ہے۔ جن کو بمبئی کے پارسی ناٹک
بنوں نے ہندوستان میں ہر جگہ پیش کیا، اور لوگوں میں ایک
ذوق پیدا کیا۔

بندرناتھ ٹیگور

تقریباً سوا سو سال قبل ایک مہذب، روشن خیال،
ر رئیس خاندان میں رابندرناتھ ٹیگور کا جنم ہوا۔
کے والد مہرشی دیبندرناتھ ٹیگور جدید ہندوستان کے
صلح اعظم راجہ رام موہن رائے کے پیروکار تھے۔ جنہوں
ے "براہمو سماج" نامی دھرم پنتھ قائم کیا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب محمد بن قاسم
ے سندھ میں عربی حکومت قائم کی تب سے ہندو مذہب
اسلام کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ ان دونوں میں بعض دفعہ
صادم بھی ہوا۔ وہیں مشہور سنتوں اور اولیاء کرام کی
وششوں سے عبادت کے نئے طریقے اور پنتھ وجود میں آئے
ن میں گرو نانک دیو کا "سکھ پنتھ" قابلِ ذکر ہے۔ بالکل
سی طرح جب سے بنگال میں ۱۷۵۷ء کے بعد سے انگریزی
کومت کی بنیاد پڑی تب سے انگریزی تہذیب اور عیسائی
ہب کو طاقت حاصل ہوئی۔ لارڈ میکالے اور گورنر جنرل
رڈ بینٹنگ نے انگریزی تعلیم رائج کی اور ان سب وجوہات
ی بناء پر ہندو دھرم اور سماج میں خامیاں محسوس کی جانے
گیں۔ اس رجحان کا نتیجہ تھا "برہمو سماج"

ٹیگور کا مذہبی، سماجی اور سیاسی پس منظر

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں انیسویں صدی کے
بنگال کے سماجی اور سیاسی حالات پر غور کرنا اس لئے
مفید ہوگا۔ کیونکہ انگریزی حکومت کا پایۂ تخت کلکتہ شہر
تھا اور قدرتی طور پر "ذہنی روشنی" بنگال سے ہی
نکل کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

مذہب کے تعلق سے لوگوں میں بیداری پیدا
ہوئی اور ستی، بیواؤں کا منڈن وغیرہ رسموں کو رد کرنے
کے لئے تحریکیں شروع ہوئیں۔ دوسری طرف انگریز
حکمران اور عیسائی پادری لوگ ہندوستانیوں کو خصوصاً
ہندوؤں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کی مخالفت
کا رجحان پیدا ہوا اور ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کے متعلق
تحقیق جاری ہوئی۔ اسی طرح دقیانوسیت پر بھی حملے ہونے
لگے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے برٹش راج کا دبدبہ محسوس
کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف بغاوت کے آثار بھی رونما
ہونے لگے تھے جیسے بنکم چیٹرجی کے "آنند مٹھ" سے
ظاہر ہوتا ہے۔

ٹیگور کا کلام

ٹیگور بہ حیثیت شاعر بہت مشہور ہیں
اُن کی نظم "گیتانجلی" کو ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز سے
نوازا گیا۔ تب سے ٹیگور ہندوستان کے شاعرِ اعظم بن
جاتے ہیں۔

ٹیگور کے ڈرامے

رابندرناتھ ٹیگور نے جو ڈرامے لکھے ہیں ان کا موضوعات
کے لحاظ سے دائرہ نہایت وسیع ہے۔ مہابھارت،
پرانوں اور تاریخی واقعات پر مبنی ڈراموں میں ہندوستانی
تہذیب اور ہندوستانیوں کی اخلاقی قدروں کی بھرپور ترجمانی
کی گئی ہے۔ اس کا ایک نہایت مختصر ڈرامہ ہے "کرن اور
کنتی"۔ یہ حکایت مہابھارت سے ماخوذ ہے۔ مہابھارت
میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے بھگوان کرشن
کو۔ ان کے بعد ارجن کو جو اپنی شجاعت میں لاثانی تصور
کیا جاتا تھا۔ مگر ایک بہادر ضرور تھا جو انفرادی طور پر
ارجن سے بے شک زیادہ قابلیت اور سخاوت جیسی

صفات کا مالک تھا۔ وہ بھگوان سورج دیو (آفتاب) کا بڑا بھاگ تھا۔ جس نے اسے زرہ بکتر (کوچ) اور کان کے نگینہ (کنڈل) کا تحفہ عطا کیا تھا۔ جس کی رو سے وہ ہر طاقتور دشمن پر فتح حاصل کرتا تھا۔ اس میں ایک کمزوری تھی۔ کوئی برہمن یا گداگر اس سے جو کچھ مانگتا اسے وہ فوراً نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دے ڈالتا۔ ارجن کنتی اور پانڈو راجا کا بیٹا تھا اور شتریہ (جنگجو یعنی اونچے طبقے یا جماعت میں پیدا ہوا تھا۔ کرن کنتی کا ہی بیٹا تھا۔

مگر وہ اس کی شادی سے پہلے سورج دیو کے ستر ویں حصے کی طاقت سے پیدا ہوا تھا۔ کنتی نے اپنی لاج رکھنے کی جدوجہد میں اسے گنگا کنارے تیرتا چھوڑ دیا تھا۔ ایک ملاح اور اس کی بیوی رادھا نے اس کی پرورش کی تھی۔ جلد ہی اس بچے کی بہادری کے جوہر رنگ لائے۔ شہزادہ دیورودھن نے اس کو اپنا مصاحب بنالیا اور انگ دیس مشرقی ہند کا راجا بنالیا: حالانکہ شودر (نیچی ذات) کا ہونے کی وجہ سے وہ راجہ بننے کے اختیار سے محروم تھا۔

کرشن جی کی کنتی کو صلاح

مہابھارت کی لڑائی میں بھیشم جی اور درون اچاریہ کی شہادت کے بعد کرن سپہ سالار جنگ مقرر ہوا گیا۔ حالانکہ ارجن کچھ کم بہادر نہیں تھا پھر بھی کرن کے زرہ بکتر اور کان کے نگینوں کی طاقت سے اور اس کے پاس ایک خاص استر (تیر) تھا۔ اس کے بل بوتے پر اس برتری میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس سے ارجن کی حفاظت ایک پیچیدہ سوال بن گئی۔ کرشن جی نے برہمن کا سوانگ بھر کر اس سے کوچ کنڈل مانگ لیے۔ مگر اس کے بھیانک استر یا تیر کا خوف اپنی جگہ قائم رہا۔ کرشن جی نے کنتی کو صلاح دی کہ وہ خفیہ طور پر رات کے اندھیرے میں کرن کے خیمے میں داخل ہو کر اس پر اس کی پیدائش کا راز ظاہر کر دے۔ اور اس کو یقین دلائے کہ وہ پانڈوؤں یعنی یودھشٹر یا دھرم راج بھیم۔ ارجن۔ نکل اور سہدیو کی طرح کرن بھی اس کا اپنا نہایت پیارا بیٹا ہے۔ اس لیے وہ دیورودھن یا کوروؤں کی بجائے پانڈوؤں کی فوج کا سپہ سالار بنے تو وہ زیادہ مناسب ہوگا۔ حالانکہ کنتی نے پہلے کبھی کرن کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ بلکہ کوروؤں کا دوست ہونے کی وجہ سے اسے نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھتی رہی۔ اب ارجن کو بچانے کی مصلحت سے وہ کرن کے خیمے میں پہنچی۔ کرن کو تعجب ہوا کہ راج ماتا کنتی پر اسرار انداز سے کیوں آئی ہوگی؟ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ خود غرضی سے اپنے کو لالچ دے۔ اپنے پیارے دوست اور کرم فرما دیورودھن کو دغا دینے پر آمادہ کر رہی ہے تو اس کے خلاف سخت نفرت کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا ایک طرف اسے اس بات کی خوشی ہوئی کہ آخرکار اس کی اصلی ماں نے اسے اپنا بیٹا مان ہی لیا۔ مگر دوسری طرف وہ بے حد ناراض اس لیے ہوا تھا۔ کنتی نے اپنی جو ممتا جتائی اس کی جڑیں ارجن کو فتح یاب بنانے کی خود غرضانہ مصلحت تھی تاہم اس نے اپنی روایتی سخاوت سے باز نہ آتے ہوئے اس کو یقین دلایا کہ ارجن کو چھوڑ کر کسی اور پانڈوؤں سے لڑے گا۔

اس ڈرامے میں ٹیگور نے کرن کے کردار کے ذریعہ ان کو مہاویر کی مثال پیش کی ہے۔ جو خود اپنی ماں اور سماج کی جانب سے مسلسل ناانصافی اور توہین کا شکار بنا رہا مگر کبھی ان کے خلاف انتقام کے جذبے کو دل میں آنے نہیں دیا بلکہ جب بھی ان کے دشمنوں نے ان سے دان مانگا تو ہمیشہ دیتا ہی رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے دوست، کرم فرما" دیورودھن سے کبھی دغا نہیں کی۔

مالتی۔ بودھ مذہب

رابندرناتھ نے اپنے ادبی کارناموں کے ذریعہ سے متعدد تحریکات کو فروغ دیا۔ جن میں سماج سدھار دیش بھگتی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی اپنی قدیم اور عظیم الشان تاریخ اور خاص طور سے بدھ مذہب کے بانی سدھارتھ یا گوتم بدھ کے بدھ مذہب کے متعلق احساس پیدا کیا۔ جنہوں نے انسانی مساوات کے اصول کی بناء پر ایک زبردست تنظیم قائم کی تھی اور ان کے پیروکار نہ صرف ہندوستان

رابندرناتھ ٹیگور اپنے ایک ڈرامہ کی ہدایت کاری کے دوران

یورپ و ایشیا میں اپنے گرو کا پیغام پہنچاتے رہے جب
انیوں نے مغربی ایشیا پر اقتدار حاصل کیا اور ہندستان
پر بھی حملہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں سے
دھ مذہب کا بول بالا بن چکا تھا۔ اشوک راجا نے
ایک مکمل تبلیغی تنظیم قائم کی اور ایشیا کے ہر ملک میں
اپنے سفیر بھیجے۔ اس کے نتیجے میں اس کا اولین مقابلہ
ہندوستان کی قدیم ویدہند دھانی سے شروع ہوا۔ یہ
صرف سیاسی دائرے میں محدود نہیں تھا بلکہ درشن شاستر
یعنی فلسفے کے علاقے میں بھی جاری رہا۔

بودھ مذہب نے جس مساواتی نقطہ نظر
اور روشن خیالی کا پرچار کیا تھا اس سے نوجوانوں میں اپنے
یعنی ہندو مذہب کی خامیوں کے متعلق احساس پیدا کیا تھا
اور ان کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کو دور کرنے کی بجائے بودھ
دھرم کو قبول کرنا زیادہ سود مند تھا۔ ایسے ہی نوجوانوں میں
ایک بھی مالتی جو ایک راجا کی بیٹی تھی۔ وہ ہمیشہ
بدھ بھکشو یا سنیاسیوں سے واسطہ رکھتی تھی۔ اس
لیے راجا کو اس کے مستقبل کے بارے میں تردد محسوس ہونے
لگا۔ اسی وقت برہمنوں نے بھی اس کو محل سے خارج کرنے
کے لیے مانگ کی اور مالتی بھی اس کے لیے تیار تھی۔ دو اور
نوجوان تھے جن میں ایک تھا لیبر؟ ایک کا نام تھا سوپریا،
جو بدھ مت کی حمایت کرتا تھا۔ مگر راج کماری مالتی کو چاہتا
تھا۔ دوسرا نوجوان تھا جو لگن کا پکا تھا اور دل و جان سے
بودھ دھرم کی تبلیغ میں مصروف تھا اور جب راجا نے
مالتی کو محل سے خارج کرنے کا سوچا تو برہمنوں نے بھی —
جنہوں نے اس کی مانگ کی تھی۔ اس کی سخت مخالفت
کی اور وہ مالتی کو دیوی سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ —
نوجوانوں میں سوائے کھیم کار کے جو کٹر برہمن تھا۔ بدھ مذہب کے تعلق سے
جوش دم پڑ گیا اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے
مالتی اور سوپریا کی شادی کا انتظام کیا جائے۔

چنانچہ ایک طرف سے اس کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور دوسری طرف
کھیم کار کو موت کی سزا سنائی گئی۔ اس کو قید کر کے زندان میں رکھا گیا تھا
اس کے دوست جن میں سوپریا بھی ایک تھا اس سے ملنے گئے اور وہاں

بات کے خواہشمند ہے اسی طرح ملک کا ریدھ مت (بدھ مذہب) بنسر از چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بخشی ہو سکے۔ قیدی نے اس سے صاف انکار کیا آخر میں جب اس کی سزائے موت پر عمل درآمد کا دن آیا تو اس کو بہت سامنے لاکر کھڑا کیا گیا جب حسب معمول اس کی آخری تمنا پوچھی گئی تو اس نے اپنے دوست سوپریا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب دوست ایک دوسرے سے ملے تو مکی کار نے سوپریا پر ہتھیار کا وار کرکے اس کو جان سے مار ڈالا۔

ٹیگور نے اس ڈرامے کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ دین اور ایمان کے تعلق سے دیندار آدمی اپنے رشتہ داروں اور رفیقوں کی خاطر اپنے ایمان میں ڈھیل نہ آنے دے۔ گو سمجھوتہ ایک اچھا طرز عمل ہے۔ اس کو دنیا داری کے معاملوں تک محدود رکھا جائے اور دین کے معاملوں میں اس کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔

سیاست یا راج دھرم ڈراما راجہ اور رانی دنیا بھر میں ہزاروں سال سے بڑے قابل اور طاقتور اشخاص حکمراں، راجہ، سمراٹ، چکرورتی سلطان اور ناموں سے چھوٹے یا بڑے رقبوں پر اپنا اقتدار جتاتے آئے ہیں۔ شروع شروع میں راجا بننے کے لیے لڑائی میں فتح حاصل کرنا کافی تھا۔ مگر جوں ہی فاتحوں کے خاندان بننے لگے اور کاروبار میں باہداری قائم ہوئی تو راج پاٹ ایک انسٹی ٹیوشن یا ادارہ بنا اور راجا اور پرجا یا حاکم، اور محکوم کے فرائض مقرر ہوئے اور ملکوں کے دستور کی ٹھوس صورت اختیار کرنے لگے۔ قدیم دنیا کے ہر ملک کی طرح ہندوستان میں بھی راجا اور پرجا کے فرائض بیان کرنے کی کوشش کی جاتی رہی تھی۔ ان میں سب سے پرانی کتاب ہے "کوٹلیہ ارتھ شاستر" جس کے مصنف تھے آریہ چانکیہ جو خود موریا سمراٹ چندرگپت کے وزیر اعظم تھے۔ یہی بات کالی داس کے رگھوونش میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں رامچندر جی کے خاندان رگھوونش کے راجاؤں یعنی راجا دلیپ، اج، رگھو، دشرتھ اور خود راجہ رام چندر جی کے راج دھرم کے اصول دیئے گئے ہیں۔

"प्रजानां विनयाधानात्
रक्षणात् पोषणात् वा
स पिता — पितरः तेषाम्
केवलं जन्म हेतवः"
रघुवंश 35. 2.

یعنی پرجا کی تعلیم روزی روٹی اور حفاظت کرنے والا راجہ ہی پرجا کا باپ کہلانے کا مستحق ہے اور ان کے اصلی باپ انہیں پیدا ہونے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی تعلیم کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ راجہ بھیس بدل کر عوام کے مصائب اور ان کی پریشانیوں سے واقف ہوں اور ان کے حل کرنے کی مناسب تدبیر کرے۔

خود رام چندر جی نے جب اپنے بارے میں پرجا کے خیالات جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا پرجا لوگ رام چندر جی کے بارے میں تو نہایت خوش ہیں۔ مگر کسی دھوبی نے سیتا جی کی پاک دامنی کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ رام چندر جی خود تو سیتا کو اگنی پریکشا لے کر سیتا کی پاکدامنی کو پرکھ چکے تھے مگر ان کے نزدیک پرجا کی رائے ان کی اپنی رائے سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ انہوں نے فوراً رانی سیتا کو اجودھیا کے راج سے خارج کروا دیا۔ جب بزرگوں نے رام کی اس حرکت کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تو انہوں نے کہا ––

"میری تخت نشینی سے پہلے میں سیتا کا پتی تھا۔ مگر جب میں راجا راج بنا تو رعایا کی رائے کے مقابلے میں سیتا کے متعلق میری ذاتی رائے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔"

کچھ اسی انداز میں ٹیگور نے اپنے ڈرامے "راجہ اور رانی" میں راجہ، رانی، رعایا وغیرہ کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے۔

راجہ برداشت ہی نہیں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ رانی سمجھتی ہے کہ راجا، رعایا کی بہبودی سے زیادہ اپنی ازدواجی زندگی میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس لئے وہ سوچتی ہے کہ وہ صرف راجہ کی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ بذاتِ خود ملک کی حکمران بھی ہے۔ چنانچہ راج پاٹ کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس لئے وہ راجا کے عاشقی کے مطالبات کو نظر انداز کرکے راجہ سے دُور رہنا چاہتی ہے بلکہ وہ راجہ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اسے تیاگ دے۔ راجہ ہجر برداشت نہیں کر سکتا اس لئے وہ گڑگڑا کر روتا ہے اور اسے محل سے باہر جانے سے روکنا چاہتا ہے لیکن رانی کچھ نہیں سنتی ہے اور وہ محل سے چلی جاتی ہے۔ راجہ بہت خفا ہوتا ہے۔ رانی کا بھائی کشمیر کا راجہ ہے اور وہ راجہ کی عیش پرستی کی وجہ سے پیدا شدہ اندھیر نگری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ راجہ کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے وہ بھی ایک بڑی فوج لے کر ان کے بھائی کی فوج پر حملہ آور ہوتا ہے۔ راجہ کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ کشمیر کا راجہ اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں پناہ لیتا ہے۔ راجہ رانی کی یاد میں بہت بے چین ہے مگر وہ "راج دھرم" کو محبت پر ترجیح دیتے ہوئے کشمیر پر قبضہ جمانے کی ٹھان لیتا ہے۔

اس دوران میں اس کی ایک دوشیزہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کے دل میں محبت کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ مگر جوں ہی اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ دوشیزہ کشمیر کے راجہ کی دل و جان سے محبت کرتی ہے تو اس کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ کشمیر کے راجہ سے اس کا بیاہ کرا دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس دوران راجہ کا مشیر خاص یعنی اس کا دوست برہمن کشمیر کے راجہ کو بخش دینے اور رانی کو کھو دینے کی صلاح دیتا ہے۔ مگر راجہ اپنے دوست کی پیش کش رد کر دیتا ہے، اور یہ شرط رکھتا ہے کہ کشمیر کا راجہ اس سے معافی مانگے تو اسے بخشنے کے لئے تیار ہے۔ تب ہی اسے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کا راجہ معافی مانگنے اور ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ راجہ نے دیکھا کہ دور سے لوگوں کا ہجوم ایک ڈولی لے کر اس کی طرف چلا آرہا ہے۔ اسے لگا کہ شاید صلح کے لئے کاغذات لیکر کوئی آرہا ہے۔ جب ڈولی راجہ کے سامنے اتاری گئی اور راجہ قاصد سے ملنے کے لئے آگے بڑھا تب ہی ڈولی کا دروازہ کھلا تو اس نے دیکھا کہ اس ڈولی سے رانی اتری، اور ان کے ہاتھ میں ایک طشتری ہے اور اس طشتری میں کشمیر کے راجہ کا سر سجا ہوا ہے۔ راجہ سمجھ گیا کہ رانی نے اپنے فرض کو نبھانے کے لئے خود اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اسی طرح ٹیگور کے متعدد ڈرامے ہیں۔ یہ ڈرامے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ "مکت دھارا" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

آج کل ٹیگور کے ناولوں کو ڈراموں کا روپ دے کر اسٹیج کیا جاتا ہے۔

"اُپہار" اور "چارولتا" ٹیگور کی قابلِ قدر تخلیقات ہیں۔ ان پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ان میں سماجی زندگی میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کا حل کھوجنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہ حیثیت ڈراما نویس کے ٹیگور کہتے ہیں:

"— وہ اخلاقی قدروں اور انسان کے دائمی مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑے ذمہ دارانہ طریقے سے پیچیدہ مسائل کے حل پیش کرتے ہیں۔"

"ماتا! میں اپنے غم کے آنسوؤں سے تیرے گلے کے لئے موتیوں کا ہار تیار کروں گا۔ ستاروں نے اپنے نورانی پازیب تیرے پاؤں کی زیبائش کے لئے تیار کئے ہیں۔ مگر میرا ہار تیری چھاتی پر لٹکے گا۔

دولت اور شہرت کا منبع تو ہے اور اس کا دینا اور نہ دینا بھی تیرے اختیار میں ہے۔ مگر میرا یہ غم واحد میری ملکیت ہے۔ اور جب میں اسے تیرے پر چڑھانے کے لئے آتا ہوں۔ تو تو مجھے اپنی مہربانی کا انعام بخشتا ہے۔"

(گیتانجلی)

• [illegible]
[illegible]، حمایت نگر، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

قومی یکجہتی اور ٹیگور

ٹیگور کا ترانہ "جن گن من" جو آج ہندوستان کا قومی ترانہ اور ہماری عظمت اور قومی یکجہتی کا نشان بن چکا ہے۔ اس موضوع کے تحت شاعر کے خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔ ٹیگور نے اس ترانے میں جس قومی یکجہتی کا پیام دیا ہے وہ ہندوستان کی عظمتِ دیرینہ کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح شیکسپیئر کے ڈراموں کا ماخذ انگلستان یونان اور روم کی قدیم تاریخیں ہیں یا پھر ملٹن کے شعری ادراک میں عیسائیت ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح سے ٹیگور نے اس ترانے میں ویدوں پرانوں اور اپنشدوں سے اکتساب کرکے قومی یکجہتی کے شعور کو جو ضیاء بخشی ہے اور روشنی کا جو چراغ جلایا ہے وہ پورے دنیائے ادب کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے رہا ہے۔

ٹیگور کے پورے ادب کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے [illegible] ویدوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر امن اور آشتی کے گیت گائے ہیں اور دنیا کو "گیتا نجلی" کی شکل میں [illegible] کا سندیش دیا ہے جس میں آفاقیت بھی ہے اور روحانیت بھی ..... لیکن ٹیگور کی یہ آفاقیت اور روحانیت امنسا کے دھندلکوں میں انسانیت کے دامن کو نہیں چھوڑتی بلکہ اس کے تابناک مستقبل کا پیام دیتی ہے۔ اس وقت ہم تاریخ انسانی کے ایک بڑے تخلیقی دَور سے گزر رہے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں رائج الوقت معاشی نظام اس عہد کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی غور و فکر پر گہرے اثرات ڈال رہے ہیں۔ یہ اثرات اتنے دور رس ہیں کہ فوری طور پر ان سے نجات حاصل کرنا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ سیاسیات میں کوئی بھی صاف اور سادہ سلیٹ سے کام کا آغاز نہیں کرتا بلکہ کام کا آغاز ان واقعات سے کرنا پڑتا ہے جو تاریخ سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ٹھیک یہی حال اس وقت تھا جبکہ ٹیگور کا سیاسی شعور پروان چڑھ رہا تھا یہ وہ

[illegible]

زمانہ تھا جبکہ ہندوستان کی قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے قومی اتحاد کی بنیاد کو ڈانواڈول کر دیا تھا نیز ہندوستان کی وحدت چکنا چور ہو گئی تھی اور قومی یکجہتی کا شعور اپنی منزل کی تلاش میں بکھرا ہوا۔ تاریخ کے اوراق کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا تاکہ وہ قومی بیداری کی نئی راہ پر گامزن ہو سکے۔ میں اس بات پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستان کی تاریخ تغیر اور انقلاب کا زبردست منظر پیش کرتی ہے اور ان قدروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ماضی سے رشتہ رکھنے کے باوجود تقریباً بالکل نئی ہیں۔ ٹیگور کے تخلیقی ذہن کے لئے ان واقعات نے ایک پس منظر کا کام کیا اور وہ ایک نئی سوجھ بوجھ کے ساتھ میدان میں آئے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ دلی لٹ چکی تھی، اور شعر و شاعری کی محفلوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور ادب کے قدردان برائے نام باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے ٹیگور نے اپنے آپ کو زمانے کے ہاتھوں نہیں بیچا۔ جہاں انہوں نے خواص سے بھی رسمی تعلق رکھا تو دوسری طرف عوام سے بھی رشتہ بنائے رکھا۔ اور ویدانتک فلاسفی کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا کر صلح و آشتی کا پیام دیا جس میں ایک طرف روحانیت ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی بھائی چارہ کا جذبہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی ادب میں قومی یکجہتی کے شعور کو نیا موڑ ملا اور انہوں نے شاعری ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ کیونکہ ادب میں شاعری ہی سب سے زیادہ مرکب ترقی یافتہ اور نازک ترین فن ہے" اور ٹیگور کی مکمل شخصیت کا پَرتو ہمیں اُن کی شاعری ہی میں ملتا ہے جو اس زمانے کے داخلی اور خارجی حالات و واقعات کے اقدار کا سنگم بن جاتی ہے۔ جس میں "رقص و وجد بھی ہے۔ فن تعمیر کا حسن بھی اور موسیقی اور مصوری کے جلوے بھی۔ اس لئے کہ شاعری کو کامل فنی نمونہ بنانا فنکار کی شخصیت و انفرادیت اس کے جذبات کے گداز اس کے تخیل کی پرواز اس کے ادراک کے توازن اس کے نفیس داخلی ذوق اس کی سلجھی ہوئی قوت انتخاب اس کی صلاحیت ترکیب و تعمیر اور اس کے ہنرمند مشق کش پر منحصر ہے" اور ان تمام باتوں میں ٹیگور کو ماہرانہ چابک دستی حاصل تھی۔ اسی بنا پر ہم "ٹیگور کے فن شاعری کی جانچ صرف عروض کے اوزان اور پیمانوں سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے پختہ سیاسی اور سماجی شعور درکار ہے" جس کے بغیر ہم اس شاعرانہ لذت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے جو ٹیگور کی شاعری کا حصہ ہے۔

ادبیات میں جب قومی یکجہتی اور وحدت کا ذکر آتا ہے تو اس کی نوعیت بھی فلسفیانہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر ادیب ایسے اہم تصورات کا ذکر کرتے وقت کسی نہ کسی فلسفہ کی پناہ لیتا ہے اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ ادیب کا تعلق جس طبقے زمانے اور ماحول سے ہوتا ہے اس کی صدائے بازگشت اس کی تخلیقات میں گونجتی رہتی ہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان میں اس کی دو بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ ایک طرف گرودیو ٹیگور ہیں، تو دوسری طرف علامہ اقبال اور یہ دونوں ہندوستان کی ادبی تاریخ کے اتنے بڑے ستون ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ادیب اور شاعر ان دونوں کے مختلف النوع فلسفیانہ خیالات سے دامن نہیں بچا سکے۔ بظاہر یہ دونوں شاعر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں لیکن گہری نظر سے ان دونوں کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کی شاعری کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملتے ہیں جہاں یہ دونوں ایک نظر آتے ہیں۔ اقبال نجات کے حصول کا وسیلہ مردِ مومن کو قرار دیتے ہیں اور ان کی شاعری اسلامی تعلیمات و اقدار کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف بھگوت گیتا کے کامل انسان کے جلوہ آرائیاں ہمیں نظر آتی ہے۔ مگر اس بنیادی تصورِ حیات کی یکسانیت کے باوجود ٹیگور کے ادب میں قومی یکجہتی کا جو انوکھا تصور ہمیں ملتا ہے وہ اقبال کے سیاسی عقائد سے میل نہیں کھاتا۔ اسی لئے ٹیگور کے ادب میں قومی یکجہتی کے تصور کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے ذہن اور نفسیات کا جائزہ لیں اور اس ماحول کو بھی اپنے پیش نظر رکھیں جس میں ٹیگور نے پرورش پائی تھی۔ جن صوفیانہ روایات، اور ماحول نے ٹیگور کے ذہن کو سہارا دے کر پروان چڑھایا تھا اس میں اس انفرادیت کا کوئی مقام نہیں تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ جس میں شخصی آزادی

کا تصور عقائد اور مسابقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے یہی وہ نقطہ ہے جس کو سمجھے بغیر ہم ٹیگور اور ان کے فلسفیانہ خیالات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیت ایک پورے دور پر حاوی ہے۔ جو ماضی کے عقائد سے رشتہ توڑے بغیر نئے رجحانات کو اپناتی ہے، اور قوموں کی وحدت کا ایک ایسا تصور پیش کرتی ہے جو زرعی نظام کے پیدا کردہ مشترکہ خاندان کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح کوئی عہد لوٹ کر نہیں آسکتا۔ اس طرح سے کوئی ادبی دور بھی دوبارہ جنم نہیں لے سکتا۔ اس لئے آج کے صنعتی دور میں کوئی ادیب یا شاعر پورے طور پر ٹیگور کی پیروی کرنے کی کوشش کرے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ٹیگور کے زمانے کا ماحول آج کے ماحول سے بالکل جدا ہے۔ جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے مقابل آتا ہے۔ ایک جماعت دوسری جماعت سے ٹکر لیتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ ٹکراؤ مفاد اور مذاہب کے تصادم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس کی تہہ میں معاشی ناآسودگی اور استحصال کارفرما نظر آتا ہے اور جب تک اس تضاد کو دور نہ کیا جائے قومی یکجہتی کا تصور بہت ہی دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم اس پس منظر میں ٹیگور کے ادب اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ لیں تو پیران کے فلسفیانہ خیالات کی ایک واضح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس میں قومی یکجہتی کا جو پیام ان کی بین الاقوامیت کی روح میں پوشیدہ ہے۔ اس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندوستانی عوام نے عدم تشدد اور اپنے مخالف کو اپنا ہمنوا بنا لینے کی جس بات پر زور دیا تھا اس کی تہ میں بھی ٹیگور کی وطن دوستی اور ان کی بین الاقوامیت کا بڑا دخل ہے۔ اس نظریہ کے مابعد الطبیعاتی پہلو سے قطع نظر بھی کر لیا جائے۔ تب بھی اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد اور ٹیگور کی بین الاقوامیت کے تصورات نے ملک میں ایک قومی جذبہ اندرونی خانہ جنگیوں کے خلاف اور ہندوستان کے مختلف گروہوں میں یگانگت کی ایک فضا پیدا کر دی تھی۔ یہی وہ عناصر ہیں جو ہندوستان کی قومی یکجہتی کو باقی رکھتے ہیں۔ میں نے اس بات کا ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری سمجھا کہ جب ترک موالات کی تحریک نے عدم تشدد کے مسلک سے ہٹ کر تشدد کا روپ دھار لیا تھا تب ٹیگور نے اس کو پسند نہیں کیا تھا اور گاندھی جی کو خط لکھ کر اس جانب توجہ دلائی تھی کہ ان کی تحریک اپنے مسلک سے ہٹ رہی ہے۔ جس کی وجہ سے بین الاقوامیت کو دھکا پہنچنے کا احتمال ہے جس کے ساتھ ہندوستان کی قومی یکجہتی اور وحدت کا دامن بندھا ہوا ہے۔ ٹیگور نے اس موقع پر اس بات کی بھی نصیحت کی تھی کہ ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے سینے کو عقل کی دولت سے ہمیشہ مالامال رکھیں تاکہ ایک نئے عہد اور شاندار مستقبل کی تعمیر میں مدد مل سکے۔

ان خیالات سے ٹیگور کی شاعرانہ عظمت اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے اور ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب سیاسی اعتبار سے ہمارا ملک غلام تھا۔ اس فضا میں بھی شاعر اعظم نے نہ صرف اپنے پاکیزہ بلند اور حسین تخیل کے چراغ کو روشن رکھا اور ہندوستانیوں کے دلوں کو دردمندی بخشی، اور لازوال رومانی اور ذہنی سرور و کیف کا سامان مہیا کیا تاکہ ہم اپنی قومی یکجہتی کے سہارے غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

انہوں نے اپنی شاعرانہ نغموں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو ایک حیرت انگیز جذبہ حب الوطنی عطا کیا جس میں انسان کو ہر طریقے اور ہر نہج سے اوپر اٹھانے بلند روحانی عظمتوں کو حاصل کرنے اور متحرک اجتماعی زندگی کی تعمیر اور جستجو کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو مان سرور کی نیلی جھیل کی طرح صاف و شفاف اور گنگا کے نرمل جل کی طرح شانت ہے۔ جس میں ہماری اجتماعی زندگی کے رنگین نقوش بھی سموئے ہوئے ہیں اور جن میں حریت پسندوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں اور یہ دھڑکنیں ایک بھرپور زندگی کی جانب نشاندہی کرتی ہیں اور مسرت کے احساس سے ایک جذبہ کو ابھارتی ہیں اور زندگی کے بے رنگی اس کے سپاٹ پن اور ناہمواری کو اپنی رنگین نورانی نغمگی حقیقت بینی اور خیال آرائی سے ختم کر دیتی ہیں تاکہ انسانوں میں بھائی چارہ کا جذبہ پیدا ہو اور حیات بخش عرفانی شعاعوں کی بارش سے تازہ دم ہو کر اپنے اس فرض کو پورا کریں جو انسانیت کا شیوہ ہے۔

— —

قومی راج

معزو فیاض خان

ٹیگور کی تخلیقات سیلولائیڈ پر
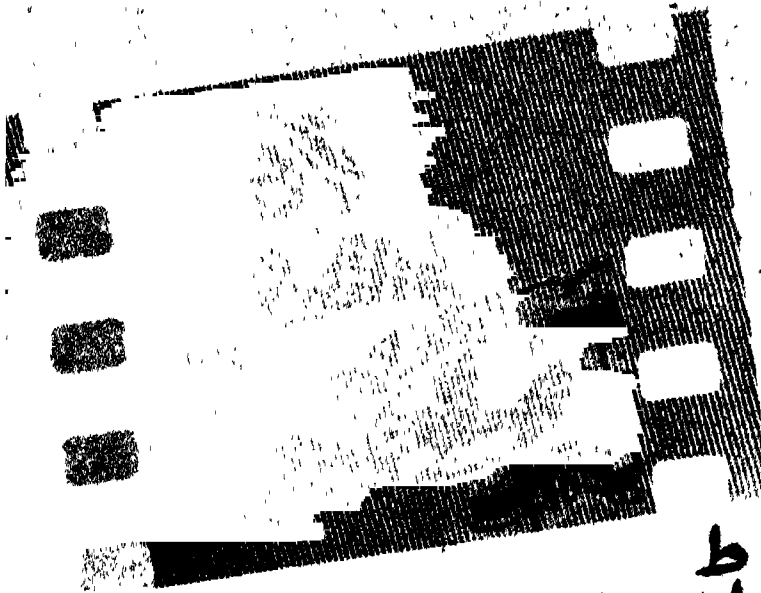
رابندر ناتھ ٹیگور ایشیا کے واحد شاعر ہیں جنھیں "نوبل پرائز" ملا۔ اس کے علاوہ واحد مصنف بھی ہیں جن کی تخلیقات پر تقریباً دو سو فلمیں مختلف زبانوں میں سیلولائیڈ پر پیش کی جا چکی ہیں۔ فلم انڈسٹری کی ابتدا سے ہی ٹیگور کی کہانیوں اور ناولوں کا زبردست اثر رہا ہے اور یہ اثر بڑھتا ہی چلا گیا۔ ابھی حال میں ہی ستیہ جیت رے کی فلم "گھرے باہرے" بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ خود ان کے "فن اور شخصیت" پر ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ستیہ جیت رے کی بنائی گئی ڈاکیومینٹری فلم (دستاویزی فلم) کو پریزیڈنٹ ایوارڈ ۱۹۶۱ء میں دیا گیا تھا۔

ی بیشتر کہانیاں اور ناول جیسے "گھرے باہرے"، "نوکا ڈوبی"، "کابلی منگری اسٹوری"، "چارولتا" اور "گورا" وغیرہ کے نام قابل ذکر ز مقبول ترین فلموں کے ذریعہ گھر گھر پہنچ چکے ہیں۔ بنگلہ دیش ید کے بعد شرت چندر چٹرجی کو یہ شرف ملا ہے کہ ان کی کہانیو

اور ناولوں پر جتنی زیادہ فلمیں بنائی گئی ہیں۔ بنگال میں اگر فلم بنانی ہو تو ڈائریکٹر ٹیگور کی کہانی کے بارے میں سب سے پہلے سوچتا ہے کیوں کہ اپنا ماحول اپنی تہذیب اور اپنائیت اور کہیں نہیں ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی زبان میں ان کی تخلیقات پر بیشتر فلمیں بن

ٹیگور پر بنائی گئی ڈاکومینٹری فلم کا ڈائرکشن دیتے ہوئے ستیہ جیت رے

چکی ہیں۔ مثال کے طور پر تین کنیا، "مولی ہار"، "پوسٹ ماسٹر" وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ ان کی ایک ہی کہانی پر دو دو تین تین بار فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ خود ہندی میں "نوکا ڈوبی" جس میں دلیپ کمار نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ بعد میں اسی کہانی کو لے کر "گھونگھٹ" بنائی گئی اور دونوں فلمیں اپنے زمانے کی سپرہٹ فلمیں تھیں۔ اسی طرح "کابلی والا" بنگالی اور ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی بنائی گئی۔

ہندی میں تو ٹیگور کی کہانیوں پر بنائی گئی فلمیں بہت مقبول ہوئیں۔ جیسے ان کی کہانی "سماپتی" پر بنائی گئی فلم "اپہار" کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔
اسی طرح تنگیت گا تا چلی جس کے گانے بہت مقبول ہوئے

جو ٹیگور کی کہانی "آمیتی" پر بنائی گئی تھی۔ ابھی ٹیگور کی ایسی کئی کہانیاں اور ہیں جن پر آئندہ بھی فلمیں دیکھنے کو ملیں گی کیونکہ ہر بڑا ادیب یا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنے ادب میں نہ صرف اپنے زمانے اور ماحول کو سمیٹ لیتا ہے بلکہ ماضی سے بھی اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور صدیوں آگے کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھتا ہے۔ چنانچہ ٹیگور کو سمجھنے کے لئے ابھی وقت درکار ہے جیسے جیسے اسرار کھلتے جائیں گے وہ اور زیادہ مقبول ہوتے جائیں گے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ان کی تمام کہانیوں اور ناولوں پر فلمیں بن چکی ہوں گی۔

ٹیگور کی کہانیاں عموماً سماجی مسائل خصوصاً دیہات کے

"گھرے بائرے"
میں
وکٹر بنرجی
'درسورں لیکھا.

ماحول اور دیہات میں رہنے والے غریب عوام، کسانوں، مزدوروں اور ان کی زندگی کے رنگا رنگ پہلو کو سامنے لاتی ہیں ان کی امنگوں اور دل کی دھڑکنوں کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے اندر سدھار اور بیداری کے جذبے کو اجاگر کرتی ہیں اور ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں کی سمت ترقی اور تعمیر کے دھاروں میں جوڑتی ہیں۔ اسی لئے جب ٹیگور کی کہانی کتاب کے اوراق سے اُبھر کر سیلولائیڈ پر منتقل ہوتی ہے تو سارے کردار جانے پہچانے سے لگتے ہیں اور ان کے دکھ درد، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشی ہر طبقے کے من کو بھاتی ہے۔ انپڑھ گنوار سے لے کر تعلیم یافتہ افراد تک (جو ٹیگور کی کہانیاں پڑھ چکے ہیں) ان فلموں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، اور اس تاثر کو ابھارنے میں فلمساز ستیہ جیت رے نے اپنے فنکارانہ انداز سے ٹیگور کی کہانیاں کو اس سلیقے سے سیلولائیڈ پر منتقل کیا ہے کہ ہر منظر اور ہر کردار ٹیگور کے شاعرانہ احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ جیتے جاگتے کرداروں کی ہلچل کو پیش کرتا ہے اس سچائی کو جو ٹیگور کی کہانیوں کی روح ہے۔ ●

صفحہ نمبر ۴۲ سے آگے "شانتی نکیتن"

بھی ہیں۔ ان کے ہنر اور ذوق کا پتہ کرافٹ اور آرٹ کے مختلف نمونوں، ان کے رہن سہن سے چلتا ہے۔

ڈوبتی ہوئی شام کی شرمیلی چادر نے فضا کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے سنتھالیوں کے گیت اور ڈھولک کی آواز بیادور ہوتی جا رہی ہیں۔ پرسکون فضا میں قدرت اور فطرت کو میں اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کر رہی ہوں اور میرے کانوں میں گرودیو کی کویتا کے بول تیر رہے ہیں۔

এসেছে প্রথম যুগে প্রকাণ্ড প্রচণ্ড মাংসস্তূপ
ধরিল বিপুল মূর্তি। প্রাণের সে অনিশ্চিত রূপ
সৃষ্টির চিন্তার মাঝে। ক্ষুদ্রতনু মানুষ তাহার
মাঝে আনিল দীপ্তি। সংশয় ঘুচিল বিধাতার

রবীন্দ্রনাথ ঠাকুর

Life began its dubious chapter
With an exaggeration of flesh.
The little man came to solve the doubt
from Creator's mind.

گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کی ۱۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر محکمۂ ڈاک نے ۷ مئی ۱۹۸۶ء کو اس خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجرا کیا۔

*

رابندر ناتھ ٹیگور کی

تحریر کا عکس

*

تُو نے مجھے اننت بنایا ہے۔ اسی میں تیری لیلا ہے۔ تو اس ناشوان پاتر (جسم) کو بار بار خالی کرتا ہے اور نئی زندگی سے اسے ہمیشہ بھرتا رہتا ہے۔

تُو نے اس بانس کی ننھی سی بانسری کو پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر پھرایا ہے اور تو نے اس کے ذریعہ ایسی سُریلی تانیں نکالی ہیں، جو نِت نئی ہیں۔

میرا چھوٹا سا دل تیرے ہاتھوں کے امرت مئے سپرش سے اپنے آنند کی حد کو کھو دیتا ہے اور پھر اس میں ایسے ولولے اٹھتے ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔

تیرے اننت اُپہاروں کی بارش میرے ان ادنیٰ ہاتھوں پر ہوتی ہے۔ زمانے گزر گئے اور تو انھیں برابر لگاتار برساتا جاتا ہے لیکن یہ بھرنے میں نہیں آتے۔

(گیتانجلی)

ستیہ جیت رے کی فلم "چارولتا" میں مادھوری مکھرجی

شانتی نکیتن

نِشابار ٹھاکر

آئری کا ورق

مدِ نظر تک پھیلے کھیتوں کا ہرا لے گھنے پیڑوں نے احاطہ کر رکھا ہے۔ دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ صاف نیلے آسمان پر دُور دُور تک بادلوں کا کوئی نشان نہیں۔ یہ ہے ہرا بھرا خوبصورت بنگال۔ رومانٹک، میوزیکل، جہاں ہر طرف رقص ہے، زندگی ہے، سکون ہے۔ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام شانتی نکیتن رکھا گیا۔ شانتی کے معنی سکون اور نکیتن آماجگاہ کی وضاحت کرتا ہے۔ شانتی کی آماجگاہ : A HODE OF PLACE.

صبح کا وقت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت اور گھنے پیڑ اور کنارے کنارے چائے کی دکانیں ہیں جن کی چمنیوں سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ یہ سڑک سیدھی وشوا بھارتی کو جاتی ہے سڑک کے کنارے کی دکان سے ایک پیالی چائے پی کر میں بھارتی ورسٹی کی جانب چل پڑتی ہوں۔ سنتھالی عورتیں کسی ہوئی ساڑیوں میں بنا بلاؤز کے جوڑوں میں پھول لگائے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کرتی ہوئی کھیتوں کی طرف جا رہی ہیں۔ چمکتے آبنوسی چہروں پر اُجالا ہے۔ سب کے پیر ایک ہی تال اور لَے پر تھرک رہے ہیں۔ کسے ہوئے سڈول مزدور بدن جیسے خالق نے انھیں بڑی محنت سے فرصت کے اوقات میں اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو۔ یہ لوگ زندگی کے گیت گا رہے ہیں۔ کھیتوں کے، محنت کے اور بارش کی آمد کے گیت۔ ان کی زندگی سے بھرپور رقص، سُر، تال اور علی الصباح کی ملگجی روشنی نے مل کر ایک ابدی سکون کی فضا پیدا کر دی ہے۔

یونی ورسٹی کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی روح ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کے احساس سے بھر جاتی ہے۔ جامن، بکھیر اور آم کے درخت جہاں تہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئل اور پپیہے کی آوازیں ہم آہنگ ہیں۔ سامنے "شیاملی" ہے مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑی جہاں مندر کا سا سکون ہے۔ کھپریل کی چھت والی کٹیر بس کی سُرخ بجری جامنوں سے پٹی پڑی ہے۔ بجری کے دونوں جانب جامنوں کے پیڑ ہیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں گرو دیو نے اکثر سادھنا کیا ہے۔ شامیلی سے لگ کر پورٹیکو ہے جس میں اب بھی گرو دیو کی VINTAGE CAR کھڑی ہے۔

میں سنگیت بھون سے آگے بڑھ کر رویندر بھون سے ہوتی ہوئی کلا بھون کے احاطے میں داخل ہوتی ہوں۔ رویندر بھون ایک میوزیم اور ریسرچ سینٹر بن گیا ہے۔ کلا بھون اور سنگیت بھون چھوٹے چھوٹے کاٹیجوں پر مشتمل ہے۔ کلا بھون کے سامنے ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جس کے درمیان بڑا سا بیل کا پیڑ ہے۔ اس چبوترے پر کلا بھون کے موجودہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ مسٹر سبرامنیم بیٹھے اپنے طلبا سے بحث و مباحثہ میں مصروف ہیں۔ میں ایک کاٹیج کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی ہوں۔ کھڑکی کے

قومی راج

قریب ایک دراز زلف لڑکا گھڑا ایزل پر باہر کے لینڈ اسکیپ اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سنگیت بھون سے تان پورے اور ستار کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں رابندر سنگیت کا ریاض کر رہے ہیں۔ سامنے ایک کاٹیج کے برآمدے میں ایک خوبصورت کنیا اپنے لانبے بال کھولے تان پورہ ہاتھ میں لئے گرودیو کا کوئی بھجن گا رہی ہے۔ کلا بھون اور سنگیت بھون میں فائن اور کمرشیل آرٹ اور موسیقی سے علاوہ ڈانس کرافٹ وغیرہ کی بھی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ یہاں غیر ممالک کے طلبہ بھی کثیر تعداد میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

کلا بھون اور سنگیت بھون کے علاوہ ودیا بھون بھی ہے جہاں نفسیات، اقتصادیات، سماجیات وغیرہ پر ریسرچ کی جاتی ہے۔ شعبۂ سائنس کو شکشا بھون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک ٹیچرس ٹریننگ کالج بھی ہے جسے "ونایا بھون" کہتے ہیں۔ قدیم زبانیں جیسے سنسکرت، پالی، چینی اور جاپانی زبانیں، ان پر "چائنا بھون" اور "ہندی بھون" میں ریسرچ کی جاتی ہے اور پوسٹ گریجویٹ کورسس کی کلاسیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ چائنا اور ہندی بھون کی دیواروں پر مشہور زمانہ آرٹسٹ بنود بہاری مکرجی اور سری نندلال بوس کے خوبصورت مورال MURALS آج بھی ہیں اور آئندہ بھی اپنے زمانے کی تاریخ دہراتے رہیں گے۔

ایک ڈیپارٹمنٹ سے اگر دوسرے ڈیپارٹمنٹ جانا ہو تو ہری ہری دوب اور روشوں پر سے گزرنا پڑتا ہے جہاں مختلف مجسمے جہاں تہاں استادہ ہیں۔ کچھ طلبا کے بنائے ہوئے اور کچھ اساتذہ کے۔ ایک مشہور معلم رام کنکر کا بنایا ہوا ہے۔ ایک مزدور اور اس کی فیملی کا مجسمہ فن سنگتراشی کا بہترین نمونہ ہے جسے دیکھنے کے لئے اکثر سیاح آتے ہیں۔

"وشوا بھارتی کے کیمپس میں پرائمری اور پری پرائمری اور سکنڈری اسکول میں آج بھی اسی طرح تعلیم دی جاتی ہے جو ٹیگور کے فلسفۂ تعلیم پر مبنی ہے۔ اساتذہ جہاں تہاں بچوں کے گروپ بنا کر درختوں کے نیچے بیٹھے بحث و مباحثہ میں مصروف نظر آتے ہیں "پتھ بھون" سکنڈری اسکول اب بھی قدیم برہمچاریہ آشرم کا نمونہ نظر آتا ہے۔

وشوا بھارتی رابندر ناتھ ٹیگور کے پتا شری دیوندر ناتھ ٹیگور کی دریافت ہے۔ دراصل ایک مرتبہ رائے پور جاتے وقت انھوں نے دوران سفر اس علاقے میں قیام کیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں اس آشرم کو تجربے کے طور پر OPEN AIR SCHOOL یا برہمچاری آشرم میں بدل دیا گیا جو ابتدا میں صرف پانچ طلباء پر مشتمل تھا۔ رابندر ناتھ ٹھاکر ابتداء ہی اس جگہ کے شیدائی تھے اور اکثر اپنے والد کے ساتھ یہاں جایا کرتے تھے۔ اپنے بچپن کے تلخ تجربات کی وجہ سے انھیں رسمی تعلیم سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں یہی آشرم اسکول وشوا بھارتی یونی ورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ ایک ایسی یونی ورسٹی جہاں مشرق اور مغرب ٹکراتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔

شانتی نکیتن سے کچھ فاصلے پر "سری نکیتن" ہے۔ یہاں انگریکلچر چھوٹے پیمانے کی صنعتیں، کرافٹ، باغبانی، کتائی بنائی وغیرہ سے متعلق تعلیم دی جاتی ہے۔ کمہار کام اور بڑھئی کام، رنگائی وغیرہ سے متعلق ورکشاپس بھی ہیں جہاں طالب علم بذات خود عملی طور پر تعلیم حاصل کرتے ہیں جس طرح گرودیو اور روسو نے کہا کہ بچوں کو بجائے کلاس روم کے ورکشاپ میں بھیج دیا جائے تو وہ بہترین اور کارآمد شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔

گرودیو نے بذات خود بہت سارے تیوہاروں سے متعلق ڈانس ڈرامے اور گیت لکھے ہیں۔ ہر دور میں اور آج بھی مختلف موسمی تیوہاروں کے موقعوں پر وشوا بھارتی کے طلبہ ست رنگی پوشاکیں پہنے رابندر سنگیت کی لے پر سرمست ہو کر تھرکتے نظر آتے ہیں۔ شانتی نکیتن میں منائے جانے والے تیوہاروں میں "ورشا منگل" "پرشش انسو" (فروری کے مہینے میں منایا جانے والا سالانہ میلہ) "میگھ میلہ" (سری نکیتن کا سالانہ میلہ) "وسنت اتسو" (موسم بہار کی آمد) وغیرہ زیادہ ترمیلے اور تیوہار سردیوں میں اور بہار کے موسم میں منائے جاتے ہیں تاکہ طلبا میں جمالیاتی حس کی نشوونما ہو سکے اور وہ قدرت اور نیچر کو محسوس کر کے اس سے حظ اٹھائیں۔

وشوا بھارتی کے احاطے سے نکل کر پوسٹ آفس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک بڑے سے چبوترے پر بنی ہوئی تین کمروں اور برآمدے پر مشتمل ایک جھونپڑی کو "کاروسنگھ" کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں پر عورتیں گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر کڑھائی، بنائی اور چھپائی کا کام کرتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ہنرمند ہونے کے ساتھ ساتھ باذوق

(باقی صفحہ نمبر ۴۹ پر)

علامہ قمر سرسوی
پرنم لائیم ڈپو ہیر جی گووندجی کمپاؤنڈ
سینی منزل ٹی ڈی۔ جے روڈ سیوری، بمبئی ۴۰۰۰۱۵

ایک عظیم مفکر، ہمہ گیر شخصیت۔
رابندر ناتھ ٹیگور

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"
اور رابندر ناتھ ٹیگور بھی ان دیدہ ور انسانوں میں سے ایک ہیں جنہیں دنیا کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ٹیگور پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ آئیے ہم بھی اس مختصر سی تحریر میں کچھ ان کی زندگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں آخر ایسی کونسی باتیں ان کی ذات میں تھیں جس نے ان کو ایک عظیم مفکر اور ہمہ گیر شخصیت بنا دیا۔ جس ماحول میں آنکھ کھولی اس کے کیا کیا تاثرات کارفرما رہے۔

یہ دیکھنے کے لئے ہمیں آج سے سوا سو سال پہلے شہر کلکتہ کے شمالی علاقہ میں واقع سڑک چیت پور کی دوارکا ناتھ ٹیگور لین چلنا ہوگا۔ جہاں جوراسنکو نامی ایک سہ منزلہ مکان دوارکا ناتھ ٹیگور کے دادا کا تعمیر کردہ اپنے مکینوں کے جاہ و جلال اور ثروت و اقبال کا نمونہ پیش کر رہا ہے جو ایک آشرم کا ماحول بھی رکھتا ہے جس میں چھوٹا سا مندر بھی ہے اور کیلے، مولسری اور ناریل کے درخت بھی۔

یہی دوارکا ناتھ ٹیگور کا آبائی مسکن ہے جن کی عزت و شہرت کا یورپ تک ڈنکا بجا۔ ہے اور پھر ان کے بیٹے دیوندر ناتھ ٹیگور نے بھی باپ کی پوری وراثت حاصل کی۔ یہاں تک علم و زہد کے مہارشی کہلائے۔ سب کچھ حاصل تھا۔ بنگال کی روایت ہے کہ علم کی دیوی سرسوتی، اور دولت کی دیوی لکشمی ایک ساتھ نہیں رہتیں۔ لیکن جوراسنکو کے مکینوں نے اس کو غلط ثابت کر کے دکھایا۔ دولت کے ساتھ عزت بھی پائی۔ یہ برہمنی خاندان تھا جسے کچھ باوقار کٹر پنتھی لوگ حقیر سمجھ کر "پیرالی" کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی نظر میں اس خاندان نے مسلمانوں سے میل جول رکھ کر برہمن ذات کو بٹہ لگایا تھا۔

ان ہی مہارشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے یہاں ۷ مئی ۱۸۶۱ء کو جوراسنکو ہی میں رابندر ناتھ ٹیگور نے جنم لیا۔ جو ۱۴ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اولاد کہے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کے بعد جو ایک بھائی نے جنم لیا تھا وہ ایک سال بعد ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

بچپن میں ٹیگور کو سب پیار سے 'رابی' کہہ کر پکارتے تھے۔ ہونہار بروا

قومی راج

کے چکنے چکنے پات۔ رابی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا لیا۔ ماں باپ کے دل میں کیا کیا خواہشیں جاگ اٹھیں۔ وہ اُن بچے کو فلاسفر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ، گائک، مصور، ادیب جانے کیا کیا ایک دم بنا دینا چاہتے تھے۔ ہر مضمون کے لیے الگ الگ ٹیچر مقرر کیے گئے۔ رسم و رواج کے مطابق ٹیگور کی پرورش اور دیکھ بھال نوکروں کے ذریعہ ہوئی جو بہت ناگزیر رہی۔ بڑی عمر تک موزے اور جوتے بھی پہننا نصیب نہیں ہوئے۔ جاڑے کے موسم میں بھی معمولی سوتی کپڑے پہننے کو ملتے رات کو ماں کے کمرے میں سوتے۔ رشتے کی ایک بوڑھی نانی کہانی سنایا کرتیں

"نوکر شاہی" میں ٹیگور نے اپنے بچپن کی یادیں لکھی ہیں انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی زندگی کے اصول ترتیب دینا شروع کر دیئے تھے۔ ورزش، کشتی، حفظان صحت کے اصولوں کے ساتھ موسیقی، تاریخ، جغرافیہ، بنگلہ، سنسکرت اور انگریزی کا سبق لیتے تھے لیکن اسکول جانا پسند نہ تھا۔ ایک بار ضد کر کے بھائی اور بھتیجے کے ساتھ اسکول گئے اور وہاں کا ماحول دیکھ کر بیزار ہو گئے کیونکہ وہاں بچوں کو کھیلنے کی آزادی نہیں تھی۔ بغیر کھیل کے پڑھنا اُن کو پسند نہ تھا۔ نفرت اسکولوں سے تھی تعلیم سے نہیں اس لیے سارے علوم گھر ہی میں حاصل کیے۔ گیارہ سال کی عمر میں جنیو پہنانے کی رسم ادا ہوئی۔ منڈھا ہوا سر کا مدار ٹوپی سے ڈھانکا گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ ہمالیہ کی یاترا پر گئے۔ یہیں سے ٹیگور کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۱۸۶۸ء سے کم عمری ہی میں گیت لکھنا شروع کر دیئے تھی موسیقی رگ رگ میں تھی خود ہی ایسی سُر بناتے کہ سننے والے جھوم جھوم اٹھتے آواز غضب کی تھی۔ ٹیگور کے والد نے جب ایک بھجن سنا "آنکھ تجھے کیسے دیکھے"۔ "تو تو آنکھ کے اندر رہتا ہے" تو روپیوں سے بھری تھیلی انعام میں دی کم عمری میں ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔ بھاوجوں کی شفقت اس غم کا مرہم بنی۔ ٹیگور کا قلم نہ رکا طرح طرح کے اس قدر گیت، بھجن، حب وطنی اور قدرتی مناظر پر لکھے کہ اتنی کم عمری میں آج تک کسی نے نہیں لکھے۔

۱۸ سال کی عمر تک سات ہزار لائنیں ان کی نظموں کی شائع ہو چکی تھیں۔ ٹیگور کے بھائی جیوتندر ناتھ جو موسیقی میں کمال رکھتے تھے انھوں نے ٹیگور کی غزلوں کو راگوں میں تبدیل کیا ہے۔

۲۰ ستمبر ۱۸۷۷ء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن کا سفر کیا۔ ایک بھائی جو احمد آباد میں جج تھے ان کے بچے لندن میں تھے انھیں کے ساتھ گئے۔ دل شکستہ نظم اسی سفر کے دوران لکھی گئی۔ تعلیم کا ماحول لندن میں بھی پسند نہ آیا اس لیے ۱۸۸۰ء میں ٹیگور واپس آ گئے اور آکر سنگیت ناٹک (میوزیکل ڈرامہ) والمیکی کی پرتیبھا لکھی جس میں ڈاکوؤں کا سردار ایک عظیم شاعر بنا اور رامائن لکھی۔ ناٹک کا نام والمیک کا خداداد جوہر ہے ایسے ناٹک جس میں گا کر بات کہی جائے اوپیرا کہلاتے ہیں گانے کے ساتھ ناچ بھی ہو تو بیلے کہلاتے ہیں۔ "پرتھوی راج کی حکومت" نامی تاریخی ڈرامہ لکھا۔ خود بھی ایکٹر تھے۔ اپنے لکھے ڈرامے ایکٹ بھی کرتے تھے۔ طولانی نظم "بن پھول" لکھی۔ نظموں کے مجموعے "صبح کے گیت" اور "شام کے گیت" لکھے۔ بچوں کی نظموں کا ایک مجموعہ جس کا انگریزی ترجمہ تھی "کریسنٹ مون" کے نام سے چھپا اور ایک ناول "راج رشی" لکھا۔ بعد میں جس کا نام قربانی رکھا جس میں دکھایا گیا ہے کہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانی کرنا کتنا بڑا ظلم ہے۔

بائیس سال کی عمر میں مرنالینی دیوی سے شادی ہوئی گھریلو ذمہ داریاں بڑھیں۔ شمالی مشرقی بنگال اور اڑیسہ کے دیہات میں گھومنا پھرنا۔ جائداد کی دیکھ بھال کرنا بھی شغل رہا۔ اکثر مہینوں گنگا کے کنارے مشرقی بنگال میں رہتے "پدما" نام بوٹ میں رہتے۔ بھلائی کے کاموں کی طرف توجہ کرتے۔ تعلیم سے غافل نہ رہتے کیونکہ اسکول کی گھٹی فضا میں طریقہ تعلیم ان کو پسند نہ تھا اس لیے پرانے زمانے کے آشرم کے اصولوں پر انھوں نے اپنا من بھاتا مدرسہ "شانتی نکیتن" بالپور بنگال میں کھولا جو آج بھی وشو بھارتی کے نام سے یونیورسٹی کی شکل میں ہے جہاں مادر فطرت کی گود میں دیہات کی کھلی فضا میں بیٹھ کر درختوں کے نیچے آزادانہ ماحول میں پڑھائی ہوتی ہے معلم اور طالب علم بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ بہت کم کتابیں استعمال ہوتی ہیں۔ ٹیگور بچوں کو آزاد چھوڑ دینے کے حق میں تھے۔ انھیں اُن کی پسند کا کام کرنے دو۔ کھیلنے دو۔ نصیحتیں نہ لادو۔
"شانتی نکیتن" کے قیام سے انھوں نے تعلیم کو ایک نیا

رتعلیم صدیوں پہلے "رکسیو"، جوکہ مشہور نیچر پسند
جاری کیا تھا۔
ے اس کی تعلیم کو ہندوستانی ماحول میں پیش کیا۔
ں ہر شخص نیچے پا ڈکی رہتا تھا۔ درسی کتابوں کے ساتھ
جسم کی پرداخت، سماج سیوا، کھیل کود، فنون
رتی مناظر سے بھی متعارف کرایا جاتا۔ یہ وہی شانتی
اں پنڈت جواہرلال نہرو نے ہماری وزیر اعظم
اگاندھی کو بچپن میں داخل کرایا تھا۔ جہاں سے ان کی
ی اور بعد میں اندرا گاندھی اس کی چانسلر رہیں
انتی نکیتن جاتی رہیں۔
اقول ہے کہ اعلیٰ تعلیم وہ ہے جو معلومات بہم پہونچا
و سمجھانے اور یہ کالجوں میں ممکن نہیں ہے۔ آنریرنم
ہے۔ ایچ۔ بی مکرجی جو ایک مشہور ماہر تعلیم تھے
سے ٹیگور وازوی گریجویٹ پروفیسٹ آف ایجوکیشن"
لے بہت بڑے مبصر تھے۔
نکیتن کے قیام اور ترقی کے لئے ان کی بیوی کا
اون رہا جس کے لئے ٹیگور نے بیوی کا سامان اور
زیور تک فروخت کر دیا تھا۔
ورتی دیتے تو گھر کی دیکھ بھال بیوی کرتیں ان کے
ٹیگور کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ پانچ بچوں
دریش کیا اور گھر پر ہی تعلیم کا انتظام کیا۔ ۱۹۰۲ء
ک بہت دکھ کا زمانہ گذرا جس کے دوران منجھلی
ر چھوٹا لڑکا شانی اور والد صاحب کا انتقال ہوا
رمیاں جاری رہیں۔
از یں تقسیم بنگال کے خلاف ناراضگی اور قومی تقسیم
بھی حصہ لیا۔ ٹیگور کا مزاج عملی سیاست کے لئے موزوں
رین اور سماجی تعصب سے نباہ کرنا ان کے بس کی بات
یام پوری دنیا کے انسانیت کے لئے تھا۔ ٹیگور ر
الم، پنڈت یا مولوی نہیں ہیں۔ خدمت خلق ہی
رہا ہے اور خود کو سیاست سے بچاتے رہے ہیں۔
مے، پھر سے گیارہ بدیسی سفر کئے۔ شمالی، جنوبی
، جاپان، ملایا، جاوا، ایران اور مڈل ایسٹ کا
و کہنا کہ جب تک آپس میں دوستی نہ ہوگی دنیا
امن کا منہ نہ دیکھ سکے گی۔
۱۹۱۲ء میں برطانیہ کے مفکروں سے ملاقات رہی۔
انگلش ادب پر لیکچر بھی دیئے۔ شکسپیر کا گہرا مطالعہ کیا۔ شاعر
ڈبلوپی ییس اور مصور راستھان ان کے قدردان تھے۔ ٹیگور
کی نظموں کی انتہائی مشہور کتاب "گیتانجلی"، ان ہی کی ہمت
افزائی سے چھپی جس پر ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز ملا جو دنیا کا سب
سے بڑا اعزاز تھا جس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کا نقد انعام
بھی تھا۔
ٹیگور پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں یہ عزت بخشی گئی۔ یہ
ساری رقم انھوں نے شانتی نکیتن کے نام دیہی امداد کے لئے
بینک میں جمع کرادی جہاں سے گاؤں کے لوگ کم سود پر قرض
لے سکیں۔ سری نکیتن کا ادارہ بھی قائم کیا جس کے ذریعے
بہترین فصلیں اگانے اور صنعت کاری کے سائنسی طریقوں
سے آگاہی کرائی جاتی۔
۱۹۱۵ء میں گاندھی جی بھی شانتی نکیتن آئے اور آتے
رہے ٹیگور سے دوستی کا رشتہ رہا۔ ایک بار جب کہ ٹیگور
کی سترہویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ گاندھی جی اور ان کے
رفقا، لیڈروں کی گرفتاری کی خبر ملی تو ٹیگور نے فوراً جشن سالگرہ
بند کرادیا اور برٹش حکومت نے ٹیگور کو جو دنیا کے بڑے شاعروں میں
سے ایک گنے جاتے ہیں۔ نائٹ کے ٹائٹل سے عزت بخشی
تو انھوں نے واپس کر دیا جس کی وجہ جلیان والا باغ کا حادثہ تھا
جہاں بے شمار بے گناہوں پر برٹش حکمرانوں نے گولیاں برسائیں
نقش اور جو خط وائسرائے کو لکھا وہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار
رہے گا جو ٹیگور کی حب الوطنی کا کھلا ثبوت ہے۔ راجہ رام موہن رائے
سے بھی ان کے تعلقات رہے۔ برہما سماج کی بہت خدمت کی۔
ٹیگور ایک ہمہ گیر شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے مصوری میں
بھی سیکڑوں نادر نمونے پیش کئے جس میں قدرتی مناظر کی بھرمار
ہے اور نہ جانے کیا کیا کچھ تصویروں کی زبانی کہہ دیا ہے کسی نے مطلب
پوچھا تو صرف اتنا ہی جواب دیا کہ "اگر میں مطلب الفاظ کے
ذریعہ سمجھا سکتا تو تصویریں ہی کیوں بناتا"۔

ٹیگور نے نہایت لطیف انداز میں خوبصورت جملے بھی کہے ہیں۔
تاج محل کے بارے لکھتے ہیں۔ —
"محبت کی آنکھ سے نکلے ہوئے انمول دو آنسوؤں کا مدفن ہے۔"

کس کس چیز کا جائزہ لیا جائے ان کے کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے ہر تصنیف ایک مکمل شاہکار ہے۔

گورا بنگال کا سب سے بڑا ناول ہے۔ "تیاگ" جس میں ہندو خاندان کے تعلقات پہ بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ انسانی احساسات پر اسکی بنیادیں نہیں ہیں۔ "ڈاکیہ" "راجہ" "ڈاک گھر" بے حد مشہور ہیں۔ "جن گن من" آج بھی ہمارا قومی ترانہ ہے جو لب پہ آتے ہی ٹیگور کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

وہ صرف بنگلہ زبان ہی کے شاعر نہ تھے بلکہ انگریزی میں بھی بہت کچھ شاعری کی ہے۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی ہر زبان سے ان کو شوق رہا ہے۔ فارسی ادب میں مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ ان کی محبوب کتابیں تھیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں سوویت روس سے واپس آکر مصوری چھوڑ کر آخر عمر ناول نویسی اور دیگر رشحات قلم میں گذاری۔ اور ۷ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو ساون پورنماشی کے دن اسی "جوڑا سانکو" والے مکان میں جہاں ۸۰ سال پہلے آنکھ کھولی تھی ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ایک تصویر زمانے کی نگاہوں میں باقی ہے جوان کا لمبا قد، دلکش چہرہ، سڈول جسم، بڑی بڑی چمکتی آنکھیں تو پیش کرتی ہے لیکن ان کی ظریفانہ طبیعت اور شخصیت کی ہمہ گیری دیکھنے کے لئے ہمیں ان کا پورا مطالعہ کرنا ہی پڑے گا جہاں یہ عظیم ہستی اپنی زندگی تابندگی کے ساتھ پیش کرتی نظر آئے گی۔ رہتی دنیا تک! ہم ان کو بھلا نہیں سکتے ؎

مرنے والوں کو سب ایک روز بھلا دیتے ہیں
دل سے چاہت کو محبت کی مٹا دیتے ہیں
کارنامے ہی تو انسان کے دنیا میں قمر
مر کے بھی زندہ جاوید بنا دیتے ہیں

ترجمہ:۔
ابوالحیات بردُونی

زا

مصنف:۔ رابندرناتھ ٹیگور

صبح کو دکھی رام رُئی اور چھدام رُئی دونوں بھائی کٹاری ہاتھ میں لے کر مزدوری پہ چلے تو ان دونوں کی بیویوں میں بک بک جھک جھک شروع ہوگئی۔ محلے کے لوگ عادی ہو گئے اور دنیا کے اور ہزار ہا غل شور کی طرح ان کے چیخنے چلانے کو بھی سنتے تھے۔ ان کے چیخنے چلانے کی آواز کان میں پڑتے ہی لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے "لو شروع ہوگئی"، گویا جیسا ہوتا آیا ہے ویسا ہی ہو رہا ہے آج بھی دستور کے خلاف کوئی بات نہیں ہو رہی ہے۔ صبح کو آفتاب جب پورب کی طرف طلوع ہوتا ہے تو اس کے اس طرح کے نکلنے کی وجہ کوئی نہیں پوچھتا اسی طرح جب ان دیورانی جٹھانی میں جھجم دھاڑ مچنے لگتی تو اس کی وجہ دریافت کرنے کے لئے کسی کے دل میں شوق تجسس پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کے آئے دن کے جھگڑے سے محلے والوں کو کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن ان دونوں کے شوہروں کو بلاشبہ کچھ نہ کچھ دکھ ہوتا ہی تھا پھر بھی وہ اسے کوئی خاص پریشانی کا سبب نہیں سمجھتے تھے گویا وہ دونوں بھائی اپنی زندگی کے طولانی سفر کو ایک یکے پر سوار ہو کر طے کر رہے تھے اور بغیر اسپرنگ کے دونوں پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کو اس سفر کے لوازمات میں سمجھتے تھے۔

بلکہ جس دن اس کے گھر میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی اور ہر طرف سناٹے اور سکوت کا عالم ہوتا اس دن ان کو خدشہ رہتا کہ کہیں کوئی خلاف فطرت بات نہ ہو جائے اس دن کس وقت کیا پیش آ جائے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔

ہماری کہانی کی ابتدا جس دن سے ہو رہی ہے اس دن سر شام جب دونوں بھائی مزدوری سے فارغ ہو کر تھکے ماندے گھر لوٹے تو انھوں نے دیکھا کہ مکان پر بالکل خاموشی چھائی ہے۔

باہر بھی نہایت امس تھی دوپہر کو تھوڑی سی بارش ہوگئی تھی اور اس وقت بھی آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ برسات میں گھر کے چاروں طرف جنگل اور جھاڑیوں کی افراط ہوگئی تھی ان جھاڑیوں کے اندر سے تر پانی میں ڈوبے ہوئے پٹسن کے کھیت سے اور مرطوب پودوں اور گھاس سے متعفن بخارات آ کر اور گھر کے چاروں طرف منجمد ہو کر ایک غیر متحرک دیوار کی صورت اختیار کئے ہوئے تھے گئوشالہ کے پیچھے کے گڑھے میں مینڈک ٹرا رہے تھے اور جھینگروں کی آواز سے شام کے وقت آسمان کے اوپر جو سکون چھایا ہوتا ہے وہ بھی معدوم ہوگیا تھا۔

وہاں سے قریب ہی پدا ندی تھی جس پر برسات کے بادل چھائے ہوئے تھے وہ بالکل خاموش مگر ڈراونی ہیبت اختیار کئے ہوئے تھے۔ اور اکثر کھیتوں کی فصل کو برباد کرتی ہوئی آبادی کے قریب آ پہونچی تھی۔ زمین کا جو حصہ ندی میں دھنسا جا رہا تھا اس جگہ کے دو چار آم اور کٹھل کے درختوں کی جڑیں باہر نکل آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھ کر اپنی مٹھیوں کی گرفت کو ڈھیلی کر کے کسی آخری سہارے کو خلا میں پکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

قومی راج

دکھی رام اور چھدام اس زمیندار کے کچہری میں کام کرنے گئے تھے ندی کے اس پار آبی دھان جو پانی کے اندر پیدا ہوتے ہیں پک کر تیار ہو گئے تھے اور قبل اس کے کہ برسات کی ندی کا سیلاب انھیں بہا لے جائے ان کے کاٹ لانے کے لئے دیہات کا ہر غریب آدمی لگ رہا تھا صرف دکھی رام اور چھدام کو زمیندار کا چپراسی زبردستی پکڑ کر لے گیا تھا۔ زمیندار کے کچہری کے پھوس کی چھت سے جا بجا پانی ٹپک رہا تھا اس کو درست کرنے اور کچھ بانس کی ٹٹیاں بنانے میں وہ دن بھر لگے رہے کھانے کے لئے بھی فرصت نہیں ملی تھی وہیں کچہری پر کچھ چبینا چبا لیا تھا۔ کبھی کبھی بارش میں بھی بھیگنا پڑا۔ پوری مزدوری بھی نہ ملی تھی علاوہ ازیں زمیندار کے چپراسیوں کی جو گھڑکیاں ان کو برداشت کرنی پڑی تھیں اس کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔

کیچڑ اور پانی کے اندر سے ہوتے ہوئے شام کے وقت جب دونوں بھائی گھر لوٹے تو انھوں نے دیکھا کہ چندرا یعنی چھوٹی بہو زمین پر اپنا آنچل بچھائے چپ پڑی ہے اس بادل سے بھرے دل کی طرح وہ بھی دوپہر کو خوب آنسو بہا کر شام ہونے سے کچھ ہی پہلے آنسوؤں کی بوچھار ملتوی کرکے گم سم پڑ گئی ہے اور رادھا یعنی بڑی بہو اپنا منہ پھلائے برآمدے میں بیٹھی ہے اس کا دو برس کا بچہ دن بھر رو رہا ہے جب دونوں بھائی گھر میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ بچہ انگنائی میں ننگا پڑا سو رہا ہے

دکھی رام بھوک سے پریشان تھا۔ گھر آتے ہی اس نے اپنی بی بی سے کہا "چل بھات دے" بارود کی تھیلی جیسے آگ لگنے پر بھڑک اٹھتی ہے۔ بڑی بہو اسی طرح بے انتہا کرخت آواز کے ساتھ فوراً بول اٹھی "بھات کہاں سے لاؤں" تو کیا چاول دے گیا تھا کیا میں خود کما کر لے آتی" دن بھر محنت کرنے کے بعد تھکا ماندہ پریشان دکھی رام جب اندھیرے میں گھر آتا ہے تو وہاں نہ اسے امن ملتا ہے، نہ دانہ پانی بھوک سے بے تاب ہو کر اور اپنی عورت کی دل آزار جھڑکی اور خاص کر آخر والے طعن آمیز فقرے کو سن کر یکایک وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا اور مجروح شیر کی طرح گرج کر بول اٹھا کیا کہا تو نے؟ پھر اسی گھڑی کٹاری اٹھا کر بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنی بی بی کے سر چلا دی رادھا چھوٹی بہو کے پاس جا گری اور اس کا دم نکلتے دیر نہ لگی۔ خون سے لت پت چندرا چلا اٹھی "ارے کیا کیا؟ چھدام نے اس کا منہ بند کر دیا۔ دکھی رام نے کٹاری پھینک دی اور مخبوط الحواس انگنائی میں بیٹھ گیا بچہ جاگ اٹھا اور ڈر کے مارے رونے لگا۔

اس وقت باہر بالکل امن تھا۔ چرواہے مویشی لئے دیہات کو آ رہے تھے۔ ندی کے اس پار جو لوگ دھان کاٹنے گئے تھے اکثر ان میں سے گھر واپس آ چکے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ آدمی مل کر دھان کے گٹھروں کو چھوٹی چھوٹی ناؤ پر چڑھا کر اس پار سے آئے تھے اور اپنی مزدوری کے دو چار گٹھر دھان لے کر اور اپنے اپنے سر پر رکھ کر گھر لوٹ چکے تھے

رام لچن چکر برتی جسے دیہات کے لوگ چاچا کہا کرتے تھے دیہات کے ڈاکخانے میں چٹھی ڈال کر اپنے گھر لوٹا اور اطمینان سے حقے کا دم لے رہا تھا یکایک اسے یاد آ گیا کہ اس کی رعیت دکھی رام کے پاس لگان کا بہت سا روپیہ باقی ہے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اس دن کچھ دے گا اس وقت تک وہ ضرور گھر لوٹ چکا ہوگا اس خیال کے آتے ہی اپنی چادر کو گردن میں ڈال کر اور چھتری ہاتھ میں لے کر وہ نکل پڑا دکھی رام کے مکان میں قدم رکھتے ہی چکرورتی کے کان کھڑے ہو گئے اس نے دیکھا کہ اس وقت تک چراغ نہیں جلا تھا۔ اندھیرے برآمدے پر دو چار آدمیوں کی دھندلی سی مورت دکھائی دے رہی ہے اسی برآمدے کے ایک گوشے سے رونے کی خفیف سی آواز رہ رہ کر سنائی دے رہی ہے بچہ ماں ماں پکار کر رونا چاہتا تھا مگر چھدام نے اس کا منہ دبا رکھا تھا۔

رالچن نے کسی قدر خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ " دکھی تم ہو گھر میں؟ دکھی اب تک پتھر کی مورت بنا ہوا بے حس و حرکت بیٹھا تھا اس کا نام لے کر پکارتے ہی دفعتہً ناسمجھ بچے کی طرح رو دیا۔

چھدام فوراً برآمدے سے اتر کر انگنائی میں چکر برتی کے قریب آ گیا چکر برتی نے پوچھا شاید عورتیں آپس میں لڑ جھگڑ کر چپ بیٹھی ہیں۔ آج تمام دن ان کے چیخنے کی آواز سنائی دی ہے۔ ابھی تک چھدام کچھ طے نہ کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے بہت غیر ممکن باتیں اس کے دماغ میں آ رہی تھیں بحالت موجودہ اس نے سوچا تھا کہ کچھ رات گئے لاش کو کہیں ڈال آئے گا اس کا اسے گمان تک نہ تھا کہ اتنی درمیان میں چکرورتی آ موجود ہوگا اس لئے کوئی فوری جواب اسے نہ سوجھا" ہاں آج خوب جھگڑا ہوا ہے،" چکر برتی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا " تو اس کے لئے دکھی کیوں رو رہا ہے؟

چھدام نے دیکھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی " جھگڑتے جھگڑتے چھوٹی بہو نے بڑی بہو کے سر پر کٹاری مار دی ہے۔ یکایک بہ مینہ

موجودہ مصیبت کے سوا کوئی اور بھی مصیبت ہو سکتی ہے یہ بات عام طور پر خیال میں نہیں آتی۔ چھدام کو اس کی فکر تھی کہ اس ہیبت ناک حقیقت سے کیونکر نجات مل سکتی ہے لیکن اس نے یہ نہ سوچا کہ جھوٹ اس سچ سے بہت زیادہ ہیبت ناک ہو سکتا ہے۔ چکر برتی کا سوال سنتے ہی اس کے دل میں ایک جواب گھس آیا اور اس نے کہہ دیا۔

چکر برتی چونک کر بولا" ایں کیا کہا مر تو نہیں گئی؟"

چھدام نے کہا مر گئی ہے، اتنا کہہ کر اس نے چکر برتی کے پیر پکڑ لیے۔ چکر ورتی کو بھاگنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ سوچا رام رام شام کو کس بلا میں گرفتار ہو گیا۔ گواہی دیتے دیتے دم نکل جائے گا۔

چھدام نے کسی طرح اس کے پیر نہ چھوڑے۔ بولا ٹھاکر میری بہو کو بچانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ مقدمہ وغیرہ کے بارے میں دیہات کا ہر شخص رام لچن چکرورتی سے صلاح و مشورہ لیا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد چکر برتی نے کہا دیکھ اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے تو ابھی دوڑ کر تھانے میں خبر کر آ کہ تیرے بڑے بھائی دکھی نے گھر آ کر اپنی بی بی سے کھانا مانگا تھا کھانا تیار نہ تھا اس نے غصے میں آ کر اپنی بی بی کے سر پر کٹاری مار دی اور وہ مر گئی۔ مجھے یقین ہے تو اگر ایسا کرے تو چھوکری کی جان بچ جائے گی"!

چھدام کا حلق سوکھ گیا اس نے کہا" ٹھاکر بہو اگر چل بسے تو دوسری مل جائے گی لیکن بھائی کو اگر پھانسی مل گئی تو پھر بھائی تو نہ ملے گا لیکن جب چھدام نے اپنی بہو پر الزام دیا تھا اس وقت ان سب باتوں کو اس نے سوچا نہ تھا جلدی میں ایک بات کہہ دیتا پھر اس کے بعد اپنے دل کو سمجھانے کے لیے اور اپنے فعل کی تائید کے لیے غیر شعوری طور پر وہ دلائل جمع کر رہا تھا چکر برتی نے بھی اس بات کو معقول سمجھا کہا تو پھر جیسا ہوا ہے ویسا ہی کہنا ہر پہلو کا سنبھالنا ناممکن ہے اتنا کہہ کر رام لچن چکرورتی ترت چل دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے دیہات میں یہ بات پھیل گئی کہ چھدام کی بہو چندرا نے جھگڑا کرتے ہوئے اپنی جٹھانی کے سر پر کٹاری چلا کر مار ڈالا ہے۔

دریا کا بند ٹوٹ جانے پر جس طرح باڑھ آ جاتی ہے اسی طرح تیزی کے ساتھ اس دیہات میں پولیس آ پہونچی۔ مجرم اور غیر مجرم سب ہی گھبرا اٹھے۔

دوسرا باب

چھدام نے سوچا جس راستے پر وہ گامزن ہو چکا ہے اس پر ہی چلنا پڑے گا۔ چکر برتی کے پاس وہ خود اپنی زبان سے ایک بات کہہ چکا ہے اور وہ بات سارے دیہات میں پھیل گئی اب اگر کوئی دوسری بات ظاہر ہو تو نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے وہ اور کوئی صورت سوچ کر بھی نکال نہ سکا اس نے سوچا جس طرح بھی ہو اسی بات پر قائم رہ کر اس کے ساتھ دو چار اور باتوں کو ملا کر اپنی بی بی کو رہا کرنے کی کوشش کی جائے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

چھدام نے اپنی بی بی چندرا سے التجا کی کہ وہ اس الزام کو اپنے سر لے لے۔ وہ بالکل ہکا بکا رہ گئی چھدام نے اسے یقین دلا کر کہا" جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کر۔ کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے تو خاطر جمع رکھ۔ ہم لوگ تجھے بچا لیں گے۔

اس نے یقین دلایا مگر خود اس کا حلق خشک ہو گیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔

چندرا کا سن سترہ اٹھارہ سے زیادہ نہ ہو گا اس کا چہرہ بھرا بھرا اور تر و تازہ تھا زیادہ لمبی نہ تھی اس کا جسم سڈول تھا مگر اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں ہلنے جلنے اور چلنے پھرنے میں اس کے جسم کا کوئی عضو کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تھا ٹھیک اس چھوٹی سی ناؤ کی طرح جو کہ آسانی سے چلے پھرے اور اس کا کوئی جوڑ ڈھیلا نہ ہو اس کو دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی تھی اور وہ ان کی تحقیق و تفتیش کیا کرتی۔ محلے میں جا کر گپ شپ کرنا اسے اچھا لگتا جب وہ گھڑا لے کر پانی بھرنے کو جاتی اور لوٹتی تو اپنی گھونگھٹ کو انگلیوں سے ذرا سا ہٹا کر اپنی دو چمکتی ہوئی کالی کالی آنکھوں سے ان سب چیزوں کو دیکھ لیا کرتی جو کہ اس کے نزدیک دیکھنے کے لائق ہوتیں۔

بڑی بہو اس کے بالکل برعکس تھی نہ اپنے سر کو سنبھال کر ڈھانک سکتی تھی نہ بچے کی اچھی طرح پرورش کر سکتی تھی نہ گھر کا کوئی اور کام کر سکتی تھی وہ بالکل ہی ڈھیلی تھی اور کوئی کام سلیقے سے نہ کر سکتی تھی نہ وہ کسی کام میں لگی رہتی نہ اسے کبھی فرصت رہا کرتی یوں تو چھوٹی بہو اسے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کیا کرتی تھی صرف دبی زبان سے ایک آدھ چبھتی ہوئی بات کہہ دیتی جس پر بڑی بہو چیخ و پکار مچا دیتی یہاں تک کہ محلے والے عاجز آ جاتے تھے۔

ان دونوں میاں بی بی کے جوڑوں کے سبھاؤ میں حیرت انگیز یکسانیت تھی۔ دکھی رام لمبا چوڑا مرد تھا اس کی ہڈیاں بھی چوڑی تھیں اس کی ناک چھوٹی تھی اور اس کی آنکھیں گویا اس کھلے ہوئے سنسار کو دیکھ کر بھی سمجھ نہ رہی تھیں اور سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرتی تھیں اتنا سیدھا سادہ لیکن اس قدر خوفناک اتنا قد آور اور اس قدر بے بس انسان ملنا مشکل ہے۔

چھدام کو گویا کسی نے بڑی جتن کے ساتھ ایک چمکدار پتھر سے تراش کر بنایا تھا اور اس کے جسم میں نہ کوئی نقص تھا نہ اس میں کوئی فاضل چیز تھی اس کے جسم کا ہر عضو مضبوط تھا گویا اس کے جسم کی ساخت ہی ایسی تھی کہ اس میں کوئی عیب نہیں رہا تھا اس کے ہر کام میں چاہے وہ ندی کنارے کہ بلندی سے پانی میں کودنا ہو یا چچوپیسگر ناؤ چلائے یا بانسواڑی میں جاکر بانس کاٹ لائے ایک باضابطگی اور حسن ترتیب آپ ہی آپ ظاہر ہوتا تھا وہ اپنے سر کے بڑے بڑے بالوں میں اچھی طرح تیل ڈال کر اور کنگھی کرکے اپنی پیشانی کے اوپر سے جاکر گردن میں چھوڑے رکھتا تھا اپنے پہناوے پر بھی اس کی کافی نگاہ تھی۔ گرچہ دیہات کی بہو بیٹیوں کے حسن و جمال سے وہ بے التفاتی نہیں برتتا تھا اور اپنے آپ کو ان کی نظر میں دلربا بنائے رکھنے کی خواہش بھی اس میں کم نہ تھی پھر بھی چھدام اپنی جوان بی بی سے مخصوص طور پر محبت کرتا تھا ان دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جایا کرتا لیکن کوئی کسی پر قابو نہیں پاتا تھا۔ ایک اور بات تھی جس کی وجہ سے ان دونوں کے بندھن اور بھی مضبوط ہو گئے تھے۔ چھدام سمجھتا تھا کہ چندرا جیسی طرح دار اور چنچل عورت ہے اس پر پورا پورا اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چندرا کا خیال تھا کہ جب اس کے شوہر کی نظر ہر طرف جایا کرتی ہے تو اس کو اگر مضبوطی سے باندھ نہ رکھا جائے تو نہ معلوم کب وہ ہاتھ سے نکل جائے۔

موجودہ حادثے کے پیش آنے سے پہلے ہی ان دونوں میاں بی بی کے اندر کسی قدر کشمکش چل رہی تھی چندرا دیکھ رہی تھی کہ اس کا شوہر کبھی کبھی کام کے بہانے سے دور چلا جایا کرتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ ووایک :ن بعد وہ گھر لوٹتا ہے مگر زیادہ مزدوری بھی کما کر نہیں لاتا۔

جب چندرا کو اپنے آدمی کے لچھن بھلے نہ لگے تو اس نے بھی اپنی چال چلن میں افراط کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ گھاٹ پر چلی جایا کرتی پھر سارے محلے کا چکر لگا آتی اور گھر آکر کاشی مجمدار کے منجھلے لڑکے کی بڑی تعریف کرنے لگتی۔

اپنی بی بی کے چلن سے چھدام بہت مشکوک تھا۔ اسے نہ قرار تھا نہ رات کو آرام کہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے کبھی جاتا تو ا[illegible] نہ ملتا ایک دن اس نے اپنی بھاوج کو اس بارے میں کچھ طعنہ دیا تو بڑی بھاوج نے اپنے آنجہانی باپ کو یاد کرکے کہا "وہ عورت سے بھی تیز چلتی ہے اسے میں کیسے سنبھال سکتی ہوں میں ڈرتی ہو[ں] دل وہ گھر کی رسوائی نہ کرائے۔ قریب کے کمرے سے آکر چندرا نے سکون کے ساتھ کہا تو دیدی (آپا) تم کو اتنا ڈر کاہے کا ہے؟" پھ[ر] بس تو تو میں میں شروع ہو گئی۔

چھدام نے آنکھیں نکال کر کہا "پھر اگر میں نے سنا کہ ت[و] گھاٹ پر گئی ہے تو تیری ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔ چندرا نے ک[ہا] تو میری ہڈی کو چین ملے" اتنا کہہ کر وہ فوراً ہی باہر جانے لگی۔ لپک کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے کم[رے میں] داخل کر دیا پھر باہر سے دروازہ بند کرکے چلا گیا۔

شام کو کام سے واپس آکر چھدام نے دیکھا کہ کمرہ کھلا۔۔۔ اس میں کوئی بھی نہیں ہے چندرا تین دیہاتوں سے گذر کر اپ[نے] کے پاس جا پہونچی ہے۔ بڑی خوشامد در آمد کرکے چھدام اسے [واپس] لایا لیکن اس دفعہ اس نے ہار مان لی۔ چھدام نے دیکھا کہ سیماب کے ساتھ مٹھی میں بند رکھنا جیسا دشوار ہے اپنی اس چھوٹی سی بی[وی کو] بھی پوری طرح قابو میں رکھنا ناممکن ہے وہ گویا سیماب ہی کی [طرح] انگلیوں کے شگاف کے اندر سے نکل جاتی ہے تو پھر اس نے کوئی [زبردستی] نہ کی لیکن وہ اکثر مغموم رہا کرتا۔ اپنی اس نوجوان بی بی کی وفاداری [پر] بھروسہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اپنے دل میں ایک درد محسوس [کرتا] یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آجاتا کہ اگر [یہ] مر جائے تو چین ملے۔ انسان کو جتنی عداوت انسان سے ہوتی ہے [موت] سے اتنی نہیں ہوتی ہے۔ اتنے میں ان کے گھر میں یہ مصیبت آپڑی۔

چندرا کو جب اس کے شوہر نے خون کا الزام اپنے سر لینے کو [کہا] ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھتی رہی اور اس کی دو کالی کالی آگ کی [آنکھیں] اس کے آدمی کو خاموشی کے ساتھ مجروح کرنے لگیں۔ اس کا تن من [گویا] خشک ہو گیا اور وہ اس بات کی کوشش میں لگی رہی کہ کیونکر اپ[نے] شوہر کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کرے اس کا دل اپنے شوہر [سے پھر] ہو گیا۔

قومی راج

چھدام نے اسے دلاسا دیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے اور پولیس کے پاس اور حاکم کے پاس جو کچھ اس کو کہنا ہوگا سب اسے اچھی طرح سکھا دیا۔ چندرا نے وہ لمبی داستان کچھ بھی نہ سُنی اور لکڑی کی مورت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

دکھی رام اپنے ہر کام کے لئے چھدام ہی پر بھروسہ کرتا تھا۔ چھدام اپنی بی بی پر الزام رکھنے لگا تو دکھی نے کہا "تو پھر چھوٹی بہو کا کیا ہوگا؟"
چھدام نے کہا اسے "میں بچا لوں گا۔ بھولا بھالا دکھی رام مطمئن ہوگیا۔

تیسرا باب

چھدام نے اپنی بی بی کو سکھا دیا۔ "تم کہنا بڑی بہو ایک ہنسوا لے کر مجھے مارنے آئی تھی میں نے کٹاری اٹھا کر روکنا چاہا تھا یکایک وہ کٹاری اسے لگ گئی۔ یہ سب رام لچھن کی بتائی ہوئی باتیں تھیں اس کے ثبوت میں اور جو کچھ کہنا پڑے گا وہ بھی اس نے چھدام کو سکھا دیا تھا۔
پولیس آکر تحقیقات کرنے لگی دیہات کے ہر شخص کو اس کا یقین ہوگیا تھا کہ چندرا ہی نے اپنی جیٹھانی کو مار ڈالا ہے چنانچہ ان لوگوں نے یہی گواہی دی کہ۔ پولیس نے جب چندرا سے پوچھا تو اس نے کہا "ہاں میں نے ہی مار ڈالا ہے۔"

"کیوں مار ڈالا ہے؟
" وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی"
" وہ پہلے تمہیں مارنے آئی تھی؟"
"نہیں"
"اس نے تم پر کوئی ظلم کیا تھا"
"نہیں"
اس طرح کا جواب سنکر سب ہی متحیر ہوگئے۔
چھدام تو بالکل بدحواس ہوگیا وہ بول اٹھا وہ ٹھیک نہیں کہہ رہی ہے۔ بڑی بہو نے پہلے ...
داروغہ نے ڈانٹ کر اسے خاموش کر دیا پھر قانون کے مطابق چندرا سے کئی بار جرح کرنے پر بھی داروغہ کو ایک ہی جواب ملا۔ چندرا نے کسی طرح بھی نہ کہا کہ بڑی بہو نے اس پر حملہ کیا تھا اس قسم کی ضدی عورت تو کم نظر آتی ہے وہ اپنی جان اپر کھیل کر پھانسی پر لٹکنے کو سیدھے چلی جا رہی تھی۔ اسے کسی طرح باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ کیسا ہولناک زعم باطل تھا چندرا دل ہی دل میں اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی "میں نے تمہیں برطرف کرکے اپنی اٹھتی جوانی کو لے کر پھانسی کے تختے ہی کو قبول کر لیا میری اس زندگی کا آخری لگاؤ اسی کے ساتھ تھا۔

چندرا گرفتار ہو کر پولیس کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ ایک معصوم چنچل اور شوخ دیہاتی عورت اپنے برابر کے پہچانے ہوئے راستے پہ سے رتھ کے قریب سے، ہاٹ کے اندر سے، گھاٹ کے کنارے سے۔ مجدار کے سامنے سے۔ پوسٹ آفس اور اسکول کے پاس سے۔ سارے پہچانے ہوئے لوگوں کی آنکھوں کے آگے کلنک کا ٹیکا ماتھے پر لگائے ہوئے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی اس کے پیچھے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا اس کی اپنی ہمجولیاں اور دیہات کی دوسری عورتیں کوئی تو اپنی گھونگھٹ کے اندر سے کوئی اپنے مکان کے دروازے پر سے کوئی اپنی درخت کے آڑ میں کھڑی ہو کر پولیس کی حراست میں چندرا کو جاتے دیکھ رہی تھی اور شرم، نفرت اور خوف کے جذبات ان کو مجروح کر رہے تھے۔

ڈپٹی مجسٹریٹ کے پاس بھی چندرا نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور یہ بھی اس نے کہا کہ بڑی بہو نے اس پر کسی قسم کا حملہ یا ظلم نہیں کیا تھا۔ چھدام سے چپ نہ رہا گیا اس نے گواہ کے کٹہرے میں آکر حاکم سے روتے ہوئے دست بستہ التجا کی" دہائی حضور! میری بی بی کا کوئی قصور نہیں"۔ حاکم نے ڈانٹ کر اس کے جوش کو روکا پھر خود اس کی گواہی لی اس نے ایک ایک کرکے صحیح واقعہ بیان کر دیا۔

حاکم نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا کیونکہ معزز اور باوثوق گواہ رام لچھن چکربرتی نے کہا "قتل کی تھوڑی ہی دیر بعد میں جائے وقوعہ پر جا پہنچا تھا۔ چھدام نے میرے پاس اصل واقعہ کا اقرار کرکے میرے دونوں پیر پکڑ کر کہا اپنی بہو کو کیونکر بچا سکوں اور اس کا راستہ مجھے بتا دیجئے۔ میں نے بہلا کر برا کچھ بھی نہ کہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا اگر میں کہوں میرے دادا (بڑے بھائی) نے اپنی بہو سے کھانا مانگا تھا اور کھانا نہ ملنے پر غصے میں آکر اس نے اپنی بہو کو مار ڈالا ہے تو کیا میری بی بی بچ جائے گی میں نے کہا خبردار حرامزادے عدالت میں ایک لفظ بھی جھوٹ مت بولنا اتنا بڑا گناہ اور کوئی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

رام لچھن نے چندرا کو رہا کرنے کی غرض سے اصل واقعہ کو توڑ مروڑ کر کچھ کہنا چاہا تھا مگر جب دیکھا کہ خود چندرا ہی ضد پر آگئی ہے تو اس نے سوچا "ارے باپ رے کہیں جھوٹی گواہی دینے کے جرم میں نہ پھنس جاؤں۔ جتنا

جانتا ہوں اتنا ہی کہنا ٹھیک ہے" اس خیال سے رام لچن نے وہی کہا جو اسے
معلوم تھا بلکہ کچھ بڑھا چڑھا کر بھی کہنے سے نہ چوکا۔
ڈپٹی مجسٹریٹ نے مقدمہ کو جج کی عدالت میں بھیج دیا۔

اس درمیان میں کھیتی باڑی۔ ہاٹ بازار، خوشی غمی۔ دنیا کے سارے
کاروبار چلتے رہے اور اگلے برسوں کی طرح اس سال بھی نئے دھان کے
کھیت پر ساون کی مسلسل بارش ہوتی رہی۔

بہت سے لوگ اپنے اپنے مقدمے کے انتظار میں منصفی عدالت کے
سامنے بیٹھے ہیں۔ پولیس اسامی اور گواہوں کو لیے ہوئے کچہری میں حاضر ہے
کسی باورچی خانے کے پیچھے کی ایک چھوٹی سی گڑھی کے حصے کے تصفیہ کے
بارے میں ایک مقدمہ درپیش ہے جس کے لیے کلکتے سے ایک وکیل آئے
ہیں اور مدعی کی طرف سے انتالیس گواہ حاضر ہوئے ہیں۔ سیکڑوں آدمی
اپنی اپنی کوڑی کے حساب کا فیصلہ کرانے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔
اور ان لوگوں کے خیال کے مطابق فی الحال دنیا میں اس سے زیادہ کوئی اہم
چیز نہیں ہے۔ چھدام برآمدے میں بیٹھا ہوا دنیا کے اس ہر روز کی کھلبلی اور
ہلچل کی طرف آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ ساری چیزیں اس کو خواب
سی لگ رہی ہیں۔ کچہری کے احاطے میں پیپل کے درخت پر ایک کوئل
بول رہی ہے اس کے لیے کوئی قانون ہے نہ عدالت۔

چندرا نے جج سے کہا "ارے صاحب ایک بات کو کتنی دفعہ دہراؤں
جج صاحب نے اسے سمجھا کر کہا "تم جس جرم کا اقرار کر رہی ہے اس کی سزا کیا
ہے تم جانتی ہو۔ چندرا نے کہا نہیں جج صاحب نے کہا اس کی سزا پھانسی ہے
چندرا نے کہا! آپ کے پیر پڑتی ہوں مجھے وہی سزا دیجئے آپ لوگوں
کی جو مرضی ہو کر گزرئیے، مجھ سے تو اور سہا نہیں جاتا۔

جب چھدام کو عدالت میں حاضر کیا گیا تو چندرا نے اپنا منہ پھیر لیا جج
صاحب نے کہا کہ گواہ کی طرف دیکھ کر کہو کہ وہ تمھارا کون ہے؟
چندرا نے دونوں ہاتھوں نے اپنا منہ ڈھانک کر کہا "وہ میرا
شوہر ہے"

سوال :۔ "وہ تم سے محبت کرتا ہے؟"
جواب :۔ "اوہ خوب محبت کرتا ہے"
سوال :۔ "تم اس سے محبت کرتی ہو"
جواب :۔ "میں خوب محبت کرتی ہوں"
چھدام سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا "میں نے قتل کیا ہے"

سوال :۔ کیوں
چھدام :۔ کھانا مانگا تھا بڑی بہو نے دیا نہیں۔
گواہ کے کٹہرے میں آکر دکھی رام کو غش آ گیا جب اسے ہوش
آیا تو اس نے کہا حضور میں نے قتل کیا ہے۔
سوال :۔ کیوں
جواب :۔ کھانا مانگا تھا اس نے دیا نہیں۔

مختلف گواہوں کی شہادت لینے کے بعد اور بہت جرح کر
کے بعد جج صاحب صاف سمجھ گئے کہ اپنے گھر کی بہو کو پھانسی کی ذلت
سے بچانے کے لئے دونوں بھائی اپنے سر الزام لے رہے ہیں لیکن چندرا
شروع سے لے کر جج صاحب تک ایک ہی بات کہتی آئی ہے اس کی باتوں میں
ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہوا ہے۔ دونوں وکیلوں نے رضا کارانہ
طور پر اس کو موت کی سزا سے بچانے کی بڑی کوششیں کیں لیکن چندرا کی
اپنی گواہی نے ان سے ہتھیار ڈلوا دئیے۔

جس دن وہ کالی سی بچی رتی بھر بن ماں باپ کے گھر کھیلنا
کو پھینک کر اپنے گھر سے گاؤں کو لیکر سسرال آئی تھی اس
کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ایک دن ایسا ہونے والا ہے۔
باپ کو مرتے وقت اس بات سے تسکین حاصل ہوئی تھی کہ جو بھی
نے اپنی لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔
جیل خانے میں پھانسی سے قبل رحم دل سول سرجن نے
سے پوچھا تم کسی کو دیکھنا چاہتی ہو۔ چندرا نے کہا ایک دفعہ اپنی ماں
دیکھنا چاہتی ہوں"
ڈاکٹر نے کہا تمھارا شوہر تمہیں دیکھنا چاہتا ہے اسے بلا دو
چندرا نے کہا "بھاڑ میں جائے"

قومی راج

پنڈت جواہرلال نہرو کی ۲۲ ویں برسی کے موقعہ پر وزیراعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے ۲۷ مئی کو منترالیہ میں پنڈت جواہرلال نہرو کی تصویر کو ہار پہنا کر خراج عقیدت پیش کیا۔

رمضان عید کے مبارک موقع پر وزیراعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے داؤدی بوہرہ سماج کے سربراہ ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب کے ملبار ہل پر واقع "سیفی محل" نامی بنگلے پر ملاقات کی اور انھیں عید کی مبارکباد پیش کی۔

عید تقریب کی کمیٹی کی طرف سے ۳۱ مئی کے پروگرام میں وزیر مملکت برائے شہری ترقیات شری ولاس ساونت تقریر کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ بائیں سے :- شری قاضی زبیر، شری علی سردار جعفری، شری علی شمسی اور شری فقیر محمد اور شری عمر قاضی۔
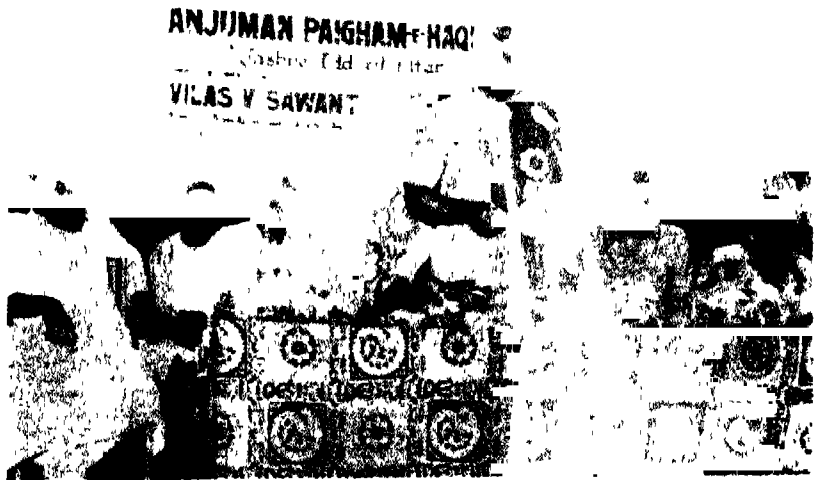
بادشاہ خان بمبئی میں زیرِ علاج

صدرِ ہند اور وزیراعظم کی تشریف آوری اور مزاج پرسی

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان جوان دنوں بیمار ہیں۔ ہندوستانی سفیر برائے پاکستان شری ایس کے سنگھ اور اپنے پوتے سنایڈ۔ اے۔ خان کے ہمراہ انڈین ایئر لائنز کے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے عارضۂ قلب کے علاج کے لئے ۱۵ رمئی ۱۹۸۷ء کو پشاور سے بمبئی تشریف لائے۔

سرحدی گاندھی، جنہیں مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر پی۔ کے۔ گوئل کے ذریعے بمبئی لایا گیا ہے۔ ایک پہیئے دار گاڑی میں ہوائی جہاز سے اُترے اور انہیں ایک سرکاری کار میں فوراً بامبے اسپتال پہنچا دیا گیا۔

جیسے ہی ہوائی جہاز ہوائی اڈے پر رُکا، مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر ایس۔ ڈی۔ شرما اور وزیراعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان فوراً ہوائی جہاز کے اندر داخل ہوئے اور خان عبدالغفار خان کا استقبال کیا۔

صدر جمہوریہ ہند، شری گیانی ذیل سنگھ، وزیراعظم شری راجیو گاندھی اور شریمتی سونیا گاندھی نے سرحدی گاندھی کی بمبئی میں آکر مزاج پرسی کی۔

اوپر کی تصاویر (۱ و ۲) میں:

صدر ہند اور وزیراعظم بامبے اسپتال میں سرحدی گاندھی کی مزاج پرسی کرتے ہوئے

ڈاکٹر پی۔ کے۔ گوئل، گورنر مہاراشٹر اور وزیراعلیٰ بھی صدر کے ہمراہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ نیچے کی تصویر میں خان عبدالغفار خان کا گورنر مہاراشٹر اور وزیراعلیٰ مہاراشٹر ہوائی اڈے پر استقبال کر رہے ہیں۔

سابق وزیر اعظم

چرن سنگھ چل بسے

ہندستان کے سابق وزیر اعظم اور لوک دل کے لیڈر چودھری چرن سنگھ ۲۹ مئی کو صبح طویل علالت کے بعد چل بسے۔ ۸۵ سالہ چرن سنگھ کے پسماندگان میں ان کی اہلیہ گائتری دیوی، بیٹا اجیت سنگھ اور ۵ بیٹیاں ہیں۔ ان کی موت پر مرکزی حکومت نے تمام سرکاری مشغولیات منسوخ کرتے ہوئے ۴ دن کے لئے سوگ منانے کا اعلان کیا۔

صدر زیل سنگھ، وزیر اعظم شری راجیو گاندھی اور ان کے وزرا ساتھیوں، لوک سبھا اسپیکر شری بلرام جاکھر اور اپوزیشن لیڈران شری ملکھی سالش ۱۲ تغلق روڈ پر گئے اور کسانوں کے لیڈر کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے جسد خاکی پر پھول چڑھائے۔

سابق صدر شری این سنجیوا ریڈی جنھوں نے ۱۹۷۹ میں مرارجی ڈیسائی حکومت کے زوال کے بعد شری سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کیا تھا، وہ بھی خراج عقیدت پیش کرنے آئے اور جسد خاکی پر پھول چڑھائے۔

نائب صدر شری آر وینکٹ رمن جو [illegible] کے سبب [illegible] نے وہاں سے تعزیتی پیغام روانہ کیا۔

ملک بھر میں تعزیت

شری سنگھ کو مختلف [illegible] نے خراج عقیدت پیش کیا۔ شری سنگھ [illegible] [illegible] [illegible] آنجہانی [illegible] [illegible]

صدر اور وزیر اعظم کا پیغام تعزیت

صدر زیل سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں شری چرن سنگھ کو مجاہدین آزادی میں ایک عظیم اور ادا کار کی ایک مکمل شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے کمزور اور پسماندہ طبقے کی ترقی کے لئے انتھک محنت کی تھی۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کہا کہ ملک ایک باعزت اور خدمت گزار لیڈر سے محروم ہو گیا۔ مختلف صلاحیتوں کے تحت ملک کے لئے ان کی خدمات کی یاد تازہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شری چرن سنگھ اپنی سادگی اور دیہی غربا کے لئے اپنی ایک سوز ہمدردی کے سبب خدمات کے لئے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

کسانوں کا ہمدرد خواہ نہیں رہا

وزیر اعلیٰ کا شری چرن سنگھ کی رحلت پر تعزیتی پیغام

مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان نے سابق وزیر اعظم ہند شری چرن سنگھ کی رحلت پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار فرمایا۔

اپنے تعزیتی پیغام میں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری چوان نے فرمایا کہ شری چرن سنگھ کی رحلت سے ملک نے ایک عظیم لیڈر اور کسانوں کا ہمدرد کھو دیا ہے۔ آپ ایک سادہ زندگی بسر کرنے والے عظیم مفکر تھے۔

وزیر اعلیٰ شری چوان نے لوک دل کے لیڈر کی اہلیہ شریمتی گائتری دیوی کے نام بھی پرسہ کا پیغام ارسال کیا ہے۔

الوداع

خواجہ احمد عباس

ممتاز فلم ساز، ادیب اور صحافی خواجہ احمد عباس کا یکم جون کو صبح سویرے ارلا نرسنگ ہوم میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔

خواجہ احمد عباس نے تقریباً ۴۵ فلمیں بنائیں جن میں صدر کا گولڈ میڈل یافتہ ان کی فلم "شہر اور سپنا" بھی شامل تھی۔

سپر اسٹار امیتابھ بچن کو پہلی مرتبہ انھوں نے "سات ہندوستانی" میں متعارف کروایا۔

وہ ۱۹۴۰ء سے ہی فلموں کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے جب انھوں نے بمبئی ٹاکیز کی فلم "نیا سنسار" اور وی شانتا رام کی فلم "ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی" کے لئے اسکرپٹ لکھے تھے۔ انھوں نے ممتاز فلم ساز راج کپور کی کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے تھے جن میں "آوارہ"، "شری ۴۲۰"، "میرا نام جوکر" اور "بوبی" شامل ہیں۔ انھوں نے عوام کی پہلی فلم "ہمارا گھر"، "بمبئی ہماری ہے" بھی بنائی تھی اور "ایک آدمی" کا شمار ان کی آخری فلموں میں ہے۔

ہدایتکار کی حیثیت سے خواجہ احمد عباس کی پہلی فلم "دھرتی کے لال" تھی جو ۱۹۴۶ء میں بنی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے "انہونی"، "انگارے"، ہند روس تعاون سے بننے والی پہلی فلم "پردیسی" اور "چار دل چار راہیں" کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے۔

وہ ایک ناقابل تسخیر جذبے اور قوت ارادی کے مالک تھے۔ ابھی حال تک انھیں ان کی خرابی صحت کے باوجود اپٹا کی گولڈن جوبلی تقریبات میں آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا۔

ایک صحافی کی حیثیت سے خواجہ احمد عباس نے سب سے پہلے "بمبئی کرانیکل" میں کام کیا تھا جو اس وقت معدوم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے آزادانہ طور پر مختلف اخبارات و رسائل کے لئے کام کیا اور آر۔ کے۔ کرنجیا کے ہفت روزہ اخبار "بلٹز" کے لئے "آخری صفحہ" کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھتے رہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں تقریباً ایک سو کتابیں تصنیف کیں جن کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں کئے گئے۔

۱۹۶۹ء میں انھیں "پدم شری" کا ایوارڈ ملا۔

خواجہ احمد عباس پانی پت (ہریانہ) میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی جہاں سے انھوں نے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

صدر اور وزیراعظم نے ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ وزیراعظم نے انھیں مجاہد آزادی، دانشور، اور سیکولرزم کا علمبردار قرار دیا۔ دیگر مرکزی وزراء، گورنر، وزرائے اعلیٰ اور اہم فلمی شخصیتوں نے خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور ان کی بیوی نے خواجہ احمد عباس کے انتقال پر اپنے شدید صدمے کا اظہار کیا۔ ایک تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا "ان کے انتقال سے ملک ایک تخلیق کار ذہن سے محروم ہو گیا ہے جس نے فلم سازی، صحافت اور ادب کے شعبوں میں زبردست خدمت انجام دیں۔"

مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ شری ایس بی چوان نے خواجہ صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سارے ملک میں سنیما شائقین برسوں تک ان کی شاندار فلموں کو یاد رکھیں گے۔ شری چوان نے شری عباس کے انتقال پر اپنے گہرے رنج کا اظہار کیا۔

مہارشی دیانند کالج بمبئی کا ایک روشن ستارہ

کماری سنیتا دیودھر کو
جنکو شیو چھتر پتی انعام ملا

بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کالج کے بی کام کی طالبہ کماری سینتا
کو حال ہی میں حکومت مہاراشٹر نے شیو چھتر پتی انعام سے نوازا ہے
کبڈی میں بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے دیا گیا ہے وزیر مملکت
اسپورٹس شری اشوک پاٹل نے بڑے فخر سے اس بات کا
کیا انعام کی رقم مبلغ ۵ ہزار روپئے نقد تھی۔ کماری سنیتا دیودھر
فال بنیک آف مہاراشٹر (پریل برانچ) میں کام کرتی ہیں۔

یاد رہے کہ ایم ڈی کالج کی ہی ٹی وائی بی اے کی طالبہ
تی رانے کو گذشتہ ۸۵ء کے تعلیمی سال میں ٹیبل ٹینس کی بہترین
ی کی حیثیت سے یہی شیو چھتر پتی انعام ملا تھا اور کماری دیپتا
ل کو کبڈی میں یہی انعام ملا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ مجموعی طور پر
تک چھ طلبا اور طالبات کو یہ انعامات مل چکے ہیں۔

صفحہ نمبر ۲۳ سے آگے کے

گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور

ن فرعات سے بے نیاز تھے۔ ویسے کلکتہ یونیورسٹی نے ان کی
کے اعتراف میں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی اور وہ
ٹی میں بنگالی شعبے کے سربراہ بھی مقرر ہوئے لیکن ٹیگور آدمی
نتی نکیتن کے۔ سقف و دیوار میں مقید رہنا انھیں پسند نہیں تھا
فضا کے آدمی تھے اور ان کی نظر آسمان پر تھی لیکن قدم بہرحال
پر تھا۔
زمین پر پاؤں تو ان لوگوں کے نہیں ٹکتے جن کی گرہ میں کچھ ہوتا نہیں
ٹیگور کے پاس تو علم با کا خزانہ تھا لیکن علم و دانش کا۔

قومی راج

ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو چھ زبانوں میں ہفتہ وار شائع ہوتا ہے

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل خصوصی نمبر

جلد نمبر ۱۴ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۶ء شمارہ نمبر ۷

اداریہ

قارئینِ کرام!

آپ کی خدمت میں "قومی راج" کا "کرمویر بھاؤراؤ پاٹل خصوصی نمبر" پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ ستمبر ۱۹۸۶ء سے ان کی صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریبات کا سلسلہ مہاراشٹر بھر میں جوش و خروش سے جاری ہے اور انھیں تقریبات کے حصے کے طور پر "قومی راج" کا یہ خصوصی نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔

"کرمویر" نے دیہی علاقوں میں تعلیم کی نیو ڈالی اور تمام ذات پات اور مذاہب کے نوجوان طلبہ میں ایک جگہ رہنے سہنے اور کھانے پینے کا اہتمام کر کے ان میں یکجہتی اور مساوات کا بیج بویا۔ اگلی پیڑھی کے لیے ان کے کارہائے نمایاں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

"قومی راج" نے اس خصوصی شمارے میں اپنی سابقہ روایات کے مطابق بہترین مضامین شامل اشاعت کیے ہیں جو "کرمویر" کی تعلیمی میدان میں اعلیٰ کارکردگی اور ان کی پُر وقار شخصیت، نیز ان کے کارہائے نمایاں سے متعلق ہیں اور جو آئندہ نسلوں کے لیے یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

اس شمارے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے نہ صرف ہمارے ایڈیٹر صاحبان نے بلکہ ان کے ماتحتوں، آرٹسٹوں اور دوسرے سرکاری افسران کے علاوہ پریس کا بھی تعاون ملا۔

اسی طرح "ستارا کی" "رعیت شکشن سنستھا" نے بھی ہر ممکن مدد کی ہے جن کے ہم بہت بہت شکر گزار ہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگوں کو "یہ خصوصی نمبر" ضرور پسند آئے گا۔ "کرمویر" کو یہی ہمارا خراجِ عقیدت ہے۔

پرمود ملنے
ڈائرکٹر جنرل برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ
حکومتِ مہاراشٹر بمبئی۔

****

وزیر اعلیٰ کا پیغام

ڈاکٹر کرموویر بھاؤ راؤ پاٹل تعلیم کے دلدادہ تھے۔ آپ بہت بڑے سماجی مصلح بھی تھے، غریب اور پسماندہ عوام کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا جذبہ آپ کے دل میں کوٹ، کوٹ کر بھرا تھا۔ آپنے ہمیشہ سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی جو یقیناً آج کی نوجوان نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ آج ہمارا یہ فرضِ عین ہے کہ ہم ان کے مختلف اچھے کاموں کا جائزہ لیں جبکہ ہم ان کی صدسالہ سالگرہ منا رہے ہیں

کرموویر بھاؤ راؤ پاٹل نے ہمیشہ مہاتما گاندھی، مہاتما جیوتی باپھلے اور راجرشی شاہو مہاراج کے اعلیٰ اصولوں سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ تعلیمی میدان میں اپنے ٹھوس اور مضبوط کارناموں سے کرمویر نے اس حقیقت کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا کہ اگر ہندوستان جیسے غریب اور وسیع و عریض ملک میں تعلیم کے ہر پہلو کا احاطہ کرنا ہے تو ہمیں ان دو اصولوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا یعنی" اپنی مدد آپ کرنا اور مزدوروں کے وقار کو برقرار رکھنا۔"

آپ نے عوام کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرایا آپ کا اس بات پر پکا یقین تھا کہ اس سے عوام ہر طرح کی پریشانیوں سے نجات پاسکیں گے۔ آپنے نوجوان نسل میں "اپنی مدد آپ" کرنے کا جذبہ پیدا کردیا اس طرح ان میں سماجی اور ثقافتی بیداری کے لیے راہ ہموار کردی۔ آج ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل مزدوروں کی ایک نئی نسل دیکھ رہے ہیں جو مختلف میدانوں میں اپنے کارنامے پیش کر رہے ہیں۔

یقیناً یہ کارنامے ۱۹۱۹ء میں کرمویر بھاؤ راؤ پاٹل کی طرف سے جاری کردہ "رعیت شکشن سنستھا" کے مرہونِ منت ہیں کرمویر نے طلبہ کے بہت سے ہوسٹل قائم کیے جو ذات پات، مذہب و ملت سے بالاتر ہو کر کھولے گئے تھے۔ مذہبی رواداری بھی سماجی مساوات کو قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کرمویر بھاؤ راؤ پاٹل نے اس مذہبی رواداری کو ماضی بعید میں جاری کر دکھایا تھا۔ آج کرمویر کے اعلیٰ کارناموں کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

قومی راج کے اس خصوصی شمارے میں مشہور قلمکاروں نے اپنے مضامین لکھے ہیں۔

اس خصوصی شمارے کے لیے میری نیک تمنائیں ہیں۔

ایس۔ بی۔ چوان
وزیر اعلیٰ مہاراشٹر

وزیر تعلیم کا پیغام

کرموویر بھاؤراؤ پاٹل کی صد سالہ جشنِ ولادت مہاراشٹر اور پورے ملک میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی جارہی ہے۔ سماج کے پچھڑے طبقات میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے کرموویر بھاؤراؤ پاٹل نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ تعلیم میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہی ہے۔ حصولِ تعلیم کے مواقع ہر کسی کو فراہم ہونے چاہئیں۔ یہی کرموویر بھاؤراؤ پاٹل کا مقصدِ زندگی تھا اور اسی اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے مہاراشٹر میں تعلیم کو فروغ دیا، اسے عام کیا۔ ستارا ضلع جیسی بنجر زمین پر ان کا لگایا ہوا یہ پودا آج "رعیت شکشن سنستھا" کے روپ میں ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ اسی درخت کی شاخوں سے بے شمار کمزور طبقات کے افراد فیضیاب ہو رہے ہیں اور سماج میں باعزت مقام حاصل کر رہے ہیں۔

گزشتہ سوا سو برسوں میں مہاراشٹر میں تعلیم کے میدان میں جو بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ کرموویر بھاؤراؤ پاٹل کی ہی مرہونِ منت ہیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے مہاراشٹر میں تعلیم کے میدان میں نئی جوت جگائی ہے۔ آج ملک میں نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی جارہی ہے۔ مہاراشٹر میں اسے برائے تجربہ جاری کیا گیا ہے۔ اس پالیسی کے اثرات دیکھنے کے لئے سارا ملک نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اس پالیسی کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

"ہر ایک کے لئے تعلیم، لڑکیوں کے لئے تعلیم، خود روزگار کے لئے تعلیم اور ٹیکنیکل و کمرشیل تعلیم اور ان کے لئے سہولتیں، طلبہ کو ایسی تعلیم سے نوازنا جوان کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرسکے جس سے وہ ملک کے بردبار اور ذمہ دار شہری بن سکیں" انھیں مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر کرموویر بھاؤراؤ پاٹل نے مہاتما جیوتی با پھلے، پنڈت رمابائی، ساوتری بائی پھلے، راج شری شاہو مہاراج، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، ڈاکٹر پنجاب راؤ دیشمکھ اور سوامی ولیانند تیرتھ جیسے حضرات نے اپنی کوششوں سے اور بھی لگن و محنت سے جو ماحول تیار کیا ہے امید ہے کہ مہاراشٹر کا محکمۂ تعلیم انھیں پوری طرح ذمہ داری کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔

کرموویر کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے مہاراشٹر ہر طرح کے اقدامات کرنے کے لئے تیار ہے۔ ۶ تا ۱۴ سال کے بچے تعلیم سے مستفید ہوں اور دیہی علاقوں میں پرائمری اسکولوں کی سہولتیں فراہم ہوں۔ اس کے لئے یکم جولائی سے ریاست بھر میں "تعلیمی مہم" کا آغاز کیا جارہا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ کرموویر کی صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر اس سال جاری کردہ یہ مہم کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ اس مہم کو کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچانا کرموویر بھاؤراؤ پاٹل کے لئے صحیح معنوں میں ہمارا خراجِ عقیدت ہوگا۔

تعلیم سے متعلق کرموویر کے خیالات اور ان کے بتائے ہوئے راستوں سے عوام کو روشناس کرانے کے لئے ہی قومی راج کا یہ خصوصی شمارہ شائع کیا جارہا ہے جو یقیناً باعثِ مسرت ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس شمارے کے بلند پایہ مضامین ہمارے موجودہ تعلیمی مسائل کو سلجھانے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ اس خصوصی شمارے کے لئے میری نیک تمنائیں ہیں۔

پروفیسر رام میگھے
(وزیر برائے تعلیم)

****

پرنسپل ایس۔ ڈی۔ پاٹل

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی "رعیت شکشن سنستھا"

عوامی تعلیمی ادارہ "رعیت شکشن سنستھا" کا نزول ہمارے سماجی انتشار کے پس منظر میں ہوا ہے۔ بھارت زمانہ قدیم سے مذہبی فرقہ واریت، اندھی تقلیدات اور فرسودہ دقیانوسی نظریات کا شکار رہا ہے۔ مذکورہ ادارہ کے قیام کے وقت ملک کی کیفیت اپنی انتہا پر تھی چار ورنوں (برہمن، کشتریہ، ویشیہ اور شودر) نے ہندستانی سماج کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے رکھ دیا تھا، جس کے سبب مانو، سارا سماج لنگڑا، لولا ہو کر رہ گیا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے مظالم نے نچلے طبقے کے لوگوں کو جانوروں سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں بے جا رسم و رواج نے سماجی نظام کو کھوکھلا کرکے رکھ دیا تھا۔

سماج کو اس قعر مذلت سے نکالنے کی جن مصلحین نے جدوجہد کی ہے ان میں مہاتما جیوتی راؤ پھُلے کا نام بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ مہاتما پھُلے نے "ستیہ شودھک سماج" کے نام سے ایک جماعت قائم کرکے اس کے ماتحت، سماج کی ازسرِ نو تعمیر کے لئے تحریک چلائی۔ مہاتما پھُلے کی موت کے بعد بھی یہ جماعت اپنے مشن کے تحت کئی برس کام کرتی رہی ہے۔

"رعیت شکشن سنستھا" کے بانی کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل "ستیہ شودھک سماج" کے سرگرم اور باعمل رکن تھے۔ ۱۹۱۹ء میں ستارہ ضلع کے کالے نامی دیہات میں ستیہ شودھک جماعت کی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے دیہاتی عوام کی تعلیم کے مقصد کے تحت ایک خاص ادارہ کے قیام کا تصور پیش کیا، جسے ایک تجویز کی شکل میں منظور کیا گیا۔ اس طرح "رعیت شکشن سنستھا" کی تخم کاری "ستیہ شودھک سماج" کے پلیٹ فارم پر کی گئی۔ اسی بیج نے، کونپل اور پھر پودے کا روپ لیا اور گذشتہ ۶۰ سالوں میں یہ پودا بلند تناور درخت بن گیا۔

اس سنستھا کے تعلق سے جو بات نمایاں اہمیت اور اظہار کی حامل ہے، وہ یہ ہے کہ اس سنستھا نے اپنے طویل سفر اور اپنی عظیم ترویج و ترقی میں بھی اپنی سماجی اغراض و مقاصد اور افادیت پر ذرا آنچ نہیں آنے دی اور اپنے منصوبہ کی ہیئت کو ذرا تبدیل

ہونے نہیں دیا اور اسے بعینہ بڑے کارلاتے رہے اس منصوبے اور اس کے طویل المیعاد لائحہ عمل سے کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کے صد سالہ جشنِ ولادت پر عوام کو متعارف کرانا، انتہائی مناسب تو ہوگا ہی نیز یہ بات عوام کی رہنمائی بھی کرے گی۔ یہ ایک یقینی امر ہے۔

تعلیم کے ذریعے روزی، روٹی کے حصول کی تدابیر سمجھانا، ذہنی بیداری کے ذریعے قدامت پرستی کا تدارک کرنا، یکجہتی کی مدد سے باہمی نفاق کا انسداد کرنا، محنت اور جفاکشی کا احترام اور کاہلی و تن آسانی سے نفرت کرنا، یہی بھاؤ راؤ کا فلسفۂ حیات تھا۔

غرض انہی مقاصد کو حاصل کرنے کا منصوبہ، آپ نے اپنی "رعیت شکشن سنستھا" کے لئے بنایا۔

سنستھا کی ابتدائی شکل

مذکورہ سنستھا کا قیام کالے نامی دیہات میں عمل میں آیا لیکن ۵ سال کے بعد ۱۹۲۴ء میں کرم ویر نے سنستھا کا انتظامیہ دفتر ضلع کے مقام ستارہ میں منتقل کرلیا۔ اسی برس سنستھا کے انتظامیہ نے حصولِ تعلیم کے لئے دیہات سے آنے والے طلباء کے لئے ایک ہوسٹل قائم کیا۔ پہلے سال اسی ہوسٹل میں چار طالب علم تھے۔ ان چاروں کی تفصیل، ذات، فرقہ اور نظریات کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ ان میں سے دو مراٹھا، ایک جین، ایک ہریجن تھا۔ ۱۹۲۷ء میں، راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے ہاتھوں اس ہوسٹل کے لئے "شری چھتر پتی شاہو بورڈنگ ہاؤس" کے نام کا تعین کیا گیا۔ دیکھئے اس موقع پر، مہاتما جی نے، کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی عظمت کا اظہار کن شاندار لفظوں میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

"بھاؤ راؤ، جو کام میں سابرمتی آشرم میں نہیں کر سکا وہ کام تم نے یہاں کامیاب طریقہ پر کر دکھایا۔"

یہ بورڈنگ ہاؤس کیا تھا، بھاؤ راؤ کے قومی اشتراک تجربہ کا ایک خوبصورت نتیجہ تھا، جس سے مہاتما جی اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ وہ کئی برسوں تک اپنے "ہریجن سیوک سنگھ" کے تحت، اس بورڈنگ ہاؤس کو مالی امداد بہم پہنچاتے رہے۔

۱۹۳۵ء تک یہ سنستھا ایک ذاتی سنستھا کی حیثیت سے چلائی جاتی رہی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں یہ سنستھا "دی سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء" کے تحت باقاعدہ رجسٹرڈ کرائی گئی۔

ستارا کے رعیت شکشن سنستھا کا شری چھترپتی شاہو بورڈنگ ہاؤس۔

چار طالب علموں سے جس ہوسٹل کی بنیاد ڈالی گئی تھی وہ "شری چھترپتی ساہو بورڈنگ" رفتہ رفتہ بڑھتا پھیلتا گیا۔ وہاں وقت کے ساتھ طلباء کی صرف تعداد ہی نہیں بڑھی، بلکہ باہم رہنے والے طلباء کے اعتبار سے، مختلف ذاتوں اور فرقوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اس بورڈنگ ہاؤس کا پہلا سہ سالہ احوال (۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک) شائع کیا گیا تھا۔ اس کا ایک باب ذیل میں دیا جارہا ہے، جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بورڈنگ ہاؤس، دیہاتوں کے غریب اور نادار بچوں کے لئے، ماوا ایک پناہ گاہ ہو، ساوات اور یک جہتی کے میدان میں مؤثر انداز میں کام کرنے والا ایک تجرباتی مرکز ہو۔ دیکھئے، وہ باب یوں ہے:۔

"شری چھترپتی ساہو بورڈنگ ہاؤس" اپنی ہی نوعیت کا ایک ایسا مثالی ادارہ ہے جو انسانوں کے مابین پیدا شدہ انتہائی غیر فطری تفرقات کے دھبوں کو دھو رہا ہے، صاف کررہا ہے، اور اس طرح ایک راست۔ متحد بھارت کی تعمیر کی راہیں ہموار کررہا ہے۔ بورڈنگ کے موجودہ ۷۷ اطلباء میں ۵۷ مراٹھے۔ ۱۲ منسلک (دوستانہ) برادریوں کے ۱۲ برہمن، ۶ جین، ۱۳ مسلم، ۳۹ ہریجن، ۱۶ مانگ (ہریجنوں ہی ایک نچلی ذات)، ۱۵ چمار، ۵ راموشی، ۲ ڈھور اور اینٹ ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں ان تمام طلبا کی پرورش ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح کی جاتی ہے، جو ساتھ رہتے ہیں، ساتھ کھاتے ہیں اور ایک ساتھ عام منظم زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں ماہانہ خرچ فی کس صرف ساڑھے تین روپے ہے۔ ۱۷۰ طلباء میں سے ۱۲۱ ثانوی مدارس میں، ۲۰ تربیتی مدارس میں، ۶ صنعتی مدرسوں میں اور ۳۰ اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔"

کرم ویر کا یہ تجربہ، اس دور میں محض بے مثال نہیں بلکہ ایک نئے انقلاب کا حامل تھا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے، کیوں کہ اس دور میں، ہمارے ملک میں، قومی تفرقات اور سماجی اختلافات کچھ اس درجہ شدید نوعیت کے تھے کہ ان کے تدارک کا احساس پہلے ہی بعض کے ذہنوں میں جاگا ہوگا لیکن ان کے تدارک کے لئے عملی جسارت کا مظاہرہ صرف کرم ویر ہی کرسکے ہیں۔

"ظلمت گناہ نابود ہوا" گیانیشوری کا یہ مصرعہ کرنی بنیاد آنکھیں بند کرکے جذباتی انداز میں چھیڑدے تو فردوس گوش معلوم ہونے لگتی ہے، روح میں لمحہ بھر کے لئے ایک سکون بخش لہر اٹھ کر رہ جاتی ہے مگر ایسا کچھ صرف گا لینے گنگنا لینے سے اندھیرا دور نہیں ہوجاتا۔ گناہ کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے گناہ کی دنیا میں بلاواسطہ مشعلیں روشن کرنے کی ضرورت ہے اور کرم ویر نے اپنی سنستھا کے ماتحت یہی کارنمایاں انجام دیا ہے۔ قبر کے گڑھوں جیسے پیٹ اور بہتی ناک والے، مٹی میں اَٹے ہوئے چیتھڑوں میں آدھ ڈھکے بچے جمع کرنا، انھیں نہلانا، دھلانا، ان کے بیٹھے گڑھے بھرنا، انھیں تعلیم اور تربیت دینا اور پھر ان کا ہاتھ تھام کر انھیں دانش مندوں، سماجی رہنماؤں اور سیاستدانوں کی صف میں لاکھڑا کرنا۔ یہ اس سنستھا کی ہمیشہ عالمانہ کوشش رہی ہے۔ لیکن یہ سب ہو کس طرح ....؟ اس کے لئے ہریجنوں سے لیکر برہمنوں تک تمام ذات اور فرقوں کے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں سمیٹ کر انھیں جینے کے انداز اور طور طریقے سکھانے پڑے۔ ان میں سے ایک اناج پسوا کر لائے، دوسرا پانی لائے، تیسرا لکڑی ایندھن مہیا کرے، چوتھا روٹی بنائے، پانچواں روٹی سینکے، کوئی لہسن چھیلے، کوئی پیاز کاٹے تو کوئی سبزی کاٹے اور آخر میں باری باری صفوں میں کھانا کھائیں۔ اس وقت بھی کچھ کھانا کھلانے تو کچھ پروسنے۔

بتائیے زندگی کے اس معمول میں، اتفاق کے خمیر میں نفاق اور فرقہ دارانہ ذہنیت کا زہر کہاں رہے گا!؟ غرض جن کے گھروں میں پشتوں سے جہالت اور نفرت کے اندھیروں کا تسلط تھا وہاں کرم ویر نے علم اور باہمی محبت کے چراغ روشن کئے، جہاں پہلے ہی کچھ روشنی تھی، وہاں مزید چراغ روشن کرنے کی انھوں نے شاید ضرورت نہیں سمجھی، تاہم تسلیم کرنا پڑے گا کہ کرم ویر بھاؤ راؤ کا سماجی تجدید اور احیائے سماج کا یہ تجربہ یقیناً ایک انقلابی تجربہ تھا۔

چھترپتی ساہو بورڈنگ کے بعد سنستھا اس قسم کے ہوسٹلوں کی تعداد بڑھاتی گئی۔ اب تک اس سنستھا کے زیر اہتمام مختلف مقامات پر کل ۸۲ ہوسٹل قائم کئے جاچکے ہے جن میں ۱۲۱ و ۲۰۱۲،

طلبا قیام کرتے ہیں۔

چھترپتی ساہو بورڈنگ کے علاوہ بھی سنستھا گذشتہ ۴۶ برسوں سے قانون کی طرف سے سزا یافتہ بچوں کے لئے بھی ہوسٹل قائم کئے ہوئے ہے۔ اور گذشتہ پانچ برس سے نرادھار اور بے سہارا بچوں کے لئے بھی ہوسٹل چلا رہی ہے، جن میں بالترتیب ۵۰، ۵۵ اور ۵۰ بچے رہتے ہیں۔

اس موقع پر میں ایک اور بات کا فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہوں گا کہ مشترکہ قومی بورڈنگ ہاؤس قائم کرکے سنستھا کی طرف سے تمام مذاہب کے بچوں کے لئے تعلیمی سہولت بہم پہنچانے کے صلہ میں مرکزی حکومت نے، فروری ۱۹۵۵ء کو مخصوص گورنمنٹ ریزولیوشن کے ذریعہ، سنستھا کی حوصلہ افزائی کے نام پر دس ہزار روپیوں کا عطیہ بھی دیا ہے۔

گیان - دان تحریک

۱۹۳۵ء تک "رعیت شکسن سنستھا" صرف اقامت گاہیں چلا رہی تھی۔ گویا دیہاتوں سے تعلیم کے لئے بچوں کو سمیٹ کر کم سے کم خرچ میں ان کے قیام وطعام کا انتظام کرکے سماجی نقطۂ نگاہ سے ان کی مخصوص انداز میں تربیت کرکے، ان کے دلوں میں انسانیت اور انسان کے لئے باہمی درد کو جگانے کا ایک خاص مقصد پیش نظر تھا لیکن اپنے مشن کی وسیع حدیں کرم ویر کی نظر میں متعین تھیں۔ یہ درست ہے کہ "رعیت شکسن سنستھا" کم سے کم

ستارا میں مہاراجہ سیتاجی راؤ ودیالیہ۔

ریج میں طلبا کے قیام وطعام کا اہتمام کر رہی تھی۔ لیکن اس منصوبہ
فائدہ کتنے لوگ اٹھا رہے تھے؟ دیہاتوں کی آبادیوں کے
اسب سے ایسے لوگوں کی تعداد نہیں کے برابر تھی۔ عوام میں
رت ایسے مفلس اور کنگال لوگوں کی تھی جو کم خرچ پر بھی اپنے بچوں
تعلیم کے لئے شہر میں بھیجنے کی سکت اپنے میں نہیں پاتے تھے۔
اسی تو تھی ہی، ان کا گنوار پن بھی ایک مسئلہ تھا جو بحیثیت تھے
تعلیم کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتے تھے "کیا لینا ہے۔ بچوں کو
پڑھا لکھا کر!؟" اور وہ اپنے بچوں کو گھر پر ہی رکھتے تھے۔
لڑکیوں کی تعلیم کی بات تو تخیل سے بھی پرے کی بات تھی، ان حالات
ات دینے کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف تو تعلیم غریبوں
ن جھونپڑیوں تک پہنچائی جائے اور دوسری طرف تعلیم اور اس
ی اہمیت کے تعلق سے عوام میں بیداری پیدا کی جائے۔ کرم ویر
نے دکھتی رگوں کو پہچانا اور ان پر صحیح انداز میں انگلی رکھی۔

رضا کارانہ مدارس

۱۹۳۱ء میں ریاست مہاراشٹر میں تعلیم کا اوسط صرف ۸ فیصد
تھا۔ ایسے میں دیہاتوں میں بڑے پیمانے پر کم از کم پرائمری اسکولوں
ا اجرا ضروری تھا، اور پھر جتنے زیادہ اسکول ہوں اتنے زیادہ
اساتذہ بھی ضروری تھے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے
بھاؤراؤ نے سب سے پہلے ستارہ میں ۱۹۳۵ء میں ابتدائی
درجوں کے لئے معلم تیار کرنے کے لئے ایک تربیتی کالج قائم
یا جو "مہاتما پھلے ٹریننگ کالج" کے نام سے آج بھی موجود ہے
س کے بعد سنستھا نے دوسرے اضلاع میں مزید ٹریننگ
کالج قائم کئے۔ لیکن مہاتما پھلے ٹریننگ کالج "سنستھا کی "گیان
دان تحریک" کا پہلا قدم تھا۔

ایک طرف ابتدائی مدرسوں کے لئے معلم تیار کرنے کی مہم
اور دوسری طرف دیہاتوں میں دربدر بھٹک کر عوام کو بیدار کرنے
کی جد و جہد اور بہ ضرورت پھر اسکول قائم کرنے کی تگ و دو نے
کرم ویر کو بھاؤ دیا۔ کرم ویر نے اپنی سنستھا کے تحت مہاراشٹر
کے مختلف اضلاع میں ۵۵۷ رضاکارانہ اسکول قائم کئے تھے
تھا ہے بعد میں یہ اسکول حکومت نے اپنے قبضے میں لے لے
فی الوقت صرف ۴ ابتدائی مدرسے سنستھا کے زیر نگرانی چل
رہے ہیں۔

ثانوی مدارس

ابتدائی تعلیم تو پہلا مرحلہ تھا۔ اس لئے صرف اتنے ہی سے تو
سماج میں نئی پود کی مکمل شخصیت کی نشوونما تو نہیں ہو سکتی تھی،
اس کے لئے نئی نسل کو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے
ذرائع فراہم کرنے کی بھی ضرورت تھی غرض سنستھا نے دیہاتوں
قصبوں میں ثانوی مدرسوں کے قیام کا پروگرام ہاتھ میں لیا۔
سنستھا نے اپنا پہلا ثانوی مدرسہ ۱۹۴۰ء میں ستارا ضلع میں
قائم کیا۔ اور اسے "مہاراجہ سیواجی راؤ ودیالیہ" نام دیا۔ بعد ازاں
مہاراشٹر کے کئی اضلاع میں ثانوی مدرسے قائم کئے گئے۔
جن کی تعداد فی الوقت ۱۹۱ ہے، جن میں سے بیشتر اسکول
دیہی علاقوں میں ہیں۔ بعض اسکول تو ایسے مقامات پر ہیں،
جہاں آسانی سے پہنچنا بھی مشکل ہے۔ یہ تمام اسکول ستارا، سانگلی
کولھاپور، رتناگیری، سندھودرگ، شولاپور، پونے، احمد نگر، بیڑ
ناشک، رائے گڑھ اور تھانے، ان بارہ ضلعوں کا اور کرناٹک
میں ضلع بیلگام کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم

سنستھا نے ۱۹۴۷ء میں ستارا میں "چھترپتی شیواجی مہاراج
مہاودیالیہ" قائم کرکے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پہلا قدم رکھا۔
اس مہاودیالیہ کی ابتدائی تشکیل میں بھی، بھاؤراؤ کے سماجی زندگی
کی تعمیر سے متعلق جو تصورات تھے، انھیں کا عکس ملتا ہے۔
ان کا یہ اعلان تھا:

"میرا یہ کالج مفت ہوگا اور اس
میں طلباء کے لئے اقامت گاہیں
بھی ہوں گی"

مفت اس لئے کہ غریب، فیس کا بوجھ برداشت نہ کر سکنے
کی بنا پر اپنے بچوں کو داخل ہی نہیں کرائیں گے۔ اور اقامت گاہیں
اس لئے ہوں گی کہ یہاں آنے والے مختلف ذات اور فرقوں
کے طلباء میں محنت کشی، مساوات اور بھائی چارے جیسے صالح
جذبات کی تخلیق و تعمیر آج کے سماج اور سماجی زندگی کی اہم ضرورت
تھی۔

اس پہلے کالج کے قیام کے بعد اب تک بھی سنستھا نے اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں اپنی پیش قدمی برابر جاری رکھی ہے۔ شیواجی، پونے اور بمبئی اعلیٰ تعلیم کی ان تینوں یونی ورسٹیوں میں، سنستھا کی طرف سے فی الوقت کل ۲۹ کالج چلائے جا رہے ہیں جن میں ایک انجینیرنگ، دو تعلیمی تربیت گاہیں اور ایک لا کالج شامل ہیں۔

ان تمام کالجوں کے قیام کے سلسلے میں کرم ویر کا ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے کہ دیہی علاقوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے وسیع ذرائع کا اہتمام کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ سنستھا کے قائم کردہ کالجوں میں سے بیشتر کالج دیہی علاقوں میں ہی چلائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے دہی دکھی اور لونندہ (ضلع ستارا)، وٹیا (ضلع سانگلی)، ماڈھا ضلع سولاپور، کرجت اور شری گوندا (ضلع احمد نگر)، منچر (ضلع پونے) اور مورواڈا (ضلع تھانے) ان مقامات کے کالج تو گویا انتہائی پسماندہ اور قحط زدہ علاقوں میں ہی قائم کئے گئے ہیں۔ موروواڈا ڈ مکش ادیباسیوں کا علاقہ ہے۔

دیگر شاخیں

سنستھا کا دائرۂ کار صرف اسکولوں اور کالجوں کے قیام تک محدود نہیں رہا ہے۔ ملازمت پیشہ لوگوں کے لئے فلاحی ادارے، غریب اور ضرورت مند طلبا کی مدد، سنستھا کے اخراجات میں کفایت شعاری وغیرہ باتوں کے تعلق سے سنستھا کی کارآمد اور مفید منصوبے بھی عمل میں لاتی ہے۔ چار شاخوں پر مشتمل ایک "رعیت سیوک کو آپریٹیو بینک" ایک مالیاتی امدادی ادارہ، ایک کو آپریٹیو اسٹورس، ایک پرنٹنگ پریس، ایک خاندانی فلاحی ادارہ، سیوک ویلفیئر فنڈ، پنچایتی نظام کا تربیتی مرکز وغیرہ کئی ادارے، ضمنی اداروں کی حیثیت سے سنستھا نے قائم کئے ہیں۔

فی الوقت سنستھا کے زیر اہتمام چلنے والے اسکول، کالج اور دیگر اداروں کی کل تعداد ۴۹۲ ہے اور ان سارے اداروں میں ۱۲,۰۰۰ کارندے خدمات انجام دیتے ہیں۔

کماؤ اور تعلیم حاصل کرو

طلباء کو خود اپنے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کے مقصد سے تعلیم کے ساتھ محنت کشی کی تربیت دینا سنستھا کے تعلیمی نظام کی ایک نہایت اہم خصوصیت رہی ہے۔ گویا یہ کرم ویر کے فلسفۂ تعلیم کا ایک مخصوص عنصر رہا ہے کہ مفلسی کسی بھی طالب علم کی تعلیم میں حائل نہ ہو۔ اس لئے اسے جسمانی محنت اور مشقت کے ذریعے خود کچھ کما کر اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہئے۔ اپنے اس منصوبے کے ضمن میں کرم ویر کے دو اہم مقاصد پوشیدہ تھے۔ ایک یہ کہ کسی بھی تعلیم یافتہ نوجوان کو جسمانی

ضلع سانگلی کے مقام وٹیا پر رعیت شکشن سنستھا کا بلونت کالج۔

رعیت شکن سنتھا اسکول کے طلبہ
جو گنّے کے کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔

نت سے عار محسوس نہیں کرنا چاہیئے اور دوسرا مقصد یہ کہ
اتوں کے محنت کش لوگوں اور شہروں کے تعلیم یافتہ اور مہذب
بقہ کے درمیان پائی جانے والی امتیازات کی دیوار ختم ہو جائے۔

کماؤ اور تعلیم حاصل کرو

" دورانِ تعلیم
ت کشی کا یہ منصوبہ " رعیت شکن سنتھا " کے قیام سے
لے کر آج تک بدستور عمل میں لایا جا رہا ہے۔ سنتھا کے پہلے
بتربتی ساہو بورڈنگ ہاؤس " کے طلبا کو بورڈنگ کے
ے کام خود ہی کرنے پڑتے تھے اور آج بھی کم و بیش وہی طریقہ
رائج ہے۔ بعد کے برسوں میں ہائی اسکولوں اور کالجوں کے
با کے لئے بھی یہ منصوبہ عمل میں لایا گیا ہے۔ پتھر توڑنا، زمین کو
ار کرنا، کھیتی باڑی کے کام، سنتھا کی عمارتوں کے لئے اینٹیں
ر کرنا۔ معماروں کے ساتھ مزدوروں کی حیثیت سے کام کرنا۔
یسے کئی کام سنتھا کے طلبا برابر کرتے رہے ہیں اور آج بھی
رہے ہیں۔

سرکاری خدماتی ملازمتوں میں پسماندہ طبقوں کو ترجیح

اِن دنوں حکومت نے سرکاری خدماتی ملازمتوں میں پسماندہ طبقوں
کے لئے ایک خاص تناسب مقرر کر دیا ہے لیکن " رعیت شکن سنتھا "
نے تو اپنے قیام کے وقت ہی سے اپنے یہاں ملازمتوں میں پسماندہ
طبقے کے امیدواروں کو ترجیح دی ہے اور اس کا زندہ ثبوت یہ ہے
کہ فی الوقت سنتھا کے مختلف اداروں میں ۱۳۲ مختلف فرقوں اور
ذاتوں کے لوگ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ سرکاری محکمہ جات
کے علاوہ کسی بھی سنتھا یا ادارہ میں اس کی مثال اگر ناممکن نہیں تو،
یقیناً دشوار ضرور ہے۔

فرقہ وارانہ آلودگی سے پاک انتظامیہ

اگر کسی ادارہ کو فرقہ واریت سے محفوظ رکھنا ہو تو سب سے پہلے
اس کے انتظامیہ کو ذات پات کی آلودگی سے پاک رکھنا چاہیئے
اس اعتبار سے اگر اس سنتھا کے انتظامیہ کا جائزہ لیا جائے تو اس
کے قیام کے وقت ہی سنتھا نے، ملازموں کی تقرری کے سلسلہ
میں فرقہ وارانہ ذہنیت اور جذبہ کو قطعی خاطر میں نہیں لایا، بلکہ
علمیت، اہلیت، دیانتداری اور خدمت گذاری کے جذبوں کو دیکھ
پرکھ کر ہی ہمیشہ ملازموں اور کارندوں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔

کرم ویر بذاتِ خود جین مذہب کے پیرو تھے، لیکن سنتھا کے
قیام کے موقع پر انھوں نے برہمن، مسلمان، مراٹھا، جین، مارواڑی،
ہریجن ان سب کا تعاون حاصل کیا ہے۔ مثال کے طور پر " رعیت
شکن سنتھا " کے پہلے صدر شری حمید علی (کلکٹر ضلع ستارہ)

یہ ایک مسلمان تھے، شری اے۔ بی۔ موہتے، یہ پہلے اعزازی سکریٹری بنائے گئے اور شری کے۔ ایس۔ وکشت، پہلے ٹریننگ کالج کے پہلے پرنسپل برہمن تھے۔ ان کے علاوہ آر۔ بی۔ کالے (برہمن) آر۔ بی۔ بھٹھا (مارواڑی)، سردار پنڈت راؤ (برہمن) اور خود بھاؤراؤ (جین) سنستھا کے ابتدائی معتمدین خاص بھی تھے۔

شری اے۔ بی۔ موہتے کا تقرر مختصر وقفہ کے بعد ہی انتقال ہوجانے سے اس عہدے پر بی۔ ایس۔ بارٹکے پیشے سے اس درزی شخص کا، آنریری سکریٹری کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔

شری حمید علی کے بعد، شری آر۔ بی۔ کالے (برہمن) سنستھا کے دوسرے صدر مقرر ہوئے۔ اور ان کے بعد تیسرے صدر کی حیثیت سے شری آر۔ بی۔ بھٹھا کو چنا گیا۔

سنستھا کی انتظامیہ کونسل ادارہ کے دستور کی رو سے اعلیٰ ترین اختیارات کی حامل جماعت ہے۔ اس جماعت کے چیئرمین ہی تمام انتظامات کے نگراں ہوتے ہیں۔ اسی طرح سنستھا کے سکریٹری (انتظامیہ کونسل کے سیکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کرتے ہیں) کے ساتھ ہی نائب سکریٹری، محاسب (Auditor)، انسپکٹرس جیسے کچھ خاص عہدیدار بھی سنستھا میں متعین ہوتے ہیں۔ ان تمام عہدیداروں میں چیئرمین، سکریٹری اور نائب سکریٹری ان عہدوں پر کام کرنے والے لوگوں کی معلومات کا، ذات پات اور فرقہ کے اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سنستھا کا یہ نظام کار ہر طرح کی تفرقہ بندی سے آزاد ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔

چیئرمین کے عہدہ پر آج تک مسلمان، برہمن، مراٹھا اور ہریجن ذات کے لوگوں نے کام کیا ہے۔ شری رام بھاؤ نکوڈے، جو ہریجن ذات سے تعلق رکھتے تھے اپنی خدمت گذاری کے جذبہ کے تحت ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۵ء کے اخیر تک مسلسل ۱۶ برس تک اس عہدہ کو شاندار طریقہ پر سنبھالا ہے۔

سکریٹری کا عہدہ کسی بھی ادارہ کی نظامت کے تعلق سے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر اب تک مراٹھا، درزی، مسلمان اور جین لوگ فائز رہے ہیں۔ شری اسمٰعیل صاحب مُلّا۔ یہ مسلمان شخص تو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۳ء (انتقال تک) پورے تیئیس سال تک سکریٹری کے فرائض انجام دیتا رہا تھے۔

نائب سکریٹری، اس عہدہ کے تعلق سے بھی سنستھا کی کچھ ایسی ہی تاریخ دیکھنے کو ملتی ہے۔ جبکہ کوشٹی، مراٹھا، گجر، سنار، نائی اور مانگ جیسے فرقوں کے لوگ اس عہدے کو سنبھالتے رہے

کرم ویر کی جشنِ ولادت کی تقریبات کے سلسلے میں ہندوستانی اور غیر ملکی طلبہ کرم ویر کی سمادھی پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔

س سنستھا میں "بورڈ آف لائف ممبرس" یہ اعلیٰ اختیارات کا
یا اہم شعبہ ہے۔ سنستھا کے روزمرہ کے فرائض اور ذمہ داریاں
ر بھی اسی شعبہ کے ماتحت ہے۔ اس شعبہ میں بھی مراٹھا،
براہمن، سامان، مانگ، پریٹ، دھنگر، نہائی، لنگائیت،
یسی مختلف ذاتوں کے لوگ کام کر رہے ہیں۔
رض سنستھا اپنے قیام کے وقت سے اب تک کی فرقہ وارانہ
ت سے قطعی پاک رہی ہے۔

یاسی ہتھکنڈوں سے پاک

سیاسی مفاد پرستی کسی بھی جماعت، انجمن یا ادارہ کے بنیادی
ر کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ بات تجربوں سے بار بار
بت ہو چکی ہے۔ اسی خطرہ کے پیش نظر کرم ویر نے اپنی
تھا کو سیاسی آلودگی سے ہمیشہ بچائے رکھا ہے اور سنستھا
لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ
تھا کی بنیادیں اب تک بھی ہر طرح مضبوط ہیں، جیسے سنستھا کی
بندی سیاسی راولوں کے لئے ایک کسوٹی رکھا ہو۔ یہ سچ
ایک سیاسی سلسلے سے نہیں مختلف سیاسی حلقوں میں کام
نے والے لوگ اس سنستھا میں ہیں، اس کے انتظامیہ میں
لیکن وہ سب باہمی اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔
کہ سنستھا کا کام کرنے کے دوران وہ تمام اپنے سارے
سی نظریات اور تفرقات کو ذہن سے خارج کر دیتے ہیں۔
فیصلہ متفق ہو کر کرتے ہیں سنستھا کی تاریخ میں کہیں
ایسی مثال نہیں ملتی کہ کوئی فیصلہ کرتے وقت ان میں اختلاف
ے کا ذرا بھی عنصر دکھائی دیا ہو۔

سنستھا میں عہدوں کے لئے

کبھی چناؤ نہیں ہوئے

متفقہ فیصلے روزمرہ کے کاموں میں ہی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے
صدر، نائب صدر، سکریٹری۔ ان عہدوں کے لیے، انتظامیہ
نمائندوں اور کارندوں کے تقرر کے سلسلے میں بھی مسلم پسندانہ

اتفاق رائے سے انہیں منتخب کر لیا جاتا ہے۔ ویسے سنستھا
کے دستور میں انتخابات کی گنجائش رکھی گئی ہے لیکن باقاعدہ
الکشن یا چناؤ کبھی نہیں ہوتے۔ سنستھا کی ۶۷ سالہ تاریخ میں
کسی بھی عہدے کے لئے کبھی کوئی انتخاب نہ ہوا۔ یہ بات اس کے
کارندوں کی پُر اعتماد کارکردگی اور بے داغ انتظامیہ پر دلالت
کرتی ہے۔

غرض "رعیت شکشن سنستھا" گذشتہ ۶۷ برس سے اپنے
مخصوص نظریاتی اغراض و مقاصد کے تحت کام کر رہی ہے، جن
کی بدولت انسان انسان کے بیچ کی بے جا منافرت ختم ہونے اور
باہمی خلوص، ہمدردی، مساوات اور محبت کو فروغ حاصل
ہونے میں مدد ملی اور دیہی علاقوں کے بیشمار گنوار اور جاہل
خاندانوں کو علم و عمل کی روشنی ملی اور پشتوں سے مفلسی کے
دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو جینے کی طرح جینے کا سلیقہ ملا۔
یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "رعیت شکشن سنستھا" نے اپنی
بے مثال کارکردگی سے مہاراشٹر کے عوام کی سماجی زندگی
کی تجدید و تعمیر میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ مدتوں تک بھلایا
نہیں جا سکے گا۔

مراٹھی سے ترجمہ: مرزا اسرار قاسمی
۱۴۹۔ کیو/۴ /اے
فیت والا کمپاؤنڈ، پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۷۰
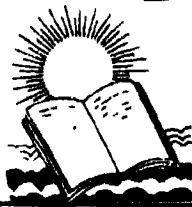
بھاسکر دھونڈ کرے

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل اور تعلیمِ نسواں

انیسویں صدی کے اختتام تک ہمارے ملک میں تعلیمِ نسواں کا کوئی رواج نہیں تھا۔ البتہ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ویدک عہد میں عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ گارگی اور میتریی جیسی تعلیم یافتہ عورتوں کا ذکر اس کا ثبوت ہے۔ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم عام تو نہیں تھی تاہم ذہین خواتین اپنی فراست سے تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں۔ جب سماج میں بچپن کی شادی کا چلن عام ہوا تو عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ بہت ہوا تو انھیں ابتدائی تعلیم دے دی جاتی وہ بھی گھر کی چار دیواری میں۔

جس طرح تاریخ میں بعض عظیم خواتین کا ذکر ملتا ہے اسی طرح بعض سنت خواتین کے نام بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں لیکن ڈیڑھ سو برس قبل تک "لڑکی" کو مدرسے میں پڑھانے کا تصور نا پید تھا اس زمانے تک مردوں نے بھی تعلیمی میدان میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں کی تھی۔

عام طور پر سات آٹھ برس کی عمر میں لڑکیوں کا بیاہ کر دیا جاتا تھا اس لئے ان کا مدرسے میں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کی زندگی سے وہ تقریباً ناواقف تھیں۔

طلبہ کی خاطر اسکول کھولنے کا تصور بالخصوص مشنری والوں کی دین ہے۔ انگریزوں نے اپنی عملداری میں لڑکوں کی تعلیم کی طرف قدرے توجہ ضروری مگر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے کوئی دخل نہیں دیا۔ اس کی وجہ صاف تھی

م لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔

انگریزوں کے تسلط اور انگریزی تہذیب کے اثرات نے
ں میں رفتہ رفتہ انگریزی تعلیم میں دلچسپی پیدا کی۔ نیز سماج
عورت پر ہونے والی ناانصافیوں کی طرف بھی ان کا دھیان
س طرح اَن پڑھ بیوی مردوں میں ناپسندیدہ نگاہوں سے
ی جانے لگی۔ اور پہلی بار گوپال راؤ جوشی جیسے جری رہنما
ہوئے جنھوں نے سماج کی مخالفت کے باوجود اپنی بیوی کو
دی۔ رانا ڈے جیسے سماجی مصلح کاروں کی کاوشوں سے پونے
حضور پاگا کا قیام عمل میں آیا جس کی تھوڑی بہت مخالفت کی گئی

بنگال میں ایشور چند ودیا ساگر اور راجہ رام موہن رائے
تعلیم نسواں کی تحریک چلائی۔ مہاراشٹر میں راؤ صاحب
ر لک، نیائے مورتی رانا ڈے۔ مہاتما جیوتی با پھلے، پنڈتا ر
ائی وغیرہم نے لڑکیوں کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی۔ اس سے
ں لڑکیوں کا اسکول الگ سے نہ ہونے کے سبب انتظام
رتوں کی تعلیم میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوسکا۔

۱۸۲۱ء میں کلکتہ میں اور ۱۸۲۴ء میں بمبئی میں لڑکیوں کے
ول شروع ہوئے مگر یہ اسکول مشنری کے زیر اہتمام چلائے
تے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں الفنسٹن کالج کے چند حوصلہ مند طلبہ نے
ٹوڈنٹ لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی" نامی انجمن بنائی
ر اس کے زیر نگرانی بمبئی میں لڑکیوں کا اسکول شروع ہوا۔ جگناتھ
شنکر راؤ سیٹھ، ڈاکٹر بھاؤ داجی، سر منگل داس نتھو بھائی جیسے سیاسی
ہنما اس ادارے کی پشت پر تھے۔ ان کے علاوہ دادا بھائی
روجی جیسے عظیم رہنما اس سوسائٹی میں مرکزی ستون کی حیثیت
ے شامل تھے۔ یہ تحریک بمبئی کی حد تک محدود نہیں رہی آگے
ل کر پونے میں جیوتی راؤ پھلے نے ۱۸۵۱ء میں لڑکیوں کا
رسہ قائم کیا اور سب سے پہلے خود اپنی بیوی کو تعلیم دی
بعد میں اپنی مدرسے میں معلمہ کی حیثیت سے اپنے فرائض
جام دینے لگیں۔ تعلیم نسواں کی یہ ایک ابتدائی مگر نمایاں
شش تھی اس زمانے میں کسی اونچے گھرانے کی خاتون
عض گھر کی چار دیواری کے باہر قدم رکھنا بھی ایک ترقی
سند اقدام تصور کیا جاتا تھا اور تعلیم یافتہ طبقے کی جانب سے
ں کی تجزیہ پذیرائی بھی ہوتی تھی مگر رجعت پسند افراد کی
انب سے بہرحال سخت نکتہ چینی ہوتی۔

پنڈتا رما بائی کے والد کو اس بات پر بھی کافی پریشان
کیا گیا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو تعلیم دی تھی۔ رما بائی کو بھی
مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بعد میں وہ امریکہ چلی گئیں۔ انھیں
دنوں آنندی بائی جوشی نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔

پچھلی صدی کے آخری نصف حصے میں اس قسم کی غیر معمولی
مگر کمیاب مثالیں مل جاتی ہیں چونکہ بچپن کی شادی کا رواج اور
ذات پات کا بھید بھاؤ اپنی شدت پسندی کے ساتھ قائم تھا
اس لئے سماج میں تعلیم نسواں کے خلاف شدید غم و غصہ
پایا جاتا تھا غرضیکہ مجموعی طور پر تعلیمی ترقی کا سلسلہ بے حد
دھیمی رفتار سے جاری تھا۔ آگے چل کر جیوتی با کو اپنا مدرسہ بند
کرنا پڑا مگر ۱۸۸۴ء میں قائم شدہ "حضور پاگا" البتہ جڑ پکڑ چکا
تھا لہٰذا اس کا ارتقا بھی ہوتا رہا۔

اس مدرسے کے قیام کے دوران مذہبی کٹر پسندوں نے خوب
شور مچایا۔ عورتوں کو تعلیم دینا پاپ ہے انھیں تعلیم دی گئی تو وہ چڑیلیں
بن جائیں گی، خاندانی نظام تہس نہس ہو جائے گا۔ لڑکیوں کو ملازمت
تو کرنا نہیں ہے پھر تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکیوں کو پڑھا لکھا کر مرد
چولہا چکی سنبھالنا تو نہیں چاہتے؟ زیادہ سے زیادہ انھیں شادی سے
پہلے معمولی پڑھنا لکھنا سکھایا جا سکتا ہے بس۔ حضور پاگا کے خلاف
اس قسم کے دقیانوسی خیالات کا سلسلہ جاری رہا۔ علاوہ ازیں "حضور
پاگا" کی صدر معلمہ زنانہ مشن کی مس ہرفرڈ تھیں۔ اس لئے بھی یہ مخالفت
مزید شدت اختیار کر گئی۔ ۱۸۸۴ء میں (کیسری) اخبار میں یکے بعد
دیگرے چار پانچ مضامین اس ضمن میں شائع ہوئے اس خوف سے کہ
کرسچین تحریک کی زیر تربیت سماج کی لڑکیاں مذہب سے منحرف
ہو جائیں گی تو کھل کر مخالفت پر اتر آئے۔

آگرکر نے "کیسری" کے مضامین کا جواب دیا اور مخلوط تعلیم
کی ضرورت اور اہمیت کو دلائل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی
تعلیم نسواں کا مذاق اڑانے کی خاطر نسائی تعلیمی ناٹک لکھا گیا جسے
مخالف جماعت نے کافی پسند کیا۔ غرض قدم قدم پر تعلیم نسواں کے
خلاف سنجیدہ غیر سنجیدہ مخالفتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

جلد ہی ۱۸۸۹ء میں پنڈتا رما بائی نے بمبئی میں "شاردا سدن"
قائم کیا جس میں نہ صرف کنواری لڑکیاں بلکہ بیوہ عورتیں بھی تعلیم حاصل
کرنے لگیں۔ بعد ازاں یہ ادارہ پونے منتقل ہو گیا۔ لیکن ۱۸۹۳ء میں
"شاردا سدن" کی دس بارہ لڑکیوں نے بپتسمہ لیا۔ رما بائی

ضلع پونے میں ڈھیلے مقام پر
رعیت شکشن سنستھا کا
مہارشی والمیکی جونیئر کالج۔

گر سچین تھیں اس کے باوجود ان کے ادارے کو ڈاکٹر بھانڈارکر وغیرہ جیسے روشن خیال لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن چند لڑکیوں کے تبدیلیٔ مذہب کے سبب اخبارات میں رما بائی کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بیشتر لڑکیاں شاردا سدن چھوڑ کر چلی گئیں اور مجبوراً انھیں بیواؤں کی تعلیم کا خیال ترک کر دینا پڑا۔ اور وہ یتیم معذور افراد کے امداد کی کام میں جٹ گئیں اور انھوں نے اپنا ادارہ کیڈگاؤں میں منتقل کر لیا بیواؤں کی تعلیم کی بنیاد رما بائی نے رکھی۔ مہاراشٹر ان کے اس احسان عظیم کو بھلا نہیں سکتا۔ لیکن ان کے ادارے کی پالیسی کا

ڈھانچہ بدل جانے کے سبب تعلیمِ نسواں کی پیش رفت میں کچھ دشواریاں ضرور پیش آئیں۔

جب اناصاحب کروے نے ۱۸۹۶ء میں یتیم لڑکیوں کا آشرم قائم کیا تو اس میں بیواؤں کے ساتھ یتیم لڑکیوں کو بھی تعلیم دی جانے لگی یہ ادارہ جلد ہی کافی معروف ہو گیا۔

بیسویں صدی کے آغاز تک لڑکیوں کو مدرسوں میں تعلیم دینے کی مخالفت تقریباً ختم ہو گئی مگر اس بات پر اصرار موجود تھا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم میں امتیاز ضروری ہے۔ ہنگنے کے ادارے نے لڑکیوں کی تدریس میں کچھ تجربے بھی کئے۔ سابقہ نصاب میں تبدیلی کرکے ۱۹۱۶ء میں "مہیلا ودیا پیٹھ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بعد میں ان اصلاحات کو دیگر تعلیمی اداروں نے بھی تسلیم کر لیا اس زمانے میں لڑکیوں کے لئے الگ کالج کی بات بیشتر لوگوں کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔ لیکن اسے کچھ لوگوں کی نظریاتی تائید ضروری حاصل تھی۔

پچھلے سال ہنگنے کے اس قدیم ادارے نے اپنے نوّے برس پورے کئے۔ مہیلا ودیا پیٹھ، کو حکومت کی منظوری ملے ہوئے بھی ۳۵ برس گذر چکے اب وہ مہاراشٹر کی سات یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے اس کے باوجود بھارت خواتین کے کالجوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے یونیورسٹیاں بھی دو ایک ہی ہیں۔ فی زمانہ سماج نے مخلوط تعلیم کو قبول کر لیا ہے۔ تاہم ہمارے موجودہ معاشرے نے مخلوط تعلیم کو ابھی صدفی صد تسلیم نہیں کیا ہے۔

ابتدائی مدارس میں طلبہ اور طالبات ضرور ساتھ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر ثانوی درجے میں لڑکیوں کے اسکول الگ ہو جاتے ہیں۔

ساٹھ برس پہلے بمبئی اور پونے شہر سے باہر لڑکیوں کی تعلیم کا الگ انتظام نہیں تھا۔ اس لئے لڑکیاں تعلیم میں لڑکوں سے پیچھے رہ گئیں۔

ہنگنے کی اقامت گاہ میں دور دور سے طالبات داخلے کے لئے آئیں۔

آگے چل کر مقامی تعلیمی اداروں اور انجمنوں کی مدد سے بمبئی، پونے، ستارا، وائی، بیلگام جیسے مقامات پر لڑکیوں کے مدارس قائم کئے گئے تاکہ زنانہ یونیورسٹی میں کافی تعداد میں طالبات داخلہ لے سکیں۔ بعض جگہوں پر لڑکوں کے مدرسوں میں بھی لڑکیوں نے داخلہ لیا۔ انھیں کوششوں کے سبب پچھلے تیس، چالیس برس میں

بوں کی تعلیم میں تھوڑی بہت توسیع ہوئی ہے لیکن آج بھی تعلیمی
ان میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلے میں خاصی کم ہے۔

تعلیم نسواں کے مذکورہ بالا تاریخی مطالعے سے یہ بات خاطرنشان
جاتی ہے کہ تعلیمِ نسواں ہی نہیں مردوں کی تعلیم کا دائرۂ عمل کچھ
ے شہروں تک ہی محدود رہا۔ نیز تعلیم کو ہر سمت اور ہر طبقے میں
م کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ گاؤں دیہاتوں میں رہنے والے
کو تعلیم کی خاطر شہروں کا رخ کرنا پڑتا تھا اور ایسے طلبہ کی تعداد
ی مایوس کن ہوتی تھی کیونکہ صرف دولت مند گھرانوں کے لڑکے
شہر میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کا جنم ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اس زمانے کی
لیمی صورت حال کیا تھی اس کا تفصیلی جائزہ یہاں اس لئے پیش
کیا ہے تاکہ ان کے بچپن میں مہاراشٹر کا تعلیمی پس منظر واضح ہو سکے

ان کا جنم ایک دیہاتی جین گھرانے میں ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم
دڈے گاؤں میں ہوئی۔ آگے انھوں نے کولہاپور میں جین بورڈنگ
ں داخلہ لیا لیکن ان کی انگریزی کی باقاعدہ تعلیم ششم جماعت سے
گے نہ بڑھ سکی۔ بچپن ہی سے ان کا مزاج باغیانہ تھا اور وہ بہت
بے باک تھے۔

مہاتما جیوتی با پھلے اور چھترپتی شاہو مہاراج کے ان پر گہرے
ثرات تھے وہ اس بات سے کافی متاثر تھے کہ مہاراج سبھی ذات
ات کے لوگوں کے ساتھ برابری سے پیش آتے ہیں۔ آئندہ انھوں
نے اسی اصول کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنایا۔ خاندانی زراعت کے
کام میں ان کا دل نہیں لگا وہ فطری طور پر ایک مدرس تھے۔ کچھ
عرصہ وہ پرائمری ٹیچر بھی رہے۔ وہ اپنے طلبہ میں کافی ہردلعزیز
تھے۔

کولہاپور میں کنگ ایڈورڈ کے مجسمے پر کسی نے کولتار لگا دیا
اناصاحب لٹھے پر شبہ کیا گیا چند روز قبل ہی بعض وجوہات
کی بنا پر اناصاحب لٹھے نے انھیں بورڈنگ ہاؤس سے نکال دیا
تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ بھاؤ راؤ اناصاحب لٹھے کے خلاف گواہی
دے کر موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ مگر بھاؤ راؤ نے جھوٹی گواہی دینے
سے صاف انکار کر دیا۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے ان کی بلند کرداری
کا پتہ چلتا ہے۔

اس ہنگامے کے بعد بھاؤ راؤ کنڈل کے لئے روانہ ہو گئے
اور راد گلے اور کرلوسکر کے سیلس ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنے
لگے۔ بعدازاں وہ ستارا میں نئے قائم شدہ کوپر کارخانے میں
ملازم ہو گئے۔ بھاؤ راؤ کا رویہ بڑا حقیقت پسندانہ تھا اور وہ بڑے
صاف گو تھے۔ ۱۹۲۲ء میں وہاں بھی ان کے اختلافات ہو گئے اور
وہ ملازمت بھی جاتی رہی اس وقت ان کی عمر ۳۵ برس کی تھی
مگر ابھی ان کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں آیا تھا۔ کارخانے کے کاموں
کے لئے انھیں دیہاتوں میں کافی گھومنا پڑتا تھا جس سے انھیں
گاؤں کی غربت اور جہالت کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع
ملا۔ یہ بات بہت گہرائی تک ان کے دل میں گھر کر گئی کہ گاؤں کے
پچھڑے لوگوں کو ساتھ لئے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے اور یہ کام
صرف تعلیم کے ذریعے ہی انجام دیا جا سکتا ہے اسی لئے انھوں نے
دیہاتوں میں تعلیم کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ بھاؤ راؤ پاٹل نے
مہاراشٹر کے کونے کونے میں غریب عوام کو بیدار کرنے اور انھیں اپنے
پیروں پر کھڑے ہونے کی ترغیب دی اور عوام ہی کی مدد سے عوام
کو تعلیم دینے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے دودھ گاؤں
میں ودیا پرسارک منڈل قائم کیا وہ بعد میں بند ہو گیا لیکن ۱۹۱۹ء
میں کالے نامی گاؤں میں ستیہ شودھک سماج کا اجلاس ہو رہا تھا
وہاں ستارا ضلع کے دور افتادہ دیہاتوں میں عوام کی سہولت
کی خاطر مواصلتی تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں
رعیت تعلیمی ادارے کے نام سے جانا جانے لگا۔ یہ ادارہ آگے
چل کر ۱۹۲۴ء میں ستارا میں منتقل ہوا۔

بھاؤ راؤ نے جیوتی با پھلے کو اپنا گرو مانا تھا لیکن انھوں نے
صرف لڑکیوں کے تعلیم کے کام کو مرکزی حیثیت دی تھی۔ بھاؤ راؤ نے
لڑکوں کی تعلیم پر بھی زور دیا وہ بڑے جذباتی تھے۔ ان پر ملک
کے عظیم رہنماؤں کے اثرات مرتسم ہوتے رہے ان کا ذہن وسیع
ہوتا گیا۔ وہ مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی سے بھی متاثر تھے اور
انھوں نے تاحیات کھادی ہی کے موٹے جھوٹے کپڑے استعمال
کرنے کا عہد کیا وہ ننگے پاؤں چلتے، چٹائی پر سوتے اور ایک معمولی
کمبل اوڑھتے۔ ان کا رہن سہن انتہائی سادہ تھا۔ ان کی غذا میں جوار
کی روٹی، معمولی سی سبزی اور پٹھلے کے سوا کچھ نہ تھا۔ بھاؤ راؤ نے ایک
ایسی اقامت گاہ قائم کی جس میں اچھوتوں کے ساتھ تمام ذات اور دھرم
کے طلبہ کا داخلہ بھی عام تھا۔

حصول تعلیم کے لئے وہ انھیں مقامی مدرسوں میں روانہ کرتے
وہ خود جین دھرم کے ماننے والے تھے مگر وہ فرسودہ خیالات سے

کرم ویر
کرلوسکر برادرس پرائیوٹ لمیٹڈ
کے بانی شری لکشمن راؤ کرلوسکر
کے ہمراہ ۔
(۱۹۱۵ء کی تصویر)

کوسوں دور تھے وہ ایک سچے اور پکے سماج سدھارک بن گئے۔ وہ سماج کے ماتھے سے چھوت چھات کے کلنک کو مٹا دینے کی آخری دم تک کوشش کرتے رہے۔ پچھڑی ہوئی ذات کے تمام بچوں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے کو انھوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا وہ گاؤں گاؤں سے اچھوت بچوں کو چن چن کر اپنی اقامت گاہ میں لاتے اور انھیں تعلیم دیتے۔ اقامت گاہ میں طلبہ خود اپنے ہاتھوں سے سارا کام کرتے اس لیے اخراجات کا بار بھی کم ہوتا۔ ابتدائی ایام میں پچاس ساٹھ طلبہ تھے بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ سب کو معمولی موٹے کپڑے اور سادہ کھانا دیا جاتا ان سب کی فراہمی کے لیے انھیں بہت زیادہ تگ و دو کرنی پڑتی۔ وہ اناج اکٹھا کرتے اور لوگوں سے چندہ جمع کرتے کبھی کبھی یہ اخراجات انھیں اپنی جیب سے بھی ادا کرنے پڑتے۔ انھوں نے کرلوسکر کے اپنے شیئر فروخت کرکے روپیہ جمع کیا۔ بعض اوقات بورڈنگ میں اناج کا دانہ تک نہ ہوتا ایسی صورت میں وہ اپنی بیوی کے زیورات گروی رکھ کر یا انھیں فروخت کرکے طلبہ کی ضروریات پوری کرتے۔ ایک دفعہ تو منگل سوتر بیچ کر طلبہ کے لیے اناج مہیا کیا۔

شروع میں ان کی بیوی لکشمی بائی اچھوتوں کو گھر میں لینے پر معترض ہوئیں لیکن بھاؤ راؤ نے اپنی دلیلوں اور رایدیشوں سے بالآخر انھیں ہمنوا بنا لیا۔ ۱۹۴۰ء میں لکشمی بائی کا انتقال ہوگیا۔ بھاؤ راؤ نے وسو بھاگیہ وتی لکشمی بائی پاٹل میموریل ایجوکیشنل فنڈ نامی ادارہ قائم کیا جس نے نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کی تعلیم میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ ستارا میں دھننی کا باغ نامی تھوڑی سی زمین تھی جہاں بھاؤ راؤ نے لڑکے اور لڑکیوں کی بورڈنگ چلائی۔ اور آخر میں اسے مستند اسکول کا درجہ دلایا۔ یہ اسکول سبھی ذات کے بے سہارا بچوں کا آشرم بن گیا۔ ستارہ کی کنیا شالہ میں وہ لڑکیوں کو پڑھنے بھیجتے کتنے ہی ضرورت مند طلبہ کے اخراجات وہ ذاتی طور پر برداشت کرتے تھے بعد میں اس اقامت گاہ کا نام بدل کر لکشمی بائی پاٹل، بورڈنگ پڑ گیا۔ تعلیم نسواں کے لیے بھاؤ راؤ نے خصوصی طور پر کوئی الگ کام نہیں کیا لیکن دور دراز کے گاؤں میں ابتدائی مدارس کھول کر لڑکے لڑکیوں کا معقول تعلیمی انتظام کیا، گاؤں میں جانا، لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا، "رعیت،، تعلیمی ادارے کی تختی لگانے پر آمادہ کرنا۔ ایک آدھ ٹیچر کا تقرر کرنا۔ اگر اس کی تنخواہ کے لیے روپئے نہ ہوں تو اس کے لیے دو ایک بوتے جواری کا انتظام کرانا۔ برسوں انھوں نے اسی طرح کام کیا۔ لڑکا ہو یا لڑکی بچوں کو تعلیم دینا لازمی ہے یہی ان کا منتر تھا۔ ان کے مدرسوں کے لیے جگہ کی قید نہیں تھی۔ کونے کھدروں میں، جھونپڑوں میں، دھرم شالوں میں، کہیں بھی ان کے مدرسے چلتے تھے۔ ان کی تحریک کا دائرہ عمل کافی وسیع تھا اس لیے ممکن ہے ابتدا میں ان کے مدرسوں کی تعلیم کا معیار بلند نہ رہا ہو لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ سارے مہاراشٹر میں تعلیم و تدریس کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔ اگر وہ باقاعدہ اسکول کی عمارتوں کی تعمیر کے انتظار میں بیٹھے رہتے تو شاید انتظار ہی کرتے رہ جاتے جہاں بھی جگہ ملی جو چیز بھی ہاتھ لگی انھوں نے اسے تعلیمی مقصد کے لیے استعمال کیا۔

کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل نے
تعلیمی ادارے جاری کیے۔
کے جاری کردہ ایک اسکول کی
تصویر۔ ضلع احمد نگر میں
ے گاؤں مقام پر رعیت شکشن
سنستھا کا
ن راؤ را بھاجی او تاڑے پاٹل،
بالیہ۔

اس طرح دیہاتوں میں تعلیم کو عام کرنے والے وہ سب سے
پرچارک ہیں ان کے عزائم اور ان کی کاوشیں بے مثال تھیں
بنیادی اور خود کفیل کے اصول پر انھوں نے تعلیم و تدریس کی
نئی دنیا تعمیر کی۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے تعلیمی پرچار کا آغاز کیا تھا
ت ان کی عمر ۵۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ بعد ازاں پندرہ
کے قلیل عرصہ میں بھاؤراؤ نے پانچ چھ سو ابتدائی مدارس
کیے یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے
میں بھی ان کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔

ستارا بھاؤ صاحب پاٹل کی کرم بھومی ہے جہاں پر انھوں
نے ابتدائی تعلیم کی فضا تیار کی۔ ساتھ ہی پورے مہاراشٹر
میں انھوں نے تین چار سو ثانوی مدارس بھی قائم کیے۔ ان سے
کے مصلح کارکنوں نے بے مثال قربانیاں دے کر صاحب
حضرات کی مدد سے مدارس اور کالج قائم کیے جو زیادہ تر
شہروں تک محدود تھے۔ مہرشی انا صاحب کروے کی تعلیم نسواں
تحریک بھی شہر کی حد تک ہی محدود رہی۔ دور افتادہ دیہاتوں
قصبوں میں تعلیم عام کرنے کا سہرا کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل ہی
سر جاتا ہے۔ اس اعتبار سے پاٹل انا اپنے پیشرو اصلاح
پسندوں کے معاملے میں یکتا اور بے مثال تھے۔ ان کے پیشرو
تعلیم سے آراستہ تھے لیکن کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل نے
تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود ایسا ٹھوس اور وسیع کام
کر دیا جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

ان کی کارکردگی کا دار و مدار ادارے کے نام کی مناسبت
سے رعیت یعنی عوام پر تھا۔ عوام کی جانب سے جو بھی تھوڑی بہت
امداد ملتی وہ ہنسی خوشی قبول کر لیتے مگر وہ دستِ خود دہانِ خود کے
زیادہ قائل تھے وہ چاہتے تھے کہ طلبہ خوب مشقت کریں، پسینہ بہائیں
اور اپنی ذاتی محنت کے بل پر ہی اپنی تعلیم مکمل کریں۔ یہی ان کا
مہا منتر تھا۔

اجنک تارا کے پاس ایک بنجر پتھریلے حصے کو انھوں نے طلبہ کی
مدد سے ہموار کیا اور وہاں لڑکوں کی محنت سے ستارا کا پہلا کالج
اور اقامت گاہ کی عمارت تعمیر کی۔ آگے انھیں مالی امداد ملتی رہی اور
انھوں نے تقریباً بیس کالج اور اقامت گاہیں تعمیر کیں۔

۱۹۲۵ء میں ان کا سالانہ تعلیمی بجٹ تیس روپئے تھا جو بڑھتے
بڑھتے آخری ایام میں ایک کروڑ سے تجاوز کر گیا تھا۔

کرم ویر کی جوہر شناس نگاہ ذہین طلبہ کو برابر تلاش کر لیتی
اور پھر ان پر خصوصی محنت اور توجہ صرف کرتے۔ ایک گڈریے کے
لڑکے کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلائی جس نے آگے چل کر فنِ خطابت
میں اور سنسکرت زبان میں خصوصی لیاقت پیدا کی۔ بھاؤراؤ پاٹل
منتخب طلبہ کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاتے۔ کئی طلبہ کو وظیفہ دے کر
بیرونی ممالک میں بھی روانہ کیا جنھوں نے تعلیمی میدان میں خوب
نام کمایا۔ بعد میں ایسے کتنے ہی طلبہ تھے جنھوں نے فارغ التحصیل
ہونے کے بعد 'رعیت' کے تعلیمی کاموں میں نہ صرف ان سے تعاون

ضلع احمد نگر کے جام کھیڈ تعلقہ میں
کھرڈا انگلش اسکول ۔

کیا بلکہ ان کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے تن، من، دھن سے اس کے شریک کار ہو گئے ۔

کرم ویر کے عوامی اشتراک کے سبب ان کے بعد بھی ادارے کا کام پورے جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور آج ادارے کا سالانہ بجٹ دس کروڑ روپئے کے قریب ہے ۔

یہ ادارہ آج ملک کے چند عظیم اداروں میں سے ایک ہے کرم ویر کا سراپا کسی رشی کے مانند پاکیزہ اور پر کشش تھا۔ بلند قامت، بلند آواز جس کے سبب ان کی معمولی سی تقریر بھی سامعین پر زبردست تاثر قائم کرتی ۔ ان کی گفتگو میں مزاح کا عنصر ہوتا تھا اس لئے لوگ ان کی تقریر بہت دلچسپی سے سنتے۔ ان کا سادہ رہن سہن اور ان کے ہمدردانہ برتاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ انھیں غریبوں سے کس قدر ہمدردی تھی ۔ اناصاحب کروے اور بھاؤ راؤ پاٹل دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے اناصاحب کروے کی صد سالہ سالگرہ کے بعد بھاؤ راؤ پاٹل خاص طور پر ان سے ملنے کے لئے 'ستارا' کی 'کنیا شالہ' میں پہونچے۔ کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے تعلیم نسواں کے لئے خصوصی طور پر الگ سے کام نہیں کیا تھا لیکن تعلیم نسواں پر ان کا زبردست اعتقاد تھا۔ ان کے اسکول، کالجوں میں آگے چل کر لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرنے لگی تھیں ۔

آنجہانی راؤ بہادر کالے رعیت تعلیمی ادارے کے صدر تھے ان کے بعد ڈاکٹر دھنجے راؤ گاڈگل اس کے سرپرست بنے ۔ رعیت، شکشن ادارے نے مہاراشٹر کے گوشے گوشے کو تعلیم و تدریس سے سیراب کردیا۔ ادارے کا شناختی نشان برگد کا پیڑ کافی معنی خیز ہے اس کی مناسبت سے دیکھیں تو آج اس انجمن کی شاخیں ریاست کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہیں ۔

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی اپنی تعلیم نامکمل ضرور رہی مگر ان کا شوق تدریس بے مثال تھا۔ عوام نے انھیں 'کرم ویر' کے لقب سے ملقب کرکے ان کی عظیم تعلیمی خدمات کا اعتراف کیا۔ حکومت نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا اور پونے یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی ۔ یہ ڈگری ساسون ہسپتال میں خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اس وقت ان کی خدمت میں پیش کیا جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے ۔ مختلف ذاتوں اور مختلف مذاہب کے غریب دیہاتی عوام کے لئے انھوں نے جدید تعلیم کے دروازے کھول دیئے وہ تعلیمی میدان کے بھگیرتھ تھے جنھوں نے علم کی گنگا سے مہاراشٹر کا کونہ کونہ سیراب کردیا ۔

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی صد سالہ سالگرہ کے موقعہ پر ان کی عظیم اور پاکیزہ روح کو لاکھوں سلام ۔

مراٹھی سے ترجمہ:۔ سلام بن رزاق
5/11 ۔ ایل ۔ آئی ۔ جی
وی بھاوے نگر ۔ کرلا (ایسٹ)
بمبئی ۴۰۰۰۷۰

ن جیابرڑے
ستی نگر چمبور، بمبئی ۴۰۰۰۷۱

کرمویر بھاؤ راؤ پاٹل سیکولرزم کے علمبردار

اقبال نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

"کرمویر" کا مترادف لفظ اردو میں "غازی" ہوگا، وہ غازی جو یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی شمشیر لے کر جہادِ زندگانی میں اپنے اصولوں کے استحکام کے لئے سرفروشانہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔ بھاؤ راؤ پاٹل ایک ایسے ہی غازی تھے۔ انہیں سمجھنے سے پہلے ذرا ہم تاریخی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ لیں گے۔

یزوں اور دیگر یوروپین اقوام کی آمد کے ساتھ ساتھ ن میں ذہنی، سماجی، دینی اور سیاسی نشاۃ ثانیہ کا سیلاب سا آگیا تھا۔ ہندستانیوں نے جنگی معرکوں رچڑھاؤ اور اپنی پے در پے شکستوں سے متاثر ہو کر ال، رسم ورواج اور عقائد کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سنے لگے کہ ہم میں کچھ تو کھوٹ ہے جو ہم پسپا ہوتے ہیں۔

دوسری طرف انگریز حاکم سائنس، منطق، دلائل اور تحقیق د ے علمبردار بن کر اپنی فتحیابیوں کے زور پر ہندستانیوں کو جکا چوند کر رہے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج قائم کر کے ہندو مت کے بھولے بسرے ان اصولوں اور طریقوں کو یاد دلایا جن کو فراموش کر کے لوگ رسم ورواج کے دلدل میں پھنس گئے تھے۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اسی طرح ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنا ڈال کر سماج کو سنگٹھت کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ بنکم چندر چٹرجی نے "آنند مٹھ" ناول لکھ کر دیش بھگتی کا جوش و ولولہ پیدا کیا۔

ایسی ہی تحریکوں کا مسلمانوں میں بھی پایا جانا فطری بات تھی۔ مسلمان

مسندوں سے اتار دئے گئے تھے اور انھیں حاشیہ نشینوں میں بھی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے حساب غداروں نے اپنوں ہی کی جڑیں کاٹ کر بیرونی حکومت کے پودے کی آبیاری کی تھی۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی پسپائی اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت نے انگریزوں کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

اب دلی دور نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے یہ کام بھی پورا کر دیا یعنی وہ جو ایک نام نہاد بادشاہ تھا شاہ ظفر انگریزوں نے اسے جلاوطنی کی سزا دیکر رنگون بھیج دیا۔

اب کلیتہً انگریزوں کا راج تھا اور حاکموں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ تھی۔ بدظنی تو لازمی تھی۔ سرسید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اس بدظنی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں قربت اور یگانگت پیدا ہو تاکہ دلوں کا میل نکل جائے اور مسلمان اس ترقی یافتہ قوم سے کچھ پاکر اپنی کھوئی ہوئی عزت و وقار کو دوبارہ حاصل کر سکیں سرسید نے مولانا الطاف حسین حالی سے ایک مسدس موسوم بہ "مدوجزر اسلام" لکھوائی اور وہ بھی اس عقیدت اور خلوص کے ساتھ کہ یہ مسدس انھیں آخرت کے توشے کا کام دے گی۔

حالی، شبلی، محسن الملک، نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر اور بعد میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کے کھو جانے کا احساس دلایا۔ اور گویا اس بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم چلنے کی دعوت دی۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں ایک ایسے مدرسے کی بنا ڈالی جو آگے چل کر علی گڑھ یونی ورسٹی کی صورت میں ایک تناور درخت بن گیا۔ مسلمانوں میں تعلیم کا شعور پیدا ہوا اور ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا سرسید نے ڈالی اور اسی تعلیمی تحریک کے زیر اثر پنجاب میں "انجمن حمایتِ اسلام" اور بمبئی میں "انجمنِ اسلام" قائم ہوئی۔

سیاست کے میدان میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی اور ۱۸۹۳ء میں مہاراشٹر سے ابھرتے ہوئے مشہور رہنما بال گنگا دھر تلک نے گنپتی میلے کی شروعات کی۔ گنپتی کی مورتیاں پہلے صرف گھروں میں بٹھائی جاتی تھیں اب وہ اجتماعی طور پر بٹھائی جانے لگیں۔ اور یہاں قومی و سیاسی شعور کو جگانے کا کام لیا جانے لگا۔

اب انگریز چونکے۔ بیداری کی لہر سیاسی مطالبات میں تبدیل ہو کر انگریزوں کے پاؤں اکھیڑ دے گی۔ یہ خدشہ ان کا اپنی جگہ درست تھا۔ لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لئے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔ اس کے نتائج آج بھی ہم کچھ نہ کچھ بھگت رہے ہیں۔

انگریزوں نے مختلف طریقوں سے ہندستانیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت کے بیج بو دئے۔ کئی سیاسی پارٹیاں ابھر آئیں جو ایک دوسرے سے متحارب تھیں اور سماج اور دین کے معاملات میں بھی کئی متصادم نظریات کو پیش کیا گیا۔ رواداری، خلوص اور یگانگت کی فضا جو برصغیر کا طرۂ امتیاز تھی، مسموم ہونے لگیں۔

غرض انیسویں صدی کی آخری تین اور بیسویں صدی کی اولین چار دہائیوں میں یہ سیاسی اور سماجی پس منظر تھا۔ جب کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے خلوص، یگانگت اور رواداری کا ماحول پیدا کر کے مہاراشٹر میں اپنے تعلیم کے مقصد کو آگے بڑھانے کا تہیہ کر لیا۔

پونے میں بارامتی کے مقام پر
شری چھترپتی شاہو اسکول

کرمویر
سابق ڈپٹی وزیر اعظم شری باوجگجیون رام
اور سابق گورنر ہریانہ
شری لفٹینٹ راؤ تپسے کے ساتھ ۔

نت گیانیشور اپنی ایک رچنا میں دعا کرتے ہیں:
"دوری کا اندھیرا دور ہو جائے"

ار اسٹرین اس دعا کو بڑے بھاؤ اور چاؤ سے گاتے ہیں لیکن اس
وجود بھی بھاؤ راؤ نے جب اس دوری کے اندھیرے کو دور کرنے
مش کی اور مہار مانگ چمار کو اونچی ذات والوں کے ساتھ بٹھانے
ش کی کہ اس کی مخالفت کی گئی۔ اور شد و مد سے مخالفت کی گئی۔
یکن بھاؤ راؤ کو جنتا نے کرمویر کا خطاب ایسے ہی نہیں دیا ہے۔ وہ
ہے۔ جوتی با پھولے نے بھی ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اس کا نام تھا
پرشودھک سماج۔ یہ ادارہ آج بھی قائم ہے۔ کرمویر نے ۱۹۱۹ء میں
ارے کے پلیٹ فارم سے ایک تجویز پیش کی کہ دیہات میں تعلیم
لنا چاہیے اور دیہی علاقوں سے آنے والے بچوں، خصوصیت
سا تو غریب بچوں کے رہن سہن، کھانے پینے اور دیگر تعلیمی
ت کی کفالت کے لیے کچھ انتظام ہونا ضروری ہے۔

تجویز پاس ہو گئی اور اس طرح بھاؤ راؤ کی
شکشن سنستھا کی ابتدا ہوئی۔ اس کے تحت ایک ہوسٹل
یا جس میں پہلے سال صرف ۴ بچے تھے جن میں دو مراٹھا، ایک
، اور ایک مہار ذات کا تھا۔ آگے چل کر ۱۹۲۰ء میں اس
گاہ کو "چھترپتی شاہو مہاراج بورڈنگ ہاؤس" نام دیا گیا۔
پہلے سال تھا ویسے ہی اس بورڈنگ ہاؤس میں مختلف
اور فرقوں کے بچے ایک ساتھ رہنے لگے اور ان کی تعداد

بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں جب ان کا ادارہ سوسائٹیز ایکٹ کے
تحت رجسٹر ہوا اور ۱۹۳۹ء میں سالانہ رپورٹ (برائے سال ۲۸-۱۹۳۵ء)
پیش کی گئی تو اس بورڈنگ ہاؤس میں ۷۱ طلبہ تھے جن میں ۱۲ مسلمان
دو برہمن ۱۵ چمار اور مختلف تعداد میں دیگر فرقوں اور جاتیوں کے
طلبہ تھے۔ آپ جانتے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سیاست میں فرقہ واریت
نے طوفان مچا رکھا تھا اور جاتیواد اب بھی اس نہج پر تھی کہ ڈاکٹر امبیڈکر
لندن سے لوٹنے کے بعد ایک کالج میں پروفیسر بنتے ہیں اور ان کے رفقاء
اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر امبیڈکر اور وہ ایک ہی مٹکے سے
پانی لے کر پی لیں۔
چھترپتی شاہو بورڈنگ ہاؤس کے بعد ایسی رہائش گاہوں کی تعداد
بڑھتی گئی۔ آج مختلف مقامات پر ۸۳ رہائش گاہیں ہیں۔
جن میں تقریباً چار ہزار طلبہ قیام پذیر ہیں اور نہ صرف زیور علم سے مزین
ہو رہے ہیں بلکہ سلیقہ مندی اور نادر المثال شخصیتوں کے سانچے میں
ڈھل رہے ہیں۔
یہاں طلبہ کو اپنے کام کرنے ہوتے ہیں اور سب کے کام مل جل کر اور
مل بانٹ کر کرنے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں، کپڑے
دھوتے ہیں، برتن مانجھتے ہیں، مسالہ پیستے ہیں، چولھا جلاتے ہیں، پکاتے
ہیں اور باری باری پروس کر سب کو کھلاتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں
مسلمان بھی، جین بھی، مراٹھے بھی اور ڈھور، مانگ، چمار بھی اور برہمن
بھی ہیں۔ یہاں نہ صرف یہ کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے
ہیں بلکہ اپنی انفرادی برتری اور کمتری کے احساس کو ہمیشہ کے لیے

مٹا دیا ہے۔ وہ سب ایک ساتھ مل کر محنت کرتے ہیں اور مشقت کے مزے لیتے ہیں۔ اونچ نیچ ذات پات، فرقہ اور قومیت کے تفرقات کو بھلا کر مساوات کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ایک دوسرے کے لئے اخوت اور بھائی چارگی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

آج یہ ادارہ رعیت شکشن سنستھا، نہ صرف یہ کہ متعدد مدرسے اور ہائی اسکول چلاتا ہے بلکہ بمبئی، پونے اور شیواجی یونیورسٹی سے ملحقہ ۲۹ کالج چلاتا ہے جن میں ایک انجینئرنگ کالج ہے ایک تعلیمی تربیت کا کالج ہے۔ اور ایک قانون کا ڈگری کالج ہے۔ ان کے تحتی اداروں کے اسٹاف اور کارکنان میں ہندو مسلمان اور مختلف جاتیوں کے لوگ بلا امتیاز ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ وہ سب گویا ایک ہی خاندان کے رکن ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان میں انسانیت کا جذبہ ہے۔ حب الوطنی اور قومیت کا جوش ہے اور اپنے مذہب کا پاس ہے اور دوسرے کے مذہب کے لئے رواداری۔

ستارا میں چھترپتی شیواجی کالج۔

کرموِیر بھاؤ راؤ پاٹل نے اس ادارے کو محض چار طلبہ کو لے کر شروع کیا تھا اور آج جب کہ ہم ان کی صد سالہ سالگرہ منا رہے ہیں، رعیت شکشن سنستھا ایک وسیع سلطنت کی طرح پھیل گئی ہے۔ خدا کرے یہ بھارت بھر میں پھیل کر بلکہ عالمگیر ہوجائے۔ آج اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو نشاندہی کر کے کہتے،

یہ ہے کردار کا غازی، بھاؤ راؤ پاٹل!

شعر

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

اقبالؔ

...م ویر کی والدہ شریمتی گنگا بائی پاٹل ۱۹۲۵ء

کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل (سنہ ۱۹۲۶ء)

کرم ویر کے والد بھیگونڈا دیوگونڈا پاٹل

रयत शिक्षण संस्था

سوانح

بھاؤ راؤ پائیگوڈا پاٹل

۲۲ ستمبر ۱۸۸۹ء

بش:۔ سمبھوج، تعلقہ، شکانگل، ضلع کولہاپور مہاراشٹر

میٹرک تک

۔ اوگالے گلاس ورکس اور کرلوسکر برادرز لمیٹیڈ میں سیلزمین

معیاد ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۱ء تک

جی خدمات:۔

مہاتما پھلے کی جاری کردہ ستیہ شودھک مہم میں حصہ لیا۔

چھوت چھات کے خاتمہ کی مہم میں نمایاں کارکردگی

بابائے قوم مہاتما گاندھی کے جاری کردہ ہریجن سیوا سنگھ مہم میں۔

ریاست مہاراشٹر کے ایک نامور سنت سنت گاڈگے مہاراج کے جاری کردہ سماجی کام برائے سماجی برابری، انصاف، بھائی چارہ اور انسانوں کی فلاح و بہبود میں موثر کارکردگی۔

آنجہانی وٹھل بھائی رام جی شندے کے قائم کردہ مہم برائے پسماندہ طبقات میں بحیثیت ٹرسٹی فرائض انجام دیے۔

۶۔ اصل کے صوبہ بمبئی کے پسماندہ طبقات بہبودی بورڈ میں بحیثیت کارکن کئی سال تک کام کیا۔

۷۔ ہریجنوں کی بہتری کیلئے قائم کردہ ستارا ضلع کمیٹی میں کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔

۸۔ جے سنگھ پور ضلع کولہاپور میں واقع سشیلا سینی ٹوریم (ٹی بی اسپتال) میں بحیثیت ٹرسٹی فرائض انجام دیے

۹:۔ ستارا ضلع ترقیاتی کمیٹی میں کئی سال تک بحیثیت کارکن رہے۔

۱۰:۔ ہریجنوں کی بہتری کے لیے قائم کردہ سنت چوکھا میلا دھرم شالہ کے ٹرسٹی رہے۔

۱۱:۔ ستارا اور صوبائی کمیٹی بمبئی کے دیہی ترقیاتی بورڈ میں کئی سال تک کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۲:۔ سماجی برابری اور سماجی انصاف کے لیے پونے میں منعقدہ سوشل کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

۱۳:۔ ستارا ڈسٹرکٹ بورڈ کے تعمیراتی کاموں میں سردھنی شاہ کو پھر کی اعانت کی اس شرط پر

کردہ فیکٹری مزدوروں کے لیے، بچوں کو مفت تعلیم کی سہولت مہیا کریں گے۔

امداد باہمی:-

۱:- کورے گاؤں ضلع ستارا میں ۱۹۱۱ء میں امداد باہمی کسان کی اسکیم نافذ کی۔

۲:- رعیت شکشن سنستھا کے مزدوروں کے لیے ۱۹۴۰ء میں ایک امداد باہمی سوسائٹی قائم کی جو بعد میں امداد باہمی بینک میں تبدیل ہوئی۔

۳:- مذکورہ بالا سنستھا کے لیے ۱۹۴۲ء/۱۹۴۳ء میں ایک امداد باہمی اسٹور قائم کیا۔

۴:- دیوا پور ضلع ستارا کے قحط زدہ علاقوں کے لیے سرودراب جی ٹاٹا ٹرسٹ دیہی ترقیاتی بورڈ کے زیر نگرانی ۹ دیہاتوں سے متعلق اعانت پذیر ترقیاتی اسکیم پر کامیابی سے عمل درآمد کیا۔

۵:- کمتر زمینوں کے مالک کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور ان کی کھیتوں کی بدرجہ بہتری کے لیے کئی امداد باہمی انجمنیں دیوا پور ضلع ستارا کے اطراف قائم کیں۔

تعلیمی خدمات:-

۱:- دیہی بچوں کی تعلیم کے لیے ۱۹۱۹ء میں کالے متعلقہ کراڈ ضلع ستارا میں رعیت شکشن سنستھا میں قائم کیا جس کا دفتر بعد میں ستارا میں منتقل ہوا۔

۲:- ۱۹۲۴ء میں ستارا میں بلاتفریق مذہب و ملت تمام فرقوں کے طلبہ کے لیے پہلا بورڈنگ ہاؤس قائم کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مہاتما گاندھی کے ہاتھوں اس کا نام ایک عظیم سماجی مصلح راجرشی چھترپتی شاہو مہاراج کے نام سے منسوب کیا گیا اسی زمانہ سے مہاتما کے قائم

کردہ ہریجن سیوک سنگھ کی جانب سے سالانہ ۵۰۰ روپیہ عطیہ منظور کیا گیا۔

۳:- ۱۹۳۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے پونے میں قیام پذیر طلبہ کے لیے ایک عام مرکزی بورڈنگ ہاؤس قائم کیا۔

۴:- ۱۹۳۵ء میں رعیت شکشن سنستھا ایک رجسٹرڈ ادارہ بنا اور اسی سال پرائمری اساتذہ کے لیے ایک تربیتی ادارہ قائم کیا۔

۵:- ۱۹۳۷ء میں ستارا میں پہلا پرائمری اسکول جاری کیا جسے ستارہ کے ایک سماجی خدمت گار شری آر بی کالے کے نام سے منسوب کیا گیا۔

۶:- ایک پہاڑی پر واقع ایک دیہات یا ؤ شیشو میں رعیت شکشن سنستھا کے زیر اہتمام پہلا رضاکارانہ پرائمری اسکول قائم کیا۔ بعد کے سالوں میں اسی طرح ۸، ۵، ۱۵ اسکول پہاڑی اور قحط زدہ علاقوں میں قائم کیے۔

۷:- ۱۹۴۰ء میں ستارا میں ایک مفت رہائشی سکنڈری اسکول قائم کیا جسے مہاراجہ سایا جی راؤ گائیکواڑ کے نام سے منسوب کیا۔ یہ اسکول تمام فرقوں کے غریب طلبہ کے لیے قائم کیا گیا۔ بعد میں انھوں نے اپنی زندگی میں ۱۰۱ ہائی اسکول قائم کیے۔

۸:- ۱۹۴۲ء میں تمام فرقوں کی لڑکیوں کیلئے ایک ہوسٹل اور پرائمری اسکول، اسکول کے خواتین اساتذہ کی تربیت کے لیے جیجا ماتا ٹریننگ کالج قائم کیا۔

۹:- ۱۹۴۷ء میں ستارا میں دیہی علاقوں کے طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پہلا کالج قائم کیا جسے قومی ہیرو چھترپتی شیواجی مہاراج کے نام سے منسوب کیا۔

ابتدائی چند سالوں میں مفت رہائشی کالج کے طور پر اسے چلایا گیا۔

۱۰:- ۱۹۵۴ء میں تعلقہ کراڈ ضلع ستارا میں ایک شکشن سنستھا کے زیر اہتمام یونیورسٹی تعلیم کے لئے دوسرا کالج قائم کیا گیا جو سنت گاڈگے مہاراج کے نام سے منسوب کیا گیا۔

۱۱:- ۱۹۵۵ء میں ستارا میں سکنڈری اسکول کے اساتذہ کی تربیت کے لئے ایک بی ایڈ کالج قائم کیا جسے عظیم قومی رہنما مولانا آزاد کے نام سے قائم کیا گیا۔

دیگر تعلیمی اداروں سے وابستگی :-

۱:- پونے یونیورسٹی کی عدالت میں گورنر کے نامزد کردہ رکن کی حیثیت سے کام کیا۔

۲:- مہاتما گاندھی ودیا مندر ضلع ناشک کے مشاورتی بورڈ کے کارکن رہے۔

۳:- لاٹھے ایجوکیشنل سوسائٹی سانگلی کے رکن

۴:- ایجوکیشنل بورڈ ریاست بمبئی میں رکن کی حیثیت سے کام کیا۔

۵:- ریاستِ بمبئی کے رکن تھے۔

پڑھائی کے ساتھ کمائی اسکیم :-

رعیت شکشن سنستھا کے زیر اہتمام تمام اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم سماج کے پسماندہ اور مالی طور سے کمزور طلبہ کی فلاح و بہبود کے لئے "پڑھائی کے ساتھ کمائی" نامی ایک انوکھی اسکیم کا کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے تجربہ کیا اس کے نتیجے میں طلبہ کے ذہنوں سے احساس کمتری میں بڑی حد تک کمی ہوئی اور محنت مزدوری کی قدر دانی میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان بھر میں شاید پہلا تعلیمی تجربہ "تعلیم بذریعۂ خود کی مدد" کی شکل میں آزمایا گیا۔

اعزازات

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی گراں قدر تعلیمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں ریاستی حکومت اور عوام نے آپ کو کئی موقعوں پر انعامات اور اعزازات سے نوازا۔

۱:- ہر طبقات کے لوگوں سے نے آپ کو "کرم ویر" یعنی تعمیری خدمات کے ہیرو کا لقب دیا۔

۲:- ۱۹۴۵ء میں کولہاپور کے تاجروں نے آپ کی عزت افزائی کی۔ اور ۲۵۰۰۰ روپیہ کا عطیہ پیش کیا۔

۳:- ۱۹۴۸ء میں ستارا ضلع کی طلبہ یونین نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں سنت گاڈگے مہاراج کے ہاتھوں ۱۰۰۰۰ روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا۔

۴:- ۱۹۵۲ء میں ضلع سانگلی میں واقع کرو شکر برادرز لمیٹیڈ کی جانب سے ۲۵۰۰۰ روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا۔

۵:- ۱۹۵۹ء میں آپ کو حکومت ہند نے "پدم بھوشن" کے خطاب سے نوازا۔

۶:- اسی سال پونے یونیورسٹی نے آپ کو اعزازی ڈگری ڈی لٹ عطا کی۔

۷:- متعدد خود اختیاری سرکاری اداروں نے آپ کی عزت افزائی کی اور تہنیتی سپاسنامے پیش کئے۔

۸:- ضلع احمد نگر کے باشندوں نے ۱۰۰۰۰ روپیہ جمع کیا جو کہ کرم ویر کو اپنی عقیدت کے طور پر پیش کیا۔

رحلت :-

آپ پونے کے ساسون ہسپتال میں ۹ مئی ۱۹۵۹ء کو سورگ باش ہوئے۔

تلخیص
زیب النساء اقبال بمبئی

قومی راج

پی۔ ایس۔ نیرورکر
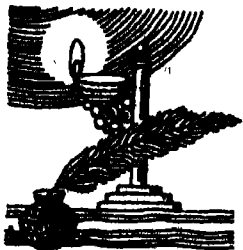
کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل
ایک سماجی مُصلح

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کا نام لیتے ہی ذہنوں میں وہ یادیں ابھر آتی ہیں جو نصف صدی یا کچھ اور عرصے پہلے مہاراشٹر کے گاؤں میں تعلیم پھیلانے کے سلسلے میں انھوں نے اپنی انتھک کوششوں کے ذریعے انجام دیئے تھے مہاتما جیوتی راؤ پھولے کے قدم بہ قدم چل کر بلکہ ان کے طور طریقوں میں بہترین راہیں نکال کر، انھوں نے ایسی خوبیاں پیدا کیں کہ مہاراشٹر کے عوام میں تعلیم اور ہمہ جہتی ترقی میں زبردست اضافہ ہوا۔ "رعیت شکشن سنستھا" جس کا آغاز انھوں نے مہاراشٹر میں پچھتر برس پہلے کیا تھا اور جو شکشن سنستھا شروع میں ضلع ستارا کے مقام دودھ گاؤں میں طالب علموں کے ایک ہاسٹل کے روپ میں تھی مہاراشٹر میں اس طرح بڑھی اور پھیلی جس طرح برگد کا درخت۔ بڑھنے، پھیلنے، اور سایہ دار ہونے میں مہاراشٹر میں کہاوت ہو چکا ہے چنانچہ یہ ادارہ تعلیم کے میدانوں میں اس طرح دیہاتوں اور شہروں میں پھیلا کہ اس کی روشنی اور جگمگاہٹ دور دور تک گاؤں میں محسوس کی گئی

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء میں انھوں نے دو اور مقامات کالے اور نیرلے میں اسی قسم کے ادارے قائم کئے اور ایک مزید ادارہ "شری چھترپتی شاہو بورڈنگ" کے نام سے ستارا میں قائم کیا جس میں ایک اکیلے طالب علم کو جو چھوت چھات کا مارا اور سماج سے نکالے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا تھا سب سے پہلے داخلہ دیا گیا۔ بالکل واضح طور پر سماجی اور تعلیمی طور پر اس نوعیت کے تعلیمی ادارے کے قیام میں سرگرمی دکھانے کی جو وجہ انھوں نے بتلائی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے کولہاپور اور ستارا کے علاقے سے ذات پات اور دھرم یا مذہب کے بھید بھاؤ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اسی لئے انھوں نے اپنے طالب علموں کے ہوسٹلوں میں

پسماندہ اور اچھوتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی بے روک ٹوک داخلہ دیا۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے اپنے اس وسیع بڑھتے ہوئے تعلیمی کام کو ایک ادارے کے تحت کر کے اسے "رعیت شکشن سنتھا" کا نام دیا۔

۱۹۲۴ء میں انھوں نے دونوں ستارا کو اپنی سرگرمیوں کا صدر مقام بنایا۔ اور آہستہ آہستہ لیکن پختگی کے ساتھ یہاں سے اپنی تعلیمی جد و جہد اور کوششوں کو آس پاس کے علاقوں تک وسیع کرتے رہے۔

سارے ہندوستان میں عموماً اور مہاراشٹر میں خصوصاً برطانوی دور میں عوام کی تعلیمی حالت افسوسناک تھی کیونکہ اس سے نہ صرف اس خاص طبقے ہی کو فائدہ پہنچا جو روایتی طور پر ہر جگہ سماجی، ثقافتی اور مذہبی برتری حاصل تھی اور اس لحاظ سے مہاراشٹر کے گاؤں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ پہلے پہل مہاتما جیوتی راؤ پھولے نے مہاراشٹر میں تعلیم کے ذریعے سماجی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس کی اور عوام کو تعلیم سے روشناس کرانے کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ وہ خود جاگیں اور دوسروں کو جگانے کی طرف دھیان دیں۔ ۱۸۵۱ء میں مہاتما پھولے نے لڑکیوں کے لئے سب سے پہلا اسکول پونے میں قائم کیا اور ۱۰ ستمبر ۱۸۵۳ء کو الگ الگ سوسائٹیوں کے لئے چلائی جانے والی تمام اسکولوں کو جس میں مہار۔ مانگ طبقے کے بچوں کو تعلیم دیجاتی تھی، سبھوں کے لئے کھلا ہوا قرار دیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انگریز حکمرانوں سے ہندوستان کے تمام لوگوں کے لئے لازمی اور مفت تعلیم کا سب سے پہلے مطالبہ مہاتما پھولے نے کیا تھا۔

مہاتما پھولے نے انگریزوں کے طریقۂ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے یہ بات دو ٹوک کہہ دی تھی کہ اس کا مقصد صرف اونچے طبقے کے برہمنوں کو بلند منصبوں پر بٹھانا اور باقی ماندہ طبقوں اور لوگوں کو صرف چند نچلے درجے کی ملازمتیں دے دینا ہے انگریزوں نے روایتی چار ورنوں کے مطابق اونچے طبقوں کو نواز کر سماج، ثقافت اور دھرم پر ان کی برتری اس طرح قائم کر دی ہے کہ مہاراشٹر کے عوام اور گاؤں دیہات کے لوگوں کو ان کی قسمت کے سہارے چھوڑ دیا گیا ہے۔

کرم ویر پدم شری ڈاکٹر وٹھل راؤ ایکناتھ راؤ وکھے پاٹل کے ہمراہ جنھوں نے پرا ور نگر کو آپریٹو شکر کارخانے کے سیکٹر میں بھارت کے پہلے کوآپریٹو ل کی بنیاد ڈالی تھی۔

اس کے برخلاف آزادی کے بعد ہندوستان کے جواں عمر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۹۸۵ء میں اپنی قومی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جب ہم تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اپنے عوام کا خیال رکھتے ہوئے ایسا کہتے ہیں۔ ہمارے عوام ہمارا اثاثہ اور قوت ہیں۔ ہمیں انھیں ترقی پر لانا ہوگا تعلیم ہی ساری انسانی ترقیوں کی روح ہے۔"

"کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل" نے مہاراشٹر میں اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا دیا۔ اور اپنی زندگی، تعلیم

پھیلانے کی نذر کردی تاکہ گاؤں میں بسنے والے عوام تعلیم حاصل کرتے ترقی کریں۔ کولہاپور کے شاہو مہاراج کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور جو راجہ ہوتے ہوئے اچھے سماجی ریفارمر تھے اور یہ بھی کہ وہاں کے پسماندوں کو ترقی کی راہ پر لانے کے لیے انھوں نے ان کے ساتھ کیسا شاہانہ برتاؤ کیا تھا۔ مہرشی انا صاحب شندے کے بارے میں انھیں معلوم تھا کہ انھوں نے مہاراشٹر میں اچھوت سدھارنے کے لیے "ہندوستان کے اچھوت فرقے کے لیے مشن سوسائٹی" قائم کی تھی۔ جس سوسائٹی کا مشنری عمل مہاراشٹر کے باہر بھی جاری تھا اور بڑودہ کے ہز ہائی نیس سیاجی راؤ گائیکواڑ کے کارنامے ان کے کانوں میں گونج رہے تھے جنھیں بڑودہ میں ان کی پالیسیوں کے سبب لوگ انھیں "عوام کا راجہ" کہا کرتے تھے اور خاص کر پسماندہ فرقہ کے لوگوں کی تعلیم سے جنھیں گہری دلچسپی تھی۔ ان سب کے حالات اور اچھے خیالات کا اثر "کرم ویر پاٹل" کی زندگی پر نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔

اگرچہ وہ خود ایک کٹر جین خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور باقاعدہ اسکولی تعلیم ان کے حصے میں نہیں آئی تھی پھر بھی ان کا مقولہ تھا کہ زندگی ہی میرے لیے اسکول ہے اور تجربات میرے لیے گرو۔ کیونکہ مہاراج گوتم بدھ کی طرح انھوں نے ننگے پاؤں پورے مہاراشٹر کا دورہ کیا تھا اور ہر جگہ لوگوں کی بے علمی، بدحالی، پسماندگی اور غریبی نے ان کے دل پر گہرا نقش چھوڑا تھا جسے سدھارنے اور دور کرنے کے لیے خود انھوں نے اپنی طور پر "اپنی تعلیمی اسکیم" کو رہنما بنایا تھا اور جان توڑ محنت کو بہترین طریقۂ عمل۔ کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے سنہ ۱۹۲۹ء سے اس سماجی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا تھا اور لگاتار ۶۰ برس تک پسماندہ علاقوں اور دیہاتوں میں اپنی انتھک محنت سے اسکولوں، کالجوں اور ٹیکنیکل اداروں کا ایک جال سا بچھا دیا۔
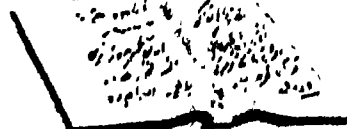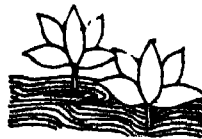
از:۔ اپّا صاحب بھاؤراؤ پاٹل

کرم یوگی پِتا

میرے قابلِ صد احترام والد ماجد اور ملک کے ایک بزرگ سماجی اور تعلیمی خدمت گار کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل عرف "انا"، کی زندگی ستوکی طرح تھی ہر بجولسو کو بیدار کرنے اور معاشرہ میں تعلیم عام کرکے بیدار کی اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔

میرے دادا پائے گونڈا پاٹل کی شخصیت بے باکی
یت شعاری، دیانت داری، وضعداری کے انمول جواہر سے
ال تھی۔ وہ مشکل کے وقت غریبوں کی حاجت روائی کے
ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے وہ محکمۂ محصول میں ملازم تھے اور
ملازمت کے سلسلہ میں انھیں مختلف گاؤں میں جانے کا
ن ہواجس کی وجہ سے ان کے دل میں مختلف مذاہب کے
ں کے لیے احترام پایا جاتا تھا۔ انا کی والدہ ماجدہ بھی
عار، ایماندار اور با اعتماد خاتون تھیں۔ ناانصافی اور دروغ
سے انھیں انتہائی نفرت تھی۔ چھوٹے یا بڑے کے سامنے
مبنی برحقیقت مافی الضمیر کے اظہار کے لیے وہ ذرا بھی جھجک
ں نہیں کرتی تھیں۔ انا نے اپنے والد سے بے باکی، دیانت
، اور اپنی والدہ سے ناانصافی اور باطل کے خلاف زبان
لنے کا حوصلہ حاصل کیا تھا۔

انا صاحب کے دل میں غریبوں اور پسماندہ لوگوں کے
ہمدردی تھی اس زمانہ میں غربت اور پسماندگی کے خلاف
بج

کمر باندھ کر میدانِ عمل میں اترنے کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا اسی لیے انا صاحب کا خیال تھا کہ افلاس و پسماندگی کے خاتمہ کے لیے خود کفیل، تعلیم یافتہ اور خود اعتماد ہونا بیحد ضروری ہے اور اسی نظریہ کے تحت انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

شروع شروع میں انھوں نے اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اصلاح کے کاموں پر توجہ دی۔ کرلوسکر اور کوپر کارخانوں میں ملازمت کرتے ہوئے تعلیم کو عام کرنے کے ان کے جذبات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے لیکن اس زمانے میں یہ کوششیں انھیں ادھوری محسوس ہونے لگی تب انھوں نے ملازمت سے مستعفی ہوکر غریبوں، پچھڑے ہوئے لوگوں، ضرورت مند دل کی حاجت روائی اور ان کو بیدار کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے ملک کے انتہائی پسماندہ علاقوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے ستارہ میں ۱۹۱۹ء میں "دارالاقامہ" کی بنیاد رکھی۔

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کے صاحبزادے آپا صاحب اور بہو شریمتی سوشیلا بائی

سب سے پہلے انھوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ہوسٹل میں مقیم طلبہ کے دلوں پر اپنے خیالات کے نقوش ثبت کئے تاکہ ان کے ہم خیال ساتھی تیار ہوں۔ بعد کے عہد میں وہاں سے جو طلبہ اسناد لے کر نکلے وہ دنیا کی کشش سے پرے ہٹ کر خوشی خوشی سماجی اصلاح کے لئے تیار ہوگئے اور ایسے ہی مخلصین کے تعاون سے انھوں نے ادارہ کی توسیع کی۔

کرم ویر آنا صاحب کے خیالات کا نچوڑ یہی ہے کہ اس ادارہ سے تربیت پاکر نکلنے والا طالب علم چاہے کتنی ہی تعلیم حاصل کرے اسے اپنے ملک اور اپنے خاندان کی عظیم گوناگوں روایات اور ثقافت سے وابستہ رہنا چاہئے۔ اسی نظریئے کے تحت انھوں نے مہاراشٹر میں خودکفیل اور خود اعتمادی پیدا کرنے والی تعلیم کا راستہ دکھاکر تعلیمی بیداری پیدا کی۔

کرم ویر وٹھل رام جی شندے ایک مرتبہ کرم ویر آنا سے بولے "بھاؤ راؤ سماج سیوا اخروٹ کے درخت کی طرح ہوتی ہے۔ اس درخت کو بہت دیر بعد پھل لگتے ہیں لیکن تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمھارے لگائے ہوئے درختوں کے پھل تمہیں اپنی زندگی ہی میں چکھنے کو مل گئے۔"

خودکفیل اور خود اعتماد طالب علم ہی ملک کو مستحکم بنا سکتا ہے ایسا ان کو یقین تھا۔ مجبوری کے عالم میں تنزل کی طرف جانے والوں کے لئے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

کرم ویر آنا صاحب کی زندگی ادارہ کے لئے وقف ہوکر رہ گئی تھی جس کے سبب وہ میری تعلیم پر بھی بھرپور توجہ اور وقت نہیں دے پاتے تھے۔ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے وقت حکومت کی جانب سے مجھے وظیفہ ملتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے میں کولہاپور گیا تھا اس وقت مجھے کولہاپور دربار سے اسکالر شپ اور فری شپ ملتی تھیں۔ ہماری خاندان کے لئے انھوں نے ادارہ سے کچھ بھی نہیں لیا۔ ادارہ میں کچھ عرصہ تک میں نے ملازمت کی لیکن وہ ترک کرکے پھر بیمہ کا کام کرنے لگا۔ آنا جی نے بیماری کی حالت میں پونے سے جو خط مجھے لکھا تھا وہ درج کر رہا ہوں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میری ذات سے انھیں کس قدر امیدیں وابستہ تھیں۔

خط

ستارا

تاریخ ۲۶/۳/۱۹۵۲

عزیزی آپا صاحب کو

بہت بہت دعائیں۔

باپ ہونے کی حیثیت سے تجھے جنم

کرم دیڑ

پنی ماں شریمتی گنگا بائی

کے ہمراہ۔

دینے کے سوا میں نے تیرے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہے اتنا ہی نہیں بلکہ تیری ماں کے خوش نصیبی کا آخری زیور بھی میں نے چھین لیا اور خدمت کرتے کرتے تیری ماں کا خاتمہ ہو گیا تو تیا گی ماں باپ کا بیٹا ہے اور اس میں تجھے خوش رہنا چاہئے۔ تیری خوشحالی کے لئے میرے برادر نسبتی آدگو نڈا پاٹل نے میری بیمہ کاروبار میں رہنمائی کی۔ خود کا بیس ہزار کا بیمہ کروایا اور بعد میں وہ مر گئے۔

میں پہلے بھی چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں کہ تو ادارہ میں ملازمت نہ کرے۔ ادارہ کے جس اسٹور میں تو ملازم تھا اس اسٹور کو اس سال کچھ زیادہ نفع نہیں ہوا ہے اور آج کے بعد بالکل نہیں ہوگا جس کے سبب اسٹور کے ملازمین کم کرنے پڑیں گے اور دوسروں کو ملازمت سے برطرف کر کے تجھے بحال رکھنا پڑیگا ایسی صورت میں تیرا خود ہو کر ملازمت ترک کر دینا میرے لئے باعث مسرت ہے چند دنوں تک تجھے پریشانی ہو گی لیکن آزادی کے ساتھ تو اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر خوشی محسوس کریگا۔ باپ کی طرف سے تجھے آج تک کوئی مدد نہیں ملی اور اس کے بعد بھی نہیں ملے گی۔

میری آخری عاجزانہ اطلاع یہ ہے کہ تو میری والدہ ماجدہ کی دیکھ بھال کرے اسکے اخراجات کے لئے ایٹوڈے کے کھیت کی سالانہ آمدنی تین سو سے پانچسو روپئے تک میں تجھے دونگا اور اگر بالفرض میں بھی مجبور ہو گیا تو میرا بار بھی تجھے ہی اٹھانا پڑے گا اسی لئے تجھے خود مکتفی ہو جانا چاہئے۔

یہی دعا ہے۔

تیرے والد

بھاؤ پاٹل

●●●●●●●●●●

ترجمہ:-

غنی غازی

• محمد لطیف احمد
لکچرار شعبۂ اردو، فارسی
ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ایسے لوگوں جیسے کہ سانے گروجی تھے ہر روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید میر تقی میر نے انھیں کے لیۓ کہا تھا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

سانے گروجی ایک مثالی معلم، بے باک صحافی، ممتاز شاعر، منفرد ناول نگار، جنگ آزادی کے رہنما، سوشل ریفارمر، ملک و قوم کے خادم، سچے اور پکے ہندوستانی تھے۔ ہم یہاں ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۲۴ دسمبر ۱۸۹۹ء کو کوکن کے ایک دیہات پال گاڑی میں بھاؤ راؤ کھوتا کے گھر ایک لڑکے نے جنم لیا جس کا نام پانڈورنگ رکھا گیا۔ لیکن ماں باپ عزیز و اقارب سب پنڈھری کے نام سے پکارتے تھے تیھائی انھیں انا کہتے تھے جب یہ بچہ بڑا ہوا تو تمام عالم اسے سانے گروجی کے نام سے جاننے لگا۔ بھاؤ راؤ کھوتا بے انتہا غریب تھے پنڈھری کی والدہ کا نام یشودا تھا۔ پنڈھری گاؤں کی ایک اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے لیکن ان کی صحیح تعلیم و تربیت اپنی والدہ کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کی شخصیت کو نکھارنے میں ان کی والدہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

تعلیم کے لئے روانگی

پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سانے گروجی کو اپنے ماموں کے پاس پونہ بھیج دیا گیا۔ وہاں اسکول جایا کرتے اور فرصت کے اوقات میں بھکتی وجے، ہری وجے اور پوتھی کا مطالعہ کرتے تھے۔ سادھو سنت اور برگزیدہ بندوں کے حالات زندگی بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ یہاں ان کا دل نہ لگا وہ اپنے دوسرے ماموں کے یہاں بمبئے چلے آئے۔ بمبئی سے پھر اپنے آبائی وطن پال گاڑی بھیج دیے گئے یہاں آکر اپنی ماں کی خدمت میں لگ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور ان کی خدمت ہی سب کچھ ہے۔ وہ جھاڑو دیتے، گوبر اٹھاتے، چھڑکاؤ کرتے، درختوں کو پانی دیتے ان کا خیال تھا کہ ماں کی خوشی، سکھ چین، اور خدمت کے ذریعے تعلیم حاصل کی جائے۔

ان کی ایک بہن دیہولی میں رہتی تھی۔ وہاں ایک انگریزی اسکول میں شریک ہو گئے۔ یہاں سنسکرت اور انگریزی پڑھتے۔ اخبار کیسری کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔

تعلیم کا ذوق و شوق

غریبی اور مفلسی کے سایے روز بروز بڑھتے چلے گئے
یاں تک کہ ان کے پاس کتابیں خریدنے کے لئے ایک پیسہ بھی
تھا لیکن ان کا ذوق شوق کچھ کم نہ ہوا۔ بھوک مٹانے کے لئے
رف دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک بھیک مانگنا، دوسرے چوری کرنا
ب بھیک مانگنا بھی دشوار ہو جاتا ہے تب آدمی چوری کرنے
ر مجبور ہو جاتا ہے۔ سانے گروجی کو کتابوں کے مطالعہ کی بھوک
مدید تھی۔ ایک مرتبہ جب کہ وہ پال گاڑی میں تھے انھوں نے
ناوں کیلئے اپنے یہاں آئے ہوئے مہمان کی جیب سے ایک نوٹ نکال لی تب ان کی ماں
ن سے کہا تھا کہ اتنا پڑھ کر کیا فائدہ؟ چوری کرنا گناہ ہے
انے گروجی کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش تھی انھیں
معلوم ہوا کہ اونڈھا میں غریب طلبہ کے قیام طعام کا مفت
نظام ہے۔

اونڈھا کے لئے روانگی عمل میں آنے لگی ان کی والدہ
ر سروں کے یہاں کام کاج کر کے گزر بسر کر لیا کرتی تھی سانے
روجی کو دینے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان کو رخصت کرتے
قت ان کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں محبت کا طوفان امنڈ
یا۔ ان کے پاس ایک گھونگھڑی تھی سانے گروجی کو دے دی
اونڈھا پہونچنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ بیرونی
لبہ کے لئے قیام و طعام کی تمام سہولیات ختم کر دی گئی ہیں غریبی
ں آٹا گیلا جو روپیہ قرض لے کر آئے تھے وہ بھی چوری ہو گیا تھا
نھیں پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ چار آنے کرایے پر
یک تاریک کمرہ لے لیا اور بھیک مانگ کر ([illegible]) پڑھنے لگے
ن زمانے میں پلیگ کی بیماری تیزی سے پھیل گئی تھی۔ پونے میں
ن کے بڑے بھائی پلیگ کا شکار ہو گئے اونڈھا کی اسکول بند کر دی
ئی اور تمام طلبہ کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے وطن واپس چلے جائیں
ن کے پاس ایک پیسہ نہ تھا اپنی گھونگھڑی اور چند کتابیں فروخت
ر کے اپنے وطن واپس چلے آئے لیکن والد نے زبردستی اونڈھا
بھیج دیا۔

یہاں بازار سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پرانی کتابیں خرید کر
اتے اور پڑھتے۔ رام کرشن دویکانند کے خیالات سے آگاہی ہوئی
لک کی تقاریر پڑھی۔ انا صاحب پٹوردھن کے حالات زندگی کا
طالعہ کیا۔

سیناپتی باپٹ کے جنم دن پر سانے گروجی کے
ہمراہ سیناپتی باپٹ، اچاریہ اترے اور
راؤ صاحب راؤ بہادر بولے۔

سانے گروجی کو اپنے والدہ کی یاد بہت ستا رہی تھی
وہ پال گاڑی واپس آئے یہاں انھیں اپنی والدہ کا آخری دیدار
بھی نصیب نہ ہو سکا ان کی زندگی میں اندھیرا چھا گیا اور سب خواب
ٹوٹتے ہوئے نظر آنے لگے وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ سب کچھ جدوجہد
کس کے لئے؟ اور کیوں؟ ان کی خالہ کہنے لگیں کہ تم اپنے بھائی اور
والد کے لئے تعلیم حاصل کرو۔ جو محبت اور خوشی اپنی ماں کو دینے والے
تھے وہی خوشی اور محبت دنیا والوں کو دو۔ بھارت کی خدمت کرو۔

پونا میں قیام

وہ پونا چلے آئے۔ یہاں ان کے دوستوں نے ایک
انجمن قائم کی۔ اس انجمن کی جانب سے مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ
ہوتا جس میں سانے گروجی بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے
رام کرشن، دویکانند وغیرہ پر کئی تقاریر کیں۔
وہ میٹرک میں امتیازی نمبر سے کامیاب ہوئے اور نیو
پونا کالج میں آرٹس میں داخلہ لیا۔ یہاں لائبریری میں کافی کتابوں
کا مطالعہ کیا۔ ٹالسٹائی، رویندرناتھ، رسکن، کیٹس، شیلے، امرسن
بائرن، ٹینی سن، ورڈس ورتھ کے متعلق بے شمار کتابیں پڑھیں۔

والد کا انتقال ہو گیا گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پر عائد ہو
گئیں، چھوٹے بھائی کی تعلیم کے لئے معاشی مدد دینے عدد ضروری تھی
انھوں نے بمبئی کے ولسن کالج میں ملازمت کے لئے درخواست دی
وہاں انھیں نوکری بھی مل رہی تھی لیکن کالج کی ملازمت کے بجائے
اسکول میں مدرس کے پیشے کو اپنانے کو ترجیح دی کیونکہ ان کا خیال تھا

کر دیہات میں رہنے والے طلبہ کی خدمت کرنے میں قلبی اطمینان مل سکے گا۔

۱۹۲۰ء میں خاندیش شکشن سنستھا کی ایک ہائی اسکول تھور میں ۱۹۲۶ء تک بحیثیت مدرس اپنی خدمات انجام دینے لگے تدریس میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ شاعر دتا کا جھولا یا شکسپیر کے ڈرامے کے مکالموں کو سمجھاتے وقت جن لوگوں نے انھیں دیکھا وہ ان کے تدریس کے طریقے کو بھول نہیں سکتے۔

یہاں انھوں نے گوکھلے پر ایک کتاب تصنیف کی اور اسکول کے صدر مدرس گوکھلے صاحب کو دکھانے کی غرض سے لے گئے اور یہ خیال تھا کہ صدر مدرس ان کی کاوشوں کو خوب سراہیں گے لیکن گوکھلے صاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ "اس کتاب پر دو وقت کی چائے ہوسکتی ہے۔" یہ سخت الفاظ نشتر بن کر جگر کے پار ہوئے لیکن ان کے دل میں یہ خیال ہرگز پیدا نہیں ہوا کہ گوکھلے صاحب نے ان کی توقیر کی ہے۔

طلبار کی خدمت

وہ طلبہ کے ماں باپ تھے۔ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ان کا کمرہ صاف کرتے، جھاڑو دیتے، ان کے بستر کی خراب چادر دھوتے، قندیل کا حباب صاف کرتے، ان کے کپڑے دھوتے، کپڑوں کو رفو کرتے، درختوں اور جانوروں کو پانی دیتے۔ ایک طالب علم نے ان کی یہ خدمات دیکھ کر کہا کہ گرو جی ہمیں شرمندہ کرنے کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کیا ماں اپنے بچے کو شرمندہ کرنے کے لئے اس کے کپڑے دھوتی ہے۔

ہوسٹل کے طلبہ ان سے بے حد خوش تھے انکی وجہ سے ہوسٹل کا نام تمام خاندیش میں مشہور ہوگیا تھا۔ دور دور سے طلبہ ہوسٹل میں داخلہ کے لئے آنے لگے تھے۔ ہوسٹل گویا پھولوں کا ایک باغیچہ ہے اور وہ طلبہ کی زندگی کے مالی بن کر ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔

اخبار کا اجرار

غریب طلبہ کی امداد کرنا یہی ان کا ایمان تھا۔ صبح و شام پرارتھنا کے وقت گرو جی طلبہ کو نصیحت کرتے۔ انھوں نے ہوسٹل سے ایک اخبار جاری کیا جس میں مختلف النوع مضامین ہوتے تھے ملکی و غیر ملکی چیزیں، تحریک آزادی کا ذکر، گاندھی جی کی جد وجہد ملک میں ہونے والے حادثات، سائنس کی ترقیاں، بڑے لوگوں کے حالات زندگی، مختلف معلوماتی مضامین شائع ہوا کرتے تھے جن کا مقصد طلبہ کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھنا تھا اَمَلنیر جیسے دیہات سے اخبار کا نکالنا جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کلکتہ میں کانگریس کا ایک اجلاس ہوا جس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس ہوئی۔ سانے گرو جی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ آزادی کا خواب دیکھنے لگے۔

मंगल मंगल त्रिवार मंगल

पावन दिन हा धन्य अहो

भारत प्यारा स्वतंत्र झाला

जय बोला जय बोला हो

اسکول کی ملازمت ترک کرکے تحریک آزادی میں شامل ہوگئے وطن سے محبت کا جذبہ پیدا کرنے اور عوام کے دلوں میں آزادی کا شعلہ پیدا کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا۔

आम्ही माडू निर्भर गण

देउ हो प्राण

स्वातंत्र्यसुधेचे निजजननीला

घडवू मंगल पान

स्वार्थाची करून होळी

छातीवर झेलू गोळी

करू मृत्युशी खेळीमेळी

मातृभूमी च्यासाठी मोदे

करू सारे बलिदान

ही मंगल भारभूमी

करू स्वतंत्र निश्चित आम्ही

हा निश्चय अंतर्यामी

मातृमोचना करूनि जगी

अर्पू पहिले स्थान

یہ گیت خاندیش کی گلی کوچے میں گونجنے لگا جس کی وجہ سے
۱۱ مئی ۱۹۳۰ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ پندرہ مہینے کی سزا ہو گئی۔
ان کے دل میں سب کے لیے محبت تھی انھوں نے بنگالی
زبان کا مطالعہ کیا۔ دیش بندھو چِترنجن داس کا مطالعہ کیا۔ علامہ اقبال
کی شاعری پڑھی۔ رویندر ناتھ سے وہ کافی متاثر تھے۔ وہ جیل سے
رہا ہونے لگے تو کسی نے پوچھا کہ رہائی کے بعد کیا کریں گے وہ کہنے لگے
سچے مذہب کا پرچار کرونگا۔ سچا مذہب وہ ہے جو تمام عالم کو محبت
کا پیغام دے صرف دھرم پوجا کرنیکا نام نہیں یا چند منتر یاد کرنیکا نام نہیں
وہ انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے

खरा तो एकची धर्म
जगाला प्रेम अर्पावे
जगी जे हीन अति पतित
जगी जे दीन पददलित
तया जाऊन उठवावे
// जगाला //

ونو بھاجی سے ملاقات

جیل سے رہائی کے بعد وہ خاندیش میں گھومنے پھرنے لگے
خاندیش میں ایک سمیلن رکھا گیا تھا جس میں ونو بھاجی بحیثیت صدر منتخب
کیے گئے تھے۔ سانے گرو جی کی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے ستیہ گرہ
کی اہمیت بتلائی۔ پہلی ملاقات میں ہی انھوں نے ونو بھا کا دل جیت
لیا اس سمیلن سے وہ تمام خاندیش میں مشہور ہوئے۔
جب ونو بھا کا خاندیش میں دورہ شروع ہوا تو اس سفر میں
سانے گرو جی ان کے ہمراہ تھے انھوں نے اپنی تقاریر سے عوام کے
دلوں میں آزادی کی روح پھونک دی۔ جب الوطنی کی شمع جلائی ادھر
گول میز کانفرنس انگلینڈ میں جاری تھی۔ ونو بھا کو جلگاؤں میں گرفتار
کر لیا گیا ان کے ساتھ سانے گرو جی بھی گرفتار کر کے دھولیہ جیل میں ڈال
دیے گئے۔ دونوں کو جیل میں چکی پیسنا پڑتی۔ سانے گرو جی گانا گاتے
کہانیاں قصے سناتے اور سب سے زیادہ آٹا پیستے تھے۔ دھولیہ میں
وہ زیادہ دنوں تک رہ نہ سکے انھیں ناسک جیل میں منتقل کر دیا گیا۔
جیل میں ونو بھاجی سے جد وجہد آزادی کا جو وعدہ کیا تھا وہ نظم کی
شکل میں اس طرح ظاہر ہوا۔

करीन सेवा तव मोलवान
असो अहंकार अता मला न
मदीय आहे बळ अल्प देवा
[illegible]नुरूपा मम घेई सेवा
कधी कुणाचे मजला पुसू दे
जलार्द्र डोळे मग तो हसू दे

ادبی خدمات

جیل میں فرصت کے اوقات تصنیف و تالیف میں صرف
کرتے تھے۔ مراٹھی زبان میں وہ لاثانی تصانیف چھوڑ گئے ہیں شیام
چی آئی श्यामची आई
بہت مشہور ہے (۲) کو پڑھ کر ماں کی مامتا اور محبت
کا احساس دل میں پیدا ہوتا ہے نئے جذبات، نئے حوصلے پیدا
ہوتے ہیں اس میں جذبات کی عکاسی اس انداز سے کی گئی ہے کہ
پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ زبان
بالکل سادہ، صاف، سلیس ہے اسلوب بیان نہایت دلکش ہے۔

ایک ناول धडपडणारी मुले دھڑ پڑ نا ری موے بھی لکھی جس میں سوامی گوپال راؤ، نام دیو، رگھو ناتھ جیسے وطن پرست کردار موجود ہیں۔

पत्री پتری یہ شاعری پر مشتمل ہے جو ناسک جیل ہی میں لکھی گئی ہے۔ انھیں مہاراشٹر کی تہذیب و تمدن بے حد عزیز تھی۔ پونے میں भारतीय संस्कृती کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب صرف چار دن میں مکمل کرلی تھی۔

سن ۱۹۳۲ء کی لڑائی ختم ہوئی۔ تمام ستیہ گراہی رہا کردیے گئے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ ونو بھاکو سانے گروجی کی فکر لاحق تھی۔ انھوں نے دریافت کیا کہ اب آپ کہاں جائیں گے؟ سانے گروجی نے کہا کہ ایک آشرم قائم کیا جائے مشرقی و مغربی خاندیش کی سرحد پر ونو بھا نے گروجی کے لیے ایک آشرم بنوایا لیکن گروجی آشرم چھوڑ کر چلے گئے۔

۱۹۳۶ء میں یہ طے پایا کہ کانگریس کا ایک اجلاس مہاراشٹر میں ہونا چاہیے بالخصوص خاندیش میں اس کی ذمہ داری سانے گروجی نے اپنے سر لی انھوں نے اپنا طوفانی دورہ شروع کیا۔ دیہات، دیہات گھر گھر پہونچے۔ ہر قسم کی امداد حاصل کرلی۔ تمام لوگوں کا خیال تھا کہ اجلاس کا استقبالیہ صدر سانے گروجی ہونا چاہیے۔ وہ خدمت میں آگے آگے اور عہدہ حاصل کرنے میں پیچھے تھے۔ کسان، مزدور، طلبہ دور دور سے وفد کی شکل میں آئے تھے لیکن اجلاس میں سانے گروجی کہاں تھے؟ وہ پاخانہ صاف کر رہے تھے، راستے صاف کر رہے تھے۔ جھاڑو دے رہے تھے اسی طرح ۱۹۳۶ء میں

مہاتما گاندھی کی طرح سانے گروجی بھی غریب بستیوں میں صاف صفائی کرچاہتے تھے۔ زیرِ نظر تصویر میں موصوف ہاتھ میں جھاڑو لیے دھاراوی جھونپڑپٹی کے علاقہ میں صفائی میں مصروف ہیں

انھوں نے کانگریس کا ایک ہفتہ منایا اور پیدل سفر کرتے رہے۔

تنظیم کا قیام

کسانوں اور مزدوروں پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے ان کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی تھیں۔ ان کے ساتھ انصاف ہونا چاہیے اور کسانوں پر لگایا گیا ٹیکس کم ہونا چاہیے اس غرض سے سانے گروجی نے ایک سنگٹھنا قائم کی۔ ۱۹۳۹ء میں جلگاؤں میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا جس میں چالیس، پچاس ہزار سے زائد کسانوں

سانے گروجی ایک بیت الخلا کی صفائی میں مصروف۔

یرودِ یا جیل میں سلاخوں کے پیچھے کر دیے گئے۔

جیل سے باہر آنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں تمام مہاراشٹر کا دورہ کیا انبلنر، سونیر، جلگاؤں اور دھولیہ میں ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا خاندیش کی عوام نے سانے گروجی کو ان کی خدمات کے صلے میں ایک تھیلی پیش کی ۱۹۳۵ء میں کچھ کمہاروں نے ایک کمہار ساہتیہ منڈل قائم کیا تھا۔ سانے گروجی اکثر جلسے جلوس سے دور رہا کرتے تھے لیکن لڑکوں کے اصرار کرنے پر انھیں خوش کرنے کے لیے صدارت قبول فرمائی اور اپنا پیغام سنایا۔

سانے گروجی کامگار میدان پریل کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے۔
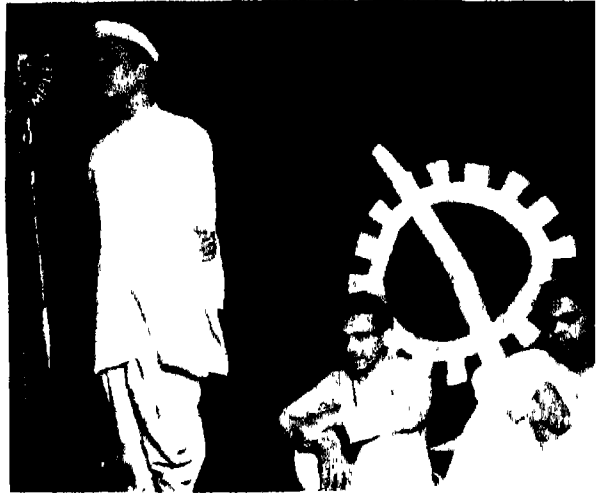
تحریر میں خون کی سُرخی

سانے گروجی اپنی نگارشات کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ "لکھتے وقت میں روتا ہوں، میری تحریر دل میں خون کی سرخی جھلکتی ہے آنسو ہیں جو میرے ادب کو پڑھتا ہے گویا وہ میرے دل کو چھوتا ہے۔ تم جو بھی لکھو اس میں جان و روح ہونا چاہیئے۔ صرف لکھنے کے لیے نہیں لکھنا چاہیئے۔ تمھارے اندر بھوک ہو تب ہی لکھنا شروع کرو! آدمی اپنے ہاتھوں سے جو کچھ بھی کام کرتا ہے وہ دراصل اس کے دل میں ہوتا ہے بھارت کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ نیچر سے محبت رکھو، نیچر اپنی ماں ہے نیچر سے محبت رکھے بغیر تمھارے ادب میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔"

سانے گروجی شیواجی پارک بمبئی میں سیوا دل کے بیچے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے۔

شرکت کی اسی زمانے میں دھولیہ میں پرتاب مِل بند ہوگئی جس سے ہزاروں ...ر بے کار ہوگئے۔ مزدوروں کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے محتاج ...گئے۔ تالہ توڑنے کے لئے گروجی نے بے انتہا جد و جہد کی۔ اسی زمانے ...کرانتی क्रांती نامی ایک ناول لکھی جس کا اثر انقلاب کی صورت میں ...انوں پر گہرا اثر پڑا۔

سانے گروجی نے कांग्रेस पत्र کانگریس پتر جاری کیا جس کا ...مد چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں کسانوں، مزدوروں، اور طلبہ تک ...ے خیالات پہونچانا تھا لیکن یہ نقصان میں چلنے لگا انبلنر میں اس ...لئے بھیک تک مانگتے رہے۔

ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ ہندو، مسلم، عیسائی ...ب کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ ذات پات، اونچ نیچ کے قائل نہ تھے ...رھی وادی اور سماج وادی تھے بستیہ گرہی سے دلی محبت رکھتے ... انھوں نے عوام میں آزادی کی لہر پیدا کرنے کے لئے طوفانی دورے ... آخر کار گرفتار کرکے ناشک جیل بھیج دیئے گئے۔

ہندوستان چھوڑو

بمبئی میں کانگریس کا ایک اجلاس ہوا جس میں "ہندوستان ...ڑو" کا ایک تاریخی رزرویشن پاس ہوا اسی زمانے میں سانے گروجی ...ل سے رہا ہوئے اسی وقت انھوں نے क्रांतीच्या मार्गावर ...ں ایک پوشیدہ کتاب لکھی۔ ۲۰ راپریل ۱۹۴۳ء میں پھر قید کرکے

۲۸ مارچ ۱۹۵۰ء کو سانے گروجی نے پریل اندھیری میونسپل ورکرس کمپلکس کے مکانات کی سنگ بنیاد رکھی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

سانے گروجی ایک نئے بھارت کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں غریبی نہ ہو، بھائی چارگی ہو ایکتا ہو، پیار ہو، گاندھی جی اور ونوبھاجی کے کندھے سے کندھا ملا کر ملک کی آزادی میں حصہ لیا۔ آج پھر سانے گروجی جیسے خادم ملک و قوم، سوشل ریفارمر کی سخت ضرورت ہے وہ جمہوریت پسند تھے۔

موت کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ زندگی ختم ہونے کا ایک دن ضرور آتا ہے۔ موت یعنی خدا کے پاس جانے کا دروازہ ہے۔ جون ۱۹۵۰ء میں وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

ان کی موت پر ونوبھاجی نے کہا تھا۔

" مجھ سے شریر میں مضبوط تھے اور عمر میں کم، زیادہ سے زیادہ پچاس برس کی عمر تھی۔ اتنی کم عمری میں انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دئے۔ مہاراشٹر میں نئی نسل کو اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ "

★ پروفیسر ڈاکٹر ایس۔ اے لگراہے
صدر شعبۂ پولیٹیکل سائنس
شریمتی متھوربائی وائچند مہاودیالیہ۔ سانگلی

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل اور انکی تعلیمی تحریکات

آج یہ بات ہر ایک پر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تعلیم اور ریاست کا تعلق محض قریبی ہی نہیں بلکہ گہرا بھی ہے مربوط ہے۔ پی نائیک تعلیم اور ریاست کے باہمی رشتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تعلیم معاشرے میں فرد کی زندگی کے معیار کو متعین کرتی ہے۔ سماج میں جمہوری قدروں کی جڑوں کو مستحکم کرنے میں تعلیم نہایت اہم رول انجام دیتی ہے مملکت کے دستور کی اساس آزادی، یکسانیت، یکساں مواقع کی فراہمی، قانون کے رول اور سماجی انصاف پر رکھی گئی ہے۔ اگر ہم ان اقدار کو اپنی روزانہ کی زندگی میں بروئے کار لائیں تو بلاشبہ ایک آئیڈیل معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی جا سکتی ہے۔

مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے غریب اور پسماندہ عوام کو جہالت کے گھنے اندھیرے سے نکال کر علم کی روشنی سے روشناس کروائیں کہ تعلیم ہی عوام کو فرسودہ روایات، اور پرانے بوڑھے اعتقاد کی زنگ آلود زنجیروں سے آزاد کرا سکتی ہے۔ شروع ہی سے ہندوستان میں ذات پات کی تفریق کی رسم ملک کی سماجی و سیاسی ترقی میں بادھا ڈال رہی ہے۔ اس رسم نے ہمارے سماج میں مختلف افراد کے مابین نفرت و حقارت کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں مثلاً برہمن اور دیگر اونچی ذات کے افراد ہی اقتدار کا مزہ لوٹتے ہیں اس طرح وہ اپنی قوت، دولت اور سماجی معیار کو مزید بلند کرتے جاتے ہیں جب کہ غریب اور پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والا فرد زندگی بھر اپنے محدود حلقے کے گرد ہی چکر کاٹتا رہ جاتا ہے۔ اس چکر دیو کے توڑنے کا حوصلہ وہ اپنے میں نہیں پاتا۔ ہمارے معاشرے کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ درج فہرست ذاتیں اور قبائل آج بھی اچھوت سمجھے اور برتے جاتے ہیں۔

برطانیہ سامراج نے جب ہندوستانی سماج پر اپنی طنابیں کس دیں۔ انگریزی تعلیم کا شہرہ بھی ہر جگہ ہونے لگا۔ انگریزوں نے محض اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے انگریزی طرز تعلیم کو ہندوستانی سماج پر لادا۔ اس سے ان کا مقصد STATUS QUO ہندوستان پر قائم کرنا تھا۔ تعلیم کو عام کرنے کا جواز غریب اور پسماندہ عوام کو سماجی و ذہنی غلامی سے نجات دلانا ہرگز نہیں تھا۔
انگریزی طرز تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے جیمس۔ ایس کولے

ضلع قلابہ میں پنویل مقا
رعیت شکشن سنستھا کا
آرٹس، سائنس اور کامرس

سن نے کہا کہ انگریزی طرزِ تعلیم کے پیچھے محض اونچی ذات کے لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔

مہاتما جیوتی با پھلے نے سب سے پہلے انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی پر نہایت سخت اور کڑے لفظوں میں تنقید کی۔ انھوں نے حکومت برطانیہ سے پرزور مطالبہ کیا کہ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ملک بھر میں پرائمری اسکول کھولے تاکہ دیہی علاقوں کی غریب اور پسماندہ عوام جو جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہی ہیں۔ علم کی روشنی میں اپنی زندگی کے مقصد اپنی سماجی ذمہ داریوں کو متعین کر سکیں اس سلسلے میں ہنٹر کمیشن HUNTER COMMISSION کو ایک عرضداشت بھی پیش کی۔

ہندوستان کے سبھی سماجی کارکنوں نے سماجی و سیاسی تبدیلیوں کے لئے تعلیم کی افادیت پر خاصہ زور دیا ہے۔ جہد آزادی کے وقت تقریباً سبھی رہنماؤں نے ہندوستانی عوام سے جمہوری اقدار پر منحصر ایک ایسا تعلیمی نظام نافذ کرنے کا وعدہ کیا تھا جن سے غریب سے غریب اور پسماندہ عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ ڈین نسک (DEAN NUSK) کہتے ہیں کہ بغیر تعلیم کے ایک جمہوری مملکت کو قائم ہی نہیں کیا جا سکتا کہ جمہوری مملکت میں محض وہ افراد سانس لے سکتے ہیں جن کے دل میں معلومات حاصل کرنے کا شوق اور اپنی معلومات دوسروں تک پہونچانے کا جذبہ ہو۔

ستیہ شیو دھک کے ایک سرگرم رکن ہونے اور مہاتما جیوتی با پھلے کے مقلد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم کی اہمیت اور اس کی افادیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا وہ جانتے تھے کہ تعلیم کے بغیر ہماری سیاست، ہمارا معاشرہ ترقی کا ایک مرحلہ بھ نہیں کر سکتا۔ بغیر تعلیم کے ملک کے پسماندہ عوام، سماجی اور آزادی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ ایک جمہوری سیاسی نظام قائم کرنا ہتھیلی پر سرسوں جما مترادف ہے۔ چنانچہ مزید وقت گنوائے بغیر انھوں نے ۱۹۱۹ بمقام کالے ضلع ستارا میں "رعیت شکشن سنستھا" کی بنیاد ڈ بعد میں ۱۹۲۴ میں اس کے صدر آفس کو ستارا میں منتقل کر تبھی سے کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل نے مغربی مہاراشٹر کی غر پسماندہ عوام کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کی خاطر ا وقف کر دی۔

وسعت اور نوعیت کے لحاظ سے بھاؤراؤ پاٹل ک صرف مہاراشٹر کے لئے بلکہ پورے برِ صغیر کے لیے اپنی مث ہے۔ کم سے کم ہمارے ملک میں ایسی مثال ناپید ہے ہے کہ بھاؤراؤ پاٹل اس میدان میں اپنی اجارہ داری قا کے خواہشمند تھے انھوں نے دوسرے افراد کو بھی اس طرح کرنے کی ترغیب دی۔

بارسی ضلع سولاپور کے جناب ماما صاحب جگدا۔ کے باپوجی سالنکھے ودیکا نند شکشن پرسارک سنستھا کے کرم ویر جناب باسو صاحب۔ ہیرے اور دھولے کے اناصاحب گھوگھرے جیسے نامور سماجی و سیاسی کارکنوں کو بھاؤراؤ ان کے حلقوں میں تعلیمی ادارے کھولنے کی ترغیب دی۔ یہ ان ہم کا نتیجہ تھا کہ انکی شکشن سنستھا کے نقشِ قدم پر بہت سی سنستھ

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل، ڈاکٹر پنجاب راؤ دیشمکھ کے ہمراہ

نے لگیں اور جنھوں نے جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے دیہی علاقوں
لم کے نور سے منور کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔

بھاؤ راؤ پاٹل کی موت کے بعد ان کے شاگردوں نے ان
سنتھا کو زندہ رکھا اور اسی جذبے کے تحت علم پھیلایا جس کے لیے
اؤ راؤ پاٹل نے اپنی ساری زندگی خرچ کردی تھی۔ بھاؤ راؤ پاٹل
خیال تھا کہ غریب اور پسماندہ عوام کو علم کی روشنی سے روشناس
ہ بغیر ملک میں جمہوریت کے معنی تلاش کرنا اندھیرے کمرے میں
لی تلاش کرنے کے برابر ہے۔ چنانچہ ان کے شاگردوں نے بھی
ادی، یکسانیت، سماجی انصاف اور اشتراکیت کی صحت مند
ر توانا قدروں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے علم پھیلانا شروع
۔ یوں تو بھاؤ راؤ پاٹل کی اس تعلیمی تحریک نے سماج کے مختلف
بھی شعبوں کو متاثر کیا مگر ہماری سیاست پر اس نے خاصے گہرے
رات چھوڑے۔

زندگی کے بالکل ابتدائی دنوں ہی سے کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل
پر ان کی زندگی کا مقصد اور مشن واضح تھا اور مہاتما جیوتی با پھلے
اور چھترپتی شاہو کے مقلد ہونے کی وجہ سے تعلیم کی قوت کا انھیں
اندازہ تھا وہ جانتے تھے سماجی ارتقا اور سیاسی ترقی کے لیے تعلیم
ایک موثر اور اہم ہتھیار ہے وہ ستیہ شودھک اور نان برہمنی تحریکات
کے رکن تھے اور سیاست میں جمہوری اقدار پر ان کا کافی اعتماد تھا اپنے
طالب علموں کو بھی انھوں نے سیاست میں جمہوری اقدار کے معنی سمجھائے
بلکہ طالب علموں کے والدین اور سرپرستوں کو بھی زندگی کے فرسودہ
اور بوڑھے اعتقاد چھوڑ کر جمہوری اقدار کو اپنانے کی ترغیب دی
ان کے اس اقدام کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ستارا، سانگلی
اور کولہاپور کے عوام نے قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا
شروع کردیا اور وہاں کے عوام نے ستارا کی "پتری سرکار" جیسے
انڈر گراؤنڈ مجاہد آزادی کی سماجی مدد کی۔

مغربی دانشوروں نے سیاست کو سیکھنے کا ایک مسلسل عمل
کہا ہے اُن کے مطابق یہ ایک ایسا عمل ہے جو بعد میں فرد کی شخصیت
کا ایک ناقابلِ تسخیر حصہ بن جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس کردار کو بنا
کر قائم رکھتا ہے۔

تمام مغربی دانشور اس امر سے متفق ہیں کہ ترقی پذیر ممالک
میں تعلیمی نظام نہایت اہم بلکہ کلیدی رول انجام دیتا ہے اس
کے ذریعے عوام کی ذہنی و سماجی سطح کو بلند کیا جاسکتا ہے۔ کرم ویر
بھاؤ راؤ پاٹل نے عوام کے اس اعتماد کو تعلیم کے ذریعے جگایا تاکہ
وہ آنے والی ساری پریشانیوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے شانوں
پر سہنے کی جرأت رکھیں، زندگی کی پیچیدگیوں سے صحیح ڈھنگ
سے نمٹ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھاؤ راؤ پاٹل کی رعیت شکشن سنستھا
سے ایسے ہزاروں لوگ باہر آچکے ہیں جو آج زندگی کے مختلف
شعبوں میں انتظامیہ کا رول انجام دے رہے ہیں۔

زندگی کے ابتدائی دنوں ہی سے بھاؤ راؤ پاٹل
ذات پات اور چھوت چھات کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی
ذاتی اور سماجی زندگی میں اشتراکیت اور بھائی چارے کا رویہ
اپنا رکھا تھا۔ انھوں نے جب "رعیت شکشن سنستھا" کی بنیاد ڈالی
تو اچھوت طلبہ کو داخلے کے لیے ترجیح دی۔ مرحوم گیان دیو گھولپ
جو بعد میں ودھان سبھا کے رکن بھی منتخب ہوئے بھاؤ راؤ پاٹل
کے اولین طالب علم تھے۔

واشی، نئی ممبئی میں رعیت شکشن سنستھا کا ماڈرن اسکول۔

ذات پات کا نظام صدیوں پرانی ایک ایسی وباتھی جس نے ہندوستانی معاشرے کو بیمار کر رکھا تھا جس نے انسان انسان کے درمیان گہری کھائیاں کھود ڈالی تھیں جس نے فرد کو ذات، نسل وغیرہ وغیرہ کے خانوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ بھاؤ راؤ پاٹل کا خیال تھا کہ محض اشتراکی نظریۂ زندگی ہی ان خانوں کو توڑ کر عوام کو ایک سطح پر پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جمہوریت کے لئے ضروری ہے کہ ملک سیاسی طور پر منضبط ہو جب کہ ہندوستان اور مہاراشٹر بھی سیاسی طور پر منضبط نہیں تھے، کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کو اس کا شدید احساس تھا اس لئے انھوں نے مذاہب، قوم اور نسل کی تفریق کے بغیر طلبہ کے لئے مشترکہ رہائشی انتظام کیا اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر فرقے کے افراد دوسرے فرقوں کے افراد کے قریب آجائیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ ان کے اس اقدام سے اشتراکی رویہ کو پنپنے میں خاصی مدد ملی۔

مشہور ماہر تعلیم جناب اے آر کامت نے ۱۰ راگست ۱۹۵۸ء کو اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ تمام فرقوں بشمول مسلم واچھوت طلبہ وطالبات کے لئے ایک مشترکہ ہوسٹل قائم کرنا کرم ویر کا ایک لائق ستائش تجربہ ہے۔ ایسا کرنے سے کم از کم نئی نسل اس زہریلی وباسے بچ جائے گی جسے چھوت چھات کہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اشتراکی نظریۂ زندگی کو بھی خاصی تقویت ملے گی۔ چھترپتی شاہو اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں کر پائے جب کہ کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کا یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔

بھاؤ راؤ پاٹل کے اس تجربے کی ستائش بہت افراد نے کی۔ ستارا ضلع کے مشہور عالم لکشمن شاستری نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ بھاؤ راؤ پاٹل نے تعصب سے اوپر اٹھ کر تمام فرقے کے طلبہ کے لئے مشترکہ ہاسٹل تعمیر کرواکر قومی یکجہتی کے لئے راہ ہموار کی۔

یہ ان کے اس کامیاب تجربے ہی کا اثر ہے کہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی نسبت مہاراشٹر میں چھوت چھات کی وبا کم نظر آتی ہے۔

چونکہ بھاؤ راؤ پاٹل ستیہ شودھک کے سرگرم رکن تھے چنانچہ آزادی، مساوات اور یکساں مواقع کی فراہمی آپ کا مکمل اعتقاد تھا انھوں نے ذات پات کی تفریق، آپسی نفاق اور چھوت چھات کی سخت مخالفت کی۔ سماجی وسیاسی زندگی میں اونچی ذات والوں کی اجارہ داری کو بھی انھوں نے اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی نظر میں اس اجارہ داری کو ختم کرنے کا واحد مگر موثر ہتھیار تعلیم تھا۔

تعلیم کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کا ایک طالب علم کہتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا کوئی دیش اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک عوام کے شعور کو جھنجوڑا نہ جائے۔ اور بے شک علم ہی وہ شئے ہے جس سے عوام کے سوئے ہوئے شعور کو دوبارہ جگایا جا سکتا ہے۔

بھاؤ راؤ پاٹل اور ان کی رعیت شکشن سمیتی نے ہزاروں کی تعداد میں ڈاکٹر، انجینیر، اور ماہرین پیدا کئے۔ انھوں نے اپنے چند ذہین مگر غریب طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ اور روس بھی بھجوایا

ائس چانسلر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیسے عہدے پر
ر۔

رزی و ریاستی حکومت کے انتظامیہ میں ان کے کئی طلبہ
انجام دے رہے ہیں اسکے علاوہ بہت سے سماجی اور سیاسی لیڈران
ؤں سے نکلے جو مختلف پارٹیوں سے منسلک ہیں ۔ اور
پاٹل کے طالب علم رہ چکے تھے۔ کسان مزدور پارٹی
بھاؤراؤ پاٹل کا رول کلیدی رہا ہے ان کے طلبہ ان
ے کی پارٹی پر فائز ہیں ۔ ان کے کئی طلبہ مختلف کوآپریٹو
آپریٹیو بینک اور کوآپریٹو شکر ملوں میں کام کررہے

ی شرد پوار۔ شری۔ وائی ۔ بی چوان اور شری بالا صاحب بھونسلے قابل
ن مہاراشٹر میں وزارتِ اعلیٰ کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔

شری وائی بی۔ چوان ۱۹۶۰ میں رعیت شکشن سنستھا کے
ہیں۔ وائی بی چوان نہ صرف مہاراشٹر کے وزیر اعلےٰ
بلکہ جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، اور اندرا گاندھی
دہ وزیر دفاع، وزیر داخلہ اور وزیر مالیات جیسے
پر رہ چکے ہیں۔ جنتا دورِ حکومت میں وہ ڈپٹی وزیر اعلیٰ
ے۔ شری شنکر راؤ کالے جو کہ رعیت شکشن سنستھا کے
ی شرد پوار کے دورِ حکومت میں وزیر مملکت برائے تعلیم بھی رہ چکے ہیں
یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آزادی کے بعد آج تک کبھی وہ
آیا جب مہاراشٹر کی وزارت میں بھاؤراؤ پاٹل یا ان کی
سنستھا کا کوئی طالب علم منتخب نہ کیا گیا ہو۔ بھاؤراؤ
بق طلبہ کانگریس اور دیگر پارٹیوں میں اس قدر بکھرے
کہ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہے۔
پاٹل۔ ڈاکٹر دتہ جی راؤ سولنکے اور شنکر راؤ کھرت تینوں ہی
ل کی رعیت شکشن سنستھا کے طالب علم رہ چکے ہیں اور
راجی یونیورسٹی، مہاتما پھولے زراعتی یونیورسٹی، مراٹھواڑہ
ں وائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز تھے۔
بہت سے ضلع پریشد، پنچایت سمیتی اور گرام پنچایت
ہدے پر رعیت شکشن سمیتی کے سابق طلبہ براجمان ہیں۔
بھاؤراؤ پاٹل کے سابق طلبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر
ہیں ۔

ہندوستانی فوج (انڈین آرمی) کے پہلے ہندوستانی کمانڈر انچیف جنرل۔ کے۔ ایم۔ سی کری اپا کے ہمراہ کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل۔

”رعیت شکشن سنستھا سے نکلے ہوئے سماجی و سیاسی لیڈران غریب و پسماندہ عوام کی خدمت کا جذبہ لے کر آتے ہیں۔ انکا سوشلزم، کمیونزم، سماجی برابری اور سماجی انصاف پر اعتماد ہوتا ہے جبکہ ذات پات اور چھوت چھات کی وہ سب کے سب مخالفت کرتے ہیں اور یہ سب بھاؤراؤ پاٹل کی تعلیم کا کرشمہ ہے۔“

پونے کے ساسون اسپتال میں کرم ویر، سابق گورنر مہاراشٹر شری پرکاشا، شری گنپت راؤ شیڈگے، سابق میئر پونے، شری بابو راؤ سناس اور ڈاکٹر مودی، ساسون اسپتال کے ڈین کے ہمراہ۔

بھاؤ راؤ پاٹل کی دیہی علاقوں کی تعلیمی تحریکات نے دیہی عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا اور لسانیاتی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم اس وقت ایک نئے بہوجن سماج کی بنیاد ڈالی۔ مغربی مہاراشٹر میں اونچی ذات خصوصاً برہمن جو معاشرے پر مسلط تھے اس بہوجن سماج نے ان کے اثر کو کم کیا۔ اس کی سربراہی وائی۔ بی چوان، وسنت دادا پاٹل، شردپوار، پرنسپل این ڈی پاٹل شونت راؤ موہیتے جیسے سماجی و سیاسی شخصیات کر رہے تھے۔

غریب اور مراٹھا عوام کا استحصال جو برہمن اور سرمایہ دار کر رہے تھے ان کے استحصال کو روکنے کے لئے ہی بہوجن سماج کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس بہوجن سماج کی جڑیں مغربی مہاراشٹر میں بہت گہرائی میں پیوست ہیں۔ اس سماج کا مقصد غریب و پسماندہ عوام کی فلاح تھا۔ اس سماج کا جھکاؤ بائیں بازو زیادہ تھا بے شک اس سماج میں چند ایک سوشلسٹ بھی تھے مگر سب کے سب سرمایہ داری کے مخالف تھے۔ بہوجن سماج کو آپریٹو تحریکات کے ذریعے معاشی ترقیات کا خواہشمند تھا۔

یہ کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کی تعلیمی تحریکات کا ہی اثر تھا کہ دھانجے راؤ گاڈگل جیسے مشہور علم معاشیات بھی کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کے لئے رضامند ہوئے۔

مغربی مہاراشٹر میں کوآپریٹو تحریکات کی ترقیات کے لئے گاڈگل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ایک جمہوری سیاسی نظام اس بات کا غماز ہے کہ ملک سیاسی طور پر جڑا ہوا ہے۔ ہندوستانی معاشرے کی اساس صدیوں سے ذات پات کی تفریق پر مبنی رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی طور پر منضبط نہیں ہو سکا ہے۔

ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والے ہیں۔ مگر اب بھی بہت سارے دیہاتوں میں لوگ جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں وہ اپنے آس پاس بکھری زندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے واقف نہیں۔ وہ آج بھی فرسودہ رسم و رواج صدیوں پرانے بوڑھے اعتقاد کی زنگ آلود زنجیروں اور بیڑیوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں آج تک سیاسی جمہوری نظام قائم نہیں کیا جا سکا ہے اس ضمن میں بنگال، مدراس اور بمبئی کے سماجی و سیاسی لیڈروں نے ملک کو سیاسی طور پر منظم کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی۔

مہاراشٹر میں جسٹس راناڈے، گوپال گنیش آگرکر، مہاتما پھولے چھترپتی شاہو اور کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل نے بھی اپنی تعلیمی

کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل
اور سابق مرکزی وزیر مالیات
ڈاکٹر چنتامن راؤ دیشمکھ
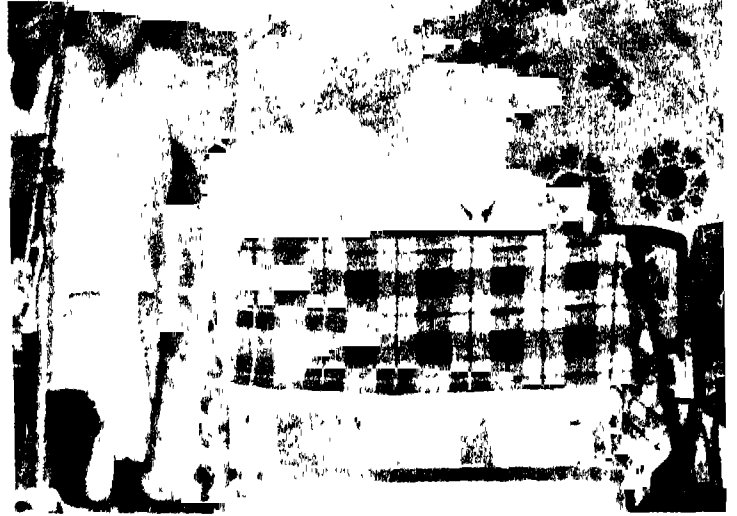
بھاؤ راؤ پاٹل کی صدسالہ
ت تقریبات کے موقع پر
، شری بلرام جاکھر اسپیکر
، کرم ویر کے صاحبزادے
تا صاحب پاٹل کی
افزائی کرتے ہوئے

، کے ذریعے سیاسی طور پر منضبط کرنے کی سعی کی۔ دیہی علاقوں
۔ عام کرنے کے لیے کرم ویر بھاؤ راؤ پاٹل کا رول کلیدی
۔ انھوں نے اس کام کی تکمیل کے لیے اپنی زندگی کا بیشتر
، کر دیا اس کے باوجود ہم آج بھی ملک کو سیاسی طور پر منظم
سکے ہیں۔ اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بہار اور ہندوستان
یاستوں کی نسبت تمل ناڈو، مغربی بنگال اور مہاراشٹر میں
یاسی لیڈروں کی تحریکات نے اپنا خاصہ اثر چھوڑا ہے

اب آئیے مہاراشٹر کی جانب۔ مہاراشٹر خصوصاً مغربی مہاراشٹر مراٹھواڑہ اور ودربھ کے علاقے دیگر علاقوں کی بہ نسبت سیاسی طور پر زیادہ منظم ہیں۔

بھاؤ راؤ پاٹل کی سیاسی و سماجی کارگزاریوں کا مطالعہ کرتے ایک بات جو بار بار ذہن میں ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جس نے بھاؤ راؤ پاٹل کو دیہی علاقوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے پر مجبور کیا۔

کرم ویر کی صدسالہ یوم ولادت کی تقریبات کے موقع پر "دیہی تعلیم" کے عنوان سے منعقدہ ایک سیمینار جس کا اہتمام نیشنل ڈیولپمنٹ نے نئی دہلی میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو کیا۔

یہ سیمینار شری پی این بھگوتی اس وقت کے چیف جسٹس، سپریم کورٹ کی صدارت میں کیا گیا تھا۔ تصویر میں شری منی اوچینیہ مہاراج بھی نظر آرہے ہیں۔

سب سے پہلی وجہ جو ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بچپن ہی سے بھاؤراؤ پاٹل کے دل میں غریب و پسماندہ عوام کے لئے نرم گوشہ تھا اور جب انھوں نے ایک بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مہاراشٹر کے دیہی علاقوں کا دورہ کیا تو انھیں عوام کی پسماندگی کا شدید احساس ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ عوام ابھی تک چھوت چھات اور نسلی تعصبات کے دلدل سے نکل نہیں پائی ہے اور جب وہ ستیہ شودھک تحریکات میں حصہ لیا تو انھیں معلوم ہوا کہ عوام کو صرف علم کی روشنی کے ذریعہ ہی اس دلدل سے نکالا جا سکتا ہے چنانچہ انھوں نے دیہی عوام کو علم سے آراستہ کرنا شروع کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علم حاصل کرنے کے بعد عوام کا استحصال نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں علم حاصل کرنے کی بڑی تڑپ تھی۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ وہ شخص جس نے ہزاروں لوگوں کو قلم پکڑنے کا طریقہ بتایا جس نے سیکڑوں لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا وہ بذاتِ خود میٹرک فیل تھا۔

بھاؤراؤ پاٹل نے دیہی عوام کی فلاح کے لئے جو کام انجام دیا ہے وہ آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بھاؤراؤ پاٹل نے اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے طلبہ کو امریکہ اور برطانیہ بھی بھیجا اور ان کی علمی، سیاسی اور سماجی اور ذہنی معیارِ زندگی کو بلند کیا۔

تیسری وجہ عمل پر بھروسہ کرنے والی بھاؤراؤ پاٹل کی ذاتی شخصیت تھی۔ اس وقت جب کہ لوگ مہاتما گاندھی کی بنیادی تعلیم کی زیر و زبر پر بحث کرنے میں مصروف تھے۔ بھاؤراؤ پاٹل نے سیکڑوں اسکول کھول کر اپنے باعمل ہونے کا ثبوت دے دیا۔

کرم ویر بھاؤراؤ پاٹل کی زندگی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم ایک آئیڈیل سماجی کارکن، ریفارمر، سیاسی لیڈر اور ان سب سے بڑھ کر ایک اچھے سچے انسان کا عکس دکھائی دیتا ہے جس نے اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات دیہی عوام کو علم سے روشناس کرانے میں صرف کیا۔

ترجمہ مراٹھی سے: ۔ نجمہ شیخ
کرلا، بمبئے

س حالاتِ زندگی

د جمہوریہ ہند

شری آر۔ وینکٹ رامن

، راما سوامی وینکٹ رامن تاملناڈو کے
م میں ۴ ردسمبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے تھے
ں نے ایم۔ اے اور بی۔ ایل کی ڈگریاں
یورسٹی سے حاصل کیں۔
ی شادی شریمتی جانکی کے ساتھ ۱۹۳۸ء
ں اور آپ کی تین لڑکیاں ہیں۔
ڈی۔ جیسا کہ ان کے دوست احباب
ا پکارتے ہیں ۱۹۳۵ء میں وکیل مدراس
کے بطور درج کئے گئے اور بعد میں بحیثیت
کورٹ۔ لیکن جلد ہی تحریکِ آزادی
اپنی طرف کھینچ لیا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں
ن چھوڑ دو" کے پُرجوش مرحلے میں وہ گرفتار
ر ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت دو
جیل بھیج دئے گئے۔
۱۹ء میں آپ کو حکومتِ ہند کی طرف سے
یک جماعت کے ہمراہ ان ہندوستانی
ھنے والوں کی مدافعت کے لئے روانہ کیا
لایا اور سنگا پور پر جاپانیوں کو قابض
ں مدد دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا
۱۹ء سے ۱۹۵۰ء تک آپ مدراس
، بار ایسوسی ایشن کے سیکریٹری رہے۔
۱۹ء میں آر۔ وی پراونشیل پارلیمنٹ
ب ہوئے اور ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں
ے لوک سبھا کیلئے دوبارہ چنے گئے۔ اس
پ (۱۹۵۴-۵۵ء) میں پارلیمنٹ کی
رٹی کے سیکریٹری اسٹینڈنگ فائنانس
پارلیمنٹ کی پریویلیج ایسٹی میٹ اور
[illegible]

بابائے صنعت کاری

دس سال تک ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۷ء تک
آپ تاملناڈو میں وزیر رہے اور صنعت، لیبر
امدادِ باہمی، توانائی، نقل وحرکت اور تجارتی
ٹیکسوں کے وزیر رہے۔ صنعت کاری کے سلسلے
میں آپ کی زبردست کوششوں پر آپکو تاملناڈو
کے "بابائے صنعت کاری" کے خطاب سے نوازا گیا۔
۱۹۶۷ء میں آپ منصوبہ بندی کمیشن کے ممبر
مقرر ہوئے اور صنعت، لیبر، توانائی، نقل وحرکت
مواصلات اور ریلویز کے امور سے وابستہ رہے۔
آپ اس حیثیت سے ۱۹۷۱ء تک فرائض انجام
دیتے رہے۔
۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اور دوسری بار
۱۹۸۰ء میں آپ جنوبی مدراس کے حلقۂ انتخاب
سے لوک سبھا کے لئے منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں
آپ وزیرِ مالیات مقرر ہوئے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۸۲ء
کو آپ وزیرِ دفاع بنائے گئے۔

نائب صدر

۱۹۸۴ء کے ماہِ اگست میں آپ وزیرِ دفاع
کے عہدے سے مستعفی ہوگئے تاکہ عہدۂ نائب
صدارت کے امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑیں
۲۲ر اگست ۱۹۸۴ء کو آپ ملک کے نائب صدر
منتخب ہوئے۔
آپ نے بہت سی بین الاقوامی میٹنگوں
میں ہندوستان کی نمائندگی کی جن میں ۱۹۵۰ء کی
نیوزی لینڈ کی "کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس"
۱۹۵۰ء میں جینوا میں ... کمرشیل ٹریڈ
[illegible]
کے بارے میں منعقدہ آئی۔ ایل۔ او کمیٹی ... ۱۹۵۸ء میں
وی آنا میں بلائی گئی بین۔ پارلیمنٹری کانفرنس
شامل ہیں۔
آپ یو۔ این۔ جنرل اسمبلی کے سیشنز برائے
۱۹۵۳، ۱۹۵۵، ۱۹۵۶، ۱۹۵۸، ۱۹۵۹، ۱۹۶۰،
اور ۱۹۶۱ء میں ہندوستانی نمائندے تھے۔ آپ
یو۔ این ایڈمنسٹریٹو ٹریبونل کے ممبر کی حیثیت
۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۹ء تک چنا گیا تھا۔
یو۔ این سیکریٹری جنرل کی طرف سے اس ا...
کارِ نمایاں پر ایک سووینیر دیا گیا تھا جو آپ نے
ٹریبونل کے صدر کی حیثیت سے انجام دئیے تھے۔
ہندوستان میں آپ متعدد تنظیموں کے چیئرمین تھے
جن میں "میجر پورٹ کمیشن" انڈین انسٹی ٹیوٹ آف
فارن ٹریڈ"۔ "نیشنل ریسرچ ڈیولپمنٹ کارپوریشن"
"کمیٹی برائے آٹومیشن" اور "ریاستی الیکٹرک
بورڈس کے طریقۂ کار کی تحقیقاتی کمیٹی" قابلِ ذکر ہیں۔
آپ کئی ایک قومی اداروں کے ٹرسٹی ہیں۔
جن میں جواہر لال نہرو فنڈ اور گاندھی گرام
ٹرسٹ، چیئرمین آف ٹرسٹ۔ میناکشی کالج
آف ویمن۔ مدراس، چیئرمین آف سنکر
سیکنڈری اسکول سوسائٹی اور نائب چیئرمین آف
کلک شیترا، مدراس بھی شامل ہیں۔ آپ تلائی
مندر (ٹیمپل) سوسائٹی نیودھلی کے بھی چیئرمین ہیں۔
آپ کو تعلیمی آرٹ اور سائنس کے میدانوں
میں نمایاں خدمات کے لئے بہت سے ایوارڈ بھی ملے
ہیں۔ آپ کو مدراس یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹریٹ
آف لا کے اعزازی ڈگری سے نوازا۔ آنجہانی شری
کے، کامراج کی سوشیلسٹ ملکوں کے دورے سے
متعلق "ٹراویلوگ" پر سوویٹ انعام ملا اور
مندر کی خدمات کے صلے میں ہز ہولی نس شنکر
آچاریہ نے آپ کو "ست سیوا رتنا" کا لقب
عطا فرمایا۔ آپکی دلچسپیوں میں کھیل اور تفریح طبع
کے امور فوٹو گرافی اور ٹینس ہیں۔ آپ لیبر لا جرنل کے
۱۹۴۹ء سے ... ایڈیٹر ...
[illegible]

وزیراعلیٰ کا پیغام

"بھارت کی آزادی کی ۴۰ ویں سالگرہ کے موقع پر میں اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ہم نے اس سال بھارت کی آزادی کی ۴۰ ویں سالگرہ کی تقریبات کا آغاز ۹ راگست کو تاریخی گوالیا ٹینک سے، جہاں سے پدرِ قوم مہاتما گاندھی نے ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو "بھارت چھوڑدو" تحریک شروع کی تھی، ایک یادگار تقریب منعقد کر کے کیا ہے۔ یہ موقع اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جدید ہندوستان کے معمار اور ہمارے ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی جنم شتابدی کی شروعات بھی اسی دن سے ہوئی ہے۔ میں ملک کی طویل جنگِ آزادی میں اپنی جانیں قربان کر دینے والے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ میں ان بے شمار مجاہدینِ آزادی کی یاد بھی دلجمی سے کرتا ہوں جنہوں نے قوم کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلائی۔

اس موقع پر ہمیں ماضی کی کارکردگیوں کا بھی جائزہ لینا چاہیئے اور مستقبل کے لئے منصوبہ تیار کرنا چاہیئے گذشتہ تین سالوں سے ریاست مہاراشٹر کے عوام کو ناکافی بارش کی وجہ سے خشک سالی اور دیگر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم ضرورت مندوں کو ملازمت، عوام کو پینے کے پانی اور مویشیوں کو چارے کی فراہمی کا انتظام کر کے موجودہ صورتِ حال پر قابو پا رہے ہیں جو اسی حال میں ممکن ہوا کہ لوگوں نے اپنی طرف سے اس سلسلہ میں بھرپور تعاون دیا ہے جس کے لئے میں تمام متعلقہ افراد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

امسال اگرچہ بارش کا آغاز وقت پر ہوا پھر بھی گذشتہ دو مہینوں سے وہ ناکافی اور غیر یقینی ہے جس کی وجہ سے ہمیں چند علاقوں میں مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تاہم بارش کی ڈیڑھ ماہ کی مدت اب بھی باقی ہے اس بقیہ مدت پر حالات کا انحصار ہے۔

ہمیں گذشتہ ۴۰ سالوں میں ملک میں ہوئی ترقی پر فخر ہے۔ ہمارے ملک نے اور ہماری ریاست نے پیہم جدوجہد منصوبہ بند ترقی کے ذریعہ سماجی انصاف کے حصول کے لئے بڑے پیمانے پر اقدامات کئے ہیں۔ آج ہمارا ملک سائنس، تعلیم، زراعت اور صنعت کے میدانوں میں مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم جمائے کھڑا ہے۔ قوم کی تاریخ میں ۴۰ سالہ مدت، طویل مدت نہیں ہوا کرتی۔ ماضی کی ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے۔ آیئے ہم اپنے عظیم لیڈروں کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ترقیوں کی منزلوں کی جانب پختہ ارادوں اور جرأت مندی کے ساتھ آگے بڑھتے جائیں۔

ملک نے آزادی کے بعد سے جو ترقیاں کی ہیں ان سے عوام کے دل و دماغ میں اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اب عوام مزید توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آزادی کے بعد مختلف میدانوں میں نوجوان قیادت اُبھر رہی ہے۔ ہمارے جوان وزیراعظم شری راجیو گاندھی، قومی اور عالمی محاذ پر ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کے لئے مصمم، ثابت قدم ارادوں کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں بھرپور قوت اور اولعزمی سے سوراجیہ کو صحیح معنوں میں ایک عوامی حکومت کا روپ دینا ہے تاکہ سماج کا ہر فرد آزادی کی نعمتوں سے مستفید ہو سکے۔ ہمیں ایسے دلیرانہ اقدامات کے اٹھاتے وقت راستے میں حائل ہر دشواری کا سامنا کرنا ہے۔

ہمیں اس بات کا عزم مصمم کرنا ہے کہ ہم ملک کے رہنماؤں کے ساتھ ایک ہو کر ان کی کوششوں اور جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹائیں تاکہ زمرۂ اقوام میں ہماری قوم بحیثیت نامور قوم کے جگہ حاصل کر سکے اور یہ مقام صرف قومی اتحاد، یکجہتی اور سماجی اتفاق سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔"

ایس۔ بی۔ چوان (وزیراعلیٰ)

جلد ۳۱ شمارہ ۸

یوم آزادی خصوصی نمبر

قومی راج

ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور
اردو میں پندرہ روزہ۔ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ دس روپے، قیمت فی شمارہ۔ ایک روپیہ

چیف ایڈیٹر:۔ پرمود ماسنے
ایڈیٹر:۔ فیروزہ فیاض خان
سب ایڈیٹر:۔ عبداللہ

اس شمارے میں

مراسلت کا پتہ:۔
ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن
اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر
۱۵ واں منزلہ
نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ، بمقابل منترالیہ
بمبئی ۴۰۰۰۳۲

ترسیل زر کا پتہ:۔
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن
اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر
بیرک نمبر ۱۹ مقابل سرد چی بلڈنگ
نزد منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

10-8-1987

● ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی
خالق فلیٹس، ۱۸۰ اے، پائپ روڈ،
کرلا ویسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

پنڈت نہرو کا تاریخی شعور

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک کے سورماؤں میں سیاست دانوں کے علاوہ ہمیں مہاتما، فلسفی، ادیب و مورخ بھی ملینگے مورخین کی اس صف میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، راجہ گوپال اچاریہ، پٹا بھی ستیارمیہ، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، اچاریہ نریندر دیو اور ہمایوں کبیر کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ان میں ہر مورخ اپنی جگہ پر اہم ہے لیکن جواہر لال کی بات چند دیگر ہے

جواہر لال کی ذات جامع صفات تھی۔ وہ آزادی کی جنگ کے سورما، مشترک تہذیب کے علمبردار، اعلیٰ پائے کے مصنف، پیشہ ور مؤرخ نہ ہوتے ہوئے بھی تاریخی شعور کو عام کرنے والے اور اس کے سرمائے سے محبت کرنے والے، معلم، مدبر، مفکر اور مجاہد تھے۔ یوں تو ہر مؤرخ اپنے زمانے کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کے لئے زمانے کے تصورات سے متاثر ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن اس زمرے میں جواہر لال کی اپنی انفرادیت ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

جواہر لال نہرو چوں کہ تاریخ کا ایک جامع تصور رکھتے تھے اور بہت سے پیشہ ور مورخوں سے زیادہ تاریخ کی روح سے آشنا تھے، انہوں نے تاریخِ عالم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس سے جو نتائج اخذ کئے اس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک صاف اور سیدھا راستہ کھول دیا، تاریخ میں انہوں نے جو وجدانی طاقت حاصل کی اس کو انہوں نے وطن اور دُنیا کی خدمت میں عملی طور پر برتا اور ایک متوازن مورخ کی حیثیت سے جانے گئے۔

تاریخ سے انہوں نے جو سبق سیکھا اسے اپنی تصانیف، مضامین اور تقریروں میں ظاہر کرتے رہے۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف تھی "باپ کے خطوط بیٹی کے نام" جو کہ انہوں نے اپنی بیٹی "اندرا گاندھی" کے نام لکھا تھا۔

اندرا گاندھی کو وہ اپنے زمانے کے ہندوستان کے نوجوانوں کا ایک سمبل سمجھتے تھے، ان خطوط میں وہ دُنیا کی تعمیر اور اس کی نشوونما کی داستان بیان کرتے ہیں، ان کی اس تصنیف کو سائنس کا محض ایک کتابچہ سمجھنا غلط ہوگا۔ اس میں طبقات الارض اور حیاتیات

کے خشک مسائل کی بھول بھلیاں ہی نہیں بلکہ مصنف کے ذاتی تاثرات کی بڑی دلکش جھلکیاں نظر آتی ہیں، دیو پیکر ستاروں کی گردش میں انہیں اپنی امیدیں اور خوف رقصاں نظر آتے ہیں، اور زندگی کی مسرت و رنج روی ارضی زندگی کے عظیم سمندر میں مل کر ایک ایسی ابدیت اختیار کر لیتی ہے جو وقت کی دستبرد سے محفوظ ہے۔

تاریخ کا ان کے یہاں ایک واضح تصوّر ہے۔ ان کو دُنیا کے ماضی سے اس لئے دلچسپی ہے کہ اس سے انہیں اپنے ملک کا حال دریافت کرنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ......

"تاریخ ایک مسلسل زنجیر کی طرح ہے جس میں ایک ملک کی کڑی دوسرے ملک سے ملی ہوئی ہے۔ مختلف ملکوں کے باشندوں میں اتنا فرق نہیں ہوتا جتنا ہم تصوّر کرتے ہیں۔"

(جگ بیتی، حصہ اول ص ۹)

Glimpses of World History ان کی اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ انسان کی تاریخ کو ملکوں کی تاریخ میں بانٹ کر پڑھنے کے بجائے عالمی تاریخ کی شکل میں دیکھا جائے۔ بظاہر تو یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنی بیٹی کے نام لکھے لیکن دراصل اس طرح وہ اپنے مطالعہ کو از سرِ نو تنظیم و ترتیب دینا چاہتے تھے، اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر یہ عہد آفریں جملہ بھی ملتا ہے۔

"تاریخ پڑھنا اچھا تو ہے لیکن میرے نزدیک تاریخ بنانے میں حصّہ لینا اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔"

"تاریخ عالم کی جھلکیاں" میں انسانی تہذیب کی نشو و نما کا ذکر وسیع اور جامع الفاظ میں کیا گیا ہے اس میں انہوں نے یونانیوں کی جراتِ فکر اور رومیوں کے بے پناہ ارادہ زندگی کا ذکر کیا ہے۔ عیسیٰ کے ساتھ دار پر چڑھے ہیں اور سقراط کے ساتھ زہر کا پیالہ پیا ہے۔ اسلام سے اخوت و مساوات کا پیام لے کر آگے بڑھے ہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی زندگی بخش تحریکوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کی اہمیت کو سمجھا ہے۔ بالشویک انقلاب میں روسی عوام کی نہیں بلکہ اپنے خوابوں کی تعبیر سچی ہوتی دیکھی ہے۔ ہندوستان تو ان

کا اپنا ملک تھا۔ جس کے وہ وارث تھے جس کے حال کی تعمیر اور جس کے مستقبل کی تشکیل میں انہوں نے اپنے زمانے کے ہر فرد سے زیادہ اہم حصّہ لیا۔ اس کتاب کا کینوس بہت وسیع ہے، لیکن مصنف کی شخصیت ہمہ وقت موجود نظر آتی ہے، اور ہم یہ بات کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ دنیا کا مرقع دراصل خود مصنف کا مرقع ہے۔

ان کی تیسری تصنیف "تلاشِ ہند" Discovery of India میں تاریخ عالم کی جھلکیاں، معاملاتِ انسانی کے بارے میں شدید ترین جمالیاتی احساس اور وسیع دلچسپیوں کی جھلک ملتی ہے۔ "تلاشِ ہند" کو ان کی خود نوشت سوانح عمری کے بعد دوسرا اہم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ نہرو کو احمد نگر کی تنہائی میں ہندوستان کے ماضی و حال پر زیادہ گہری اور شخصی نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ہندوستان میں تہذیبوں کی کثرت میں ایک بنیادی وحدت اور کشمکش اور تصادم کی لمبی کہانی میں جذب و انجذاب کی ایک لہر دیکھی اور دکھائی۔

بقول آل احمد سرور

"اس کتاب میں ہندوستان سے ایک رومانی عشق نہیں ملے گا۔ اس کی روح اور اس روح کے سفر کا ایک عرفان ملیگا۔ اس میں اس ہندوستان کی ایک جھلک ہے جو بدلتا رہا ہے۔ ہر اثر کو جذب کرتا رہا ہے۔ جس نے علم و عمل کی کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں مگر جو عقلیت اور سائنس کے تغافل برتنے کی وجہ سے بعض فرسودہ اداروں کو گلے سے لگائے رہنے کی وجہ سے سست اور بے جان ہو گیا تھا۔"

"تلاشِ ہند" کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں فرد اور دُنیا کا یکساں خیال ہے اور ان کو غمِ ذات کو غمِ کائنات سے ہم آہنگ کر دینے کی قدرت ہے "تلاشِ ہند" کے صفحات پر ہندوستان کی تاریخ بے روح لفظوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ وہ تاریخ ہے جو اپنے لکھنے والے کے دل و دماغ میں زندگی بن

کر سانس لے رہی ہے۔ دراصل یہ وہ ہندوستان ہے جو نہرو کے خلاقانہ ذہن میں تشکیل پا رہا تھا۔ اسی ہندوستان کی تلاش میں وہ ہر اس مقام تک پہنچے جہاں تک تحقیق کی روشنی انہیں لے جا سکتی تھی۔

"میری کہانی" تاریخ کی بازیافت کی تیسری کڑی ہے ان کی اپنی زندگی کی کہانی، قوم کی کہانی اور آزادی کے لئے کی گئی جدّوجہد سے ہم آہنگ ہے۔ اس لئے یہ صرف ان کی داستانِ حیات ہی نہیں بلکہ اس ہندوستان کی داستان ہے جو ماضی کے بوجھ کو جھٹک کر ایک بار پھر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جو ماضی کی قید سے آزاد ہونے کی جدّوجہد کرتے ہوئے بھی ماضی کی قوتوں ہی سے اپنی جدّوجہد کے لئے توانائی حاصل کر رہا تھا اور اس میں حال کی رگوں کا خون شامل کر رہا تھا۔ ان تین کتابوں کو پڑھنے والا یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تاریخ کی عام کتابیں نہیں بلکہ جدید ذہن کی دریافت کی تین منزلیں ہیں۔ تاریخ کی تحقیق نے انہیں وہ سیاسی بصیرت عطا کی جس کے بغیر ان کی نظر میں اتنی وسعت پیدا نہ ہو سکتی تھی کہ وہ قدیم و جدید، قومی اور بین الاقوامی عناصر کی آمیزش سے ایسا مسلکِ انسانیت پیش کر سکتے جو خود ان کے الفاظ میں "سائنٹیفک ہیومنزم" کہلایا جا سکتا ہے۔

نہرو کی "تاریخ عالم کی جھلکیاں" تاریخی سماجیات کی ایک کوشش ہے۔ یہ محض واقعات و حالات کی ایک دستاویز نہیں ہے۔ اشتراکیوں کی طرح سے نہرو تاریخ میں سیاسی و سماجی واقعات کا تجزیہ فی الوقت وقوع پذیر واقعات سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ نپولین کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

> "نپولین اگر کسی دوسرے وقت اور پُرامن دور میں پیدا ہوتا تو وہ ایک ممتاز جنرل کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا اور غالباً کوئی اس کے متعلق جانتا ہی نہیں لیکن انقلاب اور تبدیلی نے اسے آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا اور موقع سے اس نے فوراً فائدہ بھی اُٹھا لیا۔"
>
> (گلیمپس آف دی ورلڈ ہسٹری، ص ۳۱۳)

نہرو، تاریخ نگاری میں صرف افراد کی سوانحی حیثیت سے بحث نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور پر خارجی عناصر پر زیادہ زور دیتے ہیں اور ان خارجی عناصر میں بیش از بیش معاشی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ نہرو چارڈن (m...laquian / Chardon) اور ہکل کی طرح تاریخِ انسانی پر ماحول اور آب و ہوا کے اثرات پر زور نہیں دیتے۔

ہر چند کہ نہرو تاریخ میں خارجی عناصر پر زیادہ زور دیتے تھے لیکن وہ محض ایک مادّہ پرست نہ تھے۔ وہ تاریخ میں ہیروز کے اہم رول کا ذکر بھی کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاست میں وہ گاندھی جی کے تخلیقی رول کو مانتے تھے اور گاندھی جی کی مقناطیسی شخصیت کا ہندوستان کے سیاسی و سماجی انقلاب کے رونما ہونے میں ہر جگہ ان کا ذکر کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح سے روسی انقلاب کے بارے میں ہر چند کہ وہ ہر سماجی و معاشی اسباب کو ان کا محرک مانتے تھے جو ان کی بنیاد ہوئے لیکن اس کے ساتھ وہ ایک فرد کی تخلیقی قوت سے بھی معترف تھے جو کہ کروڑوں انسانوں کی زندگی میں تبدیلی لے آئی ہے اس کے وہ لینن (Lenin) کو انقلاب روس کا نقیب سمجھتے تھے۔

تاریخ سے انہوں نے روشنی حاصل کی، تاریخ نے انہیں ایک مثالی آدرش دیا۔ تاریخ میں انہیں ایک عالمگیر انسانیت کا ظہور نظر آیا جس کا ہیرو انسان ہے۔ تاریخ ہی نے انہیں بتلایا کہ نظامِ عالم میں ایک تسلسل، ایک یکسانیت، ایک ترتیب، ایک قانون ہے جو انسان کے ذہن میں عقل کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ دانوں کا ایک مکتبِ فکر ہے جس کا یقین ہے کہ تاریخ محض واقعات کی طولانی کہانی ہے۔ دوسرا مکتبِ فکر اس کا مخالف ہے۔ مارکس کے مطابق تاریخ دو طبقوں کی کشاکش کا نام ہے جس میں مزدور طبقہ سرمایہ دار طبقہ پر فتح حاصل کرتا ہے۔ ٹائن بی کا عقیدہ ہے کہ تہذیب کی عمارت کی بنیاد مذہب پر ہے اور انسان تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد نصرانیت کے سایہ میں دم لے گا۔ جواہر لال نے ان سب سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی جو انہیں دنیا کے کارخانہ میں دوسری جنگ سے نظر آئی ایک وہ جس کا تعلق ہماری اندرونی زندگی سے ہے جہاں ضمیر اور جذبہ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ دوسری وہ جہاں آدمی اپنے ماحول سے دست و گریباں ہے۔ اس ماحول میں انسانی دوستی اور دشمنی کے دونوں عنصر ہیں۔ تاریخ انہیں دو جنگوں کی ہار جیت کی داستان ہے۔ یہ آخر کس جگہ جا کر ختم ہوگی۔ اس کے بارے میں جواہر لال نہرو کا عقیدہ ہے کہ "اخلاق کی فتح ہی انسان کی بقا کی ضمانت ہے۔"

میوا رام گپت
انڈین ایئر لائنز کالونی،
۳-بی - ۳۰ - کالینہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۹

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مہاراشٹر کا حصّہ

مہاراشٹر کے ہی مشہور مجاہدِ جنگِ آزادی آنجہانی ویرونایک دامودر ساورکر کے لکھنے کے مطابق ہماری پہلی جنگِ آزادی اتر پردیش کی میرٹھ چھاؤنی سے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی شروع کردی گئی تھی جسے باقاعدہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہونا تھا کیونکہ اس کے لئے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ ہی طے کی گئی تھی، لیکن جنگِ آزادی کی تاریخ شاہد ہے کہ مہاراشٹر میں بے قاعدہ جنگِ آزادی بہت پہلے یعنی ۱۸۴۴ء میں شہر سورت میں شروع ہوگئی تھی۔

انگریزی سرکار نے عوام کے روزانہ استعمال کی چیز نمک پر ٹیکس بڑھا دیا تھا۔ پہلے یہ ٹیکس آٹھ آنہ فی من تھا۔ جو اب ایک روپیہ فی من کردیا گیا تھا۔ اس بڑھے ہوئے ٹیکس کے خلاف پبلک نے احتجاج کیا اور مظاہرات کئے۔ عوام کی متحدہ مانگ کے آگے سرکار کو جھکنا پڑا تھا، اور اس نے ایک روپیہ فی من سے ٹیکس بارہ آنہ فی من کر دیا تھا۔

سورت میں ہی ایک اور تحریک اوزان کے خلاف چلی تھی۔ سرکار نے مہاراشٹر میں بنگالی اوزان کو رائج کر دیا تھا۔ عوام نے اسے قبول نہیں کیا اور بنگالی اوزان کے خلاف زبردست مظاہرات کئے۔ بازار بند کر دیئے گئے۔ سرکار کو پھر ایک بار جھکنا پڑا اور اسے اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ مہاراشٹر کے عوام نے سرکار کے کسی بھی ایسے حکم کو جو اس کے مفاد کے خلاف تھا، سرنگوں ہوکر نہیں مانا تھا۔

گوپال کرشن گوکھلے

لوک مانیہ تلک

دامودر چاپیکر

سنہ ۱۸۸۱ء میں سورت اور پونے میں پیش ہوئے
انکم ٹیکس کے خلاف ایک زبردست تحریک چلی تھی۔
اس تحریک کا خاص لیڈر پونہ کا سیٹھ گوردھن داس
تھا۔ اس کا کہنا تھا وہ سرکار کو اپنا سر تو دے سکتا ہے
مگر بڑھا ہوا انکم ٹیکس نہیں دے سکتا ہے۔ سرکار کو
پھر منہ کی کھانی پڑی۔

انگریزی سرکار کو روپیہ چاہیے، اسے پبلک کی بھلائی
مقصود نہیں تھی اس لئے وہ ہمیشہ سرکاری خزانہ بھرنے
کی ہی فکر میں رہا کرتی تھی۔

۱۸۷۸ء میں سورت شہر میں ایک بار پھر بلوا ہو گیا۔
اس بار حکومت نے پبلک پر لائسنس ٹیکس لگا دیا
تھا۔ پبلک نے پھر احتجاج کیا۔ لاٹھیاں اور گولیاں چلیں
سیکڑوں لوگ زخمی ہوئے تو درجنوں شہید بھی ہو گئے۔ زخمی
ہونے والوں میں یا شہادت پانے والوں میں سبھی قوم
کے لوگ تھے۔ پبلک نے نہ اپنی تحریک ہی واپس لی اور
نہ لائسنس ٹیکس کو ہی خوشی سے قبول کیا تھا

انگریزی سرکار اپنے نوکروں کو ہندوستانی نوکروں
کے مقابلے چار گنا زیادہ تک تنخواہ دیتی تھی۔ ہندوستانی
نوکروں کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی غلاموں جیسا ہوتا
تھا۔ جو ہندوستانی نوکروں کے لئے بہت پریشان کن
تھا۔ ایک انگریز اور ایک ہندوستانی کا کام جب ایک
جیسا تھا تو ان کو تنخواہ برابر ملنی چاہیے تھی مگر انگریزی
سرکار دو طرح کا برتاؤ کرتی تھی۔ اس کی نیت ہمیشہ
دوہری رہی ہے۔ اس کی نظر میں انگریز حکومت کے لئے
اور کالے لوگ ان کی غلامی کرنے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔

گاؤں شریدھن قلابہ مہاراشٹر کے باشندہ
شری واسو دیو بلونت پھڑکے جو پونے کے اکاؤنٹ آفس
میں کام کرتے تھے انہیں انگریزوں کی دوہری نیت بہت
ناگوار گزری۔ وہ پیدائشی وطن پرست بھی تھے۔ انہوں نے
اپنی والدہ کی بیماری میں جب آفس سے چھٹی مانگی تو وہ نہ
ملی۔ اس سے بھی وہ بہت بدظن ہو گئے تھے۔ انہوں نے
سرکاری نوکری چھوڑ دی، اور پرچم بغاوت کو اپنے ہاتھ
میں اٹھا لیا۔ ۱۸۷۹ء میں انہوں نے پونے کی پہاڑیوں
اور جنگلوں میں رہنے والے راموسیوں کی ایک فوج تیار کی
جس میں ۳۰۰ سے زائد راموسی شامل ہو گئے۔ ان
باغی راموسیوں کو لے کر بلونت پھڑکے سرکاری خزانے
لوٹنے لگے اور سرکار پرستوں کے گھروں میں ڈاکے
ڈالنے لگے۔ پھڑکے کی بغاوت سے سرکار بہت پریشان
ہو گئی تھی۔ پھڑکے نے پونے کے کئی انگریزی دفتروں
کو آگ لگا دی تھی۔ پھڑکے نے قریب چار سال تک
حکام کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ آخرکار انہیں گرفتار
کر لیا گیا۔ پونے میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور انہیں
حبس دوام کی سزا ملی۔

ویر ساورکر

کرانتی ویر واسودیو بلونت پھڈکے

راجگرو

واسودیو بلونت پھڈکے جیسے خطرناک باغی کو ہندوستان کی کسی جیل میں رکھنا ٹھیک نہیں سمجھا گیا اس لئے انہیں وطن سے دور عدن کی جیل میں بند کیا گیا۔

ان کے ساتھ بہت سختی کی گئی۔ انہیں کولہو چلانے کی مشقت دی گئی۔ ان کا راشن بھی کم کر دیا گیا۔ انہیں تپ دق کی بیماری دی گئی اور وہ عدن کی جیل ہی میں دنیا سے چل بسے۔ ۱۷ فروری ۱۸۸۳ء کو انہوں نے شہادت کا جام پیا تھا، اور دائمی آرام حاصل کیا تھا۔

انہیں دنوں پونے میں "سارو جنک سبھا" سودیشی کا پرچار کر رہی تھی۔ جسٹس راناڈے بھی سودیشی اشیاء خریدنے کی کفالت کرتے تھے۔

واسودیو بلونت پھڈکے کے بعد پونے کے چافیکر بھائیوں نے آزادی کے پرچم کو اٹھا لیا۔ انہوں نے رانی وکٹوریہ کے گلے میں جوتوں کی مالا پہنا دی تھی اور مورت کو کوتار سے کالا کر دیا تھا۔ ایک سرکاری پنڈال میں آگ لگا دی تھی۔ اور بہت سے انگریزوں کو زدوکوب بھی کیا تھا اس طرح انگریزوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ انہیں انگریزیت سے سخت نفرت تھی۔

پلیگ کمشنر مسٹر رینڈ اور اس کے ایک فوجی ساتھی مسٹر ایرسٹ کو بھی انہوں نے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو اس وقت قتل کر ڈالا تھا جب وہ دونوں رانی وکٹوریہ کے ساٹھ سالہ جشن جبلی سے واپس اپنے بنگلوں کو جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے بنگلے نہ پہنچ کر سیدھے جہنم پہنچ دیا تھا۔ رینڈ پلیگ کمشنر کی حیثیت سے پبلک کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا۔ ان کی مورتیوں تک کو وہ توڑ دیتا ــــ یا جلا دیتا تھا۔ اسی سے چافیکر برادران اس سے سخت ناخوش تھے۔ یہ تین حقیقی بھائی تھے۔

(۱) :- دامودر ہری چافیکر
(۲) :- بال کرشن ہری چافیکر
(۳) :- واسودیو ہری چافیکر

ان کے کام میں پونے کا ہی ایک نوجوان مہادیو راناڈے بھی شامل تھا۔ رینڈ کے قتل کے بعد مخبروں کی مدد سے چاروں نوجوان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور چاروں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ ۱۸۹۹ء میں ان چار شادی شدہ نوجوانوں کو پونے کی ایروڈا جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

ان پھانسیوں کے بعد بھی بغاوت کی آگ ٹھنڈی نہ ہونے والی تھی۔

پونے کے مشہور سیاسی رہنما بال گنگا دھر تلک نے اپنے اخبار کیسری کے ذریعہ اور تمام ملک کا دورہ کر کے سیاسی حقوق پانے کے لئے پبلک کو بیدار کیا اور یہ نعرہ دیا کہ

"آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ہم اپنے حق کو لے کر رہیں گے"

مشہور انقلابی خودی رام بوس کی حمایت میں جنہوں نے اپنے ایک ساتھی پرپھل چاکی کے ساتھ مظفرپور میں انگریز مجسٹریٹ کنگس فورڈ پر بم چھوڑا تھا جس سے دو عورتیں قتل ہو گئی تھیں۔

تلک نے اپنے اخبار کیسری میں مضمون لکھے تو اُن پر بھری عدالت نے مقدمہ چلا اور انہیں چھ سال کے لئے برما کی مانڈلے جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ وہاں سے اپنی پوری سزا کاٹ کر ۱۹۱۴ء میں باہر آئے اور پھر آزادی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ "ہوم رول" ان کا نعرہ تھا۔ بدقسمتی سے وہ سن ۱۹۲۰ء میں ہی رحلت فرما گئے۔

تلک جی کے زمانے میں بھی بمبئی کے ویر دنائیک دامودر ساورکر نے آزادی کے پرچم کو بلند کیا تھا۔

ساورکر جی نے ملک کے مختلف حصوں میں ابھینو بھارت سبھا نام کے انقلابی ادارے قائم کئے تھے۔ ان کے اس کام میں ان کے دو بھائی گنیش ساورکر اور نرائن ساورکر بھی مدد کرتے تھے۔

دنائیک دامودر ساورکر نے سن ۱۹۰۶ء میں ایک ایسا ہی انقلابی ادارہ لندن میں جا کر کھولا تھا، اور لندن میں رہ کر وہ برابر ملکی آزادی کا کام کرتے رہے۔ وہاں وہ انڈیا ہاؤس میں پنڈت شیام کرشن ان کے ساتھ رہتے تھے۔ جو ایک مشہور انقلابی لیڈر تھے۔ یہاں رہ کر ساورکر نے پنجاب کے نوجوان مدن لال دھینگرا کے ذریعہ انگریز افسر ولیم کرنل وائلی کو یکم جولائی سن ۱۹۰۹ء کو قتل کروا دیا تھا۔ مدن لال پکڑے گئے۔ ان کو پھانسی کی سزا ہوئی اور مدن لال کو ۱۷ اگست سن ۱۹۰۹ء کو لندن کی ایک جیل میں پھانسی پر لٹکا یا گیا تھا۔

ساورکر کے بڑے بھائی گنیش ساورکر کو صرف اس

بنا پر گرفتار کیا گیا تھا کہ ان کے پاس سے تلاشی میں انقلابی نظمیں ملی تھیں اور حبس دوام کی سزا ناسک کے مجسٹریٹ جیکسن نے دی تھی۔ اسی جیکسن کو ناسک کے لچھمن ہری کنہرے نے اور ان کے ساتھیوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو قتل کر ڈالا تھا۔ کیونکہ وہ انقلابی نوجوانوں کو بہت سخت سزائیں دیا کرتا تھا۔ قاتل انقلابی نوجوان گرفتار ہو گئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور تینوں کو سزائیں ہوئیں۔
لچھمن ہری کنہرے، دیش پانڈے اور کرشن کروے کو ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو ان تینوں انقلابی نوجوانوں کو پھانسی دے دی گئی۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں مہاراشٹر میں مہاتما گاندھی کی آمد ہوئی۔ انہوں نے تمام ملک میں گھوم گھوم کر آزادی کا پرچار کرتے ہوئے پبلک کو بیدار کیا۔ گاندھی جی نے سنہ ۱۹۴۲ء تک کئی ستیہ گرہ کی لڑائیاں لڑی تھیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۴۲ء میں مہاراشٹر نے گاندھی جی کی تمام تحریکوں میں کھل کر ساتھ دیا اور بھرپور قربانی دی۔ مہاراشٹر سیکڑوں لوگوں نے لاٹھیاں اور گولیاں کھائی تھیں، اور درجنوں پھانسی پر جھول گئے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ کیا تھا۔ مہاراشٹر کے شہر شولاپور میں پبلک نے گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر سن کر غدر کر ڈالا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے نمک ستیہ گرہ کے ساتھ جنگل ستیہ گرہ بھی کیا تھا۔ یہاں کی جوشیلی پبلک نے سرکار پرست کئی آدمیوں کو زندہ جلا ڈالا تھا اور ایک انسپکٹر کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ اس سلسلہ میں درجنوں لوگ گرفتار ہوئے تھے۔ شری ملیا دھن سیٹھی، شری کرشن شندے، قربان علی اور ان کے صاحب زادے عبدالرسول کو ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو یرودا کی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ پونے کے رہنے والے گینو بابو پکیٹنگ کرتے ہوئے بدیشی کپڑوں کی ٹرک سے کچل کر ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کو شہید ہو گئے تھے۔ پونے کے ہی ایک اور انقلابی وشنو گنیش پنگلے کو بغاوت کے جرم میں ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۱۵ء کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

سنہ ۱۹۴۲ء کی کانگریس کی آخری تحریک آزادی بمبئی کے گوالیا ٹینک کے میدان میں ۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو شروع کی گئی تھی۔ جب مہاتما گاندھی نے انگریزوں کو بھارت چھوڑ کر چلے جانے کا یعنی "Quit

India" کا انقلابی نعرہ دیا تھا۔ پبلک کو "کرو یا مرو" کا نعرہ بھی دیا تھا۔
۹ اگست کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی تمام سیاسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا تو بمبئی کا ماحول ہی بدل گیا۔ پبلک جوش میں آ گئی اور ہوش کھو بیٹھی یوں تو جہاں بھی گاندھی جی کا نعرہ "کرو یا مرو" کا نعرہ پہنچا وہیں کی پبلک کچھ کرنے اور مرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔
"کرو یا مرو" کے نعرے کے مطابق مہاراشٹر نے جو کام کیا اور جتنی قربانی دی وہ بے مثال ہے۔ مہاراشٹر کے ہر ضلع میں ہی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا۔ لوگوں نے خوب توڑ پھوڑ کی اور دوسری عالمی جنگ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔
ناگپور، سولاپور، ستارا، وردھا، پونے، ناشک، بھنڈارہ، امراوتی، قلابہ، سانگلی، کولہاپور، تھانہ، دھولے، اور ایوت محل وغیرہ میں توڑ پھوڑ کے کاموں نے کمال دکھایا۔ ریلوں کی پٹریاں اکھاڑی گئیں۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے۔ ڈاکخانوں

کو جلایا گیا۔ تھانوں پر قبضہ کیا گیا اور اس پر ترنگا جھنڈا لہرایا گیا۔ سیکڑوں جگہ لاٹھیاں اور گولیاں چلیں۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ بہتوں نے شہادت پائی۔

مہاراشٹر نے ملک کی آزادی کے لئے جو خون بہایا وہ کسی ایک قوم کا خون نہیں تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی آزادی میں برابر کا حصّہ لیا تھا۔

"آخری جنگِ آزادی" بمبئی میں مقیم آبی جہازوں کے نو سینکوں نے فروری ۱۹۴۶ء میں لڑی تھی اور اس جنگ میں بھی سیکڑوں افراد پولس کی گولیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ اس بغاوت میں کوئی ۳۰۰ ہندو اور مسلمان شہید ہوئے تھے۔ سردار پٹیل کی مدد سے جہازوں کی بغاوت ختم کرادی گئی تھی۔ لیکن انگریزوں کو اب یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ ہندوستان سے ہمیشہ کیلئے چلے جانے میں ہی ان کی بھلائی ہے۔ "فوجی بغاوت" ہی انگریزوں کے لئے آخری ٹھوکر تھی۔

صد سالہ جد و جہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد ہمیں آزادی نصیب ہوئی ہے اور یہ آزادی ملک کی سبھی قوموں کی مدد سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان سبھی پر اس کی حفاظت کا فرض بھی لاحق ہوتا ہے۔

مہاراشٹر بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ

چپّہ چپّہ پر ہیں یہاں جوہر پکتا ہے خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

۱۷

اگر ہم ایک ہو جائیں

حسرت جے پوری
۱۴۱ کیلاش بلڈنگ
ایس وی روڈ، کھار
بمبئی ۴۰۰۰۵۲

رخِ گلشن نکھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں
وطن پھر تو سنور جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

امن ہو شانتی ہو ہر طرف خوشیوں کے موسم ہوں
گلوں میں رنگ بھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ہواؤں میں ترنم ہو فضاؤں میں تبسم ہو
یہ ڈوبا دل ابھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

یہ دھرتی اپنی ماتا ہے کہ ہم تو لعل ہیں اس کے
رخِ دشمن اتر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

بجیں شہنائیاں لاکھوں محبت کے گلستاں میں
مقدر ہی سنور جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

غلط ہیں دین کے جھگڑے کہ ہم تو بھائی بھائی ہیں
زمانہ پھر تو ڈر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

جو نفرت کا سمندر ہے اسے خوب مات ہر لو گو
سمندر خود اتر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ہلا دیں ہم زمانے کو جھکا دیں ہم زمانے کو
مخالف خود ہی مر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

محبت میں جدا رہنا کہاں کی دوستی ٹھہری
ہر ایک جلوہ بکھر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ملن کی چاند راتیں ہوں محبت کی براتیں ہوں
جہاں تک بھی نظر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

ہمارے پیار کی کشتی لگے ساحل پہ اے حسرت
محبت کام کر جائے اگر ہم ایک ہو جائیں

★ سری نواس لاہوٹی
اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد ۲۹

ڈاکٹر راجندر پرشاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا تعلق ہمارے ملک کے ان قائدین کی نسل سے ہے جو اب ناپید ہو چکی ہے اور اب وہ لوگ بھی آہستہ آہستہ ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہوں نے گاندھی جی کے بعد راجندر پرشاد اور اسی قبیل کے دوسرے قائدین کے ساتھ کام کیا تھا اور ان کے شانہ بہ شانہ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا تعلق اس نسل سے بھی تھا جو گاندھی جی کے حلقۂ اثر میں آجانے کے بعد عیش و عشرت کی زندگی کو خیرباد کہہ کر سادگی پسندی کو اپنا شعار بنا یا تھا۔ وہ اس قدر سادہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے کہ جب ۱۹۳۴ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا تو وہ شاہی مہمان تھے۔ گاندھی جی کے لئے تو ان کی مقررہ غذا فراہم کر دی گئی، لیکن راجندر پرشاد یا راجن بابو اور ان کے ساتھیوں کے لئے شاہی آداب کے مطابق چاندی کے برتنوں میں پورے لوازمات کے ساتھ چکنائی سے بھرپور کھانا پروسا گیا۔ جب گاندھی جی کو کسی طرح سے اطلاع ملی کہ راجن بابو اور ان کے دیگر ساتھیوں کو ایسی غذا فراہم کی جا رہی ہے جو ان کے لئے ناقابلِ ہضم ہے تو انہوں نے ایوانِ شاہی میں کہلا بھیجا، کہ میرے ساتھیوں کو بھی وہی غذا فراہم کی جائے جو ان کے لئے پہنچتی ہے۔ اس سے ان کی سادہ زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پیدائش ۳ دسمبر ۱۸۸۴ء کو بہار کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ اس گاؤں کو ان کے دادا نے یو۔پی سے آکر خرید لیا تھا اور یہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ کائستھ خاندانوں میں تعلیم عام ہونے کی وجہ سے راج دربار میں بھی ان کو بڑا مقام ملنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راجن بابو کے دادا منشی چودھر لال تقریباً چوتھائی صدی تک ریاست ہتھورا کے دیوان بھی رہے اور بڑا نام کمایا۔

راجن بابو کے والد منشی مہادیو سہائے بڑے ملنسار اور پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ حالانکہ انہوں نے حکمت کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن تجربے کی بناء پر انہوں نے اس پیشے میں بڑا نام کمایا۔ وہ غریبوں کا مفت علاج کرتے تھے اور صاحبِ ثروت افراد سے فیس اور دوا کے پیسے لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے گاؤں میں اتنے بااثر تھے کہ گاؤں کے مقدمات عدالت میں جانے کی بجائے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے اور ان کا وہ جو تصفیہ کرتے فریقین کے لئے قابلِ قبول ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راجن بابو کو بھی اپنے گھر کا یہ ماحول دیکھ کر وکیل بننے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ اپنی زندگی میں اتنے بڑے وکیل بنے کہ لندن کی پریوی کونسل تک انہوں نے ایک مقدمے کی پیروی کی۔

راجن بابو اپنے والد کی پانچویں اور آخری اولاد تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق ہوئی چنانچہ وہ اپنی خودنوشتہ سوانح حیات میں اس تعلق سے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ......

"اس زمانے کے مروجہ رسم کے مطابق بسم اللہ مولوی صاحب نے کرائی تھی۔ جس دن تعلیم شروع ہوئی،

حرف شناسی کی ابتدا بسم اللہ سے ہوئی ۔ شیرینی بانٹی گئی اور مولوی صاحب کو روپے بھی دیئے گئے۔"

یہ ان کی تعلیم کی ابتدا تھی اور انتہا اس وقت ہوئی، جب وہ کلکتہ ہائی کورٹ میں ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد وکالت کے دوران ایم۔ایل کا امتحان پاس کیا۔ یہ پہلے بہاری تھے جنہوں نے یہ امتحان کامیاب کیا تھا۔

راجن بابو ابتدا ہی سے بڑے شرمیلے اور جھینپو قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ وہ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ...

"میں بچپن میں بڑا دبو رہا ہوں، اور کسی بڑے معاملے میں فوری فیصلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔"

لیکن زندگی میں ایک منزل ایسی بھی آئی کہ جب گوپال کرشن گوکھلے نے انہیں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی، (Servant of India Society) میں شرکت کی دعوت دی تو وہ فوراً تیار ہو گئے۔ یہ ان کی عوامی زندگی کی ابتدا تھی، اور وہ اس سوسائٹی کے رکن اس لئے بھی بنے کہ ملک کی کچھ خدمت کرسکیں۔ وکالت کے ساتھ ساتھ انہوں نے پیشۂ تدریس کو بھی اپنایا تھا۔ کلکتہ اور بہار کے ایک کالج میں وہ لیکچرر کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگے تھے لیکن جب گاندھی جی نے بائیکاٹ کا آندولن شروع کیا تو انہوں نے نہ صرف وکالت ترک کردی بلکہ پیشۂ تدریس سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی اور اس کے بعد عوامی خدمت ہی کو انہوں نے بقیہ زندگی میں اپنا شعار بنالیا۔ گاندھی جی نے جب جنوبی افریقہ سے لوٹ کر ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا تو اس وقت پہلی جنگ عظیم ہو چکی تھی اور انگریزوں نے وعدہ خلافی کرکے ہندوستان میں اصلاحات کے نفاذ کے بجائے رولٹ ایکٹ نافذ کردیا۔ جس کی وجہ سے پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا، اور سیاسی شورش بپا ہوگئی۔ سامراجیوں نے ہندوستانی قوم پر اتنے ظلم ڈھائے کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ لیکن گاندھی جی کی قیادت نے اس کو انقلابی صورت اختیار کرنے نہیں دیا اور عدم تشدد پر کاربند رہنے کی ملک والوں کو تلقین کی۔ اس تلقین کا راجن بابو پر اتنا اثر پڑا کہ وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ...

"گاندھی جی نے نامناسب برتاؤ کو ہمیشہ غلط بتایا کیونکہ اس سے ایک تو سچی کامیابی نہیں ہوسکتی اور اگر کامیابی جیسی قسم کی کوئی چیز نظر بھی آئی تو وہ اس مقصد کی کامیابی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہمارے غلط عمل کی وجہ سے وہ مقصد ہی بدل جاتا ہے۔ جس کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے سچ اور اہنسا کی پابندی ہر حالت میں اور ہر موقع کے لئے ضروری اور لازمی بتائی۔"

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک میں جو سیاسی تحریکیں چلیں ان سب میں راجن بابو نے عملی طور پر حصہ لیا۔ اور قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں۔ یہ تین بار یعنی ۱۹۳۴ء، ۱۹۴۷ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ یہ وہ ادوار ہیں جب ہمارے ملک میں سیاسی طور پر بڑی تحریکیں چل رہی تھیں اور ان سب میں راجن بابو نے حصہ لیا اور کامیابی سے ہمکنار رہے۔

۲ رستمبر ۱۹۴۶ء کو ہندوستان میں ایک عارضی قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں مسلم لیگ نے پہلے تو شرکت نہیں کی۔ اس لئے کانگریس نے یہ حکومت بنائی، لیکن بعد میں لیگ کو بھی اس عارضی حکومت میں شریک ہونا پڑا۔ اس عارضی حکومت میں راجن بابو ملک کے وزیر زراعت و اغذیہ بنائے گئے۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جب دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو راجن بابو اس کے صدر بنائے گئے اور ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو دستور کی منظوری کے بعد ہمارا ملک جمہوری ہندوستان میں تبدیل ہوا تو یہ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہونے پر مسز سروجنی نائیڈو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :

"مجھ سے کچھ لوگوں نے خواہش کی کہ اس موقع پر میں کوئی رزمیہ نظم لکھوں تاکہ راجن بابو کی خدمت میں اسے پیش کیا جاسکے تو میں نے اپنے دل سے کہا کہ اگر میرا قلم سونے کا بھی ہوا اور میں اسے شہد بھری دوات میں ڈبو کر بھی نظم لکھنا چاہوں تب بھی میں ان خوبیوں کو اجاگر نہیں کرسکتی جو راجن بابو کا وصف رہی ہیں۔"

اس موقع پر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے جو تقریر کی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب بن چکی ہے۔

۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو راجن بابو جمہوریہ ہند کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور پورے بارہ سال تک انہوں نے بہ حیثیت صدر جمہوریہ ملک کی جو خدمت کی اور اس کے نام کو ساری دنیا میں جس طرح سے روشن کیا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ناقابل بیان ہے۔ ۱۹۶۲ء میں صدارت کے عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد پٹنہ کے صداقت آشرم میں سکونت اختیار کی، اور ۲۸ رفروری ۱۹۶۳ء کو انہوں نے آخری سانس لی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے۔

راجن بابو صرف سیاست داں ہی نہیں بلکہ ان میں
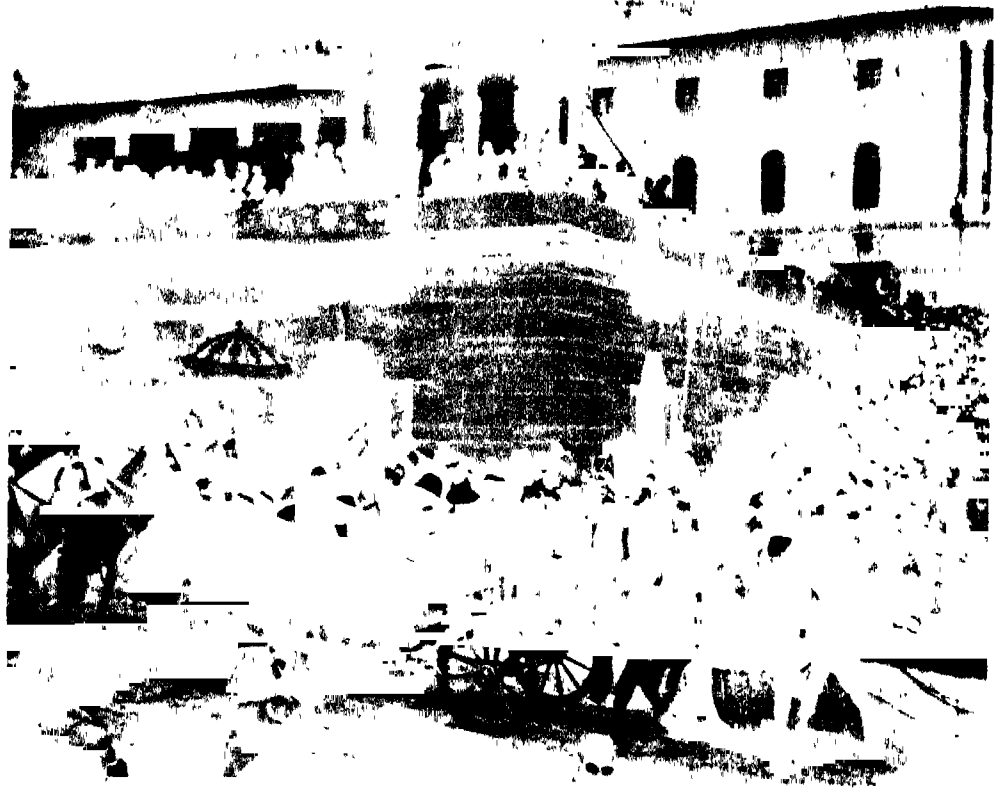
ڈاکٹر راجندر پرشاد، اولین صدر جمہوریہ ہند، بگھی کی شکل میں لے جائے جا رہے ہیں

بحیثیت ادیب وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک ادیب میں ہونی چاہیئے۔ ابتدا ہی سے ان کو ادب اور شاعری سے دلچسپی رہی تھی اور جن لوگوں نے ان کی خود نوشتہ سوانح عمری پڑھی ہے جو ہندی میں لکھی گئی تھی۔ وہ ان کے ادبی ذوق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مسٹر سردار پٹیل نے اس سوانح حیات کے بارے میں لکھا تھا کہ......

" اس کے ہر صفحہ پر راجن بابو کی زندگی کی علامتوں کے نقوش ملتے ہیں یہ ہماری سیاسی زندگی کے تیس سال کی ایک طرح سے مستند تاریخ ہے اور سیاست کا کوئی طالب علم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

آخر میں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ: راجن بابو کی صدارت کے زمانے میں جواہر لال نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک بھڑکنے والا شعلہ تھا تو دوسرا دھیمی آنچ تھی لیکن ان دونوں نے مل کر جس خوبی کے ساتھ ملک کی باگ ڈور سنبھال اور دنیا میں ہندوستان کے نام کو روشن کیا وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

★ عبدالوحید خان جامعی

لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک

۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو ہندوستان کو جنگِ آزادی کا "مسیحی نعرہ" "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے" دینے والا لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کی ۱۳۱ ویں سالگرہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں تلک کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ مہاتما گاندھی کی۔ یہ کہنا قطعی غلط نہیں ہوگا کہ جنگِ آزادی کا ملک میں جو ماحول تلک نے تیار کیا تھا۔ اسے گاندھی جی نے سنوارا اور پورا کیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ گاندھی جی نے اپنا راستہ تھوڑا بدلا ہو۔ لیکن جس بنیاد پر وہ کھڑے ہوئے، اسے تیار کرنے میں تلک کا رول بڑا اہم تھا۔ مہاراشٹر کی دھرتی نے اور خاص کر مہاراشٹر کی رتناگیری کی دھرتی نے ان سپوتوں کو پیدا کیا جنہوں نے صرف اپنے صوبے کی رہنمائی ہی نہیں کی بلکہ پورے ملک پر چھاپ چھوڑی ہے۔ رتناگیری کا علاقہ خوبصورت تو ہے لیکن خوشحال علاقہ نہیں مانا جاتا۔ اس وجہ سے یہاں کے لوگ دوسرے علاقوں میں روزی روٹی کے لئے جاتے رہے ہیں۔ یہاں کے لوگ جس قسم کے علاقے میں گئے انہوں نے اپنی شخصیت کے ذریعے اپنا مقام بنالیا۔ گوکھلے، تلک، کروے وغیرہ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کو نئی سیاست کا فلسفہ دیا۔
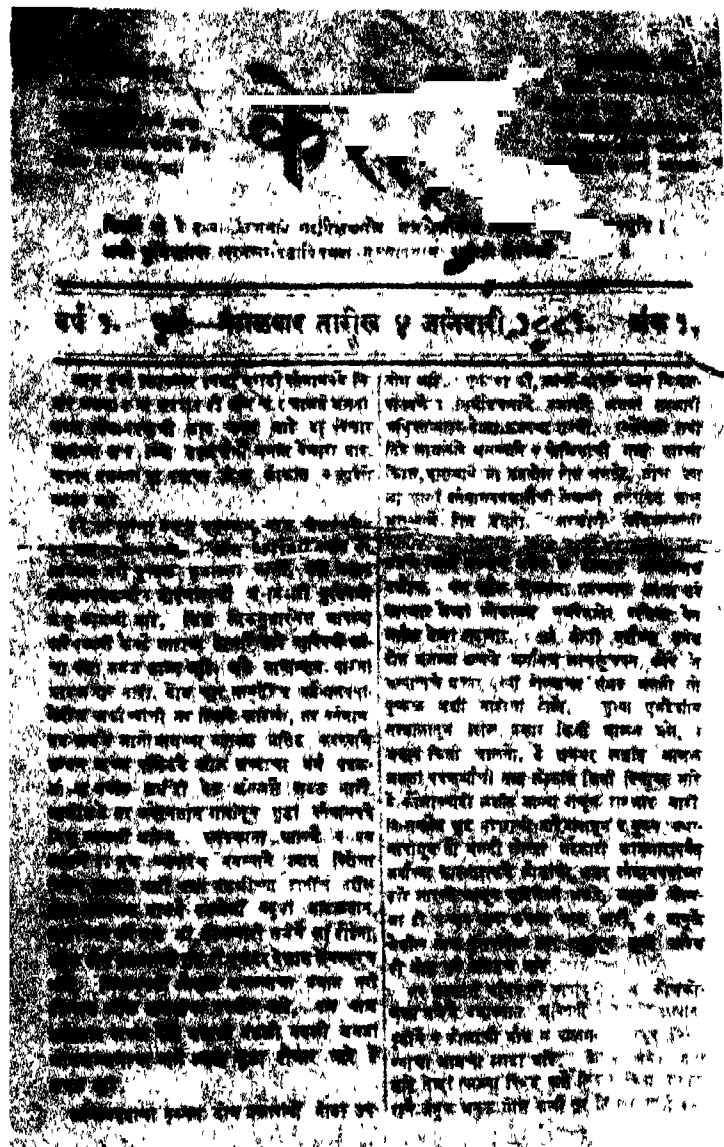
تلک کا جنم ۲۳ جولائی ۱۸۵۶ء میں رتناگیری میں ہوا۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ کے ایک سال پہلے ان کے والد گنگا دھر رام چندر تلک، جو گنگا دھر شاستری کے نام سے مشہور تھے۔ مدرس تھے اور آگے چل کر اسسٹنٹ ڈپٹی ایجوکیشن انسپکٹر بنے۔ گنگا دھر شاستری سنسکرت زبان کے پنڈت تھے، اور اپنے بیٹے میں انہوں نے اچھی تہذیب ڈالی تھی۔ لیکن ماں باپ کا سایہ تلک کو بہت دن تک نصیب نہیں ہوا۔ ان کی ماں، جب وہ چھ سال کے تھے گزر گئیں اور والد کا انتقال جب ہوا وہ ۱۶ سال کے تھے۔ اس طرح تلک جو کچھ ہوئے اپنے بل بوتے پر ہی ہوئے۔

۱۸۷۹ میں تلک نے بمبئی یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جس وقت وہ بی اے ہوئے اس کے ۶ برس بعد انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی لیکن ملک کے مختلف علاقوں میں کئی شخصیتیں اسکولوں اور انجمنوں کے ذریعے ملک کے عوام میں نئی ذہنی تبدیلی کی کوشش کر رہی تھیں کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے، ہندو کالج اور برہمن سماج کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ بنگال میں سریندر ناتھ بنرجی، برٹش انڈیا ایسوسی ایشن بمبئی میں دادا بھائی نوروجی بمبئی ایسوسی ایشن کھول چکے تھے۔ مدراس میں ہندو اخبار کا نکلنا شروع ہو چکا تھا۔ بنگال کے برہمن سماج کی طرح بمبئی میں پرارتھنا سماج نام کی سنستھا کھولی جا چکی تھی۔ اسطرح تلک جب زندگی کے میدان میں اترے تو ملک میں چیتنا کا اور سماج سدھار کا ماحول بن چکا تھا۔

حالانکہ تلک نے وکالت پڑھی تھی اور چاہتے تو خوب پیسے کما سکتے تھے لیکن انہیں تو ملک کی تاریخ بدلنی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنا راستہ الگ چنا۔ تعلیم کے تاریخی رول کو تلک اچھی طرح جانتے تھے اسی لئے انہوں نے اپنے کچھ ساتھیوں جیسے نامجوشی چپلون کے ساتھ اسکول کھولنے کا ارادہ بنایا۔ جس میں سے وہ نئی پیڑھی کو اچھی تعلیم دے سکیں۔ چار سال کے اندر ان کے اسکول میں طالب علموں کی تعداد ۱۰۰۰ ہو گئی۔ اس اسکول کے ساتھ تلک نے ملک کی جو خدمت شروع کی وہ چالیس برس تک لگاتار چلتی رہی۔ اسکول کھولنے کے بعد تلک نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انگریزی میں "مراٹھا" اور مراٹھی میں "کیسری" نام سے ہفتہ وار اخبار شروع کئے

ان لوگوں نے اخباروں کے ذریعے ملک کی سوئی ہوئی ذہنیت کو جگانے کا جو کام کیا ہے اسے ملک کبھی نہیں بھلا سکتا۔

یہ اخبار صرف خبریں چھاپنے والے اخبار نہیں تھے، ملک کے عوام کو جگانے والے اخبار تھے۔ یہ ان کے حق دلوانے کے چوکیدار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ اخبار پوری عوام میں چاؤ سے پڑھے جاتے تھے۔ ان سے سبق لیا جاتا تھا۔ تلک نے اپنے ان اخباروں کو زیادتیوں سے لڑنے کے لئے استعمال کیا پھر چاہے وہ سیاسی ہوتا یا سماجی۔ اس کا خمیازہ بھی انہوں نے ہی بھگتا۔ اس کے لئے انہیں جیل بھی جانا پڑا۔ ملک بدر بھی ہونا پڑا۔ لیکن تلک نے اپنے قلم سے لکھنا کبھی بھی کم نہیں ہونے دیا۔

تلک ہر آدرش وادی تھے، اور اپنے آدرشوں کے مطابق انہوں نے پوری زندگی گذار دی۔

تلک ہندوستان کے عوام کی نبض اچھی طرح پہچانتے تھے۔ تلک کے دہی ایک لیڈر تھے۔ جنہیں انگریزوں کی ذہنیت کا ٹھیک ٹھیک پتہ تھا، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے عوام میں جاگرن پیدا کرنے میں دھارمک اُتسوؤں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا۔ مہاراشٹر میں ہر سال "گنیش اُتسو" اور "شیوجینتی" منانے کی شروعات تلک نے کی تھی۔ تلک نے اس جلسے کو سماجی روپ دیا۔ اس جلسے کے دوران وہ ناٹک، ڈبیٹ اور بحث و مباحثہ منعقد کرنے کی شروعات انہوں نے کی اور اس کے ذریعے آزادی کی لڑائی کا منتر لوگوں میں پھونکنا شروع کیا۔

گاندھی جی جس طرح صرف سیاسی شخصیت نہیں تھے جو اسٹیج پر بڑی بڑی تقریریں کر کے ہٹ جاتی ہیں۔ سماج کی ہر تکلیف میں وہ برابر کے شریک رہتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں مہاراشٹر میں جان لیوا پلیگ پھیلا تھا۔ برطانوی حکومت پلیگ کو روکنے کا جو کام کر رہی تھی وہ بڑا تکلیف دہ تھا۔

تلک نے اس زیادتی کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ اسی وقت پلیگ کی روک تھام کرنے والوں کے افسر "رینڈ" کو چاپیکر بھائیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس معاملے میں تلک کو بھی گرفتار کیا گیا اور ان پر برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا جرم لگایا گیا جس میں انہیں ۱۸ مہینے کی سزا ہوئی۔ کسی سیاسی لیڈر کو پکڑے جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس سزا نے ملک کی تاریخ کو نیا موڑ دیا کیونکہ اس سے ملک کی سیاست کو کرسیوں، سنہری پگڑیوں کے بیچ سے کھینچ کر جیل کی بیرکوں میں لے گئے۔ جب عدالت نے سزا قبول کرنے کو کہا تو تلک نے کہا:

"زندگی میں ایسا بھی وقت آتا ہے جب انسان پر اس کا اپنا حق نہیں رہتا۔ ہے اپنے ساتھیوں کے نمائندے کے روپ میں عمل کرنا پڑتا ہے۔"

تلک کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں بہت سے ایسے مواقع آئے جہاں انہوں نے اپنے قریب کے ساتھیوں تک کو نہیں بخشا۔

تلک کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کانگریس کچھ زیادہ مضبوطی دکھائے۔ صرف برطانوی حکومت کو پٹیشن بھیجنے والی جماعت بن کر نہ رہ جائے۔

اس لئے ۱۸۹۹ء کی کانگریس میں انہوں نے "سینڈرسٹ" کو برا گردانا۔ اس کی وجہ سے کانگریس میں کھلبلی مچ گئی۔ کانگریس کی شکل بدلنے میں تلک کا رول بہت اہم رہا ہے۔ انہوں نے کانگریس کو جاندار بنانے کی پوری کوشش کی۔

تلک ان راج نیتاؤں میں سے رہے ہیں جن کو انگریز حکومت نے سب سے زیادہ پریشان کیا۔ کئی قسم کے مقدمے ان پر چلائے۔ جیل میں انہیں تکلیف دہ طریقے سے رکھا گیا۔ مگر تلک جھکے نہیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب انہیں ۶ سال کی بڑی سزا ہوئی تو پورے ملک نے اس کا احتجاج کیا۔ کئی کارخانوں میں مزدوروں نے کام بند کر دیا، اور اس احتجاج میں شامل ہوئے۔ اس سزا نے تلک کو پورے ملک کے دلوں و دماغ میں بٹھا دیا۔ اپنی سزا قبول کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ .....

"میں بے گناہ ہوں۔ اس دنیا کے اوپر بھی کوئی ایک طاقت ہے جس کے اشارے پر ہماری تجارت چلتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی یہ مرضی ہو۔ جس کام کو میں نے تھوڑا اٹھایا ہے وہ میرے آزاد رہنے کی بجائے میری تکلیف سہنے میں زیادہ پھلے گا پھولے گا۔"

تلک سیاسی لیڈر ہی نہیں تھے۔ وہ ہندوستانی فلسفے کے اونچی چوٹی کے عالم فاضل تھے۔ ان کی کتاب "گیتا رہسیہ" اور "اوکنیک ہوم آف آداباز"، بڑی اہمیت والی کتابیں ہیں جو ہندوستانی فلسفے کی تاریخ میں بڑی اہم گنی جاتی ہیں۔

تلک ہندوستان کو آزاد ہوتے ہوئے تو نہیں دیکھ پائے لیکن ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں ان کے رول کو پیڑھیوں تک یاد رکھا جائے گا۔

کبھی کبھی تلک کو کچھ پرانے خیالوں کا کہتے ہیں۔ تلک کا کہنا تھا ....

"سیاسی آزادی کے بعد ہی باقی سدھار کی بات کی جا سکتی ہے"۔ اس کے لئے سبھی کا ساتھ چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے تلک سماج سدھار میں بھی اتنی اچھی رہنمائی کرتے۔ اگر ہندوستان ان کی زندگی میں آزاد ہوا ہوتا۔

• ریاض احمد خاں

ہمارے رہنما.....لالہ لاجپت رائے

جنگِ آزادی کے مجاہدین کا جب بھی تذکرہ ہوگا اس میں لال۔ بال اور پال کا مثلث اپنی ایک انفرادی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ یہ مثلث لوکمانیہ بال گنگادھر تلک دیش سیوک بپن چندر پال اور پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے کی تحریکوں، تقریروں اور قربانیوں سے وجود میں آیا۔ جنگ آزادی کے ان مجاہدین نے بھارت کو بدیسی راج سے نجات دلانے کے لئے اپنا چین، سُکھ، آرام سب ہی کچھ تج دیا، اور بدیسی حکمرانوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اپنی ولولہ خیز تقاریر سے ہندوستانیوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان میں بیداری پیدا کی۔ یہی نہیں بلکہ وطن عزیز کو غلامی کو ختم کرنے کی جرأت دلائی۔ انہیں کیا کیا صعوبتیں نہ اٹھانا پڑیں ؟ مگر ان جانبازوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طریقۂ کار کو اپنایا۔

مجاہدین آزادی میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں ہمارے رہنما پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے جن کے بارے میں مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ لالہ لاجپت رائے جیسے انسان کبھی نہیں مرتے بلکہ جب تک ہندوستان میں سورج طلوع ہوتا رہے گا لالہ لاجپت رائے کی یاد اسی طرح ضوفشاں رہے گی.... لالہ جی اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ وطن کی خدمت

- لالہ لاجپت رائے

ان کا نصب العین تھا۔ لالہ جی بے شمار کاموں میں اپنے
آپ مصروف رکھتے اور سماجی و مذہبی کاموں کو فوقیت
دیتے۔ ان سماجی اور مذہبی کاموں کی انجام دہی نے انہیں
سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کی ترغیب دی، اور
یہی وجہ ہے کہ اس وقت سماجی جلسہ ہو یا مذہبی یا سیاسی
جب تک لالہ لاجپت رائے اس میں شامل نہیں ہوتے اس
کی اہمیت نہیں بڑھتی اسی وجہ سے لالہ لاجپت رائے
اس قسم کے ہر جلسے میں شریک ہوتے رہے۔ جہاں کہیں
بھی انہیں غربت کی گھٹائیں نظر آتیں وہ اپنی تمام تر توجہ
اس سمت مبذول کرتے اور اس وقت تک چین سے نہیں
بیٹھتے جب تک کہ اس گھٹا کو دور نہ کر دیتے اسی وجہ سے
بچھڑے ہوئے طبقات کے لوگ عام طور سے لالہ جی کے
اخلاق سے متاثر ہوکر ان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ لالہ لاجپت رائے
سیاسی معرکہ آرائی میں بھی پیش پیش رہے۔ آپ اپنے
خیالات کا اظہار بے خوفی سے کرنے میں کبھی گریز نہیں کرتے
اور یہی وجہ تھی کہ اپنی اس بے باکی کی انہیں کڑی سے کڑی سزا
بھگتنا پڑی۔ ان کی صاف گوئی اکثر ان کے احباب کے لئے
باعث تشویش رہی مگر انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔
اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے لالہ لاجپت رائے کے
بارے میں کہا تھا کہ لالہ جی ملک کے جیالے سپوت اور وطن
پرست انسان ہیں۔

اگست ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی نے تحریک
"عدم تعاون" شروع کی اس تحریک
نے ملک گیر ہلچل پیدا کر دی اور برٹش راج کی بنیادیں ہلا دیں
اسی تحریک نے لالہ لاجپت رائے کو یہ محسوس کرنے
پر مجبور کر دیا کہ آزادی وطن حاصل کرنے کا مرحلہ ایک دشوار گذار
مرحلہ ہے جس کے لئے وقت بھی درکار ہے۔ انہوں نے یہ
بھی محسوس کیا کہ اس موقع پر نوجوانوں کی ایک ایسی تنظیم کا ہونا
انتہائی ضروری ہے جو اپنے آپ کو اپنے آزادئ وطن کے
نصب العین کے لئے وقف کر دیں اور اسی لئے انہوں نے
نومبر ۱۹۲۱ء میں Servants of the People
Society کی بنیاد ڈالی۔ لالہ جی کی درخواست پر ہی
مہاتما گاندھی نے لاہور جا کر اس تنظیم کا افتتاح کیا۔
اس نیک کام کے لئے لالہ جی نے اپنا بنگلہ سوسائٹی کے کاموں
کے لئے وقف کر دیا جو کہ سوسائٹی کا صدر دفتر بنا اور جہاں
چند خاص ممبران نے سکونت بھی اختیار کر لی۔

لالہ لاجپت رائے پنجاب کے لدھیانہ ضلع کی جگراؤں
تحصیل کے ڈھوڈیکے مقام پر ۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو
پیدا ہوئے اور اپنی ۶۴ سالہ بے چین اور پرعزم زندگی
گذارنے کے بعد لاہور میں ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو انتقال کر گئے
لالہ لاجپت رائے کے والد لالہ رادھا کرشنا مدرس تھے،
اور اردو پڑھاتے تھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انہیں عربی
اور فارسی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ لالہ لاجپت رائے
اردو کے بہترین نثر نگار اور مقرر تھے۔ لالہ لاجپت رائے
نے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں تک وکالت
کی۔ آپ کا شمار لاہور کے مشہور وکیلوں میں ہونے لگا۔
لالہ لاجپت رائے اپنی آتشیں تقریروں کی وجہ سے
برٹش حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے۔ وہ خود بھی

ہندوستان میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں پا رہے تھے اس لئے ۱۹۱۴ء میں انگلینڈ چلے گئے اور وہاں سے امریکہ۔ امریکہ میں چھ سال تک مقیم رہے۔ اس وقت ان کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا تھا، اور انہوں نے اپنی معرکتہ الآرا تصانیف شائع کیں اور وہیں پر انہوں نے INDIAN HOME RULE LEAGUE کی بنیاد ڈالی سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ کے ہندوستان آتے ہی تمام ملک میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور بمبئی۔ دلّی اور لاہور کے عوام نے آپ کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا ایک خصوصی سیشن منعقد ہوا جس کی صدارت لالہ لاجپت رائے کو سونپی گئی۔ کانگریس کا یہی وہ تاریخی اجلاس تھا جہاں مہاتما گاندھی نے "عدم تعاون تحریک" کا اعلان کیا تھا۔ شروع میں لالہ جی نے اس تحریک کی مخالفت کی، مگر ناگپور میں جب کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تب وہ اس تحریک کی موافقت میں آ گئے اور اسی وقت سے انہوں نے گاندھی جی کے شانہ بہ شانہ کام کرنا شروع کیا۔

اپنی آتشیں تقریروں کی وجہ سے لالہ لاجپت رائے کو دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء میں گرفتار کیا گیا۔ کیونکہ باوجود حکومت کے منع کرنے پر بھی انہوں نے پنجاب Provincial کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد کیا تھا اور اپنی تقریر کے ذریعہ بدیسی حکمرانوں کی کھلی مذمت کرتے ہوئے دیس واسیوں کو ان کے خلاف بھڑکایا تھا۔ یہ قید ایک سال کی تھی مگر انہیں علالت کی وجہ سے چند ہی ماہ بعد رہا کر دیا گیا مگر یہ رہائی بھی عارضی تھی۔ لالہ جی نے اپنی تقریروں کا سلسلہ قائم رکھا۔ نتیجتاً انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اتفاق کی بات کہ جیل میں آتے ہی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، اور بدیسی حکمرانوں کو پھر انہیں رہا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ اس لئے پھر لالہ جی کو رہائی نصیب ہوئی۔ ابھی وہ قطعی طور پر صحت یاب نہیں ہوئے تھے کہ اسی دوران پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ لالہ لاجپت رائے نے موتی لال نہرو کی اس پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور وہ سنٹرل اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے۔

ہندوستانی تاریخ جنگ آزادی میں سائمن کمیشن کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن لاہور آیا جس کی مخالفت میں عوام نے ایک بڑا جلوس نکالا جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔ اس جلوس کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیتے ہوئے لاٹھی چارج کی۔ جس میں لالہ جی بری طرح زخمی ہوئے اور دوبارہ بیمار پڑ گئے۔ زخم اسقدر کاری تھا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے اور ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۲۸ء کو ہندوستان کا یہ جیالا سپوت جس نے عوام کے دلوں میں آزادی کی جوت جلائی تھی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ یہ وہ مجاہد آزادی تھا جس نے اپنی تحریروں سے، اپنی تقریروں سے بدیسی حکمرانوں کے دل میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔

لالہ جی نے اپنے عوام کی بیداری اور اپنی آواز ان تک پہنچانے کے لئے اردو کا ایک روزنامہ جاری کیا اور اسی کے ساتھ انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار people نامی جاری کیا تاکہ ان کی آواز ان اخبارات کے ذریعہ ملک کے کونے کونے میں پہنچ سکے اور وہ اپنے اس مشن میں کامیاب بھی رہے۔

غفران احمد

مولانا ابوالکلام آزاد
ایک عظیم مفکر، ادیب اور صحافی

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار یقینی طور پر ان عظیم انسانوں میں ہے جن میں پیدائشی طور پر عظمت کا وصف ہوتا ہے اور قدرت انھیں کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لئے عالم ہستی میں بھیجتی ہے۔ وہ ایک روشن خیال مفکر، عظیم ادیب و صحافی اور صاحبِ بصیرت رہنما تھے۔ قدرت نے ایک طرف انھیں غیر معمولی ذہانت، قوتِ ادراک اور رفعتِ خیال سے نوازا تھا تو دوسری طرف سحر انگیز خطابت، قابلِ رشک علم و فضل اور انقلاب آفریں اندازِ نگارش سے مالا مال کیا تھا۔

جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کی وفات پر پارلیمنٹ میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے ان کی وہ خوبیاں گنانے کی ضرورت نہیں جنھیں ہم سب جانتے ہیں۔ ان کا علم و فضل عمیق معلومات، اور عظیم خطابت، وہ ایک بہت بڑے ادیب تھے اور کئی پہلوؤں سے وہ بڑے تھے لیکن اور بھی دوسرے علماء اور فضلاء ہیں دوسرے ادیب اور خطیب موجود ہیں۔ مولانا آزاد میں ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت یکجا ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی شخصیت ہمیشہ ایسی شخصیتوں کی یاد دلاتی تھی جن کے متعلق میں نے تاریخ میں پڑھا تھا مثلاً یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو نشاۃِ ثانیہ کی عظیم شخصیتیں سامنے آتی ہیں یا اس کے بعد کے دور میں فرانسیسی انقلاب سے کچھ پہلے کی دو مجموعۂ علوم شخصیتیں ذہانت۔ اور عمل کے میدان میں عظیم شخصیتیں۔ مولانا آزاد میں قدیم دور کی عظیم ہستیوں میں پائی جانے والی بردباری، رواداری اور حلم و برداشت کی خوبیاں تھیں۔ وہ اس مشترکہ ثقافت کے ایک منفرد نمائندہ تھے جو ہندوستان میں رفتہ رفتہ پروان چڑھی۔ وہ خاص طور پر اس ہندوستانی ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے جو مغربی ایشیا خصوصاً ایران اور عرب کی اقوام سے متاثر ہوئی تھی۔"

علمی تبحر

مولانا کے علمی تبحر کے متعلق پنڈت نہرو نے جو کچھ کہا ہے اس کا اعتراف دوسری بڑی شخصیتوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ برِّصغیر ہند و پاک کے چوٹی کے مصنف مولانا غلام رسول مہر مولانا آزاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن ایک وجود میں بہت کم جمع ہوتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا ہے جن کا حصار مشکل ہے ان میں سے کسی ایک دائرے میں ایسی بلندی حاصل کرلینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے دائمی فخر کا سامان ہوسکتا ہے علم و فضل، حقائق دین، فلسفہ و حکمت شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطاب، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کہ کونسا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں جنم لیا ان کی والدہ ایک عرب خاتون تھیں۔ والد ایک سرکردہ ہندوستانی عالم مولانا خیرالدین تھے۔ اس زمانہ میں مولانا خیرالدین کا قیام مکہ معظمہ میں تھا۔ بعد میں مولانا موصوف مع اہل خاندان کلکتہ واپس تشریف لے آئے۔

مولانا ابوالکلام کا بچپن مکہ معظمہ میں گذرا۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ ابتدائی تعلیم اسی مقدس شہر میں انجام پائی۔ کلکتہ میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ابتدائی عربی و فارسی نصاب اور درس نظامی کی تکمیل مختلف علماء نے کرائی اپنے والد سے بھی مختلف کتابوں کے اسباق پڑھے۔ عربی و فارسی علوم پر مولانا کو جو عبور حاصل تھا ان کے ہم عصر علماء کم ہی اس پایہ کا کمال رکھتے تھے۔ مولانا نے انگریزی اور فرانسیسی اپنی کوششوں سے سیکھی تھی اور اتنا کمال حاصل کرلیا تھا کہ ان دونوں زبانوں کی بڑی بڑی کتابوں کا مطالعہ کرسکتے تھے۔ مولانا کا دماغ کیا تھا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھا۔ غضب کی قوت حافظہ پائی تھی ایک بار جو کتاب پڑھ لیتے تھے اس کے مضامین ہمیشہ کے لیے حافظہ کی قید میں آجاتے تھے۔

قوم کا غم

مولانا آزاد اور ان کے سیاسی فلسفہ اور قیادت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے دور کا پس منظر نظر میں ہو۔ ۱۸۵۷ء میں اہل ہند کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ملک پر برطانوی تسلط مکمل ہوچکا تھا۔ چنانچہ جب مولانا آزاد نے آنکھیں کھولیں تو انھیں رات دن قوم کا غم دامنگیر تھا۔ شروع میں بنگالی انقلاب پسندوں سے ملاقاتوں کے بعد انھوں نے انقلاب پسند تنظیم میں شرکت کا فیصلہ کیا لیکن بہت جلد انھوں نے اپنی سیاسی بصیرت کے پیش نظر آزادی کے حصول کے لیے پرامن لیکن باشعور اور پرجوش جدوجہد کی راہ اپنائی اور اس کے ساتھ ہی صحافت کو ایک موثر حربہ کے طور پر اپنایا۔

ایک عظیم مفکر کی حیثیت سے مولانا آزاد نے قومی بیداری کے لیے صحافت کی راہ اپنائی ان کے مزاج کی ساری انقلاب پسندی تحریروں میں ڈھل گئی۔ شروع میں "المصباح" اور پھر "لسان الصدق" جاری کیا اس کے بعد لکھنؤ میں علامہ شبلی کے رسالہ "الندوۃ" کی ادارت سنبھالی چند ماہ بعد اس کی ادارت سے سبکدوش ہوگئے۔

۱۹۰۲ء میں امرتسر کے سہ روزہ اخبار "وکیل" کی ذمہ داری لی۔ ۱۹۰۸ء میں اس سے الگ ہوئے اس دوران وہ یہ محسوس کرتے رہے تھے کہ اپنا ایک اخبار جاری ہونا چاہیے چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا اس کا پہلا دور ۱۹۱۴ء میں ختم ہوگیا۔

اسی مدت میں حکومت نے دوبارہ ضمانتیں طلب کیں۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" نکالا گیا۔ یہ اخبار ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں "پیغام" منظر عام پر آیا یہ بہت جلد بند ہوگیا۔

"الہلال" کا دوسرا دور جون ۱۹۲۷ء میں شروع ہوا اور اسی برس ۱۹۲۷ء کو اس کا آخری شمارہ نکلا۔

مولانا نے ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے عربی کا رسالہ "الجامعہ" نکالا جس میں برطانوی استعمار کے خلاف اہل مشرق کو متوجہ کیا جاتا تھا۔ یہ رسالہ عرب ممالک میں بھیجا جاتا تھا اور وہاں بڑی سنجیدگی سے پڑھا جاتا تھا "الہلال" فنی، سیاسی، علمی اور ادبی حیثیت سے اردو صحافت میں ایک سنگ میل تھا۔ دراصل اردو میں جدید صحافت کی ابتدا "الہلال" ہی سے ہوتی ہے خود مولانا آزاد الہلال کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"الہلال" کی اشاعت سے اردو میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ اہل ملک کے لیے صرف اس کی اعلیٰ طباعت ہی باعث کشش نہ تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ پرکشش تو کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔"

"الہلال" نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کردی۔

کردار کے غازی

مولانا آزاد صرف قلم ہی کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ قول و عمل کے صادق تھے۔ اپنے مسلک کی خاطر انھوں نے قربانیاں دیں مشرق کے اس عظیم مفکر نے قید و بند کی طویل زندگی گذاری۔ مجموعی طور پر انھوں نے دس برس سات ماہ قید میں گذارے۔ تحریک خلافت ہو یا انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ آزادی وہ ہر جگہ صف اول میں نظر آتے ہیں۔ مولانا کے سیاسی نظریات واضح تھے جس طرح خلافت عثمانیہ کے بارے میں ان کی پیشین گوئی پوری ہوئی کہ تقسیم کے عمل سے چھوٹے چھوٹے ملک ختم ہیں گے۔ سامراج ان پر اپنا تسلط جمائے گا اسی طرح تقسیم ہند کے مضر نتائج سے انھوں نے بار بار آگاہ کیا تھا ان کے سیاسی نظریات ٹھوس تھے وہ تقسیم ملک کے خلاف اور متحدہ قومیت کے علمبردار تھے۔ مولانا آزاد کو اپنے اس نظریہ کے لئے بھی بہت کچھ تنقید کا نشانہ بننا پڑا لیکن جب تقسیم ہو گئی تو اس مرد دانا کی تمام باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔

مولانا آزاد ایک جید مذہبی عالم تھے انھوں نے اپنے افکار میں مذہبی رواداری، بھائی چارہ اور وطن پرستی پر زور دیا۔ مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے غالباً اپنی ایک تقریر میں بالکل صحیح کہا تھا۔

"میری رائے میں مولانا آزاد کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے عوام کو مذہب کے حقیقی پہلوؤں سے آشنا کیا ایک پہلو تو مذہب کا یہ ہے کہ اختلافات اور نفرت کو ہوا دی جائے۔ یہ مذہب کا جھوٹا، اور غلط پہلو ہے۔ مذہب کا دوسرا پہلو اس کا حقیقی پہلو ہے وہ یہ ہے کہ مذہب ایک دوسرے کو جوڑتا ہے مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ مذہب کا یہ پہلو خدمت کے جذبے اور اپنے نفس پر دوسروں کے ترجیح دینے میں پوشیدہ ہے۔ یہی ایک سبق ہم سب کو ان کی زندگی سے لینا چاہئے۔"

مذہبی و سیاسی مفکر

مولانا کے سیاسی و مذہبی افکار پر اُن کے زمانے ہی میں خاصی توجہ دی گئی۔ عالم عرب اور مغربی ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک میں وہ ایک جانے پہچانے مذہبی و سیاسی مفکر تھے۔ اور

دوست محمد شاداب
۲۰۶ کلثوم بی بلڈنگ،
شمسان روڈ کولا (ایسٹ)
بمبئی ۳۷...۴۰۰

غزل

آج کل غم دوراں ہر کسی سے ڈرتے ہیں
تیرگی کے دھوکے میں روشنی سے ڈرتے ہیں

انقلاب عالم کا یہ بھی اک کرشمہ ہے
آج آدمی اکثر آدمی سے ڈرتے ہیں

خود غرض زمانے میں خود غرض زمانے کی
دوستی سے بچتے ہیں، دشمنی سے ڈرتے ہیں

پہلے دل میں لوگوں کے رہزنوں کا ہی ڈر تھا
آج رہبروں کی بھی رہبری سے ڈرتے ہیں

سامنے نگاہوں کے ہے مآل گل لیکن
لوگ پھر بھی خاروں کی دوستی سے ڈرتے ہیں

آکے رک ہی جاتا ہے حرفِ مدعا لب پر
ہم مزاج دلبر کی برہمی سے ڈرتے ہیں

بزم رنگ و بو نے یوں کر دیا ہمیں شاداب
موسم خزاں کی ہم آگہی سے ڈرتے ہیں

اب ماضی قریب میں پاکستان میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی و مذہبی افکار پر تحقیق و اشاعت کا آغاز ہوا ہے یہ ایک نیک فال ہے مولانا آزاد اپنے نصب العین میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ہر بڑے مفکر کی طرح وہ بھی زمانے کی ناقدری کا شکار رہے ہر بڑے آدمی کو کسی نہ کسی حد تک اس صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد کی وفات پر نہ صرف ملک بھر میں بلکہ عالم اسلام میں اس عظیم مفکر کو جو خراج عقیدت پیش کیا گیا اس سے ثابت ہوا کہ مولانا کے افکار کے تعارف کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

•••••••

شری شیواجی راؤ موہتے، وزیر برائے جنگلات اور سماجی جنگلبانی نے قومی راج کے ایڈیٹر کو ایک خاص انٹرویو دیا۔ قسم قسم کے ۲۸ کروڑ پودے، سوبول، کیکر، آم، ناگوان اور پھلدار درختوں کے پودے ون مہوتسو میں لگائے جا رہے ہیں جس کی ابتدا جون سنہ ۱۹۸۶ء یعنی عالمی جنگل بانی دن سے ہو گئی ہے اور یہ دن ۱۵ اگست سنہ ۱۹۸۶ء یعنی یوم آزادی تک منایا جائے گا۔ شری موہتے نے بتلایا کہ یہ ۲۸ کروڑ پودے محکمہ جنگلات کی پودکیاریوں نیز بعض غیر سرکاری پودگھروں میں تیار کئے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امسال ون مہوتسو کے دوران جنگل بانی کے لئے تجویز کیا گیا رقبہ ۲۳ لاکھ ہزار ہیکٹر ہے۔

اس بات پر خاص زور دیا جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں درخت لگائے جائیں اور منظم کوشش کی جائے کہ لگائے گئے زیادہ سے زیادہ درخت محفوظ رہیں۔

کثرت سے درخت لگائیے
اور
ان درختوں کی حفاظت کیجئے

وزیر جنگلات کا پیغام

"اگر ہم امن و سکون کی فضا چاہتے ہیں تو ہمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں درخت لگانے اور ان کی حفاظت پر توجہ دینی چاہئے یعنی ہمیں امن و سکون کے لئے شجرکاری کرنی چاہئے۔

زمانہ قبل از تاریخ سے جنگلات ہمارے دوست رہے ہیں۔ قسم قسم کے پرند اور جنگلی جانور اطمینان اور خوشی کے ساتھ ایسی زندگی ہمارے ساتھ گذار سکتے ہیں جو باہم ایک دوسرے کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہرے بھرے جنگلات میسر ہوں۔ اس لئے ایک جملے میں میرا یہ پیغام ہے "کثرت سے درخت لگائیے" ان کو محفوظ رکھئے اور ان کی حفاظت کیجئے۔

"ون مہوتسو" کے دوران لگائے جانے والے پودوں کی ۲ یا ۳ سال دیکھ بھال کیجئے اس کے بعد درخت خود اپنا بچاؤ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور آپ اسے ننھے پودے سے بڑا درخت ہوتے دیکھ کر مسرور ہو سکتے ہیں۔"

محترم وزیر نے خوشی کا اظہار فرمایا کہ عوام میں آگاہیات کی بابت کافی آگاہی آ چکی ہے اور کہ ان کی بھی خواہش ہے کہ ہرے بھرے درختوں کی تعداد بڑھائی جائے، علم معیشت جو ان کو ترقی دی جائے، اور جنگل کے درختوں، پرندوں اور جانوروں کو محفوظ رکھا جائے کیونکہ ان کی بدولت اس پاس کا ماحول صاف اور صحت مند رہتا ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بڑی حوصلہ افزا ہے کہ بہت سے اسکول اور کالج، امداد باہمی سے چلنے والے شکر کے کارخانے اور غیر سرکاری ادارے درخت لگانے کے عظیم الشان پروگرام میں مدد دینے کے لئے اپنے آپ آگے بڑھ رہے ہیں اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس "ون مہوتسو" کو زبردست کامیابی عطا کرنے کے لئے اپنا دلی تعاون پیش کریں۔

انٹرویو مذکورہ کے بعض اضافی نکات نیچے درج ہیں۔

سوال :- ہمارا ملک میں کتنا فیصد رقبہ جنگلات کے تحت ہے اور

اس باب میں قومی پیمانے پر اس کی کیفیت کیا ہے؟

جواب:- منظور کردہ بین الاقوامی قاعدوں کے مطابق کل زمین کے ۳۳ فیصد حصے پر جنگلات ہونے چاہئیں۔ ہمارے ملک میں جنگلات اس حساب سے نہیں ہیں۔ ایک موٹے اندازے کے مطابق تقریباً ۲۵ فیصد حصے میں جنگلات ہوں گے ہم کہتے ہیں کہ مہاراشٹر میں ۲۰ فیصد زمین پر جنگلات ہیں۔ لیکن درحقیقت اتنے فیصد کا بمشکل نصف جنگلات رقبہ ہوگا۔ اگر ہم جھاڑیوں کو جنگلات میں شمار نہ کریں اور صرف بڑے بڑے درختوں والے حصۂ زمین ہی کو جنگلات کا نام دیں۔

سوال:- فیصد اتنا کم رقبہ تو بڑا خطرناک ہے آخر اس حد تک فیصد کمی کی وجہ کیا ہے؟

جواب:- اس حد تک فیصد کمی کا خاص سبب تو درحقیقت یہی ہے کہ تعمیراتی ضرورتوں، ایندھن، جانوروں کے چارہ، اور دوسرے کاموں کے لیے درختوں کو اندھا دھند کاٹا جاتا ہے۔ یہ کاٹ چھانٹ زیادہ تر ان درختوں کے سلسلے میں ہوا کرتی ہے جو غیر سرکاری یا خانگی زمینوں پر ہوا کرتے ہیں۔ شہروں کے حدود میں اضافے یا شہر سازی نے عموماً ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ اور قطاروں پر دست اندازی کی ہے۔ ہمارے بعض ضلعوں میں تو ایک فیصد رقبہ بھی جنگلات کے تحت نہیں ہے۔

سوال:- ان حالات میں بہتری لانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

جواب:- حکومت کو معلوم ہے کہ لوگوں کو تعمیراتی کاموں، جلانے اور دوسری ضرورتوں کے لیے لکڑی کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے محکمۂ جنگلات اور کارپوریشن برائے ترقی جنگلات کافی بڑی تعداد میں ساگوان کے درخت اور جلن کی لکڑیوں کے درخت لگا رہے ہیں تاکہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اور تاکہ وہ بے تحاشا اور غیر قانونی طور پر ان مقاصد کے لیے درختوں کو نہ کاٹیں۔ حکومت سخت طریقے اختیار کر رہی ہے تاکہ غیر قانونی طور پر بغیر اجازت کہیں بھی اور کسی بھی زمین کے درخت عام طور پر اور خانگی ملکیت والی زمینوں پر لگے ہوئے درخت خاص طور پر کاٹے اور گرائے نہ جائیں۔

غیر قانونی طور پر درخت کاٹنے والوں کے خلاف ایس آر۔ پی کے ذریعے اچانک چھاپہ ڈالا جاتا ہے اور خطا کاروں سے سخت باز پرس کی جاتی ہے۔

قانون جنگلات میں مناسب ترمیمیں کی جا چکی ہیں اور زمینوں پر لگے ہوئے درختوں کو کاٹنے کی اجازت جو پہلے تحصیلدار دیا کرتا تھا اب ایس۔ ڈی۔ او اور ضلع کلکٹر کے یہاں سے ملتی ہے جو نہایت زبردست احتیاط برتتے ہیں اور اس کے لیے اجازت آسانی سے نہیں دیا کرتے اس کے علاوہ قانون جنگلات میں ۱۹۸۵ء میں ایک نئی ترمیم کی گئی جس کے تحت غیر قانونی طور پر کاٹے گئے درختوں اور قیمتی جنگلاتی پیداواروں کو، نیز ان کو لے جانے والی گاڑیوں جیسے ٹرکوں، بیل گاڑیوں، گھوڑوں، بائیسکلوں وغیرہ جن پر ان کو کاٹنے کے بعد چوری چھپے لے جایا جاتا ہے دونوں کو ضبط کر لیا جاتا ہے ان سخت قوانین سے مقصود یہ ہے کہ چوری سے جنگلات کو نقصان پہنچانے والوں کو دہشت زدہ کیا جائے تاکہ وہ خلافِ قانون عمل سے باز رہیں۔

سوال:- تجویز کے مطابق ۲۸ کروڑ پودکیاریاں تیار کی جائیں گی اور انھیں موسم باراں میں لگا دیا جائے گا۔ کیا یہ پودکیاریاں صرف سرکاری پودگھروں میں تیار کی جائیں گی؟

جواب:- نہیں اتنی کثیر تعداد میں سرکاری پودگھروں میں پودکیاریاں تیار کرنا حکومت کے لیے مشکل ہوگا۔ اس لیے ہم پرائیوٹ پودگھروں کی مدد بھی لے رہے ہیں ہم نے نفع پر کام کرنے والے ۳۱۵۴ پرائیوٹ پودگھروں کا انتخاب بھی کیا ہے جو ۲۱ء۲۷ لاکھ پودکیاریاں تیار کریں گے۔ حکومت ان سے رعایتی قیمت پر (یعنی ۴۵ پیسے فی پودکیاری کی شرح سے) یہ پودکیاریاں خریدے گی۔ یہ بات بھی ہمت افزا ہے کہ ریاست کے ۱۷، ۱۸ ضلعوں میں کسانوں نے امداد باہمی کی سوسائٹیاں قائم کرلی ہیں جو پودکیاریاں تیار کر رہی ہیں ان کا مقصد تجارتی ہے اس سلسلے میں یہ سوسائٹیاں اکٹھا ہوئی ہیں۔ میٹنگیں کرتی ہیں اور اپنے ممبروں کو مختلف قسم کے درختوں کے فائدے سمجھاتی ہے اور کہ انھیں لگانے میں کیا کیا بھلائیاں ہیں اور اس طرح کسانوں کے دل میں درخت کاری کا خو

بٹھاتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اس طرح لوگوں میں درختوں اور جنگلات کے فائدوں کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے تاکہ ان میں زیادہ سے زیادہ درخت لگانے کی لگن پیدا کی جائے اور جو درخت لگائے جا چکے ہیں ان کی حفاظت پر آمادہ کیا جائے۔

سوال ۶۔ لوگوں کو پودکیاریاں کس شرح سے مہیا کی جاتی ہیں اور انھیں کہاں لگایا جاتا ہے؟

جواب ۶۔ لوگوں کو پودکیاریاں "جشنِ جنگلات" کے دوران امدادی شرحوں پر مہیا کی جاتی ہیں چونکہ یہ بارش کا موسم ہے (۵ جون تا ۱۵ اگست) اس لئے پودکیاریوں کے جڑ پکڑ لینے کی زیادہ امید ہے ویسے بھی سوبول، نیلگری، بانس اور پھل والے درختوں کی مانگ زیادہ ہے۔ سماجی جنگل بانی کے تحت اس وقت ریاست میں ۴ لاکھ ہیکٹر رقبہ زمین زیر استعمال ہے اس کے علاوہ "جشنِ جنگلات" کے دوران جو پودے لگائے گئے ہیں وہ سرکاری اور نیم سرکاری زمینوں، گرام پنچایت اور بستی کی زمینوں پر لگائے گئے ہیں ان کے سوا اسکول اور کالج، پرائیوٹ ادارے، امداد باہمی کے شکر کے کارخانے بھی خود اپنی کوششوں سے پودکیاریاں تیار کرتے ہیں اور جشنِ جنگلات کے دوران انھیں لگاتے ہیں۔

گذشتہ سال ایک لاکھ ۵ ہزار ہیکٹر پر لگائے گئے تھے امسال ایک لاکھ تیس ہزار ہیکٹر پر لگانے کی تجویز ہے اور آئندہ سال ایک غیر یقینی پروگرام کے مطابق دو لاکھ ۵۰ ہزار زمین کے رقبے پر لگانے کی تجویز ہے اس کی تفصیل کے ساتھ منصوبہ بندی کا حساب کیا جا رہا ہے اور تجویز یہ ہے کہ افتادہ زمینوں کو بڑے پیمانے پر درخت لگانے کے لئے آئندہ سال استعمال کیا جائے۔

سوال ۵۔ کیا درخت لگانے کی سرگرمی پر "جشنِ جنگلات" کے موقع پر ہی عمل کیا جانا محدود ہے؟

جواب ۵۔ نہیں محکمۂ جنگلات کے لئے درختوں کا لگانا اور لگائے گئے درختوں کی حفاظت کرنا پورے سال کی سرگرمی ہوا کرتی ہے۔ جنگل بانی کا کام یو، این، اے، آئی، ڈی، پروگرام کے تحت بھی عمل میں لایا جاتا ہے اس کے سوا دوسرے پروگرام اور اسکیمیں بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک اسکیم کے تحت درخت لگائے جاتے ہیں اور تین سال تک انھیں پانی دیا جاتا اور محفوظ رکھا جاتا ہے اور پھر انھیں گرام پنچایت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب آمد و رفت کی سہولتیں نہیں تھیں تو لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ تب سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت ہوا کرتے تھے جن سے مسافروں کو جھلسا دینے والی گرمی سے نجات ملتی تھی۔ آج بھی ہمارے بہت سے راستوں کے دونوں طرف ایسے درخت ہیں۔ ایک اسکیم جسے "درخت پٹہ" اسکیم کا نام دیا گیا ہے بنائی گئی ہے جس کے تحت تین ہزار سے زیادہ لوگ ایسے راستوں پر دونوں طرف درخت لگانے کے لئے کام پر رکھے گئے ہیں جن راستوں پر اس طرح کے درخت نہیں ہیں دوسری ایک اسکیم کے تحت حکومت نہروں کے کنارے کنارے اپنے خرچ سے درخت لگاتی ہے جہاں ٹوٹ پھوٹ کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں ایسے رقبوں میں ایک مربع کلومیٹر پر درخت لگائے جاتے ہیں اور ایسوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جو ان درختوں کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے سپرد یہ درخت کئے جاتے ہیں ان کی زیرِ حفاظت درختوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

گذشتہ سال سے ہمارے وزیرِ اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان کی طرف سے اعلان کردہ ایک اسکیم کے تحت جنگل بانی کے لئے پرائیویٹ آراضی کو حاصل کیا جا رہا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ۳۰ تا ۳۵ کلومیٹر کا ایک رقبہ ضلع عثمان آباد میں متعلق لوگوں نے اپنی اراضی خوشی خوشی جنگل بانی کے عظیم الشان پروگرام کے لئے دے رہی ہے اور ایک اور اسکیم کے تحت بنجر زمین کو جنگل بانی کے لئے کارآمد بنایا جا رہا ہے۔

ہمارے وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی نے نئے ۲۰ نکاتی پروگرام میں صحیح طور پر درخت کاری پر زور دیا ہے اس لئے محکمۂ جنگلات درخت لگانے کے کام میں اور ان کو بچانے اور محفوظ رکھنے کی کوششوں میں دل و جان سے مصروف ہے اور یہ کام محکمۂ مذکور سال بھر کی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہے۔

سوال ۷۔ جشنِ جنگلات میں جو پودے لگائے جاتے ہیں کیا وہ محفوظ

بھی رہتے ہیں ؟

جواب ۹:- جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہماری ریاست میں بارش یکساں طور پر ہر جگہ نہیں ہوتی۔ لگائے گئے درختوں کو پانی دینا عملاً دشوار ہے اس لئے قدرتی طور پر لگائے گئے درختوں کا قائم رہنا ان حالات اور کیفیات پر منحصر ہے جو مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں بعض مقامات پر ۸۰ تا ۹۰ فیصد لگائے گئے درخت قائم رہتے ہیں جب کہ بعض دوسرے مقامات پر صرف ۲۰ فیصد درخت باقی رہ جاتے ہیں۔ ہم نے اسکول اور کالج کے طالب علموں کے ذریعے درخت لگانے کی اسکیم شروع کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ پھر بھی تعلیمی اداروں کو ہم "پودکیاریاں" مہیا کرتے ہیں اور ان سے بعض جلوس کی شکل در "درخت ڈنڈی" نکالتے ہیں تاکہ انھیں درخت کاری کے پروگرام کے سلسلے میں عوام کی تائید حاصل ہو

سوال ۱۰: کس قسم کے درختوں کی مانگ زیادہ ہے ؟

جواب ۱۰:- سوبول، نیلگری، بانس اور پھل دینے والے درختوں کی مانگ زیادہ ہے۔ ساگوان کے درخت کے بھی طلب گار بڑھتے جا رہے ہیں۔ محکمہ جنگلات آسان زبان میں درختوں کے بارے میں لٹریچر نکال رہی ہے جس میں الگ الگ قسم کے درختوں کے لگانے کے طور طریقے سمجھائے جاتے ہیں یہ کتابچے یا لٹریچر زیادہ تر مفت دیئے جاتے ہیں۔ درختوں کے اگانے کے تئیں نظریات بدلتے جا رہے ہیں لوگوں میں اس بات کی آگاہی پیدا ہو رہی ہے کہ صرف بعض قسم کے درخت ہی نہیں لگانے چاہئیں۔ درخت صرف ایک ہی قسم کے نہ ہوں تو بہتر ہے۔ درخت کاری کا پروگرام ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعے ماحولیات کی حفاظت اور تحفظ بھی ہو سکے چنانچہ یہ شعور رفتہ رفتہ جاگ رہا ہے۔

سوال ۱۱:- ہماری ریاست میں ادیباسیوں کا ایک بڑا رقبہ ہے جنہیں ادیباسی جنگل کی پیداوار پر بڑے پیمانے پر انحصار کرتے ہیں ان لوگوں کو غیر قانونی طور پر درخت کاٹنے سے باز رکھنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں ؟

جواب ۱۱:- آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے ادیباسی رقبوں میں، ادیباسی جنگلاتی پیداوار پر انحصار رکھتے ہیں اس لئے محکمہ جنگلات انھیں بڑے پیمانے پر جنگل کاری کے عظیم الشان پروگرام میں شریک کرتی ہے تاکہ ان کی ضروریاتِ زندگی بھی آسانی سے پوری ہوں اور جنگل کے درختوں کو نقصان بھی نہ پہنچے

ایک "ادیباسی" پودا لگاتے ہوئے۔

سو ببول کی
شجر کاری
کا
ایک منظر

"جنگل بانی" پروگرام میں جو کام کیے جاتے ہیں وہ "دیہی روزگار اسکیم" کے ماتحت نیز ہماری ریاست کی امتیازی "ضمانت روزگار اسکیم" کے تحت انجام دیے جاتے ہیں تاکہ دیہات کے لوگوں کو کام ملے اور جنگل بانی کے کام کو بھی فروغ حاصل ہو۔

اس خیال سے کہ جلانے کی لکڑی کے لیے دیہات کے لوگوں کا انحصار جنگلات پر نہایت کم رہ جائے ہمیں جلانے کی لکڑی کی جگہ کوئی مناسب بدل جیسے گوبر گیس پلانٹ، شمسی کوکر، ہوائی مل وغیرہ دیہاتوں کے لیے تجویز کرنا ہوگا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ راست مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں گوبر گیس پلانٹ بڑے وسیع پیمانے پر بنائے جا رہے ہیں بلکہ دھواں بغیر چولہے بھی، عورتوں کو چولہا پھونکنے کی مشقت سے بچانے کے لیے دیہاتوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔

سوال:۔ ہمارے شہری علاقوں میں کس حد تک جنگل بانی کے امکانات ہے؟

جواب:۔ شہروں میں اور شہری علاقوں میں بھی "جنگل بانی" کے امکانات ہیں شہری اور شہری علاقوں میں بھی جہاں کھلی جگہیں ہیں درخت لگائے جا سکتے ہیں۔ دراصل ایسے مرکزوں میں کسی بلڈنگ یا منصوبہ کو منظوری عطا کرنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کر لیا جانا ضروری ہے آیا درخت لگانے کے لیے کافی جگہ چھوڑی گئی ہے یا نہیں اس کے بعد ہی اس امکان کا پلان یا بلو پرنٹ منظور کیا جانا چاہیئے۔ مختصراً یہ کہ شہری جنگل کاری کا ہونا بھی ضروری ہے۔

سوال:۔ جشن جنگلات کے سلسلے میں لوگوں کو آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

جواب:۔ بس ایک جملے میں ہمارا پیغام یہ ہے کہ "کثرت سے درخت لگایئے اور ان درختوں کو محفوظ رکھئے اور ان کی حفاظت کیجئے جو ون مہوتسو (جشن جنگلات) کے سلسلے میں لگائے گئے ہیں دراصل میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمیں ان پودوں کی حالت پر وقتاً فوقتاً نظر رکھنا چاہیئے جن کو ہم نے لگایا ہے، "تاکہ انھیں بڑا درخت ہوتے ہوئے دیکھیں۔ ہر پودے کے لیے دو سے تین سال تک دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد درخت اپنا بچاؤ خود کر لیتا ہے اگر ہم امن وسکون کی فضا چاہتے ہیں تو ہمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں درخت لگانے اور ان کے حفاظت کرنے پر توجہ دینی چاہیئے یعنی ہمیں امن وسکون کے لیے شجر کاری کرنی چاہیے۔ زمانہ قبل اور تاریخ سے جنگلات ہمارے دوست رہے ہیں قسم قسم کے پرندے اور جنگلی جانور اطمینان اور خوشی سے ہمارے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں ایسی زندگی جو باہم ایک دوسرے کے لیے مفید اور فائدے مند ہو سکتی ہے اور یہ صورت حال بہترین طور پر صرف ہرے بھرے جنگلات ہی کے ذریعے میسر آ سکتی ہے۔

• مطلوب نظامی
۳۰۸/۵ جوہری محلہ لکھنؤ (یوپی)

ہم کو بھارت میں بہارِ اَبدی لانا ہے

قوم تہذیب کی یکجہتگیٔ بید کا ہے نام قوم تعظیم درروایاتِ ابوجر کا ہے نام
قوم ہے رام کا نام اور نہ احمد کا ہے نام قوم ہر بزم میں کھلی ہوئی مسند کا ہے نام

قوم کو تاجِ تعصب سے نہ شاہی بخشو
قوم پرور ہو تو آزاد نگاہی بخشو

گل بھی لالہ بھی ہے بیلا بھی چنبیلی ایسی اور جوہی کی دلہن بھی ہے نویلی اس میں
کامنی رہتی ہے بن بن کے سہیلی ایسی سارے پھولوں نے بنائی ہے حویلی اس میں

کوئی ہندو نہ مسلمان نہ عیسائی ہے
گلشنِ ہند میں مل جل کے بہار آئی ہے

خواہ مسلک ہو کوئی چشمِ تماشائی کا کوئی عنواں نہ ہو افسانۂ بینائی کا
یہ تقاضا نہیں احساس کی گہرائی کا دل میں طوفاں نہ ہو جذباتِ خودآرائی کا

معتدل چال رہے موجِ شناسائی کی
اسی اجمال میں تفسیر ہے یکجائی کی

نہ دلوں میں خلشِ تفرقہ پردازی ہو یکرطوں لب ہوں مگر شوقِ ہم آوازی ہو
فکر بیدار میں اخلاص کی غمازی ہو شرحِ آزاد خیالی میں بھی دمسازی ہو

سر ہوں سو ایک ہی انداز ہو قربانی کا
قوم پرتو ہے اسی جذبۂ انسانیت کا

پا چکی ہو جو روایاتِ لسانی سے فراغ وضعِ دل ہوتے اس بزم میں ڈھلتے ہیں دماغ
پھر جو جلتے ہیں مجھا نہیں بجھتے ہیں چراغ شبِ پُرہول میں تو دیتے ہیں منزل کے سراغ

روشنی اک نئی تصویر لئے آتی ہے
صبح کیا شام بھی تنویر لئے آتی ہے

لب کھلیں بھی تو زباں ذکرِ مساوات کرے ذہن آزاد وہی ہے جو عنایات کرے
دل پہ کتنا ہی اثر شورشِ جذبات کرے وہی ایثار ہے جو پاسِ روایات کرے

دور ہاں راہِ تعصب کی بداخلاقی سے
کر گذرنا ہے ابھی منزلِ آفاقی سے

پیش مقصد جو آزادیٔ ایوانِ عزیز نہ چھٹے ہاتھ سے توقیر کا دامانِ عزیز
بحرِ تعبیر کوئی شے ہی نہیں جانِ عزیز محوِ تخریبِ گلستاں نہ ہو یارانِ عزیز

ناز ابھی ہر گلِ صد رنگ کو فرمانا ہے
ہم کو بھارت میں بہارِ اَبدی لانا ہے

ہے لبِ زہرۂ ملت پہ یہ دل کش آواز ارضِ ہند اٹھ کے ہو تا بامِ ثریا پرواز
قبلۂ شوق بنے عرشِ محبت کا فراز ہوں دہائی کی صفیں اور اکائی کی نماز

وحدتِ تام بھی ہو کثرتِ سجدہ بھی رہے
بندگی قوم کی جاگی ہے تو زندہ بھی رہے

○

لیلیٔ عہد ہو تم عہد کی محمل دے دو محورِ خاص کو اک دردبھرا دل دیدو
کشتیٔ عزم کو چلتا ہوا ساحل دے دو روشِ قوم کو بیداریٔ منزل دے دو

سفرِ زیست میں وہ حدِ خوشی آجائے
لب کھلیں زندۂ جاوید ہنسی آجائے

○

جام ہے اس لئے گردش میں کہ پینا آئے ذوقِ رندی کو تفاخر کا قرینہ آئے
پی چکے ساغرِ سم آج تو جینا آئے یوں جو موت کے ماتھے پہ پسینہ آئے

گرمیٔ انجمنِ میکدہ پائندہ باد
قومِ ہندی بہ دمِ حشر سدا زندہ باد

• رزاق دلے کھولاپوری
مقام و پوسٹ کھولاپور ۴۴۴۸۰۲
ضلع امراوتی، مہاراشٹر

جشنِ آزادی

حسیں زمیں حسیں گگن
چمک اٹھی کرن کرن
بنی سجائی کھیتیاں
حسین تر یہ باغ و بن
مہک اٹھی پون پون
ہمارا اپنا یہ وطن

ہم ایکتا کی جان ہیں
وطن کی آن بان ہیں

یہ پربتوں کے سلسلے
یہ ندیوں کے جل سلے
یہ لہلہاتی کھیتیاں
کہ جھومتی ہیں ٹہنیاں
یہ علم و فن کی جوتیاں
یہ جگمگاتی بستیاں
سنور رہی ہے ہر کرن
ہمارا اپنا یہ وطن

ہم ایکتا کی جان ہیں
وطن کی آن بان ہیں

یہ پرچم سہ رنگ نے
سدا دیا سبق ہمیں
انہی رنگوں میں زیست کی
دکھائی دی رمق ہمیں
اشوک چکر ساراں
رہے وطن کا کارواں
یہی گہر یہی رتن
ہمارا اپنا یہ وطن

ہم ایکتا کی جان ہیں
وطن کی آن بان ہیں

●●●●●●

بڑھو ایکتا سے

یہ مندر یہ مسجد یہ گرجا یہ دوارا
یہ گنگا کی موجیں یہ جمنا کا دھارا
ہمیں جان سے پیارا ہے سب کچھ ہمارا
لہو دے کے ہم نے وطن کو سنوارا
اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

تھا سولی پہ چڑھنا بھی منظور ان کو
نہ بھایا غلامی کا دستور ان کو
اجل بھی نہ کر پائی مجبور ان کو
یہی شوق رکھتا تھا مسرور ان کو
اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

یہ گوتم کا ملتی کا، میترا کا آنگن
یہ ٹیگور کا روپ غالب کا درپن
یہیں سے ملاتے ہیں گیان کا دھن
اسی کے لیے وقف کرنا ہے جیون
اٹھو! جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو! ایکتا سے وطن کو سنوارو

فقط آج اتنی ہی خواہش ہے سب کی
یہی آپ کے تخلیق و بندش ہے سب کی
اسی واسطے مل کے کاوش ہے اپنی
یہ اہلِ وطن سے گزارش ہے سب کی
اٹھو! جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو! ایکتا سے وطن کو سنوارو

●●●●●

آزادیٔ ہند کی ۴۰ ویں سالگرہ اور پنڈت جواہر لال نہرو کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں "قومی تقریبات کمیٹی" کا اجلاس ۱۷ جولائی ۱۹۸۶ء کو "وگیان بھون"، نئی دہلی میں ہوا تھا۔ گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان اس اجلاس میں موجود تھے۔ زیر نظر تصویر میں گورنر مہاراشٹر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اگست کرانتی میدان (گوالیا ٹینک) بمبئی کی یادگار پوتر سرزمین جہاں پر ۹ اگست ۱۹۸۶ء کو (شہیدوں کے دن) مہاراشٹر کے شہیدوں کے سرزمین کی مٹی جمع کی گئی اور آزادیٔ ہند کی چالیسویں سالگرہ کی تقریبات کی ابتدا کی گئی۔ قوم کے نام "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ اسی مقدس مقام سے جدید ہندوستان کے بانی مہاتما گاندھی نے ۴۵ سال پہلے دیا تھا۔ تقریبات سے قبل وزیر اعلیٰ شری۔ ایس۔ بی۔ چوان نے یہاں کا دورہ کیا تھا تاکہ بچشم خود وہاں کئے جانے والے انتظامات ملاحظہ فرمائیں۔ زیر نظر تصویر میں پروفیسر رام میگھے وزیر برائے تعلیم، چیف سکریٹری شری کے۔ پی۔ پرابھو، پبلک ورکس کے سکریٹری شری آر۔ ٹی۔ اترے، سکریٹری برائے اطلاعات شری وینکٹیش، افضل پونکر، سکریٹری برائے تعلیمات شری مقصودن کو لہاٹکر اور دیگر حضرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء کو
وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان نے پنڈھرپور کے مشہور شری وٹھوبا کے بُت کا ایک مجسمہ صدر ہند شری گیانی ذیل سنگھ کی خدمت میں اس وقت پیش فرمایا جب صدر ہند نے ناندیڑ کے مشہور گردوارہ کی زیارت فرمائی تھی۔ تصویر میں صدر ہند شری گیانی ذیل سنگھ۔ وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر ایس۔ ڈی شرما اور شری اشوک ممبر پارلیمنٹ دیکھے جا سکتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان نے دس لاکھ روپے کا ایک چیک شری آر ایس گاوئی چیرمین ڈاکٹر امبیڈکر میموریل کمیٹی کو ناگپور میں ڈاکٹر امبیڈکر کی مرکزی یادگار کے سلسلے میں نئے ودھان بھون میں ۲۴ جولائی ۱۹۸۴ء کو عطا کیا۔

آہ! ماہرِ طیور سالم علی

پرندوں کی انواع و عادات کے ماہر سالم علی کا ۲۰ جون کی رات بمبئی کے مشرقی شمالی باندرہ میں اپنے ایک رشتہ دار کی رہائش گاہ پر پیرانہ سالی کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ آپ کی تدفین چرنی روڈ کے قبرستان میں ہوئی۔

ہندوستان کے "برڈ مین" (ماہر طیور) ۹۱ سال کے تھے انکی بیوی پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھی۔

پرندوں سے سالم علی کی دلچسپی انکی چچا کی مرہون منت ہے اور بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر لرڈ انھیں پرندوں کی دنیا میں لے آئے۔

۱۹۱۸ء میں بمبئی واپس آ کر انھوں نے تہمینہ سے شادی کر لی جنھوں نے پرندوں سے سالم علی کی دلچسپی میں نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اس کام میں ان کا ہاتھ بھی بٹایا۔

شادی کے بعد انھوں نے یہاں کے سینٹ زیویرس کالج سے زولاجی میں باقاعدہ ڈگری لی اور بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی سے منسلک ہو گئے۔ سالم علی نے اپنی ساری زندگی طیور کے علم اور اس کی حفاظت میں صرف کر دی جس کے لیے "پدم بھوشن" (۱۹۵۸ء) اور "پدم وبھوشن" (۱۹۷۶) کے علاوہ متعدد دیگر انعامات ملے۔

بمبئی میں اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران سالم علی کی ملاقات ہندوستانی جد و جہد آزادی کے رہنماؤں سے ہوئی جس میں سروجنی نائیڈو مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی شامل تھے جب وہ ارون اسٹریسمین کی ماتحتی میں عملی ٹیکسا نومی میں تربیت کے لیے برلن گئے تو وہاں انکی ملاقات فریڈم فائٹرس کے ایک جتھے سے ہوئی جنھیں چمپاکرمن پلائی اور راجہ مہندر پرتاپ شامل تھے۔

۱۹۲۰ میں وہ بمبئی واپس آ گئے آئندہ ۲۰ برسوں تک ملک کے کونے کونے کا چکر کاٹتے ہوئے پرندوں کی نقل و حرکت اور عادات و اطوار کا جائزہ لیتے رہے ان کی دلچسپی صرف پرندوں ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ انھوں نے پوری آغوش فطرت کا مشاہدہ کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان کے اثرات سے اقوام عالم کو روشناس کرایا۔

سالم علی نے اپنا کام حیدرآباد سے شروع کیا جہاں وہ مختلف پرندوں کی تصاویر اور عادات و اطوار کا جائزہ لیتے رہے یہاں سے ۱۹۳۲ میں انھوں نے نیلگری کی پہاڑیوں کا رخ کیا۔ ان برسوں میں انھوں نے مختلف طیور کی افزائش نسل، گھونسلوں کی ساخت، شکار کرنے اور شکار ہونے سے بچنے کے مختلف عادات و اطوار کا جائزہ لیا۔

اندور، گوالیار، بھوپال اور جوناگڑھ کے والیان ریاست کی فرمائش پر انھوں نے مختلف طیور کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جو بعد میں ان کی کتابوں کی زینت بنیں۔ ان کتابوں میں "دی بک آف انڈین برڈس" اور "دی ہینڈ بک آف انڈین برڈس" بہت مشہور ہیں۔

اول الذکر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی جو فطرت سے متعلق ہندوستان میں ایک سنگ میل شمار کی جاتی ہے اور جس کی پچاس ہزار کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ موخر الذکر دس جلدوں میں ہے جسے مکمل کرنے میں ۲۰ سال کا عرصہ لگا اور جس کی طباعت آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی مدد سے مکمل ہوئی۔

اپنی خود نوشت سوانح حیات "فال آف اے اسپیرو" میں جو ۱۹۸۵ میں شائع ہوئی۔ سالم نے پرندوں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کی دلچسپیاں بیان کی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور دوسری جنگ عظیم نے پہلے یورپ اور پھر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اس لیے انھوں نے دہرہ دون کی رہائش ترک کر دی اور واپس بمبئی چلے آئے اور پالی ہل باندرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۷ میں سالم علی بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے رسالہ کے ایڈیٹر اور بعد میں سوسائٹی کے سکریٹری بن گئے۔

ڈاکٹر سالم علی کی نماز جنازہ مولانا شوکت علی روڈ پر بدر باغ میں سلیمانی جماعت کے پیشوا جناب ملا عرفان نے پڑھائی۔ بدر باغ میں ڈاکٹر سالم علی کے تئیں اظہار عقیدت پیش کرنے والی معزز ہستیوں میں وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی چوان، پولیس کمشنر شری ڈی ٹی سومن اور پرنس آف ویلز میوزیم کے ڈائرکٹر شری ایس گورکھشکر شامل تھے۔

ڈاکٹر سالم علی کی موت پر جو راجیہ سبھا کے ممبر اور بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے صدر تھے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی اور دیگر ممتاز ہستیوں نے تعزیتی پیغامات روانہ کیے۔ ان کے جسد خاکی پر مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر ایس ڈی شرما کی جانب سے گلہائے عقیدت نچھاور کیے گئے۔

حسینی جاوید
جاگیردار باؤنڈری، اسٹیشن روڈ (روبرو آرٹی او آفس)
اورنگ آباد (۴۳۱۰۰۱) مہاراشٹر
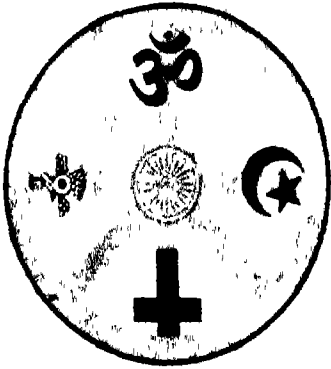
NATIONAL INTEGRITY

قومی یکجہتی اور ہندو مسلمان

جب کبھی، جہاں کہیں فساد ہوتا ہے، میرا دل مچل جاتا ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا کرتا ہے۔ کیا ہو گیا ہے ان انسانوں کو جو انسانیت کے گن بھی گاتے ہیں اور فسادات میں اپنے چہروں سے نقاب بھی الٹ دیتے ہیں فسادات ہوتے ہیں تو میرا دل اس لئے نہیں مچلتا کہ کسی خاص فرقے کی تباہی و بربادی کا مجھے اندیشہ رہتا ہے، بلکہ اس لئے کہ فسادات انسانیت کے لئے چیلنج ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اسی انسانیت کی چاہت میں بے تاب ہوا جاتا ہوں ؎

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا (ناسخ)

کاش کوئی سمجھے کہ انسان کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا
یت ہوتی ہے۔ انسان انسان کا جب خون کرتا ہے تو درحقیقت
خود پر ظلم کرتا ہے یہ کتنی بڑی جہالت ہے کہ ایک انسان
سرے انسان کا خون کرے اس کا مال و اسباب لوٹے اور
ھر یہ سمجھے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ٹھیک ہی کیا۔ یہ احساس
قدر بھیانک اور ظالمانہ ہے کہ ایک انسان بحیثیت ہندو یا
لمان ایک دوسرے سے اس حد تک نفرت کرے کہ زندگی کی کوئی
ر و قیمت ہی باقی نہ رکھے۔ زندگی بڑی قیمتی شے ہوتی ہے اس کی
الی کا تصور تو صرف درندوں کے یہاں ملتا ہے۔ ہم انسانوں
یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہم انسان انسان سے ہٹ کر صرف ہندو مسلمان
گئے ہیں ہم ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو ہندو اور مسلمان
حیثیت سے کیوں ملتے ہیں کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ ہم انسانوں کی
طرح کیوں نہیں ملتے ہم بھارتی کی طرح اپنے تعلقات کو پروان کیوں نہیں چڑھاتے؟ آخر ہماری زندگیوں میں یہ زہر کس نے گھولا ہے؟ ان پاپیوں کے عزائم کو ناکام بنانے میں ہم نے ابھی تک کیا کیا ہے؟

یہ ایسے سوال ہیں جو اکثر میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں لیکن افسوس کہ یکجہتی اور ہم آہنگی کی برقراری کے لئے وہ کام نہیں ہو پا رہے ہیں جن کی موجودہ دور میں شدید ضرورت ہے۔ فرقہ پرست، انتشار پسند، اور انصاف دشمن طاقتیں برابر پروان چڑھ رہی ہیں ایسے لوگوں کو مسلسل تقویت حاصل ہوتی جا رہی ہے جو صرف ہندو اور مسلمان کی حیثیت سے سوچتے ہیں اسی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کے بھرپور جتن کیا کرتے ہیں۔ اپنے مذہب پر چلنا برا کام نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ برا ہوتا ہے کہ کوئی اپنے مذہب کے لئے کام کرے بلکہ برا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کے

پیروؤں کو نفرت کی نظر سے دیکھے اور انھیں تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے اور اس پر عمل کرے میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی نہ تو سچا مسلمان ہو سکتا ہے نہ ہی سچا ہندو اور نہ ہی وہ ایک اچھا بھارتی یا ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

تیری چھایا دھرتی سمندر
جس کی موجیں مسجد مندر
دونوں کی ہے گونج برابر
اللہ اللہ، ایشور، ایشور
(آرزو لکھنوی)

کسی مذہب نے بھی نفرت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ ہر مذہب اتحاد و یکجہتی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانیت اور مساوات پر زور دیتا ہے۔ ظلم و بربریت کو کسی مذہب نے بھی پسند نہیں کیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ترجمہ

* یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ خدا ظالموں کے کام سے بے خبر ہے۔
(پارہ ۱۳ سورہ ۱۴ آیت ۴۲)

* خدا کو فساد پسند نہیں
(پارہ ۲ سورہ ۲ آیت ۲۰۵)

* ملک میں امن و امان قائم کرو
(المائدہ ۳۳)

* آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساری دنیا کی بھلائی کے لئے کام کیا۔
(یونس ۱۰۸، الانبیاء ۱۰۷، البقرہ ۲۱)

سنتوں، صوفیوں اور سکھوں کے گروؤں سبھی نے تو نفرت و انتشار کو سخت ناپسند کیا ہے۔

* وہی شخص سچا ہندو یا سچا مسلمان ہے جس کی نیت شک و شبہ سے بالاتر ہو۔

سنت ملوک داس نے کہا ہے کہ میرے لئے جو غیر مرئی نیت ردھا ہے وہی اللہ وہی برہم وہی خالق ہے، وہی خدا ہے مجھے تو فرق نظر نہیں آتا۔ فرق تو مایا سے پیدا ہوتا ہے۔ رام میری جان ہیں رحمٰن میرے دین و ایمان ہیں۔ میں تو اب سارا فرق بھول گیا۔

* الکھ اللہ، برہم خالق خدا ہے ایک
میرے تو ابھید بھاؤ یا متی کھوئی ہے
رام میرے پران رحمان میرے دین و ایمان
بھول گیو بھیا سب لوک لاج دھوئی ہے

مہاتما گاندھی نے تو اتحاد و یکجہتی کی خاطر بڑی قربانیاں دیں ہیں ان کا کہنا تھا کہ۔

* مذہب انسان کو علیحدگی نہیں سکھاتا بلکہ یکجہتی کا درس دیتا ہے۔

* تمام مذاہب کی ایک ہی منزل ہے۔

انھوں نے نہ صرف ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد کی تھی بلکہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتیوں کی فلاح و بہبود اور یکجہتی کے لئے بھی تاریخ ساز اور مثالی کام انجام دئے تھے یہی وجہ ہے کہ انھیں "باپائے قوم" کہا جاتا ہے آج باپائے قوم کے بتائے ہوئے راستوں کو نظر انداز کر کے نفرت و حقارت کی خار دار راہوں کا تعین کیا جا رہا ہے ہم ان کے تصاویر کو گھروں کی زینت بنا چکے ہیں مگر ان کے پیغام کو فراموش کر چکے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ چلو باپائے قوم کو خراج عقیدت پیش کر دیا گیا ہے مگر یہ نہیں دیکھا کہ فسادات میں متعدد انسانوں کے قتل سے باپائے قوم کی روح پر کیا گذر رہی ہوگی۔ کیا ہم اس طرح کے قتل و خون کو روک کر "باپائے قوم" کی آتما کو شانتی نہیں پہنچا سکتے؟ کیا ہمارے لئے یہ کام اہم نہیں ہیں؟

ہم سب کو سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے پر غور کرنا ہوگا۔ یقیناً ہندو اور مسلمان ہو سکتے ہیں لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہم انسان بھی ہیں۔ بھارتی بھی ہیں۔ ہم مسلمان یوں ہیں کہ دوسروں کے لئے وہ کچھ پسند کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں ہم ہندو اس طرح ہیں کہ تمام لوگوں کو بھگوان کے مانند سمجھیں۔ یہی تو بھگوان کی حقیقی پوجا ہوگی۔ ہم اپنے درمیان خلیج حائل کر کے آخر کس بھگوان یا خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں کبیر نے سچ ہی کہا ہے۔

* اگر اللہ مسجد میں رہتا ہے تو باقی دنیا کس کی ہے۔ اگر رام مندر کی محض مورتی میں رہتا ہے تب وہ کون ہے جو مورتی کے باہر کا کاروبار چلا رہا ہے۔

ہم سب کو آخر کیا ہو گیا ہے ہم کیوں یہ بھول گئے ہیں کہ ان

سے محبت ہی خدا یا بھگوان سے محبت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے خدا یا بھگوان کو سمجھا ہی نہ ہو؟ سجدہ یا پوجا کرکے ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ خالق ہمارے اس عمل سے خوش ہو گیا ہوگا؟ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ہماری بڑی بھول اور بے وقوفی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بے وقوفوں اور بھولنے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ یہ جو مذہب کے نام پر کھیل ہو رہا ہے اسے "احمقوں کی آرزو" ہی کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس طرح خدا یا بھگوان کو خوش کیا جا رہا ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہوتی۔ بھلا خالق اپنی مخلوق کے قتل پر کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی انسان اپنے بنائے ہوئے گھر کو تباہ کرکے مسرت حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کے ٹکڑے کرکے خوشی محسوس کر سکتا ہے؟ کیا کوئی صانع اپنی مصنوعات کو بگاڑ کر مسرور ہو سکتا ہے اگر ایسا نہیں ہو سکتا ہے تو پھر وہ رب وہ خالق وہ بھگوان وہ پرماتما کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟

یہ سیدھی سادھی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں کیوں آتی؟ دراصل اشتعال دلا کر لوگوں کے جذبات سے کھیلنا بظاہر آسان بات نظر آرہی ہے۔ عقل کے اندھے جب میر کارواں بن جاتے ہیں تو وہ اپنے پیرو کاروں سے اسی قسم کے کام لیتے ہیں۔ انھیں نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تشدد کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ ان کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ پلٹا جاتا ہے اور ہمنوائی کی ساری تدبیریں کر لی جاتی ہیں۔ بالآخر آگے چل کر لوگ جذباتی انداز میں سوچنے کے عادی ہو جاتے ہیں ماحول بن جاتا ہے اور معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا کر نفرت کے یہ سودائی اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی کو آج ہم عوامی زبان میں فساد کہتے ہیں۔

اس طرح یہ معلوم تو ہو گیا کہ فساد کس طرح اور کیوں ہوتے ہیں۔ اب آیئے ملک پر ان فسادات کے اثرات کا مختصراً جائزہ بھی لے لیں۔ فسادات درحقیقت ملک کے ماتھے کا ایک بدنما داغ ہیں۔ ان سے نہ صرف ترقی رک جاتی ہے بلکہ جب جب فساد ہوتے ہیں ملک کئی برس پیچھے چلا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں فسادات کی وجہ سے ہمارا وقار مجروح ہو رہا ہے باہر کی دنیا سوچتی ہوگی کہ ہندوستان جسے جنت نشان بھی کہتے ہیں اور جہاں "اہنسا اور عدم تشدد" کا بول بالا ہونا چاہئے۔ آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" والی پالیسی کے شکنجے سے آزاد نہیں ہو سکا ہے اور یہ بات ہر ہندوستانی کو خاص کر نئی نسل کو سوچنا چاہئے اور ایسا ماحول پیدا کرنا چاہئے کہ ملک ترقی کر سکے۔ خوشحال بن سکے۔ قومی یکجہتی اور قومی ایکتا ہی اس کا تعمیری حل ہے جس کیلئے ہمارے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کوشاں ہیں اور یہی راہ آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے دکھائی ہے جس پر چل کر ہم سب صحیح معنوں میں دنیا کی اس عظیم ہستی کو خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ ••

اسحٰق ملک
انجمن تعمیرِ ادب آندھرا پردیش، فرینڈس ریڈنگ روم
۲۲-۱-۸۶۳ سلطانپورہ، حیدرآباد ۲۴ (اے پی)

آہ! خواجہ احمد عباس

یہ کون آیا ہے یادوں تک
یہ کس کا ذکر نکلا ہے
وہ بحرِ علم و دانش کا گہر تھا
جسے کھویا ہے ہم نے
اسے پابندیاں حد بندیاں بے چین کرتی تھیں
بہاریں اس کے طرزِ فکر میں سو رنگ بھرتی تھیں
وہ اک جادو جگاتا تھا۔
نگارش جس پہ حیراں تھیں
اسے ہم خواجہ احمد عباس کہہ کر نام لیتے تھے۔
وہ تھا اک پیکرِ عظمت
وہ تھا اک ملک کی دولت
اسے ہر شعبۂ صنفِ ادب سے آشنائی تھی
کہانی، ناول، افسانوں سے فلموں تک رسائی تھی
قلم آزاد تھا جس کا
نظر بے لوث تھی جس کی
وہ ہم میں اب نہیں لیکن اسے ہم یاد آئیں گے
ادب کے باغباں اس کو سدا آباد رکھیں گے

خواجہ احمد عباس

راجندر سنگھ بیدی

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسے ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بزرگ اور پیش رَو مانا اور یوں احترام کرتے ہوئے ٹال دیا کچھ اسی قسم کا سلوک انھوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ ادبی سلسلے میں بار ہا میری پیٹھ ٹھونکی تحریری طور پر مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد ٹکسال باہر کر دیا۔ حال ہی کی بات ہے جب کہ میں نے انھیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تو بلا تکلف انھوں نے مجھ سے پوچھا تم رہتے کہاں ہو؟

عباس صاحب کی ہمدمی کا شرف کبھی مجھے حاصل نہیں ہوا جس میں میرا قصور ہے تو ان کا بھی۔ میرا خیال ہے انھوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب امتیازی نظر یہ سے نہیں کیا۔ ایک واضح ارادے سے کسی صحیح آدمی کو تو قریب لانے کی کوشش نہیں کی۔ جی ہاں صحیح آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ خود اپنی طرف ہے تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو نقد و نظر سے عباس صاحب کی بہتری کا سامان کر سکتے تھے اور خود بھی ان سے سیکھ سکتے تھے جو بھی ان کے پاس آیا انھوں نے آنے دیا ہی نہیں جو ان کے پاس سے گیا اسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی پیر مغاں تھے اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے حسنِ سلوک نے ہمیشہ کے لیے انھیں بنا دیا، ورجانے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟

اس مودب فاصلے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کی ہم عصری کا فخر حاصل ہے جس سے ہمدمی اور دوستی کہیں دور کی بات نہیں پھر تھوڑا جاننے والوں میں اتنا انکسار تو ہوتا ہے کہ وہ کسی کو جاننے کا حتمی دعویٰ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی دور بھی۔

زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ایک ہی سی رہی ہو جس کی وجہ سے وہ بہت سے جرائم نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنے فزیالوجی کے محدود علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری اڈیشن کا پیپر بیک ہوں گے۔ اور کچھ نہیں تو پچھلے ۲۵ برس سے تو میں ان کا منہ دیکھ رہا ہوں جہاں ذہنی طور پر ان کا قد بڑھا ہے جسمانی طور پر آپ وہیں کے وہیں رہے ہیں چہرے پر جس فہم و فراست کے نشان پہلے تھے وہی اب بھی ہیں ویسے ہی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پر پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی تحریر جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ جو خفگی یا کھسیانے لمحوں میں کچھ اس طرح سے ملتے ہیں کہ انھیں بھڑ بھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی بے ساختہ ہے مگر شیمی جسے استعمال کرتے ہوئے وہ یکایک ہی رک جاتے ہیں۔ معتبر آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے!۔۔ سر پر کے بال پہلے ڈھائی تھے اب دو رہ گئے ہیں اس کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ کئی دفعہ میں نے انھیں کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ لباس میں سادگی ہے اور استغنا کا فن بھی۔ ان کی عام نشست و برخاست کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں تاکید تکلفات پر نہیں کچھ اور ضروری باتوں پر ہے جس میں ادب، صحافت، فلم سیاست، اور دوسری بیسیوں قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انھیں اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے

درمیان چننے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً عرب جمہوریہ کو چنیں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیروی کریں گے لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے بن گورین سے ملے گی۔

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کا ایک حصہ تھے جس کے ایک جلسے میں، میں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔

ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ایئر تھیٹر قائم ہوا تھا جہاں خوب ہی ہنگامہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ نہیں تو اردھ کمبھ ضرور ہے چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکے پڑے۔ خیر دھکوں کی بات چھوڑیے وہ تو زندگی کا حصہ ہیں ہم سب دھکے کھاتے ہیں کبھی مل کر کبھی الگ الگ، ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں مہاکوی ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا تو اس سے بھی برا سلوک ہوا بھگدڑ رہی سیکڑوں پیروں کے نیچے دلا گیا جب بھی میں نے یہی سوچا تھا کہ کیا بڑے آدمی کو دیکھنے کے لئے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس لئے نہیں کہ باقی کے فضول اور بیکار قسم کے لوگ تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے اور سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے جیسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے ..... اور وہ آزادانہ ہالوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جلتے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا عباس صاحب کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے ایسا کریں گے تو ان کا اپنا دل ٹوٹ جائے گا اس عمل میں انھیں کتنا جھوٹ بولنا کتنا ہی وقت ضائع کرنا پڑا وہ اس بات کو بھول گئے اور آج تک بالعموم بھولے ہوئے ہیں کہ جب تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے بات کیسے بنے گی۔ (دل بدست آور کہ حج اکبر است)

جب عباس صاحب کے چہرے پر ایسی ہی طمانیت برستی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ بعد میں وہ "آزاد فلم" ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو "آزاد فلم" ایک نقطہ اور بھی کم ان کے چہرے پر سب سے اوپر عقیل اور آزادروی کے نقوش تھے اس سے نیچے پی سی جوشی کی پارٹی لائن اور سب سے نیچے مہاتما گاندھی کی "تلاش حق"، پوری کی پوری جو چھپاکر سب سے اوپر چلی آتی تھی۔

اسی دن مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لئے اس سے ذاتی طور پر مل لینا ضروری ہے اسے چھو کر دیکھنا لابدی ہے چاہے وہ ہاتھ ملانے ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح کا انسان ہے صرف اس نے زندگی کے خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت اور ریاضت کی ہے اور ہم نے نہیں کی۔ کریں تو ذہنی طور پر بھی ہم ان سے ہاتھ ملا سکتے ہیں ورنہ ہم اپنے ذہن میں ایسے آدمی کو کچھ ایسے مافوق الفطرت انتسابات دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں وہ بامن اوتار سو گز کا معلوم ہونے لگتا ہے پھر اسے انسان کی تربیت میں دیکھ کر عام انسانوں کی سی حرکتیں کرتے پاکر ہمارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے جس میں اس بیچارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں۔ ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ عباس صاحب سے مصافحے کے بعد کم از کم ایک بات کی تسلی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور پر ان کا قد مجھ سے بڑا نہیں البتہ رنگ گورا ہے لیکن کبھی تو افریقی قومیں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھیں گی اور گوروں کا جوا اتار پھینکیں گی۔ (چنانچہ آج ہی میری پیشین گوئی کتنی پیغمبرانہ ثابت ہو رہی ہے) ..... رہی ذہنی قد کی بات تو ورزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی جس کا مجھ پر بہت رعب پڑا تھا۔ لائم اور فلا ہرٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ خوبصورت افسانے لکھے تھے لیکن عباس صاحب کا افسانہ "ابابیل" ان پر بیس تھا۔ جب میں ڈاکخانے میں بابو ریک نقطہ بیٹھ یا بوشودم تھا اور میرے نزدیک کاؤنٹر پر منی آرڈر بک کر دینے سے لے کر عباس صاحب تک سب انگریز وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے لکنت سے پٹی زبان میں افسانے کی تعریف شروع کی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر انکسار میں ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے اور میں بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی "ایک پاؤلی چاول" کی بھی تعریف کرنا ہے۔ میں خود بھی اپنے افسانوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں کس قدر گرا پڑا ہوں گا کہ انکسار ان دنوں میرے لئے بہت بڑی عشرت کی بات تھی جیسے عباس کی تعریف میرے نزدیک بہانہ محض تھی اپنی باتیں کرنے کے لئے۔ جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے اس وقت جانے

بوجھے بغیر انھوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصہ مجھے بھی دے دیا ہے۔ میں گورا نہیں ہوا تو لمبا ضرور ہو گیا ہوں۔

اور یہ عباس صاحب میں امتیازی بات ہے۔ ادیبوں میں (میرے سمیت) کم آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں گے اور دوسروں کی باتیں زیادہ۔ ایک دوسرا شخص جو لوگوں کو بظاہر "انا" سے معمور معلوم ہوتا ہے وہ ہے اپندر ناتھ اشک۔ میں جب کبھی ان سے دوستوں سے ملا ہوں مجھے پتہ چلا ہے کہ ادب کے آسمان پر کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے یہ اسی کا تذکرہ کرتے ہیں اس کی چیزیں پڑھ کر سناتے ہیں یا پڑھواتے ہیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے ہیں۔ کہ وہ ستارہ ابھی طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں ڈر، محض ڈر کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں چونکہ ڈر کوئی اثباتی جذبہ نہیں اس لئے یا تو وہ ادیب مجھے تالستائی اور چیخف سے بھی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے اور یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا۔ میری طرح کے جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے اور بھی بہت سے ادیب ہیں لیکن ایک فرق ہے میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں اور اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن ان میں سے اکثر جانتے ہیں نہ کوشش کرتے ہیں۔ خیر وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے اور میں اپنے آپ سے مایوس نہیں۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور اشک میں "انا" نہیں ارے صاحب ہے اور بہت ہے۔ لیکن اسی قدر جس قدر کہ تخلیقی عمل کے لیے ہونا چاہئے اور وہیں جہاں اسے ہونا چاہئے جیسے اکثر لوگوں کا "سیکس" تمام تر سر میں ہوتا ہے اور ایک معزز خاتون کے مطابق ـــ وہاں نہیں جہاں اسے ہونا چاہئے۔ عباس صاحب میں "انا" اتنی ہی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں۔ دوسروں سے الگ اور دوسروں کے بیچ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ساتھی لکھاڑ ہی بہت ہیں۔

میں نے عباس صاحب کے بہت سے افسانے پڑھے جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گیا۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رہا ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں اس سے بہت بلند ہے جس کی تفصیل یا بحث اس مضمون کا حصہ نہیں۔ ... . عباس صاحب کا افسانہ "بارہ بجے" تو میں بھول ہی نہیں سکتا ایک تو اس لئے کہ اس سے براہِ راست میرا تعلق ہے (اگرچہ میں داڑھی کاٹنے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لئے کہ یہ افسانہ پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھا جن سے میں بھی گذرا ہوں اور ریل کی چھت پر ننگے بدن بیٹھ کر تقسیم کے وقت ہندوستان پہنچا ہوں اس افسانے میں عباس صاحب نے اپنے ہی طرز کی حسابی مساوات میں برابر کے سکھ اور مسلمان مارے تھے لیکن اس پر بھی سکھوں کو تسلی نہ ہوئی اور مجھے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں بیان دینا پڑا۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی۔ اب آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے ان کی فلمیں دیکھی ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ میں نے اچھا کیا یا بُرا؟

جب تک عباس صاحب انڈین پیپلز تھیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کا کلاسیک "دھرتی کالال" بنا چکے تھے ـــ نہ صرف یہ کہ "دھرتی کے لال" پہلی ہندوستانی Realistic فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور بیرون ملک کے باشندوں کی توجہ اس المیے کی طرف دلائی جس کا نام اس زمانے کا ہندوستان تھا "آجکل" بھی تکمیل پا چکی تھی اس میں عباس صاحب کے ان افسانوں، ناولوں کی قسم کا ایک پیغام تھا جو تائید کی کثرت سے پیغام نہیں رہ جاتا آدمی کو چڑا دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھنا چاہتا۔ "انہونی" پہلی غیر جانبدار فلم تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی عباس صاحب اس کے راہبر تھے اور راہی بھی۔ کبھی انھیں اس تحریک کی زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر کمی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب کہ غریبوں اور ناداروں کے حق میں ایک مبلغ کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی مینڈیٹ کے مطابق تحریک سے عاق کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں تب میں نے پہلی مرتبہ عباس صاحب کو اس قدر غصے میں دیکھا جب ان کے ہونٹ بھنچ بھی رہے تھے اور پھڑپھڑا بھی رہے تھے چہرہ لال اور ہاتھ وہ تیز تیز باتیں کئے جا رہے تھے۔ آواز جو پہلے ہی کھسیائی ہوئی تھی اور کھسیا گئی لیکن پانی پت کا ہونے اور اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے کے باوجود عباس صاحب کے منہ سے ایک بھی گالی نہ نکلی کیونکہ وہ تہذیب کا تقاضا نہ تھا۔ ان دنوں ہم "چور" کا رول ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف پلڑا بھاری ہو جھک جائیں کچھ ہمت اور شخصیت کی کمی اور کچھ دماغی ابطال۔ بس جو اسٹالن نے کہہ دیا

خواجہ احمد عباس (۱۹۴۵ء)

وہ آسمانی صحیفہ ہے کبھی کبھی محسوس کرتے تھے کہ یہ سیل (۱۹۷۷ء) کیا بلا ہے؟ جس میں بیٹھے ہوئے لوگ عالم کل ہیں۔ ہمیں سے بغیر ہی ہماری قسمت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے ورنہ آپ تحریک سے خارج، حالانکہ آپ کی تحریک کا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں کم از کم براہ راست نہیں۔ اس پہ طرفہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں بچ بھی نکلتے ہیں کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں۔ کمیٹی کا ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ پنچ پرمیشر ہوتا ہے پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان پنچوں میں ایک ادیب قسم کا بھی آدمی ہوتا ہے ایسا آدمی جو ادب اور فن اور اس کے عوام کے لئے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب حدیں جانتا ہے اور پھر اس قدر لوچ بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر کبھی معافی مانگ سکے ...... میں تو اپنی ناسمجھی اور کمزوری کی وجہ سے خائف تھا لیکن دوسرے بھی خاموش تھے جو مجھ سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ عباس تھا جیسا کہ منہ پر کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کا تذکرہ کر کے خوش ہوتے تھے اپنی ہمت پہ خود حیران لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی تحقیق کی بہ نسبت اپنے جذبے پر یقین تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسٹالن سے لے کر کیفی اعظمی تک اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے بلکہ اس لئے کہ حقیقت پر پہنچنے کے لئے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔ محبت ... جسے صحیح آدمی خود بھی شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سرکس کے روپ واکر کی طرح زندگی کے رستے پر اپنے آپ کو فکر اور جذبات کے درمیان متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال اپنے آخری تجزیے میں وہی کسوٹی نسبتاً ٹھیک اترتی ہے کیونکہ اس کے پیش نظر ادب اور سیاست ریاضی کے گنجلک سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان کے سیدھے سادھے مسئلوں کی توضیح و تفہیم اسٹالن کے برجز کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نہ چاؤ ماؤ کی طرح ہندوستان پر حملے کی تاکر دیں کے کان ہوں . . . چنانچہ ان سب باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے رستے سے نہ ڈگمگائے لیکن جب تک بقول شخصے بہت سا پانی ہمارے دریاؤں میں بہ گیا تھا۔

ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی مقصدی ادب کے قائل ہیں اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ کو ہم آہنگ کر کے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا بلکہ شور . . . عباس صاحب کے کئی افسانے اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو موثر نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو کردار کے اعتبار سے سخت خارجی ہنگامی پہلو لئے ہوئے جس کے باعث اس کی گونج جلد ہی معدوم ہو جاتی ہے لیکن ان کے مقصد اور دوسروں کے مقصد میں بھی فرق ہے انھوں نے لڑکی کے سہارے تو ایک طرف لکڑی کے سہارے بھی انقلاب تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس عمل میں بہت سوں کی طرح منقلب ہوئے ہیں۔ نہ انھوں نے زبان اور جمالیات کو اپنے معنی پہنائے ہیں بلکہ اپنے مقصد کی جستجو میں کچھ یوں سیدھے گئے ہیں کہ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھا حالانکہ نظروں سے راستے کی تزئین کرتے جانا عین فن ہے ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے عباس صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ انھیں ایک کام تھوڑا ہی ہے؟ سیکڑوں ہیں ان کے پاس وقت نہیں اور زمانہ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنسی عمل ہے میں اس بات کو فلسفیانہ سطح پر لاتے ہوئے عرض کروں گا کہ وقت کو تھامنا ہی پڑے گا ورنہ ہم کچھ نہیں کرسکتے جیسے ہمارے بڑوں نے منتروں کے ذریعہ گویائی تھام لی تھی اور نجومی اختیار کر کے کالی بھگوان کی مار سے بھی پرے چلے گئے تھے اسی طرح کا عمل ہمیں بھی روا رکھنا ہوگا۔ ہم ادیبوں کا داستاک اور ہمارا راکٹ یہی ہے کہ جس پر سوار ہو کر مہر و ماہ سے بھی اوپر جاسکتے ہیں . . . . ایک دن آئے گا جب کہ جدلی مادیات کے دعویداروں کو بھی مقصد کی تحلیل اور اس کے اندرونی تضادات کو خاطر میں لانا پڑے گا۔

حضرت جگر مرادآبادی کی زیر صدارت قیصر باغ ڈونگری بمبئی میں منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ ۱۹۴۶ء کی ایک یادگار تصویر۔ خواجہ احمد عباس اپنی نظم سناتے ہوئے اور کرسئ صدارت پر حضرت جگر مرادآبادی ہمہ تن گوش ۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی بیگم۔ مرحومہ بھی ایک نہایت پیار کرنے والی عورت تھیں ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں ۔ جوہو میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا۔ عباس صاحب کا گھر راستے میں پڑتا تھا کبھی ان کے یہاں رکتا تو وہ بڑی شکایت کرتیں کہ قریب سے گذر جاتے ہو، آتے تک نہیں ۔ ان کی وفات سے ہمیں قلق ہے تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جنسی زندگی کے بارے میں عباس صاحب کا نظریہ ایک عام نارمل مہذب آدمی کا نظریہ ہے وہ زندگی کے اس حصے کو بالکل منفرد سمجھتے ہیں۔ انگریزی قول کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے پبلک میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں۔ مطلب اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو ... (ضرور ہوں گے)

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے وہ انکے کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت و قوت ۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ قومی یا بین الاقوامی سطح پر فلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ بلٹز کا آخری صفحہ تو بہرحال لکھنا ہی ہے لیکن ساتھ ہی خرد شچوف کی سوانح بھی

ہوگئی۔ پنڈت نہرو سے بھی مل آئے جن سے عباس صاحب کے ذاتی مر
ہیں پھر ۳۵ لاکھ کمیٹیوں کا ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے
اور یہ بات ممبر شپ ہی تک محدود نہیں ہر جگہ پہونچیں گے بھی تقریر
کریں گے۔ پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے تین آدمی دکھا
دیتے ہیں۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو۔ دوسرے بمبئی کے ڈا
بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس۔ جن میں یہ قوت اور استعداد
عام آدمی کی نہیں۔ چنانچہ جب ایک بار میں نے عباس صاحب کے سا
اس حیرت کے جذبے کا اظہار کیا تو انھوں نے معمول کے رسمی انکس
ٹال دیا اور بولے "جبھی تو ہر بات میں پتلا پن ہے" اور پھر مسکرا کر
طرف دیکھتے ہوئے بولے " آجکل کیا لکھ رہے ہو،،
بیچ میں کسی صاحب نے ٹوک دیا اس لئے عباس صا
میری آنکھیں نہ دیکھیں جو نمناک ہوگئی تھیں ان سے میری پہلی ملاقا
اور اس ملاقات میں بیس پچیس برس کا وقفہ آچکا تھا اور میں ا
بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔
(تحریر دسمبر ۸۲ء)

تشریف لائیں اور انھوں نے مجھے "آئی ایم نائٹ این آئی لینڈ" کی ایک جلد دی۔ آٹوگراف کے لئے میں نے اس کا پہلا ورق پھٹا ہوا پایا۔

"میرا نام سمرتی سانیال ہے۔ میں لائبریرین ہوں"۔ انھوں نے کہا

میں نے پوچھا "آپ نے یہ کتاب کہاں سے خریدی ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "میری ایک اسٹوڈنٹ ہے ملقیس، اس نے یہ کتاب آج کہیں سے حاصل کرکے لاکے دی ہے۔ بڑے دنوں سے میں تلاش میں تھی۔"

"اس کے کتنے روپے دیئے آپ نے؟"

"بے چاری نے اصل قیمت سے کم ہی میں مجھے دی۔ پچیس روپئے میں مجھے ملی!"

"کہیں سے حاصل کرکے بچاری نے!"

میرا سر گھوم رہا تھا اس میں سے گرم ہوا نکل رہی تھی اپنے نارمل سائز کو واپس آرہا تھا۔ میں نے آٹوگراف کرکے کتاب مس سانیال کو لوٹا دی۔

"آپ کو معلوم ہے یہ کتاب کل میں نے ملقیس کو تحفے میں دی تھی؟"

"جی ہاں وہ بہت شریر ہے۔ کوئی بھی شرط کرلیتی ہے تو اسے پورا کرکے ہی رہتی ہے"

"کیا شرط کی تھی اس نے؟"

"وہ آپ سے کتاب مفت لے کر ہی آئے گی اور لائبریری کو پچیس روپے میں دیدے گی۔"

"کس سے شرط کی تھی؟"

"مجھ سے۔"

"مگر اسے تو بڑی واقفیت ہے میری کتابوں اور میری فلموں سے"

"جی ہاں! وہ میں نے ہی اسے بتایا تھا۔ اس کے علاوہ جو کتاب بھی لائبریری میں آتی ہے اس کے گرد پوش کے اندر جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ زبانی یاد رکھتی ہے"

میری انجو کا پنجر مکمل ہوگیا۔

گارڈ نے سیٹی دی! ہری جھنڈی دکھلائی اور ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

ایک سوال اور رہ گیا تھا میں نے چلتی ٹرین سے وہ بھی کردیا؟

"آپ خود کیوں نہ آگئیں کتاب لینے؟"

"عباس صاحب! سچ کہئے گا! اگر میں آتی تو آپ مجھے پینتالیس روپئے کی کتاب مفت دے سکتے تھے؟"

****

شری ریاض احمد خاں ملازمت سے سبکدوش

"شری ریاض احمد خاں کا اور میرا شب و روز کا ساتھ رہا۔ میں ان کی محنت، ہمت، دیانت داری اور فرض شناسی سے بہت متاثر ہوا۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح شری خاں نے حکومت کی ایمانداری محنت اور لگن سے خدمت انجام دی ہے اسی طرح "انقلاب" کو بھی ترقی کی منزلوں پر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔"

شری پرمود مانے ڈائرکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر نے شری ریاض احمد خاں سینئر اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف انفارمیشن کی حکومت کی ۳۴ سالہ طویل ملازمت سے رضاکارانہ طور پر سبکدوش ہونے کے سلسلے میں ان کے اعزاز میں ۳۰ رجون ۱۹۸۷ء کو منترالیہ کے چھٹے منزلے پر واقع کانفرنس ہال میں منعقدہ الوداعی تقریب میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقعہ پر بنو درائو۔ سابق ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ، شری رمیش وا بگا ؤنکر ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ شری وسنت چودھری، ڈپٹی ڈائرکٹر شری جیٹھا لال شاہ، سینئر اسسٹنٹ ڈائرکٹر، شری مہیر محکمہ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے بھی اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس موقع پر محکمہ کے افسران اور ملازمین بڑی تعداد میں موجود تھے۔

رحلتِ خواجہ احمد عباس پر

نقشِ بردارِ ماہ و سال گیا
واقفِ گردشِ حال گیا
روحِ تقدیسِ عصر! ماتم کر
آدمی ایک بے مثال گیا

جلیل ساز
مومن پورہ، ناگپور ۱۸

★ پروفیسر م۔ خ۔ شاذلی
کیلاش نگر۔ ناندیڑ۔ (مہاراشٹر)

تذکرۂ برق و خرمن
(مولانا آزاد کے علمی ذخیرہ کی بربادی)

ملک کی معاشی بدحالی، سماجی اور سیاسی عدم استحکام اور بدامنی جہاں ملک کیلئے مختلف طور پر نقصان دہ ہیں۔ وہیں سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ تحقیقی اور علمی کارنامے اگر پوری طرح بند نہیں ہوجاتے ہیں تو یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی رفتار اس قدر سست ہوجاتی ہے کہ اس عرصہ میں وہ قیمتی ذرائع اور ماخذات بالآخر ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن پر تحقیقی کام کئے جاسکتے تھے اور یہ صورتِ حال کسی بھی ملک اور قوم کی بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایک عرصہ سے یہی صورتِ حال باقی رہی ہے۔ اکثر و بیشتر محققین و مصنفین کی گرانقدر کاوشیں یا تو ضائع ہوگئیں یا ابھی تک منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی محقق کی وفات کے بعد اس کے قلمی مسودات کا علم بھی ہوا لیکن ان پہ کوئی تحقیقی کام نہ ہوسکا یہی کچھ مولانا ابوالکلام کے ساتھ بھی ہوا۔

مولانا آزاد کا شعری ذوق دراصل بہت کم عمری میں پروان چڑھ چکا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں حکیم عبدالحمید فرخ بمبئی سے "پنج بہادر" نکالا کرتے تھے اور فن شعرگوئی کی ہمت افزائی کے لئے ہر بار ایک مصرع طرح دیا جاتا تھا۔ جس پر شعراء اپنے اپنے مقام پہ اسی مصرع طرح پہ مشاعرے منعقد کرتے تھے، اور ان

مشاعروں میں پڑھا گیا تمام شعری مواد پنج بہادر کو بھیجا جاتا تھا اور پھر علیحدہ سے گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے منتخبہ کلام شائع کیا جاتا تھا۔ ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنا کلام بھیجا۔ جس کو پسند کیا گیا اور گلدستہ میں شائع ہو گیا۔ جس پر مولانا نے ایک خط مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں۔

"...... آج بھی جبکہ چھتیس برس گزر چکے ہیں۔ اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی، اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

یہ ضرور ہوا ہے کہ اکثر شعراء اور ادباء نے اپنی ابتدائی یا تجرباتی دور کی کاوشوں سے خود ہی گریز کیا ہے۔ لیکن شخصیت کے عظیم ہونے کے اعتبار سے تو اس شخصیت کی تمام تر سرگرمیاں قابل قدر ہو جاتی ہیں۔ کم سے کم اس شخصیت کی عظمت اور بلندی تک کے سفر کی مختلف منزلیں سامنے آتی ہیں۔ مولانا کی اس غزل کو لیجئے۔ بارہ سال کی عمر کا کلام اور اس قدر پختہ۔ لیکن جس خط میں مولانا نے اس غزل کا ذکر کیا ہے۔ وہ پچاس سال بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں "قومی آواز" لکھنؤ اور "مدینہ" وغیرہ میں شائع ہوا ہے۔

اسی طرح مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" ہفتہ وار شروع کیا۔ لیکن اس سے پیشتر مولانا آزاد نے کئی اخبارات شائع کئے۔ مثلاً "المصباح"، ہفتہ وار "رسالہ محمدیہ" "خدنگ نظر" وغیرہ۔ "الہلال" خاص مقاصد کے تحت خاص حالات میں شائع ہوا۔ اس قدر مقبول ہوا کہ بعض اوقات اس کے شمارے دوبارہ شائع کرنا پڑے۔ لیکن سوال ان سابقہ اخبارات کا ہے۔ جو مولانا نے "الہلال" سے پہلے شائع کئے تھے۔ یقیناً یہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان شائع ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ۱۹۰۰ء میں مولانا کی غزل پہلی بار "پنج بہادر" بمبئی میں شائع ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے ان اخبارات کا بھی یقیناً ایک معیار ہوگا۔ ان اخبارات کی نگارشات میں مولانا کی اس کم عمری کے علمی معیار کا عکس نمایاں ہوگا۔ بہر حال ان پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب "الہلال" پہلی بار شائع ہوا تو اس کے دو خاص مقاصد تھے۔ اول مقصد جیسے مولانا نے خود عام مقصد کہا ہے۔ یہ تھا کہ علم و ادب اور سیاست و صحافت کے عام مباحث منظر عام پر آئیں، اور اردو زبان میں ہر اعتبار سے ایک ایسا بلند پایہ رسالہ وجود میں آجائے جو زمانہ کی رفتار ترقی کا ساتھ دے سکے، اور فکر و نگارش کے ہر میدان میں ایک نئی قسم کی بلندی پیدا کرے۔ دوسرا مقصد "دعوت" سے متعلق تھا۔ یعنی مذہب میں مجتہدانہ نظر و فکر کا ایک نیا دروازہ کھولا جائے، اور سیاست میں آزادی فکر و عمل اور علوئے نظر و رائے کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کی جائے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ نہایت درجہ وسیع اور گہرا تھا۔ اسی لئے حکومت فوراً چوکنا ہو گئی، اور دوبار "الہلال" پہ پابندی عائد کر دی گئی۔ اس طرح "الہلال" کے تین دور گزرے۔ "الہلال" پہ یہ دور اس لئے بھی گزرے کہ اب مولانا آزاد صرف شاعر اور ایڈیٹر ہی نہ تھے، بلکہ وہ اب کانگریس کے اعلیٰ پایہ کے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ لہٰذا مولانا کی اس عملی سیاسی زندگی نے بھی جہاں "الہلال" کے لئے مشکلات پیدا کیں۔ وہیں مولانا کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر بھی بری طرح اثر پڑا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے محققین یا اعلیٰ پایہ کے مصنفین سیاست میں عملی طور پر کبھی حصہ نہیں لیتے یا اگر لیتے بھی ہیں تو صرف برائے نام کسی پارٹی کے رکن بنے رہتے ہیں۔ بعض تو اس طرح کی رکنیت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی شخصیت کسی خاص نظریہ، یا طرز فکر سے وابستگی (Commitment) کی مظہر نہ بن جائے، اور وہ آزاد فکر و نظر کے حامل قرار دئیے جائیں لیکن مولانا آزاد کے پاس "برق و خرمن" کا معاملہ یکجا ہو گیا۔ مولانا خود "الہلال" میں اس صورت حال کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

"ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی اہم ہے۔ "الہلال" نے اپنے دینی و علمی مباحث میں نظر و تحقیق کا ایک خاص دروازہ کھولا تھا۔ لیکن وہ محض ابتدائی تھی۔ ضرورت تھی کہ ان بنیادوں پر عمارتیں اٹھائی جائیں بارہ سال گزر گئے۔ لوگ انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ انتظار و طلب نے مایوسی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن مجھے مہلت نہ ملی کہ اس کام کی تکمیل و اشاعت کی طرف متوجہ ہوتا۔ جو اصحاب علم و ذوق ان چیزوں کے طلبگار تھے۔ ان پر میری ملکی مشغولیتیں شاق گزرتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے ہمہ تن انہی کاموں کے لئے وقف ہو جاؤں میں اپنی سیاسی مشغولیتیں ترک کر دینے پر قادر نہ تھا۔"

یہ صحیح ہے کہ عام طور پر اس دور میں مولانا آزاد بلیت و صلاحیت، علمی تبحر، اور تدبر نے واقعی و یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس اعلیٰ پایہ کا عالم ق کیوں خواہ مخواہ عملی سیاست میں وقت ضائع ے۔ لوگ اس اجتماع اضداد کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ، مولانا آزاد جہاں اعلیٰ فکر و نظر اور علم و تحقیق کا یار رکھتے تھے۔ وہیں ان کے سینہ میں ایک نہایت ند دل جو نہ صرف ملک و ملت بلکہ انسانیت کے ر وقت بے چین رہتا تھا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

"..... لیکن ساتھ ہی یقین رکھتا ہوں کہ نہ صرف علمی و دینی تحقیقات کے لحاظ سے بلکہ خود قوم کی عملی زندگی کی صحیح نشوونما کے لئے ان کاموں کی تکمیل سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

یہ قدرتی امر ہے کہ عملی سیاست کی سرگردانیاں انسان کو یکسو ہو کر فکر و تحقیق میں محو ہو جانے کا موقعہ نہیں دیتی ہیں۔ بلکہ اگر کوئی باہمت اس طرح کی جراُت رندانہ دکھائے بھی تو حالات کی پے در پے تبدیلیاں اس کی علمی و تحقیقاتی کاوشوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جس کا صدمہ ان تمام سیاسی مصائب اور تکالیف سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو عملی طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مولانا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ بہتر ہے اس اجمال کی تفصیل انہی کی زبانی سنیئے:

"اس بارے میں میرے اجزائے فکر اور اوراقِ نظر کی پریشان حالیوں کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ علم کی زندگی، سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک وقت اور ایک محل میں جمع ہونا بہت مشکل ہے، میری زندگی کی مشکلات میں پہلی مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت اور بیک محل جمع کر دوں۔"

"پنبہ را آتشی ایں جا بہ شرار افتادہ است"

مولانا یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذوق کی وسعت، نظر کی بلند پیمائیاں اور فکر کی مشکل پسندیاں کسی حدود میں محصور نہیں کی جا سکتیں۔ فکر و عمل کے علیحدہ دائرے بھی بنا لیے جائیں تو طبع انسانی کی جولانیاں ان حدبندیوں کو توڑ کر نکل آتی ہیں۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:-

"....... لیکن یہ تقسیمیں اور حدبندیاں ہمیشہ نہیں چل سکتیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت کا جوش اور فکر کی وسعت ان چھوٹے چھوٹے خانوں کی تنگ نائیوں میں قانع نہیں رہ سکتی اور حدبندیاں توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ میں فکر کی یکسوئی اور ایک ہی راہ پر پڑ جانے کی آسانیوں سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ مبدأ ازل نے طبعیتیں تقسیم کرتے ہوئے مجھ نامراد کے لئے یہی پسند کیا کہ ہر راہ کی پیمائش اور ہر

کو جہ کی گردش کا اضطراب اس میں ودیعت کردیا جائے
علم کا استغراق اور سیاست کی خود فروشیاں دنیا
کے لیے متضاد ہوں تو ہوں لیکن میرے لئے تو ایک ہی
دماغ کا سودا اور ایک ہی دل کی تپش تھی ۔

روئے در یا سلسبیل و قعر دریا آتش است

اس میں شک نہیں کہ اس متضاد صورت حال
میں بھی مولانا آزاد نے اپنے مضبوط کردار اور آہنی شخصیت
کی وجہ سے زندگی کے ان دونوں پہلوؤں پر فاتحانہ
قابو پاتے ہوئے دنیا کے قائم کردہ فکر اور عمل کے دائروں کو توڑ
دیا ۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں :-

"..... لوگوں نے گوشہ ہائے چمن کے
سکون اور کتب خانوں کے بے خلل استغراق
میں علم و نظر کے مرحلے طے کئے ہیں ۔ لیکن
یہاں جو کچھ پیش آیا ، یہ تھا کہ سیاسی و ملکی
صف آرائیوں کے ہنگامے تھے ، یا نظر بندی
کی سختیاں اور قید خانے کی کوٹھریاں
تھیں ۔ تاہم دماغ اپنے کاموں میں مشغول
اور فکر اپنی کاوشوں میں سرگرم تھا "

تادست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

زندگی میں اس عملی تضاد پر فتح تو حاصل کی جا سکتی
ہے ۔ لیکن بعض اوقات اس کی بڑی قیمت بھی ادا کرنی
پڑتی ہے ۔ لیکن اہلِ ذوق و علم جب دانستہ ان دشتوں
کی صحرا نوردی کرتے ہیں تو نتائج کو برداشت کرنے کی
طاقت بھی رکھتے ہیں یا صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا
ہے ۔ چنانچہ مولانا آزاد کو بھی اس کی قیمت ادا کرنی پڑی
جس پر مولانا نے تو صبر کر لیا ـــــ لیکن ہم آج اس علمی
نقصانِ عظیم پر صبر کس طرح کریں ؟
مولانا لکھتے ہیں :-
" ۱۹۱۶ سنہ ء سے لے کر ۱۹۲۱ سنہ ء

تک یکے بعد دیگرے اس طرح کے حالات
پیش آتے رہے کہ ایک طرف میں اپنا
سرمایۂ فکر جمع کرتا جاتا تھا ۔ دوسری طرف
دست بردِ زمانہ انہیں پوری بے دردی
کے ساتھ منتشر کرتا جاتا تھا ۔ ؎
متاع جمع کن شاید کہ غارتگر شود پیدا

۱۹۱۶ سنہ ء میں مولانا آزاد کو بنگال سے خارج
کردیا گیا تھا ۔ وہ رانچی چلے گئے اور " البلاغ " اور
دار الارشاد کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ
انہوں نے اپنے افکار اور تحقیقات کی تحریر و ترتیب
بھی شروع کردی تھی ۔ اس دور میں مولانا زیادہ تر
فکر و نظر کی گہرائیوں کی طرف متوجہ رہے اور متفرق
اور منتشر حقیقتوں کی چھان بین کر کے ان کو جمع کرنا اور
پھر اصول و کلیات کے تحت لانا مولانا آزاد کے
پیشِ نظر تھا ۔ مولانا کے کہنے کے مطابق اس وقت بہت
سی چیزیں ابتدائی شکل میں مرتب ہو چکی تھیں اس وقت
تک مولانا کے الفاظ میں کم سے کم ایک ہزار چھوٹے بڑے
پرچے تو صرف یادداشتوں ہی کے سیاہ ہو چکے تھے ۔ اس
میں سے کچھ حصہ مولانا رانچی لے آئے تھے ۔ باقی حصہ
کلکتہ کے سکونتی مکان میں چھوڑ دیا تھا ۔ چونکہ اس وقت
پہلی جنگِ عظیم جاری تھی ۔ ہندوستان کے حالات بھی
نہایت غیر مستقل تھے ۔ جنگِ آزادی کے ان رہنماؤں کے
تعلق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں ان کو کس
صورتِ حال سے گزرنا پڑے گا ۔ چند ماہ بعد ہی مولانا کی
نظر بندی کے احکامات جاری ہوئے ۔ برطانوی حکومت
کی نظر میں مولانا آزاد نہایت خطرناک لیڈر خیال کئے جاتے
تھے ۔ لہٰذا نظر بندی کے فوراً بعد ہی ان کی رانچی کی قیام گاہ
اور کلکتہ کے سکونتی مکان میں یک وقت تلاشی شروع کر
دی گئی ۔ یہاں تک کہ ان تمام مقامات کی تلاشی بھی لی گئی
یہاں مولانا کی تحریرات کے وجود کا شبہ ہو سکتا تھا ۔
بہر حال مولانا کی تمام تحریرات ضبط کرلی گئیں جن میں قلمی مسودے
یادداشتیں اور اشارات وغیرہ شامل تھے ۔ مولانا اکثر

اشارات فارسی اور عربی میں تحریر کیا کرتے تھے، اور تلاشی
لینے والے زیادہ تر انگریز یا بنگالی افسر ہوتے تھے۔ جو زبان
سے ناواقفیت کی بنا پر ہر تحریر کو ایک راز' ایک سازش
قرار دے رہے تھے۔ اتفاق سے کوئی مسلمان افسر ہوتا
بھی تو وہ معمولی اُردو سے واقف۔ اس نایاب ذخیرہ کا
کیا انجام ہوا، ضبط تحریر لاتے وقت دل بھر آتا ہے۔
خود مولانا کی زبانی سنیئے:۔

"...... اور سب کو ایک ڈھیر کی شکل
میں جمع کر کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ کاش!
احتیاط کے ساتھ جمع کرتے اور احتیاط کے
ساتھ رکھتے۔ لیکن ان میں کون تھا جسے
ان چیزوں کا درد ہوتا؟ نتیجہ یہ نکلا، کہ
نصف سے زیادہ اوراق تو تلاشی کے
وقت کی بے احتیاطیوں میں ضائع گئے۔
اور نصف جو باقی رہے۔ انہیں بھی اسی
بے احتیاطی کے ساتھ ادھر اُدھر جوڑ دیا
گیا کہ کوئی ایک چیز بھی اپنی اصلی شکل میں باقی
نہ رہی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ یہ برباد شدہ
ذخیرہ بھی پورا واپس نہیں ملا۔ جو کلکتہ
سے لے گئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ
دنوں تک پولس کمشنر کے دفتر میں رکھے
گئے۔ اتفاقاً وہاں کے ایک گوشہ میں آگ
لگ گئی، اور دفتر کے سامان کے ساتھ
بعض اوراق بھی جل گئے۔ پولس کے دفتر
میں آگ بھی لگنی تھی تو اسی وقت جب یہ
دفتر پریشاں وہاں جمع تھا"

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو!

اس "دفتر پریشاں" میں کیسی گرانقدر اور نایاب
حقیقتیں تھیں۔ اس کی تفصیل تو مولانا خود ہی جانتے
ہوں گے۔ ۲۴ جون ۱۹۲۷ء کے "الہلال" کے ایک
شمارے میں مولانا نے ان بربادیوں کا مختصر خاکہ دیا ہے۔

تفصیل مولانا کے ساتھ ہی چلی گئی۔ یا اس وقت کے مولانا
کے قریبی لوگ شاید جانتے ہوں۔ اس تباہی کا اجمالی خاکہ
بھی مولانا ہی کے زبانی سنیئے تو بہتر ہے۔ مسودات کے
نام سن کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

" ان مسودات میں حسب ذیل کتابیں
ایک حد تک مرتب تھیں۔ تاریخ معتزلہ،
سیرۃ شاہ ولی اللہ، دیوان غالب، اُردو
پر تبصرہ، خصائص مسلم، امثال القرآن،
شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ، مقدمۂ
تفسیر کے تمام اجزاء، ترجمان القرآن
کا مسودہ سورۂ ہود تک، تفسیر البیان
سورۂ نساء کے ابتدائی حصّہ تک، مضامین
اور یادداشتوں کا ذخیرہ ان کے علاوہ ہے
قیام رانچی کے ابتدائی زمانہ میں دو نئے
رسالے شروع کئے تھے۔ ایک وحدت
قوانین کائنات پر' دوسرا قانون انتخاب
طبعی اور معنویت کائنات پر' ان کے
اوراق بھی اسی ذخیرہ میں شامل ہو گئے"

رانچی کی زندگی میں مولانا نے تصنیف و تالیف کے
لئے زیادہ وقت دیا۔ فکر و خیال میں بھی کافی انقلابات
آئے۔ "مقدمہ" "ترجمہ" کا کام از سر نو شروع کر دیا تھا
جنوری ۱۹۲۰ء میں رانچی سے کلکتہ گئے۔ ارادہ تھا کہ
کسی طرح ترجمان القرآن شائع ہو جائے لیکن ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء
کو مولانا گرفتار کر لئے گئے اور پھر سے خانہ تلاشیوں کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔ اس بار تو نہ صرف مسودہ جات بلکہ کتابت
شدہ کاپیاں بھی پولس کے قبضہ میں چلی گئیں۔

"...... ۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو جب
رہا ہو کر واپس آیا تو ۱۹۱۶ء سے لے کر
۱۹۲۰ء تک کی تمام محنت تقریباً
رائیگاں ہو چکی تھی"

بڑی کوشش اور محنت کے بعد اوراق واپس ملے۔
لیکن تمام تر ناقص، منتشر اور برباد شدہ تھے۔ اوراز سرِ نو اتنی ہی محنت و کاوش کے متقاضی تھے۔ یہ مولانا ہی کا دل گردہ تھا کہ دونوں بار ان بربادیوں کے صدمۂ عظیم کو برداشت کر گئے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں کام کرنے والے جانتے ہیں کہ از سرِ نو محنت کس کو کہتے ہیں۔ جب کارلائل کی تاریخ انقلاب فرانس کا مسوّدہ جل گیا تو عرصہ تک اس کا یہ حال تھا کہ قلم پکڑتا اور بغیر ایک حرف لکھے چھوڑ دیتا۔ اس وقت مولانا کو اس "برق و خرمن" کو یکجا جمع کرنے کے تجربہ کا شدید احساس ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"..... مجھے دونوں مرتبہ تسلیم کر لینا پڑا
کہ یا تو اس طرح کی زندگی اختیار نہیں کرنی
تھی۔ یا کی ہے تو پھر اس کے تمام لازمی نتائج
گوارا کر لینے چاہئیں۔ سرمد کا فیصلہ صرف
ایک گوشۂ عشق ہی کا نہیں بلکہ انسان کی
تمام مصیبتوں کے لئے عام و ابدی فیصلہ ہے:

یا تن بہ رضاء دوست می باید داد

یا قطع نظر ز یار می باید کرد

ان حالات میں کوئی اور ہوتا تو شاید مایوسیوں کے اندھیروں گم ہو جاتا۔ یا کم سے کم اس ہنگامہ پرور زندگی سے فرار اختیار کر لیتا۔ لیکن مولانا کا عزم و استقلال مثالی تھا۔ درد کی صرف ایک ہلکی سی کسک ظاہر کر دی۔ لکھتے ہیں:-

"..... عرصہ کے انتظار و التوا اور بار بار
کی تعمیر و تخریب سے طبیعت کچھ اس طرح
اکتا گئی ہے کہ اب نہ تو ترتیب و ضبط کی
طرف مائل ہے، نہ آرائشِ گفتار، اور
زینت زبان کا شوق ہے"

البتہ اب صرف خواہش رہ گئی تھی کہ جس طرح بھی مولانا کی وہ تمام تحقیقاتی کاوشیں شائع ہو جائیں اور اس کا سلسلہ انہوں نے "الہلال" کے اس تیسرے دور میں شروع کیا۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا نے "الہلال" کو صرف اپنی تصنیفات و تحقیقات کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا، اور مولانا کی شخصیت سے ایسی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ "الہلال" کے تعلق سے اب تیسرے دور میں مولانا کے پیشِ نظر، جو منصوبہ تھا۔ وہ بھی انہوں نے [illegible] عزم و حوصلے اور پورے اطمینان اور اعلیٰ فکر و خیال کے ساتھ واضح کیا ہے۔

"..... لیکن اگر ان خاص مقاصد سے
قطع نظر کر لی جائے جب بھی عام مقاصد
کی ضرورت و اہمیت کا یہ حال ہے کہ اگر
"الہلال" کے درجہ کے دس رسالے
بھی ملک میں شائع ہوں جب بھی ضرورت
پوری نہ ہوتی"

"—— چند حقیقتیں صاف اور تسلیم شدہ ہیں۔ یقیناً ان میں، دو روایتوں کی گنجائش نہیں۔ موجودہ زمانہ "پریس" اور "مطبوعات" کا زمانہ ہے۔ نہ صرف علم و ادب کے لئے بلکہ قومی و اجتماعی زندگی کی نشو و نما کے لئے بھی ان کا وجود ناگزیر ہے۔ علم و ادب کی صحیح ترقی بجائے خود قوم کے اجتماعی ذہن و فکر کی ترقی ہے۔ جیسی جیسی اس کی سطح بلند ہوگی، اتنی ہی قومی زندگی کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔ جہاں تک "پریس" اور "صحافت" (جرنلزم) کا تعلق ہے۔ دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب سے دس برس پیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر کے لئے ایک بڑا کام، اینٹ زبان ہے۔ زبان کی ترقی کے لئے پہلی چیز اس کی ادبیات (لٹریچر) ہیں۔ ادبیات کی نشو و نما بغیر اعلیٰ درجہ کے رسائل و مطبوعات کے ممکن نہیں"

"یہ ادارہ اس طرح کے وہ تمام باتیں جو معروف معلوم ہوتی ہیں اگر صحیح ہیں تو کیا اس کے ضرورت لوگ محسوس نہیں کرتے کہ تمام برّاعظم ہند میں کم از کم ایک رسالہ اردو کا ایسا موجود ہو جو اپنی ظاہری اور باطنی خصوصیات میں دنیا کی ترقی یافتہ صحافت کا نمونہ پیش کر سکے"؟

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا کی تصنیف و تالیف اور تحقیقی کام کا رُخ اب اعلیٰ پایہ کی صحافت، اردو زبان و ادب کی ترقی کی طرف مڑ گیا تھا جس کے ذریعہ وہ ملک و قوم کی فکری بلندی کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے طباعت کے تعلق سے "الہلال" کے اس تیسرے دور میں کتابت اور ٹائپ (مصری طرز تحریر) طباعت کی بحث بھی چھیڑ دی تھی بلکہ اس دور کا "الہلال" نصف ٹائپ پر اور نصف کتابت شدہ شائع ہوتا تھا۔ گویا اردو زبان کی طباعت اور اشاعت کی تیز رفتاری کے لئے مولانا نے دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا۔ اردو زبان کی صورتِ حال کے تعلق سے کتنا درد بھرا جملہ مولانا نے کہا ہے.....

> "دنیا نے انیسویں صدی کے اوائل میں طباعت و صحافت کا کام جس نقطہ پر چھوڑا تھا۔ اردو زبان کی صحافت ۱۹۲۷ء میں اسی پر قناعت کئے ہوئے ہے۔ آخر یہ حالت کب تک باقی رہے گی؟"

مولانا آزاد کے مندرجہ بالا اذیت ناک حالات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

۱:- مولانا آزاد نے "برق و خرمن" کو یکجا کرنے کی جو جرأت رندانہ دکھائی تھی وہ حالات اور واقعات کی پیداوار نہ تھی۔ بلکہ سوچ سمجھ کر مولانا نے یہ تجربہ کیا تھا۔ گو ان کی زندگی میں بھی اکثر صاحبِ علم حضرات مولانا کی اس دوہری روش سے متفق نہ تھے، اور آج بھی اکثر لوگ مولانا کے اس کردار سے متفق نہیں ہیں۔ لیکن سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات میں مولانا کا یہ دوہرا کردار نہایت مدبرانہ اور متاثر کن اقدام تھا۔ جس نے سینکڑوں سوالات کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا، اور پھر مولانا کی سیماب صفت طبیعت اس پر مستزاد۔

۲:- یوں تو تعمیر و تخریب کے اس قانونِ قدرت کے تحت یہ صدمے اور بربادیاں برداشت کر لی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہماری ایک قومی کوتاہی کا بھی پہلو سامنے آتا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد سرکاری دفاتر پولس اور دفاع کے محکموں کی چھان بین کے بعد ایسے تمام کاغذات مسودات جات اور ضبط شدہ علم و ادب کے ذخیروں کو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ جو کسی منظم منصوبہ کے تحت ہونا چاہئے تھے۔ اندازہ ہے کہ ان غیر مستقل حالات میں نہ صرف مولانا بلکہ کئی دانشوروں کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوا ہو۔ مثلاً حال ہی میں روس کے ایک مصنف الیکزی رائیکوف نے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ انہوں نے بھارت پہ کافی کتابیں لکھی ہیں۔ اپنی معلومات کے ماخذات کے سلسلے میں رائیکوف نے بتایا کہ انہیں ایک نہایت نایاب نسخہ اتفاقی طور پر دستیاب ہوا۔ جس میں نہ صرف ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ تھی بلکہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کی طرزِ حکومت کا خاکہ بھی دیا گیا تھا۔ وہ

کتاب بھی "انڈین فیڈریڈری پبلک
کانسٹی ٹیوشن / مصنف مولانا عبید اللہ سندھی" اور
یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی۔
پتہ نہیں ایسا کتنا نایاب علمی و تاریخی مواد
کہاں کہاں بکھرا پڑا ہے۔ اسی طرح جواہر لال
نہرو، گاندھی جی، باباصاحب امبیڈکر
وغیرہ کے علمی و نظریاتی سرمایوں کا کیا ہوا ہوگا۔

۳ :- مولانا ایک مستحکم ارادہ کے مالک تھے۔
غور و فکر کے بعد وہ جو بھی راستہ اختیار
کرتے تھے۔ اس پر نہایت مضبوطی و استقلال
سے قائم رہتے۔ ان مصائب و آلام کے
دردناک حالات میں یہ ممکن تھا کہ مولانا....
گوشہ نشینی اختیار کر لیتے۔ لیکن نہایت جرأتمندی
اور بلند ہمتی سے وہ تا دم آخر حالات کا مقابلہ
کرتے رہے اور اپنے نظریات، تصنیف و تالیف
عملی سرگرمیوں پہ قائم رہے۔

۴ :- سیاسی اعتبار سے مولانا پہ کافی اعتراضات
ہوتے رہے اور خصوصاً مسلم لیگ کے عروج
کے زمانے میں تو مولانا کے کیا احساسات ہوں گے
اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی
گفتگو اور معاہدات وغیرہ کے موقعوں پر جناح
ہمیشہ مولانا سے گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔
لیکن سیاسی میدان میں بھی مولانا کی ہمت
اور استقلال، صبر و استقامت کا یہی حال
رہا اور آج بھی جب ہم سنجیدگی سے غور
کرتے ہیں تو ان حالات میں بہر نوع مولانا کا
سیاسی کردار اپنی جگہ موزوں تھا۔ گو یہ
موضوع اب اتنا زیادہ قابل بحث نہیں رہا ہے

۵ :- صحافت کے میدان میں مولانا نے جو معیار
قائم کیا تھا۔ وہ آج کے ہمارے نیشنل پریس
کے لئے بھی نمونہ ہے۔ اردو میں تو الہلال کے
بعد شاید ہی بھارت میں کوئی اردو جریدہ اس
معیار سے شائع ہو سکا ہے۔ الہلال کے پرانے
فائیل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "الہلال"
کے نمائندے تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں
موجود تھے اور ان ممالک کے تازہ ترین حالات
میں کیا جبکہ رسل و رسائل کی آج کی طرح سے
سہولیتیں تو تھیں ہی نہیں، علاوہ اس کے سرکار
برطانیہ کی تلوار ہمیشہ مولانا کی سرگرمیوں پہ لٹکتی
رہتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ علمی اعتبار سے "الہلال"
کے شمارے آج بھی ماخذات کا کام دیتے ہیں۔

۶ :- اردو زبان کی طباعت اور اشاعت کے
تعلق سے تو آج بھی ہم اسی مقام پہ ہیں جہاں
مولانا کے "الہلال" (۱۹۲۷ء) نے ہمیں
چھوڑا تھا۔ آج بھی ہمیں اس مسئلہ پر اتنی ہی
سنجیدگی اور دردمندی سے غور کرنا ہوگا۔

۷ :- جن عنوانات یا موضوعات پہ مولانا نے
عرق ریزی کی تھی اور جو گردش زمانہ کے شعلوں
کی نذر ہو گئے۔ آج از سر نو ہمارے علماء
ان پہ توجہ دے سکتے ہیں۔

ایک اندازہ یہ بھی قائم ہوتا ہے کہ مولانا کے علمی و
ادبی اور تحقیقاتی کارناموں پہ ابھی کافی کام کرنے کی ضرورت
ہے۔ یہ کام کسی پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم کے بس
کا نہیں۔ اس کے لئے منصوبہ بند طور پر کسی منظم ادارہ
کی جانب سے کیا جانا چاہیئے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

بصیر
برہ ۱۵ ے ۲۳
۱ عزیز کھا روڈ، لاڈ دیپ ، ممبئی ۴۰۰۰۹۵

سنِ بلوغ کے مسائل

ہر بچے کی زندگی میں ایسا دور آتا ہے کہ جس میں اس کی جسمانی، دماغی اور جنسی نشو و نما بڑی تیزی سے ہوتی ہے جسے انگریزی میں ADOLESCENCE یا اردو میں سنِ بلوغ کہتے ہیں۔

سنِ بلوغ زندگی کا وہ زمانہ ہے جو بچہ میں ایک ذہنی اور
پیدا کر دیتا ہے۔ بچہ اپنے بچپن سے نکل کر لڑکپن اور
قدم اٹھاتا ہے۔ یہ بڑا نازک دور ہوتا ہے جس میں
زندگی کے اونچ نیچ کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے
ندر کر بچہ اپنی INDIVIDUALITY یا انفرادیت
کے دورِ بلوغ) اس کی ADOLESCENCE
قی کس طرح ہوئی اس بات پر اس کی شخصیت کا دار و مدار

سنِ بلوغ کی پہلی نشانی جسمانی نشو و نما ہے۔ یہ نشو و نما بالغ
اہشات اور دلچسپیوں میں زبردست تبدیلیاں پیدا
کر نوجوان یعنی ذہنی بالغ حتی الامکان اپنے احساسات
نے کی کوشش کرتا ہے ماں باپ کی باتوں پر ناراضگی
سی وجہ سے والدین کو مالی تنگدستی سے تو اس کی زندگی
مشکلوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر
کی صحت پر بھی اثرات پڑتے ہیں کبھی کبھی وہ عجیب
یں کرنے لگتا ہے بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گھر میں باپ،
سے بغاوت بھی کر بیٹھتا ہے اور آج کل کے زمانے میں
جوان لڑکے یا لڑکیاں HIPPIES ہپی بن جاتے ہیں۔

رغ میں مخالف جنس Opposite Sex سے
دوستی کی خواہش بہت عام بات ہوتی ہے ایسے حالات میں والدین
کو یا سرپرستوں کو اور استادوں کو چاہیئے کہ بہت ہی ہوشیاری
سے اپنے بالغ بچوں کے مسائل حل کریں اور نفسیاتی طور پر ان سے اس
طرح کا برتاؤ روا رکھیں کہ وہ چڑ کر یا ناراض ہو کر اپنی من مانی نہ
کر بیٹھیں۔ مراد یہ کہ ان کے امنڈتے ہوئے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔
انھیں ان کے حال پر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے ان کی سوسائٹی ان کے
اردگرد کا ماحول، انکی پسند ناپسند، ان کے شوق اور ان کی دلچسپیوں
پر گہری نظر رکھنا چاہیئے۔

نوجوانی کے زمانے میں اکثر لڑکے لڑکیوں کی صحت خراب
رہتی ہے یا ان کے چہروں پر مہاسے یا پھنسیاں نکل آتی ہیں جن کی
کی وجہ سے بھی وہ لوگ فکرمند رہتے ہیں اور یہ معمولی بات ہے۔ بچپن
سے نوجوانی یا جوانی میں قدم رکھتے وقت بالغوں کو خیال رہنے لگتا
ہے کہ ان کے گھر میں والدین، ان کے بڑے بھائی اور بہن، چھوٹے
بھائی اور بہن اور ان کے احباب ان کی شخصیت اور انفرادیت کو
سمجھیں وہ بالغ اپنے اندر ایک شان اور علحدہ سے کوئی ایسی صفت
محسوس کرتا ہے کہ اس میں کبھی کبھی انانیت آجاتی ہے اپنے کاموں اور
اپنی ضروریاتِ زندگی کو گھر والوں اور دوسروں کے کاموں پر
ترجیح دیتا ہے اس کو اپنی سجاوٹ یعنی جسمانی حسن کا شدت سے
خیال رہنے لگتا ہے۔ یہ لوگ (بالغ لڑکے لڑکیاں) دیر تک آئینے

کے سامنے اپنے آپ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ آئے دن کے فیشن کی تبدیلیوں کا بھی ان کو بہت احساس رہتا ہے اور اس زمانے میں تو بالغوں کے مسائل تو درحقیقت اور زیادہ پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

بالغوں کو نئی نئی دوستی اور میل ملاپ بڑھانے کا بھی شوق ہوتا ہے گروپ یا حلقے بن جاتے ہیں۔ پارٹی بازی اور علیحدہ علیحدہ ٹولیوں کی شکل میں تاکہ ان کو نمایاں حیثیت اور امتیاز نصیب ہو یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کلبوں اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر ضروری اور غیر ضروری موضوع اٹھا کر گھنٹوں بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ آؤٹ ڈور گیمس (OUT DOOR GAMES) کے بجائے بعض سست ذہنیت کے نوجوانوں کو کیرم، شطرنج اور تاش وغیرہ سے زیادہ دلچسپی ہو جاتی ہے۔

قانون توڑنے، طرح طرح کے طوفان برپا کرنے، کالجوں میں اکثر ایک بازی یا کسی بھی لیڈر کی قیادت میں اپنی تعلیم چھوڑ کر نعرے بازی، توڑ پھوڑ اور دوسری مخرب اخلاق سرگرمیوں میں حصہ لینا بعض نوجوانوں کا پسندیدہ مشغلہ بن جاتا ہے۔

سن بلوغ پر بتدریج جنسی خواہشات اور احساسات عروج پر ہوتے ہیں اور جب ان احساسات کی تکمیل نہیں ہوتی تو وہ اپنی ذہنی اور جسمانی تکمیل کے لئے نیم پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر ان کے بڑے ان کی اس طرح کی خواہشات پوری کیوں نہیں کرنے دیتے۔ وہ ان کی ان ناگفتہ بہ حرکتوں کے مخالف کیوں ہوتے ہیں وہ ان کو کیوں روکتے ہیں۔ کیوں منع کرتے ہیں کیوں نگرانی کرتے ہیں اس کی وجہ انکی اپنی نوجوانی کے تجربے ہوتے ہیں۔

اس عمر میں نوجوانوں کے ذہنوں میں ایک طرف تو پیار محبت، ہمدردی اور خلوص کا جذبہ ہوتا ہے تو دوسری طرف نفرت اور بغاوت۔ دونوں طرح کے جذبوں میں شدت ہوتی ہے۔ اور اگر ان کی ذہنی کشمکش، جنسی اور نفسیاتی خواہشات کو بڑی عقلمندی حکمت عملی سے نہ روکا گیا تو وہ اعصابی کمزوریوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی نوجوان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور آنکھیں دھنسنے لگتی ہیں اور اسی عمر سے وہ سگریٹ اور بیڑی بھی پینے کا شوق شروع کر دیتے ہیں ان میں احساس کمتری اور خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ عام طور سے لوگوں سے ملنے جلنے میں وہ کتراتے لگتے ہیں کچھ شرم، جھینپ، مایوسی، ناکامی کی لہر جڑ پکڑ جاتی ہے ان میں بعض اوقات بزدلی، ماں باپ کے لئے نفرت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اس لئے کہ ماں باپ ان کے معاملات میں پیہم مداخلت کرتے رہتے ہیں لہٰذا انھیں غصہ آتا ہے اور چڑچڑا مزاج ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔

بچپن میں جرم کا خیال آنا یا دوسری بری باتوں کی طرف مائل ہونا اس کی بڑی وجہ طالب علم کا اسکول سے بھاگنا۔ اسکول میں یا گھر میں چوری کرنا۔ چھوٹے چھوٹے جرائم کی طرف مائل ہونا۔ چھپ چھپ کر سنیما جانا۔ غنڈے اور برے لڑکوں کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ امتحان میں نقل کرنا۔ بدتہذیبی اور دوسری گندی باتیں کرنا جھوٹ بولنا۔ آگے چل کر سماج سے بغاوت کر بیٹھنا۔ آج کل اس طرح کے بے شمار واقعات دیکھنے یا سننے میں آتے ہیں۔ بالغ اپنے سامنے ایک نمونۂ حیات (MODEL) بھی رکھتے ہیں جو ان کی نظر میں ایک کامیاب شخصیت ہوتی ہے ان کو وہ اپنا ماڈل چن لیتے ہیں وہ اپنی عادتیں اپنے رہن سہن کا طریقہ اسی ماڈل کے طریقے پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے کوئی فلم کا ہیرو یا ہیروئن کو ہی عموماً وہ اپنا ماڈل تصور کر لیتے ہیں۔

اس لئے ٹیچروں کو چاہئے کہ وہ خود طالب علموں کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش کریں کہ وہ خود ان کے لئے یعنی اپنے شاگردوں کے لئے ایک مکمل نمونۂ حیات بن جائیں ان کی زندگی کی تعمیر کے لئے صحیح معنوں میں وہی اساتذہ معمار ہیں بشرطیکہ وہ اپنے فرائض کو نبھائیں۔ ان کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہو۔

پیشہ کا انتخاب بھی ایک ضروری مسئلہ ہے جس کا سامنا ہر بالغ کو کرنا پڑتا ہے۔ بعض بالغوں کو مجبور ہو کر یا مالی حالات کی خرابی یا گھریلو ماحول کی بدنظمی اور بدحالی کی بدولت اپنی مرضی کے خلاف ان کو پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے یا والدین کے مجبور کرنے پر اس کو بھی وہی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس کے باپ دادا کرتے تھے یا خاندانی پیشہ رہا ہو اس کے لئے لڑکوں یا لڑکیوں کی کوئی ترغ نہیں بلکہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ متوسط گھرانوں — کے لوگوں میں بھی اسی طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں ان چیزوں سے بالغوں کا ذہنی انتشار اور بڑھ جاتا ہے اور ان کی ذہنی آزادی

پڑتی ہے اور خاص کر بالغ لڑکوں کی زندگی میں یہ دور
ھتا ہے کیونکہ ان کے زندگی کے مستقبل کا دارومدار اسی
ہی وجہ ہے کہ اکثر لڑکے اور لڑکیاں سن بلوغ میں بڑی
ہو جاتے ہیں۔ انگریزی کے کسی فلاسفر کا قول اس طرح ہے

" TO COMPARE THE LIFE OF
YOUNG PERSON LIKE THE M
THAT FLOWS OUT OF THE H
AFTER THE BOILING POINT

●●

رفیق شاہین
۴/۴ ء۔ گورنمنٹ پریس کالونی
علیگڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یوپی)

انصاف برتنے کا سلیقہ بھی نہ رکھا
منصف نے صفائی کا تو موقع بھی نہ رکھا

ماں باپ کے دم تک ہی رہی گھر میں محبت
پھر بھائیوں نے خون کا رشتہ بھی نہ رکھا

ساحل کے لٹیروں سے بچیں بھی تو کدھر جائیں
ہم نے تو کنارے پہ سفینہ بھی نہ رکھا۔

منظر کی چمک روح کو بیمار نہ کر دے
اس خوف سے کمرے میں دریچہ بھی نہ رکھا

تھا خوف ہی کب ہم کو لٹیروں کا سفر میں
خیموں پہ اسی واسطے پہرہ بھی نہ رکھا

مالک نے مجھے غم تو دئے سینے میں لیکن
غم سہنے کو پتھر سا کلیجہ بھی نہ رکھا۔

الفاظ کے نشتر تو اتارے مرے دل میں
ہونٹوں پہ مگر پھول سا لہجہ بھی نہ رکھا

کچھ دن بھی نہ گذرے تھے کہ نشتر نے دل میں
شاہیں تری یادوں کا گوشہ بھی نہ رکھا

●●●

تابش صدیقی
بزمِ افکارِ نو جو ہولین، اندھیری (ویسٹ) بمبئی

مطربہ گیت سنا

مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا
آج پھر ساز اٹھا، سوزِ غم اور بڑھا
میری آواز میں پھر اپنی آواز ملا
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

اشک آنکھوں سے بہیں، آتشِ رنج بڑھے
آہِ سوزاں سے تری، گلشنِ زیست جلے
جب دھواں دل سے اٹھے گرمیٔ شوق بڑھا
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

سرخیٔ خونِ جگر لائی ہے رنگِ بہار
درد میں ڈوبی ہوئی سن میرے دل کی پکار
نالۂ غم کو مرے سوئے افلاک اٹھا
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

غنچہ و گل پہ یہاں، کب تلک جور و ستم
ہر قدم خوفِ خزاں، ہر نفس رنج و الم
کس طرح کوئی جئے ایسے موسم میں بتا
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

چھوڑ دے رسمِ جہاں توڑ دے عہدِ کہن
چھیڑ پھر ساز نیا، پھر بدل طرزِ سخن
پھر نیا دور چلے ایک نیا گیت سنا
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

چھین لے بڑھ کے ذرا چاند سورج سے کرن
ظلمتِ دہر مٹا، مہکیں الفت کے چمن
ماہ و انجم سے پرے اک نئی دنیا بسا!
مطربہ گیت سنا، مطربہ گیت سنا

عشرت کرتپوری
محلہ سطھنہ، غازی آباد
(یو،پی)

قمر سنبھلی کی شاعری

(ایک مختصر مطالعہ)

پچھلی دو دہائیوں میں دہلی کے ادبی افق پر جو نوجوان شعرا جلوہ گر ہوئے، ان میں قمر سنبھلی کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ اکثر نوجوان شعرا کی طرح فن اور عروض سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ آج کے میکانکی دور میں کلاسیکی ادب کے مطالعے، تجربات اور مشاہدات کے بغیر محض طبع کی موزونیت کی بنا پر اکثر اپنے آپ کو شاعر کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ سچی اور عظیم شاعری بغیر عصری حسیت، مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کے وجود میں نہیں آتی۔

ہر دور کی شاعری عوام اور ان کے مسائل نیز ملک کے بنتے بگڑتے حالات سے علیحدہ نہیں رہتی، ہر شاعر اپنے عہد کا نقیب ہوتا ہے۔ آج کا دور خوابوں کا دور نہیں ہے۔ بلکہ تلخ و شیریں حقائق کا آئینہ دار ہے۔ اچھا شاعر وہ ہے جو اپنے (ذاتی) غم کو بھی اس انداز سے پیش کرے کہ وہ تمام انسانیت کا غم معلوم ہو۔ قمر کی عظمت یہی ہے کہ اس کا ذاتی غم پوری انسانیت کا غم معلوم ہوتا ہے۔ غالبؔ کا کمال بھی یہی ہے کہ اس نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی شمعیں اپنے خونِ جگر سے روشن کی ہیں۔

قمر سنبھلی اپنے گرد و پیش سے کیسے غافل رہ سکتے تھے ان کی شاعری کی جس خصوصیت نے مجھے متاثر کیا یہ ہے کہ ان کے یہاں ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے، مفاہیم کی ترسیل براہِ راست ہوتی ہے،

ؔ

راکھ کا ڈھیر ہے اب اور نشاں کچھ بھی نہیں
کل مرے گھر کے برابر میں بھی گھر تھا کوئی

ؔ

بنا ہے آگیا شعلوں کی زد میں شہر تمام
ذرا آب آؤ چلیں چل کے اپنا گھر دیکھیں

ؔ

ہمارے صحن میں اتری نہ دھوپ کی دیوی
ہمارے گھر کے عقب سے نکل گیا سورج

ؔ

بن کر صدائے دشت پلٹ آئیں دستکیں
باندھے ہوئے تھے آس کس اجڑے مکاں سے ہم

بظاہر مندرجہ بالا اشعار قمر سنبھلی کے اپنے مسائل کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر ہم غور کریں تو یہ مسائل ہم سب کے مسائل ہیں۔

زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ساتھ ا دب

، قدریں بدلی ہیں، اور یہ غزل کی ہی خصوصیت ہے کہ
یں قدیم تشبیہات، استعارے، تلمیحات بھی بدل
ں۔ اب شانہ، چوٹی، گیسو، چلمن، برق، آشیان
ب و رخسار کی جگہ نئی نئی تشبیہات اور تلمیحات
یں، بعض لوگ روایت سے انحراف کو جدیدیت
ں، حالانکہ روایت سے دیکسر، انحراف نہ تو ممکن
مناسب ! ــــ جو چیز آج جدید ہے کل قدیم ہو جائیگی
ے ہم قدیم کہتے ہیں وہ کل جدید تھی۔
قمر سنبھلی نے اپنے انداز بیان سے اپنی غزل کو
بنا دیا ہے، ؎

تمام عمر گذاری مسافروں کی طرح
فریبِ سایۂ دیوار و در میں ہم بھی تھے

؎

فضا میں گونج کے تارِ صدا ابھی ٹوٹ گیا
لبوں پہ آتے ہی حرفِ دعا بھی ٹوٹ گیا

؎

گفتگو جس نے سنی تیرا طرفدار ہوا
بات کرنے کا ترے پاس ہنر ہے کیسا

؎

خلش تھی دل میں نقابوں میں بند تھے جبتک
کھلے تو اور پُراسرار ہو گئے چہرے

؎

تمام عمر رہے سورجوں کی زد میں ہم!
ہمارے سر پہ کوئی سائبان تھا ہی نہیں

؎

رہا جو ربط کسی سے تو اک تری خاطر
ہوا جو ترکِ تعلق، ترے سبب سے ہوا

؎

شجر سرسبز تھا جبتک تو رہا سب کو عزیز
شاخِ بے برگ پہ اب کوئی پرندہ بھی نہیں

؎

مرے ہی سر پہ لگا اس کے ہاتھ کا پتھر
سلیقہ اتنا کہاں بے ہنر بھی رکھتا تھا

؎ وہ تو پڑھ لے گا ساری تحریریں
تم ہواؤں پہ مدعا لکھ دو

قمر سنبھلی کو اپنے فن اور شاعری پر اعتماد ہے، انہیں اس کا ادراک بھی ہے، اس لئے انہوں نے ہر لفظ کو بہت احتیاط کے ساتھ برتا ہے، اور یہی مشورہ اپنے ہم عصر شعراء کو بھی دیا ہے۔ ؎

بہت سنبھل کے برتنا، ہر ایک لفظ قمرؔ
اگر وہ آج نہیں کل سند میں آئے گا

عام طور پر یہ ہوتا ہے جو شعراء عروض کی تیز چھری سے اپنے اشعار کو تراشتے ہیں ان کے یہاں خشکی تو ہوتی ہے لیکن شگفتگی نہیں ہوتی، قمر نے بھی عروض کی پابندی پوری طرح کی ہے اور اس سے اپنے اشعار کو سنوارا ہے، لیکن شعر کی پرت کمزور نہیں ہونے دی، وہ تاریخی نام، تاریخی قطعات، تاریخی مادّے نکالنے میں بھی اپنے ہم عصروں میں شہرت رکھتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قمر سنبھلی شعراء کی اس بھیڑ میں اپنی شناخت کے لئے بڑی تیزی سے منزل کی طرف گامزن ہیں اور وہ دن دور نہیں جب انہیں کے بقول،

؎ "ہر زباں پر مری غزلوں کے حوالے ہونگے"!

آخر میں اپنے چند پسندیدہ اشعار پیش کر کے اجازت چاہوں گا۔

؎

دھوپ ہے تیز بہت مجھ کو بچائے رکھنا
اے مری ماں کی دعاؤ! یوں ہی سائے رکھنا

؎

زنجیر خدا جانے کس پاؤں میں تھی پہلے
زنجیر سے برسوں تک خوشبوئے وفا آئی

؎

رفیق مخلص بہت خود کلامیاں اپنی
حیات ورنہ اکیلے گذارتے کیسے!

تبصرہ نگار:۔
م۔ ناگ
۶ باندرہ پیراڈائز
۳۳ ویں روڈ کھار بمبئی ۴۰۰۰۵۲

"پتھروں کے گیت"

افسانہ نگار:۔ محمود بالیسری

قیمت:۔ ۲۵ روپئے

ناشر:۔ ایڈشاٹ پبلیکیشنز ۲۲/۱۸ ٹنڈیل اسٹریٹ ڈونگری بمبئی ۹

"پتھروں کے گیت"، محمود بالیسری کی بیس کہانیوں پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ افسانوں کا انداز روایتی ہے۔ محمود صاحب ۱۹۵۰ء سے کہانیاں لکھ رہے ہیں اس بیچ کہانیوں میں تکنیکی اعتبار سے کئی تبدیلیاں آئیں۔ اتار چڑھاؤ آئے۔ فارم ٹوٹا۔ کہانیوں کا چولا ہی بدل گیا مگر محمود صاحب کی کہانیوں کا فارم نہیں بدلا۔

ان کے افسانوی سفر سے متعلق دیباچہ نگار جناب سلام بن رزاق رقمطراز ہیں۔ "محمود بالیسری نے افسانوی ادب میں کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ نہ انھوں نے نئی زمینوں کو دریافت کیا۔ البتہ وہ ایک ثابت قدم رہرو کی طرح ہر گام پر افسانے کے ساتھ سرگرم سفر رہے ہیں اس اعتبار سے وہ قابل ستائش ہیں کہ افسانے کے ساتھ اتنی طویل ہمسفری بھی کتنوں کو راس آتی ہے۔

اڑیسہ جیسے ادب بنجر علاقے میں رہتے ہوئے افسانے تخلیق کرنا اپنے آپ میں ایک بڑی بات ہے۔ ان کے یہاں عصری حسیت اور آگہی ہونے کی وجہ سے ان کا فارم نئے انداز میں برتا ہوا لگتا ہے۔ وہ ۱۹۸۰ء سے آج ۱۹۸۰ء تک کسی واقعہ یا اتار چڑھاؤ سے بے خبر نہیں ہیں۔ انھوں نے اتنے لمبے عرصے کی تمام زندگی کو اپنی تیز نگاہوں سے جانچا پرکھا ہے اور ان کے اس رویہ سے فارم میں تازگی آگئی ہے ان کی عصری حسیت ۱۹۵۴ء سے ۱۹۸۰ء تک ایک پل کا کام کرتی ہے جو آج ۱۹۶۰ء کے بعد والی افسانوی نسل سے انھیں جوڑتا ہے اور وہ اجنبی نہیں لگتے۔ ان کے یہاں سب کچھ پرانا ہوتے ہوئے بھی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نیا لگتا ہے اور وہ ایک تازہ کار اسلوب لے کر سامنے آتے ہیں۔

"فری لانڈر کا گلاب"، "جوکر"، "رقص ابلیس"، وغیرہ اچھی کہانیاں ہیں جو افسانے پر لگے مندرجہ ذیل الزامات کو پوری طرح غلط تو نہیں ثابت کرتیں۔ مگر غور و فکر کی دعوت ضرور دیتی ہیں۔

جیسے "دیہات پر افسانے نہیں لکھے جارہے ہیں"

"افسانوں میں جمالیات نہیں ہے"

"قصہ گوئی کی وہ روایت نہیں ہے جو پریم چند کے ادب کا خاصہ رہی ہے۔ یہ ان چند افسانے ہیں پیروی کے لئے مواد ضرور فراہم کرتے ہیں۔"

ویسے کہیں کہیں جزئیات زیادہ ہونے سے کہانی کا کینوس بلا وجہ کھنچ گیا ہے۔ کہیں کہیں بڑی اچھی تمثیلیں ضائع ہوئی ہیں۔ مگر آج کہانیوں کا دور میں ہم ان کے قصہ پن کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ بہت خوبصورت لکھی بھی گئی ہے۔ اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

آزادی کی چالیسویں سالگرہ کی تقریبات اور پنڈت جواہر لال نہرو کی یوم ولادت کے سلسلے میں ہونے والے پروگرام کے لئے قائم کردہ ریاستی سطح کمیٹی کی پہلی میٹنگ ۲ جون ۱۹۸۶ء کو راج بھون بمبئی میں منعقد ہوئی اس موقعہ پر گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے صدر کے فرائض انجام دیئے۔
تصویر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان ودھان سبھا کے اسپیکر شری شنکر راؤ جگتاپ، مرکزی وزیر مملکت برائے سائنس و ٹکنالوجی شری شیوراج پاٹل، وزیر تعلیم پروفیسر رام میگھے۔ ایم۔ ایل۔ اے شری شردیوار دیکھے جا سکتے ہیں۔

خبریں - تصویروں میں

...ر بھاؤ راؤ پاٹل صد سالہ جشنِ ولادت پر منی... ج مہاراشٹر مانس اور قومی راج کے خصوصی... کا اجرا ۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو وزیر اعلیٰ... شنکر راؤ چوان کے ہاتھوں منترالیہ میں...

تصویر میں بائیں سے دائیں) ڈاکٹر شری... بکار وزیر مملکت برائے اطلاعات و... عامہ۔ ایم ایل۔ اے شری تینگ راؤ... لاعات و رابطہ عامہ کے ڈائرکٹر جنرل... بودمانے انا صاحب پاٹل وزیر اعلیٰ... کر راؤ چوان اور وزیر تعلیم پروفیسر رام میگھے... جا سکتے ہیں۔

شنکر۔ وزیونز اور ریاستی وزیر
۲۰ رجولائی ۱۹۹۶ء کو بمبئی لے سہار
میں ج کو الوداع کیا۔ اس موقع

آسفہ پبلی کیشنز کی جانب سے اردو کے شاہکار افسانوں کا مراٹھی میں ترجمہ کر کے "افسانہ نمبر" کی افتتاحی تقریب باندرہ کے نیشنل لائبریری ہال میں ۱۲ رجولائی کو منعقد کی گئی۔ زیر نظر تصویر میں ڈائرکٹر آف انفارمیشن اینڈ پبلک ۔ شری رمیش وانگاونکر سامعین سے خطاب فرما رہے ہیں تصویر میں شری باقر مہدی۔ پروفیسر کیشو میشرام اور شری رام پنڈت بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

قارئین کی رائے

★ ڈاکٹر محمد منشاالرحمٰن خاں منشا
(بی۔ اے، (اردو) ایم۔ اے (دینیات) ایل۔ ٹی۔ پی ایچ ڈی)
ملا۔ اسٹار کی اوان منگل بازار ناگپور ۴۴۰۰۰۱

ماشاءاللہ آپ خصوصی نمبر پیش کرکے اردو زبان و ادب کی بڑی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔
"قومی راج"، کا قدیم پرستار اور قلمی معاون ہوں، اور اس کی دن دونی ترقی کے لئے دعاگو۔

○

★ اختر شاہجہاں پوری
رنگین چوپاں ... حاں کاپل شاہجہاں پور ۲۴۲۰

ایک ضروری گذارش یہ ہے کہ سرکاری رسائل تقریباً سب ہی میرے مطالعے میں ہیں۔ آپ بھی ضرور پڑھتی ہوں گی جتنا سرکاری مواد اس رسالے میں ہوتا ہے اتنا کسی دوسرے رسالے میں نہیں۔ مثال کے طور پر آپ تعمیر (ہریانہ) پاسبان (چنڈی گڑھ) آج کل (دہلی) نیا دور (لکھنو) وغیرہ دیکھیں۔ اگر ادبی مواد، ترقیاتی مواد سے بڑھ جائے تو اس رسالے کا حسن بڑھ جائے گا اور اس کا شمار بھی ادبی رسائل میں ہونے لگے گا۔
مجھے امید ہے آپ اس سلسلہ میں غور فرمائیں گی۔

○

★ [illegible]
[illegible] ۴۲۲۰۰

آپ کا جریدہ پابندی سے نظر نواز ہوتا ہے ... خبروں کے ... ادبی مواد میں اضافہ کیا جائے تو اہل حلقوں میں بھی قومی راج دلچسپی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ بمبئی جیسے مقام پر ادبی معاونین کی کمی نہیں ہے ان سے قلمی تعاون حاصل کرکے "قومی راج" کو مزید دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔

"قومی راج"، کا بجٹ نمبر"، سامنے ہے۔ مراٹھی کہانی "سادھو" کا ترجمہ پسند آیا۔ کتابوں پر فیاض رفعت صاحب کے تبصرے عام طور پر جاندار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کو برقرار رکھنے کیلئے شعری حصے پر توجہ کی ضرورت ہے۔

○

★ خورشید نعمانی
خالق فلیٹس، ۱۸۰-اے، پائپ روڈ کرلا (ویسٹ) بمبئی

آپ لوگوں نے ماشاءاللہ مخصوص نمبر شائع کرنے میں اختصاص حاصل کرلیا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

○

★ رفیق جعفر
۱۲/۶۱ - مالونی کالونی نمبر ۶۔ باندرہ پلاٹ پوسٹ کھارودی
بمبئی ۴۰۰۰۹۵

۱۰ اپریل ۱۹۸۷ء کا شمارہ ملا۔ یہ مہاراشٹر بجٹ ۸۸-۱۹۸۷ء کے بابت ہے۔ بجٹ کے متعلق تفصیلی معلومات اسی رسالہ میں ملیں۔ بہرحال "قومی راج" کے ہر شمارہ میں کچھ نہ کچھ مواد ایسا مل ہی جاتا ہے جو کسی دوسرے رسالہ میں نہیں ملتا اور خاص طور پر اردو کے کسی رسالے میں تو بالکل ہی نہیں۔ کیونکہ ہمارے اردو رسالے زیادہ تر افسانوں اور غزلوں سے بھرے ہوتے ہیں ایسے میں "قومی راج"، کا وجود فال نیک ہے۔

اس بار مراٹھی کہانی "سادھو"، کا ترجمہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ سلام بن رزاق نے اس کہانی کو اردو کے قالب میں اچھی طرح ڈھالا ہے۔ اگر ہر شمارے میں مراٹھی کی ایک کہانی یا ڈرامے کا ترجمہ شائع کیا کریں تو اردو والوں کے لئے مفید ہوگا۔ مراٹھی کہانی اور مراٹھی ڈرامے کی اہمیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ اس ترقی سے اردو والے واقف بھی ہوتے رہیں گے اور متاثر بھی۔

وزیر محصول ولاس راؤ دیشمکھ سے لیا ہوا انٹرویو معلوماتی ہے۔ "وزیر اعلیٰ چوان کی حکومت کا ایک سال"، سے ان کی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے۔
رویندر جین کی کتاب "اُجالوں کا سلسلہ"، پر جناب فیاض رفعت صاحب کا تبصرہ مختصر اور مفید ہے۔ ڈاکٹر حقیر آستانی کی نظم "اے میرے اہل وطن"، پسند آئی۔ غزلوں کا انتخاب بھی خوب تر ہے۔

○

PRINTED AT THE GOVT PHOTOZINCO PRESS PUNE 1987

گیتانجلی سے

پائدان تیرا یہاں ہے اور چرن وہاں، جہاں اتی دین ہین اور تباہ حال لوگ رہتے ہیں ؛

جب میں تیرے ادب کے لئے سر جھکاتا ہوں تو میرا نمسکار اس گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا. جہاں اتی دین ہین اور برباد لوگوں کے درمیان تیرے چرن ہوتے ہیں ؛

جہاں تو اتی دین ہین اور تباہ حال لوگوں کے درمیان نمرتا کی پوشاک پہنے چلتا پھرتا ہے۔ وہاں غرور کبھی بھی نزدیک نہیں پھٹک سکتا ؛

جہاں تو اتی دین ہین اور تباہ حال لوگوں کے درمیان بے یار و مددگار کے ساتھ بطور دوست بن کر رہتا ہے، میرا دل وہاں کا راستہ کبھی بھی تلاش نہیں کر سکتا ؛

(گیتانجلی)

انت میں پریم کے کرکملوں میں اپنے آپ کو نچھاور کرنے کے لئے کیول میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی سے اتنی دیر ہوئی ہے اور اسی سے اتنی خامیاں ہوئی ہیں ؛

لوگ اپنے رواجوں اور بندھنوں میں مجھے جکڑنے کیلئے آتے ہیں لیکن میں انھیں سدا ٹال دیتا ہوں کیوں کہ میں تو محض پریم کے کرکملوں میں اپنے آپ کو نچھاور کرنے کے لئے اس کی انتظار کر رہا ہوں ؛

لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں اور مجھے لاپرواہ کہتے ہیں. بلاشبہ ان کا الزام لگانا ٹھیک ہے ؛

بازار کا وقت ختم ہو گیا اور بیوپاریوں کا کام بھی سب ختم ہو گیا جو مجھے فضول بلانے آئے تھے ناراض ہو کر لوٹے۔ انت میں پریم کے کرکملوں میں اپنے آپ کو نچھاور کرنے کے لئے میں کیول اس کا انتظار کر رہا ہوں ؛

(گیتانجلی)

(ریج)

خالد کفایت

ایم اے، بی ایڈ، (علیگ)

جنرل سکریٹری ہم عصر (رجسٹرڈ)

عصمت منزل، موتی بازار ۔ مالیر کوٹلہ

۱۴۸۰۲۳

اندھیرے کا قتل

گذشتہ شام دھندلکوں نے روشنی سے کہا
وہ دور آیا کہ تھا جس کا انتظار ہمیں
زمانہ بیت گیا روشنی سے ٹکراتے
کہ ہم تھے صدیوں سے سورج سے برسرِ پیکار
مگر شکست لکھی تھی ہماری قسمت میں
کہ ٹوٹ جائیں بلا سے، لچک نہیں سکتے

پر آج ہم نے اجالوں کو مات دیدی ہے
عمیق بحر میں سورج کو غرق کر آئے
حسین شنگرفی کرنیں افق پہ تنہا تھیں
اندھیرے شہر کے زنداں میں انکو پھینکدیا
زمانہ اوڑھ چکا ہے ردائے تاریکی
جہاں کی مانگ اندھیروں سے ہم نے بھردی ہے
اب اختیار میں اپنے ہے انتظامِ جہاں
کہاں اندھیرے کہاں روشنی سرگرداں
ابھی دھندلکے اندھیروں کا روپ دھاریں گے
ہر ایک ذرۂ تاباں پہ شب خوں ماریں گے
ہمارے جسم بڑھیں گے، عظیم تر ہونگے
وہ ایک پل میں شہنشاہِ بحر و بر ہونگے
ابھی یہ گفتگو تشنہ، یہ بات ادھوری تھی
کہ ایک ننھا سا مٹی کا دیپ جل اٹھا
اڑا خیال کے پردے سے روئے تاریکی
جہاں تہاں سے اندھیرے کا جسم پھٹنے لگا

جوشِ پیہم کا مقام
اگست کرانتی میدان

آزادی کا ترانہ اسی عظیم اور مقدس سرزمین سے گونجا تھا۔
"پیغامِ بیداری" کا نعرہ
"ہندوستان چھوڑ دو"
یہیں سے بلند ہوا تھا
باپو کا آزادی کے لئے عزم بھی یہیں سے مستحکم ہوا تھا۔
آیئے یہاں کی مقدس مٹی کو ہم سلام کریں
اور آنکھوں سے لگائیں۔
آیئے ہم اپنے دیش کو مضبوط اور خوش حال بنائیں۔
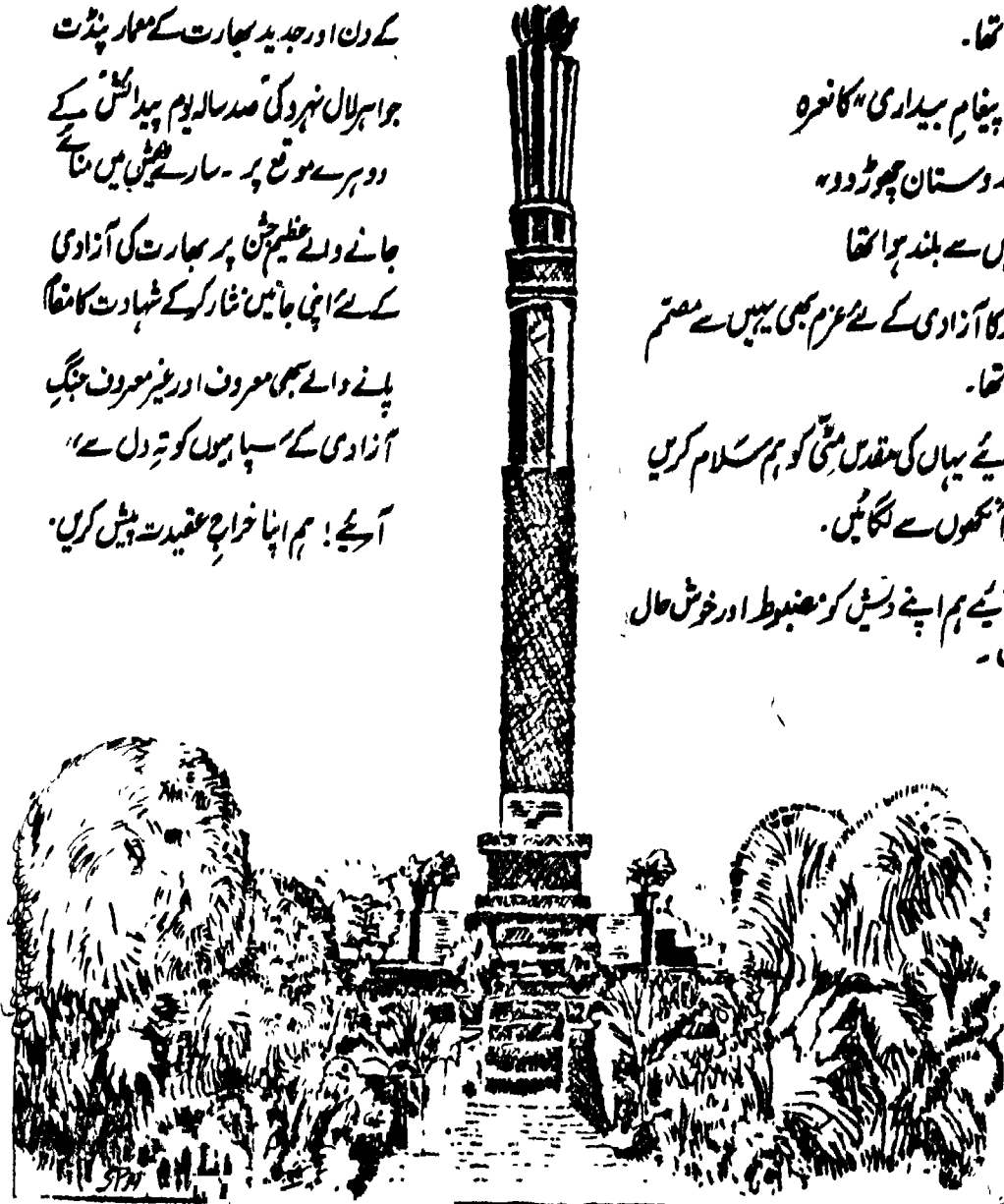
بھارت کی آزادی کے چالیسویں سالگرہ کے دن اور جدید بھارت کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو کی صد سالہ یوم پیدائش کے دوہرے موقع پر۔ سارے دیش میں منائے جانے والے عظیم جشن پر بھارت کی آزادی کے لئے اپنی جانیں نثار کرکے شہادت کا مقام پانے والے بھی معروف اور غیر معروف جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو تہ دل سے،
آیئے! ہم اپنا خراجِ عقیدت پیش کریں۔

جاری کردہ:۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ حکومت مہاراشٹر منترالیہ بمبئی ۳۲
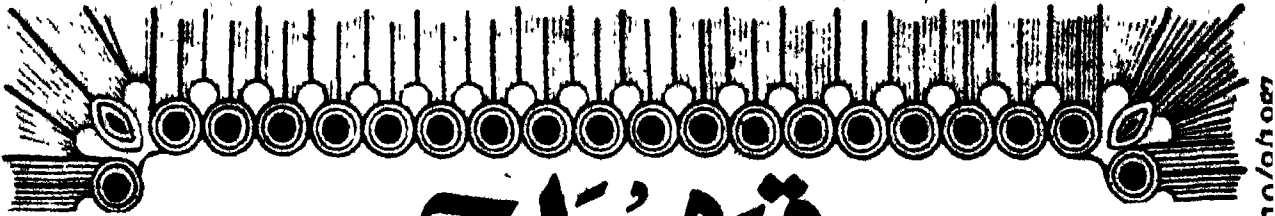
قومی راج

جلد ۱۲ شمارہ ۹ — ۱۰ ستمبر ۱۹۸۷ء

مراٹھی، ہندی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو زبان میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

زرِ سالانہ :- دس روپئے — قیمت فی شمارہ :- ایک روپیہ

چیف ایڈیٹر :- پرمود مانے — ایڈیٹر :- فیروزہ فیاض خان

سب ایڈیٹر :- عبداللہ

مراسلت کا پتہ :

ایڈیٹر قومی راج (پندرہ روزہ)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر،
۱۵واں منزلہ۔ نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ، مقابل منترالیہ،
بمبئی ۴۰۰۰۳۲۔

شرح خریداری

ایک سال کے لئے	دس روپے
دو سال کے لئے	بیس روپے
تین سال کے لئے	ستائیس روپے
چار سال کے لئے	چھتیس روپے
پانچ سال کے لئے	پینتالیس روپے

* ترسیل زر کا پتہ :-

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن) ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، گورنمنٹ آف مہاراشٹر
بیرک نمبر ۱۹ مقابل مروچی بلڈنگ۔ نزد منترالیہ۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

شری سید احمد
وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ،
حکومت مہاراشٹر،

بے گھروں کے لئے گھر
عالمی سال سنہ ١٩٨٧ء

ریاستِ مہاراشٹر کی کارکردگیوں کا جائزہ

گھر انسانوں کی بنیادی ضرورت ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں گھروں کی مانگ اور اس کی فراہمی کے درمیان کافی فاصلہ ہے جس کی وجہ سے سماج کے کمزور طبقات گھروں کو خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس لئے کمزور طبقات کے لوگوں کو گھر فراہم کرکے گھروں کے مقررہ نشانے کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومتِ مہاراشٹر نے اس سلسلے میں صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے مناسب اقدامات کئے ہیں۔

بمبئی ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ بورڈ، مہاراشٹر ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی ایک یونٹ ہے جس کا قیام مہاراشٹر ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ ایکٹ سنہ ١٩٧٦ء کی روشنی میں قائم کیا گیا۔

اتھارٹی کو قائم کرتے وقت اس میں چار ریجنل بورڈ، اور مندرجہ ذیل باڈیز اس کے زیر اثر قائم کی گئیں۔

(١) مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ۔
(٢) ودربھا ہاؤسنگ بورڈ۔
(٣) بمبئی بلڈنگ ریپیر اینڈ ری کنسٹرکشن بورڈ۔
(٤) مہاراشٹر سلم امپرومنٹ۔

مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ سنہ ١٩٤٨ء میں قائم کیا گیا جس کا حلقہ اختیار سوائے ودربھا علاقہ کے تمام ریاست تک وسیع کیا گیا۔ اس باڈی کے تحت سماج کے مختلف حصوں اور مختلف اسکیمات کے تحت عمارتوں کی تعمیر کا کام خاص طور سے سپرد کیا گیا۔ مکانات کا الاٹمنٹ اور ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اسے سونپی گئی۔ اتھارٹی کے قیام کے بعد مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ، بمبئی بلڈنگ ریپیر اینڈ ری کنسٹرکشن بورڈ اور سلم امپرومنٹ بورڈ کو ایک دوسرے میں ضم کرکے بمبئی ہاؤسنگ اینڈ ایریا ڈیولپمنٹ بورڈ قائم کیا گیا جس کے ذمہ بمبئی عظمیٰ کی دیکھ بھال اور ضلع کے مقامات کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سنہ ١٩٤٨ء سے بی ایچ اور اے۔ ڈی بورڈ کے قیام سے قبل ایچ۔ بی نے ٩٢٨٨٦ مکانات ٥٩٣٥ ازین بھرتی کئے گئے پلاٹ اور ٢٩ کوآپریٹیو سوسائٹی پلاٹ مارچ سنہ ١٩٨٦ء تک بمبئی میں تعمیر کئے۔

…وارہ کے ذریعے فزیکل، فنانشیل نشانہ اور سال ۱۹۸۶ء۔۸۷ کی کارگردگی کا جائزہ پیش کیا گیا۔

شمار	اسکیمات کی تفصیلات	تعمیراتی نشانہ	تعمیراتی سرگرمیاں (مارچ ۱۹۸۶ء تک)	مالی نشانہ	مالی سرگرمیاں (مارچ ۱۹۸۶ء تک)
۱	عمارتوں کی مرمت	۸۲۵ (بلڈنگ)	۸۰۰ (بلڈنگ)	(روپے لاکھ میں) ۱۲۷۲ء۲۵	۱۲۷۲ء۳۱
۲	عمارتوں کی دوبارہ تعمیر	۸۴۲ مکانات	۹۶۲	۲۹۹ء۵۶	۴۴۳ء۳۲
۳	ٹرانزٹ کیمپ (مکانات)	۷۵۰ مکانات	۴۴۱	۲۷۵ء۳۸	۱۲۳ء۳۸
۴	سلم امپرومنٹ ورکس	۱۸۴۰۸	۱۸۴۷۵۰	۴۷۴ء۷۱	۵۱۱ء۴۲
۵	ہاؤسنگ اسکیمات				
	ایل۔آئی۔جی۔ایچ۔ایس	۴۸۰ مکانات	۴۸۰ مکانات		
	ایم۔آئی۔جی۔ایچ۔ایس	۲۹ + پلاٹ ۶۹۱ مکانات ۱۰۵ + پلاٹ	۱۷۵ مکانات		
(۶)	سلم	-	-		
(۷)	ای۔ڈبلیو۔ایس	۲۰۵۰	۹۰۰		

…یچ اینڈ اے ڈی بورڈ بمبئی کے مستقبل کے پروجیکٹ

(۱) دین دوشی ملاڈ میں ایم۔آئی۔جی کے تحت ۱۴۰ مکانات
(۲) دین دوشی ملاڈ میں ایچ۔آئی۔جی کے تحت ۳۰ مکانات
(۳) ملاڈ دین دوشی میں ۱۶ مکانات + ۸ دکانیں
(۴) کرلا چونا بھٹی میں ایچ۔آئی۔جی کے تحت ایس نمبر ۲۹۲ (جزو) ۲۰۴ مکانات۔
(۵) گھاٹ کوپر پنت نگر میں ایم۔آئی۔جی + ایل۔آئی۔جی پلاٹ ۲۶۰ مکانات
(۶) وکھرولی کنور نگر میں ایچ آئی جی کے تحت ۸۰ مکانات
(۷) دھوبلا ریلنڈ پر ایم۔آئی۔جی کے تحت ۱۶۰ مکانات
(۸) سیوری وڈالا پر ایم آئی جی کے تحت ۴۰ مکانات
(۹) سانتا کرز آنند نگر پر ایم آئی جی کے تحت ۴۰ مکانات
(۱۰) بوریولی اکسر پر ایچ آئی جی کے تحت ۱۲۰ مکانات
(۱۱) پوئسر پر شاپنگ رہائشی یونٹ

حکومت مہاراشٹر نے اس معاملہ پر بخوبی غور کرنے کے بعد ایسے رہنمایانہ خطوط مقرر کئے ہیں جن کے ذریعے فاضل آراضی کے مالکوں کی حوصلہ افزائی مقصود ہے۔ ان رہنمایانہ خطوط کے تحت ایسی آراضی ۷۰ فیصد حصہ جہاں فاضل آراضی ایک ایکڑ سے زائد ہوگی، جنھیں کمزور طبقات اور کم آمدنی والے گروپ کے مکانات کے لئے استعمال کیا جائے گا
قومی راج

۲۵۰۰۰ روپئے سے کم آمدنی والے گروپ میں شامل کیا جائے گا
یہ مکانات ایسے خاندانوں کو تقسیم کیے جائیں گے جن کی سالانہ آمدنی
۱۵۰۰۰ روپئے سالانہ سے کم ہوگی اور جو بمبئی کے شہری حلقے میں
کل رہائشی مکانات کا ۶۵ سے ۷۰ فیصد تک ہیں۔ یہ حساب مختلف آمدنی
والے گروپوں کو مکانات مہیا کرنے کی استطاعت کے مطابق لگایا گیا ہے۔
مختلف آمدنی والوں کی رہائشی یونٹوں کے لیے مناسب ملے جلے مکانات
ہوں گے جو قطعاً بمبئی چالیں ایک کمرہ پر مشتمل ہوں گے ان میں سے
ہر ایک کی تعمیر پر زیادہ سے زیادہ خرچ ۲۵۰۰۰ روپئے ہوگا فاضل
زمین کا ۳۰ فیصد حصہ کمرے تعمیر کرنے میں استعمال ہوگا اس ۳۰ فیصد
آراضی کے نصف حصے پر پلنتھ کے اوپر ۴۰ مربع میٹر سے کم رقبہ والے
کمرے ہوں گے اور باقی نصف حصہ ایسے کمروں کے لیے استعمال کیا
جائے گا جن کی پیمائش یا رقبہ ۴۰ مربع میٹر سے تو زیادہ لیکن ۸۰ مربع
میٹر تک ہی ہوگا جہاں فاضل زمین ۴۰۰ مربع میٹر تک ہوگی وہاں پوری
زمین کمزور طبقوں کی رہائش گاہ کے لیے استعمال کی جائے گی یعنی ہر طرح
کی سہولت فراہم کردہ قطعات نیز بیٹھی چالوں اور مکانات کے لیے جو
پلنتھ سے اوپر ۴۰ مربع میٹر والے ہوں گے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بمبئی میں کانگریس
کے صد سالہ جشن کی منعقد تقریب میں ہاؤسنگ اور سلم سدھار کے
مسائل پر قابو پانے کے لیے بمبئی شہر کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپئے
کی گرانٹ کا اعلان کیا۔ یہ رقم ساتویں پنجسالہ پلان کے بقیہ سالوں کے
دوران ملے گی۔

۱۰۰ کروڑ روپئے کی خصوصی گرانٹ سے وضع کیے جانے
والے پروجیکٹ (پی۔ ایم۔ جی۔ پی)

اس پروجیکٹ کے ذریعے ۲۸۳ کروڑ روپئے کی رقم سے
وضع کی جانے والی اسکیمات درج ذیل ہیں۔

پروجیکٹ	پی ایم گرانٹ	مالیاتی اداروں سے قرض	دیگر ذرائع سے فنڈ کی فراہمی	کل رقم	رزلٹ فیملی
دھاراوی	۳۷	۶۵	۲۰	۱۲۲	۵۵۰۰۰
اربن بیلٹ	۴۱	۱۳	۱۰	۶۴	۱۳۰۰۰
سلم سدھار	۲۲	۵۵	۲۰	۹۷	۵۵۰۰۰
	۱۰۰	۱۳۳	۵۰	۲۸۳	۱۲۲۰۰۰

دھاراوی ترقیاتی پروجیکٹ:

جیسا کہ اوپر پیش کیا گیا ہے مرکزی امداد (گرانٹ) سے
۳۷ کروڑ روپئے مختص کر دیئے گئے ہیں۔ دھاراوی کا علاقہ
ایشیا بھر میں سب سے بڑا سلم علاقہ تصور کیا جاتا ہے جو تقریباً
۲ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے اور جہاں تین لاکھ افراد کی
آبادی ہے۔ اس پروجیکٹ کے لئے جو اخراجات مختص کیے
گئے ہیں وہ خصوصی طور پر منصوبوں کی فوری تکمیل کے لیے مختص ہیں
اس مقصد کے لیے بلاک اور ایریا سطح پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے
دوسری جگہوں پر منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام بمبئی میونسپل
کارپوریشن اور بمبئی میٹروپولیٹن علاقائی ترقیاتی اتھارٹی کے ذریعہ
کیا جائے گا خصوصی اختیارات تفویض کر کے خصوصی اتھارٹی کا تقرر
کر دیا گیا ہے۔ یہ اتھارٹی اس علاقہ کے لیے منصوبہ بند اتھارٹی کے
فرائض بھی انجام دے گی۔ سلم آبادی کی کم سے کم تعداد دوسری جگہ
منتقل کرنے اور تجارتی حلقہ کو ہٹانے کا کام انجام دینے کے لئے ایک
جامع پروگرام مرتب کر دیا گیا ہے۔ ہڈکو نے اصولاً اس بات کو تسلیم
کر لیا ہے کہ وہ ۶۲ کروڑ روپئے تک کی مالی امداد مکانات وغیرہ
کی مرمت کے لیے دے گی۔ دھاراوی علاقہ کا ترتیب وار جائزہ
اور سماجی و معاشی جائزے کے کاموں کی تکمیل بھی ہو چکی ہے
فروری ۱۹۸۷ء تک اس بات کا جائزہ لینے پر ۱٫۴۴ لاکھ روپئے
تک خرچ کیے جا چکے ہیں۔

شہری تجدید نو:

تعمیراتی مرمت اور از سر نو تعمیراتی کام بمبئی میں مکانات کے
سلسلے میں ایک اہم سرگرمی ہے۔ یہاں ۱۹۶۴۲ بلڈنگوں کو "سیس
بلڈنگ" کے بطور ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ کام ۱۹۶۹ء سے جاری ہے
اور اب تک ۱۰۲۹۷ بلڈنگوں کی مرمت کا کام پورا کیا جا چکا ہے
مارچ ۱۹۸۷ء تک تقریباً ۲۰۰ بلڈنگوں کی از سر نو تعمیرات مکمل کی
گئیں۔ اس سرگرمی کو بہ شدت آگے بڑھانے کے لیے حکومت
نے مختلف اقدامات کیے ہیں۔ حکومت نے ایک قانون کے تحت
پرانی بلڈنگوں کے کرایہ داروں کو ماہانہ کرایہ کا ۱۰۰ گنا ادا کر کے
اپنی رہائشی جگہ کے مالکانہ حقوق بھی دئیے ہیں، بشرطیکہ وہ مالکانہ
حقوق کے لیے امداد باہمی سوسائٹیاں بنا لیں۔ اس لحاظ سے

۲۰ نکاتی پروگرام میں خصوصی طور پر جس بات کو اہمیت دی گئی ہے اس کے پیش نظر اور ۱۹۸۷ء کو بحیثیت بین الاقوامی سال برائے بے گھروں کے لئے مکانات کے اعلان کے تحت حکومت نے ایم۔ ایچ۔ اے۔ ڈی اے کو اس بات پر خصوصی توجہ دینے کے لئے کہا ہے کہ وہ مکانات کی تعمیراتی سرگرمیوں کو بڑھا دے۔

اب تک مکانات کی جو تعمیر کی گئی ہے ان میں سے تقریباً ۵۰۰۲۰ رہائشی مکانات سلم بستیوں میں آباد لوگوں کی باز آبادکاری کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں۔ سلم بستیوں میں رہائش پذیر لوگوں کو رہائش دینے کا خیال کافی عرصہ پہلے ہی ترک کیا جا چکا ہے۔ حکومت کی فی الحال یہ پالیسی ہے کہ موجودہ کالونیوں میں آباد لوگوں کو ہر طرح کی بنیادی سہولتوں سے نوازا جائے اور اگر عوامی مقصد کے لئے ان سلم بستیوں میں آباد لوگوں کی جگہوں کی ضرورت پیش آئے تو ان لوگوں کو دوسرے علاقوں میں متبادل جگہ دے دی جائے گی۔ ساتویں پنجسالہ منصوبہ میں بمبئی اور مضافات بمبئی کے تقریباً ایک لاکھ جھونپڑ پٹیوں کو ۲۲ کروڑ روپے کے صرفہ سے اچھے رہائشی مکانات میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ان میں رہائش پذیر افراد اگر اس اسکیم سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں تو انہیں معمولی شرح پر حکومت اور میونسپل کی زمینوں پر پٹہ حقوق دئے جائیں گے بشرطیکہ یہ زمینیں ترقیاتی منصوبوں میں شامل نہ ہوں۔ اس اسکیم پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ یہ اسکیم نیز سلم آبادیوں کے معیار زندگی کو اونچا اٹھانے کے لئے جو اسکیمات جاری ہیں وہ بمبئی کے علاوہ دوسرے کارپوریشن شہروں میں بھی رائج العمل ہیں۔

مالونی میں ۷۶ پلاٹ نابینا افراد کے لئے مختص کر دینے کی تجویز آئی، وائی، ایچ، ایس کے دوران کی گئی ہے جو یقیناً ایک نمایاں کارکردگی ہے۔ بمبئی کے علاوہ ریاست مہاراشٹر کے دوسرے اہم مرکزوں میں بھی آئی۔ وائی۔ ایس۔ ایچ کے تحت ۷،۸۰ اسکیمات پر عمل درآمد کرنے کے منصوبے بنائے گئے ہیں۔

سولاپور میں بیڑی بنانے والے مزدوروں کے لئے ۱۰۰۰۳ مکانات بنانے کا کام جاری ہے۔ ان میں سے ۲۸۴۵ مکانات کی تعمیر اس سال مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ حکومت ہند نے بیڑی ورکرس ہاؤسنگ کے منصوبہ میں امداد دینے کی اسکیم پر از سر نو غور کیا ہے۔ مارچ ۱۹۸۶ء سے امداد کی رقم کو ۳۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰۰ روپے کر دیا گیا ہے۔

سولاپور میں حمالوں کے لئے ۲۰۰۰ مکانات کی اسکیم پر بھی عمل آوری شروع کر دی گئی ہے۔ پونے میں بیڑی مزدوروں کے لئے ۴۸۰۰ مکانات بنانے کی تجویز رکھی گئی ہے جن میں سے ۶۰۰ مکانات کی مارچ ۱۹۸۶ء کے اختتام تک تعمیر ہو جانے کی امید ہے۔ یہ بات بھی زیر غور ہے کہ اس سال تعمیراتی کام میں جٹے ہوئے مزدوروں کے لئے کوئی اسکیم رائج کی جائے۔

کامٹی میں ناگپور کے قریب ہی بیڑی مزدوروں کے لئے ۱۰۰ مکانات اور ۲۰۰ پلاٹس کی اسکیم رائج کی گئی ہے۔

مراٹھواڑہ، اورنگ آباد، اور جالنہ میں بھی بیڑی مزدوروں کے لئے ہاؤسنگ پروجیکٹ جاری کرنے کی ایسی اسکیمات وضع کی جانے والی ہیں جن کے تحت ۴۰۰ مکانات یا ۳۰۰ مکانات سے زیادہ تعمیری کام کو انجام دیا جائے گا۔ اورنگ آباد میں جسمانی طور پر معذور افراد کے لئے مکانات الاٹ کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے۔

ریاست کے دیگر اہم مقامات پر جہاں بیڑی مزدوروں کی کافی تعداد آباد ہے ان کے لئے بھی آئندہ سالوں میں ایسی ہی اسکیمات وضع کئے جانے کا معاملہ زیر غور ہے۔

ناگپور میں بنکروں کے لئے مکانات اور ورک شیڈ بنانے کی اسکیم بھی جاری ہے۔

ایم۔ ایچ۔ اے۔ ڈی۔ اے کی جانب سے معاشی طور پر کمزور طبقات اور کم آمدنی والے گروپ کے افراد کے لئے جو ہاؤسنگ پروگرام حسب معمول جاری ہیں ان کے علاوہ اوپر مذکور دیگر پروگرام جاری کئے گئے ہیں۔

یشور ساج ماتھر
ابق صدر ناظم، اطلاعات و رابطہ عامہ، حکومت مہاراشٹر
/۳۸۸، روڈ نمبر ۲۲، جوبلی ہلز، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۴
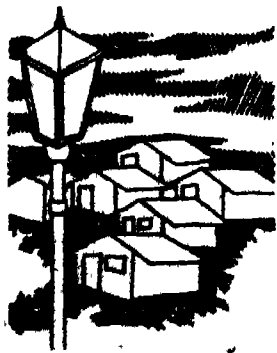
تہواروں کی اہمیت

زمانۂ قدیم میں یونانی اور رومن قومیں سال کا ایک خاطرخواہ حصہ عام تہواروں کے منانے کے لئے مختص کیا کرتی تھیں۔ اُن خوشی کے موقعوں پر کھیل کود کے مظاہرے، مذہبی جلوس، خاص رسومات، شہسواری اور کشتیوں کے مظاہروں کا انعقاد ہوتا۔ ان تہواروں کو قومی تہواروں کی حیثیت حاصل تھی۔ جس میں عوام تو شریک ہوتے ہی تھے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت اور شاہی سرپرستی بھی حاصل ہوتی۔ زمانۂ قدیم کے تہواروں کی اہمیت موجودہ *Jet Age* میں کچھ کم ہوگئی ہے۔ لیکن مشرق میں اور خاص کر ہندوستان میں ان قدیم روایات، تہواروں، جلسوں اور جلوسوں کی سماجی مذہبی اور موسمی اہمیت اب بھی باقی ہے اور وہ بڑے جوش و خروش اور تزک و احتشام سے منائے جاتے ہیں۔

جدوجہد زندگی میں عام لوگ اس قدر منہمک
ہوجاتے ہیں کہ ان کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی
ی خوشی، مذہبی فرائض اور روحانی معاملات کی طرف
ں توجہ دیں۔ یہ تہوار ایسے مواقع فراہم کرتے ہیں کہ
ں بھکتی، بھاؤ، عقیدت، عبادت اور یاد الٰہی میں
، خاص تہوار کی حد تک اپنی توجہ مرکوز کریں۔ ان ہی موقعوں
خدا کی بندگی اور شکرانہ ادا کرنے کا خاص احساس
ہوتا ہے۔ فرد اپنی انفرادیت سے ہٹ کر اپنی سماجی
ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنی سماجی ذمہ داری
ادا کرنے کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ ہر مذہب میں ایک

سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے اور ایک مذہبی ضابطہ ہوتا ہے۔ جس
کے تحت اُ پاس اور روزہ رکھنا، خدمت خلق میں
مصروف رہنا، خدا کی عبادت کرنا اور خاص تہواروں
اور مقدس راتوں کو یادِ الٰہی میں مصروف رہنا، اور
دیگر مذہبی روایات اور احکام کی پابندی شامل ہیں۔
غرض کہ تہوار خوشیاں منانے کے موقع ہوتے ہیں جس میں
اعلیٰ قدور روحانی، اخلاقی، سماجی اور موسمی حالات
اور موزونیت کو پیشِ نظر رکھ کر دوسروں کے ساتھ مل
جل کر خوشی منانے میں شرکت کا خاص موقعہ ملتا ہے۔
ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں تقریباً ہر مذہب

کے لوگ رہتے بستے ہیں۔ ہندوستانی تہوار بھی مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبی دھاروں اور بدلتے موسمی حالات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ کسی اور ملک میں اتنے مذہب، دھرم اور کلچر اور تہذیبی رنگا رنگی دکھائی نہیں دیتی جتنی کہ ہندوستان میں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی، جینی، بدھسٹ اور یہودی سب مل جل کر ہنسی خوشی اپنے ہمسایہ اور پڑوسیوں کے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کو فروغ دینے میں اور قومی یکجہتی کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں ان تہذیبی و ثقافتی قوتوں نے اپنا اپنا یوگ دان دیا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ Unity in Diversity یا کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا خوش آئند منظر دیکھنا ہو تو ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کریں جس کو مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کا نام دیا ہے۔

جب کوئی تہوار قریب آتا ہے تو امیر، غریب، چھوٹے بڑے، مرد اور عورتیں سب اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ بازاروں میں خریداروں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ دکانیں رات گئے تک کھلی رکھی جاتی ہیں گہنے بنوائے جاتے ہیں، تحفے خریدے جاتے ہیں، خاص پکوان تیار کئے جاتے ہیں۔ گھر کو رنگ و روغن کر کے چیزوں سے آراستہ کیا جاتا ہے تاکہ تہوار اچھے اور خوشگوار ماحول میں منایا جائے۔ ایسے ماحول میں ہر طرف خوشی و انبساط کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ محبت، خلوص اور بھائی چارگی جیسے لطیف اور خوش آئند جذبات ہر دل میں موجزن ہوتے ہیں، اور ایک انسان دوسرے انسان سے قریب سے قریب تر آجاتا ہے۔

مذہبی اور سماجی اہمیت کے علاوہ ہر تہوار اور عید خاص خاص پکوانوں اور لوازمات سے وابستہ ہیں۔ دیوالی کے پٹاخے، آتشبازی اور مٹھائیاں، دسہرہ کی پرخلوص ملاقاتیں اور لوازمات، ہولی کی رنگ رلیاں، پاپڑی، گجیا، اور کیپور گجیا، عید الفطر کا شیر خرمہ، اور سوئیاں، اونم کا پائسم، اگادی کی پورن پوری اور کھچڑی کرسمس کے کیک، ایسٹر کے میٹھے انڈے، عید نوروز کے خاص پارسی میٹھے پکوان گروپرب خالص گھی کا حلوہ اور کڑا پرشاد وغیرہ زبان زد خاص و عام ہیں۔ ہر شخص بلا لحاظ مذہب و ملت ان خاص پکوانوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

بسنت پنچمی اور تل سنکرانت کی خوشگوار فضا میں قدرت اپنی مستی میں جھومتی ہے۔ سرسوں کے لہلہاتے کھیت سارے دیہی علاقوں کو بسنتی رنگ میں ڈبو دیتی ہے۔ پتنگ بازی کے جلسہ، نئی نئی تل کے لڈو، دن کا تلی برابر بڑھنا شروع ہونا ایک انبساطی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی ماحول کو پیش نظر رکھ کر مراٹھی میں کہا جاتا ہے۔ تل گڑ گھیا، گوڑ گوڑ بولا (تل اور گڑ لو اور میٹھی بات بولو)، اوگادی ہندو نئے سال کا پیغام لاتی ہے، نئے پنچانگ پڑھے اور سنائے جاتے ہیں۔ گھر گھر پر "گڈی"، سجائی جاتی ہے۔ مہاراشٹر میں گڈی اس طرح رچائی جاتی ہے۔ ایک بمبو پر ایک قیمتی ساڑی پہنائی جاتی ہے اور اس پر ایک چاندی یا اسٹیل کا کوڑہ رکھا جاتا ہے۔ اسے پھول کے ہار سے سجایا جاتا ہے۔ دل میں نئی نئی امنگیں نئے نئے ولولے پیدا ہوتے ہیں اور سارا ماحول شادمانی کا ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں بڑی بڑی روحانی شخصیتوں، علمائے دین اور بھگوان کے اوتاروں کے جنم دن بھی مقدس مانے جاتے ہیں اور تہواروں کی طرح منائے جاتے ہیں۔ ان میں قابل ذکر رام نومی، کرشن جینتی، مہا شیوراتری، عید میلاد النبی گرونانک جینتی، مہاتما بدھ اور لارڈ مہاویر کے جنم دن ہیں۔— رام نومی کے پر رونق جلوس، رام لیلا رسن، کرشن جینتی کا "گوبندا آلا رے آلا" اور دہی کی ہنڈی توڑنے اور رنگین جلوس اور جلسے، گوپال کالوے بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے ہیں، عوام ان مبارک و مسعود موقعوں پر اظہار عقیدت کرتے ہیں، اور ان مہاپرشوں اور اوتاروں کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن ہونے کا عہد کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ مہاتما گاندھی جینتی، نہرو جینتی جو یوم اطفال کی حیثیت سے منائی جاتی ہے۔ باباصاحب امبیڈکر جینتی ڈاکٹر رادھا کرشنن جینتی جو بہ حیثیت "ٹیچرس ڈے" منائی جاتی ہیں۔ ان جلسوں میں ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب خیال کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور ان بزرگان قوم کو، خراج عقیدت اور شردھانجلی پیش کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر قومی سطح پر تعمیری کام شروع کیا جا سکتا ہے اور ان بزرگوں اور رہنماؤں کے بتائے ہوئے اعلیٰ اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا اعادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی قومی اہمیت کے جلسوں میں

وان اپنے شان دار ماضی، جدوجہد آزادی کے شہیدوں اور
رہنماؤں کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور ایک
ہندوستانی ہونے پر فخر کر سکتے ہیں۔ شعراء اور دانشوروں کے
ذریعہ ہندوستان کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیبی قوتوں کو مضبوط
کرنے کی ترغیب بھی دی جاسکتی ہے۔ کھیل کود کے مقابلے
یعنی بھوجن جن میں سب لوگ شریک ہوں، ملک کے مختلف
زبان بولنے والوں کو ایک جگہ اور ایک ہی منچ پر لایا جاسکتا
ہے اور قومی یکجہتی ہم آہنگی اور یگانگت کو آگے بڑھایا
جاسکتا ہے۔

اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ رمضان
مبارک کے زمانہ میں چیف منسٹر، وزیر اعظم، صدر جمہوریہ،
پارلیمنٹ کے اسپیکر اور دوسرے معززین روزہ افطاری کی
ملی جلی تقریبیں منعقد کرتے ہیں، اور ان جلسوں میں ہر
مذہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی تقریبیں عام
قومی تہواروں جیسے دسہرہ، دیوالی، تل سنکرات، بسنت
پنچمی جیسے خوشی کے ماحول میں ہر محلہ میں، رکھی جانی چاہئیں۔
جن میں بلا لحاظ مذہب و ملت سب لوگ ایک ہی منچ
پر آئیں۔ موسمی پکوان کا لطف اٹھائیں۔ ایسی ملی جلی تقریبیں
ہندوستان کی بنیادی اتحاد کو مضبوط کرے گی۔ روزمرہ زندگی
میں اسی قومی یکجہتی کی اور اتحاد کا مظاہرہ عرس، جاتراؤں،
رشتہ داری بانا روں اور مشترکہ کلچرل پروگراموں میں ہوتا ہے —
جہاں ہر مکتب خیال کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ذمہ دار شہری
اور اچھے پڑوسی کی حیثیت سے دل کھول کر اور عقیدتمندی
کے لئے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا خیال
رکھتے ہوئے بلا جھجک شریک ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ
ہندوستان میں ایک دوسرے کو قریب لانے میں صوفی،
سنت، مہاتماؤں کا بڑا دخل رہا ہے۔ اجمیر کے خواجہ
معین الدین چشتی، گلبرگہ کے خواجہ غریب نواز گرو نانک دیو جی،
سنت تکارام، روی داس، کبیر داس، شرڈی کے
سائیں بابا، منترالیہ کے راگھویندر سوامی، رمن مہارشی، شری
اروبندو گھوش اور فرانسس زیویئر جیسے روحانی رہنماؤں نے
انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی اور روحانی قدروں کا پرچار کیا۔
سچی بھگتی، عقیدت اور پریم کا راستہ دکھلایا۔ ان کے

غزل

ڈاکٹر نایاب لکھنوی
روم نمبر ۳۹/۱۲۸ ۔ ساتویں لین
نیا پورہ ۔ مالیگاؤں ۔ ۴۲۳۲۰۳

اکثر یہ ظلم راتوں میں مہتاب کرگیا
آنکھوں سے جاری موجۂ سیلاب کرگیا

کہرے میں ڈوبی شام کی دہلیز پر مجھے
طوفاں تمہاری یادوں کا آداب کرگیا

آیا تھا میری بستی میں خوشحالی کا سفیر
کچھ خواب دے کے آنکھوں کو بےخواب کرگیا

شہزادے کے نکلا تھا جادو کی اک چھڑی
سب کنکروں کو گوہر نایاب کرگیا

تاریخ ہے گواہ کہ ہم دل جلوں کا خوں
تپتے جھلستے صحرا کو شاداب کرگیا

جس کے لبوں کو پھول سا مسکان میں نے دی
مجھ کو عطا وہ دیدۂ خوں ناب کرگیا

آئینہ دیکھنے کا جنوں حد سے جب بڑھا
سارا لہو ہواؤں کا بےتاب کرگیا

کتنا عجیب ہے مرے منصف کا فیصلہ
پیدا شدید جنگ کے اسباب کرگیا

نایاب اک نئے معجزۂ عہد خود پرست
سارے خلوص و وہم کو نایاب کرگیا

چاہنے والوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ ان کے جنم دن منانے میں عوام ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں، اور یکانگت واتحاد کی دوشوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ اسی مذہبی رواداری اور باہمی خلوص کی نمایاں مثال حیدرآباد دکن میں ملتی ہے جہاں پر ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، سب کے سب خلوص اور انسانیت کے رشتہ میں باندھے گئے تھے۔ اعلیٰ اقدار، اخلاق حسنہ، قدیم حیدرآبادی ثقافتی اور تمدنی زندگی تہذیب و شائستگی کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ شاعر نے اس جذبہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

یہ دکن دیس ہے، یہاں کے لوگ عید، تہواروں مناتے ہیں
لوگ یہ رنگ دیکھ کر ان کا خود بھی مستی میں ڈوب جاتے ہیں

حضرت داغؔ نے بھی ان ہی جذبات کو یوں پیش کیا ہے ؎

شیوہ راستی ایسا ہے دکن میں اے داغؔ
بل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل میں

یوم آزادی اور یوم جمہوریہ ہند ہمارے دو خاص قومی تہوار ہیں۔ ان جشنوں اور مسعود موقعوں پر ہر ہندوستانی خوشی سے جھوم جاتا ہے، اور اپنی مادرِ وطن کی شان اور وقار کو بلند کرنے اور تن من دھن سے بھارت ماتا کی خدمت کرنے کا عہد کرتا ہے۔ ہر سال یوم آزادی کے شبھ اوسر پر وزیر اعظم قومی پرچم لال قلعہ پر لہراتے ہیں تو ہر ہندوستانی فخر سے سر اونچا کرتا ہے اور ہندوستان کی آزادی، سالمیت کو قائم رکھنے کا عہد کرتا ہے، اور جدوجہد آزادی کے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

یوم جمہوریہ تو واقعی مسرت، خوشی اور شادمانی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس دن ہندوستان اور ہندوستانیوں نے اپنے آپ کو ایک آزاد، خودمختار (Republic) ہونے کا اعلان کیا۔
صدرِ جمہوریہ اس خوشی کے موقعہ پر شاندار فوجی پریڈ کا معائنہ کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی اس پریڈ میں شریک ہو کر صدرِ جمہوریہ کو سلامی دیتے ہیں۔ اس رنگین تقریب میں بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں انتہائی جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب کو زندہ رکھنے، اس کی جغرافیائی سالمیت کو برقرار رکھنے اور ہندوستان کے وقار اور شان بڑھانے کا عہد ہر ہندوستانی کرتا ہے۔

●●

بیکس الہ آبادی
بذریعہ مسلم آباد ہوٹل مصطفے بازار بمبئی

غزل

عجب دورِ جہاں فتنہ نما ہے
ریاکاری کا ہر پہلو جدا ہے

گلہ اہلِ چمن کا کیا کریں ہم
بہر صورت ستم رانی روا ہے

جو ہے ناآشنا تہذیب و فن سے
اُسے کیا علم کیا اچھا بُرا ہے

اسی کی آنکھ پر پٹی ہے شاید
تباہی دیکھ کر جو ہنس رہا ہے

خوشی ہے زباں بندی کا شکوہ
لبِ اظہار پر تالہ لگا ہے

وہ کیوں بیزار ہے اظہارِ غم سے
کوئی پوچھے اسے کیا ہو گیا ہے

ہماری داستاں سے آج کوئی
چرا کر اپنی آنکھیں ہنس رہا ہے

جسے تھا ناز حق گوئی پہ کل تک
بنامِ مصلحت کچھ بنا ہے

وہ کہتا ہے کہیں راحت نہیں ہے
جو نالوں میں جا کر بس گیا ہے

جو بن کر چارہ گر آیا تھا بیکسؔ
بچا کر مجھ سے وہ دامن چلا ہے

پروفیسر م۔ خ۔ شاذلی
کیلاش نگر۔ ناندیڑ۔

ناندیڑ کے گردوار

ہندستان کی تاریخ کے عہدِ وسطیٰ میں، پندرھویں صدی میں، سکھ مذہب کا جنم ہوا۔ اس وقت دراصل بھارت میں ذات پات کی تقسیم، سماجی اونچ نیچ، مسلمانوں کی حاکمانہ آمد سے مذاہبی تناؤ اور پھر سیاسی اُلٹ پھیر، ملک گیری وغیرہ نے کچھ اس طرح بھارت کی آبادی کو منتشر کر دیا تھا کہ اگر اس دور میں سنتوں اور صوفیائے کرام نے عوام کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے یکجہتی کا ماحول نہ پیدا کیا ہوتا تو شاید انارکی پھیل جاتی۔ ان حالات میں اکثر دردمند اور امن پسند بزرگوں نے بڑی بے چینی محسوس کی جن میں گرو نانک جی مہاراج بھی تھے۔ حالات کا جائزہ لے کر سنتوں اور صوفیوں کی راہ اختیار کرکے مذہبی ہم آہنگی اور مذہب ہی کو بنیاد بنا کر تمام مذاہب کے ماننے والے، مختلف ذات اور پنتھ کے لوگوں میں مذہبی رواداری کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے سکھ مذہب کا آغاز کیا۔ (۱۴۶۹ء ——— تا ——— ۱۵۳۹ء)

گرو نانک جی مہاراج کے بعد ان کے جانشین دس گروؤں نے بھی اسی روایت اور کردار کو لے کر سکھ مذہب کے پیروؤں کی ایک قوم یا ایک معاشرہ تشکیل دے دیا۔ دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کا انتقال ۱۷۰۸ء میں ہوا۔ اس اعتبار سے سکھ دھرم کی تاریخ و تشکیل کا زمانہ دراصل کل ۲۳۹ سال کا ہوتا ہے لیکن اس مختصر عرصہ میں گو سکھ گروؤں کو مختلف مشکلات سے گزرنا پڑا لیکن توحید، آپسی اتحاد اور محبت، خدمتِ خلق کے مضبوط اصول نے سکھ دھرم کو پھیلنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

سکھ دھرم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گو ابتدا میں گرو نانک جی اور ان کے جانشینوں کے ارشادات، ان کی تعلیمات عوام میں منھ زبانی جاری رہیں۔ البتہ پانچویں گرو گرو ارجن دیو جی (۱۵۶۳ء تا ۱۶۰۶ء) نے اپنے زمانے میں امرتسر کا گولڈن ٹیمپل تعمیر کیا جس کے چار دروازے رکھے گئے تاکہ ہر مذہب، ذات اور پنتھ کے لوگ چاروں سمتوں سے اس مندر میں داخل ہو سکیں۔ انھوں نے ترن تارن میں جذامیوں کا ایک بڑا اسپتال قائم کیا اور تیسرا بڑا کام یہ کیا کہ گرنتھ صاحب کی تالیف کی جو آج سکھ مذہب کی مقدس کتاب مانی جاتی ہے۔ یہاں ایک بات نہایت درجہ قابلِ توجہ ہے کہ گرنتھ صاحب کی تالیف کرتے وقت گرو ارجن دیو جی نے نہ صرف سکھ گروؤں کے ارشادات اور تعلیمات کو جمع کیا بلکہ ساتھ ہی دیگر مذاہب کے صوفی اور سنتوں کے ابھنگ اور اشعار بھی شامل کر لیے ہیں جو سب روحانیت انسانی مساوات اور وحدانیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ مثلاً حضرت بابا شیخ فرید کے ۱۳۵ اشعار اور سنت نام دیو کے ۶۶ ابھنگ، اس مقدس کتاب میں شامل ہیں اور دن رات سکھ لوگ ان کا ورد کرتے ہیں۔ ان کے بعد گرو ہرگوبند سنگھ کے زمانے میں البتہ جنگوں

سلسلہ چلتا رہا (۱۶۴۴–۱۵۹۵ء) ان کے بعد گرو ہر رائے جی اور گرو ہرکشن جی بہت کم عرصہ تک رہے۔ ان کے زمانے میں بھی مغلوں سے [illegible] کے پہاڑی راجاؤں سے جھڑپیں جاری رہیں اور سکھوں نے بھی صوفیانہ زندگی کے ساتھ ساتھ عسکری تعلیم بھی شروع کردی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ بھی انھیں دفاعی حیثیت میں کرنا پڑا۔ ورنہ سکھ گروؤں کی تعلیمات میں کہیں بھی ملک گیری کا تصور نہیں پایا جاتا ہے۔

گرو تیغ بہادر سنگھ کا زمانہ زیادہ نمایاں ہے (۱۶۷۵ء–۱۶۲۱ء) اس وقت تک سکھ قوم ایک طاقت کی شکل میں ابھر آئی تھی اور سکھ مذہب کو قبول کرنے والوں کی بھی تعداد کافی بڑھ چکی تھی ——— یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ کشمیر کے برہمن گرو ارجن دیو جی کے پاس آکر التجا کرنے لگے کہ مسلم حکمرانوں کے ظلم وستم سے انھیں بچایا جائے۔ لہٰذا گرو ارجن دیو جی نے مغل حکمرانوں سے اس تعلق سے گفتگو کا آغاز کیا لیکن مغل سلطنت نے انھیں دہلی بلاکر چاندنی چوک میں قتل کردیا۔ جہاں آج کل گردوارہ شیش گنج قائم ہے۔ اس واقعہ کی تاریخی تحقیقات کی ضرورت ہے کیونکہ کشمیر میں ہندوؤں پر ظلم وستم کا زمانہ کافی پہلے کا ہے جب کہ راجہ سلطان سکندر کے وزیر اعظم سہاس بھٹ نے، جو مسلمان ہوگیا تھا، ہندوؤں اور خاص طور پر برہمنوں پر کافی ظلم کیا تھا لیکن سلطان سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین نے تخت نشین ہوتے ہی تمام تصویر بدل دی۔ برہمنوں اور ہندوؤں کو واپس بلاکر بسایا۔ ان کے لیے مکانات تعمیر کروائے بلکہ ان کے لئے نئے مندر بھی تعمیر کروائے اس سلطان کو تاریخ میں "اکبر ثانی" بھی کہا جاتا ہے لیکن سلطان زین العابدین کا زمانہ ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء کا ہے۔

گرو تیغ بہادر جی کے ہی بیٹے گرو گوبند سنگھ جی گدی نشین ہوئے اور دسویں گرو کہلائے جن کی سمادھی ناندیڑ گردوارے میں ہے۔ گرو گوبند سنگھ جی (۱۶۶۶ء تا ۱۷۰۸ء) نو سال کی عمر ہی میں گدی نشین ہوگئے تھے اور ان کے والد کے سرعام قتل کے واقعہ نے چاروں طرف دہشت پھیلادی تھی لہٰذا گرو گوبند سنگھ جی کی تمام عمر تقریباً جنگوں کی نذر ہوگئی۔ ان کے دو چھوٹے بیٹوں کو سرہند کے صوبہ دار نے دیوار میں چنوا دیا تھا اور دوسرے دو بیٹے بھی جنگوں میں مارے گئے لہٰذا یہ صدمہ گرو گوبند سنگھ جی کے لئے معمولی نہ تھا۔ آخری عمر میں انھوں نے ایک طویل خط "ظفر نامے" (فارسی نظم میں) اورنگ زیب کو لکھا جو اس وقت دکن میں آچکے تھے اور خط سے متاثر ہو کر اورنگ زیب نے انھیں ملاقات کے لئے دکن بلایا تھا۔ گرو گوبند سنگھ جی چل پڑے لیکن ابھی راستہ ہی میں تھے کہ برہان پور کے پاس اورنگ زیب کے انتقال کی خبر ملی۔ اس وقت دہلی میں اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ موجود تھے۔ دوسرا بیٹا دکن میں تھا اور وراثت کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس وقت گرو گوبند سنگھ جی نے بہادر شاہ کا ساتھ دیا اور ان کی تخت نشینی کے بعد وہ جنوب کی طرف نکل پڑے اور کسی طرح ناندیڑ پہنچے۔ یہ زمانہ ۱۷۰۸ء کا تھا۔ ناندیڑ میں زیادہ وقت شکار اور روحانیت کی تبلیغ میں صرف ہوا۔ اتفاق سے دو پٹھان ناندیڑ پہنچے اور گرو گوبند جی کی شاگردی قبول کرنے کے بہانے ایک دن موقع دیکھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ گرو گوبند سنگھ جی سخت زخمی ہوئے اور انھی زخموں کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اور ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء کو ناندیڑ ہی میں انتقال ہوگیا البتہ آخری لمحات میں انھوں نے کسی گرو کی گدی نشینی کا اعلان نہیں کیا بلکہ گرنتھ صاحب ہی کو (مقدس کتاب) ان کے بعد گرو قرار دیا اسی وجہ سے اس کتاب کو بھی "گرو گرنتھ صاحب" کہا جاتا ہے (گیارہویں گرو)۔ اور یہ اعلان کیا کہ اب کسی کو گرو منتخب نہ کیا جائے۔

گرو گوبند سنگھ جی کے ناندیڑ میں قیام کے تعلق سے مورخین میں اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سکھ مورخین نے جو عام طور پر شمالی ہند کے ہیں، جنوبی ہند کی تاریخ کی طرف توجہ دی۔ [illegible] سے اس پر تحقیقی کام ہو رہا ہے لہٰذا چند تواریخ اس طرح دستیاب ہوئی ہیں۔

گرو گوبند سنگھ جی ۲ جون ۱۷۰۸ء کو برہان پور سے روانہ ہوئے اور باسم، اکولہ، سمتھ (پربھنی ضلع) ہوتے ہوئے ۱۹ جولائی ۱۷۰۸ء کو ناندیڑ پہنچے اور ۱۸ اگست کو ان پر حملہ ہوا۔ ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء کو زخم پھٹ پڑنے کی وجہ سے وفات پائی۔

اس طرح کل مدت قیام ۲½ مہینہ ہوتی ہے۔ بعض مورخین کے مطابق ان کا قیام ۱۴ ماہ رہا۔ بہرحال یہ تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ ایک جگہ ناندیڑ میں شہنشاہ بہادر شاہ سے ملاقات کا بھی ذکر ملتا ہے جس سے مدت کے تعین میں مدد مل سکتی ہے۔

البتہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان ناساعد حالات اور پے در پے صدموں اور شکست خوردگی کے باوجود گرو گوبند سنگھ جی نے ۱۳ عدد کتابیں لکھیں۔

جیسے بچتر ناٹک۔ جپ صاحب۔ اکال استت۔ چاندی دی وار۔ چوبیس اوتار۔ شبد ہزارے۔ گیان پربودھ۔ ظفر نامہ (اورنگ زیب کے نام خط) وغیرہ۔ گرو گوبند سنگھ جی دراصل گورمکھی کے علاوہ بنج

بھاشا، فارسی، عربی وغیرہ زبانوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ظفر نامہ فارسی نظم میں تحریر ہے۔ البتہ اس تمام لٹریچر میں کہیں بھی مذہبی تعصب یا منافرت یا انتقام وغیرہ کا عکس نہیں ملتا ہے۔ یوں جنگ کے زمانے میں وہ ایک بہترین سپہ سالار بھی تھے۔ اور خالصہ پنتھ کا قیام دراصل گرو گوبند سنگھ جی نے ہی کیا تھا۔ جس نے عسکری نظم بھی قائم کی تھی۔

گرو گوبند سنگھ جی کی سمادھی پر بعد میں غالباً انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ والئ پنجاب نے (۱۸۳۰ تا ۱۸۳۹ء) ایک عظیم گردوارہ تعمیر کروایا اور اس گردوارہ کا نام "تخت سچ کھنڈ حضور ابچل نگر صاحب" قرار دیا گیا۔ اور ہندوستان کے پانچ سکھ تختوں میں سے ایک تخت شمار کیا جاتا ہے۔ بعد میں موقع و محل کے اعتبار سے سکھ برادری نے یہاں آٹھ گردوارے قائم کر لئے ہیں۔ اس گردوارہ میں گرو گوبند سنگھ جی کی سمادھی کے علاوہ اسلحہ جات بھی رکھے ہوئے ہیں۔ چند گرو گوبند سنگھ جی کے اور ایک تلوار مہاراجہ رنجیت سنگھ جی اور دیگر سکھ فوجی سپہ سالاروں کی موجود ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ گرو گوبند سنگھ جی کے زمانے ہی میں سکھوں میں عسکری نظام بڑھا۔ چنانچہ گرو گوبند سنگھ جی نے کہا ہے ؎

ہور بچن تب سنگھنی بشستر باندھو نت
سینا مینا واک تن اشستر سنگنی نت

اسی وقت سے سکھوں نے ہمیشہ ہتھیار ساتھ رکھنے کی پابندی اختیار کر لی۔ گرو گوبند سنگھ جی کے ہتھیار عام طور پر لوگوں کے پاس، تاریخی گردواروں میں یا ریاستوں کے راجگان کے پاس دستیاب ہوتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ جی نے بڑی کوشش اور شوق سے ان کے ہتھیار جمع کئے ہیں۔ آج بھی چند ہتھیار اکال تخت امرتسر، تخت پٹنہ صاحب ناندیڑ گردوارہ، میں موجود ہیں۔ البتہ دربار صاحب لاہور میں بھی گرو گوبند سنگھ جی کے چند ہتھیار موجود ہیں۔ اسی طرح ریاست پٹیالہ اور رانے کوٹ کے رئیس اور ریاست فرید کوٹ میں بھی چند ہتھیار محفوظ ہیں۔

گردوارہ نگینہ گھاٹ صاحب

یہ گردوارہ بڑے گردوارے سے نصف میل کی دوری پر دریائے گوداوری کے کنارے واقع ہے۔ یہ گردوارہ دہلی کے راجہ گلاب سنگھ سیٹھی نے تعمیر کیا ہے۔ یہاں ایک روایت مشہور ہے کہ کسی رئیس نے جو گرو گوبند سنگھ کے درشن کو آیا تھا، جب وہ ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک نگینہ پیش کیا۔ گرو جی نے نگینہ دریا میں پھینک دیا۔ رئیس کو تعجب ہوا۔ گرو جی نے کہا اگر نگینہ اتنا اہم تھا تو جا کر ڈھونڈ نکالو۔ رئیس ندی میں گیا تو دیکھا کہ پوری ندی نگینوں سے بھری پڑی ہے۔

گردوارہ بندہ گھاٹ صاحب

یہ بھی نگینہ گھاٹ گردوارے کے قریب ہی واقع ہے۔ یہاں ایک تیمن داس بیراگی رہتا تھا جو اپنے جنتر منتر سے لوگوں کو مسحور کرتا رہتا تھا۔ گرو گوبند جی جب ناندیڑ پہنچے تو اس نے آپ کو بھی زیر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور سکھ مذہب قبول کر لیا ان کا نام بندہ بہادر سنگھ رکھا گیا۔ اور چونکہ راجپوت تھے اس لئے فن سپہ گری سے واقف تھا۔ چنانچہ گرو گوبند سنگھ جی نے اس کو پرچار کے لئے شمالی ہند بھیجا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بعد میں اس نے وہاں خود کو گرو ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی کی جھونپڑی کی جگہ یہ گردوارہ قائم ہے

گردوارہ سنگت صاحب

بڑے گردوارہ سے یہ گردوارہ دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں گرو گوبند سنگھ جی نے ناندیڑ پہنچنے پر سب سے پہلے قیام کیا تھا۔ یہیں گرو گوبند سنگھ جی نے کئی دنوں بعد اپنی فوج میں روپیہ تقسیم کیا تھا۔

گردوارہ مال ٹیکری صاحب

یہ گردوارہ تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دراصل جس وقت گرو گوبند سنگھ جی ناندیڑ پہنچے تو ان کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ فوج کو تنخواہیں بھی نہ دے سکتے تھے۔ یوں خود گرو گوبند سنگھ جی صوفی منش تھے۔ دنیاوی مال و دولت کی کبھی خواہش نہ کی۔ خدا کے بھروسے آگے بڑھتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں ناندیڑ میں اسی مقام پر انھیں زمین سے دفینہ دستیاب ہوا۔ جس کو آپ نے اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ گرو نانک جی بھی جب سری لنکا گئے تو اسی مقام پر کیمپ کیا تھا۔

گردوارہ شکار گھاٹ صاحب

یہ گردوارہ تقریباً ۱ میل دور ہے۔ اس گردوارہ کی تعمیر ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ اس مقام سے اکثر گرو گوبند سنگھ جی شکار کیا کرتے تھے۔

اس گردوارہ کی عمارت گوداوری ندی کے دوسرے کنارے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔ پنجاب کے سنت بابا جیون سنگھ اور بابا دلیپ سنگھ نے یہاں آکر اس پروجیکٹ کو ہاتھ میں لیا اور دیگر سکھوں نے مفت خدمتِ خلق کے طور پر کام کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ گردوارہ جانے کے لئے دریائے گوداوری پر شرم دان ہی کے ذریعہ ایک مضبوط پل تعمیر کر لیا گیا ہے۔

گردوارہ ہیرا گھاٹ صاحب

یہ گردوارہ بھی تقریباً ½ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور یہاں بھی نگینہ گھاٹ کی طرح روایت مشہور ہے۔ یہیں شہنشاہ بہادر شاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب کہ وہ دکن کی فتوحات کے لئے جنوب کی طرح آیا تھا۔ بہادر شاہ نے بھی ایک ہیرا بطور تحفہ گرو جی کو نذر کیا۔ انھوں نے اسی طرح بے اعتنائی سے دریا میں پھینک دیا۔ اور بہادر شاہ کو پوری ندی ہیروں سے بھری دکھائی دی۔ دراصل یہ شہنشاہ کے لئے ایک ہدایت تھی کہ دنیاوی مال و متاع ہیچ ہے انسانی زندگی میں روحانیت، انسانیت اور محبت کا اہم مقام ہے۔

گردوارہ ماتا صاحب دیوان جی

یہ گردوارہ شکار گھاٹ صاحب اور ہیرا گھاٹ صاحب کے درمیان واقع ہے۔ جب گرو گوبند سنگھ جی ناندیڑ آئے تھے تو اس مقام پر خواتین کا کیمپ رکھا گیا تھا۔ گرو گوبند سنگھ جی کی بیوی ماتا صاحب کنور جی ساتھ تھیں۔ آپ کے انتقال کے بعد وہ یہاں سے گرو جی کے چند ہتھیار لے کر دہلی چلی گئیں اور ان کی وفات بھی وہیں ہوئی۔

سلطنت آصفیہ کے زمین میں گردوارہ کے انتظامات کے لئے حیدرآباد میں ایک مرکزی کمیٹی قائم تھی۔ جس کا صدر انسپکٹر جنرل آف پولس ہوا کرتا تھا اور ناندیڑ میں ایک لوکل کمیٹی کلکٹر ضلع کی صدارت میں قائم ہوتی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں پولس ایکشن کے بعد سلطنتِ آصفیہ کا سقوط ہوا اور حکومت حیدرآباد کی جانب سے "ناندیڑ سکھ گردوارہ سچ کھنڈ حضور اپچل نگر صاحب ایکٹ۔ ۱۹۵۶ء" پاس ہوا اور اس گردوارہ کے لئے ایک بورڈ قائم کیا گیا جس کے (۱۷) سترہ اراکین ہوتے تھے۔ جن میں دو حکومت مہاراشٹر کے نامزد کردہ، ایک آندھرا پردیش کی جانب سے تین اراکین ریاست کے سکھ برادری میں سے منتخب

عامر برقی اعظمی
سی اے / A-15 - ایل آئی جی، جی - ۸
رجوری گارڈن، مایاپوری - ہری نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۴

نہ شب مرے گی نہ دن پاؤں پر کھڑا ہوگا
تمام شہر میں بس ایک بات " کیا ہوگا؟"

حیات عارضی شے ہے کسے نصیب اجل
مرا وجود فلک سے بھی جھانکتا ہوگا

صنم کدوں کا تعلق ہے شاہراہ سے بھی
وہ دیوتا ہے اگر کل مجسمہ ہوگا

نہ مضمحل نہ پریشاں نہ غمزدہ نہ اداس
وہ ایک چاندسی لبنی کا آئینہ ہوگا

ہر ایک نقش ہے سرشار آبگینے کا
کوئی گلاب کی مانند کھل اٹھا ہوگا

قیصرِ وقت نے دیکھا نہیں جسے عامر
تمہارے ہاتھ کا سکہ نہیں خدا ہوگا

کئے جاتے تھے۔ ایک رکن شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا نامزد کردہ جو مدھیہ پردیش سے لیا جاتا تھا۔ تین اراکین پربندھک کمیٹی کے، چار اراکین ناندیڑ کے خالصہ دیوان کے نامزد کردہ، ایک رکن امرتسر سے دو اراکین پارلیمنٹ کے ممبران میں سے لئے جاتے ہیں۔ موجودہ گردوارہ بورڈ کے صدر اورنگ آباد کے سردار سنت سنگھ جی ہیں۔ البتہ گردوارہ کے انتظامات کے لئے ایک مقامی کمیٹی بھی قائم ہے جس کے صدر ضلع کلکٹر ہوتے ہیں۔ گردوارہ میں صبح شام بھجن کیرتن جس کو گرنتھ پاٹھ کہا جاتا ہے جاری رہتے ہیں اور زائرین میں پرشاد بھی تقسیم ہوتا ہے۔ لنگر خانہ چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ کسی وقت بھی زائرین کو کھانا مفت مہیا کیا جاتا ہے۔ زائرین کا ہمیشہ تانتا بندھا رہتا ہے۔ گردوارہ کی آمدنی کے لئے ہزاروں ایکڑ زمینات ہیں۔ شہر میں دوکانات کے سلسلے ہیں۔ اسی لئے گردوارہ جہاں مذہبی رسومات کے لئے خرچ کرتا ہے۔ وہیں تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں کارگزاری کی ہے۔

گردوارہ کی جانب سے خالصہ پرائمری اسکول، ہائی اسکول، مانیٹری اسکول چلتے ہیں، ایک ہوسٹل بھی قائم ہے جہاں مفت قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بڑی بات یہ کہ یہ تمام ادارے بلا لحاظ مذہب و ملت سب کے لئے کھلے ہیں ایک انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (آئی۔ ٹی۔ آئی) بھی چلتا ہے۔ جہاں ڈرافٹ مین، ٹرنر، ویلڈر، اور ریڈیو ٹی وی میکانک کے شعبہ جات میں تعلیم دی جاتی ہے۔ گردوارہ کی جانب سے کئی گیسٹ ہاؤس بھی ہیں جن میں زائرین قیام کرتے ہیں۔ گردوارہ کی جانب سے ایک ہسپتال بھی ہے جس کی نئی تین منزلہ عمارت تعمیر ہو چکی ہے جہاں ایکسرے، آپریشن تھیٹر وغیرہ کا جدید انتظام کیا گیا ہے حال ہی میں وشنو پوری کے قریب (ناندیڑ ہی میں) ایک انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کالج بھی قائم ہو چکا ہے جو جدید جدید سائنسی آلات سے آراستہ ہے۔ قریب ہی ایک وسیع گردوارہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ گردوارہ کی عمارت میں زبردست توسیع کی گئی ہے۔ ایک نہایت وسیع "دیوان ھال" تقاریب کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک میڈیکل کالج کے قیام کا منصوبہ بھی زیر تجویز ہے۔

زائرین کی سہولت کے لئے ایک قدیم بیل گاڑی روزانہ ہر ٹرین کے وقت ریلوے اسٹیشن آتی ہے۔ زائرین ہندوستان کے کونے کونے کے علاوہ غیر ممالک سے بھی آتے ہیں۔ دو یا تین سال کے بعد نہایت عظیم الشان پیمانے پر "گرو پرب" کی تقریبات منائی جاتی ہیں جن میں تمام ہندوستان سے سکھ علماء، فنکار وغیرہ شریک ہوتے ہیں جو اس سال بھی ۴ نومبر سے جاری ہے اور قریباً ایک ہفتہ جاری رہتی ہیں۔

اس عظیم گردوارہ کی وجہ سے نہ صرف ناندیڑ بلکہ ریاست مہاراشٹر کو فخر حاصل ہے۔ سکھوں کی ایک قابل لحاظ آبادی موجود ہے، جو نہایت امن پسند اور سنجیدہ ہیں۔ اطراف کے بنجارے وغیرہ جیسے قبائل سکھ مذہب قبول کرتے جا رہے ہیں۔ تبلیغ کے لئے ایک ٹریننگ سینٹر بھی ہے اور ایک ماہنامہ "سچ کھنڈ پتر" کے نام سے دو زبانوں (پنجابی اور انگریزی) میں شائع ہوتا ہے۔ ناندیڑ کی سماجی، معاشی اور تعلیمی زندگی میں سکھ برادری کا اہم رول ہے۔ عام طور پر سکھ گھروں میں اردو زبان استعمال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی علاقائی زبان مراٹھی اور ملازمتوں کے لئے انگریزی بھی سیکھتے ہیں۔ پرانی نسل اردو اور فارسی کا گہرا علم رکھتی تھی۔ لیکن جدید نسل کی اب اردو اور فارسی سے دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ البتہ بول چال میں اردو ہی استعمال کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی ناندیڑ کے سکھ قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔

آخری بڑی دلچسپ بات یہ کہ گردوارہ میں تقریباً ۲۰ سے ۲۵ تک نہایت اعلیٰ نسل کے نہایت صحت مند گھوڑے ہیں جن کو ہر سال صرف دسہرہ کے موقع پر جلوس میں سجا کر نکالا جاتا ہے۔ ان کا دوسرا کوئی استعمال نہیں ہے۔ تاریخ کی یادگار کے طور پر ان گھوڑوں کی پرورش کی جاتی ہے۔

البتہ گرو گوبند سنگھ جی کی جنوبی ہند میں آمد، آنے کا راستہ، ناندیڑ میں قیام کی مدت اور یہاں کی سرگرمیوں پر مزید تحقیقات کی سخت ضرورت ہے جس پر اب تک منصوبہ بند کام نہیں ہوا ہے بعد میں سکھ افواج کی آمد اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ناندیڑ سے تعلق، پر ابھی کام کی ضرورت ہے۔

امیر حسن نورانی
اے ۲۵ ر گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں تاوی
(کشمیر) ۱۸۰۰۰۴

بچوں کے محروم

اردو شاعری نے اپنی مختصر مدتِ حیات میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو زبان کا آغاز شاعروں کے رہینِ منت ہے۔ ان گنت ستارے اردو شاعری کے آسمان پر نمایاں ہوئے۔ قانونِ قدرت کے مطابق سب ہی کو کم و بیش چمک دمک عطا ہوئی۔ مگر کچھ ایسے چاند تارے بھی نمایاں ہوئے جن کی ضیا پاشیوں نے عالمِ انسانیت کے کسی گوشے کو منور کر دیا۔ قدرت نے ان کی فطرت میں ملکۂ شاعری ودیعت کیا اور وہ دنیا میں ایک انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ ایسے بلند پایہ اردو شعرا کی تعداد محدود ہے جنہوں نے اپنے انفرادی کمالاتِ شاعری سے دنیائے انسانیت کی قدروں کو بلند کرنے کی جد و جہد کی اور اپنے ملک و قوم کی صحیح معنوں میں خدمت کی۔ حضرت تلوک چند محروم کا شمار بھی ایسے ہی با کمال شعرا میں کیا جاتا ہے۔

حضرتِ محروم کی طبع رسا نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے نقاد ان کے کلام پر جس گوشے سے نظر ڈالتا ہے ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ محروم کو قبولِ عام حاصل ہوا۔

محروم کے شاعرانہ کمالات کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جس پر اہلِ نظر نے کم توجہ کی ہے۔ حالاں کہ وہ ان کی شاعرانہ عظمت کا روشن ترین گوشہ ہے جہاں وہ بچوں کے ایک کامیاب ترین شاعر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی حسین و دلکش نظموں کے ساتھ ساتھ محروم کی نظمیں بھی پڑھی ہیں۔ ان میں وہی لطف حاصل ہوتا تھا جو حالی اور اسمٰعیل کی نظموں میں تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے نظم و نثر دونوں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں بے حد مقبول ہیں اور وہ بچوں کے لیے محبوب شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

ہم اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے کہ محروم نے اس تحریک کو پروان چڑھایا، جو آزاد اور حالی نے شروع کی تھی اور اسمٰعیل نے جس کو آگے بڑھا کر اور حسین و دلکش بنایا تھا۔

محروم کی دیگر شاعرانہ حقیقتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر انھیں

صرف بچوں کا شاعر کہا جائے تب بھی ان کی شاعرانہ عظمتوں میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی اور اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ بچوں کی تعلیم قومیت کی تعمیر ہے تو ماننا پڑے گا کہ مرحوم نے عام شعرا کی طرح صرف (ادب اور شاعری) کی خدمت نہیں کی بلکہ ملک اور قوم کی بنیادی خدمت کی ہے اس طرح ان کی شاعری کی عظمت و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔

حضرت مرحوم نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گذارا بچوں کی تعلیم و تربیت کے عملی تجربے کئے ان کی ذہنی کیفیات و نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے انھوں نے بچوں کی تعلیم و اخلاق کی تربیت کے لئے جو نظمیں تجربات کی روشنی میں لکھی ہیں وہ کتنی مفید اور دلکش ہو سکتی ہیں۔ بچوں کے لئے مرحوم نے ہر قسم کی نظمیں لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

صبح کے پر کیف اور روح پرور سماں کی تصویر کشی بہت سے شاعروں نے کی ہے لیکن مرحوم نے جس انداز سے صبح کی اہمیت اور سحر خیزی کی افادیت کو بچوں کے ذہن نشین کرایا ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا جو سراپا اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی نے بھی صبح کے وقت پر نظمیں لکھی ہیں اور بہت خوب لکھی ہیں مگر مرحوم کی اس نظم کا ایک ایک شعر جس تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے علاوہ شاعرانہ محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو، اس کا ہر شعر سراپا اثر ہے طبیعت میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے ؎

وقت سحر ہے سونے والو
دھیان کدھر ہے سونے والو
جاگو نیند کے اے متوالو
لطف سحر کے کھونے والو
جاگ اٹھا ہے پتا پتا
غفلت کیسی، سونا کیسا
باد سحر کے جھونکے آئے
نکہت تر کے جھونکے آئے
جاگو پہلو بدل کر دیکھو
اٹھو آنکھیں مل کر دیکھو
صل علیٰ یہ نور کا عالم
ہر ذرے پر طور کا عالم

تازہ نوا مرغان چمن ہیں
نغمے جن کے جان چمن ہیں
میٹھی بولی بول رہے ہیں
اڑنے کو پر تول رہے ہیں
وجد میں ہیں سب آتے جاتے
حمد خدا کے گیت ہیں گاتے
نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے
دست دعا شاخوں نے اٹھائے
شاخ پہ بلبل زمزمہ خواں ہے
خاک پہ سنبل سجدہ کناں ہے
جاگو یاد خدا کی گھڑی ہے
وقت نماز و دعا کی گھڑی ہے
شور اٹھا ناقوس و اذاں کا
وقت نہیں یہ خواب گراں کا
عابد و شیخ و برہمن جاگے
جاگے مسجد، مندر جاگے
عارف، زاہد اور پجاری
نیند نہیں ہے جنکو پیاری
نیند سے پیاری یاد خدا ہے
یاد خدا میں جن کو مزا ہے
محفل راز میں جا کر بیٹھے
دل کو جہاں سے اٹھا کر بیٹھے

حضرت مرحوم نے بچوں کے لئے جو لاجواب نظمیں لکھی ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کو بچوں کی انجمن کا ایک رکن سمجھنے لگتے ہیں۔

"ہمارا دیش" کے عنوان سے انھوں نے ایک چھوٹی سی خوبصورت نظم لکھی ہے جو سلاست، روانی اور سادگی کا اچھا نمونہ ہے۔ اور حب الوطنی کے جذبات کو بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سب سے اچھا دیش ہمارا
دنیا بھر سے نیارا ہے
پیارا دیس ہمارا بھارت
ہم کو دل سے پیارا ہے

اپنے دل کا سہارا ہے
بھارت دیس ہمارا ہے

اونچے اونچے پربت اس کے
لہراتے ہیں جن پر جنگل
مور پپیہے اور کوئل سے
جنگل میں ہوتا ہے منگل
کیا ہی خوب نظارا ہے
بھارت دیس ہمارا ہے

ہر چیز سے عیاں ہے یارب ظہور تیرا
خورشید میں قمر میں تاروں میں نور تیرا
قدرت سے تیری ساکن قدرت سے تیری جاری
قائم ترے سہارے ہے کائنات ساری
روشن کرۂ فلک پر پیہم جو چل رہے ہیں
دن رات بن رہے ہیں موسم بدل رہے ہیں
حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی
ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے
جس سے ملے سعادت اُس راہ پر چلا دے
وہ علم دے کہ جس سے دانش کا نور دل میں
پروردگار دیکھیں تیرا ظہور دل میں

بچوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق دلانے کے لئے محروم نے بہت سی پُر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم "کتاب" ہے جس میں بڑے دلکش انداز اور شیریں الفاظ میں کتاب کی اہمیت کو دل نشین کرایا ہے

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے
اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے
روئے زمیں کے سارے مظاہر اسی میں ہیں
باغِ جہاں کے سارے مناظر اسی میں ہیں
دیکھا ہے سب کتاب میں جو کچھ جہاں میں ہے
موجود ہے زمین میں یا آسماں میں ہے
سب کچھ کتاب ہم کو دکھاتی ہے ہو بہو
ان سب کا حال ہم کو سناتی ہے ہو بہو

پھر لو اسے کہ اس میں خزانہ ہے علم کا
اٹھو پڑھو کہ آج زمانہ ہے علم کا

محروم نے بچوں کے لئے ہر قسم کے مفید عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ صفائی تندرستی، صبح خیزی، حبِ وطن، ادب و احترام، سچ اور جھوٹ محنت و مشقت وغیرہ کے فوائد پر محروم کی پُر اثر نظمیں موجود ہیں۔ ملک اور قوم پر ان کا احسان ہے کہ محنت و جانفشانی سے بچوں کی ذہنی تربیت اور تہذیب، اخلاق کا سامان فراہم کیا۔ انھوں نے خدا کی حمد اور دعا دعیرہ کے عنوان سے متعدد نظمیں لکھی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان میں بڑی دلکشی اور تاثیر ہے۔ یہ اشعار ہمارے دعویٰ کی صداقت کے آئینہ دار ہیں ؎

ہر چیز سے عیاں ہے یارب ظہور تیرا
خورشید میں قمر میں، تاروں میں نور تیرا
قدرت سے ہے تیری ساکن قدرت سے تیری جاری
قائم ترے سہارے ہے کائنات ساری
باقاعدہ ہے تجھ سے سارا نظامِ عالم
قدرت کے ہیں کرشمے یہ صبح و شام تیرے
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے
جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے
عقبیٰ کی سرخروئی، دنیا کی کامگاری
حاصل ترے کرم سے ہم کو ہو ذاتِ باری

"دعا" والی نظم آپ پڑھ چکے۔ اب دیکھئے خدا کا شکر ادا کرنے کی تلقین بچوں کو کس دلنشین طرز پر کی ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی بھی خوب ہے ؎

زباں پر نہ کیونکر ترا شکر آئے
کہ احساں ہیں تیرے ہزاروں خدایا
مجھے تو نے دی زندگانی سی نعمت
عطا عقل کی اور انساں بنایا
یہ قدرت ہے تیری یہ صنعت ہے تیری
کہ مٹی کو دانا و بینا بنایا
محبت سے دل کو کیا شاد میرے
دیا سر پہ ماں باپ کا تو نے سایا

رزاق شاہد

تاج پور۔ عمر کھیڑ
ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

زیست کے چہرے کو رنگین بنانیوالا
بے رخی بہنے کا یہ آس لگانیوالا

پھونک دے پھر نہ دوالی کے بہانے گھر کو
میری چوکھٹ پہ چراغوں کو جلانیوالا

کیسے چڑھتے ہوئے دریا بھی اتر جاتے ہیں
کاش سمجھے یہ اکڑ ناز دکھانے والا

دھوپ شاداب درختوں پہ سکھائے پر کو
کیا عتابوں کا ہے موسم کوئی آنیوالا

اپنے ماتھے کی سیاہی کو ذرا پونچھ تو لے
مجھ کو کردار کا آئینہ دکھانے والا

سمندر جزیرے پہاڑ اور دریا
جو منظر دکھایا سو دلکش دکھایا
چمک چاند سورج کو تو نے عطا کی
ستاروں نے تجھ سے ہی یہ نور پایا
تری یاد سے دل نہ غافل ہو میرا
دعا تجھ سے محروم کی ہے خدایا

بچوں کو اگر کسی بُری بات سے روکا جائے یا کسی اچھی بات کی تلقین کی جائے تو اس کے اثر کا انحصار سمجھانے کے طرز اور انداز پر ہوتا ہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ پُراثر ہوتی ہے لیکن ایسے شاعر بہت کم ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں اور غیر معمولی خداداد ذہانت سے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھکر نظمیں لکھیں۔ حالی، اسمٰعیل اور اقبال کی نظموں میں جو دلکشی ہے اس کو اردو ادب میں ایک مسلمہ حقیقت سمجھا جاتا ہے اور موجودہ دور میں حضرت محروم کو مذکورہ ارباب ثلاثہ میں شامل کرکے بچوں کی دنیا کے شعر و ادب کے عناصر اربعہ کہا جا سکتا ہے۔

شری رام اورنگ آبادکر، کہنہ مشق فلمی صحافی، فلمی صحافیوں کی جانب سے شری اشوک پاٹل
وزیر مملکت برائے ثقافتی امور اور نائب چیرمین برائے مہاراشٹر فلم اسٹیج اور ثقافتی ترقیاتی
کارپوریشن گورے گاؤں کی خدمت میں ۲ رجون کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں۔

شری اشوک پاٹل، فلم کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ہمراہ بائیں سے دائیں دیکھے جا سکتے
ہیں۔ شری مہیش کوٹھارے، شری اشوک پاٹل، شری پرکاش [illegible] ایم۔ ڈی، مینجنگ ڈائرکٹر
شری این آر رنگناتھن۔

• علاء الدین جینا بڑے
۳۰-۳۳، شانتی نگر، چیمبور، بمبئی ۴۰۰۰۷۱

ضمانتِ روزگار اسکیم ۔ مہاراشٹر میں

علامہ اقبال نے مزدوروں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچنے میں گو تمثیلوں سے کام لیا ہے لیکن سچ پوچھو تو ہم اسے حقیقت نگاری ہی کہہ سکتے ہیں۔ ع

شاخِ آہو پہ رہی صدیوں تلک تیری برات

مزدور صنعتی انقلاب سے پہلے زمینداروں اور جاگیرداروں کے یہاں غلاموں کی طرح کام کرتا تھا اور صنعتی انقلاب کے بعد اس غلامی سے نجات پانے کی امید میں شہر کی طرف دوڑا آیا جہاں سرمایہ داروں نے اسے پوری طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔ سکون اور سکھ چین کی تلاش میں وہ لوٹ کر دیہاتوں کی طرف جاتا رہا اور دیکھتا رہا کہ اس کی جگہ ٹریکٹروں نے لے لی ہے۔

بادشاہوں کے دور میں جب کبھی ہندوستان میں قحط سالی وقوع پذیر ہوتی اور بھوک، بے کاری کا سیلاب امنڈ آتا تھا تو بعض مورخین کا خیال ہے کہ بادشاہوں کو تاج محل، گول گنبد جیسی شاہکار عمارتوں کی تعمیر کا خیال آتا تھا تاکہ رعایا کو کام ملے اور وہ خوشحال رہے اور بادشاہ یا راجہ کا نام رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے۔

وہ زمانہ کب کا بیت چکا جب زمین پر انسانی آبادی کا بھار زمینی پیداوار کے مقابلے میں ناقابل برداشت نہیں تھا، بے روزگاروں کا گزارہ بھی آسانی سے ہو جاتا تھا۔

اب بڑھتی ہوئی آبادی نے بے روزگاروں کی تعداد میں بھی ایسا اضافہ کر دیا کہ انسان سوچ کر کانپ اٹھتا ہے۔ ایک فلاحی ریاست کے لئے جیسی کہ ہماری ریاست ہے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس مسئلے کی طرف خاص توجہ دی جائے۔

چنانچہ سب سے پہلے مہاراشٹر نے ایک ایسا قدم اٹھایا جسے آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی نے جب وہ بقید حیات تھیں، قابل تقلید گردانا اور یوم آزادی کے جشن میں لال قلعہ کے پلیٹ فارم سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے اظہار فخر کے ساتھ فرمایا کہ مہاراشٹر میں یہ پروگرام کامیاب رہا ہے اور ہم اسے پورے ملک میں آزمانا چاہتے ہیں۔ وہ پروگرام جس کے تعلق سے ملک کی عظیم خاتون نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا "ضمانت روزگار یوجنا" کے

نام سے مشہور ہے۔

اس یوجنا کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں غریب عوام کے لئے اور خصوصیت کے ساتھ کھیت مزدور اور چھوٹے اور محدود اراضیات رکھنے والے کسانوں کو کچھ ایسا روزگار فراہم کرنا جس سے ان کی آمدنی اور خوشحالی میں اضافہ ہو کہاں تک ممکن ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے تاس گاؤں بلاک میں ہمہ جہتی پروگرام کے تحت دیہی ترقی کی ایک رہنما اسکیم کو آزمایا گیا اور اس منتخبہ ترقی بلاک میں ۱۹۶۹ء سے روزگار کی ضمانت دینے والی ایک اسکیم کو بھی روبہ عمل لایا گیا۔

اس رہنما یوجنا کے تجربات کو سامنے رکھ کر ۱۹۷۲-۷۳ء میں پوری ریاست میں اس یوجنا کو عمل میں لایا گیا لیکن ۱۹۷۲-۷۳ء اور ۱۹۷۳-۷۴ء میں ریاست کے متعدد علاقوں میں قحط پڑا لہٰذا اس اسکیم کو ایسے علاقوں میں فوری طور پر مرکوز کر دیا گیا۔ قحط کے مقابلے کے لئے جو اقدام کئے گئے ان کے ساتھ اس اسکیم سے خاطر خواہ فائدہ پہونچا اور اس کے ساتھ مرکزی حکومت کی تیار کردہ دیہی روزگار یوجنا بھی بروئے کار تھی ہی۔

اس یوجنا کو روبہ عمل لانے کے لئے ضروری ذرائع کا فراہم کیا جانا ضروری تھا چنانچہ ۱۹۷۵-۷۶ء سے کچھ ٹیکس عائد کئے گئے اور ان کی وصولیابی پر وصول شدہ رقم کی مساوی رقم اس میں جمع کر کے ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کا تمام تر روپیہ ضمانتِ روزگار اسکیم یا یوجنا پر ہی صرف ہوتا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر حکومت نے ۱۹۷۷ء میں ضمانتِ روزگار قانون پاس کر کے ہر بالغ کو حصول روزگار کا قانونی حق عطا کر دیا یہ قانون ۲۶ جنوری ۱۹۷۹ء سے مہاراشٹر بھر میں نافذ ہے اور اس کے تحت ہر بالغ کو غیر ماہرانہ جسمانی محنت کرنے والے روزگار پانے کا حق حاصل ہے۔

اس قانون کے تحت روزگار پانے کے لئے اٹھارہ سال یا اس سے زیادہ عمر والے شخص کو جسمانی محنت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ایک شخص اندراج افسر کے دفتر میں اپنا نام درج کرائے گا اس طرح نام درج کرانے کے بعد پندرہ یوم کے اندر اسی تعلقہ میں قریب سے قریب تر مقام پر جہاں اس اسکیم کے تحت کام چل رہا ہوگا روزگار دیا جائے گا اور اگر اس تعلقہ میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے تو کسی دوسرے تعلقہ میں، لیکن اسی ضلع میں کام دیا جائے گا وہ جہاں بھی کام کرنے گا وہاں اجرتوں کا تختہ ہوگا اور اس تختے کے مطابق اسے اجرت ملے گی۔ اجرتوں کی ادائیگی میں مرد اور عورت کی تفریق نہیں ہوگی بلکہ پانچ یا اس سے زیادہ عورتیں کسی ایسی کام کی جگہ پر ایسی ہوں گی کہ ان کے ساتھ تین سال سے کم عمر کے بچے ہوں تو ان بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا بھی رکھی جاتی ہے انہیں دودھ پلانے کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان بچوں کے لئے کپڑے کے عارضی جھولے بھی باندھے جاتے ہیں اس آیا کو بھی ضمانتِ روزگار اسکیم کے تحت وہی مزدوری دی جاتی ہے۔ اس آیا کو بچوں کے کپڑے اور جھولے وغیرہ دھونے اور صاف صفائی رکھنے کے لئے ضروری چیزیں فراہم کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مزدوروں کو پینے کے پانی کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے اور پانی پلانے والے کو بھی اسی اسکیم کے تحت سب کے برابر اجرت دی جاتی ہے۔ نیز مزدوروں کو لنچ ٹائم گذارنے اور کچھ دیر سستانے کے لئے سایے کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

اجرت رقم کے علاوہ جزوی طور پر گیہوں جوار جیسی اجناس کی صورت میں بھی دی جاتی ہے۔ یہ چیزیں مزدوروں کو کفایتی بھاؤ پر دی جاتی ہیں اور ان کی قیمت اجرتوں سے منہا کی جاتی ہیں۔ نام درج کرانے کے بعد اگر پندرہ دن کے اندر کام نہیں دیا جا سکتا تو ایسے روزگار کے طلب گار مزدور کو روزگار بھتہ اس روز سے دیا جاتا ہے جس روز اس نے نام درج کرایا ہے۔

اس اسکیم کا دوہرا مقصد یہ ہے کہ ایک تو مزدور کو روزگار ملے اور بے روزگاری کا ازالہ ہو اور دوسرا مقصد یہ کہ چھوٹے موٹے ایسے کام سرانجام پائیں جو اس بستی یا علاقے کی ترقی میں معاون ہوں جیسے دو دیہاتوں کے بیچ یا دیہات سے بڑی سڑک تک راستہ بنانا۔ تالاب یا چھوٹے اوسط درجہ کے باندھ باندھنا یا شجر کاری کرنا وغیرہ۔

پانچ سو یا اس سے زیادہ آبادی کے کسی دیہات کو بڑی سڑک سے ملانے کا کام اس اسکیم کے تحت لیا جاتا ہے۔ عموماً بیس ہزار سے کم خرچ میں انجام پانیوالا کام اس اسکیم کے تحت نہیں لیا جاتا۔ اسی طرح ۵۰ یا اس سے زیادہ تعداد میں مزدور روزگار کے متلاشی ہوں تو ان کے لئے کوئی نہ کوئی کام تلاش کر کے اس کے لئے ضلع کلکٹر یا حکومت سے جیسے بھی ضروری ہو منظوری لی جاتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ علاقے کے سبھی مزدور ضمانت روزگار اسکیم کے تحت ہی کام کرنے کے لئے پیا

کسی اور بڑے پروجیکٹ کے لئے مزدور نہ ملیں ۔ اس اسکیم کے تحت کام شروع کرنے سے پہلے نیز کام کے دوران اس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے ۔

بس اسکیم پر خرچ کرنے کے لئے جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے ایک فنڈ قائم کیا ہے جس میں مختلف ٹیکسوں سے وصول ہونے والی رقم آتی ہے وہ ٹیکس خاص ضمانتِ روزگار کے لئے ہی وصول کئے جاتے ہیں وہ ٹیکس کچھ یوں ہوتے ہیں ۔

۱۔ پیشہ بیوپار وغیرہ پر ٹیکس ۔
۲۔ سیل ٹیکس پر سرچارج ۔
۳۔ موٹر گاڑیوں پر ضمانتِ روزگار اسکیم ٹیکس ۔
۴۔ اراضیات پر لگان ۔
۵۔ سینچائی کی زمین پر ضمانتِ روزگار اسکیم سرچارج ۔
۶۔ شہر میں غیر رہائشی جائداد پر سرچارج ۔

۸۳-۱۹۸۱ میں ان مختلف ٹیکسوں سے ۶۰ کروڑ ۵ لاکھ کی رقم وصول ہوئی تھی اور اس پر سرکار کی جانب سے مساوی رقم ڈالے جانے پر ۱۲۰ کروڑ ۱۰ لاکھ کا فنڈ بنا تھا جس میں سے ۵۷ کروڑ ۵ لاکھ روپے خرچ کئے گئے ۔

۱۵ اگست ۱۹۸۵ء کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نے لال قلعہ کے پلیٹ فارم سے عوام کو خطاب کرتے ہوئے ملک سے افلاس کو دور کرنے اور پوری طرح روزگار فراہم کرنے کے عزم کا اعادہ کیا اور اس عہد کے مطابق ۲۰ نکاتی پروگرام کی ترجیحات، نشانوں اور مقاصد کو از سر نو ترتیب دے کر شری اے ۔ بی ۔ اے غنی خاں چودھری نے جو پروگرام کو روبہ عمل لانے کے لئے ذمہ دار وزیر ہیں پارلیمان میں پیش کر دیا اس نو ترتیب یافتہ پروگرام میں بھی پیداواریت کو بڑھانے پیداوار کو اضافہ کرنے اور دیہی روزگار فراہم کرنے کو اولیت دی گئی ہے ۔

اگست ۱۹۸۶ کے آخری دنوں میں وزیر اعظم کے ایما پر وزیر مالیات نے ایک ایسی اسکیم کا اعلان کیا ہے جس کے تحت بے روزگاروں کو پانچ ہزار کی رقم قومیائی ہوئی بینکوں سے بلا ضمانت بطور قرض دی جائے گی اور وہ تین مہینے کے بعد ماہانہ قسطوں پر سہولت کے ساتھ وصول کی جائے گی ۔ یہ بھی گویا ضمانت روزگار کا ایک پہلو ہے ۔

ہماری آزادی کے متوالوں نے ایک خواب دیکھا تھا ۔ خوش حالی کا، پیار و محبت کا زندگی کا، اور قومی یکجہتی کا ۔ ضمانت روزگار اسکیم اس خواب کی تعبیر میں معاون ہوگی ۔ ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس کارِ خیر میں حکومت سے تعاون کرنا چاہئے ۔

ضمانتِ روزگار اسکیم کے تحت جاری کام کا ایک منظر ۔

ن علی خان (انفارمیشن آفیسر)
عات و رابطۂ عامہ
تر پردیش۔ لکھنؤ۔ (یوپی)

جامِ جہاں نما

اُردو کا پہلا اخبار کب اور کہاں سے شائع ہوا تھا؟ نیز اُس کا نام کیا ہے؟ اس امر کے بارے میں محققین کے درمیان کافی اختلاف رہا ہے۔ دانشورانِ ادب و صحافت ایک زمانہ تک دہلی سے شائع ہونیوالے ہفت روزہ "دہلی اُردو اخبار" کو ہی اُردو کا پہلا اخبار قرار دیتے رہے ہیں جس کے ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ اس کے برعکس بعض محققین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مولوی اکرام علی کا مبینہ 'اردو اخبار' اُردو کا پہلا اخبار تھا۔ لیکن آج بیشتر محققین یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ "جامِ جہاں نما" اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا، اگرچہ مؤخر الذکر دعویٰ بالکل صحیح ہے، تاہم اس اولین اُردو اخبار "جامِ جہاں نما" کی تاریخِ اجراء کے بارے میں آج بھی اختلاف ہے۔

در اصل اردو کے اس پہلے اخبار کے بارے میں اختلاف ۱۔ اس وقت ہوئی جب مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور تصنیف 'آبِ حیات' میں یہ دعویٰ کیا کہ:

" ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔"

یہ بیان سراسر غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن ہے۔ گمان غالب مولانا آزاد نے دہلی اردو اخبار کو محض دہلی یا شمالی ہند اخبار قرار دیا ہوا اور محققین غلطی سے اس اخبار کو ہندوستان اردو اخبار سمجھ بیٹھے ہوں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اس سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد کے اس دعویٰ کو بیک جنبشِ قلم مسترد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر دہلی اُردو اخبار کے ایڈیٹر تھے اور وہ خود بھی اس سے وابستہ رہ چکے تھے اس لئے ان کا بیان اہم ہے۔ لیکن اس کا دوسرا ٹکڑا کہ 'یہ اُردو کا پہلا اخبار تھا' صحیح نہیں۔ 'جامِ جہاں نما' کی موجودگی میں یہ شرف "دہلی اردو اخبار" کو حاصل نہیں ہو سکتا۔"[1]

اس کے برعکس ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سید عبدالخالق کی تصنیف "میسور میں اردو" کے حوالے سے کسی "فوجی اخبار" کو پہلا اُردو اخبار قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] مقدمہ دہلی اردو اخبار، مرتبہ: خواجہ احمد فاروقی (۱۹۷۲ء) ص الف

"غالباً اردو کا پہلا اخبار فوجی اخبار تھا جسے
سلطان ٹیپو کے حکم سے سرنگا پٹنم سے جاری
کیا گیا تھا: ۱؎

لیکن یہ اخبار کب اور کس کی ادارت میں شائع ہوا؟ اس بارے میں کچھ بھی نہیں ذکر کیا گیا۔ پھر پہلا فوجی اخبار کی تاریخ اجرا کے علم اندراج کی صورت میں یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ واقعی یہ اردو کا پہلا اخبار تھا۔ حالانکہ اس سے قبل محمد ابواللیث صدیقی 'دہلی اردو اخبار' کو ہی اردو کا پہلا اخبار تسلیم کر چکے ہیں:

"اردو زبان کا پہلا اخبار 'اردو اخبار' تھا
جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی
محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے نکالا تھا۔ ۲؎

اسی طرح اردو کے پہلے اخبار کے بارے میں مذکورہ دونوں متضاد بیانات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کا پہلا اخبار "فوجی اخبار" تھا یا "اردو اخبار"؟

اسی طرح ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی مولوی باقر کے 'دہلی اردو اخبار' کو ہی اولیت کا درجہ عطا کیا ہے:

"۱۸۳۶ء میں "اردو اخبار" نکلا۔ اس اخبار
کے بانی مولوی محمد باقر تھے۔" ۳؎

"اردو اخبار (۱۸۳۶ء) اردو کا پہلا اہم
اخبار تھا: ۴؎

اس بیان کی تائید کرتے ہوئے "ذوالقرنین" بدایوں کے سابق ایڈیٹر نظام الدین حسین نظامی رقمطراز ہیں:

"۱۸۳۸ء میں 'اردو اخبار' کے نام سے
ایک ہفتہ وار پرچہ دہلی سے نکالا گیا۔ غالباً اردو
میں یہی پہلا اخبار تھا۔" ۵؎

اس اقتباس میں 'دہلی اردو اخبار' کا سنہ اجرا غلط ہے

۱؎ "آج کا اردو ادب" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۷۵ء) ص۲۲
۲؎ اردو صحافت کی ابتدا اور ارتقاء، محمد ابواللیث صدیقی، سہ ماہی مصنف علیگڑھ جلد ۱ نمبر ۱، فروری ۱۹۶۲ء، ص۱۳۰۔
۳؎ "نئے ادبی رجحانات" ڈاکٹر اعجاز حسین (۱۹۷۵ء) ص۲۰۹ اور ۲۱۰
۴؎ "میر امن سے عبدالحق تک" ڈاکٹر سید عبداللہ، ص۱۲۱

مسٹر نظامی غالباً مارگریٹا بارنس کے بیان سے گمراہ ہوئے ہیں۔ جنھوں نے دہلی اردو اخبار کے اجرا کا سن ۱۸۳۸ء قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس مارگریٹا بارنس نے سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے "سید الاخبار" کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ:

"شاید اردو کا یہ پہلا اخبار تھا" ۲؎

اس خیال کی تائید کرتے ہوئے مولوی ذکاء اللہ نے بھی اردو اخبارات میں سید الاخبار کو ہی اولیت کا درجہ عطا کیا ہے لیکن خواجہ احمد فاروقی نے اُن کے اس بیان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے جو حق بجانب ہے۔ کیونکہ اس سے قبل دو اردو اخبارات "جام جہاں نما" کلکتہ (تاریخ اجرا ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء) اور "دہلی اردو اخبار" دہلی (تاریخ اجرا ۲۸ فروری ۱۸۳۷ء) پہلے ہی جاری ہو چکے تھے۔

اس سلسلے میں پروفیسر سید حامد حسن قادری نے ان تینوں اخباروں کو رد کرتے ہوئے مولوی اکرام علی کے مبینہ اخبار "اردو اخبار" کو اردو کا سب سے پہلا اخبار قرار دیا ہے:

"مولوی محمد باقر نے دہلی سے "اردو اخبار"
جاری کیا۔ اردو زبان کا یہ دوسرا اخبار تھا۔ پہلا،
"اردو اخبار" مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے
۱۸۱۰ء میں نکالا تھا"۔ ۳؎

اس بیان کی تائید کرتے ہوئے سید رئیس احمد جعفری اپنی تصنیف "بہادر شاہ ظفر" میں رقمطراز ہیں:

"۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی باقر (مولانا
محمد حسین آزاد کے والد) نے دہلی سے "اردو اخبار"
جاری کیا یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اردو اخبار
مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ ۴؎

اسی طرح ضمیر الدین قریشی نے بھی مولوی اکرام علی کے ہی اردو اخبار کو اردو زبان کا پہلا اخبار تسلیم کیا ہے:

۱؎ "دی انڈین پریس" مارگریٹا بارنس، ص۲۳۱
۲؎ "دی انڈین پریس"، مارگریٹا بارنس، ص۲۳۱
۳؎ "داستان تاریخ اردو" پروفیسر حامد حسن قادری ص۸۵۸، ۴؎ "بہادر شاہ ظفر" سید رئیس احمد جعفری ص۴۱۳ ؛ ۵؎ "ادب اور اردو صحافت" ضمیر الدین قریشی ص۱۹

"اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار "اردو اخبار"
کے نام سے مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفا)
نے ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے جاری کیا۔"

اس اخبار کے بارے میں نادم سیتاپوری نے پورے وثوق کے ساتھ بچپن کے حافظے پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے:

"اردو کا اخبار" ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی
اکرام علی کی ادارت میں نکلا اور یہی اردو کا پہلا
اور سب سے پہلا اخبار تھا۔ "اردو اخبار" کے
کچھ پرچے بچپن میں میری نظر سے گذرے ہیں
جو فل اسکیپ کے دبیز "سیرام پوری" کاغذ پر
ٹائپ حروف میں چھپا ہوا تھا۔ یہ پرچے اکرام علی
کے پوتے منشی حسن رضا ادیب سیتاپوری (ایڈیٹر
ماہنامہ تہذیب، سیتاپور) کے پاس تھے جو آخری
زمانہ میں سخت قسم کے دماغی امراض میں مبتلا
ہو گئے تھے اور اسی عالمِ جنون میں انھوں نے
سیکڑوں کتابیں، رسائل اور اخبارات چاک
کر کے پھینک دیے، جنھیں ان کی وفات کے
بعد بوروں میں بھر کر دریا میں بہا دیا گیا۔"[1]

لیکن نادم سیتاپوری کا یہ بیان اگر کوئی صحیح بھی تسلیم کر لے تو مولوی اکرام علی کے اس مبینہ "اردو اخبار" کی عدم دستیابی کی صورت میں ان کا یہ دعویٰ ناقابلِ اعتبار ہی رہے گا کیونکہ نادم سیتاپوری کی بچپن کی یادداشت کی بنیاد پر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انھوں جس اخبار کو بچپن میں دیکھا تھا وہ مولوی اکرام علی کا ہی شائع کردہ، "اردو اخبار" ہی تھا۔ گمان غالب ہے کہ انھوں نے بچپن میں جو اخبار دیکھا ہوگا وہ مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" ہی رہا ہوگا۔ کیونکہ مولوی اکرام علی کے مبینہ "اردو اخبار" کی عدم موجودگی میں قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا بالکل غلط ہے کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار مولوی اکرام علی نے شائع کیا تھا۔

در اصل یہ غلط فہمی اختر الدولہ سید محمد اشرف کی تاریخ صحافت کے موضوع پر پہلی تصنیف "اخترِ شہنشاہی" کی درج ذیل تحریر کے باعث ہوئی ہے:

"ہندوستانی پریس، کلکتہ، مالک مولوی
اکرام علی، مہتمم مولوی خلیل الدین (اشک) تاریخ
اجرا یکم جنوری ۱۸۱۰ء"[1]

اس اقتباس کے خط کشیدہ لفظ "اجرا" سے شاید بعض محققین یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ اس "اجرا" سے مراد ہے اخبار کا اجرا کیونکہ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے مولوی اکرام علی کے اس مبینہ اخبار کو "اردو اخبار" کے بجائے "ہندوستانی" اخبار قرار دیا ہے۔ "انڈین ڈیلی میل" معارف اعظم گڑھ اور نگار، لکھنؤ کا حوالہ دیتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

"مولوی اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں فارسی کا پہلا "ہندوستانی"
اخبار جاری کیا تھا۔ لیکن اس اخبار کے بارے
میں مزید کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔"[2]

اسی طرح عبدالرزاق نے بھی انگریزی کے مشہور اخبار "انڈین ڈیلی میل" میں شائع شدہ مضمون "انگلش جرنلزم ان انڈیا" کے حوالے سے مولوی اکرام علی کے اخبار کا نام "ہندوستانی" قرار دیا:

"دیسی صحافت: ۱۸۱۰ء میں کلکتہ
میں "ہندوستانی" نامی اردو مطبع قائم ہوا اور
مولوی اکرام الدین صاحب نے اسی نام کا اخبار
جاری کیا۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس
رنگ کا اخبار تھا۔"[3]

اس طرح ان تمام حوالوں پر اگر غور کیجیے تو کسی نتیجہ تک پہونچنا قطعی ناممکن ہے کیونکہ اردو کے سب سے پہلے اخبار کے بارے میں کوئی مولوی محمد باقر کے "دہلی اردو اخبار" کو تو کوئی مولوی اکرام علی کے مبینہ "اردو اخبار" کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیتا ہے۔ عبدالرزاق نے مولوی اکرام علی کا نام اکرام الدین تحریر کیا ہے جبکہ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے مولوی اکرام علی کے "اردو اخبار" کا نام نہ صرف "ہندوستانی" تحریر کیا ہے بلکہ اسے اردو کا

---

[1] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی "نادم سیتاپوری، ص ۱۰۷، اردو ادب ۱۹۶۲

[1] "اخترِ شہنشاہی" سید محمد اشرف ص ۲۸۰، [2] "دی رائز اینڈ گروتھ آف ہندی" ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر (پی ایچ۔ ڈی۔ مقالہ) ۱۹۳۵ء ص ۲۲، [3] "ہندوستان میں اردو صحافت" (مضمون) عبدالرزاق، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۳۰ء ص ۳۵۰

نہیں، فارسی کا اخبار قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے متضاد بیانات کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ کیونکہ ان بیانات میں اگر ذرا سی بھی صداقت ہوتی تو محمد عتیق صدیقی اپنی تصنیف "ہندوستانی اخبار نویسی"، امداد صابری اپنی تصنیف "تاریخ صحافت اردو"، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی تصنیف "صحافت پاکستان و ہند میں" نیز ڈاکٹر نادر علیخان اپنے پی ایچ ڈی مقالہ "اردو صحافت کی تاریخ" میں مولوی اکرام علی کے اس اخبار کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کرتے۔ راقم الحروف کو بھی اس سلسلہ میں کافی تلاش و جستجو کے باوجود ہنوز دست کوئی معتبر سراغ دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔

درحقیقت اردو کا پہلا اور سب سے پہلا اردو اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ ہے جس کا پہلا شمارہ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو بدھ کے دن شائع ہوا تھا کیونکہ اس اخبار کے بارے میں اس کے ہمعصر انگریزی اخبارات "جان بل ان دی ایسٹ" کلکتہ، "کلکتہ جرنل" کلکتہ، "کلکتہ منتھلی جرنل" کلکتہ، اور راجا رام موہن رائے کے بنگلہ جریدہ "سنواد کومدی" کلکتہ، کے بیسویں شمارہ میں مندرج مضامین اور تبصرہ کی شکل میں تحریری ثبوت دستیاب ہوچکا ہے اس کے علاوہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے "جام جہاں نما"، کلکتہ کی بعض جلدیں نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی میں محفوظ ہیں جن کے مطالعہ کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں "کلکتہ جرنل" کلکتہ، کا مندرجہ ذیل اقتباس انتہائی اہمیت کا حامل ہے:

"پچھلے دنوں ایک تیسرا فلسفی نمودار ہوا جس کا نام "جام جہاں نما" ہے۔ ہمارا ہمعصر اخبار "جان بل" گزشتہ جمعہ کے شمارہ میں ان تینوں (یعنی راجہ رام موہن رائے کی سنواد کومدی، سماچار چندریکا، اور جام جہاں نما کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"اس وقت دیسی عالموں کی نگرانی میں دو بنگالی اخبار جاری ہیں۔ آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے لیکن اس کا رشتہ کس سے ہے؟ اسے کس نے جاری کیا؟ اس کے بارے میں ہمیں کوئی بھی کچھ بتا نہیں سکتا

نہ اس کا کوئی پراسپکٹس ہے، نہ اس پر چھاپ
والے کا نام درج ہے۔ یہ اخبار کوارٹو سا
کے تین ورق پر مشتمل ہے اور اس کا
"جام جہاں نما" ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے
دن ۲۷ مارچ کو شائع ہوا۔"[1]

اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو
سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" ہی تھا جسے کلکتہ سے
ہنگو نے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو جاری کیا تھا۔ اگرچہ جا
کے بارے میں بعض محققین نے یہ دعویٰ بھی کیا
جہاں نما' سب سے پہلے فارسی زبان میں شائع ہوا
اگر یہ اخبار سب سے پہلے ہندوستانی یعنی اردو زبا
ہوچکا ہوتا تو راجا رام موہن رائے' جو اردو جام جہا
اولیت کو تسلیم کرتے ہوئے 'سنواد کومدی' کلکتہ میں
'ہندوستانی پیپر جام جہاں نما' شائع کرچکے تھے'، ا
"مرآۃ الاخبار" کلکتہ، کے پہلے شمارہ کی اشاعت کے با
جو ۱۲ اپریل ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا تھا یہ اعلان کا
میں شائع نہ کراتے:

"قارئین بالخصوص شمالی ہند کے عوام
کے لیے اس زبان (فارسی) میں کوئی اخ
شائع نہیں ہوتا ہے چنانچہ راجا رام موہن
رائے نے ہر ہفتہ ایک فارسی اخبا
جاری کرنے کا کام شروع کیا ہے۔"[2]

اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے
۱۸۲۲ء کو فارسی اخبار 'مرآۃ الاخبار' کی اشاعت سے قبل
زبان میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوا تھا اور جو اخبار
شائع ہو رہا تھا وہ اردو "جام جہاں نما" ہی تھا۔
یہ اخبار کچھ دن بعد ہی 'جام جہاں نما' کے نام سے فار
شائع ہوا تھا۔ البتہ اردو زبان میں 'جام جہاں نما' کی اشا
کا دور انتہائی مختصر رہا تھا کیونکہ 'کلکتہ جرنل' کلکتہ، کے

---

[1] دی کلکتہ جرنل، جرنل، بحوالہ دی کلکتہ منتھلی جرنل، کلکتہ، جلد اول
"صحافت پاکستان و ہند میں" ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۲۰

[2] دی کلکتہ جرنل، کلکتہ جلد دوم نمبر ۹۰ ص ۸۳۵، ۲۳ اپریل ۲۲،۸
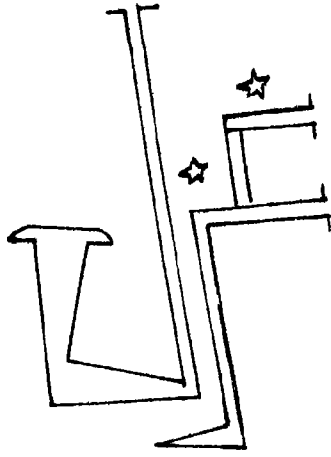
کے شمارہ میں شائع شدہ ایک اعلان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندوستانی (اردو) اخبار کے اب تک چھ شمارے شائع ہو چکے ہیں اس کی زبان میں اہم تبدیلی ہونے والی ہے" چنانچہ ساتویں شمارہ کی اشاعت کے بعد ۵ امئی کو شائع ہونے والے آٹھویں شمارہ سے اس میں اردو کے ساتھ فارسی کے چند مضامین شائع ہوئے اور پھر ۱۹ جون ۱۸۲۲ء کے شمارہ سے 'جام جہاں نما' محض فارسی کا ہی ایک اخبار بن کر رہ گیا اور فارسی کے ساتھ اردو مضامین کی اشاعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاریخ ۱۸ جون ۱۸۲۳ء سے اس کے باہمت ایڈیٹر نے درج ذیل اعلان کے ساتھ اردو 'جام جہاں نما' کے دور ثانی کا آغاز کیا:

> "اخبار کو زیادہ دلچسپ، پُرلطف اور مفید بنانے کی غرض سے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اس اخبار کا ایک ضمیمہ خالص ہندوستانی یا اردو زبان میں شائع کرے"

اس کے بعد اردو 'جام جہاں نما' کئی برسوں تک فارسی 'جام جہاں نما' کے ساتھ شائع ہوتا رہا لیکن افسوس کہ اردو 'جام جہاں نما' کو اس کے ایڈیٹر نے حسب ذیل معذرت کی اشاعت کے بعد ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا:

> "بہتیرے قدر شناس، جنھوں کے لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی، اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جنھوں کی زبان ہی فارسی ہے وہ فارسی تحریر چاہتے ہیں۔ آج تک آٹھ صفحے فارسی اور اردو کے چار چھپتے ہیں، آئندہ سے بارہ صفحے فارسی چھاپے جائیں گے"

اس طرح اردو جام جہاں نما کی اشاعت کا دور ثانی بھی ختم ہو گیا۔ حالانکہ فارسی 'جام جہاں نما' کافی عرصہ تک جاری رہا کیونکہ اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع شدہ اس عبارت سے کہ 'جام جہاں نما' کلکتہ، فارسی عبارت صاف و شفاف ہے" یہ پتہ چلتا ہے کہ فارسی زبان کا یہ اخبار انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔

——

رئیس الدین رئیس

۲۵، ۱/۱ ادہلی گیٹ۔ علیگڑھ (یوپی)

اک تجسس سا بھر ہو گئیں آہٹیں
راستوں میں کہیں کھو گئیں آہٹیں

پھر کسی کی نظر پھول چُننے لگی
پیکر مجسم کہیں ہو گئیں آہٹیں

آئنوں سے چٹخنے لگے آئینے
تخم تخریب پھر بو گئیں آہٹیں

برہمی برہمی سے گلے مل گئی
داغ سینے کے جب دھو گئیں آہٹیں

بے سماعت بصارت کا حاصل ہے کیا
کس سے پوچھیں کدھر کو گئیں آہٹیں

عمر بھر ریگ زاروں میں چلنا پڑا
مجھ سے ناراض کیا ہو گئیں آہٹیں

ذہن میں اے رئیس ایک طوفان ہے
کیا مجسم لرزتی ہو گئیں آہٹیں

شری گریش درگی
ڈپٹی کنٹرولر برائے اوزان و پیمائش
حکومت مہاراشٹر

مہر بند اشیاء ضروری تقسیم تحفظ حقوق صارفین

آج کے اس جدید دور میں جب کہ صنعتوں و حرفتوں اور تکنیکی معلومات بڑی تیزی سے فروغ پا رہے ہیں۔ اشیاء ضروریہ کی مہر بند طریقہ سے فراہمی بھی ناگزیر بنتی جا رہی ہے۔ چنانچہ مہر بند اشیاء ضروریہ کی فروخت میں باقاعدگی پیدا کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔
زیر نظر مضمون میں اس تعلق سے رائج قوانین پر خصوصی بحث کی گئی ہے

وزیراعظم کے اعلان کردہ ۲۰ نکاتی پروگرام میں "صارفین کے حقوق" کو خصوصی طور پر شامل کیا گیا ہے صارفین غیر معمولی طور سے معیشت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ صارفین کے مفاد کی حفاظت کیلئے یوں تو کئی قوانین نافذ العمل ہیں۔

لیکن اشیاء ضروری کی مہر بند طریقہ سے فراہمی کے تعلق سے جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ واقعی صارفین کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔ ان قوانین کی رو سے صارفین کو دھوکہ دہی اور دیگر ناجائز کاروباری ہتھکنڈوں سے بچایا جاتا ہے۔ مہر بند اشیاء کی خاصیت میں بہتری پیدا کرنے کی غرض سے اگر قانون کی مدد لیجائے تو یقیناً تجارت کو فروغ حاصل ہوگا۔

آج کے اس جدید دور میں جب کہ صنعت و حرفت اور تکنیکی مہارت ساری دنیا میں خوب تیزی سے پھل پھول رہی ہے اشیاء ضروری کی مہر بند طریقوں سے فراہمی بھی ناگزیر بنتی جا رہی ہے جس کی خاص وجہ ہے وہ پیکنگ سسٹم جس سے ان اشیاء کو لانے پہنچانے اور ان کی بازار میں فروخت میں کافی مدد ملتی ہے۔ پیکنگ سسٹم دراصل پیداواری صلاحیت اور کھپت کے مابین ایک اہم رابطہ ہے۔ پیکنگ کے کئی طریقے ہیں لیکن ان سب کا واحد مقصد اشیاء ضروری کی بحفاظت نقل و حمل اور حفظان صحت اصول کے تحت متعلقہ صارفین تک ان اشیاء کی رسائی۔ مہر بند طریقہ سے فراہمی کی بدولت نہ صرف اشیاء کی تازگی باقی رہتی ہے بلکہ ان اشیاء کے استعمال کی مدت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے تکنیکی مہارت کے استعمال سے مہر بند اشیاء ماحولیات کے بُرے اثرات سے خود بخود محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ محض اشیاء قابل استعمال ہیں نہ کہ ان کی پیکنگ۔ پیکنگ تو صرف اشیاء کے استعمال کی مدت تک ان اشیاء کی حفاظت کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔

ر بند اشیاء ضروری کے متعلقہ قوانین

ہر کوئی جانتا ہے کہ پیکنگ شدہ اشیاء ضروری کے
ون کیلئے اس بات کا اندازہ لگانا کہ آیا مذکورہ شے
ے لحاظ سے ٹھیک تولی گئی ہے بہت مشکل ہے جب تک
کھول کر اس مذکورہ شے کا وہ خود وزن نہ کر لیں،
سے خود اپنی سہولت کی خاطر اور پریشانی سے بچنے کے
الہ بیوپاریوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر بیوپاریوں
ین کے مفاد کا خیال ہو تو انھیں یہ ذمہ داری قبول کرنی
ہے کہ وہ اشیاء ضروری کو مہر بند کرتے وقت یہ خیال
مذکورہ اشیاء ناپ، تول اور خاصیت کے اعتبار سے
سے اطمینان بخش ہیں۔ آجکل کے مشینی دور میں جب کہ
کے اوقات مشکل سے حاصل ہوتے ہیں۔ صارفین کے
تمام جھنجھٹوں میں پڑنا ناممکن ہوتا ہے اس لئے وہ فوری
ہ اشیاء کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس وجہ سے پیکنگ شدہ
امر کے استعمال کو ہی صارفین زیادہ ترجیح دیتے ہیں

صارفین کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ

اشیاء ضروری کی تیاری، ناپ، تول اور مہر بند کرنے
مراحل سے وابستہ بیوپاری کوئی دھوکہ دہی نہ کریں اس
ضمانت نہیں۔ ان ہی معاملات میں صارفین کو پشت پناہی
ت ہوتی ہے۔ چنانچہ مہر بند اشیاء کی تقسیم و فروخت
ایک مضبوط قانون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ دھیان رہے
حق! صارفین کو راغب کر کے ان سے زیادہ پیسے وصول
ذریعہ نہیں ہے۔ ایسے رجحانات کا سدباب کرنے کے لئے
الاقوامی تنظیم برلئے قانون بابت اوزان و پیمائش نے
ثر قانون بنانے کی سفارش کی۔ آج دنیا کے تمام ترقی
ں میں مہر بند اشیاء کی خرید و فروخت کے تعلق سے قوانین
ن کی رو سے صارفین کے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔

ن و پیمانوں کا تعین

ام طور سے کوئی بھی مہر بند شے کا ٹھیک ناپ اس کی اونچائی

یا موٹائی سے معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ پیکنگ کے اوپر وزن نہ
لکھا ہو۔ اگر غلطی ہو جائے تو صارفین کے لیے یہ سہولت ختم ہو جاتی
ہے کہ آیا وہ متعلقہ شے خریدے یا نہ خریدے۔ اکثر اوقات یہ بھی
دیکھا گیا ہے کہ پیکنگ کے اوپر مہر بند شے کی تفصیل اتنی باریک
تحریر میں ہوتی ہے کہ اسے پڑھا ہی نہیں جا سکتا یا پھر کسی ایسے
کونے میں لکھ دی جاتی ہے جہاں خریدار کی توجہ مشکل سے مبذول ہو
کبھی کبھار ایسے لفظ مثلاً "جب پیکنگ کی گئی" "کل وزن"
"پیکنگ کا کل وزن" وغیرہ کے استعمال سے خریدار کو گمراہ کرنے
کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اسے اس بات کا احساس نہ ہو سکے کہ اصل
شے کا وزن کیا ہے۔ مذکورہ بالا تمام معاملات سے نمٹنے کے لئے اس
بات کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ پیکنگ کے اوپر مہر بند شے کا
ٹھیک ناپ تول لازمی طور پر صاف صاف تحریر کیا جائے۔

میٹرک سسٹم

اب بھارت میں اوزان و پیمائش کے لیے میٹرک سسٹم قبول
کیا گیا ہے چنانچہ سیر، پاؤنڈ، اونس وغیرہ پیمانوں کی اب یہاں
کوئی قانونی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ علاوہ ازیں ایک ہی طرح کی
اشیاء جو کہ وزن اور پیمانے کے اعتبار سے بھی مساوی ہوں ان کی
پیکنگ میں یکسانیت پیدا کرنے کی گنجائش نکالی گئی ہے تاکہ صارفین
کے لیے مذکورہ شے کی خاصیت اور قیمت خرید کے درمیان فرق
کا اندازہ کرنا آسان ہو جائے۔

کسی بھی ملک میں عوام اور خصوصاً صارفین کی علمی قابلیت اور
اشیاء ضروری کی دستیابی میں تخفیف (جو کہ ناجائز طریقے سے
عموماً بناوٹی قلت سے پیدا کی جاتی ہے) اشیاء کی قیمتوں پر اثر
انداز ہوتی ہیں   بیوپاریوں کی اس چالاکی سے کہ وہ بناوٹی قلت
کا ڈھونگ رچا کر اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کریں۔ صارفین کو بچانے
کے لیے چند موثر قوانین کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اگر ایک بار قیمتوں
کا تعین ہو جائے تو انہیں تبدیلی ممنوع قرار دینی چاہیے۔

نافذ العمل قانون بابتہ ۱۹۸۵ء

یہاں پہلے اوزان و پیمائش (نافذ العمل) قانون بابتہ ۱۹۸۵ء
رائج ہے جس کی دفعہ ۴ کی رو سے ہر پیکنگ کی جو کہ فروخت کے
لئے رکھی گئی ہو مہر بند شے کا وزن اور پیمانہ صاف طور سے درج

قومی راج

کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی پر دفعہ ۲۸ کے تحت کم از کم ۲۰۰ روپیہ جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے لیکن یہ قانون بہت ہی محدود پیمانے پر نافذ العمل ہے اور صارفین کے مفاد کے لئے غیر مؤثر ثابت ہوا ہے۔

مہر بند اشیاء (ضابطہ) حکمنامہ بابت ۱۹۷۵ء

مہر بند اشیاء (ضابطہ) حکمنامہ بابتہ ۱۹۷۵ (پیکیج) کچھ عرصہ نافذ العمل رہنے کے بعد ۲۵ ستمبر ۱۹۷۷ء سے منسوخ کر دیا گیا بعد میں مذکورہ حکمنامہ میں ترمیمات کرتے ہوئے اسٹینڈرڈ آف ویٹس اینڈ میزر ایکٹ ۱۹۷۶ کا نفاذ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۷ء سے کیا گیا۔

اس کے بعد اس قانون کو دوسری شکل دیتے ہوئے مہر بند اشیاء شرائط بابت ۱۹۷۷ء کا نفاذ کیا گیا۔

مذکورہ قوانین کا سب سے اہم پہلو اشیاء کی پیداواری قیمت کو نظر انداز کرتے ہوئے اشیاء کی قیمتوں میں ناجائز اضافہ کی کوششوں سے صارفین کو بچانا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ الگ الگ اوزان اور پیمانے بنائے جائیں تاکہ صارفین کے استحصال کی روک تھام ہو سکے۔

معیار برائے اوزان اور پیمائش (مہر بند اشیاء) شرائط بابت ۱۹۷۷ء

صارفین کے **مفاد کی** حفاظت کی غرض سے معیار برائے اوزان و پیمائش قانون بابتہ ۱۹۷۶ اور معیار برائے اوزان و پیمائش (مہر بند اشیاء) شرائط ۱۹۷۷ نافذ العمل ہیں۔ ان قوانین کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

"مہر بند شئے" کا مطلب ہے وہ شئے جسے خریدار کی غیر حاضری میں وزن ناپ تول کر گنتی کے ساتھ ایک پیکنگ میں رکھا گیا اور بعد میں مشکل بیوپاری کے توسط سے فروخت کیا گیا۔

مذکورہ قانون کی رو سے کسی بھی شخصیت کے لئے یہ ممنوع ہے کہ وہ کوئی شئے بنائے۔ تیار کرے، پیکنگ کرے، فروخت کرے یا اس میں مدد دے (۳) ظاہر کرے یا فروخت کے لئے ذخیرہ کرے ایسی کوئی بھی شئے جو پیکنگ کی گئی ہو ایسے پیکنگ پر یا

غزلیں

• قاضی حسن رہنما
قاضی پورہ، کھنڈوہ (ایم پی)

عزائم کو اپنے تو پتوار کر
پلٹ جائے موج ستمگار کر

خلوص و محبت کے تیشے سے اب
فصیلِ عداوت کو مسمار کر

انا کا یہ جذبہ ہے خود سر بہت
عقیدت کے رشتے کو ہموار کر

پسِ پشت شورش نیا چھوڑ دے
نصیحت کے نشتر سے اب وار کر

نہیں تجھ میں طاقت و قوت اگر
قلم کو رہنما اپنے تلوار کر!

حفاظت کھنڈوی،
کھنڈوہ (ایم پی)

تا عمر گرفتارِ بلا ہو کے جئے ہیں
جیسے کسی بے کس کی دعا ہو کے جئے ہیں
رقصاں رہا ہونٹوں پہ نمائش کا تبسم
جینے کو تو جینے کی سزا ہو کے جئے ہیں
ہر دور میں دنیا نے ہمیں دار پہ کھینچا
ہر حال میں پابندِ وفا ہو کے جئے ہیں
ان کو میسر ہی نہیں منزلِ عرفاں
پتھر تری دنیا کے خدا ہو کے جئے ہیں،
ہر گام پہ جھکتے رہے احساسِ وفا سے،
سجدوں کی طرح روز ادا ہو کے جئے ہیں
سنو کھی ہے زباں جب کبھی نغموں کی حفاظت
ہم ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہو کے جئے ہیں

غزل

قالب مرزا پوری

عفور خان کی گلی ۔ ولزلی گنج ۔ مرزا پور
(یو۔ پی)

ں اور بھلاتی یہ تبصرے ہیں بہت
ھا لکھا نہیں کوئی پڑھے لکھے ہیں بہت
جانے کتنوں کو سورج نے کر دیا بے گھر
ں کے ابر کھلا ہے تو گھر گرے ہیں بہت
سوچتے ہیں بہت کچھ وہ کر نہیں سکتے
ں ہی ہیں میں بھی ہوں جو لوگ سوچتے ہیں بہت
جانتے ہوئے میں ان کے ساتھ رہتا ہوں
یہ جانتا ہوں کہ ساتھی مرے بُرے ہیں بہت
بڑھائیے نہ مری سمت جامِ ہمدردی
کہ میری ذات سے قصّے جڑے ہوئے ہیں بہت
جاہلِ علم ہیں وہ بُرد بار ہوتے ہیں
جو جانتے نہیں کچھ بھی وہ بولتے ہیں بہت
عجیب ضد ہے یہ شیشہ نہیں ہے ہیرا ہے
نہ چھیڑیئے مجھے بس آپ جانتے ہیں بہت
لگا کے منہ انہیں پچھتا رہا ہوں اے قالب
یہ سوچنا ہی غلط تھا وہ کام کے ہیں بہت

اس پر چسپاں لیبل پر صاف صاف طور سے مندرجہ ذیل تفصیلات درج ہوں

(۱) کارخانہ دار یا پیکر کا نام اور پتہ
(۲) پیکنگ میں بند شے کی پہچان اور نام
(۳) مروجہ وزن اور پیمانے کی اکائی کی شے کی مقدار اور اگر کسی شے کو تعداد کے لحاظ سے مہر بند کر کے فروخت کے لئے رکھا گیا ہو تو اس شے کی ٹھیک تعداد۔
اور پیکنگ سے پہلے شے کے تیار ہونے کی تاریخ اور سال۔
(۵) اگر کارخانے دار نے تھوک قیمت بتائی ہو تو متعلقہ شے کی پھٹکل قیمت فروخت۔
(۶) پیکنگ کی قیمت فروخت
(۷) شے کی سائز کی تفصیل۔

(۸) دیگر معاملات جو مذکورہ شرائط میں درج ہیں۔
مذکورہ بالا قانون اور شرائط کی خصوصیات اسطرح ہیں
(۱) قانون کے تحت دیگر تمام قوانین غیر واجب العمل ہیں
(۲) ان قوانین اور شرائط کی حیثیت مرکزی ہے جس کا نفاذ ریاستی حکومت محکمۂ غذا اور شہری رسد کے ماتحت اوزان اور پیمائش تنظیم کے توسط سے کیا گیا ہے۔
(۳) ان قوانین کی پابندی صرف اسی تجارت کے لئے لازمی ہے جو کہ بین الریاستی صنعت و حرفت کے لئے متعین ہے
(۴) ان کا اطلاق صرف تھوک پیکنگ یا خریداری پیکنگ پر ہوگا۔
(۵) چند مخصوص مہر بند اشیاء کو سال، مہینہ اور قیمت فروخت بتانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔
(۶) قانونی طور سے کنٹرول قیمتوں والی اشیاء مثلاً محصولی سیمنٹ وغیرہ کی بھی قیمت فروخت ظاہر کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔
(۷) صرف دو طریقوں سے مہر بند اشیاء کی قیمت فروخت ظاہر کرنا ہوگی۔
(الف) زیادہ سے زیادہ قیمت۔ لوکل ٹیکس علٰحدہ (M.P.L.T)
لوکل ٹیکس میں سیلز ٹیکس، سینٹرل سیلز ٹیکس، اور

آکرامے شامل ہیں)

(ب) زیادہ سے زیادہ قیمت (اس میں تمام ٹیکس اور محصول شامل ہیں ۔)

(۸) پھٹکل بیوپاری کے لئے لازمی ہے کہ وہ لوکل ٹیکس کی رقم صاف تحریر کرے ۔

(۹) مقدار کے لئے کوئی حرف یا اشارہ کا استعمال نہیں ہوگا کیونکہ اس سے مہر بند اشیار کے بارے میں مغالطہ پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ۔

(۱۰) صرف ان ہی اشیار پر "وزن جب پیکنگ کیا گیا" تحریر کیا جاسکتا ہے جن کے وزن میں نمی یا دیگر قدرتی حالات کے سبب تخفیف ہونے کا خدشہ ہوتا ہے ۔

(۱۱) کوئی بھی تھوک یا پھٹکل بیوپاری کوئی بھی شے مہر بند فروخت تقسیم، فراہم یا ذخیرہ نہیں کرسکتا جب تک کہ مذکورہ قوانین و شرائط کی پابندی نہ کرے ۔

(۱۲) کوئی بھی بیوپاری یا شخص کسی بھی شے کو مہر بند طریقے سے اس قیمت پر فروخت نہیں کرسکتا جو کہ پھٹکل قیمت سے زائد ہو ۔

(۱۳) مذکورہ قانون کے تحت عام غلطیوں کو نظر انداز کیا گیا ہے ۔

(۱۴) بھارت میں درآمد مہر بند اشیار پر بھی مذکورہ قانون کا اطلاق ہوگا ۔

(۱۵) برآمد اشیار کے لئے مندرجہ ذیل اندراجات لازمی ہیں ۔

(۱) کسی شے کیلئے مخصوص ۔

(۲) شے کی پہچان ۔

(۳) کارخانہ دار کا نام و پیکر کا پتہ ۔

جن ممالک میں اشیار برآمد کی جارہی ہوں وہاں کے قوانین کی پابندی بھی لازمی ہوگی ۔ برآمد اشیار کی فروخت بھارت میں ممنوع ہوگی ۔

(۱۶) مذکورہ بالا قانون و شرائط کا اطلاق درج ذیل پر نہیں ہوگا ۔

(۱) اگر مہر بند شے کل وزن اور پیمانہ میں ۲۰ گرام یا ۲۰ ملی لیٹر یا اس سے کم ہے ۔

(۲) بیڑی اور ماچس کی سلائیاں ۔

(۱۷) کارخانہ دار ریپکر، ڈائرکٹر لیگل میٹرولوجی، وزارت غذا و شہری رسد حکومت ہند نئی دہلی کے دفتر میں رجسٹرڈ ہوں ۔

جرمانے

مذکورہ قوانین یا شرائط کی خلاف ورزی پر کم از کم پانچ سال قید اور یا پانچ ہزار جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی ہے ۔

رعایت

پہلے جرم پر معافی نامہ تحریر کرنے پر معاف کردیا جاتا ہے ۔ پہلے جرم سے ۳ سال مدت تک کوئی جرم نہ ہوا اور اس کے بعد کوئی جرم ہو تو اسے دوبارہ پہلا جرم تسلیم کیا جاتا ہے ۔

نیا قانون

مہر بند اشیار ضروری کی بین الریاستی (اندرون ریاست) تجارت و حکومت کے لئے ریاستی حکومت کے توسط سے معیار برائے اوزان و پیمائش، (نافذ العمل) قانون بابتہ ۱۹۸۵ کا جلدی اطلاق متوقع ہے ۔

افسانہ

لکیریں

م۔ ناگ
معرفت باندرہ پیراڈائز
۲۲ پالی روڈ، باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

لکھا تھا کہ چاروں طرف چمن زار ہیں مگر میں
طرف کا نجریٹ لوئی جاری ہے حق کو کالی
ہے۔ کتابوں میں لکھا تھا کہ سڑک کی دونوں
سایہ دار درخت ہیں مگر چاروں طرف
اور میں نے اجالوں کی الف لیلیٰ پڑھی
یاں آکر پتہ چلا کہ روشنی کی ساری کرنیں قید
ہیں۔

میں نے اپنی ہتھیلیاں دیکھیں مگر وہ بالکل
ایک بھی لکیر نہیں — ویسے میں لکیر کا فقیر بھی
بنا تھا مگر . . . . .

پہلے کسی انٹرویو میں پوچھا گیا تھا تم ہندی بولتے ہو؟
ر بھی ہندی بولتے ہو؟ جب میں انگریزی
انھوں نے غلطیاں نکالنی شروع کیں۔ میرا دل
انگریزوں سے صحیح ہندی بولتے تھے جو میں
ہی بولوں۔"

جب پچاس روپے کا چیک بھائی صاحب نے کاٹا
نے چار الاسنے دیئے تھے۔ کپڑے نہیں
میں نے بھائی صاحب سے کہا تھا نوکری کی
ری نہیں۔"
صاحب بولے تھے "اپنی طرف سے کوشش
ہ۔"

●

میری کلاس میں پچھلی بنچوں پر بیٹھنے والا ایک

کتنا آگے نکل گیا جیٹ کی رفتار سے — اور
بیل گاڑی میں سوار ہوں — اگر یہ قسمت
ہے تو میں پوچھتا ہوں یہ قسمت کون لکھتا ہے۔ اور
اپنی ہتھیلیاں دیکھیں ایک بھی لکیر نہیں
ہو گیا ہے یہ مجھ سے کیوں کتراتی ہیں؟ — میں
— میرے ہاتھ میں کیا تھا ان کے ہاتھ میں
اور اس لڑکی کے ہاتھ میں چوڑیاں تھیں جو
یا دلال کر وہ میرے بچے کی ماں بننے والی
نہیں نے شادی نہ کی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے
رہے گی۔

تو کیا میں اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل
رہا تھا۔

— میرے ہاتھ میں کیا تھا ان کے ہاتھ میں تو اقتدار
تھا اور اس لڑکی کے ہاتھ میں چوڑیاں تھیں۔ میرے ہاتھ
میں تو بانسری بھی نہیں تھی — میں نے بار بار لڑکی سے
پوچھا تھا کہ میں موہن ہوں تو وہ رادھا کیوں نہیں ہے؟ —
میں کرتا بھی کیا — اگر کوئی ذمہ داری مل جاتی تو اس کا
گلا ہی دبا دیتا۔

میں نے ایک دفعہ پوچھا تھا۔
"کیا صرف تعلیم کے بل پر روٹی نہیں مل سکتی۔ میرے
پاس ڈگری ہے۔"
ڈائریکٹر صاحب نے چشمہ صاف کیا تھا۔
"تم نے بی۔ اے کر لیا ہے؟"

"ایم اے کر لیا ہے؟" میں بولا تھا

"اگر تمہاری تعلیم کو روٹی دینی ہوتی تو کیوں امیر
غریب بنتا اور کیوں غریب دن بہ دن امیر ہوتا جاتا
اور کیوں ایم اے پاس لڑکا ان بچوں کے گو موت دھوتا
بولو؟ —"

●

میں نے اپنی ہتھیلیاں پھیلائیں، لکیریں بھاگ رہی
تھیں۔
کیا لکیریں موجود تھیں اور دیکھنے پر بھاگ رہی تھیں؟
میں حیرت زدہ انھیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر
ایک بھی لکیر پکڑ میں نہ آئی اور دامن چھڑا کر بھاگنے لگی۔
یوں پھر ہتھیلی صاف!
— ہمیشہ کی طرح پھر لیٹر (Letter) ملا۔
"از پرڈی ڈیسزن میکن بائی دی بورڈ آف ڈائریکٹرس
وی آر انیبل ٹو گیو اپائنٹمنٹ . . ."
ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ تحریر وہی صرف دستخط
بدل جاتے تھے۔

ادھر ایک خط آتا میں تھوڑا اور تھک جاتا ڈگری
تھوڑی اور باسی ہو جاتی۔ وہ کہتے بیٹھو — میں بیٹھ جاتا
اور پھر شروع ہوتے اوٹ پٹانگ سوال۔ کہاں تھا ان
سوالوں کا جواب۔ کس Comptetion Success
میں —

چاروں طرف دھوپ تھی اور کتابوں میں لکھا تھا
کہ چاروں طرف چمن زار ہیں۔ میں نے اپنی ہتھیلیاں پھیلائیں
لکیریں بھاگ رہی تھیں میں نے انھیں سمیٹنے یا پکڑنے کی بڑی
کوشش کی مگر وہ میرے ہاتھ نہ آئیں اور نکل بھاگیں — یوں
میری ہتھیلی صاف ہو گئی میں نے سوچ لیا — ان لکیروں
کو مجھ سے بہتر ہاتھ مل گیا ہوگا! □ □

نام کتاب "شبنم کے موتی"
مصنف :- غنی غازی
قیمت :- چھ روپے
ملنے کا پتہ :- صبح امید پبلیکیشنز
بلاسس روڈ بمبئی ۸

بچوں کا ذہن ایک سفید کورے کاغذ کے مانند ہوا کرتا ہے اس پر جو بھی نقش بنائے جائیں وہ پائیدار بن جایا کرتے ہیں۔

بچے جن حالات اور واقعات کو ذہن نشین کر لیتے ہیں وہ تا عمر انھیں بھولتے نہیں۔

بچے کہانیاں سننے کے بہت شائق ہوتے ہیں اور دوران کہانی اپنے بچکانہ سوالات سے ان کہانیوں میں مزید چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ اردو ادب میں بچوں کے لئے اچھی کہانیوں کے روپ میں ادب کی ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں دلچسپ انداز میں نصیحت آموز کہانیوں کو پیش کیا گیا ہو زیر نظر مجموعہ "شبنم کے موتی" بچوں کے لئے دس دلچسپ کہانیوں پر مشتمل ہے جو بجا طور پر بچوں کی ذہن کی آبیاری کے لئے مفید ہیں۔ یہ کہانیاں نہ صرف طلسماتی اور لسیاتی جذبات سے بھری ہوئی ہیں بلکہ ہر کہانی بچوں کے لئے ایک درس نصیحت ہے۔

غنی غازی صاحب کا اسلوب نگارش جیسا کہ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور صاحب نے اس کتاب کے پیش لفظ میں فرمایا ہے۔ "الفاظ ہیر پھیر یا ابہام سے پاک ہے۔ کہانیاں شبنم سے دھلے ہوئے ان ستھرے گل و گلزار میں اصلی موتی کی طرح آبدار ہیں۔ نئے موضوعات کیلئے غنی غازی صاحب کی مسلسل جستجو اور ان میں دلچسپ رنگ آمیزی نے بچوں کے ادب کے لیے ان کی ان کوشش نے گرانقدر سرمایہ فراہم کیا ہے۔

کتابت خوبصورت ہے الفاظ روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہیں جہاں بچے آسانی کے ساتھ کہانیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہیں ان کو ان کے ذریعہ روانی کے ساتھ پڑھنے میں مدد بھی ملے گی انشاءاللہ۔

مجھے توی امید ہے کہ "Aesop's Fables" کی طرح اس مجموعے کی سبق آموز کہانیاں بھی اس دور میں یاد رکھی جائیں گی اور وہ پاک و صاف معاشرہ بنانے میں ممد و معاون ثابت ہونگی۔

بچوں کے شوق تکمیل کے لئے ہر اسکول کی لائبریری میں اس مجموعہ کا رکھا جانا ضروری ہے۔

یہ مجموعہ موزوں سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے صبح امید پبلیکیشنز بلاسس روڈ بمبئی ۸ کے زیر اہتمام شائع کیا گیا ہے کتاب کی قیمت ۶ روپے ہے جو موجودہ گرانی کے دور میں مناسب ہے۔ سر ورق بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔

خبریں ۔ تصویروں میں

گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے نائب صدر ہند کے عہدے پر منتخب ہو جانے کے بعد ۲۴ اگست کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ بمبئی میں حاجی علی کی درگاہ شریف اور ماہم میں مخدوم شاہ بابا کی درگاہ شریف پر حاضری دی۔ زیر نظر تصاویر میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور دیگر حضرات مصروف دعا ہیں۔ تصویر میں شری عبدالصمد میونسپل کونسلر اقبال پٹیل اور شری سید احمد وزیر مملکت برائے ہاؤزنگ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

بھارت میں پولینڈ کے سفیر مسٹر سیویکسکی نے ۴ ستمبر ۱۹۸۷ء کو یہاں راج بھون میں مہاراشٹر کے کارگزار گورنر شری ایس کے. ڈیسائی سے رسمی ملاقات کی۔ یہ اسی موقعہ کی تصویر ہے۔
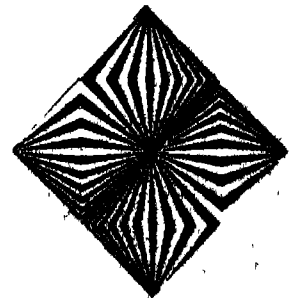
وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان ۱۴ ستمبر ۱۹۸۸ء کو بمبئی کے گرگاؤں چوپاٹی پر گنیش درشن تقریبات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔ تصویر میں ڈی جی پی شری ڈی ایس سومن بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سری لنکا کے وزیر مالیات شری این رسے نارائن ذبیل نے ۵ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ورشا میں وزیر اعلیٰ شری ایس. بی چوان سے رسمی ملاقات کی۔

دلت ساہتیہ کی جانب سے "گوتا ورا" کہانیوں پر مبنی اجیت کیلکر اور اگیان بابو کی کتاب کا اجرا وزیر مالیات شری سوشیل کمار شندے نے منترالیہ میں ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء کو کیا اس موقع پر پروگرام کے صدر شری بابا صاحب تھورات، شیواجی راؤ شندے، شری رمیش متکر شری رام داس بھٹ نے شری یشونت شیو ساگر، شری دبے قدم دیکھے جا سکتے ہیں۔

تحریک آزادی کے جدوجہد کے
مقدس مٹی کے مرتبان کو وزیراعلیٰ
راؤ چوان ۴ ستمبر کو دہلی سے بمبئی
زیر نظر تصویر میں وزیر تعلیم پروفیسر
زیر مالیات شری سوشیل کمار شندے
اے انفارمیشن ڈاکٹر شری کانت
کر یڑی شری کے جی ۔ پیرا بھیے،
رمیشن شری دنیش افضل پور کر
ہیں ۔

پولینڈ کے بھارت میں سفیر مسٹر سیلوی تفسکی نے ۶ ستمبر کو بمبئی میں ۔۔ مسز الیہ میں وزیراعلیٰ شری ایس ۔ بی ۔ چوان سے رسمی ملاقات کی یہ اسی موقعہ کی تصویر ہے ۔

قارئین کی رائے

• علی رضا
۲۰ سومت، ۲۲ ایس۔ پی روڈ
ورلی بمبئی ۴۰۰۰۲۵

"قومی راج" کا گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" آج ہی ملا۔ آج ہی ختم کیا اور آج ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایسا محسوس ہوا جیسے آپ نے یہ نمبر نکال کر میرا ایک ذاتی بڑا اہم کام کر دیا جس کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہی چاہیئے۔
سلامت رہے یوسف ناظم بھی، کسی کا گھر بند نہیں بھئی۔
خواجہ احمد عباس نمبر بھی ضرور نکالیئے۔

• حیات وارثی
باغ الزار، لکھنؤ ۳ (یوپی)

"گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" بہت وقیع، معیاری، اور دیدہ زیب ہے۔ "قومی راج" اردو زبان وادب کے ساتھ ہی ساتھ "قومی یکجہتی" اور "لسانی ہم آہنگی" کے سلسلے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔

• ڈاکٹر حقیر آستانی
۲۰۰۔ گولڈ کراؤن جے پی روڈ اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۶۱

"گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" نکالنے پر مبارکباد قبول فرمایئے نمبر واقعی جامع اور مکمل تھا۔

• منظر بیگ، اسحٰق بیگ
بدنیرہ۔ پھوپی، تعلقہ ناندورہ ضلع بلڈانہ (مہاراشٹر)

اچانک قومی راج میری نظروں سے گذرا۔ میں نے اس رسالہ کو بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ اس کی خوشخط تحریر اور ترتیب بہترین ہے واقعی یہ رسالہ عوام کا خدمت گذار ہے۔ حکومت مہاراشٹر نے مختلف زبانوں میں رسالہ نکال کر بہت اچھا کیا ہے۔ قومی راج سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یوم مہاراشٹر کا سرورق بہت پسند آیا۔ اس رسالہ کو کم تعلیم یافتہ نوجوان بھی پڑھے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ادارہ اس رسالہ کو ترتیب دینے میں بہت محنت کرتا ہے میں ادارہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ قومی راج دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

• مطرب نظامی
۳۰۸/۵۔ جوہری محلہ۔ لکھنؤ ۳ (یوپی)

کچھ عرصے سے مضامین دلچسپ اور مفید شائع ہو رہے ہیں۔ کتابوں پر تبصرہ ایک تلخ مٹھاس کا نام ہے لیکن آپ کا تبصرہ گفتار کا لطف دیتا ہے میری نظر میں تبصرہ کوئی باہر کی چیز نہیں کیونکہ آپ فطری طور پر ڈوب کر تبصرہ فرماتے ہیں اس لئے تبصرے میں براہِ راست ایک تخلیق کار ابھرتا ہے۔ اتنی گہرائی سے تبصرہ لوگ کم کرتے ہیں۔

• منظر باغ مانڈوی
رائے گڈھ (مہاراشٹر)

یوں تو کئی رسائل کا خریدار ہوں لیکن قومی راج کے پرکشش اوراق نے مجھے سرِ ماہ بیحد متاثر کیا۔ "یوم مہاراشٹر نمبر" زیر مطالعہ ہے۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے پیغامات حقیقت میں درس آگہی دے رہے ہیں نیز ترقیاتی امور سے متعلق معلومات اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی تخلیق "دو زبانوں کے تہذیبی رشتے" اور تمام غزلیات بے حد پسند آئیں۔ قومی راج کا ہر لفظ واقعی کام کی چیز ہے۔ بشرطیکہ غور وخوض سے پڑھا جائے۔
اللہ اس عظیم ترین رسالے کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے
(آمین)

فوری توجہ کیلئے ہمیشہ "حوالہ نمبر" (جو آپ کے پتہ کے اوپری حصہ پر درج ہوتا ہے) ضرور تحریر فرمائیں۔ اپنا پتہ صاف لکھیں اور اردو کے ساتھ ہندی، مراٹھی یا انگریزی میں بھی تحریر فرما دیں۔ (ادارہ)

PRINTED AT THE GOVT PHOTOZINCO PRESS PUNE—1987

قومی راج

جلد ۱۳ — شمارہ ۱۱

مراٹھی، ہندی، انگریزی، گجراتی، سندھی اور اردو چھ زبانوں میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

سالانہ دس روپے، قیمت فی شمارہ ایک روپیہ

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء

اس شمارے میں

صفحہ نمبر

مراسلت کا پتہ: ایڈیٹر " قومی راج "، ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، گورنمنٹ آف مہاراشٹر، ۱۵ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

ترسیل زر کا پتہ: اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن) ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹ نزد سروجنی بلڈنگ مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

اُن عظیم روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے
ں نے فرمایا کہ ملک کے تمام دھرموں کے ماننے
ے لوگ بمبئی میں بستے ہیں۔ آپ نے اس شہر
" قومی یکجہتی" اور اتحاد، مستقبل میں قائم رہنے
توقع ظاہر کی۔

کٹر شرما نے ریاستی ڈائرکٹوریٹ جنرل آف
رمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز کی جانب سے
ائع ہونے والے "لوک راجیہ" (مراٹھی، انگلش
ی، سندھی، مہاراشٹر مانس (ہندی، اور
راج (اردو) کے بارے میں اپنی خوشنودی
ظہار فرماتے ہوئے کہا کہ ادبی ترقیات میں
ن کی غرض سے مختلف مواقع پر خصوصی نمبر ان
شاعت کرتے رہتے ہیں۔
ئب صدر ہند نے "خوب صورت بمبئی" کے
ب کو شرمندۂ تعبیر ہونے کی ضرورت پر
ر دیا۔

زیر اعلیٰ مہاراشٹر شری ایس۔ بی چوان
ے انہیں بھگوان کرشن کا ایک مجسمہ (شری
ن کو گیتا کا اپدیش دیتے ہوئے) ریاست
اشٹر کی طرف سے محبت اور عقیدت کی یادگار
طور پر پیش کیا، اور ان کی اہلیہ شریمتی ویلا
و ایک مہاوستر اور ایک ناریل پیش کیا
یر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان نے اپنی تقریر
فرمایا کہ انہیں ڈاکٹر شرما کے ساتھ کام کرکے
ی خوشی حاصل ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ
یت گورنر مہاراشٹر انکی خدمات کو مہاراشٹر
عوام ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ
اشٹر ایک لائق گورنر سے محروم ہو گیا۔ لیکن
ایک نائب صدر سے سرفراز ہو گیا۔ آپ نے
کہ مہاراشٹر ڈاکٹر شرما کا ہمیشہ خیر مقدم کریگا۔
اعلیٰ شری۔ ایس۔ بی چوان، ان کی اہلیہ
تی کسم تائی چوان اور ڈاکٹر سری کانت جیکار
یلکت برائے پروٹوکول نے قبل ازیں ڈاکٹر
نکر دیال شرما اور ان کی اہلیہ کا استقبال کیا۔

اس موقع پر وزیر اعلیٰ کے کابینی رفقاء،
ممتاز افراد موجود تھے۔

گرمجوشی کیساتھ الوداع

مہاراشٹر کے گورنر کی حیثیت سے رخصت ہوکر
نائب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہونے والے ڈاکٹر
شنکر دیال شرما کو ۲ ستمبر کے روز بمبئی کے سانتا
کروز ہوائی اڈے پر نہایت گرمجوشی کے ساتھ الوداع
کیا گیا۔

ڈاکٹر شرما راج بھون سے خصوصی تقریبی
موٹر کیڈ کے ذریعہ ۴ بج کر ۳۰ منٹ پر سانتا کروز
ہوائی اڈے پر پہنچ گئے جہاں موجود وزیر اعلیٰ
شری ایس بی چوان اور ان کے کابینی رفقاء نے
آپ کا خیر مقدم کیا۔

روانگی سے قبل ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور
ان کی اہلیہ شریمتی ویلاجی شرما کو، وزیر اعلیٰ
ان کے کابینی رفقاء، شہری اور فوجی عہدہ
داروں اور بڑی تعداد میں سیاسی اور سماجی
ورکروں کی طرف سے پھول کے گلدستے پیش
کئے گئے۔ ڈاکٹر شرما نے ریاستی حکومت اور
مہاراشٹر کے عوام کے پیار و محبت کا شکریہ
ادا کیا۔

سوانح

ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے والد
کا نام شری خوشی لال شرما ویدیہ
شاستری اور ماں کا نام شریمتی سبھدرا شرما تھا۔
آپ کی ولادت ۱۹ اگست ۱۹۱۸ء کو بھوپال
میں ہوئی تھی۔ اور آپ کی شادی ویلاجی (شریمتی
ویلا شرما) کے ساتھ ۷ مئی ۱۹۵۰ء کو ہوئی تھی۔
آپ کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

تعلیم

آپ نے سینٹ جان کالج آگرہ،
الہ آباد یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی،
فیٹز ولیم کالج کیمبرج یونیورسٹی، ہارورڈ لا اسکول،
زیورچ یونیورسٹی، پیرس یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی
اور لنکن اِن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

آپ نے انگریزی ادب، ہندی، اور سنسکرت
میں ایم اے کیا۔ اور اول مقام حاصل کیا، آپ نے
لکھنؤ یونیورسٹی سے "ایل۔ ایل۔ ایم" کیا اور اول
مقام حاصل کیا۔ آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی
ایچ ڈی کی اور لندن یونیورسٹی سے "پبلک ایڈمنسٹریشن"
کا ڈپلوما حاصل کیا۔ آپ نے لنکن اِن سے بار ایٹ لا
کا اور بعد ازاں ۱۹۴۶-۴۷ء میں ہارورڈ لا اسکول
سے فیلوشپ حاصل کیا۔

تعلیمی اسناد

آپ کو لکھنؤ یونیورسٹی سے
سوشیل سروسز کا "چکرورتی
گولڈ میڈل" دیا گیا۔ آپ نے ۹ سال تک لکھنؤ
یونیورسٹی میں بحیثیت "لاء کے پروفیسر" کام
کیا اور ۱۹۴۶-۴۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں بھی۔
آپ کو وکرام یونیورسٹی اور بھوپال یونیورسٹی
نے "ایل۔ ایل۔ ڈی" کی سند عطا کی ۱۹۵۶ء
سے ۱۹۵۹ء تک ساگر یونیورسٹی میں آپ پرو
چانسلر مقرر کئے گئے۔

عوامی زندگی میں داخلہ

آپ نے ۱۹۴۰ء
میں قانونی پیشہ میں بحیثیت ایڈوکیٹ اپنی عملی زندگی
کا آغاز کیا اور آزادی کی لڑائی میں ۸ ماہ قید
و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ کو ۱۹۵۲ء
میں بھوپال کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

آپ کو مدھیہ پردیش سرکار میں اپریل ۱۹۵۲ء
اور نومبر ۱۹۵۶ء کے دوران کابینی درجہ کا وزیر
بنایا گیا اور تعلیم قانون اور پبلک ورکس کے قلمدان
سپرد کئے گئے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء سے ۲۴ مارچ
۱۹۷۷ء تک آپ مرکزی وزیر برائے مواصلات
کے عہدے پر فائز رہے۔

عملی سیاست کے میدان میں

۱۹۵۰-۵۲ء میں بھوپال کانگریس کمیٹی کے صدر
مقرر ہوئے ۱۹۶۷-۶۸ء میں مدھیہ پردیش کی
کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے

ڈاکٹر سری کانت جیچکار، وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ، ۳۰ ستمبر ۱۹۸۶ء کو منترالیہ کے صدر دروازے پر رکھی ہوئی مقدس مٹی کے برتن کو ۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو سیواگرام میں منعقد ہونیوالی تقریب میں لے جا رہے ہیں۔ زیر نظر تصویر میں وزیر موصوف کے عقب میں ڈائرکٹر جنرل محکمۂ اطلاعات و رابطہ مہ شری پرمود ماسنے، دائیں جانب ڈائرکٹر شری رمیش واسکاؤنکر اور ڈپٹی ڈائرکٹر شری نی کے ٹھاکرے کو دیکھے جا سکتے ہیں۔

اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۷ء تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ ممبر مقرر ہوئے ۱۹۶۸-۷۲ء تک آل انڈیا نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری مقرر کئے گئے۔ ۱۹۷۲-۷۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ نے ۳۲ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آپ نے ممبر اسمبلی اور ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے ۳۰ سال تک اپنی خدمات انجام دیں جس میں ۱۹۵۲-۵۷ء تک ریاستی اسمبلی کے رکن کی میعاد شامل ہے۔ آپ ۱۹۷۱-۷۷ء تک پانچویں لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور جنوری ۱۹۸۰ء سے اگست ۱۹۸۴ء تک ساتویں لوک سبھا کے رکن منتخب ہوئے۔

خصوصی دلچسپی عالمی امور، دیہی ترقیات قانون فلسفہ اور تعلیم سے آپ کو گہری دلچسپی ہے۔

مشاغل قومی اور بین الاقوامی امور کے موضوعات پر پڑھنا اور لکھنا۔ مختلف مذاہب کی جانکاری حاصل کرنا اور مختلف بھارتی زبانوں کے ادب کا مطالعہ آپ کے اہم مشاغل میں شامل ہیں۔

تصنیفات کانگریس کی عالمی امور تک رسائی، "کرانتی درشیہ"، "انڈو سوویٹ ریلیشنز"، رول آف لا اینڈ رول آف پولس۔

۱۔ "لکھنؤ لا جرنل" (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۳ء)

۲۔ "لائٹ اینڈ لرننگ" (۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۶ء)

۳۔ "ارد وعلم دلور" حیوتی (ہندی) اور "سوشلسٹ انڈیا" (۱۹۷۰-۱۹۷۱) میں آپ نے اداراتی فرائض بحیثیت ایڈیٹر انجام دیئے۔

کنوکیشن خطاب مختلف یونیورسٹیوں کانفرنسوں اور مختلف قومی اور عالمی رسالوں میں مضامین سپرد قلم فرماتے رہے ہیں۔

کھیل کود کے میدان میں

الہ آباد یونیورسٹی کے کراس کنٹری ریس چمپئن لکھنؤ یونیورسٹی کے متواتر ۳ سال تیراکی چمپئن اور لکھنؤ یونیورسٹی کے تیراکی کلب کے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء تک صدر رہ چکے ہیں۔

ظیم رزحیں جب عالم آب وگل میں
ں ہیں تو اپنے زمانے کے مروجہ قالب
کر بچپن سے عنفوان شباب تک کی منزل
طے کرلیتی ہیں جیسے زیرۂ گل ہوا کے ساتھ
تلہے۔ لیکن جب ان مہان آتماؤں
کا آغاز ہوتا ہے تو یہ اپنا راستہ خود متعین
دران راہوں پر چل کر اپنے سماج کی فرسودگی
کی اصلاحات میں لگ جاتی ہیں۔

ہم ہستیاں تاریخ ساز اس لئے بن جاتی ہیں کہ
کر وعمل، دانش وفلسفہ، شعروادب اور
بت سے ملک وقوم کو منزل مطلوب
پاکر معدوم ہوجاتی ہیں۔ لیکن ایسے نقوش
تے ہیں جنھیں وقت کی خود غرضی اگر دھندلا
لو صدیوں تک نسل انسانی کے لئے
ہ کا کام کرتے رہتے ہیں۔

ہد جدید کی تاریخ ساز ہستیوں کی فہرست
ابراہم لنکن، والٹیر، روسو، تھامس گک
کارل مارکس لینن چرچل نہرو کے علاوہ
ے بہت سے نام شامل کئے جاسکتے ہیں
ما گاندھی کا نام ان میں سرفہرست لکھے
ے لائق ہے۔

مہاتما گاندھی مادی مسائل کے حل اور ان کے نتائج سے زیادہ روحانی پاکیزگی اور اس کی بقا کے لئے سرگرم رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی سادھو یا صوفی بن کر اپنی ریاضت سے روحانی طاقت کے کرشمے دکھانا چاہتے تھے بلکہ وہ بہ ہندوستانی جسم میں ایک ایسی بالیدہ روح دیکھنا چاہتے تھے جو نفس امارہ کے اندھکار سے پاک ہو۔ روح کی بالیدگی عدم تشدد، صداقت اور تزکیۂ نفس کی سان پر چڑھ کر جلا پاتی ہے۔ اسی لئے گاندھی جی نے اپنی تمام سیاسی اور سماجی تحریکوں میں انہیں اصولوں کو اساس بنایا۔

مہاتما گاندھی صرف دماغوں کو اکسا کر کوئی بڑا کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دلوں میں انقلاب کے خواہاں تھے۔ وہ قوم میں وقتی کف وجوش کے بجائے مستقل ومستحکم فعالیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ کھوکھلے آتشی نعروں کا استعمال کر کے مقصد براری کے خلاف تھے۔ وہ صداقت کی شرر فرمایہ سے انقلاب آفریں کے خواستگار تھے۔ وہ عصیاں پر لطف وکرم کی نگاہ ڈالتے تھے اور مجرم کشی کے بجائے جرم کشی کے حامی تھے۔

جب عدم تعاون کی تحریک نے انگریز سرکار کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ اور پورا ملک کچھ کر گزرنے کے لئے کمربستہ ہوگیا تھا۔ تو اچانک گاندھی جی نے تحریک ملتوی کردی کیونکہ چورا چوری پولس اسٹیشن پر عدم تشدد کے سپاہیوں نے تشدد سے کام لیا تھا۔ اس مرد باعمل نے یہ منظور نہ کیا کہ حصول

[illegible] مقصد کے حصول [illegible] دفن کردیئے جائیں۔ انھوں نے [illegible] چند سال غلام رہنا اور ظلم سہنا پسند کیا لیکن انسانیت سوزی کا جرم کرکے سرخروئی حاصل کرنا پسند نہ کیا۔

گاندھی جی ہر نا انصافی کے خلاف بے خوف وخطر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔
لیکن تیر و تفنگ اور شمشیر و سناں کے سہارے نہیں بلکہ "سچائی کے لیے اصرار" (ستیہ گرہ) کرکے۔

چاہے وہ احمد آباد کے کپڑا مل کے مزدوروں کا معاملہ ہو یا چمپارن کے مزدوروں اور کسانوں کا۔ چاہے وہ برطانوی پارلیمنٹ ہو یا وائسریگل لاج، ہر جگہ اور ہر موقع پر عدم تشدد اور صداقت کی لاٹھی ٹیک کر بڑے سے بڑا معرکہ سر کیا۔
تزکیہ نفس کے لئے برت رکھنا، فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے جسم کو بھوک اور پیاس کی آگ میں جلانا، نواکھالی کی خوفناک گلیوں میں تنہا دل میں دردِ انسانیت لئے چرنا کسی معمولی آتما کا کام نہیں تھا۔
مہاتما نے ۱۹۴۲ء کی "کرو یا مرو" تحریک کے دوران بھی عدم تشدد کا پھریرا اونچا رکھا۔
اپنے ہم وطنوں کو ایثار و قربانی کے لئے تیار کیا۔ لیکن یہ زبان سے کبھی نہ نکلا کہ "مارو"۔ بمبئی میں انگریزی بحریہ کی بغاوت جس نے فرد کی وہ بھی مہاتما گاندھی کے ہی پیروکار اور چیلے تھے۔
یہ فیض تربیت مہاتما گاندھی کا تھا۔ جس نے دشمنوں کا استحصال بھی نہ ہونے دیا۔ عالمی جنگوں میں غیر مشروط تعاون پر اصرار کسی موقع پرست سیاستداں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔
ہمیشہ چاک گریبانوں کی رفوگری کرنے والا دیش کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر خود ٹوٹ سا گیا یہ صدمہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ جغرافیائی تقسیم کے بعد بھی اس تقسیم کو قبول نہ کرسکے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زمین پر دیواروں کو کھڑی کرنے سے خون اور روح کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جسم و جائداد کا بٹوارہ تو ہوسکتا ہے مگر دلوں کو کیسے بانٹا جاسکتا ہے۔ مذہب کے نام پر انسانی نسل کے تعلق کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہونی ہو کر رہی۔
ملک کی غیر فطری تقسیم کے کرب نے مہاتما کے جسم کے عضو عضو کو شکستہ کردیا تھا۔ لیکن روح کی توانائی و قوت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوگیا۔ مہاتما گاندھی اب اور زیادہ مہان بن گئے ان کے عزم مصمم اور پائے استقامت میں اور زیادہ مضبوطی آگئی۔

مہاتما گاندھی نے سیاست کی مصلحت آمیزی موقع پرستی، شاطرانہ مکاری، سے کبھی کام نہ لیا اور نہ کبھی اسے پسند کیا۔ مہاتما گاندھی کی بلیغ نظری اور دور اندیشی نے ہمیشہ معاشی خوشحالی کو پیش نظر رکھا۔ خالی پیٹ جھوٹی نعرے بازی سے ہمیشہ گریز کیا۔ 'سرودیہ' کا فلسفہ کتنا سچا اور سیدھا ہے "جو کام نہیں کرے گا وہ کھائے گا بھی نہیں"۔
گاندھی جی نے مایوس انسانیت کی چارہ سازی کی دلتوں کو عزت، چھوٹوں کو بڑائی، اندھیروں کو روشنی بخشی۔ روح کو فروغ عطا کیا۔ اس مہاتما کو خلوص، سچائی۔ اور رواداری کی راہ سے تعصب و تنگ نظری کے بجاریوں کی گالیاں ترکیب گولیاں بھی نہ ہٹا سکیں۔

قومی راج

نسیم فاروقی
تلسی داس مارگ، نزد ہسپتال لکھنؤ

شمعِ دل کی سحر ہو گئی
داستاں مختصر ہو گئی

اتنے سجدے کئے آپ کو
اب جبیں سنگِ در ہو گئی

دل ٹھہرتا نہیں جسم میں
بے گھری میرا گھر ہو گئی

روشنی کو دعا دیجئے
ہر نگہ کم نظر ہو گئی

اک کلی کیا کھلی شاخ پر
وسعتوں کو خبر ہو گئی

ہمسفر ڈھونڈتے ڈھونڈتے
زندگی اک سفر ہو گئی

آپ کو دوست کیا کہہ دیا
دشمنی معتبر ہو گئی

لمس و آہنگ کے دور میں
ہر وفا بے اثر ہو گئی

کہہ کے یہ کوئی رخصت ہوا
چھوڑیئے اب سحر ہو گئی

آئینہ دیکھتے دیکھتے
آئینہ کی نظر ہو گئی

ہم جو تسنیم پہونچے دکن
لکھنؤ میں خبر ہو گئی

پنڈت گووند ولبھ پنت

گووند ولبھ پنت ہندوستان کی تحریک
دی کے دوران انڈین نیشنل کانگریس کے
ادل کے لیڈروں میں سے تھے اور
دی کے بعد انہوں نے ایک قانون داں
نظم کی حیثیت سے بہت اہم رول ادا کیا
شہرت صرف ان کی شخصیت کارگزاریوں
ار پر ہی نہیں ہے بلکہ اپنے زمانے میں انہیں
پر جو زبردست اثر حاصل تھا اور مستقبل کی
سوجھ بوجھ انہیں تھی اس کی بنا پر وہ بہت ممتاز
رکھتے تھے۔

س سوانح حیات کے ذریعے، جسے پنڈت
ر ولبھ پنت کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں
کیا گیا ہے۔ جو ۱۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو واقع ہوا
ظیم سیاستداں اور پارلیمانی امور کے واقف
حالات زندگی مختصراً پیش کرنا مقصود ہے
ند ولبھ پنت، جنہیں پنڈت جواہر لال نہرو
کے نورِ نظر کہا کرتے تھے۔ منورتھ پنت اور
ی کے گھر میں ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کو، یعنی انڈین
کانگریس کی تاریخ پیدائش کے دو سال
ا ہوئے تھے۔ ان کے پتا جی پنڈت منورتھ
درمیانی درجہ کی اوسط زندگی گذارتے تھے۔

چھوٹے گووند میں شروع سے ہی تیزی وطراری
نمایاں تھی۔ انہوں نے سامنے کالج، الموڑہ، سے
مڈل اسکول اور میٹرکولیشن کے امتحانات پاس
کئے انہیں ایک اسکالرشپ ملی اور وہ موئیر کالج
الہ آباد سے حسابات انگریزی اور سیاسیات میں گریجویشن
کیلئے شریک ہوئے ۱۹۰۵ء میں آپ وارانسی کے
آل۔ انڈیا کانگریس کمیٹی سیشن میں بحیثیت ایک
رضاکار کے شریک ہو کر سماجی زندگی میں شامل ہوئے
اسی میعاد کے دوران انہیں گوکھلے کی تقریر سننے کا
پہلے پہل سابقہ ہوا اور یہیں سے وہ قومی تحریک میں
شریک ہو گئے قومی جدوجہد کی لگن سے سرشار ہونے
کے سبب انہوں نے سرکاری ملازمت میں داخل ہونے
اور برطانیہ کی غلامی اختیار نہ کرنے کا فیصلہ کیا انہوں
نے قانون کا مطالعہ شروع کیا اور ۱۹۰۹ء میں الہ آباد
یونیورسٹی کے قانون کے امتحان میں سرفہرست رہے
کاشی پور میں، قانون کے عمل و پیروی کے ابتدائی
چند برسوں میں انہوں نے میونسپل بورڈ کے ایک
رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔
۱۹۱۶ء میں آپ کا شمار یو پی کے ان بڑے
کانگریسی لیڈروں میں ہونے لگا جنہوں نے
لارڈ ساودتھ برد کی چیرمینی میں قائم کردہ انتخاباتی

کمیٹی کے روبرو شہادت دی۔ انہوں نے کماؤں
حلقے کے معاملے کی کمیٹی کے روبرو، نہایت پُرجوش
انداز میں وکالت کی کیونکہ وہ حلقہ پسماندہ ٹکڑا اشمار
کیا جاتا تھا اور اگر انہوں نے اس کی یوں پُرجوش
وکالت نہ کی ہوتی تو اس حلقے کی ترقی پر ناگوار اثر پڑتا
آخرکار کماؤں حلقے کو درجِ فہرست اور پسماندہ حلقوں
کی فہرست سے خارج کروانے میں آپ کی کوششیں
کامیاب ہوئیں۔

جب کاشی پور میں ایک وکیل کی حیثیت سے
آپ کو شہرت حاصل ہوئی تو پنڈت جی نے دوسروں
کے ساتھ مل کر، ایک ہفتہ وار اخبار "شکتی" جاری
کیا تاکہ حلقہ کماؤں کے مسائل پر خاص طور پر روشنی
ڈالی جائے۔ اس اخبار کے ذریعے آپ نے "بیگار
مزدور" (مفت جبری خدمت کروانے) کے رواج
کی منسوخی کے سلسلے میں زبردست تحریک چلائی۔
اس پر مالدار طبقے کو آپ پر بہت غصہ آیا لیکن آپ
نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور آخر میں کامیابی
سے سرفراز ہوئے۔

پنڈت جی ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور

ہو گئے اور جلد ہی ایک کامیاب وکیل کی طرح آپ کے پاس اہم مقدمات آنے لگے۔ تاہم بنیادی طور پر آپ ایک مجاہد آزادی تھے اِس لئے آپ کا مشغلۂ قانون دانی قومیاتی اور حبِ وطن کی مصلحتوں سے عاری نہیں ہوتا تھا۔ بطور وکیل کے پنڈت جی کے پاس سب سے بڑا مقدمہ "کاکوری سازش" کا تھا جس کے لئے پنڈت موتی لال نہرو نے ایک "دفاعی کمیٹی" تشکیل دی تھی اور اس کمیٹی کی لیڈرشپ یا سربراہی پنت جی کو سونپی تھی۔ قومی تحریک میں پنڈت جی جلد ہی کانگریس میں "کُل ہند" لیڈروں کے صف اوّل میں سرفراز ہو چکے تھے۔ جب سائمن کمیشن نے لکھنؤ کا دورہ کیا تھا تو پنڈت ولبھ پنت نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ہمراہ اس کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی تھی۔ مظاہرین کے جلوس پر پولس نے شدید لاٹھی چارج کیا تھا جس کا اثر دائمی طور پر ان کے جسم پر باقی رہ گیا۔ پنڈت پنت، عدم تعاون کی تحریک سول نافرمانی کی تحریک اور ہندوستان چھوڑو کی تحریک میں سرگرم شریک کار رہتے۔

پنڈت جی دوسری یو پی لیجسلیٹیو کونسل میں ۱۹۲۳ء میں شامل ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال تھی اور آپ پارٹی کے لیڈروں میں سب سے کم عمر تھے۔ کونسل میں آپ کی انگریزی اور ہندی تقریریں متوازن ہوا کرتی تھیں جن میں دانائی اور فصاحت ہوتی تھی۔

اپنی پوری سیاسی زندگی میں، پنڈت جی نے عقلمندی کی باتیں کیں خواہ وہ مخالف پارٹی میں ہوتے خواہ حکومت کی۔ جب تک ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت باقی رہے گی۔ پنڈت جی کا نام بھی جمہوری اقدار و عمل کے سلسلے میں باقی رہے گا آپ یو پی کونسل میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک سوراج پارٹی کے لیڈر رہے اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کے نائب لیڈر۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں پنڈت جی یو پی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر چنے گئے اور جولائی ۱۹۳۷ء میں آپ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں جب ہندوستان کو دوسری عالمگیر جنگ میں، اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹ گیا تو کانگریس نے تمام کانگریسی وزارتوں سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا۔ پنت نے بھی استعفیٰ دے دیا اور بعد میں گاندھی جی کے شروع کئے ہوئے انفرادی ستیہ گرہ بھی شرکت کی۔ الہ آباد کانگریس سیشن میں اصل تجویز آپ نے ہی پیش کی تھی اور ... ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد انتخابات ہوئے جس میں کانگریس نے اکثریت حاصل کی ... پنڈت جی ... قانون ساز کے لیڈر اور یو پی کے وزیر اعلیٰ چنے گئے۔ آپ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۴ء تک اس عہدہ پر قائم رہے۔

۱۹۵۴ء کے اواخر میں پنڈت نہرو نے پنت جی کو مرکزی مجلس وزرا میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ پنت جی انکار نہیں کر سکے۔ آپ اتر پردیش کے نہایت مقبول لیڈر تھے اور ان کے بغیر یو پی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن زیادہ دن نہیں لگے پنڈت جی نے یونین کی مجلس وزرا میں اپنی جگہ بنا لی۔ چنانچہ آپ صرف پنڈت نہرو کے بعد دوسرے نمبر پر رکھے گئے جہاں انھوں نے اپنی قابلیت اور صداقت کا سکہ ہر ایک پر بٹھایا۔ پنڈت جی کو وزیر بلا قلمدان کی حیثیت سے ۳ جنوری ۱۹۵۵ء کو حلف دلایا گیا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء کو آپ وزیر داخلہ بنائے گئے اور وزارت مذکورہ پر آپ نے ایسی مضبوط گرفت رکھی کہ گویا پٹیل نمبر ۲ برسر کار رہتے۔

اگر سردار پٹیل پہلے ہندوستانی بسمارک تھے جنہوں نے ہندوستان کی راجواڑی ریاستوں کو ہندوستان کا جزو لاینفک بنایا تو پنڈت جی دوسرے ہندوستانی بسمارک تھے جنہوں نے

عظیم الدین عظیم
دھرم پور، برن پور، بردوان (مغربی بنگال)
پن ۷۱۳۳۲۵

یہ زندگی ہے اگر رزم گاہ کی صورت
گزرئیے آپ بھی مردِ سپاہ کی صورت

پرانے رشتوں کا یوں ٹوٹنا بھی ٹھیک نہیں
تلاش کیجئے کوئی نباہ کی صورت

جھجکنا کیسا بڑے شوق سے قیام کریں
یہ دل ہے سینے میں اک خانقاہ کی صورت

یہ کس کی یاد کا سورج ادھر سے گذرا ہے
کہ ضوفشاں ہے یہ دل مہر و ماہ کی صورت

گزرنے والے سبھی ٹھوکریں لگاتے ہیں
عظیم تو بھی ہے اک سنگِ راہ کی صورت

ی وزیر داخلہ کی حیثیت سے ۔ ریاستوں کی ازسرِ نو
یم کی ۔ انڈین یونین کی دفتری زبان کا مسئلہ
ستوں کی تنظیم نو کے بعد دوسرا اہم مسئلہ تھا
س کو انہیں سلجھانا پڑا ۔ پنڈت جی نے اس پیچیدہ
ہ کے سلجھانے پر بہترین توجہ دی ۔
جیسے جیسے مسائل پیش آتے گئے، پنڈت جی
یں انتھک کوششوں کے ذریعے سلجھاتے رہے
می زبان کا مسئلہ ، آسامی پہاڑی باشندوں
مطالبات اور پنجابی صوبہ کیلئے پنجابی ہنگامے
ے سے آپ کی صحت و دماغ پر دباؤ ڈال رہے
۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء سے چین و ہند
دم کی پیچیدگیاں بڑھتی جارہی تھیں ۔ آپ
یں سے بعض مسئلوں پر انسرن سے بحث و مباحثہ
۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو مشغول تھے جس وقت
۔ یر دوَر ویڑا ۔ (CEREBRAL TH... OSIS)
سبب پیش آیا تھا اور جس سے آپ صحتیاب
ہوسکے ۔ علیٰحدگی میں رہنے کے بعد آپ ۷ رمارچ
ا ہے ۔
پنی صلاحیتوں کے باعث ، پنڈت جی ملک کے
اہم عہدوں پر فائز رہے ۔ آپ دستوری طور
نوں پر پختہ عقیدہ رکھتے تھے اور پارلیمانی
سٹم کو دل و جان سے مانتے تھے ۔ کانگریس
ی کے نائب لیڈر کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی
مخالف کے روپ میں کام کرتے ہوئے انہوں
نہایت باصلاحیت پارلمنٹیرین ہونے کا ثبوت
۔ آزادی کے بعد ، نئے ہندوستان کی تعمیر
پ نے نمایاں خدمات انجام دیں ۔ عوامی زندگی
اپ کے طویل مصروفیت ، آپ کے اعلیٰ کردار
بے غرض سماجی عملوں کی شاہد ہے ۔
پنڈت پنت کی زندگی اور ان کے کارنامے آنے
نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے ۔
نے اپنی زندگی لوگوں کی خدمت کیلئے وقف
ی تھی ۔
س حیثیت سے بھی آپ نے کام کیا ، خواہ وہ

حصولِ آزادی کی جنگ میں بحیثیت ایک جوان
کے رہے ہوں ، یا مجلس قانون ساز کے ایک رکن
کی حیثیت سے ، یا حکومت میں ۔ ان کا مقصد
ہندوستان کی اور ہندوستان کے لوگوں کی
بھلائی تھی ۔ پنڈت جی جیسے لیڈروں نے صحیح
اور تعمیری انداز میں سوچنے کا طریقہ بتلایا ۔ تقریباً
۳۸ سال تک ، ۱۹۲۳ء سے جب آپ یو پی کی
مجلس قانون ساز میں سوراج پارٹی کے لیڈر
چنے گئے تھے ۔ ۱۹۶۱ء تک ، جب آپ مرکزی
حکومت کے وزیر داخلہ تھے ، پنڈت پنت کانگریس
پارٹی کے اعلیٰ مشاورتی امور میں شریک کار رہے
یہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا جس نے
حکومت کو حسن و خوبی کے ساتھ ریاستوں کی تنظیم نو
کے مسئلوں کی سلجھانے اور ملک کی دفتری زبان کے
بارے میں فیصلہ کرنے کی طرف رہنمائی کی ۔

ریڈیو سے براڈکاسٹ کی گئی ایک تقریر میں ۲۶ جنوری
۱۹۵۹ء کو آپ نے فرمایا تھا کہ " جمہوریت
میں سرکاری محکمے کے کارکنوں کے ذمے عوام کی خدمت
ہوتی ہے کیونکہ ان کی زندگی کا یہی ایک مقصد ہوتا
ہے اور ہونا چاہیئے ۔ "
ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطاب " بھارت رتن "
سے ۱۹۵۷ء میں پنڈت پنت نوازے گئے تھے
اور اس طرح ہندوستان کے عظیم معماروں کے
زمرے میں آپ بھی شمار کئے گئے ۔ پنڈت جواہر لال
نہرو نے ۷ رمارچ ۱۹۶۱ء کو ان کی وفات پر
ان کی بہترین خوبیوں کی سراہنا کی ۔

قلمی معاونین سے گذارش

" قومی راج (ماہنامہ) " درج ذیل خصوصی نمبروں کی تیاری کے لئے اہلِ قلم حضرات سے مضامین مقالات اور نظموں کی صورت میں تازہ تخلیقات کا خواہاں ہے ۔

۱ ۔ بال گندھروا خصوصی نمبر (یکم نومبر ۱۹۸۷ء)
۲ ۔ پنڈت جواہر لال نہرو خصوصی نمبر (۱۴ رنومبر ۱۹۸۷ء)
۳ ۔ جنگلی جانور خصوصی نمبر (یکم دسمبر ۱۹۸۷ء)

اہلِ قلم حضرات سے گذارش ہے کہ " قومی راج " کے ان خصوصی نمبروں کے لئے اپنے رشحاتِ قلم (بشرطِ ممکن متعلقہ تصاویر کے ہمراہ) جلد از جلد ارسال فرمائیں ۔

مضامین اس پتہ پر روانہ فرمائیں :

ایڈیٹر " قومی راج "
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز گورنمنٹ آف مہاراشٹر
نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ ، پندرھواں منزلہ ، مقابل منترالیہ ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲

الطاف انصاری سلطانپوری
۷۰۴ - ہاؤسنگ کالونی

غزل

منت کبھی کسی کی نہ جا کر کروں گا میں
روشن خود آپ اپنا مقدر کروں گا میں

ثابت جو اپنے آپ کو بہتر کروں گا میں
ہر دل میں پیدا اپنے لئے گھر کروں گا میں

پتھر کو موم، موم کو پتھر کروں گا میں
دانشورانِ دہر کو ششدر کروں گا میں

میری وفا پہ بھی یہ خدا حرف آئے گا
رسوا جو تجھ کو حسن کے پیکر کروں گا میں

جو خم نہ ہو سکا کبھی شاہوں کے سامنے
نذرِ وطن بہ شوق وہی سر کروں گا میں

سچ بولنا بھی جرم اگر ہے جہان میں
یہ جرم زندگی میں سراسر کروں گا میں

اک روز خود ہی اپنے نشیمن کو پھونک کر
تاریک گلستاں کو منور کروں گا میں

خونِ جگر پلا کے شب و روز دوستو
خارِ چمن کو رشکِ گلِ تر کروں گا میں

ہٹ جاؤں گا تمہارے لئے اٹھائیے یہ راہ سے
ثابت نہ خود کو راہ کا پتھر کروں گا میں

جن کا جفا و جور ہے محبوب مشغلہ
اک دن وفا کا ان کو بھی خوگر کروں گا میں

جب مجھ کو اعتماد نہیں اپنی ذات پر
پھر کیسے اعتماد جہاں پر کروں گا میں

الطاف دشمنوں کے جو کہنے میں آؤں گا
دانستہ خود کو غرقِ سمندر کروں گا میں

پروفیسر اکبر رحمانی
۱۷، بھوانی پیٹھ، جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱
(مہاراشٹر)

اردو ادب اور مشترکہ تہذیب

برِصغیر ہند و پاک میں اگر کوئی زبان مشترکہ تہذیب، قومی یکجہتی اور ملے جلے کلچر کی نمائندہ ہو سکتی ہے تو وہ لشکروں اور بازاروں میں پیدا ہوئی اور خانقاہوں میں تربیت پائی ہوئی اردو زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے مختلف تہذیبوں کے اختلاط نے جنم دیا اور مختلف قوموں کے افراد نے جس کے علم و ادب کی رونق و رنگینی میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ اردو مختلف قوموں کے میل جول سے پروان چڑھی۔ اپنے ارتقائی مراحل میں بھی اس نے کبھی کسی تہذیب یا کسی زبان کے ساتھ بیر نہ رکھا۔ ہر ایک سے فیض اٹھایا۔ مشہور و معروف محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری، اردو کی اس سیال فطرت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

منطق کی طرح اردو کٹر اصول پرست نہیں۔ سیال اور لچکیلی زبان ہے۔ الفاظ کی حد تک اردو بڑی آزاد منش اور ملنسار واقع ہوئی ہے۔ اس نے ہر زبان سے فیض اٹھایا۔ عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پوربی، برج، پرتگالی، اطالوی، انگریزی، ہر زبان کے الفاظ اس نے دل کھول کر قبول کئے، جہاں کوئی لفظ نظر پہ چڑھا اس نے آنکھوں سے لگایا اور ادنیٰ تصرف کے بعد اپنایا (داستانِ زبانِ اردو)

آج ملک کی بیشتر زبانیں سیاسی اور جغرافیائی حد بندیوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن صرف اردو ایک ایسی زبان ہے جو نہ کل کسی علاقے تک محدود تھی نہ آج محدود ہے۔ اس کی ہمہ گیریت اور غیر علاقائیت کی شان آج بھی برقرار ہے۔

اردو زبان کے غیر علاقائی ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ مختلف علاقوں میں وہ مختلف ناموں سے موسوم ہوئی۔ امیر خسرو نے اسے زبانِ دہلوی کہا تو دکنی شاعر نصرتی نے ؎

ہے دکھنی میں مجھ کو مہارت پتی
کہ النصر منکم کہے نصرتی

دکن ہی کے ایک شاعر آگاہ (المتوفی ۱۲۲۰ ھ) نے اُسے بجائے دکھنی کے اسے "زبانِ ہندی" لکھا ہے ؎

دلے بعض یاروں کا ایسا ہوا
سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

گجرات میں اسے گجری کہا گیا۔ دکن اور شمالی ہند میں اردو کا ایک اور نام "ریختہ" بھی استعمال ہوا ہے۔ اسے سب سے پہلے ولی

نے استعمال کیا تھا ؎

یہ ریختہ ولی کا جاکر اسے سنادے
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

شمالی ہند کے شعرا لفظ ریختہ کو عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ میر تقی فرماتے ہیں

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق تھا جو اپنا باشندہ دکن کا تھا

لوگوں نے ریختہ کا مطلب گری پڑی زبان لیا ہے جب کہ ریختہ موسیقی کی اصطلاح ہے جو آگے چل کر مخلوط زبان کے معنوں میں استعمال ہونے لگی۔ ریختہ کہہ کر اردو زبان کو حقیر اور معیوب گردانا گیا۔ لیکن اس ادنیٰ و حقیر لفظ میں اردو زبان کی ایک طویل تہذیبی و فکری ارتقا کی تاریخ مضمر ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

۔۔۔۔ یہ لفظ "ریختہ" بجائے خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ زبان ایک طویل عرصے پر پھیلی ہوئی تہذیبی آمیزش بلکہ آویزش کو خود میں سمیٹتی چلی گئی ہے۔ (نیرنگ خیال راولپنڈی ۱۹۷۰ء)

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اردو زبان، ہند آریائی زبان کی پروردہ ہے۔ اس لحاظ سے اردو زبان میں وہ تمام مشترک قدریں ملتی ہیں جو آریائی، ایرانی اور موہن جوڈارو اور ہڑپا کی تہذیبوں میں تھیں۔ اگرچہ عرب تاجروں اور حکمرانوں کے اثرات نے بھی اس جدید زبان کا ہیولیٰ تیار کرنے میں تعاون کیا لیکن ترک ایرانی مسلمانوں کے اثرات اس نے سب سے زیادہ قبول کیے۔ ایرانی و فارسی اثرات نے اردو زبان وادب کو ایسا رنگ و آہنگ دیا جس میں من و تو کا امتیاز نہ رہا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد خیالی اور وسیع المشربی اور رواداری اردو ادب کا مزاج بن گئی۔ مشہور نقاد ڈاکٹر محمد حسن اردو زبان وادب کی فکری اور جذباتی بنیاد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔

"اردو ادب کا فروغ تہذیبوں کے اختلاط سے ہوا۔ مگر ان تہذیبوں کو غالباً ہندوستانی اور ترک ایرانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہندوستانی اور ترک ایرانی تہذیبیں خود کئی منازل و مراحل سے گذر رہی ہیں۔ اور کئی تہذیبی وحدتوں سے مل کر بنی ہیں لیکن ہندوستانی اور ایرانی دونوں آریائی تہذیبیں تھیں اور چونکہ ان کو دونوں میں نسلی مناسبت تھی لہذا مشترک اقدار و تصورات کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ اردو زبان وادب کی فکری اور جذباتی بنیاد انھیں مشترک ذخیرۂ اقدار پر ہے اور انھیں ذرائع سے آزادیٔ فکر، رندی و قلندری، رواداری، وفا پیشگی، وحدت الوجود اور انسان دوستی کی عظیم روایات ہمارے شعر وادب تک پہونچیں اور یہ رنگ و آہنگ اس انداز سے مقبول ہوا کہ اس کی گونج ملک بھر میں سنائی دی (اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر)

اردو زبان جس مشترکہ تہذیب کی امین و ترجمان ہے اس کا نمایاں اظہار اولین نثری شہ پاروں میں نظر آتا ہے جو اولیا و صوفیائے کرام کے ملفوظات، اقوال اور تعلیمات پر شامل ہیں۔ ان صوفیائے کرام نے اپنے پیغام اور معرفت میں ڈوبی ہوئی باتوں کو عوام تک پہونچانے کے لئے انھیں کی زبان کو وسیلہ بنایا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ "معراج العاشقین"، شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی "بحر الحقائق" شیخ خوب محمد چشتی کی "امواج خوبی"، اور "خوب ترنگ" شاہ برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقائق" علاوہ ازیں ملا وجہی کا ادبی شاہکار اور صوفیانہ تمثیل "سب رس"، چند ایسے اردو کے نثری شاہکار ہیں جن میں انسان دوستی، مشترک اقدار، رواداری اور مشترکہ تہذیب کی روایات ملتی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "اردو کا کلاسیکی ادب فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے تصوف سے متاثر رہا ہے تو غلط نہ ہوگا"، تصوف نے بھی اردو غزلوں کو متاثر کیا اور اس طرح غزلوں میں آزاد خیالی، رواداری، ہمہ مستی اور انسان دوستی کی روایات فروغ پائیں۔ گل و بلبل، ساغر و مینا، کفر و ایمان شمع و پروانہ، اور دیر و حرم کے استعاروں میں کٹر پن اور جگہ آزاد خیالی اور قلندری کے مضامین مقبول ہوئے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اردو شاعری کی یہ سیکولر روایات مشترکہ تہذیب ہی کی بدولت فروغ پائیں۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

ہمارے گھر کے پہلو سے دین کی راہ یاد آوے
صنم رکھے ہیں جس کو دیکھ کے اللہ یاد آوے

معتقد ہرگز نہیں ہیں کفر اور اسلام کے
گر مرید اس دور میں ہیں ہم تو پیر جام کے
جلوہ تو خدا کا دیکھا ہے بتوں ہی میں
سمجھانے کو پھر آگے اک بات بنالی ہے

اردو شاعری مشترکہ تہذیبی اقدار سے مالا مال ہے۔ اس میں کسی
بس فرقے یا مذہب کی چھاپ نہیں ہے۔ بلکہ مختلف تہذیبوں، فرقوں
مذاہب کی تاریخی و نیم تاریخی روایات اور رسم و رواج، نیز طرز
شرت کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ یہاں آپ کو شب برات کے
نہ دیوالی کے جلوے بھی دکھائی دیں گے اور عید کے ساتھ دسہرہ
ہولی کی رنگینیاں بھی نظر آئیں گی۔

خصوصاً اردو مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب یا مشترکہ تہذیب
عناصر کی جلوہ گری سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ مشہور محقق رشید حسن
ں فرماتے ہیں۔

"ان مثنویوں میں ہندوستان کے موسموں کی رنگینیاں
یہاں کی مذہبی و غیر مذہبی رسموں کی تفصیلات اور خالص
مذہبی تلمیحیں بھی ملتی ہیں اور اس ملے جلے کلچر کی رنگا رنگ
ترجمانی بھی ملتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے
ساتھ رہنے سے عالمِ وجود میں آیا۔

ان مثنویوں کے قصے اگرچہ ایرانی ہیں لیکن پورا ماحول، رسم
اج اور مناظر ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مثنوی سحر
ن ہو یا گلزارِ نسیم ان سب میں اس زمانے کے ہندوستانی
رت اور مشترکہ تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات سامنے
تی ہیں غرض اردو کی مثنویاں صحیح معنوں میں مشترکہ تہذیب
جمان ہیں کیونکہ بقول رشید حسن خاں :-

"ان میں ہندوستان کے موسموں، منظروں،
شہروں اور ہندوستان کی روایتوں کے خزانے
محفوظ ہیں۔ رسم و رواج کے افسانے درج ہیں ان
میں بہادری کی داستانیں بھی ہیں اور محبت کی
کہانیاں بھی۔ ان داستانوں میں رنگ و نسل کے
امتیاز کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں سماجی سطح پر سینکڑوں
برس تک ہندوستان میں جس ہم رنگی و یک رنگی کی
روایت پروان چڑھتی رہی اس کی تفصیلات بکھری
ہوئی ہیں۔

عابد بن اثر انصاری

ضیاء الادب مولانا آزاد روڈ
ولی پورہ ۔ دھولے (مہاراشٹر)

★

انانیت نے تیری لوٹ لی ہے ہر خوشی جس کی
کہاں سے فکر لاحق ہو اسے آدابِ مجلس کی

ملوث ایک عالم آج ہے آوارہ گردی میں
نوازش ہائے گوناگوں کہاں ہیں میرِ مجلس کی

بڑھا دستِ طلب اپنا اگر حق بیں نگاہیں ہیں
یہ مینا ہے، یہ ساغر ہے، یہ زمزم ہے، یہ ہے وہسکی

تو اے ناداں خود اپنا گریباں جھانک لے پہلے
کریگا فکر بدگوئی کی کبتک اُس کی اور اِس کی

تجھے بھی علم ہے اس کا تو اس سے خوب واقف ہے،
ہوئی مکاریوں میں زندگی برباد کس کس کی

تجھے معلوم ہے پھر کونسی منزل میں تو ہوگا
اگر دو چار دن میں روح تیرے جسم سے کھسکی

ہمیں یہ درس اے عابد کتابوں سے بھی ملتا ہے
دعا خالی نہیں جاتی کسی معصوم و مفلس کی

• ڈاکٹر یونس اگاسکر
شعبۂ اردو، بمبئی یونیورسٹی
بمبئی ۹۸، ۴۰۰۰

پریم چند کے افسانوں میں ہندوستانی عورت

منشی پریم چند اردو فسانے کے جنم داتا ہوں یا نہ ہوں۔ اردو میں ترقی پسندانہ رجحان کے بانی ضرور ہیں۔ ترقی پسند تحریک جن بنیادی اصولوں سے عبارت ہے، ان اصولوں کی پذیرائی سب سے پہلے پریم چند ہی نے کی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ ان پر ان کے قدم بہت پہلے ہی اٹھ چکے تھے۔ کانفرنس کا خطبۂ صدارت محض وقتی جوش یا ابال نہ تھا۔ پریم چند کی ذہنی تشکیل کے کٹھن سفر ہی کا ایک سنگ میل تھا۔ اس سفر کا ایک اور سنگ میل ان کا شاہکار افسانہ "کفن" ہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی بار منظرعام پر آنے والا ان کا افسانوی مجموعہ "واردات" بھی اسی سفر کی واضح نشان دہی کرتا ہے۔

"واردات" کے افسانے اس دور کے افسانے ہیں جب پریم چند ذہنی و جذباتی اعتبار سے شدید قسم کے ردِ عمل سے دوچار، بغاوت اور جوشِ عمل سے سرشار اور سماج کے کرم خوردہ تصورات سے بیزار رہے، اور سماجی ناانصافیوں اور بے جا رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ وہ مذہب، سیاست، تہذیب، اخلاق، معاشیات و نفسیات کا مطالعہ کرکے اس نتیجے پر پہنچے کر کائنات کی آخری سچائی انسان ہے، اور انسان کے بارے میں علوم و فنون کی بنیاد پر آخری و حتمی فیصلے صادر کرنا، حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔ وہ اس نتیجے تک کتابی مطالعے سے نہیں، انسانوں کے مشاہدے اور تجزیئے سے پہنچے تھے۔

"واردات" کے افسانوں میں ہمیں کوئی ادعا، کوئی نتیجہ خیزی، کوئی فیصلہ زنی نہیں ملتی۔ افسانے زیادہ تر نفسیاتی حقیقتوں کے عکاس ہیں۔ ان میں سماج کے بندھے ٹکے رواجوں پر تنقید کے باوجود انسانیت کا احترام ملتا ہے۔ پریم چند زندگی کے حسن اور اس کی بدصورتی دونوں کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن بدصورتی سے نفرت کرنے کی بجائے اسے خوبصورتی میں بدل دینا چاہتے ہیں۔ دنیا والوں کی نظروں میں جو بات کریہہ اور گری ہوئی ہے، وہ اس میں بھی حسن اور علویت تلاش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ جمالیت پسندوں سے بڑھ کر شیدائی جمال ہیں،

وہ ہر جگہ حسن و عظمت کی جستجو کرتے ہیں خواہ وہ اَن پڑھ اور اُجڈ برہمن گنگو کی فطرت میں ہو (معصوم بچہ) ، چاہے جان کو خطرے میں ڈال کر اپنے بچوں کے منہ میں نوالہ ڈالنے والی دیہاتن میں ہو ، جو بے محنت کسی سے کچھ لینے کو بھیک سے بھی بُرا سمجھتی ہے (روشنی)

پریم چند کو دیہات کے ان پڑھ مرد و عورت پڑھے لکھے شہریوں سے زیادہ پیارے ہیں۔ وہ ان جاہل کسانوں، مزدوروں اور گھروں اور کھیتوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ پسینہ بہانے والی عورتوں کی چھوٹی موٹی مطلب پرستیوں کو بھی درگزر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی خود غرضی اس نظام کی پروردہ ہے جس نے ان کے بہت سے حقوق ان سے چھین رکھے ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا بھرپور ادراک ہے کہ بے غرض اور فیاض وہی ہو سکتا ہے۔ جسے دنیا داری کے جھنجھٹوں سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑتا، جن عورتوں کو گھر گرہستی کے بکھیڑوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نمٹنا پڑتا ہے، وہ چھوٹے موٹے مفادات اور حقیر اغراض کو فیاضی اور خوش خلقی سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔

"واردات" کے پہلے ہی افسانے "شکوہ شکایت" کی بیوی کا کردار ایک ایسی ہی ہندوستانی عورت کا عکاس ہے جو گھر والوں کی بھلائی کو غیروں کی فلاح پر مقدم سمجھتی ہے۔ وہ بخیل اور تنگ دل، کھلانا پسند کرتی ہے مگر سخاوت، اور غریب پروری کے نام پر گھر لٹانے کو تیار نہیں ہے۔ اس کا شوہر، جو دراصل پریم چند ہی کی شخصیت کا افسانوی روپ ہے اس کے برخلاف سماجی بھلائی اور بے جا رسم و رواج کی خلاف ورزی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ دونوں کے کرداروں کے تضاد کو پریم چند نے بیوی کی زبانی اس طرح اُجاگر کیا ہے:

> "زندگی کا بڑا حصہ تو اس گھر میں گذر گیا، مگر کبھی آرام نصیب نہ ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نظر میں بڑے نیک، خوش خلق، اور فیاض و بیدار مغز ہوں گے لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزا آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے، اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے، وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے۔ بخیل ہے، تنگدل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں، ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے"؟

(شکوہ شکایت)

"شکوہ شکایت"، کی دھرم پتنی اپنے شوہر پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ عام ہندوستانی بیویوں کی طرح اپنے شوہر کو دنیا کا کامیاب ترین مرد دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے سو عیب برداشت کر سکتی ہے مگر بدھوپن اور ایسا بدھوپن جس کا نتیجہ گھر پھونک تماشہ ہو، ہرگز سہہ نہیں سکتی۔ دونوں میں ٹکراؤ کا بڑا سبب یہی خرابی ہے۔ اپنی ذہانت اور علمیت کے باوجود شوہر نامدار معمولی دکان دار اور مہتر کے ہاتھوں بے وقوف بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طبیعت کی مروّت کے سبب آئے دن گھر میں مہمانوں کی آمد رہتی ہے، اور لوگ بھی اُدھار مانگتے رہتے ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کا یہ عالم ہے کہ بچوں کی پڑھائی لکھائی پر تو دھیان نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں طرح طرح کے کھیل سکھائے جاتے ہیں۔ اصلاح پسندی کے نتیجے میں جہیز سے اور لڑکی کا کنیادان کرنے سے انکار کیا جاتا ہے، اور بے چاری بیوی کو یہ فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ غرض کہ کوئی دو چار شکایتیں ہوں تو گنائی جائیں یہاں تو دفتر کا دفتر ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے شوہر سے جدا نہیں رہ سکتی، اس سے پیار کے جذبے پر روک نہیں لگا سکتی اور اس کی کوئی توجیہہ بھی نہیں کر پاتی۔

> "ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں، مجھے خود نہیں معلوم ...... ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیں پیدا ہوگئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے تِھس گھس کر فٹ ہوگئے ہوں"!

ہندوستانی پتنی کا یہ رُوپ متوسط طبقے کی کم پڑھی لکھی مگر دنیا داری کے شعور سے آراستہ عورت کا روپ ہے۔ وہ شوہر کی عزت کرنا جانتی ہے اور اس کے خیالات و جذبات کے احترام کے ساتھ عملی زندگی کے تقاضوں کو بھی سمجھتی ہے — منشی پریم چند نے خود کلامی کی تکنیک کا استعمال کرکے اس کے کردار کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ افسانے کے موضوع کے پیشِ نظر اس سے بہتر اندازِ پیشکش مشکل تھا۔ یہاں بھی پریم چند

قصہ گو نہیں، عکاسِ فطرت ہیں۔ اسی لئے انہیں واقعات کی
پرواکم اور کرداروں کے جذبات کی تصویرکشی سے دلچسپی زیادہ

"محض واقعے کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں
لکھتا ہوں، ان میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت
کا اظہار کرنا چاہتا ہوں!"
(منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے، قمر رئیس۔ ص ۴۴۳)

"واردات" کے تیرہ افسانوں میں سات افسانے ایسے
ہیں جن میں ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت اس کی معاشی
دست نگری، اس کی نفسیات اور جذباتی کیفیات کی تصویرکشی کی
گئی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب کا نصف سے زیادہ حصہ ہندوستانی
عورت کے لئے مخصوص ہے۔ جس میں وہ حالات کی ماری، سمجھوتے
پر مجبور اور دل کی جلن کا شکار نظر آتی ہے۔ اس کی فطرت میں بغاوت
نہیں مفاہمت ہے۔ سرکشی نہیں، فرمانبرداری ہے۔ وہ اپنے جذبات
کو کچلتی رہتی ہے —— مگر کبھی کبھی فطری تقاضوں کے آگے سپر
ڈال دینے پر مجبور بھی ہو جاتی ہے، اور لالا ڈنگامل کی جوان اور نا آسودہ
بیوی بن کرانے میلے کچیلے، ان پڑھ نوکر سے چپکے سے کہتی ہے۔۔۔
"لالا کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم زرا آجانا"
(نئی بیوی)

بوڑھے شوہر کی جوان بیوی کا شوہر سے ناخوش رہنا اور
نوکر یا ڈرائیور سے جنسی تعلق استوار کرلینا، ماضی کے اردو افسانوں
کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ترقی پسندوں نے پیٹنٹ دوائیں
کھانے والے بوڑھے دولت مند شوہروں کو اکثر نشانہ بنایا ہے۔
لیکن اس موضوع کو ایک سماجی و نفسیاتی مسئلے کی حیثیت سے غالباً
سب سے پہلے پریم چند ہی نے برتا ہے، اور اس سلسلے میں تمسخر آمیز
انداز کو اپنا کر ایسی مضحک اور بے جوڑ شادی کا مذاق اڑایا ہے
اور ہنسی ہنسی میں اس سماجی برائی کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے
لیکن افسانے کے اختتام پر ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے ہیں اور اس
شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غیر صحت مندانہ صورت حال
کی طرف اشارہ کرکے اس طرح خاموش ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والا
سناٹے میں آجاتا ہے۔ پریم چند سے ایسے بولڈ اشاروں کی توقع
کم ہی ہوتی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ لالا ڈنگامل اپنی پہلی بیوی کی مستقل بیماری سے
عاجز تھے۔ وہ انہیں جسمانی سکھ نہیں دے سکتی تھی بلکہ خود ہی ان سے
دو محبت بھرے لفظوں کی طالب تھی مگر اس کی جوانی ڈھل گئی
اس لئے لالا ڈنگامل کے دو پیار بھرے بولوں کے لئے بھی وہ
تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ......

"بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو نہ بچھڑے
تو اس کے لئے گئوشالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ——"

اُن کی رائے میں لیلا کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ...

"وہ گھر کی مالکن بنی رہے، آرام سے کھائے،
پہنے اور پڑی رہے، اسے اختیار ہے چاہے جتنے
زیور بنوائے، چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے،
روزے رکھے، صرف ان سے دُور رہے"

چالیس برس کی لیلا اب لالا ڈنگامل کے لئے "ایک
گائے" تھی کیونکہ سات بچوں کو جنم دینے کے بعد اس میں
کیا تھا جو لالاجی کو متاثر کرتا۔ پھر جب وہ اپنی خامیوں کو
اور فطرت کی بے رحمیوں کے ازالے کے لئے رنگ و روغن کا
لیتی تو لالاجی کو اور کراہیت ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ خود ہفتے
دو بار خضاب لگاتے، کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے
ڈاکٹر سے بندروں کے غدود کے بارے میں خط وکتابت
معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے
کے مرتے ہی دوسری شادی کرلی۔ بوڑھا شوہر اگر دو
ہوتا سے کم عمر بیویوں کی کیا کمی؟ چنانچہ ایک جوان گائے لالا
کھونٹے سے بندھ جاتی ہے لیکن اب سچویشن قدرے
ہے۔ یہ نئی گائے پیٹھ پر ہاتھ تک نہیں رکھنے دیتی۔ نئی بیوی
نے لالاجی سے وہی سلوک کرنا شروع کردیا تھا جو انہوں
لیلا سے روا رکھا تھا۔

ایک دن لالاجی نے آکر کہا:
"چلو آج بجرے پر دریا کی سیر کر آئیں"
آشا نے بے دلی سے کہا: "میرا تو جی نہیں چاہتا"
لالاجی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا:
"تمہاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب
مائل نہیں ہوتی"
"آپ جائیں مجھے اور کئی کام کرنے ہیں"

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی کوشش
لالاجی نے سمجھ لیا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے لیکن پھر بھی
جاری رکھی۔ اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد

ں سے نمایاں نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے؟
لیکن لالاجی یہ بات بھول گئے کہ بیوپار میں مال تجارت اور خریدار دونوں کی کوالٹی یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ وہ آشا کے ہاتھوں جو سودا بیچنا چاہتے تھے اس کا درجہ گرا ہوا تھا، اور اس کے بدلے میں آشا سے جو قیمت وصول کرنا چاہتے تھے، وہ اسے ادا کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ برابری کا لین دین کرنا چاہتی تھی جس میں نہ کوئی کچھ بیچے نہ کوئی کچھ خریدے۔ مگر دونوں منہ مانگی مرادیں پالیں۔ گھر کے نوکر جنگل سے اس کی بات چیت دیکھئے :

"تمہاری شادی کسی بڑھیا سے کر دوں گی، دیکھ لینا!"

"تو میں زہر کھا لوں گا، دیکھ لیجئے گا!"

"کیوں؟ بڑھیا تمہیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کرے گی، تمہیں سیدھے راستے پر رکھے گی!"

"یہ سب ماں کا کام ہے، بیوی جس کام کے لئے ہے اسی کے لئے ہے!"

"آخر بیوی کس کام کے لئے ہے!"

"آپ مالک ہیں، نہیں تو بتلا دیتا بیوی کس کام کے لئے ہے"، موٹر کی آواز آئی۔ نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل کھسک کر کندھے پر آ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پہ کھینچ کر اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔

"لالا کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آجانا!"

پریم چند اس افسانے میں کہیں بھی نصیحت گر نہیں بنتے۔ ان کے اندر کا مصلح انہیں اس بے جوڑ شادی کے خلاف آواز اٹھانے پر اکساتا ہے مگر وہ بڑی فنکارانہ حقیقت پسندی کے ساتھ اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی طرف اشارہ کر کے چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جسمانی خواہش بہتے پانی کی طرح اپنی راہ خود بنا لیتی ہے اور اس پر ریت کے بند نہیں باندھے جا سکتے۔

ایک اور افسانے "مالکن" میں پریم چند نے اس فطری خواہش کے ارتفاع (Sublimation) کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ پیاری اور دلاری دو بہنیں چودھری شیوداس کے دو بیٹوں برجو اور متھرا سے بیاہی جاتی ہیں — پیاری بچاری قسمت کی ہیٹی نکلتی ہے اور جوانی ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ شیوداس اپنے جوان بیٹے کی اچانک موت سے ہراساں ہو کر گھر گرہستی کی ساری ذمے داری پیاری کے سر ڈال دیتا ہے۔ اس کا ایک مقصد پیاری کے غمزدہ دل کو تسکین بھی ہے۔ خاص طور سے بھنڈار کی کنجی جو ہمیشہ شیوداس کی کمر سے بندھی رہتی تھی، پیاری کے ہاتھوں میں دیئے جانے پر اسے گھر کی مالکن بن جانے کا احساس بڑی تسلی دیتا ہے اور وہ اپنے آنسو پونچھ کر تن من سے سب کی سیوا میں لگ جاتی ہے جو ہندوستانی عورت کا دھرم ہے۔

شوہر کو کھو دینے پر ہندوستانی عورت اپنے آپ کو بڑی بے سہارا اور کمزور محسوس کرنے لگتی ہے۔ پیاری نے بیوہ ہو کر جو ادھیکار کھو دیا تھا اس سے زیادہ کی حقدار وہ بھنڈار کی کنجی پا کر ہو گئی تھی لیکن اس تبدیلی نے اس کے اندر احساس ذمہ داری کو اس قدر شدید کر دیا کہ اس کے دل میں آرام پسندی کا خیال تک محو ہو گیا۔ پہلے دال چننا تک اسے وبال جان معلوم ہوتا تھا مگر اب وہ بڑھ بڑھ کر سب کام کرنے لگتی ہے۔ پہلے گھر کا روپیہ پیسہ خرچ ہوتا تھا تو اسے غم نہیں ہوتا تھا مگر اب پائی پائی جوڑنے میں اسے مزا آنے لگا ہے۔ مگر دنیا داری اور عزت کے خیال سے دل کھول کر خرچ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے چھوٹی بہن کڑے بنوانے کے لئے ضد کرے تو پیاری انکار کیسے کر سکتی ہے؟ نتیجے میں اس کے اپنے گہنے اس کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ پھر بھی گھر والے اس سے خوش نہیں۔ سب اسے سخت شست کہتے ہیں اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس ہنس کر برداشت کرتی ہے۔ مالکن کا فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرے مگر کرے وہی جس میں سب کی بھلائی ہو۔

پیاری مالکن بن کر خوش ہے لیکن اس کا احساس محرومی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ چھوٹی بہن دلاری اور اس کے شوہر متھرا کی پیار بھری باتیں اور چہلوں کے لڑکے کے دلار دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس کی بیوگی کا سونا پن اسے کسی خوفناک جانور کی طرح نگلنے لگتا ہے مگر خدمت کا خیال اس کے دل کو تسلی دیتا ہے، اور سب کی زندگی سنوارنے کا حسین تصور اس کی بنجر زندگی میں تھوڑی سی ہریالی لے آتا ہے۔

پھر ایک دن شیوداس بھی اپنے بڑے بیٹے کے پیچھے چل دیتا ہے۔ اب اکیلے متھرا سے کھیتی کا کام سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اچھا منتظم بھی نہیں ہے۔ اس لئے پیاری کو اب دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے ہیں — آخر کو وہ مالکن ہے۔ اسی کو سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مگر ایک دن جب متھرا اور دلاری اپنے

محبوب راہی
گلزاری مسجد۔ بارسی ٹاکلی
ضلع اکولہ۔ ۴۴۴۴۰۱

غزل

جیتا ہے یقیناً نہ مرتا ہے یقیناً
انساں، مقدر کا کھلونا ہے یقیناً

جو بات ضروری ہے وہ ہوتی نہیں ہرگز
جی چاہے نہ ہو جو وہی ہوتا ہے یقیناً

سقراط ہوں میں زہر کو سچائی کے پینا
یہ کام کسی کا نہیں میرا ہے یقیناً

ہمزاد ترا تجھ میں جو پوشیدہ ہے راہی
اک روز تجھے اس سے نمٹنا ہے یقیناً

دانستہ میں اس راہ کو اپناتا ہوں راہی
جس راہ میں ہر گام پہ دھوکا ہے یقیناً

بچوں کو لے کر شہر چلے جاتے ہیں تو اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسے لگتا ہے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ کسی چیز میں اس کا من نہیں لگتا۔ اب وہ مرے کھپے تو کس لیے اور کس کے لیے؟

اب ہل چلانے والا کام چور اور نشے باز جوکھو ہی تو بچ رہتا ہے جس پر وہ صرف حکم چلا سکتی ہے اس کے لیے دُکھ تو نہیں سہہ سکتی۔ یوں بھی وہ جوکھو کو ناپسند کرتی تھی اور دو ایک مرتبہ اسے کام پر سے نکلوا بھی چکی تھی۔ پر ایسے وقت میں اس کی ہمدردی کی باتیں پیاری کو اچھی لگنے لگیں اور اس کے دل میں پھر سے جینے اور کسی کا خیال رکھنے کی اُمنگ بیدار ہونے لگی۔ پھل اگر کانٹے دار درخت میں لگیں تو کیا انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب وہ دن بھر کھیت پر رہتی ہے۔ جوکھو بھی دل لگا کر کام کرتا ہے اب اس کے اندر بھی احساس ذمہ داری جاگ اٹھا ہے۔ پہلے وہ طرح طرح کے بہانے بنا کر کام ٹالتا تھا۔ اب رات دن جی توڑ کر محنت کرتا ہے۔ پیاری چاہتی ہے کہ وہ اتنی محنت نہ کرے ورنہ بیمار پڑ جائے گا:

"کون بیمار پڑ جائے گا۔ بیس برس سے کبھی سر تک نہیں دُکھا۔ آئندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں۔"

"میں کیا جانوں، تمہیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے، اور پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا، پیٹ میں درد تھا۔"

جوکھو جھینپتا ہوا بولا "وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے، اسے پیس ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں۔ میرے ہی سر ہے۔ میں نہ کروں گا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔"

پیاری پھر سے وہی تابعدار مالکن بنتی جا رہی ہے۔ اب اس کا مخدوم جوکھو بنتا جا رہا ہے۔ جو نوکر ہوتے ہوئے بھی مالک سے استحقاق اور احساس ذمہ داری کے ساتھ بات کرتا ہے۔ پیاری ایک ایک سیڑھی نیچے اُترتی جاتی ہے۔ جوکھو ایک ایک سیڑھی اُوپر چڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں آمنے سامنے، برابر برابر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اب پیاری چاہتی ہے کہ جوکھو کی پوری پوری دیکھ بھال کرنے والا کوئی ہو۔ وہ اسے شادی کر لینے کا مشورہ دیتی ہے۔ بار بار کے اصرار پر جوکھو تنگ آ کر کہتا ہے:

"تم نے پھر وہی بات چھیڑی مالکن! کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی عورت لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے؛

"یہ تو تم نے بڑی کڑی شرط لگائی۔ ایسی عورت کہاں ملے گی جو گہنا نہ چاہتی ہو"
"تم نے تو کبھی گہنے کے لئے ضد نہ کی بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیئے"
پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آگیا: "اچھا اور کیا چاہتے ہو؟"
"میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی"
پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی بولی:
"بگڑنے کی بات ہوگی تو ضرور بگڑ جاؤں گی"
"تو میں نہ کہوں گا"
پیاری نے اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا:
"کہو گے کیسے نہیں؟" میں کہلا کے چھوڑوں گی"
"اچھا تو سنو! میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو! ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو، اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی تنومند ہو۔ بس ایسی عورت ملے گی تو بیاہ کروں گا.... نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا"
پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا، پیچھے ہٹ کر بولی: تم بڑے دل لگی باز ہو"
"مالکن" کا یہ اختتام ہمیں "نئی بیوی" کے اختتام کی یاد دلاتا ہے۔ دونوں میں عورت کا جذبہ سپردگی اس موڑ کو جنم دیتا ہے جہاں مرد کی ذہنی آمادگی اور رضامندی سارے مراحل کو بیک جنبش طے کر دیتی ہے اور آقا اور نوکر کے درمیان کی دیوار ایک ہی لمحے میں زمین بوس ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے بڑے فنکارانہ انداز میں افسانے کو اس منزل کی طرف بڑھایا ہے۔ سارے افسانے میں پیاری کا کردار ایک شیشے کی طرح صاف و شفاف نظر آتا ہے جس کے آر پار ہم دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس شیشے میں ہم دو مردوں کے عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک برجو اور دوسرا جوکھو' کا برجو کا وجود پیاری کی کشتی حیات کے لئے ایک جزیرے کی طرح تھا جس کے کنارے وہ کچھ دیر تک ٹکی رہی اور جب یہ جزیرہ طوفان میں ڈوب گیا تو وہ بھی گرداب میں پھنس گئی۔ ایسے میں "مالکن" ہو جانے کا احساس ایک مضبوط پتوار کی مانند اس کا سہارا بنا رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اسے تحفظ بھی چاہیئے صرف اقتدار نہیں۔ چنانچہ وہ ساحل کی تلاش جاری رکھتی ہے، یہاں تک کہ جوکھو ساحل بن کر اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور وہ تھوڑی سی فطری ہچکچاہٹ کے بعد اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس کے اندر کی ناآسودہ اور تھکی ہوئی عورت اب بیک وقت حاکم بھی ہوگی، اور محکوم بھی، اور مالکن بھی ہوگی اور کسی کی ملکیت بھی۔ شروع میں وہ صرف محکوم و ملکیت تھی۔ پھر محض حاکم اور آقا بن کے رہ گئی۔ لیکن اب وہ ان دونوں حیثیتوں کو ایک دم سے پاکر نہال ہو رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سچا سکھ تو یہ ہوا اور ادھیکار دونوں میں ہے۔ ہندوستانی عورت کا یہ سچا روپ پریم چند کے اکثر افسانوں میں ملتا ہے۔

"نئی بیوی" کی آشا اور "مالکن" کی پیاری میں مشترک قدر یہ ہے کہ دونوں جھوٹے سماجی بندھنوں اور اونچ نیچ کی جکڑبندیوں سے آزاد ہوگئی ہیں اور اپنے ارادوں کی تکمیل سے سرشار ہیں — دونوں کے کرداروں میں پریم چند نے جسمانی آسودگی کے ساتھ ذہنی و جذباتی سیرابی کے امکانات پیدا کر کے مرد و عورت کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب ان میں نہ کوئی سودا ہے نہ کوئی سوداگر، نہ کوئی شکار ہے نہ کوئی شکاری۔

ڈاکٹر شریمتی شالنی نائک پائل کی تصنیف کردہ کتاب ... رانی تارابائی ... کا اجراء ۲۸ ستمبر کو، کولہاپور کے شاہو مہاراج کے ہاتھوں بمبئی کے تیج پال ہال میں ہوا
زیر نظر تصویر میں سابق وزیر اعلیٰ بیرسٹر بابا صاحب بھونسلے اور وزیر تعلیم پرتاپ سنگھ بھی دیکھے جا سکتے ہیں

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔
بصورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ فرمالیں۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمادیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمادیں۔ (ادارہ)

ارے کمبخت ایک کپ چائے بھی
سے نہیں لاسکتی" میری ہی عقل پر
ے تھے جو اس بھکارن کو اپنے بیٹے
باندھ دیا۔

ساجدہ بیگم کی پاٹ دار آواز آج
رے گھر تک پہونچ رہی تھی موضوع
انا تھا۔ آج پھر بیچاری سلمیٰ کی خیر
ی۔

چل سے جا یہ چائے۔ سلمیٰ کی ایک
سنائی دی اور ہمیشہ کی طرح پڑوسن
کے ناطے میں فوراً ساجدہ آپا کے
پہنچ گئی۔

ساجدہ آپا پان بنا رہی تھیں اور
روان صلواتیں سلمیٰ کو سنا رہی تھیں
ہاتھ پر پڑی گرم چائے کی پرواہ
کپ کی کرچیاں جمع کر رہی تھیں۔
مجھے دیکھتے ہی دودھ میں ابال آگیا
بتاؤں صبا کی ممی اس لڑکی نے تو
حرام کر دیا ہے میں تو اس گھڑی کو کوس
جب ان کنگالوں سے رشتہ جوڑ
تھی۔

ذرا دم لینے ساجدہ آپا رکیں تو میں
بات ختم کرنے کی کوشش کی۔
کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ میں آپ
کے ملنے آئی تھی۔

کل ایک رشتے میں شادی تھی وہیں
گئی تھی۔ کیا بتاؤں کیا جہیز دیا ہے لڑکی کو
ہر آدمی واہ واہ کر رہا تھا۔ کوئی چیز تو باقی
رکھی ہو۔ ٹی، وی، ریڈیو، فریج، ماروتی
کار تو دی ہی تھی دولہے کے بھائی کو اسکوٹر
بھی دیا۔ بھئی بیٹی کی عزت سسرال میں بڑھانی
ہو تو اس زمانے میں یہی سب کچھ کرنا چاہیئے۔
مجھے کیا پتہ تھا کہ جس موضوع سے میں
انھیں ہٹانا چاہتی تھی بات وہیں لوٹ کر
آجائے گی۔

پھر میرے بالکل قریب آکر گویا سرگوشی
کے انداز میں کہنے لگیں۔ میں دلہن کی چھوٹی
بہن کے لئے اپنے سہیل کا ذکر چھیڑ آئی ہوں
خدا کرے وہ لوگ مان جائیں پھر دیکھنا صبا
کی ممی میرا گھر بھی اسی طرح بھر جائے گا
ساتھ ہی ایک حقارت بھری نظر سلمیٰ پر ڈالی
میں نے یوں ہی بات ٹالنے کے لئے
پوچھ لیا۔ لڑکی کہاں تک پڑھی ہوئی ہے
آپا جان؟

"اے خاک ڈالو پڑھائی پر کیا اچار
ڈالنا ہے ڈگری والی بہو کا۔ ایک بی۔ اے۔
پاس لاکر بہت سکھی ہو گئے نا؟ سائنس آٹھویں
تک پڑھی ہوئی ہے مگر میرا بچہ خوشحال ہو
جائے گا۔ ارمان تو پورے ہو جائیں گے نا

کے۔

ایک میرا شکیل ہے بیچارہ بسوں کے
دھکے کھاتا ہوا کالج پہنچتا ہے۔ ان سلمیٰ بیگم
کے کنجوس ابا سے یہ بھی نہ ہوا کہ داماد کو ایک
سائیکل ہی دیدیتے موٹر سائکل نہ سہی۔

میں نے دیکھا سلمیٰ کچن میں کھڑی
آنسو پونچھ رہی تھی میں صبا کو ساجدہ آپا کے
حوالے کر آئی۔ شاید صبا کے ساتھ کھیلنے میں
وہ تھوڑی دیر کے لئے سلمیٰ کا پنڈ چھوڑ دیں
ساجدہ آپا کا فلیٹ ہمارے فلیٹ سے
بالکل ملا ہوا ہے۔ ان کے شوہر مرزا صاحب
بڑے شریف النفس انسان ہیں۔ میں نے
انھیں کبھی اونچا بولتے نہیں سنا۔ ساجدہ
آپا ہمیشہ ان پر حاوی رہیں۔ ساجدہ آپا کے
دو ہی بیٹے تھے۔ بڑا شکیل، چھوٹا سہیل
دونوں کو مرزا صاحب نے بڑی محنت
سے پڑھایا ہے۔ شکیل ایم۔ اے کرکے
کالج میں لکچرار ہو گیا۔ سہیل نے انجنیر بن
کر ایک اچھی کمپنی میں ملازمت کرلی۔ دو
سال پہلے ساجدہ بیگم بڑے ارمانوں سے سلمیٰ
کو بیاہ لائیں۔ سلمیٰ کے ابا مرزا صاحب کی
طرح نہایت ایماندار اور محنتی انسان تھے
زندگی بھر حرام کمائی کی طرف نہیں دیکھا۔

جو کچھ محنت سے کما یا اس میں جو بیٹی کو دے کے دیدیا۔ ساجدہ بیگم تو بڑی آس لگائے بیٹھی تھیں ۔ اتنا کم جہیز دیکھ کر ساری امیدوں پر پانی پھر گیا ۔ ابھی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی تھی کہ انھوں نے طعنے دینے شروع کردیے اور اس دن تو سلمیٰ کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا جب وہ کسی شادی میں ڈھیر سارا جہیز دیکھ لیتیں ۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ۔ سلمیٰ بڑی سگھڑ اور نیک اور کم سخن لڑکی ہے بی ۔ اسے پاس سے شکل و صورت بھی بڑی پیاری ہے شکیل اور سلمیٰ میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی ۔ ساس سسر کی اتنی خدمت کرتی ہے کہ بہت کم بہوئیں کرتی ہوں گی۔ پھر بھی جہیز نہ لانے پر اس کا یہ حال ہے اور میں تو کہتی ہوں وہ جہیز لائی ہے ۔ خوش اخلاقی ، خدمت گذاری ، خوبصورتی ، فن گرہستی ، کردار کی پاکیزگی ۔ شرم و حیا کا انمول موتی ، اور خاندانی شرافت جیسا بیش قیمت جہیز ۔ ایسا جہیز بہت کم لڑکیوں کو ملتا ہے ۔

مگر ساجدہ آپا کی کور نگاہیں ان انمول خزانوں سے پرے تھیں ۔ وہی اور فریج ، صوفے اور کار کی چمک سے خیرہ ہو چکی ہیں وہ ایسے آبدار موتیوں کو کہاں دیکھ سکتی ہیں ۔ نہ جانے کتنی ساجدہ آپائیں کتنی سلماؤں کا جینا اسی طرح اجیرن کیے ہوئے ہیں ہمارے ملک سے یہ ناسور کبھی ختم ہوگا بھی یا نہیں ۔ ایک ایسا سوال ہے جس کا حل ہمارے پاس ہے مگر ہم خود اسے حل کرنا نہیں چاہتے ہیں ۔ میں سوچتی ہوں کاش ساجدہ آپا کی بھی ایک بیٹی ہوتی تب انھیں پتہ چلتا جہیز کس طرح دیتے ہیں ۔

قصہ یوں ہی چلتا رہا ساجدہ آپا نے آخر سہیل کا رشتہ اس کروڑ پتی باپ کی بیٹی سے کر ہی دیا ۔ شادی کا دن آیا میں بھی شریک ہوئی ۔ دلہن کے ساتھ جو جہیز آیا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ ساجدہ کا چھوٹا سا فلیٹ کھچا کھچ بھر گیا مگر دلہن کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا ۔ سہیل کے مقابلے میں لڑکی کچھ عجیب بھونڈی سی لگی اور جس طرح پٹر پٹر وہ بولے جا رہی تھی وہ دیکھ کر تو دل اور خراب ہو گیا ۔ مگر ساجدہ بیگم تھیں کہ اس پر صدقے واری ہو رہی تھیں ۔ اور جہیز کا ایک ایک سامان دیکھ رہی تھیں اور دکھا رہی تھیں جیسے دنیا بھر کا خزانہ جہیز کی صورت میں ہاتھ آگیا ہو ۔

چند روز بڑے سکون سے گذرے ایک روز آوازیں پھر آنی شروع ہو گئیں مگر اس بار ساجدہ آپا کی آواز نہیں تھی ۔ نئی دلہن زیبا بول رہی تھی ۔

" میں یہاں نہیں رہ سکتی ۔ میرا دل اس کبوتر خانے میں گھبراتا ہے ۔

ساجدہ آپا سمجھا رہی تھیں مگر بیٹی اچھا خاصا تو گھر ہے ہمارا ذرا چھوٹا ہے تو کیا ؟

انہ ذرا چھوٹا ہے نہ گارڈن ہے نہ گیلری ، اور میرے جہیز کا اتنا خوبصورت سامان کس بے دردی سے کاٹھ کباڑ کی طرح اس کبوتر خانے میں بھر کے رکھا ہے وہ نظر نہیں آتا تمھیں ؟ زیبا کی بلند آواز میں دولت کی قوت تھی ۔

" میں اپنے ڈیڈی سے کہہ کے اسی ہفتے نئے فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گی ۔ "

زیبا نے فیصلہ سنا دیا ۔

ساجدہ آپا نے کیا کہا ۔ میں نہیں سن پائی ۔

شاید ان کی پاٹ دار آواز جہیز کے بوجھ تلے دب چکی تھی ۔

ہفتے بھر بعد سارا سامان زیبا بیگم جس طرح ساتھ لائی تھیں اسی طرح لے گئیں اور ساتھ ہی ساجدہ بیگم کا ایک انمول رتن " سہیل " بھی اس جہیز کے ساتھ چلا گیا بالکل اسی طرح جیسے کسی مقناطیس نے لوہے کو کھینچ لیا ہو ۔

ساجدہ آپا ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں ۔ اور جب خالی گھر پر نظر ڈالی تو " ہائے میرا سہیل " کہہ کر بے ہوش ہو گئیں ۔ سلمیٰ نے جھپٹ کر انھیں اپنی بانہوں میں لے لیا ۔

اس کے بعد ساجدہ آپا کی وہ کرخت اور بلند آواز مجھے کبھی سنائی نہ دی شاید وہ سمجھ چکی تھیں کہ اچھا جہیز اچھی بہو کا البدل نہیں ہو سکتا ۔

مگر ذرا دیر سے سمجھی تھیں ۔

آج کل میکانی زندگی ہے۔ مشکلات سے در پیش ہیں۔ خاندان۔ آلودگی کے عجب آثار ہیں۔ ہر طرف خواہ ہوائی آلودگی ہو یا آبی آلودگی۔ نفسیاتی انتشار کی کمی نہیں۔ نوجوان طبقہ میں، شہر ہو یا گاؤں۔ روس ہو یا امریکہ، ہندستان ہو یا افغانستان، پاکستان ہو یا سنگاپور، انگلستان ہو یا آسٹریلیا۔ سماج میں بے چینی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے اثرات عوام پر پڑتے ہیں۔ صحت عامہ متاثر ہوتی ہے۔ ہمہ اقسام کے امراض پھیلتے ہیں۔

عضلاتی درد، گردن میں درد، فکر، رنج و غم کی کیفیت
ے دباؤ میں اضافہ وغیرہ مریض میں دیکھنے میں آتے ہیں۔
عکس " دردِ سر " کی صورت میں ہوتا ہے۔ چند ممالک
سر بھاری ہو جانے سے نفسیاتی بے چینی کی وجہ سے چند لوگ
ز بھی بن جاتے ہیں۔ جسمانی بے چینی کا سبب بھی دردِ سر ہے
عمر کی قید نہیں۔ غریب و امیر کا فرق نہیں، عورت مرد کی تمیز نہیں
ردِ سر کا کبھی نہ کبھی شکار ہو سکتا ہے۔ کوئی تقریر نہ بھائے۔
ت پسند نہ آئے۔ بے ذائقہ چیز چکھ لیں، کوئی کسی کی بات نہ مانیں
دِ سر کا حملہ ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات کسی مرض کی پیشین گوئی
دردِ سر، ماحول میں کوئی کام مشکل سے انجام دیں تو محاورہ استعمال
ں "یہ تو دردِ سری ہے"۔ تناؤ، غصہ تیور چڑھاؤ میں بھی دردِ سر کا
ں حصہ ہے۔

دردِ سر کے اہم اقسام پانچ ہیں:۔
۱) نفسیاتی تناؤ دردِ سر (۲) دموی دردِ سر (۳) سو جھن
۴) گچھی دردِ سر (۵) دماغی ورم۔

دردِ سر کے چند مریض تو نہ دفتر جا سکتے، نہ آرام کی نیند لے سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو مروڑنے میں اور تکلیف کی بیان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس دردِ سر کی وجہ سے کسی کام میں دلچسپی نہیں لے سکتے جب کہ پیمانہ دردِ سر لبریز ہو جاتا ہے۔

دردِ سر کے واقع ہونے کے سلسلے میں کئی نظریے پیش کئے گئے ہیں مثلاً انفلوئنزا، ملیریا کے زیرِ اثرات میں شامل دردِ سر ہے۔ وقفہ وقفہ سے دردِ سر واقع ہوتا ہے۔ دو تکلیف کے دورے رہیں تو ایک راحت کا دور رہتا ہے۔ دردِ سر میں، داڑھ میں، مسوڑھوں میں بلا کا درد ہو تو بھی دردِ سر واقع ہوتا ہے۔ عورتوں میں حمل کے دوران بیزارگی کا انعکاس ہی دردِ سر ہے۔ زیادہ امید کرنے کے بعد سپھل نہ ہونے پر ناامیدی کا سرمایہ دردِ سر ہے۔ خصوصاً نوجوان طبقے میں، پیار و محبت میں خلفشاری ہو جائے تو نتیجہ دردِ سر ہے۔ شراب نوشی، سگریٹ نوشی، افیون، چرس نوشی زیادہ ہو جائے تو

درد سر یقینی ہے۔ قبض کی وجہ سے درد سر واقع ہوتا ہے بینائی میں کمی ہو جائے۔ خون کے دباؤ میں اچانک اضافہ ہو جائے، جسمانی تپش میں اضافہ ہو جائے تو درد سر کا ہونا ضروری ہے۔

پیشے کے لحاظ سے بھی درد سر واقع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً شاعر، ادیب، قلم کار کے تخیل میں خلل پڑ جائے تو درد سر کا ہو جانا ضروری ہے۔ کاروباری کے دوران کھانا نہ کھائیں تو بھی لوگوں کو سر کا درد آجاتا ہے۔ ہوٹل، ریسٹوران میں بیٹھیں اور چند غذاؤں کی بو کو سونگھیں تو بے زارگی اور سر کا درد شروع ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی چیزیں بنانے والوں کو بھی اس کیفیت سے درپیش ہونا پڑتا ہے۔

عام سروے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں ۳۰ % لوگ تشویش و فکر کی وجہ سے درد سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنسی پوشیدہ امراض کی وجہ سے بھی نسواں طبقہ میں یہ کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ تھکن، مرتکز روشنی، غذائی بے پسندیدگی۔ بھوک کی وجہ سے آبادی کا کافی حصہ درد سر میں مبتلا ہے۔ ایک سے زیادہ وجوہات ہو سکتے ہیں۔ اس کیفیت کی کمزوری کے لئے۔

درد سر بلا کا ہو جائے۔ بار بار آ جائے۔ درد سوز دوا بھی کام نہ کرے تو علاج و معالجہ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے تشخیص کے بعد مناسب دوا کا استعمال مریض کے لئے اہم ہے۔

درد سر سے دور رہنے کے لئے کئی ترکیبیں ہیں۔ باقاعدہ غذا وقت مقررہ پر لینا ضروری ہے۔ مناسب طریقہ سے ہر ایک کو آرام لینا ضروری ہے۔ جسمانی ورزش کرنا اہم فعل ہے۔ روحانی، نفسیاتی اعتبار سے مفید سوچ وچار دھارا میں مصروف رہنا چاہئے۔ تشویش فکر، رنج، غم کے انبار میں رہنے پر بھی نہایت ہی سنجیدگی سے تخیل کا افراط ہونا ضروری ہے۔ تندرستی کے وسائل کو اپنانا چاہیئے۔ ان تمام افعال کے ساتھ ساتھ طبی مشورہ بھی جاری رکھنا چاہیئے۔

آدھا سیسی یا یک طرفہ درد سر بلا کا مرض ہے۔ اس سے بچنے کے لئے گرم گرم ایک کپ کافی لیتے ہوئے سر کو برف کی ٹیٹی لگانے پر فرحت ملتی ہے۔ نہار پیٹ اسپرین لینا مضر ہے۔ قبض کو دور کر لینے سے، شراب، سگریٹ نہ پینے سے، وقت پر کھانا لینے سے آنکھوں کا معائنہ کروا لینے سے، خون کا دباؤ، خون میں شکر کا تناسب دیکھ لینے سے ہم درد سر سے کوسوں دور رہ سکتے ہیں۔ صحت کی برقراری ہو جاتی ہے ایسا کرنے سے۔

قومی زبان

غزل

سیدہ نسرین نقاش

خندہ بھون۔ نوا کدل۔ سری نگر ۱۹۰۰۰۲ (کشمیر)

تمہارے شہر میں ایسی بھی تتلیاں ہونگی
کہ جن کی زیست کا عنواں اداسیاں ہونگی

یونہی جو آتے رہے گاؤں شہر کی زد میں
نہ کھیت ہوں گے نہ گندم کی بالیاں ہونگی

وہ کشتیاں جنھیں اپنے سفر پہ جانا ہے
کبھی ضرور وہ ساحل سے بدگماں ہونگی

بس اک نگاہ وہ چاندی کا شہر ہوگا ضرور
مکاں مکاں جہاں سونے کی تھالیاں ہونگی

یہ ڈھلتی شام کے سائے مجھے نہ چھوڑینگے
کہ پھر نظر کی فضائیں دھواں دھواں ہونگی

خروش موجیں کسی وقت جب بھی بھڑکیں گی
بھنور میں ڈوبتی معصوم کشتیاں ہونگی

وہ خواہشیں جو ہمارے دلوں میں پلتی ہیں
وہ ہم سے بچھڑی ہوئی شاہزادیاں ہونگی

درد سر کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لئے مریض کو وجوہات کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے۔ یہ وجوہات نفسیاتی بھی ہو سکتی ہیں اور مادی بھی۔ ان کی پہچان کے لئے کافی عرصہ بھی درکار ہو جاتا ہے غرض اچھے ماحول میں، اچھے خیالات میں مگن رہنے سے درد سر ہم سے پرے رہ جاتا ہے۔

دیوان غالب عکسی

(چوتھا ایڈیشن)
(مطبع نظامی کانپور، جون جولائی ۱۸۶۲ء)

تالیف :- کالیداس گپتا رضا، بمبئی
اشاعت :- ۱۹۸۶ء
قیمت :- ۱۴۰ روپے
پبلشر :- ودل پبلی کیشنز، ۱۰، رجولی بھون
۱۰، نیومرین لائنز، بمبئی ۴۰۰۰۲۰

ادیب شہیر ماہر غالبیات، شاعر اور محقق کی حیثیت سے جناب کالی داس گپتا رضا کی شخصیت آج کسی تعارف کی محتاج نہیں دیوان غالب کے چوتھے ایڈیشن کا عکس مع مقدمہ ان کی تازہ ترین پیشکش ہے۔ ابھی پچھلے برس آج سے کوئی دس ماہ پہلے جناب رضا دیوان غالب کے اولین ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۴۱ء) کا عکس شائع کر کے عام کر چکے ہیں۔

غالب کے پہلے ایڈیشن کے بعد چوتھے ایڈیشن کی اس اشاعت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ غالب کی زندگی میں دیوان غالب اردو کے پانچ ایڈیشن چھپے ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن نہایت اہم ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کمیاب ہے۔ (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) نیز یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا"

دیوان غالب اردو کے پانچ ایڈیشن جو غالب کی زندگی میں طبع ہوئے جناب رضا نے اپنی تالیف میں ہر ایڈیشن کے متعلق ضروری تفصیل نیز دیوان میں اشعار کی تعداد جو کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنی تلاش و جستجو کا ماحصل پیش کیا ہے اس عکسی دیوان کا پیش لفظ جو ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے غالب پسندوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ رضا کی تحریروں میں جو انھوں نے غالب سے متعلق لکھی ہیں کوئی نہ کوئی نیا زاویہ ضرور سامنے آیا ہے اس کے علاوہ جو بات ان کے یہاں اہم ہے وہ ایک محقق کا رول ہے۔ تحقیق کی روایت اور اس کی پاسداری نقد کی دیانت اور مضامین کو راست بیان کرنا ان کے قلم کا شیوہ ہے۔ تحقیق کی راہ میں شخصیت کبھی ان کی راہ کا پتھر نہیں بنتی۔ رضا غالب کے دوسرے ایڈیشن پر اشعار کی تعداد سے متعلق بحث کرتے ہوئے مقدمہ میں حضرت عرشی کے مقدمہ کا ذکر کرتے ہیں جو دلچسپ اور اہم ہے جناب عرشی غالب کے معتبر ترین محققین میں شمار ہوتے ہیں۔ عرشی نے غالب کے دوسرے ایڈیشن میں اشعار کی تعداد کے متعلق جو دعویٰ کیا تھا اور جسے جناب مالک رام نے حرف بحرف تسلیم کر لیا تھا رضا کو اس سے نہ صرف اختلاف ہے بلکہ حیرت بھی ہے کہ یہ "چوک" حضرت عرشی سے کس طرح سرزد ہو گئی اور حساب غلط ہو گیا۔ چنانچہ حقیقت حال بیان کرتے ہوئے رضا صاحب نے جو تفصیل دی ہے مطالعہ کا حصہ ہے

چوتھے ایڈیشن ۱۸۶۲ء کی طباعت کے لیے خود غالب مشتاق تھے۔ وجہ؟ تیسرے ایڈیشن کی اشاعت پر بے اطمینانی جو میر مہدی مجروح کے نام ان کے مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۶۱ء سے بھی ظاہر ہے چنانچہ غالب نے ایک نسخہ اپنے ہاتھوں سے "دو رات دن کی محنت میں" برابر صحیح کیا اور پھر تمام تر غلطیوں سے پاک نسخہ اشاعت کے لیے سپرد کیا۔ تاہم طابع کے دعویٰ احتیاط صحت کے باوجود متعدد غلطیاں راہ پا گئیں۔ نیز املا اور مطلب میں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ رضا صاحب نے ان غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے درست املا کے ساتھ تفصیل دی ہے مقدمہ جو ہر پانچ ایڈیشنوں پر محیط معلومات اور تفصیل مہیا کرتا ہے مطالعہ کی چیز ہے اور غالبیات کی جہت میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے

رضا صاحب کی یہ تالیف ۱۲۸ صفحات پر مشتمل نہایت عمدہ اور سفید چکنے کاغذ پر چھپی ہے جو اصل دیوان غالب مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲ء) کی فوٹو کاپی ہے۔ سنہرے جلی حروف کی تحریر کے ساتھ جلد خاصی مضبوط اور پلاسٹک کور کے ساتھ دیدہ زیب ہے۔

غالب کے شیدائیوں اور لائبریریوں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

وزیراعلیٰ شری شنکر راؤ چوان اور ان کی اہلیہ شریمتی کسم تائی چوان ۲۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کو بمبئی کے تیج پال روڈ پر واقع متھراداس وسنت جی میموریل ہال میں درگا پوجا کے موقع پر تشریف لے گئے۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے۔

خبریں ۔ تصویروں میں

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے ڈائرکٹر شری رمیش وا بگاؤنکر نے مورخہ ۵ ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اطلاعات و رابطۂ عامہ کی جانب سے شری گرو پرشاد ونارکر کی ٹائپ رائٹر پر تیار کی گئی دلچسپ تصویروں کی نمائش کا افتتاح سچوالیہ جمخانہ میں روایتی دیپ جلا کر کیا۔

قارئین کی رائے

• مشتاق احمد
سی-٦ سے دیو سوسائٹی آئی۔ سی۔ ایس، کالونی
گنیش کھنڈ۔ پونے ۴۱۱۰۰۷

"قومی راج" کا "گرو ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" نظر نواز ہوا تمام مضامین معلوماتی اور بہت اچھے ہیں۔ اس خوبصورت نمبر کی اشاعت پر مبارکباد۔
"قومی راج" میں افسانوی ادب کے چند صفحے ضرور مخصوص کردیں۔

• شفیع اللہ خاں راز اٹاوی (ایم۔اے)
ایس۔ این۔ کالج کٹرہ۔ پرول خاں۔ اٹاوہ (یوپی)

"قومی راج" ماہ بہ ماہ باصرہ نواز ہورہا ہے۔ تمام سرکاری رسائل میں "قومی راج" واحد جریدہ ہے جو اپنی نئی آن بان اور وقار کے ساتھ بلا تاخیر منظر عام پر آرہا ہے۔ ارسال کردہ نیا تحفہ "گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" ۱۰ جون ۱۹۸۶ء موصول ہوا۔ سابقہ نمبروں کی طرح یہ خصوصی شمارہ بھی نہایت معلوماتی، کارآمد اور آپ کے حسن ادارت کا آئینہ دار ہے۔ نیز اردو کے اسکالروں کے واسطے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ لوگ لائق صد آفریں اور مستحق مبارکباد ہیں کہ خصوصی نمبر شائع کرکے دنیائے اردو ادب میں نئے نئے احسانات کا اضافہ فرمارہے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ سب کے ارادے اور حوصلے ہمیشہ جوان رہیں۔

• رفیق جعفر
بمبئی ۹۵

"قومی راج" کا "ٹیگور نمبر" ملا۔ یہ نمبر بھی قومی راج کے سابقہ نمبروں کی طرح مختصر مگر مفید ہے خاص طور پر اس نمبر کی ایک ایک سطر اہم اور معلوماتی ہے۔ میں نے ٹیگور پر ہندی اور انگریزی میں بھی بہت پڑھا ہے لیکن جو مواد آپ نے اس نمبر میں اکٹھا کیا ہے وہ واقعی "ٹیگوریات" میں اضافہ ہے اب اس میں شامل چند آرٹیکلس کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرکے چھاپا جاسکتا ہے۔

• مہدی پرتاپگڈھی
معرفت ایگزیکٹو انجینیر
اری گیشن ڈویژن۔ پرتاپگڈھ (یوپی)

اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ خاص طور سے نئی نسل کے لئے یہ مضامین مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ قومی راج ملک و قوم کی خدمت کررہا ہے اس کیلئے آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

• نہال سوحفیظ
فلیٹ نمبر ۵۱/۱۸۳۲ ۔ ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی
تلک نگر، چیمبور، بمبئی ۴۰۰۰۸۹

بڑے ہی دلکش و جاذب نظر سر ورق کے ساتھ "گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور خصوصی نمبر" موصول ہوا۔ پڑھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ آپ نے اس سے قبل جتنے بھی نمبر شائع کئے بالخصوص "ٹیگور نمبر" قابل دید رہا۔

موضوع تعریف امر یہ ہے کہ آپ نے ایک عظیم مفکر، ہمہ گیر شخصیت "رابندر ناتھ ٹیگور" کے مکمل حالات زندگی، تعلیمی و سماجی سرگرمیاں، ڈرامے، انسانیت کے علمبردار، ڈائری کا ایک ورق شانتی نکیتن، غرض کہ مضامین کا انتخاب بہت ہی عمدہ ہے جو اعلیٰ ادب کی ترجمانی کرتا ہے۔ ویسے یہ نمبر دنیائے اردو ادب کے لئے ایک عظیم تحفہ ہے جو دستاویزی حیثیت کا حامل ہے ؎
جو چیز جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے
اتنا عمدہ، دلنشیں اور ضخیم اور معلومات سے پُر نمبر پیش کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا رسالہ سرکاری پالیسیوں، حکومت مہاراشٹر کے اہم کارناموں کی بھی مفید و مزید معلومات کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کی واقفیت بہترین شہری کے لئے ضروری بھی ہوا کرتی ہے۔

غرضیکہ رسالہ اپنی گوناگوں صفحات، دلکش کتابت، حسین طباعت دلربا سرورق سے مزین ہوتا ہے۔

رب العزت سے دعا ہے کہ "قومی راج" کو مزید ترقیات دلائے اسی کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل کرے

بال گنگادھر صد سالہ سالگرہ، خصوصی نمبر ۱۹۸۶ء

قومی راج

مراٹھی، انگریزی، گجراتی، ہندی، سندھی اور اردو چھ زبانوں میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

جلد ۱۴ ۱۰ نومبر ۱۹۸۶ء شمارہ ۱۱

سالانہ دس روپے ☆ قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ

چیف ایڈیٹر: پرمود مانے ایڈیٹر: فیروزہ فیاض خان
سب ایڈیٹر: عبد اللہ

اس شمارے میں:- صفحہ نمبر

ترسیل زر کا پتہ:-

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
برک نمبر ۱۹، نزد سروچرچ بلڈنگ
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
فون نمبر ۲۰۲۱۵۳۰

★

مراسلت کا پتہ:-

ایڈیٹر "قومی راج"
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۵، والی منزل، نیو ایڈمنسٹریٹو بلڈنگ
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲
فون نمبر ۲۰۲۰۶۵۱ / ۲۰۲۳۹۵۷

وزیر اعلیٰ کا پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ ریاستی حکومت کا ماہنامہ لوک راج بال گندھرو کی جنم شتابدی کے موقع پر ایک خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔

خوش نصیبی سے نارائن راؤ راج ہنس عرف بال گندھرو کے مراٹھی ڈراموں میں آنے کی وجہ سے مہاراشٹر کے ثقافتی دور میں ایک زریں باب کا اضافہ ہوا۔ ان کی اسٹیج میں شرکت ۲۰ برس تک ایک چمکتا رہے۔ ان کے گذرنے کے ۲۰ سال بعد بھی ان پر ایک خصوصی نمبر کا اجرا اور ایک نمائش کا اہتمام جیسا اعزاز بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے جو کہ آج بھی ان کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

ریاستی حکومت نے ریاست کی ثقافت کو مالا مال کرنے کے لیے بہت سی اسکیمات وضع کی ہیں۔ گذشتہ دس سالوں میں مراٹھی تھیٹر پھر ایک بار چمک اٹھا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے یہاں اچھے ڈرامے، اداکار اور ہدایت کار موجود ہیں۔

مجھے امید ہے کہ بال گندھرو جنم شتابدی تقریبات ایک نئے دور کی تحریک ثابت ہوگی۔ میں اس موقع پر بال گندھرو کو شردھانجلی پیش کرتا ہوں۔

ایس۔ بی۔ چوان

وزیر اعلیٰ مہاراشٹر

وزیر برائے ثقافتی امور کا

ملک بھر میں "بال گندھرو" کی صد سالہ سالگرہ منائی جارہی ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ریاستی حکومت اس موقع پر "قومی راج" کا خصوصی نمبر پیش کر رہی ہے۔

مراٹھی تھیٹر کے لئے "نٹ سمراٹ" بال گندھرو کا خواب اب حقیقت بن چکا ہے۔ اس اسٹیج پر جتنے بھی فنکار نمودار ہوئے ہیں ان میں بال گندھرو ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اپنی عمدہ اداکاری اور گانوں کے خصوصی ترنم کی وجہ سے بال گندھرو ڈرامہ کے ہر منظر میں حاوی نظر آتے تھے۔ بہت سے ڈرامہ نویسوں، خصوصاً شری کے پی کھاڈلکر کے لئے آپ حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنے تھے۔ بال گندھرو نے "ناٹیہ" کو اپنی شیریں آواز سے اس زمانے میں تھیٹر کے شائقین کے لئے دل موہ لینے والی ہوتی تھی) امر بنادیا تھا۔ اسی بنا پر آپ کا دور مراٹھی اسٹیج کے لئے ایک سنہری دور کہا جاتا ہے۔ بال گندھرو جنھوں نے مراٹھی اسٹیج کو بام عروج پر پہنچایا ہے، آج بھی رہنما اور روشن مینار کی طرح ہیں۔ میں اس عظیم گلوکار کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ خصوصی نمبر بال گندھرو اور ان کے دور کے سنہرے ایام کی یاد تازہ کر دے گا۔

پروفیسر رام میگھے

وزیر برائے ثقافتی امور

وزیر مملکت برائے ثقافتی امور کا

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ ریاستی حکومت "بال گندھرو" کی جنم شتابدی کے موقع پر "قومی راج" کا خصوصی نمبر شائع کر رہی ہے۔

بال گندھرو کی حیثیت مراٹھی اسٹیج کے تاج میں ایک ہیرے کی سی تھی۔ ان کے کلاسیکل گائن اور اداکاری نے نہ صرف لاکھوں عوام کے دلوں کو جیتا بلکہ اسٹیج اور تھیٹر کے وقار کو بلند کیا۔ انھیں اسٹیج پر اداکاری کرتے ہوئے دیکھنا ایک بڑے فخر کی بات تھی۔

بال گندھرو کی جنم شتابدی تقریبات بڑے پیمانے پر منائی جا رہی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ شمارہ بال گندھرو کی ادبی و فنی صلاحیتوں کو بہترین ڈھنگ سے خراجِ عقیدت پیش کرے گا نیز یہ شمارہ بال گندھرو کی مختلف صفات کو بہترین ڈھنگ سے اجاگر بھی کرے گا۔

اشوک پاٹل

وزیر مملکت برائے ثقافتی امور

وزیرِ مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ

ریاستی حکومت، مشہور و معروف اداکار، گلوکار آنجہانی نارائن راؤ راج ہنس عرف 'بال گندھرو' کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر "قومی راج" کا ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہی ہے۔ 'بال گندھرو' نے اپنی ہمہ جہت، پرکشش شخصیت کے سبب نہ صرف مہاراشٹر میں بلکہ پورے ملک اور دنیا کے دیگر ممالک میں اپنے شائقین پیدا کر لیے تھے۔ آج بھی ایک نسل کو بال گندھرو کی اعلیٰ اداکاری بخوبی یاد ہے۔ بال گندھرو کے ڈرامے اور "محفل" کی یاد تھیٹر کے شائقین کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔

سوبھدرا نامی ڈرامہ تو بہت ہی زیادہ مقبولِ عام ہوا تھا۔

" मम सुखाचि ठेव, देवा, तुम्हा पाशी ठेवा "

تو امر بن چکے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ بصیرت افروز ہوگا اور "قومی راج" کے سابقہ خصوصی شماروں کی طرح اسے بھی محفوظ کر لیا جائے گا اور یہ آنے والی نسلوں کے لئے رہنما بن جائے گا۔

اس عظیم اداکار کو میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر) سری کانت جچکار

وزیرِ مملکت برائے اطلاعات و رابطۂ عامہ حکومت مہاراشٹر
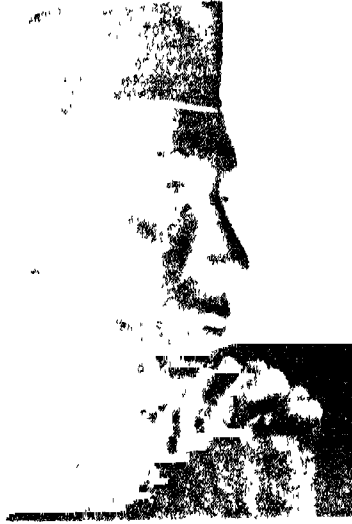
ہندوستان کو اپنے ماضی کی بہت سی باتوں سے ناطہ توڑنا ہوگا اور یہ احتیاط کرنی ہوگی کہ وہ حال پر مسلط نہ ہو جائیں۔ ہماری زندگی ماضی کی بہت سی بے کار باتوں کے بوجھ سے گراں بار ہو رہی ہے اور اب ان سب چیزوں کو جو غیر ضروری ہو چکی ہیں ترک کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ منشا نہیں کہ ہمیں ماضی کی حیات بخش روایات کو بھی بھلانا یا نظر انداز کرنا ہوگا۔

ہماری قوم نے جن مقاصد کی پرستش کی ہے۔ ہم نے مختلف زمانوں میں جو خواب دیکھے ہیں، عہدِ قدیم کے لوگوں کی دانائی اور فراست، اپنے آباء و اجداد کی اولوالعزمی، فطرت اور زندگی سے ان کی محبت، ان کا ذہنی تجسس، ان کے تخیل کی بلندی، ادب، آرٹ اور تمدن کی دنیا میں ان کے کارہائے نمایاں۔ حسن، سچائی اور آزادی سے ان کا لگاؤ، ان کی بنائی ہوئی زندگی کی بنیادی قدریں، زندگی کے رازہائے سربستہ سے ان کی واقفیت، اپنے سے مختلف خیالات کے رکھنے والوں کے ساتھ ان کی رواداری، دوسری قوموں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت اور ان کے تمدنی کارناموں کو اپنے تمدن میں سمو کر ایک نئے کلچر کی پرورش کا حوصلہ ہم ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ ہم ان بیشمار تجربات کو بھلا دیں جنھوں نے ہماری پرانی تہذیب کی تعمیر میں مدد دی ہے اور جو آج بھی ہمارے تحت الشعور کا حصہ ہیں۔ ہم انھیں کبھی نہیں بھولیں گے اور ماضی کی اس شاندار وراثت پر ہمیں ہمیشہ فخر رہے گا۔ ہندوستان نے اگر انھیں بھلا دیا تو پھر ہندوستان ہندوستان نہیں رہے گا اور آج ہم جن باتوں پر فخر اور مسرت کرتے ہیں، ان میں سے بہت سی باتیں ہم کھو بیٹھیں گے۔

ہمیں ان باتوں سے نہیں بلکہ زمانے کے

نبار سے نجات حاصل کرنی ہے جس
بستان کے اصل حسن کو اور اہمیت
یا ہے اور ان آلائشوں اور غلط
ے جس نے اس کی روح کو مسخ کر دیا
ی آزادی سلب کر لی ہے اور اس
کو روک دیا ہے ۔ ہمیں ان حسن و
یانت کرا ہے پیش رووں کی فراست
ے علم کے خزانوں کو از سر نو دریافت
راس کو موجودہ احوال کے مطابق
۔ ہمیں فکر و عمل کی روایتی پابندیوں
ری حاصل کرنا ہے جنھوں نے ہمیں
یقیناً بہت سا نفع پہنچایا ہے لیکن
یا نہ حال میں ان کی افادیت باقی
۔ ہمیں بنی نوع انسان کے تمام
کو اپنا لینا ہے ۔ اور پھر دوسرو
تسخیر فطرت کی اس عظیم الشان مہم
ریک ہونا ہے جس کا بیڑا انسان
ا ہے اور جو اس زمانے میں ماضی کی
ں زیادہ ولولہ انگیز ہو گئی ہے کیونکہ
رجد قومی سرحدوں اور جغرافیہ
تسیموں سے آزاد ہو کر سارے
بنے والے انسانوں کی مشترک
ن چکی ہے ۔ ہمیں سچائی حسن اور
ے اس جذبے کو پھر سے بیدار
جو زندگی میں معنی پیدا کرتا ہے اور
ہ اپنے اندر قوت عمل اور اولوالعزمی
ہے جو گذرے ہوئے زمانے میں

ل کے ان ممتاز پیش رووں کی
لتی جنھوں نے ان مضبوط اور
ودوں پر ہماری تہذیب کی عمارت
۔ ہمارا ایک بہت بڑی نسل سے
اور انسانی تاریخ اور انسانی جدو
ماز کی پرانی داستانیں ابھی تک

ہماری یاد میں محفوظ ہیں لیکن ہمیں زمانۂ حال کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بار پھر جوان ہونا ہے ۔ اپنے اس شان کے ساتھ کہ ہم میں شباب کا وہ احساس فتحمندی ہو جو حال سے مسرت حاصل کرتا ہے اور مستقبل کے بارے میں ایک غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے ۔

اگر دنیا میں سچائی کا بحیثیت ابدی حقیقت کے کوئی وجود ہے تو اس حقیقت کو دائمی، لازوال اور کبھی نہ بدلنے والی حقیقت ہونا چاہئے لیکن انسان کے محدود دماغ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس لامحدود، دائمی اور غیر فانی حقیقت کا پورا پورا احاطہ کرے ۔ انسان تو زیادہ سے زیادہ اس کے کسی ایک پہلو کو سمجھ سکتا ہے اور یہ واقفیت بھی زمان و مکان کے حدود اور اس خاص زمانے میں انسان کی ذہنی ارتقا اور اس عہد کے مخصوص تصورات کی پابند ہوتی ہے ۔ جیسے جیسے ذہنی طاقت بڑھتی ہے اور انسانی دماغ کی غور و فکر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور پرانے تصورات بدلتے ہیں ۔ اس حقیقت کا اظہار نئی علامتوں کے ذریعے کیا جاتا ہے اور اس کے نئے پہلو بھی نظر کے سامنے آتے ہیں ۔ خواہ اس کی بنیادی حقیقت وہی رہے لہذا حق کی تلاش ہمیشہ جاری رکھنی ہوتی ہے، اس کو ہمیشہ از سر نو دریافت کرنا ہوتا ہے ۔ اس میں ترمیم اور ترقی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تاکہ عام انسانی ذہن میں اس کا جو تصور قائم ہو وہ اس کے فکر اور اس کی زندگی کے ارتقا سے ہم آہنگ ہو تب یہ حقیقت انسانیت کے لئے زندہ صداقت بن جاتی ہے اور اس کی اہم ترین ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور حال اور استقبال میں ہماری رہنمائی کے فرائض انجام دے سکتی ہے ۔ لیکن اس صداقت کے کسی ایک پہلو کو ایک اٹل عقیدے کا رتبہ دے کر اسے پتھر کی طرح جامد بنا دیا جائے تو اس میں ارتقا کا امکان باقی نہیں رہتا اور یہ صداقت انسانیت کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے پاتی ۔ اس کے دوسرے پہلو پوشیدہ رہتے ہیں اور وہ آنے والی نسلوں کے ضروری سوالات کا حل نہیں پیش کر سکتی ایسی حالت میں اس سچائی میں حرکت اور تبدیلی کے بجائے جمود آ جاتا ہے ۔ اس میں کوئی حیات بخش عنصر باقی نہیں رہتا بلکہ وہ ایک بے جان اور رسمی چیز بن کر رہ جاتی ہے ۔ جو انسانیت اور انسانی ذہن دونوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے بلکہ اب لوگ اسے اس حد تک بھی نہیں سمجھ پاتے جس طرح پچھلے لوگ اسے سمجھتے تھے ۔ جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا اور اسے اس عہد کی مخصوص زبان اور اصطلاحات میں پہلے پہل ظاہر کیا گیا تھا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں ماحول بدل چکا ہے ۔ ذہنی فضا مختلف ہو جاتی ہے، نئی سماجی عادتیں اور نئے رسوم رواج پا جاتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں پرانی تحریروں کا مفہوم سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، ان کی روح کا پتہ لگانا اور بات ہے پھر جیسا کہ اروبندو گھوش نے کہا ہے ۔ ہر حقیقت خواہ اس میں کتنی ہی سچائی ہو دوسری حقیقتوں سے الگ ہو کر جو بیک وقت اس کا دائرہ محدود اور اس کی تکمیل بھی کرتی ہیں، انسان کے ذہن کو پابند کر دینے کے لئے ایک جال اور ایک گمراہ کن عقیدہ بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ در اصل ان تمام حقائق سے مل کر ایک مکمل حقیقت تیار ہوتی ہے

قومی راج

اور اس بنا پر اس کا ایک تاگہ بھی الگ کرنا مناسب نہیں۔

مذاہب نے انسانی زندگی کے ارتقا میں بہت مدد دی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کی اخلاقی قدریں اور معیار متعین کیے ہیں اور انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے اصول وضع کیے ہیں لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مذاہب نے سچائی کو بعض خاص شکلوں اور عقیدوں کے اندر مقید کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسے رسم و اعمال کی سرپرستی کی ہے جو جلد اپنی اہمیت کھو بیٹھتے اور محض ایک معمول بن کر رہ جاتے ہیں۔ مذہب نے انسان کے دل میں زندگی کے رازہائے سربستہ کا خوف بٹھا کر نہ صرف اسے ان جانی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش سے باز رکھا ہے بلکہ ان دقتوں کو بھی حل کرنے سے روکا ہے جو سماجی جد و جہد کی راہ میں حائل ہیں۔ ذہنی تجسس اور غور و فکر کا مادہ پیدا کرنے کے بجائے مذہب نے فطرت، مروجہ مذہبی عقائد اور موجودہ سماجی نظام غرض ہر اس چیز کے سامنے سر جھکا دینے کی تلقین کی ہے جو رائج ہے۔ ایک ایسی مافوق الفطرت قوت کے وجود پر ایمان رکھنے کی وجہ سے جو ہر چیز پر حکمراں ہے۔ سماجی فرائض کی ذمہ داری کی طرف سے ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا ہو گیا ہے اور اس طرح جذبات اور جذباتیت نے دلیل و حجت اور تحقیق و تفتیش کی جگہ لے لی ہے۔ اگرچہ مذہب نے بے شمار آدمیوں کے دل کو سکون بخشا ہے اور اس طرح مذہبی قدروں کی وجہ سے سماجی نظام میں استحکام پیدا ہوا ہے۔

لیکن اس نے تغیر اور انقلاب کے ان رجحانات کی مزاحمت بھی کی ہے جو انسانی نظام کا ایک لازمی عنصر ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے دورۂ سیلون (سری لنکا) کی ایک یادگار تصویر جب آپ اپنی اہلیہ اور اپنی صاحبزادی (شریمتی اندرا گاندھی) کے ہمراہ تحریک آزادی کے دوران تشریف لے گئے تھے۔

فلسفے نے ان بہت سی کمزوریوں سے اپنا دامن بچا کر رکھا ہے اور تحقیق و تجسس کی ہمت افزائی کی ہے لیکن فلسفی عموماً انسانی زندگی سے الگ تھلگ اپنے ایک گوشۂ عافیت میں مست رہتے ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ ماسی قدروں پر لگی ہوتی ہے۔ وہ انھیں انسانی زندگی سے ربط دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ منطق اور حجت اس کے رہنما تھے اور ان کی مدد سے اس نے بڑی ترقی کی ہے لیکن منطق تمام تر ذہن کی پیداوار ہوتی تھی۔ اسے زندگی کے حقائق سے لگاؤ نہ ہوتا تھا۔

سائنس نے انسانی زندگی کے اساسی مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنی نظر بعض حقائق پر جما دی۔ اس نے دنیا کو بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع بہم دیا۔ ایک نظر کو خیرہ کرنے والے تمدن کی تعمیر کی۔ علم کی نئی راہیں کھول دیں اور انسان کی طاقت میں اتنا اضافہ کیا کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ احساس اسے پیدا ہوا کہ وہ اپنے طبعی ماحول کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور اس کو حسب مرضی شکل دے سکتا ہے۔ انسان نے گویا ایک ارضیاتی طاقت کی حیثیت اختیار کر لی جو زمین کو کیمیائی طبعی اور دوسرے طریقوں سے بدلتی رہتی ہے لیکن جب زندگی کا کل کارخانہ بظاہر اس کے قبضۂ قدرت میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو حسب خواہش ترمیم و تغیر کرے تو اس وقت یہ احساس ہوا کہ سائنس میں کوئی زبردست کمی ہے اور اس سے کوئی اہم عنصر مفقود ہے۔ سائنس کو اس کا کچھ علم نہ تھا کہ زندگی کا بنیادی مقصد کیا ہے یا اس کے فوری مقاصد ہی کی کیا نوعیت ہے کیونکہ سائنس

گی کے متعلق ... میں کچھ معلوم نہیں
جس کا انتدا نفرت کے عناصر پر اتنا
زوا پنے اوپر دباؤ برداشت کر سکا اور اس
یا تھا۔ وہ اس کے قابو سے باہر ہو گیا
نیات اور اس طرح کے دوسرے
تحقیقات، حیاتیات اور طبعیات

سے انسان کو خود کو سمجھنے اور خود پر
مدد ملے یا ممکن ہے کہ قبل اس کے
کی ترقی انسانی زندگی پر کافی اثر ڈال
بنائی ہوئی تہذیب و تمدن کو تباہ
لے اور پھر ایک نئی تہذیب کی بنیاد

کو ترقی کا موقع دیا جائے تو وہ
سکتی ہے لیکن سائنس کا طریق کار
ہر طرح کے انسانی تجربے کی تفسیر میں
دے سکتا اور نہ اس دائرے
عبور کر سکتا ہے جو آج ...
... ہوئے ہیں۔ فلسفے کی مدد
نس کچھ اور آگے بڑھ اور راز ہا
... کوشش کرنے کی جرأت کرے
فہ اور سائنس دونوں کام نہ آسکیں
دراک کی ان دوسری طاقتوں پر
ہو گا جو ہمیں فطرت کی طرف سے ملی ہیں
ہا ہے کہ انسانی دماغ کی ساخت
عقل ... اس حد سے آگے نہیں
یک فرانسیسی مفکر پیسکل کا قول ہے
انتہائی رسائی اس حقیقت کا
ہے کہ دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں
سترس سے باہر ہیں۔ اگر یہ ... تمام
پہنچ ... ناقص ہے۔
ں اور سائنس کے منہاج کے محدود
س ... باوجود ہمیں ان کو
سے اپنے ہاتھ سے رد کرنا چاہئے کیونکہ
بنیاد اور پس منظر کے بغیر کسی قسم کی

سچائی یا حقیقت کا ادراک ممکن نہیں۔ سچائی کے
ایک حصے کو سمجھ لینا اور اس سے اپنی زندگی میں
کام لینا اس سے کہیں اچھا ہے کہ ہم کچھ نہ سمجھیں
اور رازہائے سربستہ کو حل کرنے کی لاحاصل
سعی میں بے کار غوطے لگاتے رہیں۔ آجکل
دنیا کے تمام ملکوں اور تمام قوموں کے لئے سائنس
سے کام لینا ناگزیر اور ضروری ہے لیکن محض
سائنس سے عملی فائدہ اٹھانا کافی نہیں۔ سائنٹفک
طور پر مسائل کو جانچنا سائنس کے تنقیدی اور
معروضی پسند مزاج کی شناخت، نئے علوم اور نئے
حقائق کی تلاش، تجربے اور مشاہدے کے بغیر
کسی چیز کو تسلیم نہ کرنا، نئی شہادت کے پیش نظر
پرانے نتائج کو ترک کر دینے کی صلاحیت خود ساختہ
نظریات کے بجائے مشاہدہ کئے ہوئے واقعات
پر بھروسا کرنا، ذہن و دماغ کی عملی تربیت۔ یہ
سب باتیں بھی ضروری ہیں۔ محض سائنس کے عملی
اطلاق کے لئے نہیں بلکہ خود زندگی اور اس
کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے آج بہت
سے سائنسدان جو سائنس کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں اپنے
مخصوص دائرہ سے باہر نکل کر یہ سب کچھ بھول جاتے
ہیں علمی مزاج اور مسائل زندگی کی جانب ایک
بے لاگ سائنٹیفک رویہ اختیار کرنے سے
سائنسدانوں میں زندگی کا ایک خاص ڈھنگ،
سوچنے کا ایک خاص انداز اور ساتھی انسانوں سے
ملنے جلنے اور ان کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ایک خاص
طرز عمل بن جانا چاہئے۔ یہ ایک بہت بڑا مطالبہ ہے
اور اس میں شبہ نہیں کہ ہم میں سے بہت کم
لوگ ہیں جو کسی حد تک بھی اس کو پورا کر سکتے ہیں
لیکن یہ اعتراض تو فلسفہ اور مذہب کے بتائے
ہوئے تمام قوانین پر بھی اتنا ہی یا اس سے بھی
زیادہ صادق آتا ہے۔ کم سائنٹفک نقطہ نظر
اس راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ... انسان
کو لینا چاہئے۔ یہ ایک آزاد انسان کا راستہ ہے
ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم ایک سائنٹفک

... دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن نہ تو عوام
میں نہ ان کے لیڈروں میں مجھے اس مزاج کا وجود
نظر آتا ہے جو سائنس کا تقاضہ ہے۔
سائنس خود تو ثبت علم کی مملکت سے تعلق
رکھتی ہے لیکن تاہم سائنس جس طرح کے ذہن و دماغ
کی متقاضی ہے اس سے ان حدود سے آگے
بھی کام لیا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کے
بنیادی مقاصد علم حاصل کرنا، سچ کی تلاش
اور حسن اور نیکی کی قدر پہچاننا ہے۔ سائنس کے
معروضی طریق کار کا ان مسائل پر اطلاق نہیں
ہو سکتا اور زندگی کے اور بھی بہت سے اہم گوشے
اس کی قلمرو سے باہر نظر آتے ہیں مثلاً آرٹ
اور شعر کے حسن کا احساس یا حسن کو دیکھ کر جو جذبات
دل میں ابھرتے ہیں۔ یا نیکی کا اندرونی احساس
ممکن ہے کہ علم نباتات اور حیوانیات کے
ایک ماہر کو فطرت کے حسن اور رنگ کا کبھی

احساس ہی نہ ہو اور عمرانیات کا ماہر انسانیت کی محبت کے جذبے سے یکسر عاری ہو لیکن اگر ہم اس اقلیم میں بھی جائیں جہاں سائنس کا طریق کار کام نہیں دیتا اور ان دشوار گذار اور بلند ذہنی منزلوں تک پہنچیں جہاں فلسفے کی حکمرانی ہے جہاں ہمارے دل اعلیٰ جذبات سے لبریز ہوتے ہیں، یا جہاں ہم ماورائے حیات پر یا اپنی پر نظر ڈالتے ہیں تب بھی ان سب مسائل کے لئے سائنس کا نقطۂ نظر اور سائنٹفک مزاج دونوں ضروری ہیں۔

مذہب کا طریق کار اس سے بالکل مختلف ہے چونکہ اس کے پیشِ نظر زیادہ تر زندگی کے وہ گوشے ہیں جن میں معروضی تفتیش کا طریق کار کام نہیں دیتا اس لئے اس کا دارومدار زیادہ تر جذبات اور وجدان پر ہے اور پھر مذہب ان ہی سے زندگی کے ہر مسئلے میں۔ یہاں تک کہ ان سوالات کے حل کرنے میں بھی جو ذہنی تفتیش اور مشاہدے کے لئے موزوں ہیں کام لیتا ہے۔ منظم مذہب دینیات کا سہارا لے کر بعض اوقات روحانی مسائل کی نسبت اپنے خاص مفاد کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے اور ایسا ذہنی ماحول پیدا کر دیتا ہے جو سائنس کے مزاج کے بالکل منافی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے تنگ نظری اور تعصب، اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی، جذباتیت اور غیر عقلیت پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کا ذہن تنگ اور محدود ہو جاتا ہے اور فرد میں آزادی اور خود اعتمادی باقی نہیں رہتی۔

بعض روحانی باتوں پر اعتماد ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ انسان کی مثال ایک بے بادبان کشتی کی سی ہو جاتی ہے اور زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہتا۔ خدا پر ہمیں ایمان ہو یا نہ ہو لیکن ایک چیز پر ایمان ناگزیر ہے خواہ ہم اسے ایک تخلیقی حیات بخش قوت، کا نام دیں، یا اسے مادّے کی وہ قوت سمجھیں جو اس کو از خود حرکت، تبدیلی اور ارتقا کی صلاحیت بخشتی ہے یا کوئی اور نام دیں۔ ایسی کسی چیز کا وجود اتنا ہی حقیقی ہوتا ہے جتنی موت کے مقابلے میں زندگی حقیقی ہے اگرچہ وہ بہت مبہم اور گریز پا بھی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم سب کسی ان دیکھے دیوتا کی عبادت ضرور کرتے ہیں، اور اس کے سامنے قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ خواہ یہ معبود تصوری یا ذاتی یا قومی، یا بین الاقوامی یا کوئی دور دراز مقصد جو ہمیں اپنی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے، ایک مکمل انسان اور کسی بہتر دنیا کا مبہم سا تصور ہو۔ شاید ہم کبھی کمال تک نہیں پہنچ نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے اندر ایسی کوئی طاقت کوئی جذبہ ضرور ہے جو ہمیں آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے اور ہم نسلاً بعد نسلٍ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔ جوں جوں علم ترقی کرتا ہے محدود معنی میں مذہب کا دائرہ گھٹتا جاتا ہے۔ زندگی اور فطرت کے متعلق جس قدر ہماری واقفیت بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی فوق فطری اسباب کی کم تلاش کرتے ہیں کیوں کہ ہم جس چیز کو سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر قابو پا لیتے ہیں وہ ہمارے لئے راز نہیں رہ جاتی۔ ایک زمانے میں زراعت کے مشاغل، ہماری غذا، ہمارا لباس، ہمارے سماجی تعلقات سب مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے زیر نگیں تھے۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں مذہب کے اقتدار سے باہر نکل گئیں اور اب علمی مطالعے کا موضوع بن چکی ہیں لیکن اب بھی مذہبی اعتقادات اور اوہام ان میں سے بہت سی باتوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور زندگی کے بنیادی راز اب بھی انسانی دماغ کی سطح سے بلند ہیں اور شاید ہمیشہ رہیں گے لیکن زندگی کے کتنے ہی راز ایسے ہیں جو حل ہو سکتے ہیں۔ اور جنھیں حل کرنا ضروری ہے ایسی صورت میں زندگی کے بنیادی راز کو حل کرنے کی خواہش

محمود راہیؔ

معرفت انقلاب (اردو ڈیلی)
۱۵۶ ڈی۔ تاردیو بمبئی ۳۴

یادِ ماضی کے جھروکوں سے اترنے والا
ایک الہام ہے ہر نقش ابھرنے والا

تیرگی صحنِ چمن کی ہے کہاں تک پہنچی
کوئی اٹھے تو ذرا روشنی کرنے والا

اس کی تصویر بھی ہو گی مرے آئینے میں
کس قدر غور سے دیکھے ہے سنورنے والا

ناخدا پہلے خود اندازۂ طوفاں کر لے
یہ سفینہ نہیں انجام سے ڈرنے والا

نفسا نفسی ہے یہاں حشر کا میدان بپا
جیسے عالم کا ہو شیرازہ بکھرنے والا

کہہ رہی یہ خموشی سے صلیبِ عیسیٰ
زندہ رہتا ہے ہمیشہ یہاں مرنے والا

لذتِ دردِ مے دیدۂ تر سے راہیؔ
زخمِ دل پوچھتا رہتا ہے ابھرنے والا

ماغ پر ہر وقت مسلط رہنا نہ ضروری معلوم
ہے اور نہ مناسب۔ زندگی ہی اب بھی
رنگ دنیا کا ... ہمیں دعوت نظارہ دیتا ہے
س میں ہر سوز نت، نئی دریافتوں کا ولولہ انگیز
ط بھی ہے۔ نئے نئے مرحلے اور نئی زندگی
کرنے کے نئے ڈھنگ نظر کے سامنے
تے جاتے ہیں جن سے زندگی میں زیادہ
ئی پیدا ہوتی ہے اور وہ زیادہ ... ب
مکمل بن جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے
ہم اپنی زندگی بسر کرنے میں سائنس کے مزاج
ان کے مخصوص نقطہ نظر سے کام لیں۔
ن اس کے ساتھ فلسفے کا امتزاج بھی ہو۔
ان تمام چیزوں کا احترام جو ہماری سمجھ سے
ہیں۔ اس طرح شاید ہم زندگی کا ایک ایسا
تصور بنا سکیں جس کی وسعت میں مادی اور
دونوں کے لئے گنجائش ہو اور جو زندگی کی
بیاں اور گہرائیوں کا احاطہ کر سکے۔ اور مستقبل
ر، اطمینان کامل کے ساتھ دیکھ سکے۔ زندگی
گہرائیاں موجود ہیں جنھیں ہم نظر انداز نہیں
کر سکتے۔ اور جہاں اس میں حسن اور خوبصورتی
کا وجود ہے وہاں دکھ درد اور مصیبتیں بھی اس
کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی رنج و
مسرت کا ایک عجیب مجموعہ ہے لیکن انسان
انہی کے سہارے نئے سبق سیکھ سکتا ہے
اور ترقی کر سکتا ہے۔ روح کی کلفت ایک
بڑی المناک چیز ہے جس میں انسان بالکل
تنہا ہوتا ہے۔ بیشک بیرونی واقعات اور
ان کے نتائج ہم پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں
لیکن سب سے زیادہ دھچکہ ہماری طبیعت
کو اپنے اندرونی خوف اور ذہنی کش مکش
سے لگتا ہے جہاں ہمیں مادی دنیا میں
ترقی کرنا ضروری ہے کیونکہ اس پر ہمارے
بقا کا دارومدار ہے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے
کہ ہمارے دلوں میں شانتی ہو اور ہم اپنے
ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کریں۔ ایسی ہم آہنگی
جو نہ صرف ہماری جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پیدا کرنے بلکہ
ساتھ ہی ان اندرونی تخلیقی خواہشات کی تکمیل
کا بھی سامان فراہم کرے جو اس وقت سے
انسان کے لئے باعث امتیاز رہی ہیں جب
سے اس نے فکر و عمل کی وادی میں اپنا
سفر شروع کیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس سفر
کا کوئی آخری مقصد ہے یا نہیں لیکن اس سفر
کی کلفتوں کا بدل بھی ہے اور اس میں بہت سے
ایسے قریب کے مقاصد بھی نظر کے سامنے
آجاتے ہیں جنھیں ہم جلد حاصل کر سکتے ہیں اور
جو بعد میں آگے بڑھنے کے لئے ایک نقطۂ آغاز
بنتے ہیں۔

مغرب میں سائنس کی حکمرانی ہے اور ہر آدمی
سائنس کا کلمہ پڑھتا ہے لیکن وہ ابھی تک
اپنے اندر سائنس کا حقیقی مزاج پیدا نہیں
کر سکا۔ اسے ابھی مادہ اور روح کے مطالبات
میں تخلیقی ہم آہنگی پیدا کرنی ہے۔ ہندستانیوں
کو ابھی بعض باتوں میں بہت دور جانا ہے۔
لیکن ہمارے سفر میں شاید بڑی بڑی رکاوٹیں
کم ہوں گی کیونکہ ہندستانی فلسفے کی بنیاد
دآخری دور کے مظاہر کو چھوڑ کر) سیکڑوں
برس سے ایسی رہی ہے کہ وہ سائنس کے اس
مزاج اور نقطۂ نظر اور بین الاقوامیت کے موجودہ
تصور کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس کی بنیاد
سچ کی بے باکانہ تلاش، تمام انسانوں کی
یک جہتی، تمام جانداروں کے احترام اور فرد اور
جماعت کی آزاد اور مشترک ترقی پر رکھی گئی ہے
تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ آزادی اور ترقی حاصل
کر سکیں۔

★

پنڈت جواہر لال نہرو

ہندوستان کے مثالی رہنما

جس وقت لارڈ ایٹلی نے ہندوستان کی آزادی کا بل برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا تو مسٹر چرچل نے حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے ایک تقریر کی تھی جسے نکتہ چین معترضین اپنی دلیلوں کو مناسب بتلانے کیلئے آجکل دہراتے رہتے ہیں۔ مسٹر چرچل نے کہا تھا کہ ہندوستان کے لیڈر جو ہندوستان کی ریاستوں کے حکمراں بننے والے ہیں۔ نا قابل، غیر تربیت یافتہ اور غیر مہذب ہیں۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے ایسے لیڈران بہت جلد ہندوستانی ریاستوں کو ابتری میں مبتلا کر دیں گے۔ بحثیت ۱۹۴۶ء میں بحیثیت سیاست داں کے مسٹر چرچل کا عالمی سیاست داں بہت احترام کرتے تھے۔ انھوں نے مسٹر ایٹلی کے پیش کردہ بل کی مخالفت کی تھی۔

اگر ہم ان لوگوں کا جائزہ لیں جو آزادی ہند کی تنظیم کرنے والوں میں سے تھے تو دنیا کے مشاہدہ کرنے والوں میں سے ہر کوئی یہ کہہ اٹھے گا کہ ہندوستانی لیڈران اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور کہ انھیں اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں اونچا مقام حاصل تھا۔ کئی ایک لیڈر بیرسٹر تھے اور ہندوستان کی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کیا کرتے تھے۔ بعض پیشہ ور صحافی تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ طبی ڈاکٹروں اور کالجوں کے پروفیسروں نے بھی آزادی ہند کے دھارے میں شرکت اختیار کر لی تھی میری باتیں صرف کانگریس پارٹی کے لیڈروں کے بارے میں نہیں ہیں کیونکہ یہ باتیں تمام پارٹیوں پر صادق آتی ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی پارٹی سے رہا ہو اور ان کے سیاسی انقلابات کی نوعیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو ان لیڈروں کا تعلق ہندوستانی سماج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ پیشہ ور گروہوں سے تھا۔ لہٰذا برطانوی پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل کا یہ بیان واقعی تعجب خیز تھا کہ ہندوستان

ڈاکٹر سری کانت جیکار
وزیر مملکت برائے جنرل ایڈمنسٹریشن
اطلاعات و رابطۂ عامہ انرجی مالیات و میزبانی

مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو

ے قومی لیڈروں میں ہندوستان کو سنبھالنے
لی ضروری صلاحیت نہیں ہے۔

قومی تحریک کی نمایاں صلاحیت رکھنے
والے لیڈر کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال
نہرو کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی دماغی
صلاحیت کامل و اکمل تھی۔ اس کا اندازہ
ین عظیم ذرائع و وسائل سے لگایا جا
سکتا ہے اولاً اس تاریخ عالم سے جس میں
انسانی سماج سے تعلق رکھنے والے دنیا کے
ہر گوشے کی نمایاں تاریخی شخصیتوں کی
جھلکیاں ہیں یعنی وہ مشہور کتاب

" GLIMPSES OF THE WORLD HISTORY "

" عالمی تاریخ کی جھلکیاں" جسے پنڈت
جواہر لال نہرو نے تصنیف کی۔ دوسرے

"DISCOVERY OF INDIA"

" تلاش ہند" جس میں انھوں نے ہندوستان
کی ثقافتی، سماجی اور سیاسی تاریخ پر
اپنے مطالعات کی روشنی میں تبصرہ کیا
ہے۔ تیسرے ان کی خود نوشت سوانح حیات
جو ادبیات کا ایک حصہ ہے ان کے مطالعات
اور نظریات کو انقلاباتِ عالم کے انقلابات
کی روشنی میں غیر متعصبانہ نقطۂ نظر سے
جانچئے۔ ہم پنڈت نہرو کا مقابلہ یونیورسٹی
کے پروفیسروں اور بعض امور میں تخصص
رکھنے والوں سے نہیں کرنا چاہتے جنھوں
نے لائبریریوں میں بیٹھ کر اپنی کتابیں
تصنیف کیں۔ ہمیں مقابلۃً ان لوگوں کو
پیش کرنا چاہیے جو انقلابی لیڈر ہونے کے
لحاظ سے ان کے ہم عصر تھے اور جنھوں نے
سیاسی میدانوں اور سماجی امور میں تحریکوں
کی تنظیم کی۔ حالیہ تاریخ عالم میں سیاسی لیڈروں کی
اکادمی تحصیلات کے چوکھٹے میں اگر جانچ
کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ پنڈت نہرو
کسی بھی ملک کے کسی بھی لیڈر پر سبقت لے
جائیں گے۔ کاش ایسا کوئی اٹھے جو اوپر مذکور
میرے تصورات کو جھٹلا سکے۔ کوئی سیاسی
لیڈر ایسا نہیں ہے جس نے قومی آزادی کی
تحریک میں رہ کر اتنی کتابیں لکھی ہوں۔ بنیادی
طور پر پنڈت نہرو یونیورسٹی کے سائنس کے
طالب علم تھے تاہم سیاسی تحریک میں انھوں
نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ عالمی معاملات
میں وہ خود اپنے دماغ سے کام لیں۔
" تاریخ عالم کی جھلکیاں " اور " تلاشِ
ہند " انھوں نے تصنیف کیں جس سے
ان کی ذاتی سرگرمیوں کا فلسفیانہ انداز میں
انکشاف ہوتا ہے اس لئے میرا اعتقاد ہے
کہ ان تعلیمی امور میں وہ بہت فائق تھے اور
دنیا کے سیاسی لیڈروں میں اس لحاظ سے
ان کا کوئی ثانی نہیں۔

پنڈت نہرو سوسائٹی میں خوشحال
خاندانوں کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں
ان کے والد برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں
ان کی تعلیم کو بڑھاوا دینے اور پیشہ ورانہ
مہارت حاصل کرنے میں مدد کر سکتے تھے انھوں
نے اکادمی روشنی کے تجربات مغربی تہذیب
سے حاصل کئے اور یہ ان کے لئے مغربی تہذیب
سے واقف ہونے کا پہلا موقعہ تھا۔ اس وقت
آپ کی والدہ مسز کملا نہرو علاج کے لئے
سوئزر لینڈ میں تھیں اسی وجہ سے پنڈت
نہرو یورپی ملکوں کا رخ کیا کرتے تھے
واقعات کی تاریخوں کو ملانے سے معلوم ہوتا
ہے کہ انھوں نے اس بات کی ضرورت محسوس
کی کہ ہندوستانی لیڈروں اور یورپی دانشوروں
کے درمیان تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا
کئے جائیں۔ سوشلسٹ تحریکیں یورپ کے متعدد
ملکوں میں اس وقت جاری تھیں۔ مارکسزم

نے ان کی فلاسفی اور سیاسیات پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ سوویت انقلاب سے سوشلزم کے نئے دور کا پرچم لہرانے لگا۔ اس دھندلکے میں مستعمراتی (کالونی بنائے گئے) ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کے بارے میں صورت حال واضح کم اور ابتر زیادہ رہی۔ بہت سے اشتراکی لیڈروں نے مستعمراتی ملکوں میں آزادی کی تحریک کی تائید نہیں کی اس سے اکیلے لینن ہی مستثنیٰ تھے اس پہلو کی وضاحت میں نے اپنے ایک مضمون میں کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ کے دانشمند لیڈروں سے خط و کتابت کرنا اور انھیں صورت حال سے مطمئن کر کے ہندوستان کی تحریک آزادی کے لئے فلسفیانہ اور سفارتی تائید و تعاون حاصل کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ پنڈت نہرو نے انگلستان اور یورپی ملکوں میں اپنے قیام کے دوران اس منظر کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ کرشنا مینن نے بین الاقوامی صورت حال کے اس پہلو کو واضح کرنے اور راہ عمل تجویز کرنے میں پنڈت نہرو کی کافی مدد کی۔ اگر ان امور پر مشتمل مجموعے کو اور خط و کتابت اور مختصر لکھے گئے نوٹس پر کوئی شخص نظر ڈالے تو کرشنا مینن تاریخ عالم کے فلسفیانہ موضوع پر ایک ہی نظریہ رکھتے تھے۔ کرشنا مینن نے نہرو کی طرح یورپ کے بہت سے سیاست دانوں سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ اس طرح ان دونوں شخصیتوں میں سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو بین الاقوامی سطح پر واضح کیا۔ برطانوی ہفتہ وار گارڈین خاص طور سے نہرو کے خیالات پر تبصرہ کرنے میں ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا۔ یہ بھی جانی ہوئی بات ہے کہ کرشنا مینن ہفتہ وار گارڈین میں نہرو کے لئے حالات کو ہموار کیا کرتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی

پنڈت نہرو نے لکھنؤ کانگرس کے دور ۱۹۳۶ء میں جو تقریر کی تھی اسے ہر کانگریسی کو پڑھ لینا چاہئے تاکہ وہ جان لے کہ اس قومی تحریک کے لیڈر کی فلسفیانہ سوجھ بوجھ کتنی گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے اس تقریر میں سوشلزم کے فلسفہ کی توضیحات تھیں اور پنڈت نہرو نے پورا زور اس بات پر صرف کیا تھا کہ وہ کل ہند کانگرس کی منظم کردہ قومی تحریک سے ترقیاتی نقشے کے پیش نظر اس فلسفے کی تصدیق و تائید کرے۔ پٹابھی سیتا رامیا جنھوں نے انڈین نیشنل کانگرس کی تاریخ پر کئی جلدیں لکھی ہیں۔ لکھنؤ کانگرس پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

"اس خطاب سے ہمارے ملک میں خالص کمیونزم کی وکالت کی (جلد دوم صفحہ ۱۳)

فیض پور کانگریس کا انعقاد دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ ان فلسفیانہ باتوں کی صدائے باز گشت جو لکھنؤ میں ملک کو سوشلزم کے جوکھے کے اندر رکھنے کی بابت کہی گئی تھیں۔ اس مرتبہ سلجھے ہوئے انداز میں سننے میں آئی۔ لکھنؤ کانگریس میں پنڈت نہرو نے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ نئی تہذیب بنیادی طور پر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے الگ ہے اس تہذیب کی کچھ جھلکیاں ہم یو۔ ایس۔ ایس۔ آر میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ باتیں جواہر لال نہرو کے منتخبات (جلد ساتویں صفحہ ۱۹۱) میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

سوشلزم کے بارے میں جو گہرا تعصب مغربی ملکوں کے سیاست دانوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہے۔ بالخصوص مارکس کے

م کے بارے میں میرے یقین کے مطابق
ں کا اثر ہے کہ مسٹر چرچل نے آزادی
تحریک کے لیڈروں پر وہ نکتہ چینی
ں کا ذکر اوپر گزرا۔
پھر بھی اگر چرچل کی سوانح حیات
ے تو اشخاص اور واقعات کے
یں ان کے گہرے مطالعے کا ذکر
یا جانا چاہیئے۔ ہندوستانی لیڈروں
ی پارٹی پر ان کی تنقید کا مرکزی
ڈت نہرو تھے۔ اگر ہم پنڈت نہرو
ں کا مطالعہ کریں تو ہمیں سوشلزم پر
ے شمار حوالجات ملیں گے۔
سوشلزم پر اپنے مذکورہ حوالوں میں
نہرو نے صاف طور پر مارکسی سوشلزم
ر اپنے خیال کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم
بہت سے سیاست دانوں میں شاذ
ی ملے گا لیکن پنڈت نہرو مارکسزم
ارکس کے تصور کردہ سوشلزم پر
سفیانہ اعتقاد کے اظہار میں صاف
ے کام لیتے تھے اس کے علاوہ ۱۹۱۷ء
انقلاب کی کامیابی کو اور یو۔ ایس
منصوبہ بندی کے طریقوں کو انھوں
کے ہیر پھیر سے کام لئے بغیر صاف
ر کیا ہے۔ مغربی دنیا کے تمام
ان اس لیڈر شپ کی نوعیت کا
رہے تھے جو روپ اس لیڈر شپ
ے ہندوستان کی تحریک آزادی کو
تھا۔
گھریلو پالیسیاں جو وسیع کی جا رہی
، میں پنڈت نہرو کا تجربیوں کے
، یہ اعتقاد بٹھا دینے کی کوشش
ر آخر کار ہندوستانی معیشت کا حل
کے فلسفیانہ اصولوں کو اپنانے ہی
میں ہے۔

اس تاریخی بیان کے اعتبار سے پنڈت
نہرو کی لیڈر شپ معیاری ہے چونکہ وہ سوشلزم
کی تصدیق بغیر نیت و نقل کے کرتے تھے اس
لئے بین الاقوامی معاملات میں ان کے متعلق
بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ سیاست داں عموماً
اہم امور کو پوشیدہ رکھتے اور ظاہری باتوں
کا اظہار اپنے کثیر تعداد ہمخیال سیاست دانوں
کے روبرو کیا کرتے ہیں۔ لیکن پنڈت نہرو
بغیر جھجک کے اپنے فلسفیانہ ترجیحی خیالات
کا انکشاف کیا کرتے تھے۔ گھریلو سیاسی
امور میں بھی وہ یہی رویہ رکھتے تھے۔ بین
الاقوامی مارکسسٹ تحریک اور اسی طرح
قومی کمیونسٹ تحریک نے پنڈت نہرو کے
سمجھنے میں غلطی کی۔ اس کا کمزور ترین لمحہ
وہ تھا جب مسٹر یوڈین نے پنڈت نہرو اور
ان کی حکومت پر اپنی تنقیدوں کو شائع کیا
مسٹر یوڈین چین میں سوویتی سفیر تھے ان کا انتہائی
نقطہ وہ تھا جب ماؤ نے شہنشاہیت کا کتا
کہہ کر ان کی تضحیک کی تھی۔ اس کے ذریعے
اس بات کا انکار مقصود نہیں ہے کہ مسٹر
ڈانگے جیسے بعض کمیونسٹ لیڈر ایسے تھے
جو ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ غلط پارٹی میں شامل
ہو گئے ہیں۔ جب مارکسی تحریک میں پنڈت نہرو
کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا گیا۔
۱۹۴۶ء کی سیاسی فتح کے بعد پنڈت نہرو
نے اپنے بین الاقوامی تعلقات کی نئے سرے
سے تنظیم کی۔ اس کا ذکر ان کے اس بیان میں
ہے جو انھوں نے خارجہ پالیسی کے سلسلے میں
پریس کانفرنس کو اس وقت دیا تھا جب وہ
۲۷-۹-۴۶ کو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر
اعظم چنے گئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے
بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کا دار و مدار
ان کے گھریلو معاشی امور اور سیاسی
زندگی کی نوعیت پر ہوگا۔ دستور ہند
اور پنجسالہ پلان کی تشکیل ہندوستان کی
سیاسی زندگی اور معاشی ماحول کو با اصول
بنانے کے لیے کی گئی تھی۔ پنڈت نہرو کا
یہ خیال تھا کہ صرف ایسا کرنے سے ہی جاری زندگی
اور زندگی گذارنے کے بین الاقوامی اصولوں کو وزن
دار بنایا جاسکے گا۔ انھیں اس حقیقت کا
احساس تھا کہ دنیا دو نظریوں میں بٹی ہوئی
ہے جن میں سے ایک سرمایہ دارانہ نظام
ہے اور دوسرا سوشلسٹ نظام۔ اس لئے
ان کے لئے ضروری ہے کہ سوشلسٹ کیمپ
والوں سے باہمی تعلقات فلسفیانہ انداز
میں بڑھائیں اور سرمایہ دارانہ ملکوں کے
آزاد خیال سیاست دانوں کے ساتھ بھی
روابط کو ترقی دیں۔ یہ بہت نازک ذمہ
داری تھی بس یورپ میں جن سے وہ
واقف تھے اور مغربی تہذیب میں آزاد
خیالی کا جو علم انھیں تھا اس نے روحانی
ذرائع کا پتہ لگانے میں ان کی مدد کی۔
جس سے کام لے کر اچھے سیاسی تعلقات
کو استوار کرنے کا سلسلہ جاری کیا ان کی
شخصی دوستی کے بہترین نمونے کے طور پر
کینیڈی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر مائونٹ
بیٹن۔ پروفیسر گالبریتھ، پروفیسر مائرڈل
وغیرہ نے اتحاد کا نیا جذبہ پیدا کرنے اور
دونوں کیمپوں میں بنی نوع انسان کے تعلق
سے وسیع ترین سوچ سمجھ کی بنیاد رکھنے میں
ان کی مدد کی۔ پنڈت نہرو کو سوویت
یونین میں بالخصوص اسٹالین کی وفات کے
بعد باہمی روابط کو ترقی دینے میں
دشواری پیش نہیں آئی۔ خروشچیف کا دور
اس موڑ کے لئے نمایاں زمانہ ثابت ہوا۔

جب بہت سے تنگ نظری پر مبنی بہت سے نظریے ختم ہوگئے۔ یورپ، روس اور ہندوستان میں مارکسی نظریہ رکھنے والے کتنے ہی دوستوں کو نہرو کے خیال کے مطابق اس چیلنج کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنا ممکن ہوسکا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کرشنا مینن کے ساتھ پنڈت نہرو کی دوستی کمیونسٹ ملکوں اور ان کے فلاسفروں اور سیاست دانوں کے ساتھ دوستی کو بڑھاوا دینے کا ایک زبردست ذریعہ بن گیا۔

انسانی حقوق کی مدافعت کے لیے ایک عام پلیٹ فارم پر لوگوں کو یکجا کرنے کے اس اعتقاد کی تشکیل تحریک امن عالم کے دوران عمل میں آئی۔ پنڈت نہرو کی سیاست دانی کا آخری ثقافتی حصہ اب پوری طرح تیار ہو چکا تھا تاکہ تحریک امن کے نظام کے تمام پہلوؤں کی تنظیم کی جاتی۔ بین الاقوامی امور کا دوسرا پہلو اس کے باوجود دنیا کے تبدیل ہوتے ہوئے نقشے میں ایک نیا چیلنج بن رہا تھا۔ دنیا ترقی یافتہ، درکم ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملکوں میں بٹی رہی۔ معاشی طور پر تمام کم ترقی یافتہ ممالک، استعمار پسند طاقتوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے۔ اس [illegible] استعمار پسند [illegible] طاقتوں سے آزاد ہونے کے بعد [illegible] اعتماد [illegible] کی ضرورت تھی۔ زندگی گزارنے کے بین الاقوامی اصولوں کو پنڈت نہرو نے پنچ شیل کا نام دیا یعنی ایشیائی ملکوں کا اجتماعی امن، خوشحالی اور دوستی چلانے والی تنظیم۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنڈت نہرو کو چینی تہذیب سے گہری محبت تھی۔ چین کے جمہوریت پسند لیڈروں سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ چینی معاشیات کے طالب علم پنڈت نہرو کا پیش لفظ "چین جمہوریت کی تعمیر کر رہا ہے" کے شروع میں پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تمہید ایک مضمون کی شکل میں ہے جس میں واضح طور پر فلسفیانہ انداز میں ابھرتے ہوئے چینی اقتصادیات، سیاسیات اور ثقافت کے رجحانات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس لیے چینی ثقافت کے ساتھ باہمی روابط کو بڑھاوا دینا ان کی وضعداری کے حسب حال تھا۔ پنڈت نہرو نے بحیثیت وزیر اعظم کے ۷ ستمبر ۱۹۴۹ء کو اپنے براڈکاسٹ میں ایک پیراگراف چین کے لیے وقف کیا تھا جو اوپر مذکورہ باتوں پر ایک دلیل ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے ساتھ چین کے قدیم روابط یوں بھی تاریخی طور پر معروف و مشہور ہیں اس سیاق میں چین کی تبت کی توسیع پسندی بڑے پیمانے پر زیر بحث تھی۔ تبت کے بارے میں ہندوستان کا یہ تاریخی فیصلہ کہاں تک حکمت عملی کے لحاظ سے درست یا نادرست تھا تب سے اب تک انسانیت کے نقطۂ نظر سے موضوع خط و کتابت بنا ہوا ہے۔ پھر بھی پنڈت نہرو نے اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا کہ ہندوستان علاقائی توسیع پسندی کا میلان نہیں رکھتا اور یہ بات تبت کے بارے میں دنیا کے سیاست دانوں پر واضح طور پر ظاہر کر دی گئی تھی۔ غالباً سوویت یونین کو اس سے اطمینان ہو گیا تھا کہ پنڈت نہرو ہرگز جنگی کارروائی کے ذریعے اپنے پڑوسی ملکوں پر ہندوستان کی برتری جتانے کے خواہش مند نہیں ہوں گے اس لیے چین، انڈونیشیا اور دوسرے پڑوسی ملکوں کے لیڈروں کو مطمئن کرنا اور بین الاقوامی طور پر زندگی بسر کرنے کے پنچ شیل کے اصولوں کو منظور کرنا آسان ہو گیا تھا۔

وہ روحانی بھائی چارگی جو پنچ شیل کے اصولوں کو ماننے کے بعد ان ملکوں کے ساتھ قائم ہوئی تھی جنہوں نے اس کی تصدیق کی تھی۔ باقی نہیں رہی۔ چینی لیڈر ماؤزے تنگ نے کمیونسٹ تحریک کے دوران اپنے دماغ کو عالمی لیڈرشپ کے لیے تیار کیا۔ ۱۹۵۹ء میں کمیونسٹ پارٹیوں کی بین الاقوامی میٹنگ میں جو زبردست مباحثہ ہوا وہ چین اور روس کے لیڈروں کے درمیان اختلافات کی نذر ہو گیا۔ ماؤ چاہتے تھے کہ وہ جنگ آزادی کو بین الاقوامی پیمانے پر جاری رکھیں اور اس طرح خود چین کی سرحدات کو وسعت دیں۔ ایک تکنیک طویل جنگ کی توسیع کے سلسلے میں بغیر کسی تحفظ کے چین میں پوری طرح موضوع بحث رہی۔ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر چین کے حملے کا مطالعہ اسی پس منظر میں اور چین کی بین الاقوامی ڈپلومیسی کے چوکھٹے میں رکھ کر کیا جانا چاہیے۔ بین الاقوامی تعلقات میں چین کے رول کی تشخیص الفاظ اور جملوں کے ذریعے نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے سوویت یونین کا رویہ ہندوستان کے ساتھ اطمینان کے ساتھ غیر جانبدارانہ رہا۔ اس ٹھوس شہادت نے میرے خیال میں خود بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے طور طریقوں کو منطقی بحث میں الجھا دیا ہے۔ مارکسزم پنڈت نہرو کو پیارا تھا وہ اسے بلا کم و کاست تسلیم کرتے تھے۔ جو لوگ چین میں مارکسزم کے جھنڈے تلے برسر اقتدار تھے وہ ایسے ڈھنگ سے کام کرتے تھے جو مارکسزم [illegible] اصولوں کے

جواہر لال

تھا جواہر بھی واہ کیا انساں
اس کا ہندوستان پہ ہے احساں

لوگ کہتے ہیں دردِ قومی سے
زندگی بھر رہا ہے وہ گریاں

نہیں اس کی پست کر نہ سکے
لاکھ ہنگامے سیکڑوں طوفاں

ناز تھا جس پہ ساری دنیا کو
اٹھ گیا ہائے وہ عظیم انساں

صرف ہندوستاں نہیں صدیوں
چشمِ عالم رہے گی خوں افشاں

اب کہاں ایسے لوگ دنیا میں
خود کو جو ملک پر کریں قرباں

تا ابد نام بھی جواہر کا
مہر بنکر رہے گا ضو افشاں

○ نہال حفیظ
فلیٹ نمبر ۱۸۴۲/۱۵
ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی تلک نگر
چیمبور، بمبئی ۴۰۰۰۸۹

ے خلاف تھا۔ تب سے بین الاقوامی کیونسٹ تحریک تصوراتی کیمپوں میں منطقی فروعات میں بٹ گئی جنھوں نے منطق کی منفی قوت استعمال کی وہ ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے بعد سے فروع در فروع بٹتے گئے۔ کیونسٹ لیڈرشپ کے درمیان تصوراتی اختلافات نہ صرف ایشیا بشمول ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ہر سمجھ دار آدمی بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر مجھے یقین ہے کہ پنڈت نہرو کا مارکسزم کے بارے میں پورا اندازہ فلاسفی میں کمزوری اور سوشلزم کے بارے میں تاریخی ثابت شدہ ہے۔ مارکسزم اور سوشلزم سیاسی زندگی کے جمہوری اصولوں کے بغیر ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں جو لوگوں کی آزادی کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنے بہت سے خطوط اور تقریروں میں کہی۔ انھوں نے اس نکتے کو مارکسزم کے حدود پر زور دینے کے لیے بالخصوص عوامی کارفرمائی یا ڈکٹیٹرشپ سے اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے بیان کیا تھا۔ اس محفوظ انداز کے باوجود انھوں نے کمیونزم کے خلاف نہ ہندوستان میں نہ بین الاقوامی تعلقات میں کبھی تعصب نہیں برتا۔ یہ بات ہندوستانی کیونسٹ تحریک میں یا امریکی جمہوری تحریک میں ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ حقیقتاً حیرت اس پر ہوتی ہے کہ سرمایہ داروں نے ان پر ہندوستانی کیونسٹ تحریک کا شریک ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔

ہندوستانی کیونسٹ تحریک نے بھی ان پر ہندوستانی اقتصادیات میں ابھرتی ہوئی شہنشاہیت کے نمائندہ

پنڈت جواہر لال نہرو اپنے والد موتی لال نہرو اور دیگر افراد خاندان کیساتھ

ہونے کا شبہ کیا ایسی ہی ابتری بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔

اس تناقض اندازہ کی ابتدا صنعتی کارخانوں کے شروع کرنے سے پروگراموں کے سلسلے میں عالمی بینک سے اور یورپ اور امریکہ کی پرائیوٹ مالی امداد دینے والی ایجنسیوں سے مالی تعاون حاصل کرنے کی بنا پر ہوئی۔ انھوں نے بڑے پیمانے پر ہندوستان کی صنعت کاری پر سرمایہ لگانے کی پیشکش کی اس کے معنی ایک طرح سے یہ ہوئے کہ شہنشاہیت پسند ملکوں کا سرمایہ

ہندوستان منتقل کیا جائے تاکہ ہندوستانی معاشیات کے وسائل کا استحصال کیا جائے جب بھلائی فولادی کارخانے تعمیر کرنے کی منظوری سوویت یونین کو دی گئی تو مغربی لابی اس اندیشہ میں مبتلا ہوئی کہ ہندوستان کی سیاسی اقتصادیات میں کمیونسٹ سیاسی قوت داخل ہو رہی ہے اس طرح مغربی ملکوں اور کمیونسٹ دونوں ملکوں سے بین الاقوامی فنڈ میں یا رقوم کی اور تکنالوجی کی آمد غلط فہمی پیدا کرنے کا سبب اس وقت بنی ہے۔ جس وقت بین الاقوامی تعلقات میں پنڈت نہرو کے رول کی تشخیص کی جانے لگی۔

اس سے یہ بتلانا مقصود نہیں ہے
پنڈت نہرو کا بین الاقوامی امور میں با
غلط اندازہ لگایا گیا اور انھیں رد کر دیا گ
سے دانشوروں نے جمہوریت کی طرف نہرو کے ا
کا مطالعہ کرنے پر اپنی رائے بدل دی نتائج
عارضی غلط فہمی سے قطع نظر پنڈت نہرو کے متع
یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ وہ کسی سے تعلقات منق
کرنے کے خلاف تھے جہاں ایک بار دوستانہ ت
قائم ہوئے تو ان لوگوں کے ساتھ قطع تعلق کرنے
بجائے وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ
وسلام کا سلسلہ قائم رہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہند
میں حزب مخالف چینی ماحول کو بڑھاوا دینے
کو انھوں نے ترجیح نہیں دی۔ اس نے ہندوست

قومی راج

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی اہلیہ شریمتی کملا نہرو کے ہمراہ ساتھ میں ننھی اندرا گاندھی.

سماج، اس کا سیاسی طور وطریقہ اور اقتصادی ماحول صحیح معنوں میں تمام ملکوں کے لیے اس کی نشوونما کے ذریعہ بین الاقوامی شرکت کے خواہش مند تھے. کسی ملک پر باہم مل جل کر کام کرنے میں ہندوستان کی طرف سے کوئی بندش یا پابندی نہیں ہے یہی وہ مرحلہ ہے جہاں پنڈت نہرو نے دنیا کی تمام دوسری لیڈرشپ پر سیاسی معاملات میں اپنی برتری کا سکہ بٹھایا.

ان کے دماغ میں کون سی بات بیٹھی ہوئی تھی اس سوال کا جواب اس شخص کی فلاسفی کا انکشاف کرتا ہے. مارکسزم پنڈت نہرو کا دماغ تھا اس لیے ان کے فلسفیانہ خط وخال سائنٹفک سوشلزم کے تابع تھے. سیاسی دنیا کے دونوں کیمپوں کی مخالفت سے بے پرواہ ہوکر انھوں نے اپنا اقدام اسی انداز پر جاری رکھا. اس وقت بھی ان کا طور وطریقہ یہی تھا جب وہ صاحب اقتدار نہیں تھے اور اس وقت بھی یہی رہا جب وہ اقتدار حکومت پر آئے انھوں نے اپنے پیچھے ایسا ماحول چھوڑا جس کی مزید چھان بین سائنٹفک سوشلزم کی دنیا میں کیا ان ضروری ہے ہماری اپنی دانشمندی کا سوشلزم ہماری اپنی حکومت کا منتہائے نظر ہے اعلان ہے جو شری راجیو گاندھی نے اپنی بجٹ تقریر میں فرمایا ٹھیک یہی پنڈت نہرو کے خیالات تھے سائنٹفک سوشلزم کے بہت سے نکتوں پر بحث کا سلسلہ سوویت یونین اور چین میں اقتصادی اصلاحات کے بارے میں جاری ہے ان سوشلسٹ ملکوں کے عملی طریقوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ابھی یہ فلسفہ اچھی طرح سمجھا نہیں جا سکا ہے یہی بات پنڈت نہرو اپنی زندگی میں دہرایا کرتے تھے

پنڈت نہرو کی بے اطمینانی اور گورباچیف کی موجودہ فکرمندی دونوں ایک ہی طول موج پر ہیں. کمیونسٹ ملکوں کے تمام لیڈران اب کھلے بندوں کہنے لگے ہیں کہ قومی خصوصیات کا اظہار سوشلزم کی عملی اور نظری دونوں صورتوں میں یکساں ہونی چاہئے.

تنزانیہ کے جولیس نائریرے نے اُوجما کی تعریف یوں کی ہے تاکہ افریقی سوشلزم اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے.

" یہ ترقی کرنے کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ ہے یہ اس سرمایہ داری کا مخالف ہے جس کی کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی کے ذریعے آدمی کا استحصال کرکے ایک خوشحال سماج کو وجود میں لائے اور یہ ایسے ہی اصول پرور اور سوشلزم کا بھی مخالف ہے جس کی کوشش یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے خوشحال سماج کی تعمیر آدمی اور آدمی کے اٹل تصادم کے فلسفہ پر کرے. نائریرے نے اُوجما کو اسی انداز میں دیکھا اور سمجھا اسی اُوجما کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے ان کے اکثر بیان پنڈت نہرو کی سوشلزم کے ساتھ گہری تقریبی مماثلت رکھتے ہیں. گورباچیف نے اس پالیسی پر صاد کیا ہے کہ ہر ملک میں اپنی ذاتی مہارت کے سوشلزم پر عمل کرے. یہ پنڈت نہرو کی اخلاقی فتح ہے.

فلاسفر حکمراں ہوں گے یہ اشارہ افلاطون نے اپنی جمہوریت میں کیا تھا. ریاست پر حکمرانی فلسفیانہ نظریات کے ذریعے کی جائے گی جو لوگ محکوم ہیں انھیں ضرورت ہے فیلسوف لیڈر کی تاکہ وہ ان کی رہنمائی اس نظریہ کی سمت کرے جو ان کے ذہنوں میں ہے. عوام کے ذہنوں میں کون سی بات ہے اسی کا نام مارکسی مادیت یا فلسفہ ہے. عوام کے ذہنوں میں سوشلزم ہے اگرچہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے اس لیے لیڈر کو سوشلزم میں ایک کامیاب فلسفی ہونا چاہیے پنڈت نہرو ہندوستان کے افلاطونی طرز کے رہنما تھے

مرزا ساز قاسمی
۱۴۸ لیبر/۴ اسے فیٹ والا کمپاؤنڈ
پائپ روڈ کورلا بمبئی ۴۰۰۰۷۰

بال گندھرو: فن اور شخصیت

"فنکار بہت ہوئے بہت ہوں گے مگر اپنی مثال آپ" یہ بیان اگر کسی پر صادق آتا ہے تو وہ شخصیت ہیں نٹ سمراٹ، شہنشاہ اداکاراں نارائن راؤ شری پاد راج ہنس عرف بال گندھرو۔

مراٹھی اسٹیج کا قیام ۱۸۴۳ء میں عمل میں آیا۔ تب سے اب تک اس اسٹیج پر ہزاروں فنکار آئے ان میں سے بہتیرے کافی بلند پایہ صلاحیتوں کے حامل بھی رہے اور مقبولیت عام سے سرفراز بھی ہوئے اور مشتاقان فن نے انھیں سر آنکھوں پر بھی لیا۔

لیکن ان میں مقابلتاً جو پیار جو عزت جو احترام بال گندھرو نے پایا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ آج سے تقریباً ۵۰ سال قبل تعلیم یافتہ اور مہذب مرہٹہ خاندانوں میں ان کے گھروں میں دو تصویریں بالخصوص دکھائی دیتی تھیں۔ ایک لوک مانیہ تلک کی اور دوسری نٹ سمراٹ بال گندھرو کی تلک کی دیش بھکتی اور قربانی نے سارے مہاراشٹر کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور بال گندھرو کے حسن، ان کی حسین گائیکی اور دلفریب اداکاری نے فن اور اداکاری کے مرہٹہ شائقین کے دل جیت لیے تھے آچاریہ اترے کے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں "تلک کی پگڑی اہل مہاراشٹر میں جتنی مقبول نہ ہوئی ہوگی۔ اتنی گندھرو ٹوپی مقبول ہوئی۔ مہاراشٹر کے بے شمار مرہٹہ نوجوانوں نے اسے اپنے سر کی زینت بنایا۔ اتنا ہی نہیں گندھرو سپاری، اور گندھرو چپل نے بھی خوب مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

مراٹھی اسٹیج کی تاریخ گواہ ہے کہ بال گندھرو نے جو بے پناہ کامیابی اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ مراٹھی ناٹکوں میں نسوانی کرداروں کی ادائیگی کے باعث حاصل کی ہے ایک عجوبہ ہی کہنا چاہیے کہ اپنے نسوانی کرداروں کو ادا کر کے بڑی فنکارائیں جو کامیابی شہرت اور مقبولیت حاصل نہ کر سکیں ایک مرد نے حاصل کی اور اس کامیابی کو اپنا حصہ اپنا ورثہ بنالیا۔

ان کی شخصیت میں پائی جانے والی فطری خوبیاں اس کی ضامن ثابت ہوئیں۔

پر وہ جیسے حسین دکھائی دیتے تھے اصل
ہ ویسے ہی حسین تھے۔ دودھ سے دھلا
نگ، بشاش بشاش اور متبسم چہرہ، کالے
بال۔ اونچے دیوار کی کالی فرکی ٹوپی،
ستھری لمبی قمیص، (پیرہن) اور سفید
ہ پاجامہ اور پاؤں میں کولہاپوری چپل
لوازمات تھے جو ان کے حسن کو اور دوبالا
نے تھے

آج کل ناٹکوں میں نسوانی کردار اداکارائیں
تی ہیں۔ ابتدائی دور میں کیفیت اور
عورتوں کے لئے میدانِ عمل رسوئی
وں کی پرورش تک محدود تھا اس لئے
ڈرامہ اور اسٹیج کی دنیا میں شمولیت کو
کرتی تھیں لیکن چونکہ اس وقت بھی آج
ح ڈراموں میں نسوانی کردار ہوا کرتے
ولا محالہ مردوں کو ادا کرنے پڑتے
ور اس کے لئے لازمی طور پر حسین
لڑکوں اور خوبصورت نوجوانوں کا
عمل میں لایا جاتا تھا۔ گویا دودھ کی
کو پنیر سے بجھایا جاتا تھا۔

۱۸۸۰ء میں فن کے دلدادہ کچھ
یافتہ نوجوان کے ایک گروپ کی کوششوں
میں گرلوسکر ناٹک منڈلی کا قیام عمل
یا جس نے شکنتلا، سبھدرا (سو بھدرا)
راجیہ دیوگ، دیرسنے، شاردا وغیرہ،
ب اور مشہور ڈرامے پیش کئے۔ اس
منڈلی میں بہترین گائیک فنکار موجود
کی بنا پر ان کی تخلیقات بلند پایہ
تی تھیں۔ اس ناٹک منڈلی کو لوکمانیہ
پشت پناہی بھی حاصل تھی اور ان
کی بنا پر اس منڈلی کو اس سماج
خاص وقار بھی حاصل تھا۔ سماج میں

ناٹک کے پیشہ کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا
جاتا تھا۔ اب اسے شرفِ قبولیت حاصل
ہونے لگی گرلوسکر ناٹک منڈلی کے
سبب

ابتدا میں گرلوسکر کے ناٹکوں میں
ہیروئن کا کردار بھاؤ راو کولہٹکر ادا کیا
کرتے تھے وہ بھی بے حد خوبصورت تھے

ان کی گائیکی بھی دل کو چھو لینے
والی ہوتی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں ان کی
ناگہانی موت منڈلی کی ترقی میں ایک
بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ منڈلی کو یہ
مسئلہ درپیش رہا کہ منڈلی کو زندہ رکھنے
کے لئے ایسے اداکار کی تلاش لازمی
ہے جو خوبصورت گانے والا اور نسوانی
کردار کو خوبصورتی سے نبھانے والا ہو
اور منڈلی کی خوش نصیبی کہئے کہ ۱۹۰۵ء میں
اسے نارائن شری پاد راج ہنس نامی ایک
نہایت حسین و جمیل لڑکا نسوانی کردار کی
ادائیگی کی خاطر ہاتھ لگ گیا جسے لوگوں
نے بال گندھرو کے نام سے پہچانا۔
۱۸۹۸ء میں جب نارائن دس
سال کا تھا لوکمانیہ تلک نے اس کا گانا
سنا وہ اس کی آواز کی شیرینی سے
نہایت متاثر ہوئے اور بے ساختہ بول
اٹھے اس بال گندھرو کے حلق میں کتنا
نور بھرا ہے اور اسی دن اسی وقت اسی لمحہ
سے نارائن شری پاد راج ہنس بال گندھرو
کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اس وقت کے مشہور ڈرامہ نگار
اور فن اداکاری کے مانے ہوئے
استاد گوند راؤ دیول نے بال گندھرو
کو اداکاری کا پہلا سبق پڑھایا وہ یوں

کہ نسوانی کردار کی ادائیگی کے وقت کھڑے
کس طرح ہوں، چلیں کس طرح، حرکات و
سکنات کس انداز میں ہوں؟ مکالموں کی
ادائیگی کے وقت میں آواز میں کس طرح
اتار چڑھاؤ ہو؟ یہ سارے گر بال
گندھرو کو دیول ماسٹر جی نے سکھائے۔
اداکار کی اداکاری میں قطعی تصنع نہ ہو
فن کے اس پہلو پر دیول سب سے زیادہ
توجہ دیا کرتے تھے۔ ناٹک کے گیت جو
اداکار گاتے ہیں وہ واقعات اور کردار
کے عین مطابق کردار کے مزاج اور جذبے
کے عکاس ہوں۔ اس نکتہ پر بھی دیول بھرپور
زور دیا کرتے تھے۔

استاد دیول سے اداکاری کی بہترین
تربیت پانے کے بعد مرج شہر میں، شکنتلا
میں پہلی بار بال گندھرو اسٹیج پر آئے
اس ناٹک کی تشہیر کچھ اس انداز میں
کی گئی تھی۔
علا
" لوکمانیہ تلک نے جنھیں بال گندھرو کا خطاب
کیا ہے وہی نارائن راؤ راج ہنس سنگیتا ناٹک
شکنتلا، میں شکنتلا کا کردار ادا کر رہے
ہیں" پھر کیا تھا گرلوسکر ناٹک منڈلی کی اس
نئی دریافت بالفاظ دیگر اس نئی ہیروئن
کو دیکھنے کے لئے پونہ، کولہاپور، بیلگام وغیرہ
مقامات سے شائقین کے ہجوم مرج کی سمت
دوڑ پڑے تھے۔
جب بال گندھرو شکنتلا کا حسین و دلکش
روپ دھار کر اسٹیج پر نمودار ہوئے تو
شائقین نے تالیوں کی بے پناہ گونج سے
ان کا خیر مقدم کیا۔ انھیں یہ شکنتلا حسن و
دلکشی کی ایک جیتی جاگتی مورت نظر آئی۔
اتنا ہی نہیں بال گندھرو نے اپنے
شکنتلا کے کردار میں جو گیت گائے ان
قومی راج

گیتوں میں بھی انھوں نے خوب رنگ بھرا اور اداکاری بھی انتہائی خوبصورت انداز میں کی۔ گویا ان کے گیت جس درجہ شنیدنی تھے ان کی اداکاری اتنی ہی دیدنی تھی۔ بال گندھرو کی اداکاری پہلی بار دیکھ کر شائقین یوں محسوس کرنے لگے جیسے سچ مچ کوئی جگمگاتا ہوا ستارہ اسٹیج پر اتر آیا ہو۔ کوئی اپسرا اسٹیج پر اتر آئی ہو اور ایسا کیونکر محسوس نہ ہوتا اگر بال گندھرو کے چہرے میں۔ نظروں میں، ہنسی میں، مسکراہٹ میں، لجاہٹ میں، ناز و انداز میں، غمزہ میں، عشوے میں ان کی رفتار میں، گفتار میں ان کے آرائش اور زیبائش میں مجسم نسوانیت رچی بسی ملتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی مردانہ جسم میں ایک ایسے نسوانی حسن کا پیکر ہرگز ہرگز نمودار نہ ہوا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بال گندھرو نسوانی پیکر میں اسٹیج پر آتے تھے تو مرد تو ان کا حسن ان کے حسن کی دلکشی دیکھ کر بالکل پاگل ہو جاتے تھے لیکن عورتوں کی نظریں بھی ان کے حسن پر مانو دیوانہ وار جم کر رہ جاتی تھیں۔

شکنتلا کے بعد بال گندھرو نے

वीरतनय

मूकनायक

सौभद्र

मतिविकार

गुप्तमंजुष

ان ناٹکوں کی ہیروئنوں کے کردار ادا کئے۔ بمبئی کے ناظرین نے ہو بہو رکو بے پناہ سراہا۔ سبھدرا کی بے بسی اور مجبوری کی عکاسی بال گندھرو بڑے دلکش انداز میں کیا کرتے تھے

किती किती सांगू तुला

धद जाऊ कृपाला शरण

बलसागर तुम्ही धीर शिरोमणी

अरसिक किती हा शेला

पांडु नृपती जनक जया

وغیرہ گیتوں میں فانوذ دا امرت رس گھول دیا کرتے تھے۔ پرانا سو بھدر ناٹک بھی ان کی گائیکی اور اداکاری سے نیا اور تازہ جان پڑتا تھا اور شائقین اسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔

بال گندھرو کی اداکاری دیکھ کر ہی کاکا صاحب کھاڈل کر کو ناٹک لکھنے کی تحریک ملی اور ان کا تحریر کردہ سنگیت ناٹک "مان اپمان" ۱۹۱۱ء میں اسٹیج پر آیا اور اس ناٹک سے بال گندھرو کی گائیکی اور اداکاری کو اور زیادہ جلا ملی۔ اس وقت بال گندھرو ۲۲، ۲۳، سال کے تھے۔ مان اپمان میں ہیرو دھیر دھر کا کردار گووند راؤ ٹیمبے اور ہیروئن بھامنی کا کردار بال گندھرو ادا کرتے تھے بال گندھرو جس طرح نسوانی کردار کا ایک نمونہ تھے اسی طرح گووند راؤ مردانہ کردار میں خوبصورتی، کردار نگاری اور گائیکی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اپنی آواز کی لطافت سے اپنی ہر تال اپنے ہر سُر میں وہ جادو جگا دیا کرتے تھے بالکل بال گندھرو کی طرح۔ مان اپمان میں دھیریہ دھر، ٹیمبے، بھامنی گندھرو کر اور لکشمی دھر بوڈس، مانو خوبصورتی اور گائیکی اور طنز و مزاح کا ایک دلکش تروینی سنگم ہوا کرتا تھا۔ تینوں برابر ناظرین کی نظروں میں سمائے رہتے تھے کس قدر نہار میں، کیسے کس قدر حسین اور کیسے کس درجہ سراہیں شائقین چکر میں پڑ جاتے تھے۔

مان اپمان کی ہیروئن بھامنی غرور حسن کا شکار ہے اسے اپنی امیری کا بھی بڑا گھمنڈ ہے۔ غریب دھیریہ دھر کے ساتھ شادی کرنے سے وہ بڑے کبر و انداز کے ساتھ انکار کر دیتی ہے۔ لیکن آگے چل کر دھیریہ دھر کی جواں مردی دیکھ کر وہ اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے اور اپنی سہیلی کسماوتی سے اپنے پیار کا اظہار کرنے سے بھی نہیں جھجکتی۔

नाही मी बोलत नाथा

یہ پیار بھرا گیت گاتے ہوئے

चिनयवती मी कांता

کہہ کر وہ اپنے پیار کا بیباکانہ اعتراف بھی کرتی ہے اور اسی سے اس کے کردار کی پختگی بھی واضح ہو جاتی ہے۔ تیسرے ایکٹ میں بھامنی اور کسماوتی کا داخلہ اور چوتھے ایکٹ میں دھیریہ دھر اور بھامنی کا داخلہ۔ یہ مناظر ڈرامہ نگاری کے اعتبار سے نہایت شاندار ہیں ان میں بال گندھرو نے اپنی اداکاری کے خوب خوب جوہر دکھلائے ہیں۔

اسی طرح مان اپمان اس ناٹک کی موسیقی پچھلے ناٹکوں سے موسیقی کے مقابلے میں کچھ جداگانہ تھی۔

स्यातील नयन लोजवील

वरा तो प्रेमा

मी अपना

नाही मी बोलत

ت بال گندھرونے انتہائی دلفریب
پیش کئے ہیں. تیس سال کے زیادہ
بھامنی کے کردار کی ادائیگی کے
ندھرد مان ایمان میں دھیرتیہ دھر
ادا کرنے لگے تھے اس کردار میں اس
جذباتی گیت تو بس سننے ہی سے
تے ہیں لیکن یہ بھی اتنی ہی بڑی
ہے کہ ان کے مردانہ کرداروں کو
ں اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی
کرداروں کو نصیب ہوئی ہے.
ہے جیسے زنانہ کردار ادا کرنے
ی اسٹیج کی دنیا میں ان کا جنم ہوا

کرکے ناٹک، ودیاہرن میں بال
دیوانی کا کردار ادا کیا کرتے تھے
کو اپنے پتاشری شکراچاریہ اور
تیہ فرقے پر بڑا ناز تھا. شکر
ی سنجیونی، ودیا، سیکھنے کے لئے
رنے کچ دیو کے لئے اس کے دل
جاگ جاتا ہے لیکن باپ کی نافرمانی
ل دیویانی کچ دیو ہی کو کس طرح
ے گی؟

نے آپ سے یہ سوال پوچھنے والے
کے نے شائقین اور ناظرین اپنے
ں میں ایک نرم گوشہ ضرور محسوس
کتے ہیں کیونکہ اس دور میں پیار کی
باپ، گھر بار، مال، ملکیت
سب کچھ قربان کر دینے والا سماج

दैत्य-संप्रदाय

غزل

شوق ماہری۔ مرگھٹ روڈ۔ کھنڈوا (ایم پی)

نئی منزلوں کا پتا چھوڑ آئے
جہاں بھی گئے نقشِ پا چھوڑ آئے
حرم والے اب جا کے سمجھا رہے ہیں
کہ کیا سوچ کر بت کدہ چھوڑ آئے

ہواؤں کے ساتھی ہواؤں کی زد پر
چراغوں کو جلتا ہوا چھوڑ آئے
حقیقت سے آگاہ ہوتے رہیں گے
حریفوں میں اک آئینہ چھوڑ آئے

خدا جانے کیا کیا فسانے بنیں گے
اگر خط کوئی آدھ جلا چھوڑ آئے
وہ تھا کونسیلیں چھوٹنے کا زمانہ
قفس تک بھی آشنا چھوڑ آئے

دیارِ حرم سے درِ بت کدہ تک
محبت کا اک سلسلہ چھوڑ آئے
اٹھے شوقؔ یوں اپنا دامن جھٹک کر
کئی اک کو حیرت زدہ چھوڑ آئے

راج نہیں تھا. دیویانی پیار میں ناامید
ہو جاتی ہے اور اس پر ایسا بھی وقت آتا
ہے کہ وہ کچ دیو کو بھائی ماننے پر مجبور ہو
جاتی ہے. غرض بال گندھرو دیویانی کے
کردار کی ان مختلف اور متضاد کیفیات کا
اپنی اداکاری میں بڑے حسین اور دلکش
پیرائے میں اظہار کرتے تھے.

मधुमधुरा तव गिरा

मधुकर वन-वन फिरत करी

गुंजारवाला

جیسے گیت تو مانو رس کی برسات کرنے لگے
تھے اسی طرح دیویانی کی دل شکنی اور رنج
وغم کا اظہار کرنے والے

आता राग देई

लग्न होईना

جیسے گیتوں پر تو جیسے سارا ناٹک گھر
غم کی گہری دھند میں ڈوب کر رہ جاتا
تھا.

اگلے چند برسوں میں کرلوسکر کمپنی کا
شیرازہ بکھر گیا اور بال گندھرو نے بوڈس
اور ٹیمبے کی معاونت میں اپنے ہی نام سے
گندھرو ناٹک منڈلی قائم کی.
۱۹۱۳ء میں بال گندھرو نے اپنی منڈلی
کی طرف سے

संशय-कल्लोळ

...ے کرلوسکر ناٹیہ گرہ میں پیش کیا. اس
ناٹک کی ہیروئن ریوتی کا کردار بھی بال

گندھرو ہی نے ادا کیا۔ سنشئے کلوڑ سے پہلے انھوں نے شاردا اور

मतिविकार

ان ہی دو سماجی ناٹکوں میں ہیروئن کے کردار ادا کئے تھے۔ شاردا ایک عورت کی زندگی کا المیہ تھا اور اس میں غم انگیزی کی شدت تھی اس لئے یہ ناٹک کافی کامیاب بھی ثابت ہوا تھا۔ لیکن "متی وکار" میں ان کا کردار کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا حالانکہ اس کی ہیروئن ریوتی کا کردار اداکاری کو ابھارنے اور اجاگر کرنے والا تھا۔ مزاح کے لطیف عنصر کے ساتھ اس ناٹک میں بال گندھرو نے ریوتی کے کردار میں ہجر و وصال کے لطیف کیفیات کی عکاسی انتہائی جذباتی انداز میں کی ہے ریوتی ایک بیوہ ہے اس کے ناز نخروں کی عکاسی بال گندھرو نے اپنی اداکاری میں کچھ ایسے خوبصورت انداز میں کی ہے کہ ریوتی میں بیوہ ہوتے ہوئے بھی کہیں چھچھوراپن نظر نہیں آتا۔ "میں مغرور ہوں میں شکی مزاج ہوں" یہ دعویٰ خود ریوتی اشون سیٹھ کے روبرو کرتی ہے۔ ریوتی کے کردار کی یہ خاصیتیں۔ یہ جھلکیاں بال گندھرو کی شوخ اداکاری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ریوتی کے گیتوں کو بھی بال گندھرو نے تال سُر سے سجا سنوار کر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

बाल गندھرو کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ناٹکوں میں

स्वयंवर

एकच प्याला

یہ دو ناٹک ہیں۔ سوئمبر کی رکمنی کے کردار میں بال گندھرو ایک شاہزادی کی طرح بیش قیمت ملبوسات زیب تن کیا کرتے تھے اس کے برخلاف ایکچ پیالہ میں سندھو کے کردار میں انھیں بوسیدہ اور پھٹی ہوئی ساری پہننی پڑتی تھی۔ اپنے ہر کردار کے لئے وہ اپنے ملبوسات پر بے پناہ توجہ صرف کیا کرتے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ زیبائش اور ملبوسات سے متعلقہ لوازمات کی خریداری پر بال گندھرو بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ پائل ہوں ساریاں ہوں تو سبھی زردار ہوں۔ گھنگھرو پاتے ہوں تو یا سونے کے ہوں یا اگر چاندی کے ہوں تو ان پر کھرے سونے کا ملمع کیا ہو۔ اکثر کرداروں میں وہ ایک منقش مکٹ پہنا کرتے تھے جو تھا تو چاندی کا لیکن اس پر بھی کھرے سونے کا ملمع کیا گیا تھا ملبوسات اور ان کی زیبائش کے ساتھ ساتھ انھیں عطریات کے استعمال کا بھی بے حد شوق تھا۔ اپنی پوری سج دھج کے ساتھ جب وہ اسٹیج پر پہنچتے تو ان کا روم روم اور ان کے ملبوسات کا ایک ایک تار خوشبو میں بسا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لاکھوں کی آمدنی کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست اور تہی دست رہے۔ غرض اسٹیج پر ان کے بناؤ سنگھار کا یہ عالم ہوتا تھا کہ وہ اس میدان میں عورتوں کے لئے ایک نمونہ تصور کئے جاتے تھے۔

سنشئے کلوڑ کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ہی سوئمبر نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ ان دونوں ناٹکوں میں بال گندھرو کے کردار جداگانہ ماحول سے تعلق رکھنے والے مختلف نوعیت کے تھے پھر بھی انھوں نے ان میں انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ نباہ کر ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ کرشن کو بلا واسطہ دیکھنے سے پہلے ان پر فریفتہ ہو جانے والی رکمنی۔ "دادا وہ آ گئے نا؟" کہتے ہوئے جب اسٹیج پر داخلہ لیتی ہے اس داخلہ کے وقت بال گندھرو کی کیفیت اور اس مکالمہ کی ادائیگی کا انداز اور لہجہ کچھ ایسا جادو اثر ہوتا تھا کہ اس کی تعریف الفاظ میں یقیناً دشوار ہے رکمنی کا سارا اضطراب گویا بال گندھرو ہی کے وجود سے ٹپکا پڑتا تھا۔ "دادا وہ آ گئے نا؟" اس ایک چھوٹے سے مکالمہ کی ادائیگی کے ساتھ ہی مانو رکمنی کا کرشن کے لئے بے پناہ پیار بے ساختہ آشکارا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بال گندھرو کی رکمنی کے روپ میں وہ ENTRY وہ مکالمہ اور ان کی وہ اداکاری مراٹھی اسٹیج کی دنیا میں ہمیشہ بے مثال رہے گی۔

اس ناٹک کے دوسرے ایکٹ میں جب رکمنی اپنی ماں کے پاس کرشن کی تعریف کرتی ہے اس موقع پر بال گندھرو کرشن کے لئے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار جذبات کی تمام تر گہرائیوں میں ڈوب کر کرتے ہیں اور اسی موقع پر رکمنی آ کر یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کے نتیجے میں سوئمبر کا پنڈال شعلوں کی نذر ہو جائے گا اور ودربھ دیش کی آبرو خاک میں مل جائے گی۔

اس پر رکمنی اسے بڑی چالاکی اور حوصلہ مندی کے ساتھ جواب دیتی ہے اس منظر میں بال گندھرو اپنی خوبصورت اداکاری کے ساتھ اپنے مکالمے بھی بے پناہ دلفریب انداز میں ادا کرتے ہیں گویا ان کا کردار حسن کردار اور حسن گفتار دونوں کا بہترین نمونہ ہو رکمنی کے چیلنج کا جواب دیتے ہوئے جب

بھیشمک مہاراج یہ کہتے ہیں کہ نہیں ، سوئمبر کا پنڈال نہیں ملے گا. تب رکمنی کا دل بڑی مسرت سے کھل اٹھتا ہے اور وہ مہاراج کی گردن میں اپنی باہیں حائل کرکے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھتی ہے بابا یہ سچ نا ؟ بال گندھرو نے رکمنی کے جو حسرت آگیں تاثرات اپنے چہرہ پر ظاہر کئے ہیں انھیں تاثرات کا حسین عکس ہم ناظرین کے چہروں پر رقص کرتا ہوا دیکھ پاتے ہیں. یہ بال گندھرو کا کمالِ فن نہیں تو اور کیا ہے ؟

اس کے بعد جب سوئمبر منڈل میں فریقین کے بیچ لڑائی شروع ہونے کو ہے رکمنی گہرے درد اور تڑپ کے ساتھ اپنے بھائی کو تنبیہ کرتی ہے." دادا" تلوار میان میں ڈال لو!" اور اس کے ساتھ ہی دلدوز انداز میں کرشن جی سے درخواست کرتی ہے " مہاراج ! تلوار میان میں ڈال لیں " اس وقت بال گندھرو مکالموں کے لب ولہجہ میں جو لطیف فرق پیدا کر دیتے ہیں وہ بس دیکھنے سننے سے ہی تعلق رکھتا تھا اور ایسے ہی میں رکمنی کے یہ درد انگیز مکالمے" جلی رکمنی کا سوئمبر بھنگ ہوگیا اپنی مرضی سے اپنا بر چننے کا ادھیکار بھی اس نے تیاگ دیا! جب بال گندھرو کی زبان سے ادا ہوتے تو ان کے تاثرات کا اندازہ بھی مشکل ہوتا .

سوئمبر میں رکمنی کی خود کلامیاں بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں . بال گندھرو ان خود کلامیوں کو عجیب دلکش پیرائے میں اور دلفریب اداکاری کے ساتھ ادا کرتے تھے . انھیں مکالموں کی ادائیگی میں اور حرکات وسکنات کی مدد سے جذبات کے اظہار میں

غزل

دعا بن چکا تو اثر تک بھی آ

نظام الدین نظام

۹۴/۹۶-۳-۱۷ بی-اے ویرانی مارگ

بمبئی ۴۰۰۰۰۸

تصوّر کے مہماں، نظر تک بھی آ
دُعا بن چکا تو اثر تک بھی آ

محبت پہ میرا بھی ایمان ہے
یہاں تک کہ تو میرے گھر تک بھی آ

جڑیں کھودنا کارِ بے فیض ہے
ہوس کی رُتوں میں ثمر تک بھی آ

ہوا پر تجھے اتنا وشواس ہے
تو مجھ ایسے آشفتہ سر تک بھی آ

ملاقات خواہش پہ ہے منحصر
"نہیں" سے ذرا بڑھ "مگر" تک بھی آ

بلندی کی اِکسایہ بھی تصویر ہے
اُتر پستیوں میں، بشر تک بھی آ

سفر کی صعوبت کا احساس کر
کبھی خلوتوں سے خبر تک بھی آ

عطا کر قلم کی سیاہی کو نور
نہیں یہ کہ دستِ ہنر تک بھی آ

بے پناہ مہارت حاصل تھی.

سوئمبر ناٹک میں بال گندھرو کی اداکاری اور ان کی گائکی دونوں میں لطیف امتزاج اور حسین ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی. جو بھی کردار انھیں ملتا اپنی خداداد صلاحیتوں سے وہ اس میں جان ڈال دیتے تھے. اپنی زبردست گائکی سے جو ان کا خاندانی ورثہ تھا. رکمنی کے گیت وہ ایسے دل آویز انداز میں گاتے تھے کہ سارا تھیٹر مستی میں جھومنے لگتا تھا سارے سامعین بے خودی کے سمندر میں ڈوب جاتے تھے. سبھی یہ چاہنے سوچنے لگتے تھے کہ یہ گیت کبھی ختم نہ ہو مستی وبے خودی کا یہ سلسلہ کبھی نہ ٹوٹے.

بال گندھرو کی اداکاری کی سب سے زیادہ کامیاب اور شاندار منزل ہے. "ایکچ پیالہ" اور اس کی ہیروئن سندھو کا عظیم کردار. لوگ اس سندھو کو ایک شراب کے مارے مرد کے ہاتھوں شکار ہونے والی بے بس عورت اور مظلوم بیوی نہ سمجھیں.

سدھاکر کی نظروں میں وہ ایک روشن ضمیر عورت ہے جس کا خمیر ریاضت اور بندگی میں ڈھلا ہوا ہے جب ہم بال گندھرو کو سندھو کو بانے میں دیکھتے ہیں تو اس کی یہ تصویر ہمیں حقیقتاً حقیقی دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں شوہر پرستی کا ایک حسین اور دلکش مجسمہ ہے. سندھو کو دیکھ کر ناظرین یہ تمنا کرتے تھے کہ "ایکچ پیالہ" کی سندھو کو ہم بار بار دیکھیں اور بس دیکھتے رہیں. بال گندھرو کو صرف اسی ناٹک میں اپنے بچے کے لیے بے پناہ ممتا کا اظہار کرنے والی ماں کا کردار ملا ہے.

غزل

بسم اللہ عدیم
جامع مسجد لکڑی چرک
برہان پور

اب تو دل کی پیاس بجھا لے ۔۔۔ سا غر بن گئے دل کے چھالے
کس کے تبسم کی ہے خوشبو ۔۔۔ کس نے بخشے دِل کو اُجالے
چاند جو تیری آہٹ پائے ۔۔۔ بادل میں چہرے کو چھپا لے
جیون کو سکھ دان ملے گا ۔۔۔ تُو جو مجھ کو اپنا بنا لے
دنیا بھی اک بحرِ اَلَم ہے ۔۔۔ کشتی اپنی پار لگا لے
مجھکو عدیم احساس ہوا یہ ۔۔۔ جیتے ہیں دنیا میں جیالے

घास घे रे तान्हया बाळा

बघू नको मजकडे

ندھو کے یہ ممتا بھرے گیت بال گندھرو نہایت جذباتی انداز میں گایا کرتے تھے اور

कशी या त्यजू पदाला

सत्य वदे वचनाला

ان گیتوں پر تو سارا ہال

"ONCE MORE"

کی صداؤں سے گونج اٹھتا ONCE MORE تھا۔ سنگیت ناٹکوں میں

"ONCE MORE"

کی صورت میں عوام سے داد حاصل کرنا ہر ایک فنکار کا مقدر نہیں ہوتا یہ بال گندھرو ہی تھے کہ اپنے ہر ناٹک میں کسی نہ کسی گیت میں اپنے شائقین سے داد ضرور وصول کیا کرتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ بات بڑی سہل سی بات تھی۔
"ایکچ پیالہ" کے بعد بال گندھرو نے دروپدی، آشا نراشا۔ نندکمار

विधि लिखित

कान्होपात्रा

अमृतसिद्धी

یہ ناٹک اسٹیج پر پیش کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی ناٹک

मानापमान

स्वयंवर

एकच प्याला

ے مقابلے کا نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اپنے کسی بھی ناٹک میں اپنی اداکاری اور اپنی کردار نگاری کے ساتھ معمول کی طرح انصاف نہ برت سکے ہوں۔

اگر ناٹک کے اصل معیار ہی میں فرق آجائے تو بے چارہ فنکار کیا کریگا

جہاں جوانی کے عالم میں بال گندھرو زنانہ لباس میں انتہائی حسین و جمیل دکھائی دیتے تھے وہیں ڈھلتی عمر میں بھی شائقین اس حسن کی جھلک محسوس کئے بغیر نہیں رہتے تھے عمر کے ساتھ طبعی حسن میں بھلے ہی کچھ کمی ہو جائے لیکن فنکاری کا حسن تو بسا اوقات کم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے۔ ان کے دانت بڑے خوبصورت تھے۔ ان کی مسکراہٹوں میں جاذبیت اور ہنسی میں دلکشی تھی۔ چہرے سے جذبات کی ترجمانی کرنے کے فن میں وہ ماہر تھے

اپنے کردار سے اپنی ذات کو وہ بڑی ہی خوبصورتی سے ہم آہنگ کر لیا کرتے تھے جس کی بنا پر ان کی اداکاری اور گائکی دونوں بالکل فطری ہوا کرتی تھیں۔ گانے کے دوران وہ اداکاری کے ساتھ سُر تال کا۔ اور سُر تال کے ساتھ اداکاری کا برابر خیال رکھا کرتے تھے یعنی اداکاری کرتے ہوئے گائکی کی طرف سے اور گانے کے ساتھ اداکاری کی طرف سے کبھی بے توجہی نہیں برتتے تھے۔

غرض بال گندھرو اپنی ذات میں خوبصورت اداکاری اور گائکی کا ایک خوبصورت مجموعہ تھے اور اسی لیے سنگیت کی دنیا نسوانی کردار ادا کرنے والا ایسا عظیم ہیرو اداکار اور اداکار ہیرو ان کی مثال کم از کم اب تک تو یقیناً نہیں پیدا کر سکا۔

ہِ ہ، بالگندھرو!
اَ ۔ بالگندھرو!

ہوا خوری

صبح کی ہوا میں یوں تو بڑی خوبیاں ہیں اور اگر یہ ہوا کھائی جائے تو آدمی کے تن و توش کو کافی فائدہ پہنچاتی ہے لیکن اس میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ بس تھوڑی ؟ دیر کے لیے چلتی ہے۔ ادھر چلی نہیں اور اُس گئی۔ جو ہوا خورشید عالم تاب کے طلوع ہونے سے پہلے چلے اور اس کی پیروی کرنے کے۔ اتفاقاً ہو جائے۔ اس ہوا سے اس کے ہوا خور ہونے کا بھلا کیا بھلا ہو سکتا ہے۔ ایسی چلبلی اور چنچل نسیم سحری کی خاطر منہ اندھیرے اٹھ کر گھر سے باہر نکل جانا اور اس کی تلاش میں میلوں دور کا سفر (جسے ناظمی سیر کہا جاتا ہے) پرلے درجے کی [illegible] ہونا کہاں کی دانشمندی ہے (ویسے ہم کہاں کے دانا ہیں) نسیم سحری کی لوچ کا رخ نہیں کرتی۔ یہ طبعاً آرام پسند اور تھوڑی سی غیر ہموار واقع ہوئی ہے۔ اسے کھلی فضا، اور کھلے میدانوں [illegible] کار ہوا کرتا ہے۔ کھلے میدانوں تو خیر ہر جگہ دستیاب ہو جاتا ہے لیکن کھلی فضا اور کھلے میدان بھی نہ سمندر کے کنارے اور پہاڑوں کے دامن میں نصیب ہوتا ہے۔ یہ ہوا ویسے چلا کرتی ہے جہاں اپنے گھر سے پہنچتے پہنچتے تک سورج ہمیشہ کی طرح مشرق سے مقررہ وقت پر نمودار ہوتا ہے کیونکہ سورج سورج ہوتا ہے کوئی ٹرین یا پلین نہیں ہے کہ وقت پر آئے یا بالکل ہی نہ آئے۔ نسیم سحری کے ساتھ دوسری مشکل یہ ہے یہ سورج کے ساتھ بندھی ہوئی بھی نہیں ہے کہ سورج جب تک نہ نکلے چلتی رہے گی۔ سورج اس کا پابند (BELIAVER) نہیں ہے۔ نظام شمسی میں اس قسم کے قاعدے رائج نہیں ہیں۔ ہر شے ایک اکائی ہے اور ہر شے کو ایک انفرادیت ہے اور نسیم سحری تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی راہبہ ہے یا کوئی پردہ نشین مسماۃ۔

نسیم سحری اور صبا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ غالباً اسی کی
مقبولیت ہے اور عرف عام کے مقابلے میں زیادہ مقبول [illegible]
[illegible] لئے ہر شاعر [illegible] کو بھی اپنے مجموعۂ کلام [illegible] کہتے
ہیں کہ بعض شاعر نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام [illegible]
نہیں رکھا [illegible] ہمارے مطالعے میں ایک ادبی رسالہ بھی رہا ہے جس کا
نام "صبا" تھا حالانکہ اس میں بڑے سخت مضامین شائع ہوتے تھے۔
جو لوگ نسیم سحری کے جھونکوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتے۔ ان
سے اکثر و بیشتر کو شام کی تازہ ہوا کھاتے دیکھا گیا ہے۔ دن بھر اندھے
کے بعد ہوا تازہ کیسے رہتی ہے۔ یہ انھیں ہی معلوم ہے ہو سکتا ہے
کہ یہ ہوا کا دوسرا اسٹاک ہو۔ اس اسٹاک کے شائقین کی تعداد
نسبتاً زیادہ ہوتی ہے بلکہ بعض مقامات پر اتنی زیادہ ہوتی ہے
کہ خود ہوا کو چلنے میں دقت محسوس ہوتی ہے اور وہ لوگوں کے مجمع
میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ شام کے اوقات میں ہوا خوروں کی اتنی
زیادہ تعداد کی اصل وجہ ہوا کی خوبی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی
ہے کہ اس ہوا سے مستفید ہونے کے لئے صبح سویرے بستر سے الگ ہونے
کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ گھڑی نہیں دیکھنی پڑتی۔ گھر سے باہر
جانے کے لیے بیوی کی اجازت نہیں لینی پڑتی۔ گھر واپس آنے کے
بعد بھی جلدی نہیں ہوتی۔ گھنٹوں یہ تازہ ہوا کھاتے رہو۔ کوئی نہیں
کہتا کہ اب اور کتنی کھاؤ گے۔ گھر جاؤ بچے انتظار کر رہے ہیں
کچھ لوگ تو اس وقت تک گھر نہیں جاتے جب تک کہ بچے سو نہ جائیں
اور کچھ لوگ تو جن کی عاقبت کی خبر خدا جانے۔ بیویوں کے سو جانے
کے انتظار میں تازہ ہوا ہی کھاتے رہتے ہیں۔ گھر جا کر بیوی کی ڈانٹ
کھانے سے یہ ہوا کھانا بہرحال بہتر ثابت ہوتا ہے۔

شام کی تازہ ہوا کے شائقین کے تعداد میں زیادہ ہونے کی
وجہ۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ نسیم سحری سے لطف اندوز ہونے
کے لیے خواتین گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ صبح صبح میک اپ کرنا
ممکن بھی نہیں ہے۔ شام کی تازہ ہوا انھیں بھی بھاتی ہے۔ یہ صبح
کی ہوا کے مقابلے میں ذرا تیز بھی چلتی ہے اور ان کے آنچل مجلس
اقوام متحدہ کی مرکزی عمارت پر لہرائے جانے والے پرچموں کی
طرح ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔

شام کی ہوا اس لئے بھی لوگوں کو زیادہ مرغوب ہے۔ یہ ہوا
ہوتی تو سادہ ہے لیکن مختلف اور متعدد ذریعوں سے ہونے والے

بدر نظیری

معرفت ظفر اسٹورس ڈاکخانہ گوراڈو ملز۔ پن ۱۲۳۱۱۸
ضلع گیا (بہار)

ہونا رہا وہ خواب میں شب بھر لہو لہو
نکلا سحر نے شام کا خنجر لہو لہو

احساس کے قلعے سے نہ باہر بلائیے
ہے یاد کی فصیل کا پتھر لہو لہو

خونِ جگر کو اتنا بھی بہنے نہ دیجیے
نکلے گا ورنہ کل سرِ خاور لہو لہو

بستر پہ میرے رات شکن ایک بھی نہ تھی
دیکھا سحر نے تکیہ و چادر لہو لہو

وہ کیسے پاک ہوتا، نہاتا وہ کس طرح
گنگا لہو لہو ہے تو ساگر لہو لہو

اس دور کا مسیحا اسے کہہ رہے ہیں سب
دیکھا تھا جس کو میں نے مکرر لہو لہو

پتھر چلا رہا تھا فقط گھر کا ایک شخص
تھوڑی ہی دیر میں ہوئے گھر بھر لہو لہو

دیکھو تو اس کی شوخی و رنگِ حنا کا شوق
آیا ہے وہ کے نامہ کبوتر لہو لہو

وہ درسِ امن دیتا تھا لیکن یہ کیا ہوا
آ کر گرا ہے اپنے ہی در پر لہو لہو

تاریخ ہند کا وہ ورق پڑھ سکا نہ بدرؔ
پہلے سے ایک دن تھا نومبر لہو لہو

• امروز قیصر
عرفی کلینک سرائے میاں علیگڈھ ۲۰۲۰۰۱

انکشاف

آج سے ٹھیک دس سال پہلے
ایک مفلس جواں سال لڑکی کی آنکھوں میں
دیکھے تھے سپنے سنہرے
امنگوں کا موسم ابھی جسم و جاں پر
نئے رنگ بکھرا کے خوش ہو رہا تھا
سرد ہاتھوں میں امید کے نرم پودوں کو تھامے
روح میں خواہشیں بو رہا تھا
دھڑکنیں مختلف
سابقہ دھڑکنوں سے
جانے کس کے خیالوں میں گم صم
گھر کی دہلیز پر اس کی نظریں
جانے کس کیلئے منتظر تھیں
سوچتی ہوگی شہزادہ کوئی
آئے گا اب کسی سلطنت سے
اور میری ہتھیلی پہ مہندی کی خوشبو سجا کر
مانگ چاند اور ستاروں سے بھر کے
میرے دکھ سکھ کا ساتھی بنے گا
لیکن اب ٹھیک دس سال کے بعد
اس کی بے نور آنکھوں میں
رنگین سا کوئی سپنا نہیں ہے
دھڑکنیں معتدل
لب پہ خاموشیوں کا تسلط
نگاہوں سے ویرانیاں جھانکتی ہیں
بال بھی رنگ تبدیل کرنے لگے ہیں
خواہشوں کے نگر میں عجب انقلاب آگیا ہے
پاؤں اٹھتے ہیں محتاط ہو کر
چال میں اعتدال آگیا ہے
شاید اس کو پتہ چل گیا ہے کہ مفلس کی دہلیز پر
کوئی شہزادہ آتا نہیں ہے

خوشبوؤں کے طفیل شمیم بن جاتی ہے۔ سمندر کے ساحل پر بیٹھے ہوئے ہوا خور حضرات جن کی پیٹھ سمندر کی طرف ہوتی ہے معطر ہو جاتے ہیں۔ ہوا خوری کے ساتھ عطر نوشی۔ پورا ڈنر ہو گیا۔ ڈنر گھر پر پکا ہوا کھانا ٹھنڈا ہوتا رہے اس کی پرواہ شرفا نہیں کیا کرتے۔

دن میں جو ہوا ملتی ہے وہ بھی سادہ نہیں ہوتی۔ اسے قابل قبول بنانے کے لیے پولیوشن نام کی ایک چیز استعمال کی جاتی ہے۔ اس پولیوشن میں گرد بکثرت ہوتی ہے۔ وہ گرد نہیں جسے کسٹم انفیسر یا پولیس کے عہدہ دار پکڑ سکیں۔ وہ گرد تو کہیں اور سے بڑی آسانی کے ساتھ درآمد کی جاتی ہے اور بڑی مشکل سے برآمد کی جا سکتی ہے۔ دن کی ہوا میں جو گرد پائی جاتی ہے وہ ملکی صنعت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں دھوئیں کی بھی آمیزش ہوتی ہے اگر کوئی کسر نہ رہ جائے (مشہور تو یہ بھی ہے کہ دن کی ہوا میں کچھ لوگوں کی آہ سوزاں کا بھی دھواں ہوتا ہے لیکن یہ افواہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ آہ سوزاں کا صحیح وقت رات کے دس گیارہ بجے کے بعد کا ہوتا ہے)

دن میں چلنے والی ہوا بالعموم گرم ہوتی ہے اور کئی قسم کی سرگرمیوں کو جنم دیتی ہے۔ جب اس ہوا کا درجۂ حرارت بہت زیادہ اوپر چلا جاتا ہے تو اس ہوا کو لو کہا جاتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں بعض شہر دن میں ہوا نہیں چلتی صرف لو چلا کرتی ہے۔ اس ہوا میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ یہ آدمی کو لگ جاتی ہے۔ ویسے تو ہوا بھی لگ سکتی ہے مثلاً کوئی دیہاتی شہر میں آکر بس جائے اور دو چار سال بعد بڑی مشکل سے ریل کا کرایہ جمع کرکے اپنے گاؤں واپس جائے اور اپنے پرانے ساتھیوں سے اس طریقے سے نہ گھلے ملے جس طریقے سے وہ پہلے ملا کرتا تھا تو اس کے بارے میں دو گھنٹوں کے اندر اندر پورے گاؤں میں یہ ہوا پھیل جائے گی کہ اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔ شہر کی ہوا لگنا ایک معمولی بات ہے لیکن لو لگنا ذرا خطرناک معاملہ ہے اس کا علاج کرانا اور وہ بھی ایک شریف آدمی سے۔

ہوا کی ایک قسم باد شمالی بھی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے (ناقص) معلومات یہ ہیں کہ یہ ہوا قطب شمالی سے چلتی ہے (ہمارا خیال یہ ہے یہ قطب شمالی شمال ہی میں کہیں واقع ہوگا اور شمال کی نعمتیں جنوب میں ذرا کم پہونچا کرتی ہیں۔ اس میں نظام شمسی کا دخل کم ہے) قطب شمالی کے ذکر پر یاد آیا کہ جب ہم نے پہلی

مرتبہ "قطب از جا نمی جنبد" کا محاورہ سنا تھا تو ہمارا ذہن دلی کے قطب مینار کی طرف چلا گیا تھا۔ (کئی دنوں بعد واپس آیا)

جب ہم نے جغرافیہ کی کتابیں پڑھیں اور اٹلس دیکھا (جس کا دیکھنا خود ایک مصیبت ہے) تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قطب شمالی، قطب مینار کی طرح کوئی عمارت نہیں ہے اور یہ کہ اس کے جواب میں ایک قطب جنوبی بھی موجود ہے۔

قطب جنوبی اور قطب شمالی میں یوں تو بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ ہے تو بس اتنا کہ قطب جنوبی کی سمت سے کوئی ہوا نہیں چلتی۔

آدمی اپنے آپ کو بھول نہ جائے اس لئے ایک ہوا بادِ صرصر کے نام سے بھی چلا کرتی ہے لیکن کبھی کبھی۔ جو یہ ہوا چلے تو معمولی آشیاں ہی نہیں چمن کے چمن بھی اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اب جو امکانات بن رہے ہیں کچھ اس طرح کے بن رہے ہیں کہ اس میں کسی بھی قسم کا ہوا کا گذر ہی نہ ہو۔ ویسے بھی بہت سے گھر ایسے ہوتے ہیں جس میں کسی شخص مخصوص کے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ بادِ صرصر بھی یہاں دبے پاؤں گذر جانے پر مجبور ہوتی ہے۔

ہماری رائے میں دنیا میں اس وقت جتنی بھی ہوائیں رائج ہیں ان میں سب سے اچھی ہوا وہ ہے کہ جسے بادِ مخالف کہا جاتا ہے بادِ مخالف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے یہ ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ سانس کی طرح اس بادِ مخالف کے تھپیڑے کھا کر جو جی لیا جو نپولین بونا پارٹ ہوگیا۔ اور پارٹ بھی کون سا پارٹ۔ پارٹ وَن۔

شرح خریداری

قومی راج

ایک سال کیلئے دس روپے : دو سال کیلئے ۲۰ روپے
تین سال کیلئے ۲۷ روپے : چار سال کیلئے ۳۶ روپے
(و) پانچ سال کیلئے صرف ۴۵ روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر بھجوائیے۔ کوپن پر پورا نام، پتہ اور پن کوڈ نمبر اردو کے ساتھ ہندی، مراٹھی یا انگریزی میں بھی صاف صاف لکھیے، تاکہ صحیح پتے کا اندراج کیا جاسکے۔
پتہ کی تبدیلی کی اطلاع نمبر خریداری کے ساتھ دیجیے۔ اپنی رائے لکھیے اور دوستوں کو خریداری کے لئے توجہ دلائیے۔

ترسیلِ زر کا پتہ :-

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر،
بیرک نمبر ۱۹۔ نزد سروچی بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۱
فون نمبر ۲۰۲۱۵۳۰

Tel. 2021530

مراسلت کا پتہ :-

ایڈیٹر قومی راج،
ڈائریکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر،
۵ واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ،
مقابل منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۳۲

Tel Nos. { 2020651 / 2023957 }

فون نمبر ۲۰۲۰۶۵۱ / ۲۰۲۳۹۵۷

قومی راج میں

مطبوعہ کسی بھی مواد کو بلا اجازت نقل کیا جاسکتا ہے مگر اشاعت کے بعد اس کی ایک کاپی ڈائریکٹر جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز گورنمنٹ آف مہاراشٹر، منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲ کے نام ضرور آنی چاہیئے۔

ادارہ

ایم عالم ایم اے
کالی باغ ، بتیا - ۸۴۵۴۳۸
مغربی چمپارن (بہار)

غالب کا نظریہ حیات

ایک انگریز ادیب نے کا کہنا ہے کہ " زندگی کی آندھیوں کا مقابلہ کرتے کرتے انسان اور بھی طاقتور ہو جاتا ہے ، مسلسل ٹکر سے اس کی قوتِ مدافعت "STRENGHT OF DEFENCE" اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔"

سرجان سائن کہتا ہے کہ :۔ " یہ سمجھنا نادانی ہوگی کہ زندگی کا طول اور مسرتوں کا طول مساوی ہے ۔" اور ایک چینی فلاسفر نے دنیا کے بارے میں نشان دہی کی ہے کہ :۔ " اس میں پل زیادہ ہیں اور راستے کم ۔"

اس طرح معلوم ہوا کہ دنیا کا ہر ادیب یا شاعر یا فلسفی کائنات اور حیات کے متعلق ایک مخصوص نظریہ کا حامل ہوتا ہے ، یہی نظریہ (IDEALOGY) زندگی اور تجرباتِ زندگی کو سمجھنے اور پہچاننے میں مدد دیتا ہے ۔

لفظ حیات بہت جامع اور وسیع لفظ ہے ۔ زندگی کے بارے میں الگ الگ ادیبوں ، شاعروں اور فلسفیوں کا الگ الگ نقطۂ نظر ہے ۔

ہیگل کے نزدیک زندگی ایک عظیم دماغ ہے جو انقلاب پذیر ہے ۔ مارکس نے جدلیاتی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM کہا ہے ، عمر خیام کا فلسفۂ حیات " کھاؤ ، پیو اور موج اڑاؤ " تک محدود ہے ۔ شیکسپیر کے نزدیک زندگی جدوجہد کا دوسرا نام (LIFE IS STRUGGLE) ہے ۔"

روسو انسانی زندگانی کے حقائق کا انکشاف یوں کرتا ہے کہ " انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ پابہ زنجیر ہے ، یعنی اخلاقی ، سماجی ، معاشرتی ، مذہبی اور دیگر شکنجوں میں کسا ہوا ہے ۔ مختلف اور متضاد بندشوں اور بندھنوں میں بندھا ہوا ہے ، غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں ، یہاں تفصیلات کا تذکرہ عبث ہے ۔

ادب میں غالب کا مقام نہایت اعلیٰ وارفع ہے ۔

رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ مغلیہ سلطنت نے ہندوستان کو تین عظیم چیزیں بخشی ہیں ۔ " اردو " غالب " اور " تاج محل " ۔

غالب کا ادب ایک بیکراں سمندر ہے ۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں غالب کے کسی نقطۂ نظر

کو بہ حسن وخوبی اجاگر کیا جا سکے۔ بہرکیف اس مقالے میں ہمیں غالبؔ کے زندگی سے متعلق نقطۂ نظر کا جائزہ لینا ہے۔ بعض لوگ غالبؔ کو اقبالؔ سے زیادہ رجائی شاعر تصور کرتے ہیں اور اس ضمن میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جہاں اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ ؎

صدائے لن ترانی سن کے میں اقبالؔ چپ ہوں
تقاضے کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

وہاں غالبؔ نے بہت پہلے یہ کہہ دیا کہ ؎

کیا ضرور ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ ہم بھی سیر کوہِ طور کریں!

نیازؔ فتحپوری نے کہا ہے کہ "غالبؔ مفکر طبقے کا پیش رو ہے جو زندگی کے زہر کو فکر کی روشنی میں زائل کرتا ہے۔"

یہ دنیا غالبؔ کے نزدیک بچوں کے کھیل کے میدان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ غالبؔ نے کہا ہے کہ: ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالبؔ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ زندگی اور غم لازم و ملزوم ہیں، غم کے بغیر زندگی میں لطف ہی نہیں ہے، کیوں کہ غم نہ ہو تو خوشی کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تکلیف نہ ہو تو آرام کا کوئی احساس نہ ہو، جیسا کہ دھوپ نہ ہو تو چھاؤں کی کوئی قدر ہی نہ ہو، پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جب تک سانس تب تک آس"۔ اس لئے انسان آس اور امید و بیم ہی کے سہارے مصائب و آلام اور تکالیف و شدائد کا مقابلہ خندہ پیشانی کے ساتھ کرتا ہے اور نامساعد حالات سے ڈٹ کر پنجہ آزمائی کرتا ہے۔ غالبؔ عیشِ غم اور لذتِ الم سے اچھی طرح آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ موت کے بعد ہی انسان کو غم سے نجات مل سکتی ہے۔ جب تک انسان دنیا میں ہے کسی نہ کسی طرح کے غم میں اندوہ سے دوچار ہونے پر مجبور محض ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

یہی وہ نظریہ ہے جس کی بدولت غالبؔ بیچ ہر حال

غزل

فردوس گیاوی
بنے خاں کی گلی
پنچائتی اکھاڑہ
گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

لذتِ غم مجھے ملتی یہ حسرت تھی اپنی
زندگی کر نہ سکی دستِ رفاقت اپنی

خوش نصیبی ہے تری، تجھکو ملی دولتِ غم
تجھ سا غم مجھ کو ملے یہ کہاں قسمت اپنی

در پہ جب آکے ہمارے اجل نے دی دستک
کام کچھ آ نہ سکی اپنے یہ دولت اپنی

ایک مدت پہ جو آئی تھی میرے لب پہ ہنسی
تجھ سے دیکھی نہ گئی پھر بھی مسرت اپنی

ایک تو ہی تو تھا اس شہر میں ہمدم میرا
کون اب لے گا ترے بعد ضمانت اپنی

بھول کر بھی نہ بلندی کی دعائیں دینا
خود کو نظروں سے گرا دیتی ہے شہرت اپنی

جانے کس موڑ پر بجھ جائے چراغِ ہستی
آکے لے جائیے فردوسؔ امانت... اپنی

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی نے پونے میں ۱۹۸۱ء کو ایک پروگرام کا اہتمام "اردو مراٹھی شام غزل" کے عنوان سے کیا۔ زیر نظر تصویر میں وزیر اعلی شری شنکر راؤ چوان حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔ تصویر میں وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ شری سید ... اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین ڈاکٹر ... نساری اور دیگر اردو اور مراٹھی کے ممتاز شعراء دیکھے جا سکتے ہیں۔

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

سکراہٹوں کی پھلجھڑیاں اور تبسموں کے انار چھوڑتے
ے جاتے ہیں۔ غالب کا کہنا ہے کہ دل محبت ہی کے
ہے۔ وہ دل جو دوسروں کی تکلیف دیکھ کر تڑپ
ہ دل نہیں ہے، جس دل میں درد نہیں وہ پتھر ہے
ا نرالا انداز ملاحظہ ہو، ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت
درد سے بھر نہ آئے کیوں ؟

نگریزی ادب کا ایک مشہور شاعر "شیلی" (SHELLY)
و "ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو
ریادہ غمناک خیال کی ترجمانی کرتے ہیں" یعنی

" OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELLETH SADEST THOUGHT ."

"یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگانی کا تجربہ جتنا زیادہ بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی حقیقت کھلتی جاتی ہے، انسانی زندگی غم کا ایک دفتر ہے جس میں کبھی کبھار کوئی لہر خوشی کی نکل آتی ہے" اور غم کا کوئی علاج نہیں ہے سوائے موت کے "اس حقیقت کو غالب نے نہایت ندرت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے ؎

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب نے زندگی کی مثال ایک شمع سے دیتے ہوئے کتنے پتے کی بات کہی ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر اسے گذار یا رو کر گذار دے

کسی نے بالکل درست فرمایا ہے کہ "غالب کے یہاں

زندگانی کا سوز وگداز زیادہ ہے۔ ان کی شاعری میں امید و بیم، عیش و غم، آرزو و شکست، مسرت وحسرت، کی رنگارنگی ہے، ان کے طنز میں جا بجا مزاح کی چاشنی (SENCE OF HUMOUR) ہے، کہتے ہیں کہ ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اور کہا :- ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
کہ زندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ان کے کلام میں گستاخی اور شوخی کی بھی کمی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ : ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

غالبؔ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصائب وشدائد پر کڑھنے اور کراہنے کے بجائے حوصلہ سے کام لیتے ہیں، اور قاری کو بھی حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کا ایک فلسفیانہ احساس ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا سے بڑے بڑے لوگ کوچ کر گئے، مگر دنیا کے کام بند نہیں ہوئے۔ جن کو مرنا ہے وہ مر ہی جائیں گے، موت پر ماتم کرنا اور فضول جان کھپانا مناسب نہیں ہے، مرنا اور پیدا ہونا اس دنیا کی پرانی ریت ہے۔

غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

کہا جاتا ہے کہ غم شاعری کے لئے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے۔ اس لئے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حسیات کو بیدار کرتا ہے۔ کامیڈی کے مقابلے میں ٹریجڈی کی فضیلت اور افضلیت کا راز یہی ہے۔
سنسکرت کا ایک فطرت شناس نقاد کہتا ہے کہ غم

محمد حنیف شاہد
مسجد نخی بی
۱۱، فاروق کیمپ - بھوپال (ایم پی) ۱۳

مضطرب کیا بنا دیا تم نے
ہم کو جینا سکھا دیا تم نے

ہر حقیقت کو جوش میں آکر
اک فسانہ بنا دیا تم نے

خود کو دن رات سجدے کرتا ہوں
دل کو کعبہ بنا دیا تم نے

رخ سے اپنے ہٹا کے آج نقاب
سارا عالم سجا دیا تم نے

ہوش اپنا رہا نہ دنیا کا
جام ایسا پلا دیا تم نے

اہل محفل بھی جھوم اٹھے شاہد
مقطع ایسا سنا دیا تم نے

تاثرات کا بادشاہ ہے ۔ ذرا گہری نظر ڈالئے
رخوانِ زندگی کا نمک بلکہ حاصلِ زندگی معلوم
اسی غم والم نے غالب کو فرش سے اٹھا کر عرش
یا ، اور اسی غم واندوہ کی بدولت رہتی دنیا
کی شاعری سرسبز و شاداب رہے گی ، جیوں
گذرتا جائے گا اس کے کلام کی تاثیر بڑھتی
ذرا دیکھئے تو زندگی کی اس حقیقت
کتنا اچھوتا اور خوبصورت ہے ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

طرح ہمیں غالب کے ادب میں انسانی نفسیات
مل کا سراغ ملتا ہے ۔ غالب کی مردم شناسی بھی
بدرجۂ اتم ہے ۔ غالب کبھی بلکہ کسی حال میں بھی
رتے نظر نہیں آتے ، گرچہ ان کو اس بات کا شدید
ہے کہ : ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بہرحال غالب کے فکر و فن میں ہزاروں اشعار ہیں
جو ان کے نظریۂ حیات کو اجاگر کرتے ہیں ، اس مختصر تخلیق میں
انہیں سمیٹنا ممکن نہیں ہے ۔ بہرحال غالب کا ادب ملک کا
قومی سرمایہ اور قومی ورثہ ہے

اب میں غالب کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ، یہ
شعر غالب کے نظریۂ حیات کو اجاگر کرتے ہوئے ہماری نئی نسل
کے لیے ایک خوبصورت مشعلِ ہدایت کا کام کر رہا ہے ؎

رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

شمارے سے اگر آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی
ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم
کی بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی
میں مسلسل جاری رہے ۔
صورتِ دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ
کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی ۔ خریدار حضرات بطورِ خاص نوٹ
فرمالیں ۔ تجدیدِ خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر
کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر
درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام ، پتہ ، پن کوڈ
نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں ۔
(ادارہ)

ڈاکٹر سید عبدالرحیم
انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسز
ناگپور

برار کے اُردو شعرا اور قومی یکجہتی

برار کی نرم و حاصل خیز زمین اور یہاں کی اثر پذیر جبلتوں نے ہر دور اور ہر طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ یہاں کی مردم شماری کے خاکہ میں نسلِ انسانی کی بے شمار رنگ و روپ اور خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں۔

دسویں صدی ہجری میں مسیح الاولیا حضرت عیسیٰ جند اللہ شہر ایلچپور میں پیدا ہوئے۔ ایلچپور اس وقت عماد شاہی حکومت کا پایہ تخت تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں سیاسی خلفشار کی وجہ سے مع اعزا برہان پور منتقل ہو گئے۔ ایک مجلس میں ان کے مرید شیخ برہان الدین راز الٰہی نے آپ سے دریافت کیا کہ حضور دنیا کیا ہے؟ آپ نے جواب میں ہندی کا ایک دوہا پڑھا جو مولانا روم کے مشہور شعر

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

کا بلیغ ترجمہ ہے۔ وہ ہندی دوہا یہ ہے۔

جو ہر کوں بسرا دے سو ہی
دنیا نانوں اسی کا کہی[1]

یعنی جو چیز ہری سے یعنی خدا سے بسرا دے یعنی غفلت میں ڈال دے اس کا نام دنیا ہے۔ صوفیائے کرام نے ہری اور خدا کو ایک روپ میں پیش کیا ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری میں شیخ غلام مصطفیٰ انسان، دنا ایلچپوری، موسوی مہدوی، اور رتیا بالاپوری برار کے صوفی شعرا گذرے ہیں جن کی شاعری میں برج بھاشا اور ہندو تہذیب کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری میں غلام حسین چشتی ایلچپوری (م ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء) اردو کے بلند پایہ صوفی شاعر گذرے ہیں۔ سادھو سنتوں اور دوسرے صوفی شعرا کی طرح ہندوستان میں مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تعلیم کی بنیاد عالمی مساوات، طہارتِ قلب اور بے نفسی پر تھی۔ ظاہر سے زیادہ باطن کی فکر کرنا ان کا اہم اصول تھا۔ ہندوستان کی بھکتی تحریک اور ویدانت سے صوفیائے کرام نے استفادہ کیا۔ ان ہی صوفی شعرا میں غلام حسین ایلچپوری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بقول ڈاکٹر سید نعیم الدین صاحب غلام حسین ایلچپوری ہندوستان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر قلم اٹھایا اور طویل نظم "ہندو مسلمان نامہ" یا "یکرنگ نامہ" لکھ کر اہلِ ہند کو اخوت و اتحاد کے رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

یوں دونوں جھنے ایک جاگا سوں آئیے
جگت میں مسلمان ہندو کہائیے
کمہار ایک ماٹی کے بھانڈے
ہوا کون ملا ہوا کون پانڈے
یوں دونوں جھنے کیوں بہکے چلے ہیں
کدھر سوں کدھر کو بھٹکتے چلے ہیں!
مسلمان مسجد میں سجدے کو دھا دیں
دو ہندو بھی پوجا کو دیول میں جائیں
وہاں جا کے ماٹی کی دیوار دیکھیں
اپس گھٹ میں جھانے تو دیدار دیکھیں
مسلمان تسبیح لمبی پھراویں
دو ہندو بھی مالا بغل سے دکھاویں
دکھانے ہیں لوگوں کو دانے پھرا کر
اپس منکا منکا نہ پھیریں پھرا کر
مسلمان اللہ کا نام بولیں
دو ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں

[1] برہان پور کے سندھی اولیا مصنفہ سید محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری (کراچی ۱۹۵۷ء) صفحہ ۸۴

ر ہاں سوں کہیں دل سوں اپنے بساریں
رد حاضر کو غائب سمجھ کر پکاریں
مسلمان جا ہوویں مکے کے حاجی
. ر ہندو کبھی جا ہوویں کاشی کے باسی
پھریں گھر بھرین ڈھونڈھتے ہو دیوانے
بس گھر میں دیکھیں تو جانے پہچانے
مسلمان سب غسل کر پاک ہو ویں
. ر ہندو کبھی اشنان کر تن کو دھوویں
بس کوں بنا کر پھریں ہو کے چھیلا
ریں تن کو اجلا رکھیں دل کو میلا
مسلمان پھرتے ہیں مسئلے کتابالـ
ر و ہندو کریں بید پوتھی کی باتال
بغل میں پھریں سحر کا . ے . کے دفتر
نہ سمجھیں پرت پنتھ کا ایک اچھر

مسلماں کوں گور میں لے دباویں
ر و ہندو کو لے کر اگن میں جلاویں
پڑی ڈھیر ماٹی نکل جیو گیا ہے
دبا کیا دیا ہے جلا کیا دیا ہے
مسلمان سنت کرا گوشت کھاویں
وہ ہندو چھدا کان چوٹی رکھاویں
وہیں سوں اسی بھانت کیوں ہو نہ آوے
یہیں آ کے جھگڑا دوئی کا مچاوے
دوئی عشق کے مذہب میں نہیں ہے یارو
مسلمان ہندو یوا چھر بچارو
تمہیں کفر و اسلام کی بات سمجھو
اندھیارے اجالے کو دن رات سمجھو
اسی رات میں دن ہے اور دن میں ہے رات
میری بات سمجھو تو ہے بات میں بات
مسلمان ہندو تمہیں فرض جانو!
پہچانت کوں دنیا میں جدوں فرض جانو[1]

شاہ غلام حسین وحدت الوجود کی دعوت دے کر وحدتِ ادیان کی طرف بلاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

مومن میں وہ مسلم میں وہ زاہد میں وہ عابد میں وہ
ہندو میں کیا ملحد میں کیا مرتد میں کیا ترسا میں کیا
کعبے میں وہ روضے میں وہ زمزم میں وہ کوثر میں وہ
کاشی میں کیا تیرتھ میں کیا گنگا میں کیا جمنا میں کیا
مسجد میں وہ قبلہ میں وہ محراب اور ممبر میں وہ
دیوں میں کیا دیووں میں کیا پتھر میں کیا پوجا میں کیا
مسلوں میں وہ متنوں میں وہ جلدوں میں وہ پنوں میں وہ
پوتھی میں کیا بیدوں میں کیا پستک میں کیا گیتا میں کیا ؎

شاہ صاحب کی نظم ”اودھو نامہ“

خالص ہندوانہ موضوع پر لکھی گئی نظم ہے

شاہ صاحب کی وسیع المشربی دیکھئے کہ انھوں نے کرشن جی کے دوست اودھو کو جو یوگ اور گیان مارگ کے حامی تھے اپنا روحانی پیر تصور کیا اور خالص ہندوانہ ماحول میں روحانیات اور اخلاقیات کی تعلیم دی بقول ڈاکٹر سید نعیم الدین صاحب اودھو پر اردو میں سب سے پہلے شاہ صاحب نے نظم قلمبند کی ہے زبان برج کی استعمال کی ہے اور نظم کے لئے ہندی بحر کا انتخاب کیا ہے۔

میں ہوں گنگا کے وار رے اودھو
توں ہے جمنا کے پار رے اودھو
وار گنگا ہے پار جمنا ہے
بیچ بہتی ہے دھار رے اودھو
میں ہوں غوطے میں تو ہے دریا پار
مت ڈوبا ارے اونار رے اودھو
اس بنارس سوں توں گیا ل کاشی
میں پھروں ہردوار رے اودھو
ما کبیر بنز کس گیا ، سکھیا ،
ہرنا کبرنی کی بار رے اودھو

اس ری بیگھٹ کا کیا بھروسا ہے
بارگیں بھرنی بار رے اودھو
سو دامرنے کا نقد ہے اس ہاٹ
یہاں کا جینا ادھار رے اودھو
تن سوں نکلا پران پر جس آ سنسار
رو رہیں سکھیاں پکار رے اودھو
جب بٹھا کر اوٹھائی ڈولی میں
او سکو لاگے کہار رے اودھو
لے اتارے ہیں کوٹھری بھیتر
دہاں رہے سب اندھیار رے اودھو
لوگ سنگت کے سب نکل کے گئے
کوئی نہ کچھ بن ہے یار رے اودھو

جو بنا انگ دوپہر کا پھول
دو دِنا کی بہار رے اودھو
من کی من میں رہی سبھی نہ کہی
تو بھی من میں بچار رے اودھو
میں ہوں چوسار بیو کی بازی میں
جیت یا مجھ کوں ہار رے اودھو
دو نظر سوں ہوئے نہ ایک نظر
یک نظر اب ہے چار رے اودھو
توں ہے متھرا میں ہوں بندرابن
کنج کلیوں کی ٹھار رے اودھو
سیج سونی ہے نار پیاری کی
بن پیا کیا سنگھار رے اودھو
بھوک بھوگن کوں جوگ جوگن کوں
کوئی ہے خوش کوئی ہے خوار رے اودھو
کوئی سوہاگن ہے کوئی دوہاگن ہے
کوئی ہنسی کوئی یاں زار رے اودھو
رادھا تیری ہے گوپکا بھی تیری
رکھ توں دونو پو پیار رے اودھو
گوری تیری ہے سانولی بھی تیری
کھول گھونگھٹ نہار رے اودھو

---

[1] ایلچپور کے چند قدیم شعراء . مصنف وسیم دریزنا باد صفحات ۹۲، ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۴

ساری سکھیاں سہیلیاں تجھ پر
جیو سوں ہیں وار رہے اودھو
گڑکے پر نوں اوپر غلام حسین
کیا تن من نثار رہے اودھو[1]

نوابانِ ایلچپور میں نواب نامدار خاں پنی مہدوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ) اردو کے قادر الکلام شاعر گذرے ہیں۔ ان کا قلمی دیوان ان کی قادرالکلامی کا مظہر ہے۔

نواب صاحب کی علم پروری سے ان کے دربار میں بے شمار شعراء پرورش پاتے تھے۔ ان میں غیر مسلم شعراء کی تعداد بھی خاصی تھی۔ درباری شعراء میں ہیرا لال معجز قلم، حشمت رائے جانباز، نبار پرشاد طرب، بھوانی پرشاد نفیس، اور منشی رام سیوک شگرفی کے نام تاریخ کے کتابوں میں ملتے ہیں۔ نواب صاحب ہندو تہواروں میں خود شریک ہوتے اور اپنی مذہبی رواداری کا ثبوت پیش کرتے۔ جبرئیل ان کا تخلص تھا۔ ہولی پر ان کی دو نظمیں ہیں جن میں برج بھاشا کا استعمال کیا ہے۔

آئی پیارے ہولی نولی پیہ بن کیسی کٹیں گی رتیاں
ابے پھاگ میں ہم من کیلے بھیجو سکھی ری انکو بتیاں
راس بلاس ہولاس سے رچ رچ گائے گا سکھی آنے بھیجو
آنے پیا سنگ مس مس کھیلت بھاگ سو بھاگ کھلی ری دیکھو
نیاں منوا ترست ہیں جبرئیل تمہارے من کو
سب دن سوچ بچار کے من میں من موہن کی مدھرستیاں

دوسری جگہ نواب صاحب کہتے ہیں۔
آنگن اپنے کھام گڑا دُ جھولا جھولوگا دُ بجاوُ ہوا چند انگ لگادُ
تیل پھلیل کا ریل بھاد رنگ بکھیر و سیت شال ہولی کھیلو مٹا لال

ساری ناریاں گرنگار ہاتھوں گجرے گل میں ہار جبرئیل کھیلیں ترس بہا
گلال عبیر کا اٹھے غبار تب تو جبرئیل سرت سنبھال ہولی کھیلو مٹا لال[2]

۱۸۵۷ء کے بعد شعرائے برار گیسوئے غزل کو سنوارتے رہے۔ غزل کی ایمائیت اور رمزیت نے اپنے مخصوص لہجے میں شیخ و برہمن کے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ برار کے دورِ حاضر کے شعراء میں قیصر امراوتوی غزل گو شاعر تھے لیکن ان کی بعض نظموں میں قومی یکجہتی کا پیغام ملتا ہے اپنی نظم "اونچ نیچ کا بول" میں قیصر نے مذہبی اجارہ داروں پر تیر و نشتر چلائے ہیں اور ان کی عیاری کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کھول سکے تو کھول سکھی اونچ نیچ کا پول
اونچے اونچے پربت سارے
اونچے محل مینارے
آگ ہوا، مٹی، پانی نے
سوانگ رچائے سارے
جات پات کے بندھن پھر کیوں
آپس میں کیوں بیر
اونچ نیچ کی بات یہ کیسی
جس کا سر نہ پیر
یہ مسجد ہے یہ مندر ہے
یہ گرجا کی شان
دھرم دین کے رکھوالوں کی
کوئی دیکھے آن
کوئی خدا کا پہلا بیٹا
کوئی ولی اوتار
اونچی دیواریں اونچے منارے
پاپ کے بھرے دوار
کوئی نہ جانے کوئی نہ دیکھے
ڈھول کے اندر پول
کھول سکے تو کھول سکھی اونچ نیچ کا پول
سڑی گلی مٹی کے پتلے
دولت پر اترائیں
دھنوانوں کے لاکھوں ساتھی
رات کو دن بتلائیں
دھرم دین کے رکھوالے بھی
دھنوانوں کے ساتھ
جنتا کی قسمت کی کنجی
ان دونوں کے ہاتھ
لمبی داڑھی لمبے چُٹے
پیشانی پہ داغ
دوزخ ان کے گھر کا چولہا
جنت ان کا باغ
ہاتھ میں مالا چھری بغل میں
جپتے رام کا نام
بھولی بھولی جنتا ان کو
جھک جھک کرے سلام
کیوں ان کی باتوں کا بھرم ہے
جن کا ناپ نہ تول
کھول سکے تو کھول سکھی اونچ نیچ کا پول[3]

ماسٹر محمد حمزہ خاں بیدل نظامی نے برار سے متعلق بے شمار نظمیں لکھی ہیں اور اس کی ایک ایک چیز کو موضوعِ سخن بنایا ہے اپنی ایک نظم "باسم کے مندر اور تالاب سے ایک آواز" میں وہ باسم کے مندر کو دیکھ کر کہتے ہیں۔

اللہ اللہ کیا زمانے تھے وہ جانِ اتحاد
آج تک ملتا ہے ذروں سے نشانِ اتحاد

---

[1] اردو ادب۔ ۱۹۶۳ء صفحات ۱۰۹، ۱۰۹ . ایلچپور کے چند قدیم اردو شعراء مصنفہ ڈاکٹر وسیم دردانہ باسط صفحات ۱۲۸، ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۲۹ [3] ایضاً ص ۱۰۰، ۱۰۹ [4] آبشار۔ قیصر امراوتوی صفحات ۱۱۵، ۱۱۱

ں منزل سے گذرا کاروانِ اتحاد
نزل پہ پہنچے رہروانِ اتحاد
ر ویدانت کے سب نگ پھیکے پڑ گئے
ہ جھگڑوں میں دو دلی کے پڑ گئے
پھر متحد ہو جائیں تو میں ہند کی
نے لگے شانِ رواداری دہی
ا توں کی موزوں اذاں کے ساتھ ہی
لِ جل کے ہندو ہو کہ مسلم ہو کوئی
دور پھر آئے زہی حسبِ مراد
ے اتحاد، اے اتحاد، اے اتحاد[1]

میسر منظور حسین شور برصغیر ہند و پاک
ری حیثیت کے حامل ہیں وہ اپنی
میرے معبود، میں کہتے ہیں۔

ر ایقیں عظمتِ آدم مرا دیں
یرا چمن ساری زمیں میری زمیں
روازنہ اندوہ خلا دے مجھ کو
ہو د کوئی اور سزا دے مجھ کو
بھی نہ سکے آدمیت کی دیوار
ی نہ سکے نسل و تعصب کا حصار
ل نہ اسے میرے خدا دے مجھ کو
ہو د کوئی اور سزا دے مجھ کو[2]

رم قبلہ خلیل شارق نیازی تلسی داس
عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے
سے ہی کارن رہیں فطرتِ انسانی
ہوئے ہیں مزید فرماتے ہیں
ے گیا بیت کا پھل تو
یا گنگا جل تو
سے لگا ئے آس
ں بہت ہے اداس

دیکھ تو یہ بن باس
جاگ تو اے تلسی داس[3]

پروفیسر ڈاکٹر منشا رالرحمٰن خان منشا
بذاتِ خود قومی ایکتا کی علامت ہیں
اپنی ایک نظم " ہم ایک ہیں " میں کہتے
ہیں

بندہ ہے کوئی رام کا کوئی رحیم کا
ہر کوئی نام لیتا ہے ربِ کریم کا
تہذیبیں مختلف ہیں تو بھاشائیں مختلف
آشائیں مختلف ہیں نراشائیں مختلف
موسم کے ساتھ لطف کی ورشائیں مختلف
ہیں خواہشیں جدا ابھیلاشائیں مختلف
آشائیں مختلف ہیں نراشائیں مختلف
اس پر بھی اس میں ملتا ہے وہ ایکتا کا رنگ
جلوؤں کو جس کے دیکھ کے ہوتی ہے عقل دنگ
گیتا اسے عزیز اسے قرآں عزیز ہے
دیں اس کو ہے عزیز اسے ایماں عزیز ہے[4]

نوعمر شعرا میں محبوب راہی کی شاعری
مختلف جہتوں میں اپنا سفر طے کر رہی ہے
اس سفر میں انھیں " گل بوٹے " کھلے
نظر آئے۔ ان گل بوٹوں میں ایکتا کے
گیت " " پیام یکجہتی " اور " ہم ایک رہیں
گے ان کی تین نظمیں ہیں جو قومی یکجہتی پر
لکھی گئی ہیں۔ نظم " ہم ایک رہیں گے "
میں وہ لکھتے ہیں۔

ہندو بھی ہمارا ہے مسلماں بھی ہمارا
گیتا بھی ہماری ہے تو قرآں بھی ہمارا
ہر خار بھی ہر اک گل خنداں بھی ہمارا
صحرا بھی ہمارا ہے گلستاں بھی ہمارا
ہم ہند کے صحراؤں کو گلزار کریں گے
ہم ایک تھے، ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے[5]

سید صفدر جدید لب و لہجے کے شاعر
ہیں وہ گنگا جمنی تہذیب اور ہندوستانی
کلچر کو عالم کے مہیب اور خطرناک ماحول
میں امن و سلامتی اور ایکتا کی علامت
تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظم " گنگا بہتی ہے "
اس خیال کو پیش کرتی ہے وہ کہتے
ہیں ۔

روشن اور سفید ہمالہ کی اجلی برف پگھلی ہے
گنگا بہتی ہے یگ یگ سے
گنگا شیریں اور میٹھا پانی
ساگر کے منہ میں ڈال رہی ہے ساگر میں
ایک گھونٹ نہیں انسانوں کے لئے
یگ یگ سے ساگر انسانوں کو پال رہی دھرتی کے
چاروں اور کھڑا ہے
ہر بوند میں اس کی زہر بھرا ہے
زہر کے قطروں سے جینے ساگر کے بیٹوں نے
دھرتی کو گھیر لیا ہے
ور تت کڑا ہے پھر بھی
روشن اور سفید ہمالہ کی اجلی برف پگھلی ہے
گنگا بہتی ہے[6]
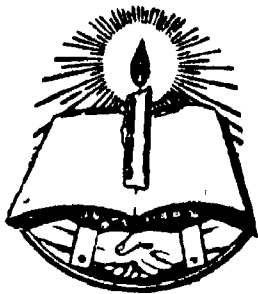
شعلہ حصہ دوم از ناشر محمد حمزہ خان جذبی نظامی[1] ،[2] میرے معبود پروفیسر منظور حسین شور صفحہ ۱۹ ،[3] صبح کا ساقی۔ کلام خلیل شارق صفحہ ۳۴ ،[4] شاداب۔ جولائی ۱۹۸۵ء حیدرآباد صفحہ
[5] گل بوٹے۔ محبوب راہی صفحہ ۲۸ ،[6] ماہنامہ آہنگ (گیا) جنوری ۸۳ء

• سلام بن رزاق
۹/۱۱ - ایل۔ آئی۔ جی
ڈی۔ بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ)
بمبئی ۴۰۰۰۸۰

دھرماتما

ہوٹل شیراز کے سامنے حسبِ معمول بھکاریوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ بھوکے، مریل اور پھٹے حال لوگ۔ آنکھوں میں وحشت ہونٹوں پہ گالی اور بدن پہ چیتھڑے، مرد، عورتیں، بوڑھے بچے سب ہوٹل کے کنارے کنارے فٹ پاتھ پر ایک لمبی قطار میں بیٹھے کسی دھرماتما کا انتظار کر رہے تھے کہ کوئی آئے اور ان کے خالی پیٹوں کو دو روٹی کا انتظام کر دے۔ وہ ہوٹل میں داخل ہونے والے ہر شخص کو پُر امید نظروں سے دیکھنے لگتے۔ کبھی کبھی گردنیں اٹھا کر کاؤنٹر پر بیٹھے اس موٹے ایرانی پر ایک نظر ڈال لیتے جو گاہکوں سے پیسے لینے اور دینے میں اس قدر منہمک تھا کہ ان لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اگر یوں ہی کسی کار یا ٹیکسی کے بریک چرچراتے تو سارے بھکاری چونک چونک کر ادھر دیکھنے لگتے اور جب کار آگے بڑھ جاتی تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دردناک مایوسی ابھر آتی۔

ہوٹل کے رسوئی گھر سے کھانوں کی خوشبو اڑ اڑ کر انھیں پاگل کیے دے رہی تھی۔ ان کے نتھنے بار بار اس طرح پھول پچک رہے تھے جیسے وہ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو کو اپنی سانسوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہوں۔ ہوٹل کے اندر سے گاہک اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے، منہ پونچھتے، دانتوں میں خلال کرتے نکل رہے تھے جب بھی کوئی گاہک باہر ہوٹل سے نکلتا بھکاریوں کی ملتجی آوازیں دور تک اس کا پیچھا کرتیں۔

"بابا اللہ کے نام پر —"

"سیٹھ جی ایشور کے نام پر"

"بھگوان تمھارا بھلا کرے"

"اللہ تمھاری کمائی میں برکت دے"

"بچہ صبح سے بھوکا ہے مالک"

مگر کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ وقت گذرتا جا رہا تھا۔ گاہکوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بھکاریوں کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی مرسڈیز ٹھیک ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ بھکاری اپنی سانسیں روکے ہوئے اس کار کو دیکھنے لگے۔ کار کا دروازہ کھلا اور ایک بے حد موٹا شخص کوٹ، دھوتی پہنے، کار سے برآمد ہوا ڈرائیور اتر کر کار کا دروازہ کھولے کھڑا ہو گیا۔ اگلی سیٹ سے ایک دبلا پتلا شخص بھی کار سے اترا اس کی بغل میں ایک موٹا سا فائل دبا تھا اور وہ شکل و صورت سے سیٹھ کا منیم معلوم ہو رہا تھا۔ سیٹھ نے پلٹ کر اس سے کہا "نہیں منیم جی تم اندر ہی بیٹھو" — جو میرا کرتویہ ہے مجھے ہی نبھانے دو" منیم جی کار میں بیٹھا رہ گیا۔ سیٹھ جی موٹی توند سنبھالتے ہوئے ہوٹل کی طرف بڑھے، بھکاریوں کی قطار میں کھلبلی مچ گئی۔ سیٹھ جی ہوٹل میں داخل ہو گئے اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے موٹے ایرانی سے دھیرے دھیرے کچھ کہنے لگے۔ پھر جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور چند نوٹ گن کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔ ایرانی نے نوٹ گنیں اور دراز میں رکھ لیں پھر ایک ویٹر کو آواز دی۔

"ظفرو! بیس پلیٹ چاول دال مار کے، بیس آدھا قیمہ

تبسم مالیگانوی

۲۱- تریشن نگر۔ کرلا۔ بمبئی۔

وقت کی اڑتی ہوئی تتلی کے پر باندھے گا کون
اے تبسم گردشِ شام و سحر باندھے گا کون

رہبری پاگل ہوا، کشتی شکستہ، شب سیاہ
جب یہ عالم ہو تو پھر رختِ سفر باندھے گا کون

زلزلوں کی زد پہ ہیں بجتہ زمینوں کے مکاں
پھر عزیز دریت کے سینے پہ گھر باندھے گا کون

راستے ہم جیسے درویشوں سے خالی ہوگئے
اپنے دامن میں غبارِ رہ گذر باندھے گا کون

اس کے میرے درمیاں میں ہے انا کی اک فصیل
اس کو ڈھانے کیلئے لیکن کمر باندھے گا کون

جانے کس منزل پہ کس لمحہ جدا ہونا پڑے
عمر بھر کا عہد اے جانِ جگر باندھے گا کون

جن دشاؤں سے ہماری آشنائی کچھ نہیں
ان دشاؤں میں نئے دیوار و در باندھے گا کون

اے تبسم باندھ لیں گے لوگ دست و پا مگر
میرے احساسات کے طائر کے پر باندھے گا کون

— ان حرامجادوں سے کہو گڑ بڑ مت کرو۔ لائن سے بیس آدمی لینا۔"
ظفر و گردن ہلاتا ہوا باہر نکلا۔ سیٹھ جی اس کے ساتھ ہی باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ بھکاریوں میں ہنگامہ تھا۔ ظفر و نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اے سنو! لائن سے بیس آدمی کو ادھر آنا ہے۔ سیٹھ جی نے بیس آدمی کا آرڈر دیا ہے۔"

ویٹر نے سیٹھ جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سیٹھ جی اپنے کوٹ کے دونوں سرے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ہنسنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

"دیکھو گڑ بڑ بالکل نہیں منگتا ہے۔"
ویٹر بھکاریوں کی طرف دیکھ کر چیخا۔

ادھر بھکاریوں میں زبردست افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اگلے بیس میں شامل ہونے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ بچے بیچ رہ کر چیخ رہے تھے عورتیں چلا رہی تھیں۔ جو جسمانی طور پر قوی تھے وہ کمزوروں کو پیچھے دھکیلتے لوگوں کو روندتے کچلتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فٹ پاتھ کے پیچھے سڑک پر راہ گیروں کی اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔ لوگ بھکاریوں کی دھکا مکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ویٹر کو مداخلت کرنی پڑی۔ اس نے گالیاں بکتے، ٹھوکریں مارتے بڑی مشکل سے بیس بھکاریوں کو الگ کیا اور انھیں پہلی قطار میں بٹھا دیا۔ باقی بھکاری منہ لٹکائے، اپنے منتخب ساتھیوں کو رشک اور حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

دھیرے دھیرے ہنگامہ فرد ہو گیا۔ فٹ پاتھ کے پیچھے کھڑے تماش بینوں کی بھیڑ بھی چھٹنے لگی۔ ویٹر اگلے بیس لوگوں کو پتوں کے دونوں میں دال چاول تقسیم کر رہا تھا۔ بھکاری کھانے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ دوسرے بھکاری عجیب للچائی نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کو کھانا کھاتے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی وحشت تھی کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اپنے ہی ساتھیوں کی بوٹیاں نوچ لیتے۔

ادھر ڈرائیور منیم سے پوچھ رہا تھا۔
"منیم جی ہڑتال کو کتنے دن ہو گئے؟"
"بارہ"

"جس دن سے ہڑتال شروع ہوئی ہے اپنے سیٹھ جی بہت دان پُن کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں! انھوں نے منت مانی ہے ہڑتال ختم ہونے تک وہ روزانہ بیس بھکاریوں کو کھانا کھلائیں گے۔"

"بیس ہی کیوں؟"

"اس لیے کہ اگر ہڑتال ناکام ہو گئی تو سیٹھ جی کو بیس لاکھ روپیے کا فائدہ ہوگا۔"

"اوہو" بیس لاکھ کے نام پر ڈرائیور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اتنے میں سیٹھ جی ایک آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ کار کی طرف آتے دکھائی دیے۔

ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا سیٹھ جی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

"سالا ملک میں آج بھی کتنی غریبی ہے"

سیٹھ جی نے اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر ایک ڈکار لیتے ہوئے کہا۔ منیم جی، جی ہاں کے انداز میں گردن ہلانے لگے۔

ڈرائیور نے شیشے میں سے سیٹھ جی پر ایک نظر ڈالی۔ اسے لگا سیٹھ جی کا باہر جھانکتا ہوا سونے کا دانت کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔

اس نے گھبرا کر بریک لگایا۔ ایک آدمی گاڑی کی زد میں آتے آتے بال بال بچ گیا تھا۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو دادر کے دن ماڑی آڈیٹوریم میں بمبئی عظمیٰ کرایہ دار ایسوسی ایشن کا افتتاح ہوا۔ زیر نظر تصویر میں وزیر برائے ہاؤسنگ ڈاکٹر دی بسرا انین اس موقع پر جاری ایک سوونیر کا افتتاح کر رہے ہیں

دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور اندھیارے کا رونا روتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اٹھ کر چاہے کتنا چھوٹا سا کیوں نہ ہو دیا جلاتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ہر شخص جہاں کہیں بھی وہ کام کرتا ہو۔ ایسا دیا روشن کرے جس سے اندھیارا دور ہو اور ہندوستان کی حالت بہتر ہو۔ جس میں ہم سب ہنسی خوشی جیون بتائیں۔

— آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی

وب راہی ضلع بلڈانہ کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر
سند انھیں پہلے ہی حاصل ہو چکی ہے اور شعر
رالی نظریں ان کی طرف پُر امید انداز سے اور
کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔
تبصرہ کتاب ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کے گرد و پوش کے
رکی جانب ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں
یں ایک تو میر کا انداز ہے جس میں جذبے کے لئے
روح میں منقلب ہو کر سامنے آتی ہے۔ دوسرا غالب
ن فکر کی آنچ جذبے کی وارفتگی میں ڈھل کر
۔ محبوب راہی کو ان میں غالب کا انداز مرغوب ہے
ان فکر کو پَر عطا ہوئے ہیں اور جذبے کو وارفتگی
۔ اور فکر اور جذبہ ایک دوسرے میں جذب ہوتے
ظر آتے ہیں۔
رظ انصاری نے محبوب راہی کی فکر، فن اور انداز
یگانہ، شاذ عارفی اور مظفر حنفی سے جوڑ کر ایک ممکنہ
ہے جس سے راقم الحروف بھی متفق ہے۔ کہتے ہیں کہ
ہے کہ مشاقی تو بڑھے مگر شعریت اور والہانہ
اسے۔ جب طبیعت میں تازگی اور بیان میں ندرت
گی اور احساس میں شدت گھٹے گی تو کیا کریں گے ؟
اپنی پیاس بجھایا کریں گے ؟ مجھے نہیں ذرا محتاط رہئے
دو رائیوں کے ساتھ ڈاکٹر مظفر حنفی کے رائے بھی
کرنے سے پہلے اس غزلوں کے مجموعے "تردید" سے
پیش کر دوں۔

پڑھتے پڑھتے لکھتے لکھتے راہی ہم بھی اوب چکے تھے
ہر اک غزل میں وہی غٹر غوں رہی کبوتر والا لہجہ
اب ذرا محبوب راہی کا ان کا اپنا لہجہ دیکھئے۔

تو پھر ایثار کا مطلب ہی کیا ہے
نہیں اس کا بدل کچھ بھی نہیں ہے

یہ انوکھا انداز ہے۔ لگتا ہے بات کا سلسلہ جیسے تحت الشعور کی گہرائیوں سے شروع ہوا ہے۔ قاری کا ذہن بھی خود بخود وہاں تک پہونچ جاتا ہے اور ملاحظہ ہو۔

پیاس سے باطن کی چاروں جاں بلب
ابرِ تر دریا سمندر اور میں

ندی، نالے، خس و خاشاک سے پُر
وہاں ہوتی جہاں گہرا سمندر

روایتی اقدار سے منحرف ہو کر عرفانِ ذات کے لئے بھٹکنا یہ بھی اس دور کے انسان کا ایک المیہ ہے جس کا اظہار محبوب راہی کے الفاظ میں دیکھئے۔

ایک ہے چہرہ ہیولا آئینہ در آئینہ
ہر طرف گہرا دھند لکا آئینہ در آئینہ

اس قبیل کے دو اور شعر ملاحظہ ہوں۔

جس کو دیکھا لپٹا پایا اپنے دکھوں کی چادر میں
میں کس کے دامن سے لپٹتا مجھ کو گلے لگاتا کون
اک پہچان لگا رکھی تھی سب نے اپنے چہروں پر
بے چہرہ، بے نام و نشاں میں پھر مجھ کو اپناتا کون؟

ان اشعار کو دیکھنے کے بعد اب غالباً زیر نظر تبصرہ کے قاری

ڈاکٹر مظفر حنفی کی مندرجہ ذیل رائے سے جو محبوب راہی کے لہجے سے متعلق ہے متفق ہوں گے۔

ایک ایسا لہجہ اور ایک ایسی آواز جو اپنے پیش روؤں کے لہجے یا آواز کی بازگشت نہیں ہے جو اپنی رمزیت، ایمائیت اور اشاریت کے باوجود بامفہوم اور بلیغ ہے۔

(مندرجہ بالا جملے میں لفظ "باوجود" غالباً ڈاکٹر صاحب کے سہو قلم کا نتیجہ ہے وہ شاید "باوصف" کہنا چاہتے ہیں۔ ع) ان کے اشعار میں تو قطعی انداز نہیں ہے تو اہمال بھی نہیں ہے۔ وہ ابہام سے بات میں نئی نئی پرتیں پیدا کرتے ہیں اس کی طلسمی کیفیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ تاثیر کو دوبالا کرتے ہیں۔ یعنی ابہام ان کے شعری وسعت میں اضافہ کرتے ہیں اسے محدود نہیں بناتا۔

یہ کتاب مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی مالی اعانت سے شائع ہوئی ہے اور اسے اشاعت کے بعد اسی اکاڈمی نے پہلا انعام بھی دیا ہے۔ کتابت اغلاط سے پاک ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور یہ ۱۱۲ صفحات کی کتاب مجلد ہے۔ نعمانی پریس دہلی سے چھپی ہوئی اس کتاب کی قیمت صرف ۲۰ روپئے ہے اور موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے مل سکتی ہے۔

بازیافت

بازیافت محبوب راہی کا خود ان کے بقول بعنوان "احتساب" کے پانچواں شعری مجموعہ اور غالباً غزلوں کا تیسرا مجموعہ ہے کیونکہ "تردید" سے پہلے بھی ایک مجموعہ غزلیات بعنوان "ثبات" مہاراشٹر اردو اکیڈمی سے مالی اعانت اور انعام پا چکا ہے۔ "بازیافت" کی اشاعت میں بھی مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی معاونت شامل ہے۔

اس میں جناب محمود سعیدی کی رائے گرد پوش کے دوسرے صفحے پر اندر کی جانب مستزاد ہے۔ نمونۂ کلام اس دوسری کتاب سے ملاحظہ ہو۔

شہر کا مسموم تہذیبی ہوا کا سلسلہ
آ گیا ہے گاؤں تک مکر و ریا کا سلسلہ
موت کیا ہے درمیاں دونوں کے بس اک مرحلہ
اِس جہاں سے اُس جہاں تک ہے بقا کا سلسلہ

•

• ایم۔ بی۔ سردانہ منتظر
۱۱۔ ڈی۔ سری رام روڈ،
سول لائینز۔ دہلی ۱۱۰۰۵۴

اس زندگی کی دھوپ کی گرمی کہاں نہ تھی
لیکن وہ بعض چہروں سے اتنی عیاں نہ تھی

یہ بات ہے الگ کہ وہ رخ سے عیاں نہ تھی
پھر تو خامشی بھی میری بے زباں نہ تھی

دل کی زباں تو دل کے ہی کمرے میں بند تھی
رکھتے تھے ہم زباں جو وہ ترجماں نہ تھی

بھرپور دے پناہ تھی فطرت کی گود بھی
پہنچیں جہاں یہ چند وہ ایسی دکاں نہ تھی

الفاظ پتھروں کی طرح بولتے نہ تھے
ندی میرے خیال کی جب تک رواں نہ تھی

شبنم کا ربط برق و شرر سے کہاں نہ تھا
گفتار و لب میں گرمی و نرمی کہاں نہ تھی

مت ہمارا کہا کیجئے
خیر سن تو لیا کیجئے

•

کھلتا نہ پارسائی کا میری کبھی بھرم
فطرت کا کیا کروں جو حقیقت پسند تھی

ان دونوں کتابوں کو جناب برم گوپال متل نے قابل تعریف اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اس کی قیمت صرف ۲۵ روپئے ہے صفحات ۱۱۲ مذکورہ بالا پتے پر مل سکتی ہے۔

***

س بینڈ کے سفیر ڈیوڈ جانسن اور ان کی
اہلیہ مسز جانسن نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو راج
بھون، بمبئی میں کارگذار گورنر جسٹس ایس بی
ڈیسائی سے ملاقات کی۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے

وم کے سرکاری مہمان عزت مآب ماکنڈ رامیز
اکتوبر ۱۹۸۰ء کو بمبئی سہار ایئرپورٹ پر حکومت
اشٹر کے چیف پروٹوکول افسر شری دگشت نے
وشی کے ساتھ رخصت کیا۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے

ئی پولیس کی طرف سے "نائیگاؤں بمبئی
اکتوبر پر گوردیوالی میلہ" کا اہتمام کیا گیا۔ زیر
صویر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان حاضرین
سے خطاب فرما رہے ہیں۔ تصویر میں بمبئی شہر کے
پولیس کمشنر شری وسنت راؤ صراف اور وزیر مملکت
برائے شہری ترقیات شری ولاس ساونت بھی دیکھے
جا سکتے ہیں۔

مہاراشٹر کے کارگذار گورنر جسٹس شری
ایس۔ کے دیسائی کی خدمت میں گرین لائنس اسکول
کے بچوں کی طرف سے "وزیراعلیٰ راحت فنڈ"
میں ... ۲۵ر روپے کا ایک چیک اسکول کے ایک
طالب علم کمار کیتیج نے پیش کیا۔ یہ تصویر اسی موقع
کی ہے۔
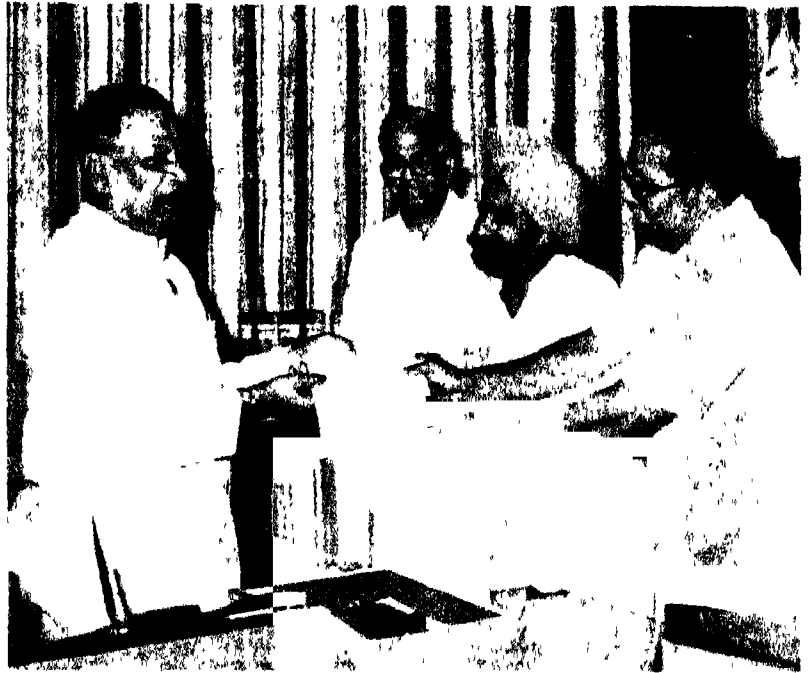
بھارت پٹرولیم کے چیرمین اور ایکزیکیوٹیو ڈائریکٹر
شری یو۔ ایم۔ کنی نے انگیور کے ڈیلروں کی جانب
سے وزیراعلیٰ راحت فنڈ میں ... ۱۵ر روپے
کا ایک چیک ۲۱ اکتوبر کو وزیراعلیٰ شری ایس بی چوان
کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے۔

ڈاکٹر سری کانت جچکار وزیرمملکت برائے
اطلاعات و رابطۂ عامہ، حال ہی میں ممبئی مراٹھی
پترکار سنگھ میں بچوں کے لئے "سائنٹفک،
حیرت انگیز کہانیاں" نامی کتاب کا افتتاح کر رہے
ہیں۔ زیر نظر تصویر میں بائیں سے شری
رمیش سسر ابھروٹے کتاب کے مصنف ڈاکٹر
جچکار اور بوک گنگا کے ایڈیٹر شری مادھو گڈکری
اور ایم ایس ای بی کے چیرمین شری ایس ولاس ڈانڈے
بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔
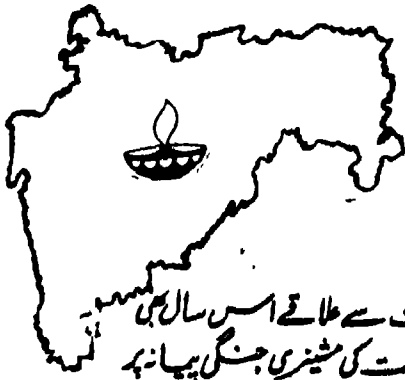
- ناکافی اور بے قاعدہ بارش کی وجہ سے مہاراشٹر کے بہت سے علاقے اس سال بھی مسلسل چوتھے سال میں شدید قلت کا شکار ہو گئے۔ حکومت کی مشینری جنگی پیمانہ پر ان تمام مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔
- ای۔جی۔ایس کے تحت ضرورت مندوں کی امداد کے لئے ایسا منصوبہ بنایا گیا کہ انہیں ملازمت مہیا کی جائے۔
- دیہی علاقوں میں پینے کا پانی فراہم کرنے کی غرض سے کامیابی کے ساتھ کارروائی عمل میں لائی جا رہی ہے۔
- صنعتوں کو بجلی کی سپلائی بلا کسی رکاوٹ کے جاری ہے۔
- مہاراشٹر توانائی کے نان کنونیشنل ذرائع۔ بائیو گیس پلانٹ کی تنصیب اور سوشیل فورسٹری کے استعمال میں درجہ اول پر ہے۔
- ادیباسی دیہات اور ہریجنوں کی بستیوں کو جو ریاست میں واقع ہے، بجلی مہیا کرنے اور سلم علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کے لئے خصوصی جدوجہد کی جا رہی ہے۔
- سلم علاقوں کی بہتری کے لئے وسیع پیمانہ کا پروگرام زیر ترتیب ہے اور اب ۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء یعنی گاندھی جینتی کے
- دن سے مضافاتی علاقوں اور وہ جو میونسپل حدود میں واقع ہے ان ہریجن بستیوں اور سلم حلقوں کو جو میونسپل حدود میں واقع ہیں ریاستی حکومت کی طرف سے حصہ داری کے خرچ کی بنیاد پر کمیونٹی ٹی۔وی سیٹ مہیا کئے جائیں گے۔ اب تک ۵۴۲۹ کمیونٹی ٹی۔وی سیٹ (۲٬۱۵۹ رنگین اور ۳٬۲۷۰ بلیک اینڈ وائٹ) گرام پنچایت کے علاقوں میں نصب کئے جا چکے ہیں۔

راہِ ترقی کو روشن کرنے
کے عزم اور ایثار کے ساتھ

(ڈی جی آئی پی آر)

★ اشوک راج باتھم
سابق صدر ناظم، اطلاعات و رابطۂ عامہ حکومت مہاراشٹر
۸/۳۰۸، روڈ نمبر ۲۲
جوبلی ہلز۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۳۴

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اردو کو راجیہ یعنی "قومی راج" جو میرے زمانے میں شروع ہوا تھا آپ کی نگرانی میں بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔
مضامین کا معیار اعلیٰ ہے اور خاص نمبر تو انتہائی شاندار ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قومی راج ایک سرکاری رسالہ ہے اس کا گیٹ اپ (ٹائٹل کور) اور خوبصورتی اور مضامین، نظمیں، معلوماتی اور سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق رکھنے والے مضامین انتہائی دلچسپ اور دیدہ زیب ہیں۔
میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ "قومی راج" دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور آپ اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ تر بنانے میں کامیاب رہیں۔ (آمین ثم آمین)

○

• انصاری محمد اسلم عزیز
اعزازی سکریٹری، ریڈیو لیسنرس کلب مالیگاؤں،
۱۳۸ جعفر نگر، سروے ۹۱ نثار ورکشاپ
مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳ (ضلع ناسک)

مانے جی کو مان گئے

عالی جناب! بارگاہِ ربِّ کریم میں آپ اور آپ کے معاونین کی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ عرض آنکہ "قومی راج" کا پیارا پیارا شمارہ "میتھلی شرن گپت خصوصی نمبر" کے روپ میں موصول ہوا۔ بلاشبہ یہ ایک دستاویزی حیثیت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔
مہاکوی گپت جی کی زندگی کے بہت سے پہلو ان کی عظمت و صلاحیتوں کے وہ مخفی نشانات جو عوام سے آج تک پوشیدہ تھے بلاکم و کاست نظروں کے سامنے آئے۔ ان کی حیاتِ سربستہ کے وہ بے نظیر پہلو سامنے آئے جس کو پڑھ کر استعجاب ہوتا ہے اور تحریک ملتی ہے۔
اس لئے کہنا پڑا کہ جناب مانے صاحب کو ہم مان گئے۔

اس قدر معلوماتی، تاریخی مجلہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔
مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اسی طرح مہاراشٹر کے عظیم سپوت مرحوم سکندر علی وجد سے متعلق بھی ایک "وجد نمبر" کے بارے میں غور فرمائیں گے۔

○

★ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں ایم اے، پی، ایچ۔ ڈی
اے۔ ٹی۔ ڈی۔ اے
گاندھی بھون مہاتما گاندھی مارگ
لکھنؤ (یوپی) ۲۲۶۰۰۱

قومی راج کا دسمبر ۱۹۸۶ء کا "میتھلی شرن گپت نمبر" موصول ہوا۔ یہ آپ کی ذات گرامی ہی ہے کہ بھارت کے ہندی زبان کے مشہور و معروف شعراء پر خصوصی نمبر، اردو کے رسم الخط میں نکال رہے ہیں۔ آپ اپنے مقصد میں مکمل طور سے کامیاب ہیں بھلے ہی اردو کے شعراء کا حق مارا جائے۔
کیا ہندی والوں کو اس خصوصی نمبر سے سبق آموزی مل سکے گی اور وہ دیوناگری لپی میں نازش پرتاپگڑھی، بیکل اتساہی اور قومی یکجہتی کے اراکین شاعروں وغیرہ پر خصوصی نمبر نکالنے کی زحمت کریں گے۔

○

ریاض خاں، فتح خاں
صدر راہیل ایجوکیشنل اینڈ سوشیل ویلفیر اسوسی ایشن
ہمایوں روڈ، بیدپورہ، اکولہ۔ مہاراشٹر
۴۴۴۰۰۱

"قومی راج" کا میتھلی شرن گپت خصوصی نمبر" دیکھنے کو ملا۔ اس نمبر کے لئے آپ لوگوں نے بہت تگ و دو کی ہوگی۔
"میتھلی شرن گپت" کی پوری زندگی کے خاکے اور تصویریں آپ نے شمارہ ہذا میں شامل کرکے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ آپ لوگ قابل تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔
اللہ سے دعا ہے کہ "قومی راج" تمام ریاستی رسالوں پر سبقت لے جائے۔ (آمین)

○

H-44--2-F
PRINTED AT THE GOVT PHOTOZINCO PRESS PUNE—1987

قومی راج

ہندی، مراٹھی، گجراتی، سندھی، انگریزی اور اردو، چھ زبانوں میں شائع ہوتا ہے

سالانہ: دس روپے ★ قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ

جلد ۱۴ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۸۷ء شمارہ ۱۲

10/12/1987

اس شمارے میں — صفحہ نمبر

شرح خریداری

سالانہ	دس روپے
۲ سال کے لئے	بیس روپے
۳ سال کے لئے	ستائیس روپے
۴ سال کے لئے	چھتیس روپے

اور

۵ سال کے لئے	پینتالیس روپے

ترسیل زر کا پتہ:

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمنسٹریشن)
ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز،
گورنمنٹ آف مہاراشٹر، بیرک نمبر ۱۹
مقابل سروچی بلڈنگ، نزد منترالیہ، بمبئی ۴۰۰۰۲۹

مراسلت کا پتہ:

ایڈیٹر قومی راج
ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز
گورنمنٹ آف مہاراشٹر
۱۵ واں منزلہ، نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ
مقابل منترالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

چیف ایڈیٹر: پرمود مانے ایڈیٹر: عثمان خان سب ایڈیٹر: عبداللہ

* نور احمد نور پاتوری
(مدرس) مظفر نگر، لکڑ گنج
نزد مسجد محمدیہ ۔ اکولہ (مہاراشٹر) ۴۴۴۰۰۱

سب پہ سکتے کا ہے عالم چیخ ہے نہ ہائے ہائے — ایک لمحہ سارے انسانوں پہ کتنے ظلم ڈھائے
جب بھی سورج اور زمیں کے بیچ میں سایہ آئے — دن اندھیرا دے بایں صورت اجالوں کے بجائے

رونق و نور و ضیا تابانی سب کچھ لے گیا
آج کا دن سارے عالم کو اندھیرا دے گیا

جس نے دوبالا کیا دنیا کی ناری کا وقار — دے گئی تاریخ ہندوستاں کو اب زرنگار
زندگی جس کی نمونہ موت بھی آئینہ دار — اڑ گئی وہ رنگت گل ہو گئی رخصت بہار

رونق و نور و ضیا تابانی سب کچھ لے گیا
آج کا دن سارے عالم کو اندھیرا دے گیا

آسماں کو چھونے والی جس کی عملی کوششیں — عالم انسانیت میں امن، مودہ خواہشیں
قوم اور عوام پر قربان سب آرائشیں — معترف ہیں آج دشمن تک کہ سب ہم نشیں

رونق و نور و ضیا تابانی سب کچھ لے گیا
آج کا دن سارے عالم کو اندھیرا دے گیا

اِن دنوں بڑے عجیب عجیب نعرے سُننے میں آرہے ہیں — لوگ تشدّد کی باتیں کر رہے ہیں، لیکن میں انہیں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تشدّد نے آج تک کوئی مسئلہ حل نہیں کیا ہے۔ ہمارے مقاصد چاہے جس قدر لائقِ ستائش ہوں، اگر ہم ان کے حصول کے لئے غلط طریقے اختیار کرتے ہیں تو ہم اطمینان بخش طور پر ان مقاصد کو بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

شریمتی اندرا گاندھی

وزیراعظم شری راجیو گاندھی لاتور میں کسانوں کے میلے سے خطاب کرتے ہوئے۔

وزیراعظم کا دورہ لاتور اور پونے

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۸ دسمبر کو لاتور اور پونے کا دورہ کیا اس دورے کے دوران وزیراعظم نے لاتور میں منعقدہ کسان میلہ میں شرکت فرمائی نیز لاتور کے قریب واقع مانجرا امداد باہمی شکر کارخانے کے پیداواری ہنگام کا افتتاح بھی انہیں کے دستِ مبارک سے ہوا۔ مہاراشٹر راجیہ سہکاری بینک کی صد سالہ تقریب میں شرکت فرماکر وزیراعظم دوپہر میں پونے روانہ ہوگئے اور پونے میں نہرو اسٹیڈیم پر منعقدہ نیشنل گیمز کا افتتاح کرنے کے بعد وزیراعظم اپنا دورہ ختم کرنے کے بعد دہلی روانہ ہوگئے۔

مانجرا سہکاری ساکھر کارخانے کے پیداواری ہنگام کا افتتاح ملک کے وزیراعظم کے دستِ مبارک سے انجام پانا ایک خوش نصیبی کی بات ہے۔ ایسا ہی مبارک موقع ایک مرتبہ ۳۰ – ۳۵ برس قبل پرورا نگر سہکاری ساکھر کارخانہ کو نصیب ہوا تھا۔

پرورا، مانجرا اور وزیراعظم

مہاراشٹر میں شکر کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھنے والے شری وٹھل راؤ وکھے پاٹل کے قائم شدہ پرورا نگر سہکاری کارخانہ کا پہلا پیداواری ہنگام بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ اس کے ۳۰ – ۳۵ برسوں بعد پہلے پیداواری ہنگام کے آغاز کرنے کا سہرا مانجرا میں واقع مانجرا سہکاری ساکھر کارخانے کے سر بندھا ہے۔ خوش نصیبی کی بات تو یہ ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں کسی بھی

شکر کارخانے کے پہلے پیداواری ہنگام کو ملک کے وزیر اعظم بحیثیت مہمانِ خصوصی نصیب نہیں ہوا۔

یہ بات بھی قابلِ تحریر ہی ہے کہ جواہر لال نہرو کے نواسے عزت مآب وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ان دونوں افتتاح کا ذکر اپنی تقریر میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت قلیل سرمایہ اور سادہ قسم کی مشینوں سے کارخانے قائم کئے جاتے تھے لیکن جدید ترین مشینوں سے آراستہ مانجرا سہکاری ساکھر کارخانے سے مہاراشٹر کی تحریک امداد باہمی اور مہاراشٹر کے کسان اکیسویں صدی کی طرف کس قدر تیزی سے بڑھ رہے ہیں ان دونوں باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

کارخانے کے پہلے پیداواری ہنگام کا افتتاح وزیر اعظم نے گوہان میں گنے کا گٹھ چھوڑ کر کیا۔ اس موقع پر کارخانے کے صدر شری ہبر دواہن کارٹے نے صافہ باندھ کر وزیر اعظم کا استقبال کیا۔

مانجرا سہکاری کارخانے کے پہلے پیداواری ہنگام کا افتتاح، کسان میلہ اور مہاراشٹر راجیہ سہکاری بینک کی صد سالہ تقریب۔ یہ تینوں پروگرام مشترکہ طور پر انجام پائے۔

اناج کی پیداوار میں خود کفیل ہو کر زراعت کے عالمی میدان میں ملک نے جس طرح کا اعلیٰ ریکارڈ قائم کیا ہے اسی طرح محنت اور لگن کے ساتھ تیل کے بیجوں کی پیداوار میں بھی دیش کو خود کفیل بنانے کا چیلنج ہمارے کسانوں کو قبول کرنا چاہیے ایسی خواہش کا اظہار وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اس مشترکہ تقریب کے موقع پر کیا۔ اس مشترکہ تقریب کی صدارت وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان نے فرمائی۔

شری گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا کہ کاشتکاروں کے لئے کھیتوں میں کام آنے والے جدید ترین آلات کی دریافت اور ان کے استعمال پر ہم غور کر رہے ہیں۔ اسی طرح کھارے پانی اور ریگستانی علاقہ میں تیل کے بیجوں کی بوائی اور پیداوار کس طرح کی جائے گی اس طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔ بے آب زمین اور کم پانی پر زیادہ سے زیادہ فصل اگانے کے سائنسی طریقوں کو ترقی دے کر ملک کے کم زمین رکھنے والے کسانوں اور زرعی مزدوروں کو معاشی طور پر مضبوط بنانے کی پالیسی ہم نے اپنائی ہے

بھارت کے کسانوں پر فخر

گذشتہ چالیس برسوں میں بھارت کے کسانوں نے اپنی انتھک محنت اور جہد پیہم کے ذریعے اناج کی پیداوار میں بڑے پیمانے پر اضافہ کیا ہے۔ اس بات کا فخریہ انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے مزید کہا کہ آزادی سے قبل کے قحط میں ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے اور آج بھی ہمارا دیش اسی طرح کے بھیانک قحط سے نبرد آزما ہے۔ دیش میں اناج کا کافی ذخیرہ ہے۔ قحط زدہ علاقوں میں لوگوں کو مشکلات کا سامنا ضرور ہے لیکن اناج کے لئے کسی کو موت کے منہ میں نہیں جانے دیا جائے گا۔ ایسی خود اعتمادی آج ہمارے پاس ہے۔

دیہی مزدوروں کیلئے قومی کمیشن

بھارت کے دیہی مزدور بے زمین کسانوں اور کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں کے مسائل کا بغور مطالعہ کر کے انھیں بہتر زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کرنے کے لئے ضروری اقدامات تجویز کرنے کے لئے حکومت نے حال ہی میں ایک قومی کمیشن قائم کیا ہے۔ ایسی معلومات شری گاندھی نے اس موقع پر دیں۔

تحریک امداد باہمی قابلِ فخر

مہاراشٹر میں تحریک امداد باہمی کا شری گاندھی نے خاص طور پر فخریہ ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس تحریک کی وجہ سے دیہاتوں سے لیکر ریاستی سطح تک قیادت کی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ معاشرتی و معاشی طور پر واقف کار اس قیادت نے زراعت اور صنعت اور دیگر پیشوں میں چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کی طاقت کو مجتمع کر کے ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں موجودہ امداد باہمی کے ادارے امداد باہمی کے ذریعے زراعتی ترقی چھوٹی آب پاشی، پھلوں کی پیداوار اور زرعی مال پر انحصار کرنے والے دیگر پیشوں کو ترقی دینے میں کامیاب ہیں۔ سماج کے پسماندہ طبقہ کو شامل کر لینے کے بعد یہ تحریک سچ مچ ایک مقصدی اور سرگرم تحریک بن گئی ہے۔ سرگرم انتظامیہ باعمل مقامی نمائندگی، معاشرتی بیداری اور تجارتی نقطۂ نظر کی وجہ سے مہاراشٹر کی تحریک امداد باہمی پورے دیش کے لئے مثالی بن گئی ہے انھوں نے اس موقع پر مشورہ دیا کہ آئندہ بھی اس تحریک کو اپنی توجہ دیہی علاقوں کے کاریگر کاشتکار ادی واسی اور جنگل باسی افراد کی جانب مبذول کرنا چاہیے۔

منصوبہ بندی

مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی نے اپنے معاشی منصوبے میں کسانوں کو اولیت دی تھی اسی سلسلے میں ہوئے شری راجیو گاندھی نے بتایا

اسی معاشی منصوبہ کی ہم نے تقلید کی ہے۔ کسانوں
ترقی کو مرکز مان کر ہی ملک کے لئے منصوبہ بندی
جاتی ہے۔ یہ ترقی صرف زرعی ترقی نہیں بلکہ زرعی
پر منحصر صنعتوں اور پیشوں کو ترقی دے کر کسانوں کی
رگی اور دیہی علاقوں کی کایا پلٹ کرنے کا منصوبہ ہمارے
یش نظر ہے اسی نظریہ کے تحت زرعی مال کو مناسب
م اور گاہکوں کی قوتِ خرید میں اضافہ ان دونوں
نوں پر اہم توجہ دے رہے ہیں۔

بھارت کو تمام شعبہ جات میں خود کفیل بنا کر دنیا میں
بلِ احترام مقام دلانے کے اپنے عہد کو دہراتے
ہوئے شری گاندھی نے کہا کہ بھارت کو ترقی یافتہ
الک کی صف ۔ سے دور رکھنے کے لئے کچھ لوگ
وشاں ہیں۔ سری لنکا کے نئے نئے مسائل پیدا
ر کے جنوبی ایشیاء کے امن و تحفظ کو غارت کرنے
کی کچھ ممالک نے کوشش کی ہے لیکن ہم سری لنکا
سے امن معاہدہ کر کے۔ اس معاہدے کو پورا کرنے
ے لئے حتی المقدور کوشاں ہیں۔ ہمارے ان
قدامات کے لئے سری لنکا حکومت اور صدر
شری جے وردھنے کی طرف سے بھرپور تعاون
ل رہا ہے۔ دنیا کے کسی بھی طاقتور ملک کے دباؤ
یں آ کر بھارت جنوبی ایشیا کے امن و تحفظ کو
ارت کرنے نہیں دے گا۔ ایسے مصمم ارادے کا
ظہار شری گاندھی نے آخر میں کیا۔

مداد باہمی کی لامرکزیت

صدارتی تقریر میں وزیر اعلیٰ شری شنکر راؤ چوان
نے مہاراشٹر میں تحریک امداد باہمی میں سربلند
راجیہ سہکاری بنک کو سوویں سال میں قدم رکھنے پر
بنک کے سابق اور موجودہ ڈائریکٹرز اور ملازمین کی
عریف کی اور مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ بارہ سو
کروڑ روپیوں کا جمع شدہ سرمایہ اور آٹھ سو کروڑ روپے
بطور قرض بانٹنے والی بھارت کی یہ سب سے بڑی تحریک
امداد باہمی کا ادارہ ہے۔ اس بنک کے پاس محفوظ
ل رقم

خطیر رقم کو استعمال میں لا کر زرعی مال پر منحصر کارخانوں
کے قیام کی خواہش کا اظہار مہاراشٹر کے عام لوگوں
نے کیا ہے۔ یہ سرمایہ اگر صنعتوں کے لئے استعمال
کی اجازت دی گئی تو مہاراشٹر میں نیا صنعتی ماحول
پیدا ہوگا اور امداد باہمی کے میدان میں سرگرم عمل
لوگوں میں نیا جوش و ولولہ پیدا ہوگا۔

ودربھ اور مراٹھواڑہ کے غیر ترقی یافتہ علاقوں
میں نئے امداد باہمی کارخانے قیام زیر ہیں۔ اس
مقصد کے لئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بارہ سو
پچاس ٹن قوت کے کارخانے منظور کئے تھے۔
اسی کے سبب ودربھ میں پانچ اور مراٹھواڑہ میں
چار، اس طرح کل ۹ نئے کارخانے پچھڑے ہوئے
علاقوں میں قائم ہو سکے ہیں۔

لیکن اب نئے کارخانوں کے لئے دو ہزار
پانچ سو ٹن قوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ اس پالیسی
کی وجہ سے شکر کارخانوں کی مرکزیت چند خاص
علاقوں کو حاصل ہو جانے کے خدشہ کے پیش نظر
پہلے کی طرح غیر ترقی یافتہ علاقوں میں بارہ سو پچاس
ٹن پر لانے کی درخواست وزیر اعلیٰ نے اس موقع
پر کی۔

قلیل مدتی پالیسی کی ضرورت

"ایک ادھیکاری کپاس منصوبہ کے
سبب مہاراشٹر میں کپاس کو کچھ کم دام ملتا ہے پھر
بھی کپاس کی برآمد کی قلیل مدتی پالیسی نہ ہونے
کے سبب اس منصوبہ سے متعلق کسانوں کے
دلوں میں ہمیشہ شکوک جنم لیتے ہیں۔ اس کے لئے خام
کپاس کی برآمد کی بجائے سوت برآمد کرنے کی
پالیسی آئندہ پانچ دس برسوں کے لئے مرتب
کر کے مہاراشٹر میں "سوت کارخانے" بڑے
پیمانے پر کامیاب ہوں گے اور کسانوں کے دلوں
میں ایک ادھیکار کپاس یوجنا سے متعلق بڑے
پیمانے پر عدم اعتمادی پیدا ہوگی۔" وزیر اعلیٰ نے

ریلیف فنڈ میں ۷۵ لاکھ روپے

پروگرام کے آغاز میں راجیہ سہکاری بنک
کے صدر شری شیام راؤ کدم نے وزیر اعظم اور
وزیر اعلیٰ کو صافہ باندھ کر شال اُڑھا کر اور
ناریل پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔ اسی طرح بنک
کی صد سالہ تقریب کے موقع پر تیار کردہ "یادگاری
نشان" بھی پیش کیا۔

اس بنک کی جانب سے وزیر اعظم کے قحط
ریلیف فنڈ کے لئے بنک نے پچھتر لاکھ روپے
کی رقم وزیر اعلیٰ کے دستِ مبارک سے وزیر اعظم
کو پیش کی گئی۔ بنک نے ۷۵ سال مکمل کر لینے
کے موقع پر یہ رقم فنڈ میں دی۔ امرت مہوتسو
کے موقع پر بنک کی جانب سے شائع شدہ یادگار
کتاب کی رسم اجرا وزیر اعظم شری راجیو گاندھی
کے ہاتھوں ادا کی گئی۔

اپنی تعارفی تقریر میں شری شیام راؤ کدم نے
وزیر اعظم کے نئے بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد
کرنے کے لئے راجیہ سہکاری بنک کو سرگرم عمل بنا کر
کہا کہ اب زمین پر انحصار کرنے والے ۸۶
فیصد کسان، کم زمین رکھنے والے اور زرعی
مزدوروں کی بہتری کے لئے بنک نے نت نئی
پالیسیاں مرتب کی ہیں۔

وزیر اعظم کو چاندی کے رتھ کا تحفہ

مانجرا سہکاری ساکھر کارخانے کے پہلے ہنگام
کے مبارک آغاز کی یادگار کے طور پر اس کارخانہ
کے صدر اور ریاستی وزیر شری ولاس راؤ دیشمکھ
نے وزیر اعظم اور ان کے ہمراہ مہمانانِ خصوصی کا دلی
خیر مقدم کیا اور وزیر اعظم کو چاندی کے رتھ کا تحفہ
پیش کیا۔

پونے میں شری راجیو گاندھی نے بین الاقوامی میراتھان دوڑ کو پرچم لہرا کر افتتاح کیا

بھائی اندرا گاندھی کی پالیسی ہی کی وجہ سے [illegible] کے مالران پرہ کارخانے کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے شری دلیش سنگھ نے اس موقع پر کہا کہ وزیر اعظم کی تقریر سننے کے لیے موجود یہ جم غفیر اجتماعی تحریکات کی کامیابی کی غماز ہے۔

آخر میں دفاع و پیداوار کے مرکزی وریاستی وزیر شری شیوراج پاٹل جاکورکر نے کہا کہ راجیو جی کی قیادت میں بھارت مزید خود کفیل اور طاقتور بننے کے لیے تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے انھوں نے آخر میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پونے میں آمد

لاتور کا پروگرام ختم ہونے کے بعد دوپہر میں وزیر اعظم ہیلی کاپٹر کے ذریعے پونے پہنچے ان کے ہمراہ وزیر حمل ونقل شری [illegible] چوہان، مرکزی وزیر دفاع اور پیداوار کے ریاستی وزیر شری شیوراج پاٹل، مرکزی خاندانی فلاح کے ریاستی وزیر شریمتی سروج کھاپرڈے اور مہاراشٹر کانگریس کی صدر شریمتی پربھا راؤ بھی تھیں۔

ہیلی پیڈ پر وزیر اعظم کا استقبال کارگزار گورنر مہاراشٹر شری چنتوش مکھرجی نے کیا۔ استقبال کے وقت پونہ ضلع کے پالک منتری شری سوشیل کمار شندے، کھیل کے ریاستی وزیر شری اشوک پاٹل، پونے کے میئر شری چندرکانت چھاجیڑ، بین الاقوامی میراتھان کے صدر اور سابق وزیر اعلیٰ شری شرد پوار، ممبر پارلیمنٹ بیرسٹر وٹھل گاڈگل اور اطلاعات عامہ کے سکریٹری شری دنیش افضل پورکر و دیگر حضرات اس موقع پر حاضر تھے۔

میراتھان کا افتتاح

وزیر اعظم کی اسٹیڈیم پر آمد ہوتے ہی میراتھان سنگھٹن سمیتی کے صدر ممبر پارلیمنٹ شری سریش کلماڈی نے ان کا استقبال کیا اور فوجی بینڈ کی دھن بجائی گئی۔ بعد ازاں ڈھول تاشوں کے مہاراشٹری روایت و ثقافت کے مطابق استقبالیہ رسم ادا کی گئی۔ طلبہ وطالبات نے اجتماعی گیت، یوگا سن لیزم، لیگڑی و دیگر جاذب نظر کھیل پیش کیے۔

اسی اثنا میں چالیس چھتیس امدادی انعامات جیتنے والے کھلاڑیوں کے ساتھ بین الاقوامی شہرت یافتہ ملکھا سنگھ نے کھیل کی مشعل شنی وار واڑہ سے دوڑتے ہوئے لائی اس وقت آزادی کے چالیس سال والی دھن بجائی گئی۔ وزیر اعظم

اسٹیج سے نیچے اتر آئے۔ ملکھا سنگھ سے مشعل لی اور اسٹیڈیم کی مخصوص جگہ پر اسے جلتا ہوا مشعل رکھا۔

اسی وقت امن کی علامت کے طور پر آسمان میں کبوتر اور غبارے چھوڑے گئے بعد ازاں پرچم لہرا کر وزیر اعظم نے پانچویں بین الاقوامی میرتھان مقابلوں کا شاندار افتتاح کیا۔

شنی وارواڑہ کا ماڈل

بین الاقوامی ملیرڈ کے کھلاڑی شری گیت سیٹھی اور بین الاقوامی کھیلوں کے منتظم شری جال پارڈی والا کو وزیر اعظم کے دستِ مبارک سے ٹرافیز عطا کی گئیں۔ اس سے قبل شنی وارواڑہ کا ماڈل یادگاری تحفہ تنظیم کے سکریٹری شری پرلہاد ساونت اور شری رمیش نادرٹ کے ہاتھوں وزیر اعظم کو پیش کیا گیا اس موقع پر شائع شدہ یادگاری کتاب کی رسم اجرا بھی وزیر اعظم نے فرمائی۔

دلی کلکتہ، حیدرآباد، گرگاؤں، بنگلور میں بھی اس کے بعد ... میرتھان مقابلوں کے انعقاد کی بات کہہ کر ممبر پارلیمنٹ شری سریش کلماڈیا نے سب کا استقبال کیا ... میں بھارت کے ساتھ ہی ۱۶ ممالک کے کل ... کھلاڑیوں کے حصہ کی اطلاع انھوں نے دی۔ ... بین الاقوامی میرتھان ٹرسٹ کے صدر شری شرد پوار نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان مقابلوں سے بڑا امید ... عزم و عمل کے پیکر نوجوان کے آگے آنے کی امید ظاہر کی۔ آزادی کے چالیسویں سال کے موقع پر مختلف پروگرام کے ایک جز کے طور پر مقابلے یہاں منعقد ہوئے ہیں۔ ایسی اطلاع شری شرد پوار نے دی۔

کھلاڑیوں کی جانب سے قحط فنڈ میں ایک لاکھ روپے

کھلاڑیوں کی جانب سے وزیر اعظم کے قحط ریلیف فنڈ کے لئے ایک لاکھ روپے شری شرد پوار نے دیا۔ اس موقع پر کارگزار گورنر شری چترتوش مکرجی نے بھی اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

وزیر اعلیٰ شنکر راؤ چوان نے اس موقع پر پونے میں کھیل کا ماحول پیدا کرنے پر منتظمین کو مبارکباد دی۔

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں بھارت کی ایکتا اور طاقت کا مظاہرہ کرنے پر کھلاڑیوں کی تعریف کی کھلاڑیوں کی ہمت افزائی و امداد کے لئے حکومت کی بھرپور کوشش کا تذکرہ کرتے ہوئے وزیر اعظم نے خواہش ظاہر کی کہ دیش میں کھیل سے پیار و اپنائیت کی نئی تحریک پیدا ہونا چاہئے۔

پونے شہر کو کھیل نگری شہر کہہ کر پونے شہر کے لوگوں کی اسپورٹس مین شپ کا انھوں نے استقبال کیا۔ چھترپتی شیواجی مہاراج کے تاریخی کارناموں پر اپنی تقریر میں وزیر اعظم نے فخر کا اظہار کیا۔ اس تقریب کے اختتام کے بعد وزیر اعظم لوہگاؤں ایئرپورٹ سے نئی دلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

قومی راج

پنڈت نہرو

خاندانِ نہرو کا ایک جگمگاتا ماہتاب
وہ جواہر لعل دنیا میں نہیں جسکا جواب

جنگِ آزادی کا اک بیباک بہادر سورما
رہروانِ راہِ آزادی کا قابل رہنما

یہ تدبر یہ سیاست یہ فراست یہ کمال
نام ہے اِن خوبیوں کا اک جواہر بے مثال

جس نے بھارت کو نیا اک روپ بخشا وہ ہے تو
قوم کو جس نے دیا جمہور کا تحفہ وہ ہے تو

ہے پسند تجھ کو گلاب تو بھی جیسے اک گلاب
تو ہے لیکن وہ گلاب جسکا نہیں کوئی جواب

تو نہیں لیکن تیرا باقی رہے گا پیارا نام
یاد کرتی ہے تجھے یہ قوم بھارت کی مدام

بولو عرفاں قوم کے اس بیمثال ہیرو کی جے
یعنی بھارت کے سپوت اور رہنما ہیرو کی جے

• عرفان پربھنوی
پھول گلی۔ پربھنی ۴۳۱۴۰۱

انصاری محمد اسحٰق خضر
ہیڈ ماسٹر تہذیب ہائی اسکول، مالیگاؤں

پنڈت جواہر لال نہرو، ایک شخصیت کا نام نہیں۔ یہ ایک تہذیب اور ایک عہد کا نام ہے۔ وہ نہرو جس کا تصوّر اچکن کے بٹن کے جھول میں لگے گلاب کے بغیر نامکمل ہے۔ اپنے عہد اور ہندوستانی تہذیب کی علامت بن کر چار دانگِ عالم میں گلاب کی طرح مہکتا رہا۔ ہندوستانی عوام کے دِلوں کی دھڑکن میں سمایا ہوا، کسانوں کی اُمیدوں کا مرکز، نوجوانوں کا پسندیدہ، بچوں کا شگفتہ مسکراہٹ سے دل جیت لینے والا اور بڑوں سے اخلاق کی بلندیوں پر متمکن ہو کر ملنے والا آزاد ہندوستان کا یہ پہلا وزیرِ اعظم محض ہندوستان کا رہنما، یا خادم نہیں تھا۔ اقوامِ عالم کا قائد اور بنی نوعِ انسان کا ہمدرد تھا۔ اس نے پچاس برس تک ہندوستانی عوام کے دلوں پر راج کیا ہے۔ ایوانِ پارلیمان سے لے کر اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور دولتِ مشترکہ کی مجلسوں میں اس نے اپنے ناخنِ تدبیر سے بے شمار مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

آئیے۔ آج اُسی کی زندگی کے چند اوراق پر نظر ڈالیں۔ اس کی تہہ در تہہ شخصیت کے خدوخال کو ان منتخب واقعات، اور سانحات کے پس منظر میں دیکھنے کی سعی کریں اور اپنے دل کو تسلّی دے لیں کہ فراق کے لمحوں میں اہلِ وفا کا یہی شیوہ رہا ہے۔ یادوں کے ان گلابوں کو سینے سے لگائے، ہندوستانی قوم اپنے زخمِ دل کا مداوا کر سکتی ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نہرو ابھی سات آٹھ برس کے تھے۔ گھوڑے سواری کا بڑا شوق تھا۔ اپنے گھوڑے کا انہوں نے نام رکھا تھا "رخش"..... ایک بار رخش پر سوار کہیں تفریح کے لیے جا رہے تھے کہ رخش کی شوخی عود کر آئی۔ پھر کیا تھا ع "رَو میں تھا رخش نہرو کہیں بھی نہیں تھما"، حتیٰ کہ سات سالہ نہرو کب اور کہاں رخش کی پشت سے زمین بوس ہوئے۔ رخش کو خبر ہی نہ ہوئی۔ گھر پر ٹینس کھیلتے ہوئے موتی لال نہرو نے جب رخش کو تنہا گھر لوٹتے ہوئے دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ دوست احباب سمیت سارا گھر ننھے نہرو کی تلاش میں مختلف سمتوں میں چل پڑا۔ اِدھر جواہر لال نہرو کافی دیر تک رخش کے لوٹنے کا انتظار کرتے رہے اور پھر پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ کچھ ہی دُور پر جواہر لال صحیح سلامت مِل گئے تو موتی لال نہرو کو گویا دنیا جہان کی نعمت مِل گئی۔

بچپن میں گھر کے حوض میں تیراکی کا بھی خوب مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اگر حوض کے کنارے کوئی کھڑا ہوتا اور پانی میں جانے سے ہچکچاتا تو اسے چپکے سے پانی میں ڈھکیل دیتے اور خوب مزہ لیتے۔ یہ چھیڑ چھاڑ، چھوٹے بڑوں سے یکساں طور پر ہوا کرتی تھی تیراکی کا یہ شوق دھیان میں رکھئے اور چلئے اِنگلستان۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب

ترمی رنج.

نہرو انگلستان میں پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ چھٹیوں میں اپنے ایک انگریز دوست کے ساتھ ناروے کے خوبصورت برف پوش پہاڑوں کی سیر کر رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ماندے گرد میں اٹے ایک ہوٹل میں نہانے کے لئے پہنچے تو وہاں کوئی انتظام نہ تھا۔ ہوٹل کے مالک نے قریب کی پہاڑی ندی کی نشان دہی کر دی۔ دونوں اس تیز رَو ندی پر پہنچے۔ جواہر لال نے اس میں قدم رکھا تو پتہ چلا کہ پانی گہرا نہیں لیکن برف کی مانند ٹھنڈا ہے۔ ابھی پاؤں جمانے بھی نہ پائے تھے کہ پھسل گئے۔ ٹھنڈے پانی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ اب وہ بے ہوش ہو کر پانی میں بہنے لگے۔ ان کا ساتھی کسی طرح باہر نکلا اور ندی کے کنارے تیزی سے دوڑنے لگا۔ ایک مقام پر جواہر لال کی ٹانگ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ کھینچ کر انہیں باہر نکالا۔ اس طرح وہ بال بال بچے ورنہ چند گز کے فاصلے پر یہ ندی آبشار کی صورت میں ایک بڑی چٹان پر گرتی تھی۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں Harrow کے مشہور پبلک اسکول میں انہیں داخل کیا گیا چونکہ شروع ہی سے اخبارات و رسائل اور عام معلومات کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اس لئے دُنیا کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ انہیں دنوں انگلستان کے عام الیکشن کے بعد جب لبرل پارٹی جیت گئی تو استاد نے ایک دن کلاس میں الیکشن اور نئی حکومت کے متعلق سوال کیا۔ ان کے سوال کا جواب سوائے نہرو کے کوئی نہ دے سکا۔ اس حقیقت پر کلاس کے تمام ہی لڑکے حیرت زدہ تھے کہ ان کے ملک کے سیاسی حالات اس کم عمر ہندوستانی لڑکے کو کیسے معلوم ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں جواہر لال کی شادی کشمیری برہمن خاندان کی خوبصورت شرمیلی دوشیزہ کملا کول سے ہوئی۔ شادی کے بعد گرمیاں گذارنے کے لئے جواہر لال دُلہن کے ساتھ کشمیر گئے۔ یہیں ایک دن رشتے کے ایک بھائی کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو نکل گئے۔ وہاں سے آٹھ میل دُور امرناتھ کے نار کو دیکھنے کی عرصے سے خواہش تھی۔ دونوں نے کمر سے رسّی باندھ رکھی تھی تاکہ کوئی پھسلے تو دوسرا اُسے سنبھال سکے۔ بارہ گھنٹے کی چڑھائی کے بعد وہ دونوں تھکے ہارے برف کے ایک بڑے میدان میں پہنچے تو ہمت بندھی لیکن وہاں جا بجا گڑھے تھے جو برف کی وجہ سے نظر نہ آتے تھے۔ جواہر لال نے جونہی برف پر قدم رکھا تو وہ اندر دھنسنے لگی اس کے باوجود انہوں نے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کی تو ایک بڑے کھڈ میں جا پڑے۔ یہ اتنا گہرا گڑھا تھا کہ کوئی چیز اس کی تہہ میں چلی جائے تو ہزاروں سال بھی اس کا پتہ نہ چل سکے۔ جواہر لال بڑی دیر تک اس کھڈ کی دیوار سے چمٹے رہے۔ خوش قسمتی سے اس بُرے وقت میں وہی رسّی کام آئی جو کمر سے دونوں نے باندھ رکھی تھی۔ بھائی نے بڑی مشکل سے انہیں باہر کھینچا، تو صحیح سلامت اُوپر آئے ورنہ اس دن زندہ بچ جانا ممکن ہی نہ تھا۔

بچّوں سے محبّت ان کی فطرتِ ثانی تھی۔ چنانچہ ساری دُنیا کے بچّے انہیں چاچا نہرو کہتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی سالگرہ ۱۴ نومبر کو ہندوستان میں "یومِ اطفال" یعنی بچوں کے دن کے طور پر منائی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ وہ ریاستِ کیرالا کا دَورہ کر رہے تھے ہزاروں لوگ راستے کے دونوں طرف کھڑے تھے، کہ اچانک ایک چھ سالہ لڑکی پولیس کا گھیرا توڑ کر جواہر لال کی موٹر کے بالکل سامنے آ گئی۔ اگر ایک لمحے کی دیر ہوتی تو وہ کچل جاتی۔ ڈرائیور بہت گھبرا گیا تھا۔ عین وقت پر موٹر کی رفتار سست ہوئی۔ جواہر لال باہر کود ے اور بچّی کو گود میں اُٹھا لیا اس کے گلے میں ہار ڈالا اور اسے روتی ہوئی ماں کی گود میں دے دیا۔

موٹر کے اس حادثے کی بات پر ایک اور واقعہ پڑھتے چلئے۔ ایک مرتبہ پنڈت نہرو ایک جلسے میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ کافی دیر ہو گئی تھی، اور فاصلہ طویل تھا۔ ڈرائیور کو حکم دیا "گاڑی تیز چلاؤ"۔ پچھلی نشست پر ان کے ساتھ ہی لال بہادر شاستری بیٹھے ہوئے تھے۔ موٹر اپنی پوری رفتار کے ساتھ جا رہی تھی کہ اچانک سامنے ایک بیل آ گیا ڈرائیور نے بیل کو بچانے کی کوشش کی، تو گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی اور موٹر میں بیٹھے تمام لوگ دور جا کر گر پڑے۔ ڈرائیور زخموں سے چُور تھا۔ نوکر کو بھی کافی چوٹیں آئیں۔ پنڈت نہرو کو بھی دو چار جگہ زخم لگے۔ لیکن وہ حواس باختہ نہیں ہوئے۔ اُٹھنے لگے تو جسم پر انہیں بوجھ سا محسوس ہوا۔ انہوں نے پڑے ہی پڑے لال بہادر شاستری کو پکارا.....

"شاستری جی آپ کہاں ہیں؟"

"میں آپ کے اُوپر ہی تو پڑا ہوں"

شاستری جی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ پنڈت نہرو نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "مجھے اُٹھنے بھی دو گے یا یونہی مجھ پر

پڑے رہوگے؟" اتنے میں حفاظتی دستے کی موٹریں بھی آگئیں۔ انہوں نے نہرو جی کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو جان میں جان آگئی۔

ملک و قوم کی خدمت میں پنڈت نہرو کچھ ایسے کھو گئے تھے کہ انہیں اپنے سراپا کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔

ایک مرتبہ جب وہ ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کرنے کے لیے پہنچے تو فوٹوگرافوں نے اپنے کیمرے ان کے چہرے کی بجائے اُن کے پیروں پر مرکوز کر دیئے۔

پنڈت نہرو پہلے تو کچھ پریشان سے ہوئے اور کچھ سمجھ نہ سکے کہ کیا معاملہ ہے؟ لیکن جب ہر کیمرہ ان کے پیروں کو ہی گھورنے لگا تو انہوں نے بھی اپنے پیروں کی طرف نظر کی۔ معلوم ہوا ان کے دائیں پیر کا جوتا بڑی طرح منہ پھاڑے ہوئے ہے۔ انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔

پنڈت نہرو کو کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ ان کی تنخواہ کیا ہے؟ کتنا روپیہ ٹیکسوں میں کٹتا ہے؟ اور کتنا بینک میں جمع ہوتا ہے۔؟ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔۔ اُنہوں نے گھر کے اخراجات کے لیے معمولی رقم کا ایک چیک کاٹ کر اپنے نوکر ہری کے حوالے کر دیا۔ رات میں بارہ بجے جب وہ سب کام ختم کرکے کھانے کے لیے بیٹھے تو کھانے میں صرف ایک سبزی اور دال تھی۔ پنڈت نہرو نے سوالیہ نظروں سے ہری کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"بنک میں روپیہ نہیں ہے"

دوسرے دن اخراجات کے لئے ہندوستان کے وزیراعظم کو اپنی بیٹی اِندرا گاندھی سے قرض لینا پڑا۔

جواہر لال پارلیمانی آداب کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ بیرونی ملک کے دورے پر روانہ ہو رہے تھے۔ سارا سامان تیار کرا کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو ان کی کابینہ کے رفقاء اور اراکین پارلیمان الوداع کہنے کے لئے حاضر تھے۔ اچانک وہ بہت بے چین ہو گئے اور اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کسی نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

کہنے لگے [illegible] جناب [illegible] دشمن سے [illegible] وقت [illegible] مشکل [illegible] نہیں [illegible] سمجھے [illegible] سکے [illegible] آپ [illegible] بات چیت کرنے لوٹ آئے [illegible] اطمینان ہوا

یہ چند واقعات جو ان کی [illegible] اور دیگر کتابوں اور رسائل سے نقل کئے گئے ہیں اُن کی شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان واقعات میں ہمارے لئے اور ہمارے موجودہ رہنماؤں کے لئے رہنمائی اور سبق حاصل کرنے کے بہت سارے پہلو مضمر ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان واقعات کی روشنی میں ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کریں اور عملی جدوجہد میں اسی روح کو اپنائیں جو ان کے خلوص، لگن اور قوم و وطن سے محبت کی راہ میں ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو اس عظیم رہنما کی عظمت کے اعتراف میں یہ ہمارا سچا خراجِ عقیدت ہوگا۔ جس نے کہا تھا۔

"ایک دن لوگ کہیں گے کہ یہ وہی آدمی تھا جو اپنے دل کی گہرائیوں سے ہندوستان اور اس کے عوام سے محبت کرتا تھا، اور اس کے بدلے میں اسے ہندوستان کے لوگوں کی بے پناہ محبت ملی اور وہ اس پر جان چھڑکتے تھے۔"

کیا ہم اس عظیم رہنما کے ان تاثرات کا پاس رکھ سکیں گے۔؟

○ شیخ اقبال احمد
۳/۴۳/۲۴ بچاپن نگر
ملاڈ ایسٹ بمبئی ۴۰۰۰۶۴

پرندوں کی قوتِ پرواز اور انکے عادات واطوار

پرندوں کے وقت زیادہ تر کا بیشتر حصہ اپنی نوع نسل کی افزائش کے پروسیس میں صرف ہوتا ہے اس سلسلے کے بھی متعدد درجے ہوتے ہیں جو مختلف انواع میں الگ الگ ہوا کرتے ہیں ۔

اکثر پرندوں کی افزائش نسل کا موسم موسم گرما کے آخر میں یا بہار کے شروع میں ہوا کرتا ہے۔ دوسرے کئی بھی وقت گھونسلے بنانے لگتے ہیں لیکن اس کا انحصار ان کے مقامی حالات پر ہوتا ہے۔ موسم خراب ہو تو مادہ کا رجحان نہ تو گھونسلے بنانے۔ انڈے دینے اور انڈوں کو سینے کی تمام کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اگر موسمی حالات اچھے ہوں تو بعض اوقات بچوں کے کئی جھول بھی لگاتار نکال لیتے ہیں ۔

پرندے ضروریات زندگی پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ ان کی ضروریات میں پانی، پودے اور وہ کیڑے مکوڑے ہیں جو ان کی خوراک ہیں ۔ اگر ان کے رہن سہن کی جگہ آب ودانہ کے لحاظ سے نامناسب ہوتی ہے تو پرندے سازگار مقام کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں خواہ وہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو اور وہیں گھونسلے بناتے اور افزائش نسل کا سلسلہ قائم کرتے ہیں انھیں خانہ بدوش پرندے کہتے ہیں ہندوستان کی آب وہوا کہیں گرم۔ کہیں خشک، کہیں سرد اور کہیں مرطوب ہے اس لئے خانہ بدوش پرندوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اگرچہ ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔

جب افزائش نسل کے لیے موسم اور حالات سازگار ہوتے ہیں تو نر اور مادہ اپنی نوع کی خصوصیات وعادات کے اعتبار سے جوڑا بنا لیتے ہیں۔ اکثر پرندوں میں جوڑا بنانے سے پہلے کچھ وقت کے لیے کورٹ شپ قائم ہوتا ہے جس کی ابتدا نر کرتا ہے۔ کورٹ شپ کبھی مختصر ہوتی ہے اور کبھی چند دنوں تک چلتی ہے اس دوران نر پروں کو سنوارتا ہے خصوصی پروں کو سیدھا کرتا ہے تحفہ کے طور پر کھانے کے لئے کوئی اچھی چیز پیش کرتا ہے اور اپنی اڑان کے کچھ کرشمے دکھاتا ہے تاکہ مادہ کو مائل کر سکے۔ کبھی کبھی رقیبانہ مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

اس طرح جو جوڑے بنتے ہیں وہ بعض انواع میں زندگی بھر کے لیے بعض عارضی اور بعض انواع میں انڈے نکلنے کی مدت کے لیے ہوتے ہیں۔ جوڑوں کے لحاظ سے زیادہ قسمیں ان پرندوں کی ہیں جن کا جوڑا انڈے بچوں کے موسم تک کے لیے ہوتا ہے گھونسلہ بنانے میں نر اور مادہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک تنکے لا کر جمع کرتا اور دوسرا انھیں جوڑتا ہے کبھی دونوں تنکے لاتے اور جوڑتے جاتے ہیں۔ بعض قسم کے پرندوں میں نر صرف تنکے لاتا اور مادہ گھونسلے بناتی ہے بعض پرندے بہت گھنا گھونسلہ بناتے ہیں اور بعض صرف بیٹھنے کے لیے یا بیٹھنے کی سہولت والے گھونسلے تعمیر کرتے ہیں۔ پرندوں کی ایسی قسمیں بھی ہیں جو گھونسلوں کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ بعض گیلی زمین میں۔ ساحل پر، سوراخوں میں۔ سوکھے درختوں پر رہن سہن اختیار کرتے ہیں۔ ہندوستانی طوطا خاص کر پیکٹوں اور سوکھے درختوں کے سوراخوں کو نشیمن بنا لیتا ہے لیکن زیادہ تر گھونسلے ایسے ہوتے ہیں جن میں کچھ درمیان میں بیٹھنے کے لائق جگہ ہوتی ہے۔ گھونسلے چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں اور آمد و رفت کے لیے صرف ایک گول سا سوراخ ہوتا ہے۔ بعض پرندے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کوئل جو دوسروں کے گھونسلوں میں انڈے دیتی ہے اور سینے اور پرورش کرنے کی زحمت مربی گھونسلوں کے مالک پرندوں کے سر ڈال دیتے ہیں۔

گھونسلے دراصل پرندوں کو گرنے سے بچاتے ہیں۔ پرندے (اکثر مادہ اور نر) ان انڈوں پر بیٹھتے اور گرمی پہنچاتے ہیں جس سے آخر کار بچے نکل آتے ہیں۔ پرندوں کے بچے عموماً انڈوں سے نکلنے پر بے بال و پر کے ہوتے ہیں اور ان کے ماں باپ انھیں اپنی چونچ کے ذریعے کھلاتے ہیں۔ تقریباً تین ہفتوں میں ان بچوں کے بال و پر نکل آتے ہیں اور دو سے تین مہینے تک یہ اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ البتہ بطخوں اور دوسری بڑی قسم کے پرندوں کے بچے انڈوں سے ایسی حالت میں نکلتے ہیں کہ ان کے جسم بال و پر سے آراستہ ہوتے ہیں اور چند ہی گھنٹوں کے بعد دوڑنے لگتے ہیں۔

ان بچوں کی حفاظت شکاری خور پرندوں سے ضروری ہوا کرتی ہے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ انھیں ان کے کھانے کے لائق چیزوں سے واقف کرایا جائے اور موسمی کیفیات سے بچایا اور صحت مندی کے ساتھ رکھا جائے اکثر مادہ یہ فرض انجام دیا کرتی ہے۔

پرندے دلچسپ مخلوقات میں سے ہیں ان کی خوش رنگی دلوں کو موہ لیتی ہے۔ بعض کی نغمہ ریزی مغموم دلوں کو سکون بخشتی ہے۔ نیل کنٹھ، طوطا، مینا

بلبل، اپنے قد و قامت، دلکش رنگ، اور پسندیدہ آواز سے طبیعتوں کو مسحور کر دیتے ہیں ان کے پروں میں بڑی جاذبیت ہے یہ پر پرندوں کے جسم سے اس طرح نکلتے ہیں جس طرح انسانوں کے جسم پر بال اور انگلیوں میں ناخن لیکن پروں کا بڑھنا ایک خاص حد تک بڑھنے کے بعد رک جاتا ہے۔

چونکہ پروں کے ذریعے پرندوں کو توازن قائم رکھنا ہوتا ہے اس لیے ان کے دونوں بازوؤں کے ایک ہی مقام کے پر ایک ساتھ گرتے اور نکلتے ہیں۔ دُم کے پر بھی دونوں طرف سے اسی طرح جھڑتے اور نکلتے ہیں۔

جہاں پروں کے ذریعے پرندوں کو توازن قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے وہیں یہ گرمی اور سردی سے بچاؤ کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ تیرنے والے پرندے (بطخ، ہنس وغیرہ) انھیں پروں کے ذریعے تیر سکتے ہیں بلکہ ان سے تیز دوڑنے میں بھی کام لیتے ہیں۔ تیرنے والے پرندوں کی بناوٹ بھی دوسرے پرندوں سے الگ ہوتی ہے۔

غزل

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا
۱۱۔ استارکی ٹاؤن۔ ناگپور ۱۸

جب ہوئے ہنر لیکر ہم اہلِ ہنر پہ مہکے
غزلوں کے چمن جاگے گیتوں کے نگر مہکے

کردار کی خوشبو میں جن لوگوں کے ہاتھ آئیں
ہر گوشۂ عالم میں مثلِ گلِ تر مہکے

جس موڑ پہ ہم ٹھہریں واں بعض جہاں رک جائے
جس راہ پہ چل نکلیں وہ راہگذر مہکے

اے شاخِ نہالِ غم ممنون ہیں تیرے ہم
جو پھول کھلے تجھ پر وہ شام و سحر مہکے

کس شاہدِ رعنا نے گلشن میں لی انگڑائی
پھولوں کی قبا چمکی شبنم کے گہر مہکے

یثرب کا گلِ رنگیں یوں عطر فشاں آیا
خوشبو سے پسینے کی ٹوٹے ہوئے گھر مہکے

اُس روئے حسیں میں وہ جادو بھری خوشبو ہے
اک بار اگر چھو لے رہ رہ کے نظر مہکے

وہ زخم بہر صورت ہاتھ آئے تو بہتر ہے
جس زخم سے اے منشا دل آٹھ پہر مہکے

تمام پرندوں میں ایک ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے جو چند چھوٹی ہڈیوں سے مل کر بنتی ہے۔ ان چھوٹی ہڈیوں کو نقرہ یا گری کہتے ہیں یہ نقرے باہم ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اس قسم کے نقروں والے دوسرے جانوروں میں دودھ پلانے والے جانور (گائیں، کتے، گلہریاں) رینگنے والے جانور (سانپ، چھپکلی، مگرمچھ، کچھوا) خشکی اور تری میں رہنے والے جانور (مینڈک، بڑے مینڈک، سلامندر (ایک قسم کا دو عنصری جانور) اور مچھلیاں ہیں۔

پرندوں کو سب جانوروں سے ممتاز کرنے والی چیز ان کے پر ہیں۔ یہ پر پرندوں کے جسم کی کھال سے نکلتے ہیں جو ہر پرندے کے سلسلے میں ان کی نوع کے لحاظ سے ایک خاص حد تک بڑھنے کے بعد رک جاتے ہیں یوں تو یہ پر ان کے جسم میں مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں لیکن شکاری کی گرفت میں جانے کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کسی قدر آسانی سے ادھیڑے جا سکتے ہیں۔ پھر یہ پر جب پرانے ہو جاتے ہیں تو قدرتی طور پر آہستہ آہستہ جھڑ جاتے ہیں

اور ان کی جگہ نئے پر نکل آتے ہیں۔ یہ سلسلہ زیادہ تر سال میں ایک بار اور عموماً انڈوں سے بچوں کے نکلنے کے بعد پیش آتا ہے اگرچہ بعض پرندوں کے سلسلے میں نئے پر سال میں دو بار بھی نکلتے ہیں۔

بطخ اور ہنس کی بعض قسموں کے سب پر ایک ساتھ جھڑ جاتے ہیں۔ یہ حالت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کے بچے اڑنے کے قابل نہیں ہوتے اور کئی ہفتے تک بڑی بطخوں کا بچوں کے ساتھ رہنا لازمی ہوتا ہے اس بے پری کی حالت میں بڑی بطخیں پانی

کے قریب نہیں جاتیں بلکہ انڈے سینے کی جگہ ہی پر رہتی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

پر ایک خاص انداز میں جلد کے اس عضو کے دائرے میں نکلتے ہیں جنہیں پر کا

دائرہ (Feather tract)

کہتے ہیں بعض پرانے پرندوں میں جیسے شتر مرغ اور پینگوین پوری جلد پر پر کا دائرہ ہوتی ہے اس لئے ان پرندوں کا سارا جسم اور جلد پروں سے ڈھکا رہتا ہے۔ دوسرے پرندوں میں پر کے دائرے اس طرح ہوتے ہیں کہ دو دائروں کے درمیان غیر پردار جلد (Bane Skin) صاف نظر آتی ہے ہر نوع میں پر کا دائرہ الگ الگ ہوا کرتا ہے جس طرح ان کے چونچ گردن پنجے جسم کی لمبائی۔ دم کی بناوٹ اور لمبائی وغیرہ الگ الگ ہوتے ہیں۔

ریڑھ کی ہڈیوں والے جتنے جانور ہیں ان سب سے ہلکا ڈھانچہ پرندوں کا ہوتا ہے لمبی گول ہڈیاں کھوکھلی ہوتی ہیں جن میں گودا نہیں ہوتا۔ بلکہ باریک دھاگے کی طرح ایک نس جیسی چیز ہوتی ہے۔

جہاں ہڈیوں کا لچکدار ہونا اور مڑنے کے قابل ہونا ضروری ہے وہاں ہڈیاں ٹھوس ہوتی ہیں تاکہ مضبوطی حاصل ہو۔ پرندوں کی ریڑھ کی ہڈی کے اوپر پسلیوں کی ہڈی کے بعض حصے جسم کے ٹھوس ڈھانچے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔

اڑنے والے پرندوں میں سب سے اہم اور خاص حصہ ان کے سینے کی ہڈی ہے جس کے بیچ میں ایک مضبوط، سیدھا قائم باستون ہوتا ہے یہی ستون وہ لنگر ہے جو اڑان کو قوت دینے والے پٹھوں کا کام کرتا ہے، یہی پٹھے ہر پرندے کے سب سے بڑے اور مضبوط پٹھے ہوتے ہیں۔ دوسرے طاقت ور پٹھے وہ ہیں جو دم کو سہارا دیتے اور پیروں اور پنجوں کو قوت عطا کرتے ہیں۔

پروں کی بڑی ہڈیاں جو اڑان کے دوران پرندے کے پروں کو سہارا دیتی ہیں ٹھوس نہیں ہوتیں البتہ پنجوں کی ہڈیاں ٹھوس ہوتی ہیں۔ انگلیوں کی بعض ہڈیاں غائب ہوتی ہیں۔ پاؤں میں پنڈلی کی ہڈیاں ٹھوس ہوتی ہیں اور پیروں اور ٹخنوں کی ہڈیاں مل کر تقریباً ایک واحد ہڈی جیسی ہوتی ہے۔ پرندوں میں اکیلا، لچکدار حصہ اس کی گردن ہے۔ یہ تمام اعضاء پرندوں کو اڑنے میں مدد دیتے ہیں۔

پر پرندوں کو توازن اور ایک شکل عطا کرتے ہیں اور اسے گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ یہی پر تیرنے والے پرندوں کو تیرنے میں مدد دیتے ہیں اور ان کو خوبصورت اور دلکش بناتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اہم یہ ہے کہ یہی پر انہیں اڑنے کے قابل بناتے ہیں۔

اڑان (Flight)

تمام پرندے پروں کو زور زور سے پھڑپھڑا کر اڑتے ہیں لیکن جہاں ایک بار وہ ہوا کے دوش

صابر دت
پرچھائیاں - 9. رائل ٹیرز لین
جوہو چرچ. بمبئی ۵۴

غزل

شراب بادہ گساروں میں رکھ گیا ہے کون
تمہارا حسن بہاروں میں رکھ گیا ہے کون
جدھر بھی جاؤں میں دیکھوں بہار کا سایہ
گئے دنوں کو نظاروں میں رکھ گیا ہے کون
گلابی ہونٹ، حسین آنکھیں، ریشمی زلفیں
یہ میرے راز ستاروں میں رکھ گیا ہے کون
اندھیرا ہوتے ہی کیوں آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
چھپا کے درد چناروں میں رکھ گیا ہے کون
مہکتے پھول کے آنچل میں اوس کے موتی
مری کہانی اشاروں میں رکھ گیا ہے کون

دلکش عثمانی (ایم اے) نیازیان۔ امروہہ (یوپی)
۲۴۴۲۲۱ پن

بہار کا عالم

ہے گلوں پر اُبھار کا عالم ۔۔۔ بلبلوں پر نکھار کا عالم
اور طاری خمار کا عالم ۔۔۔ ہے عجب لالہ زار کا عالم
خوب ہے یہ بہار کا عالم

گل و بلبل میں سانحہ کیسا ۔۔۔ شوق مرہونِ ناز ہے کیسا
کون عاشق ہے راز ہے کیسا ۔۔۔ بڑھ گیا حد سے پیار کا عالم
خوب ہے یہ بہار کا عالم

ہو گئی سبز پوش ہر ڈالی ۔۔۔ سامنے ہے نظر کے ہریالی
ہے طبیعت ہر ایک متوالی ۔۔۔ دیکھ کر سبزہ زار کا عالم
خوب ہے یہ بہار کا عالم

اس پہ صدقے ہوئے گل و سوسن ۔۔۔ اور جوبن پہ آگیا جوبن
رشکِ گل بن گیا وہ غنچہ دہن ۔۔۔ دیکھئے حسنِ یار کا عالم
خوب ہے یہ بہار کا عالم

جب فضاؤں پہ چھا گئی مستی ۔۔۔ بات ظالم نے میری بھی پوچھی
کچھ تسلی دلِ تیرہ کو ہوئی ۔۔۔ کم ہے اب انتظار کا عالم
خوب ہے یہ بہار کا عالم

پر پہونچ گئے تو ہیں مختلف طریقوں سے اڑ سکتے ہیں۔ وہ "قوتِ پرواز" سے کام لیتے ہیں۔ جب اپنے آپ کو ہوا میں آگے بڑھانے کیلئے اور پروں کو پھڑپھڑاتے رہتے ہیں وہ "اونچی اڑان" بھرتے ہیں تو ہوا میں منڈلاتے اور تیرتے رہتے ہیں اور کبھی بھی "قوت پرواز" اور "اونچی اڑان" دونوں سے کام لیتے ہیں۔

پرندوں کو قدرت نے ویسے ہی پر عطا کئے ہیں جس قسم کی اڑان کے وہ عادی ہوتے ہیں۔ بلند پروازی کرنے والے اوپر پہونچنے کے بعد بہت زیادہ عرصے تک منڈلاتے رہنے والے پرندوں کے پر دوسرے سب پرندوں کے مقابلے میں زیادہ لمبے ہوتے ہیں اور جو بہت کم اڑتے ہیں ان کے پر سب سے چھوٹے ہوتے ہیں

منڈلانا اور ہوا میں تیرتے رہنا

اسی انداز پر ہوتا ہے جس انداز سے ایک گلائیڈر ہوائی جہاز آہستہ آہستہ اڑتا ہے اس کے لئے پر پھڑپھڑانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ البتہ بلند پروازی کے موقع پر پرندے کے لئے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ ہوا کہاں ہے اور کس رخ چل رہی ہے اور اس کو کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔ زمین سے دیکھنے پر بلند پروازی آسان لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پرندہ سست رفتاری سے اڑ رہا ہے اور ہوا خوری کر رہا ہے۔ در حقیقت اس وقت پرندہ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ پروں کو سکیڑ کر پرندہ اس وقت گویا ساحلی تفریح میں مگن ہے اور اوپر اٹھتی ہوئی ہوا میں دُم کے ذریعے تیر رہا ہے اور اپنے پروں کو اور کہیں مڑتے وقت ذرا جسم کو جنبش دے رہا ہے جس طرح کوئی ہوائی جہاز کرتا ہے۔

زمین کے اوپر اڑنے والے پرندے سمندر کے اوپر اڑنے والے پرندوں کے مقابلے میں زیادہ بلندی تک پرواز کر سکتے ہیں اس لئے کہ زمین کے اوپر ہوا کا رخ زیادہ بلندی کی طرف ہوتا ہے۔ بلندی کی طرف ہواؤں کو موڑنے کا کام پہاڑ، اور وادیاں اور ٹیکریاں، اونچی عمارتیں، سطح زمین اور اونچے درخت انجام دیتے ہیں جو ہواؤں کے رخ کو یکایک تبدیل بھی کر دیتے ہیں۔

زمین کے اوپر اڑنے والے پرندوں کے پر سمندر پر اڑنے والے پرندوں کے پر سے زیادہ چوڑے ہوتے ہیں۔ زمینی پرندوں کے پروں کے سرے عموماً گولائی دار ہوتے ہیں نوک دار نہیں ہوتے۔ زمینی پرندے اپنے پروں کو پھیلا کر کشادہ کر سکتے ہیں جس کے سبب پروں کے درمیان کچھ جگہ سی بن جاتی ہے، جو ان پرندوں کو جلدی سے رخ بدلنے کی سہولت عطا کرتی ہے اور سمندری پرندوں کو ایسا کرنے کی ضرورت

شاذو نادر ہوا کرتی ہے۔

زمین کے اوپر پرواز کرنے والے حیرت انگیز مہارت رکھنے والے پرندوں میں عقاب، چیل، باز اور گدھ ہیں۔ دوسرے براعظم کے پرندوں میں کانڈور پرندہ بلند پروازی میں بڑا ماہر ہوتا ہے بمندر کے اوپر بلند پروازی کرنے والے پرندوں میں البٹراس، فریگیٹ، پرندہ شیر آب اور دریائی گل ہیں بعض سمندری پرندے جیسے سفید پلیکن، زیادہ تر زمین کے اوپر پرواز کیا کرتے ہیں ان کے پر گولائی مائل اور درمیان میں قدرے کھلے ہوتے ہیں۔

دنیا کے اکثر پرندے ادھر ادھر اڑنے کے لئے "قوتِ پرواز" سے کام لیتے ہیں ہوا کے بہاؤ کا فائدہ اس وقت اٹھاتے ہیں جب ممکن ہوتا ہے لیکن پرندے اس پر دار و مدار نہیں رکھتے کیونکہ ان کے پھڑپھڑانے والے پر ان کو آگے بڑھانے کے لئے اور سینے کے پٹھے کو قوت عطا کرتے ہیں۔ اور قوت عطا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں جو پرندے نیچے ہی اڑتے ہیں یا مختصر فاصلے تک جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان اڑتے ہیں ان کے پر بہت زیادہ گولائی مائل اور بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور جو تیزی کے ساتھ اور طویل عرصے تک بلندی پر اڑتے ہیں ان کے پر زیادہ نوکیلے ہوتے ہیں۔

پرندے پروں کے ان سروں کو جو اڑتے وقت ان کے پنجوں یا ہتھیلیوں کے قریب ہوتے ہیں اور ہوا کے ذریعے ذرا سا مڑ جاتے ہیں۔ ان پروں کو وہ ہوا کے رخ پر کرتے ہیں پھر جیسے جیسے پروں کو پھڑپھڑانے سے ہوا کے دباؤ میں فرق آتا ہے اور وہ پر جو سروں پر ہوتے ہیں اور ہوا کے ذریعے کچھ خم سے ہو جاتے ہیں خود بخود اسی دھارے پر ہو جاتے ہیں جس سمت پھڑپھڑانے والے پروں کے ذریعے پرندہ جانا چاہتا ہے۔ یہ قدرتی انتظام بطخوں، ہنسوں اور دوسرے کئی قسم کے پرندوں میں ہوتا ہے۔ بعض بلند پرواز پرندوں میں بھی یہ انتظام پایا جاتا ہے۔

پرندوں کے پروں کا دائرہ ان کے وزن کی مناسبت اور پرواز کی نوعیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ "بلند پرواز" پرندوں میں "پروں کا وزن" کم ہوتا ہے جب کہ "قوتِ پرواز" سے زیادہ کام لینے والے پرندوں کے پروں کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔ گدھ کے پر کا ہر مربع فٹ تقریباً آدھ کلو یا اس سے بھی کم وزن اٹھا سکتا ہے جب کہ بطخ کے پر کا ہر مربع فٹ اس کے بالمقابل ½۲ گنا زیادہ وزن برداشت کر سکتا ہے۔

بعض پرندے سیدھی اڑان کے وقت دوسرے پرندوں کی بہ نسبت پروں کو زیادہ تیزی سے پھڑپھڑا سکتے ہیں۔ ابابیل فی سکنڈ ۴ مرتبہ پھڑپھڑا سکتے ہیں جبکہ بعض دوسرے چھوٹے پرندے فی سکنڈ تین مرتبہ یا دو مرتبہ ہی پھڑپھڑانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جب کوئی پرندہ خوف زدہ ہوتا ہے یا کسی دوسرے پرندے کا تعاقب کرتا ہے تو وہ اپنے پروں کو کچھ دیر کے لئے زیادہ تیزی کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے تاکہ اس طرح اڑان میں تیزی آجائے۔

اڑان کا تیسرا طریقہ یعنی بلند پروازی اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ دونوں سے ایک کام لینا۔ مختلف پرندوں میں مختلف ہوتا ہے۔ ھدھد (لکڑ خورہ) اسی ترکیب کو عمل میں لاتا ہے لیکن اس کے پروں کی زوردار پھڑپھڑاہٹ اور تیرنے جیسے انداز میں نیچے کی طرف تیز پرواز اسے لہردار پرواز کا روپ عطا کرتی ہے۔ ✪

عقاب

ایک گھنٹہ میں ۱۳۵ میل اڑ سکتا ہے

کتا

ایسا جانور ہے جس کی زبان پر پسینہ آتا ہے

شہد کی مکھی کی پانچ

آنکھیں ہوتی ہیں۔

• ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ
بی ۱/۱/۴۴۱۱-۲۰۲۰ پوسٹ آفس لین
نیو نلہ کنٹہ۔ حیدرآباد ۴۴۰۰۵

پرندوں کا مسیحا

ہندوستان میں زندگی کے کئی شعبوں میں کئی نامور ہستیوں نے کارنامے کر دکھائے ہیں ان کی شہرت دنیا بھر میں ہوئی۔ سی۔ وی رامن اور ٹیگور نے ہمارے ملک کا نام سائنس و ادب کے احاط میں روشن کیا ہے ۔ عالمِ سیاسیات میں تو ہندوستانیوں کی کمی نہیں۔ عدمِ تشدد کے فلسفی، سوک رہبر اور رہنما مہاتما گاندھی تو ہمارے دلوں میں سدا کے لئے بس گئے ہیں۔ عالمی شہرت حاصل کردہ شخصیتوں میں حیاتیات کے شعبۂ آرنتھالوجی میں ڈاکٹر سالم علی کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے

ڈاکٹر سالم علی کسی یونیورسٹی میں پروفیسر نہیں رہے لیکن کوئی پروفیسر، محقق، طالب علم کسی جامعہ یا ادارۂ تحقیق میں کام کرنا چاہے تو ان کا نام لئے بغیر پرندوں کے عادات اور طرزِ زندگی کا مطالعہ مکمل نہیں ہو پاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسیحا نے زندگی کو پرندوں سے وابستہ کر لیا تھا۔ ان کے طور طریق کے لئے اپنی زندگی کو، بیوی کی خوشیوں کو بھی تیاگ دیا تھا۔ آپ وقف ہو گئے حصولِ تعلیم کیلئے جو ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر سالم علی کا بیسویں صدی میں، دنیا کے لئے۔ گو وہ انیسویں صدی کے آدمی تھے لیکن بیسویں صدی کے باشندوں کو جام پیش کیا ہے قدرت کے مطالعے کے لئے۔ امام تھے علم پرندوں کے، سینٹ فرانسس آف اسی سے پرندوں سے بات چیت کرتے تھے اپنے کندھوں پر بٹھا کر۔ دنیا کے کئی مقامات پر ہر سال ۴/اپریل کو اس سنت کا دن منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سالم علی کی ان سے بھی مماثلت ہے۔

ڈی راج

پرندوں کی چہچہاہٹ میں معصومیت ہے تو ساتھ ہی ساتھ امن کا پیغام ہے۔ سکون کی طرف اشارہ ہے تو سماجی زندگی کی تمہید بھی ہے۔ چارہ حاصل کرنا، گھونسلہ بنانا، تولید کے لئے مارے مارے پھرنا، میلوں دور چلے جانا، نقل مکان (ہجرت کرنا) یہ سب پرندوں کے افعال ہیں۔ روس سے اگرچہ چند پرندے مدراس کے قریب تولید کے لئے ۳ مہینے رہ جاتے ہیں اور بچے بڑے ہو کر پھر روس چلے جاتے ہیں۔ چیراپونجی میں زیادہ بارش ہوتی ہے۔ چند پرندے بارش کے موسم میں دادر (بمبئی) چلے آتے ہیں اور موسم برسات کے بعد چیراپونجی واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ سب عینی مشاہدات ہیں۔

سائنسدانوں کے ایسے مشاہدات میں منہمک ہوئے ہمارے ہر دلعزیز ممتاز ماہر حیاتیات ڈاکٹر سالم علی۔ آنے والی نسلیں ان کے کارناموں کا جائزہ لیں۔ ان کے روزناموں کا مشاہدہ کریں، طور و طریق کو سمجھیں۔ ترمیم و اصلاح کریں اور فروغ دیں اس علم کو جو ایک طرح سے قدرت کا ذخیرہ ہے۔ خزانہ ہے۔ سچ ہے اس طرح کے علم میں منہمک رہ جانے سے جذباتی زندگی جو انسان مادی مدا گزار رہا ہے اس سے پرے رہ سکتا ہے اور پرندوں سے امن کی زندگی گذارنے کا پیغام حاصل کر سکتا ہے۔

ایک سو سال کی زندگی گذار کر ہم سے جدا ہو گئے ڈاکٹر سالم علی۔ ان کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ کٹھنائیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیشہ کشمکش رہی ان کے مطالعے کے لئے۔ کسی کی ہمدردی حاصل کی، نہ دولت کی طرف رخ کیا۔ نہ عیش و عشرت سے لگاؤ رکھا۔ سفر زندگی میں پرندوں ہی کا مطالعہ کیا۔ کتابوں کا انبار، ادارہ سے خط و کتابت۔ قدرت کے انواع کے بچاؤ کے سلسلے میں مہم، جدوجہد، مارے مارے پھرنا۔ یہی اوراق ہیں ڈاکٹر سالم علی کی زندگی کے ابواب کے۔

عمر رسیدہ تو تھے ہی۔ عینک سے جھانکتے تھے۔ کوئی ۵.۶ کا قد لیکن باک کے مانند چوکنا۔ ستواں ناک، ہاتھ میں بیناکولر لئے ہوئے، ایک دانشور، مدبر کی طرح بھی نظر آتے تھے عمر کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کی رونق میں اور اضافہ ہوتا گیا تھا۔ خاص کر ان کی ڈاڑھی

بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے صد سالہ جشن کا روائتی دیپ جلا کر افتتاح کرتے ہوئے آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کی ایک یادگار تصویر جس میں سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سالم علی بھی نظر آ رہے ہیں۔

داڑھی کی بنا پر۔ سالم علی ایک ادارہ تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی وہ گھبرائے ہوئے کبھی نظر نہیں آئے۔ کیمرہ پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے پالی ہل میں ایک مخصوص یک منزلہ عمارت کے باغیچے میں ملاقاتیوں کو نظر آتے تھے۔ چرچے سے نفرت کرتے تھے۔ شہرت کی کبھی فکر نہ تھی ان کو۔

ڈاکٹر سالم علی برِ اعظم ایشیا میں مشاہدہ بین تھے۔ سفیر تھے پیامبر تھے۔ رہنما تھے۔

کیتھیڈرل اسکول میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی بعد میں چل کر زیویرس کالج سے علم حیاتیات میں ڈگری حاصل کی۔
ایک دفعہ ایک چڑیا کو مار گرایا تھا اور اسے شناخت کے لئے بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے دفتر میں گئے۔ ولرڈ سے ملے۔ وہ پیلے گردن کی چڑیا تھی اس طرح اس سوسائٹی میں داخل ہوئے اور نوکری کرنے لگے۔ برلن میوزیم میں حصول علم کے لئے گئے۔ واپس آنے پر نوکری چلی گئی۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری مارے مارے پھرتے رہے حیدرآباد ریاست کے جنگلوں سے لے کر نیلگری کی پہاڑیوں تک ان

کا سفر رہا۔ دلدلی علاقے سے دور رہ نہیں پائے۔ لداخ کا سفر کیا تو راجستھان کے ریگستان کو بھی نہیں چھوڑا۔ ہاتھی کا دودھ بھی پیا۔ شیر کے بھی شکار کیے۔ ماہرین ماحولیات سے بھی خط وکتابت تھی۔ ریلے کے اشتراک کے ساتھ "پرندوں کی دنیا" پر کئی مضامین قلم بند کیے۔ رابرٹ گرب، ڈائرکٹر ریٹ کے لیے "گدھ" کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے ڈاکٹر سالم علی ان کے گائیڈ تھے۔ دو ہزار فٹ اونچائی کے مقامات کا ان کے ساتھ ساتھ دورہ کیا۔ گیر کے جنگلات کا بھی سفر کیا وہ ایکو سرگرم کارکن تھے۔ بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے صدر بھی رہ چکے تھے اور انڈین بورڈ آف وائیلڈ لائف کے سرگرم رکن رہے ہیں اس سلسلے میں ان کی اہلیہ تہمینہ نے ہر لمحہ ان کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔

ڈاکٹر سالم علی نے پرندوں کے عادات و اطوار پر کئی کتابیں لکھی ہیں مثلاً "بھارت اور پاکستان کے پرندے" (دس جلدیں) "بیا پرندہ کا گھونسلہ بنانا"، "کچھ کے پرندے" انڈین ہل برڈز، ٹراونکور، کوچین برڈز، اے پکٹوریل گائیڈ، ٹو برڈز آف دی انڈین سب کانٹی ننٹ وغیرہ اس کے علاوہ کئی اقسام کے پرندوں پر نوٹس بھی

چن دیے ہیں۔ سارے عالم میں (۸۵۸۰) اقسام کے پرندے ہیں تو ہندوستان میں (۱۲۰۰) اقسام تک ہیں۔ ستر سالوں تک ڈاکٹر سالم علی نے مختلف اقسام کے پرندوں کا مشاہدہ کیا۔ مشاہدہ کا ذکر آتا ہے تو وہ خاکی سفاری سوٹ پہنے ہوئے۔ تھیلی بغل میں لیے ہوئے، آلف پی کیپ پہنے ہوئے، فیلڈ گلاس نوٹ بک ہاتھ میں لیے ہوئے دبلے، پتلے چست، ہونہار ماہر حیاتیات سالم علی کا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتے تھے۔

قدرت کا مشاہدہ انسان کے لیے

رحمت ہے۔

جب اعزازات، تمغوں، ڈگریوں کا ذکر آتا ہے تو سالم علی کو کئی اعزازات ملے۔ غیر سرکاری اداروں اور سرکار کی طرف سے بھی سب سے قیمتی ایوارڈ تو "پال گیٹی" تھا۔

پانچ لاکھ روپے کا تھا جو عالمی ادارۂ تحفظ ماحولیات کی طرف سے دیا گیا تھا۔

اس رقم کو بھی آپ نے بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ "جان فلپ" ایوارڈ بھی ملا۔ برٹش سوسائٹی کی طرف سے

سہرا تمغہ عطا کیا گیا، "یادر لودیکی" روسی میڈل بھی انھیں ملا۔ نیدر لانڈس کی سرکار نے "کمانڈر آف گولڈن آرک" کے خطاب سے نوازا بھارت سرکار نے "پدم شری" و "پدم بھوشن" بھی انھیں عطا کیا پھر جولائی ۱۹۸۶ء میں وہ ممبر راجیہ سبھا نامزد ہوئے۔

تحفظ جنگلی جانوراں، تحفظ ماحول جنگلیات جیسی تحریکوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "وادی سکوت" ہیڈل پراجکٹ کی روک تھام کی تحریک میں بھی آگے آگے تھے۔

چیکو تحریک سے بھی آپ نزدیک رہے۔ اتنا کام کرنے کے باوجود سالم علی کہتے تھے۔

میری کیفیت اندھوں میں کانے کے مانند ہے۔

وہ ایک انسان تھے۔ سادگی کا پیکر تھے۔ بے لوث خدمت گار تھے۔ مجذوب تھے۔

آئے دن لوگ ان کی تصانیف کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔ مرکزی سطح پر اگر ایک تحقیقی ادارہ پرندوں کے شعبہ میں کھول دیا جائے تو طالب علموں کو، محققین کو، عالموں کو مشاہدات کے لیے بھرپور مواقع حاصل ہوں گے۔

چند منتخب جامعات میں میموریل میڈل بھی ان کے نام سے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ منتخب شہروں میں پارک، تالاب اور سڑکیں بھی ان کے نام سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

بھرپور خراج عقیدت اسی امر میں ہے کہ ان کے کارناموں کے ترجمے ہندوستانی اور بیرونی ممالک کی زبانوں میں شائع ہوں۔

زی راج

• ڈاکٹر سیفی پریمی
نگارستان، ذاکر نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

غزل

دولتِ رشک بھی ہے گردشِ ایام کے ساتھ
لوگ پہچانتے ہیں مجھکو تیرے نام کے ساتھ

دل بدلتا ہے ہر اک غمزۂ و پیغام کے ساتھ
زندگی ہے تو اسی شوخِ دل آرام کے ساتھ

ہمنشینوں میں کوئی صاحبِ اسرار نہیں!
اسنے جینا بھی سکھایا دلِ ناکام کے ساتھ

زندگانی کی لطافت کوئی ہم سے پوچھے
دن گذارے ہیں بہت حافظ و خیام کے ساتھ

غیر کو خلد مبارک ہمیں دنیا ہے بہشت
مطرب و لالہ رخ و فصل گل و جام کے ساتھ

کوئی منزل ہی نہیں منزلِ جاناں سے حسیں
جسمِ سیمیں کا اجالا ہے در و بام کے ساتھ

اپنی تقدیر میں ہیں دوزخ و جنت سیفی
مسکن غیر بھی ہے کوچۂ اصنام کے ساتھ

مہاراشٹر میں پایا جانے والا شہباز

پروفیسر ملنڈ واٹوے
پرنو سوسائٹی
۱۰۰۰/۶-ک نوی پیٹھ-پونے نمبر ۳۰

کتنے ہی جانداروں اور پرندوں کے ساتھ ہمارا پہلا تعارف ہوتا ہے اسپ کی کہانیوں میں پنچ تنتر کی کہانیوں میں یا پھر رامائن اور مہابھارت کی کتھاؤں میں ظالم بھیڑیا۔ بزدل خرگوش۔ شاطر لومڑی۔ شیر اور پیٹو بندر اور اس طرح کے کئی جانوروں کے نقوش عین بچپن میں ہمارے دلوں میں مرتسم ہو کر رہ جاتے ہیں ان تمام حکایتوں اور کہانیوں قطعی طور پر حقیقی ماننے کی اپنی ایک عمر ہوتی ہے بعد ازاں وہ دور آتا ہے جب ہم اس حقیقت کو سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ حکایتیں حقیقی نہیں ہیں اور انھیں حقیقی تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسرے ہی لمحے ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ان حکایتوں میں جن چرند پرند کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے ہی دنیا کے رہنے بسنے والے ہیں جس طرح یہ حکایتیں فرضی اور مصنوعی لگنے لگتی ہیں اسی طرح ان میں پائے جانے والے چرند پرند بھی خیالی اور غیر حقیقی لگنے لگتے ہیں۔ چاتک صرف بارش کی برستی ہوئی بوندوں سے ہی اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ چکور چاندنی کے غم میں مبتلا ہے۔ یہ باتیں اگر محض شاعرانہ تخیل پر مبنی ہیں تو یقیناً وہ حقیقی نہیں ہیں۔ لیکن چاتک اور چکور بالکل حقیقی ہیں اس کائنات میں وہ موجود ہیں چکور ہمالیائی وادیوں میں آج بھی دیکھنے کو ملتا ہے اور مہاراشٹر میں برسات کے موسم میں اگر جھاڑیوں والے علاقوں میں تلاش کیا جائے تو چاتک جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔

ابھی کل کی بات ہے میں نے ایک صاحب کو شہباز کی تصویر دکھلائی وہ انتہائی حیرت زدہ ہو کر پوچھنے لگے کیوں صاحب یہ شہباز نام کا پرندہ کیا دنیا میں سچ مچ موجود ہے؟ اب آپ ہی بتائیے اگر شہباز کا کوئی وجود نہ ہوتا تو وہ تصویر کیا میری گھڑی ہوئی تھی۔

لیکن لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکایتی پرندے صرف حکایتوں، کہانیوں اور قصوں ہی میں ہوا کرتے ہیں اور حقیقت میں ان کے وجود کو ماننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا تجربہ یہی کہتا ہے۔

شہباز کا وجود سچ مچ ہے اس حقیقت پر شک کرنے والے میں نے بہت

لوگ دیکھے ہیں. شہباز اگر کہیں ہے تو وہ یقیناً ایسے کوہستانی علاقوں میں پایا جاتا ہوگا جہاں انسان کی پہونچ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے. بہت سے لوگ ایسا بھی سمجھتے ہیں لیکن اس پرندہ کا وجود ہے مگر نایاب اور ناقابل حصول ہے.

اس بات پر عام لوگ یقین رکھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ شہباز جو نایاب پرندہ سمجھا جاتا ہے وہ نایاب نہیں ہے. یہاں ایک بات اور ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ شہباز کوئی ایک ہی مخصوص ذات کا پرندہ نہیں ہے اس ذات کے مختلف قسم کے پرندے ملتے ہیں. کہا جاتا ہے کہ شہباز کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے تقریباً دس ذات یا قسم کے شہباز صرف مہاراشٹر میں پائے جاتے ہیں ان کے بسیرے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ پہاڑ ہی در دل کو کاٹا جائے یا جنگلات کو کٹوایا جائے.

سویرے کی دھوپ جیسے ہی ذرا تیز ہونے لگی کہ میکر بون، کھیتوں اور چشموں پر شکار کی تلاش میں شہباز دن کے جھنڈ کے جھنڈ خلاؤں میں گشت لگاتے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں.

شہباز کو ہمارے نہ پہچان سکنے کے دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ شہباز ایک لحیم شحیم پرندہ ہے لیکن بلندیوں میں اڑانیں لینے والے پرندوں کی جسامت کا صحیح اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے اور اسی لئے شہباز چیل جیسا نظر آتا ہے.

دوسرا اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ ہم چیل اور شہباز کی جسامت کے فرق کا باریکی سے جائزہ نہیں لیتے ورنہ اڑتی ہوئی چیل اور اڑان لیتے ہوئے شہباز کی جسامت کے فرق کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے چیل کی دم کے سرے پر ایک درازسی ہوتی ہے جیسے کسی نے دم کا کچھ حصہ قینچی سے مثلث نما کاٹ لیا ہو اس کے برخلاف شہباز کی دم کا سرا قوس نما ہوتا ہے اور اڑتے وقت اس کی دم قدرے پھولی ہوئی ہوتی ہے چیل کے پر جہاں چوڑائی میں کم درمیان سے پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں تو وہاں شہباز کے پر خاصے چوڑے ہوتے ہیں اور پروں کے سرے کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں جیسے ہمارے ہاتھ کی پھیلی ہوئی انگلیاں. چونکہ چیل اور شہباز کے بیچ کا فرق ہماری نظر میں نہیں آتا اس لئے ہم چیل کو بھی شہباز ہی سمجھ بیٹھتے ہیں.

مہاراشٹر میں شہباز کی ایک قسم ایسی بھی پائی جاتی ہے کہ شہباز جسامت میں چیل سے بھی چھوٹا ہوتا ہے اور اسے ہم صرف باز کے نام سے پکارتے ہیں اس کے برخلاف سب سے بڑی جسامت والا شہباز کم از کم گدھ کی جسامت کا ضرور ہوتا ہے.

مہاراشٹر میں تیسا (باز) نام سے پہچانا جانے والا جو باز پایا جاتا ہے وہ جسامت میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے در اصل ہم اسے " آدھا باز " کہہ سکتے ہیں

جاری

یہ شکل و شباہت میں محض ایک شکاری پرندے کی طرح ہوتا ہے کوے سے کچھ ذرا بڑا۔ تیا حویلی کی چھت پر یا کسی درخت پر بیٹھ کر زمین پر اپنی تیز نظروں سے جھینگروں، چوہوں، چوزوں اور کیڑوں مکوڑوں کو تلاش کرتا رہتا ہے اور جہاں ان کی کچھ ہلچل محسوس ہوئی کہ فوراً جھپٹتا ہے لیکن شباہت اور رعب داب میں اس پرندہ کو باز کہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

باز اور شہبازکی دو اور خاص قسمیں مہاراشٹر میں پائی جاتی ہیں۔ یہ سانپ کھانے والے باز ہوتے ہیں ان کے سر پر بڑا سا طرہ ہوتا ہے اور یہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر طرہ دار باز اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں جسامت میں چیل سے کچھ بڑے اس باز کا رنگ گہرا سنہری مائل ہوتا ہے جب یہ اڑتا ہے تو اس کے پروں اور دم کے حصے میں سفید پٹا صاف نظر آتا ہے۔ دوسری قسم کا باز سانپ کی دم کی طرح چھوٹے چھوٹے تیز نکیلے پنجوں والا باز، ان کے پیٹ کا نچلا حصہ سفید ہوتا ہے اور اسی سفید حصے میں گہرے سبز رنگ کی پٹیاں ہوتی ہیں جب یہ اڑتا ہے تو اس کے پروں کا سفید حصہ اور پھولی ہوئی دم صاف نظر آتی ہے۔ سانپ اس کی نہایت پسندیدہ غذا ہے اس کے پیروں پر بال نہیں ہوتے۔ سبھی باز سانپ کھانے والے نہیں ہوتے شکاری قسم کے باز خصوصاً پرندوں کو مار کر کھاتے ہیں۔ یہ ڈیل ڈول میں خوبصورت اور کافی تیز طرار ہوتے ہیں۔ ہوا میں اڑتے ہوئے پرندوں کا اپنے شکار کا تیزی کے ساتھ پیچھا کرنا اور اس پر جھپٹ کر اسے پنجوں میں دبوچ لینا۔ ان باتوں میں شکاری باز کا بس کچھ اپنا ہی کمال ہوتا ہے۔

سیشاری

(White-Bellied Ocean Eagle)

یہ سفید رنگت کے پیٹ والا سمندری باز سمندروں اور کھاڑیوں میں مچھلیوں کا شکار کر کے کھانے والے باز اس نام سے مشہور ہے۔ گہرے گھنے بالوں والا سفید رنگ کا یہ پرندہ بڑا ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ سمندروں کے اوپر اڑتے ہوئے ہوا میں غوطہ لگا کر بڑی خوبصورتی سے مچھلیوں پر جھپٹتا ہے اور ان کا شکار کرتا ہے بعض اوقات یہ سمندری سانپوں کا بھی شکار کر لیتا ہے اس قسم کا باز مہاراشٹر میں صرف کوکن کے ساحلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

بازوں میں چور اور لٹیرے قسم کے باز بھی ہوا کرتے ہیں دوسروں کا مارا ہوا شکار اڑا لے جانا اور کھانا۔ پرندوں کے گھونسلوں پر جھپٹ کر ان کے انڈے، بچے چرانا۔ مردہ جانوروں کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا اور ان جیسی مختلف گھٹیا حرکتیں کر کے غذا حاصل کرنے والے باز بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انھیں "سنہرے پروں والا باز" کہتے ہیں

(Tawny Eagle)

یہ نام دیا گیا ہے اس قسم کا باز پورا کا پورا

غزل

نصیر پرواز
بی ۱۰۹۲ / ۲ - این
بھوپال ۴۶۲۰۲۳
(ایم پی)

پہلے ہی چشم تفکر کو نکتہ چیں ٹھہرا
مری حیات کا محور مرا یقیں ٹھہرا

وہ جس کو چھو کے ہوئی خاک علم سرافراز
سبب خود نمی کا وہی پیکر مبیں ٹھہرا

قدم قدم پہ مجھے خواہش سکر ملتی رہیں
کسی کو دیکھا نہیں چل پڑا کہیں ٹھہر

ہے سبب سے کبھی اپنی آزمائش کر
جہاں کھڑا ہوں وہاں آسماں زمیں ٹھہرا

لہو لہان کیا جس نے جسم خوابوں کا
وہ اضطراب نظر عہد آفریں ٹھہرا

سکوت لب کو کبھی اذن عرض حال کبھی دے
ورق ورق تجھے تحریر دل نشیں ٹھہرا

میں انتشار کی زد میں بھی باوقار رہا
یہ غم بھی روح کی گہرائی میں حزیں ٹھہرا

وجود تشنہ لبی مجھ سے ہم کلام رہا
میں قطرہ قطرہ کوئی موج آتشیں ٹھہرا

جسے سبھی سے چھپایا تھا میں نے اپنے لئے
ہر ایک آنکھ کا مرکز وہی حسیں ٹھہرا

مرا وجود مخالف ہوا کے دوش پہ تھا
جہاں پہ چلنا تھا لازم مجھے وہیں ٹھہرا

میں اپنی ذات کو ہی کربلا بناتا رہا
ہر ایک حرف مری پیاس کا امیں ٹھہرا

ہر ایک شخص مجھے آنکھ سے گراتا رہا
کوئی بھی میرے لیے راہ میں نہیں ٹھہرا

پتہ ملے گا تجھے میری خاک کا پرواز
وجود نقش تفکر مری جبیں ٹھہرا

گہرے سنہرے رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ باز بسا اوقات اپنا ایک غول بنا کر رہتے ہیں۔ باز کی یہ تنہا ذات یا قسم ہے جو غول کی شکل میں رہتی و بستی ہے۔ یہ باز موسم سرما میں باہری ملکوں سے ہجرت کرکے مہاراشٹر میں آیا کرتے ہیں

باز کی مذکورہ بالا قسموں کے علاوہ دلدل باز

(Spotted Eagle)

سیاہ باز (Black- Eagle)

سدرشن یا شاہی باز (شہباز)

(Imperial - Eagle)

اور سٹنگ باز

(Booted - Eagle)

جو اونچا ہوتا ہے اور جس کے پیروں پر بال ہوتے ہیں اور جو غول کے ساتھ رہتا ہے) وغیرہ کے مختلف قسم کے باز مہاراشٹر میں پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے ہر قسم کے باز کی۔ اڑنے کی، شکار کرنے کی اور غذا حاصل کرنے کی اپنی جداگانہ خصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک سمجھدار مشاہدہ کرنے والا انسان باز کی اڑان دیکھ کر باز کو پہچان سکتا ہے۔

گذشتہ دو صدیوں میں جنگلی جانوروں کی نسلوں پر جو تباہ کن ضربیں لگائی گئی ہیں ان سے بیشتر جانوروں کی نسلوں کے سرے سے ہی ختم ہو جانے کے شدید اندیشے پیدا ہونے لگے ہیں اور مہاراشٹر بھی، اس سے محفوظ اور مستثنیٰ نہیں رہا ہے لیکن اس تعلق سے چوپایوں اور جنگلی جانوروں کو جس قدر نقصان پہنچا ہے اتنا پرندوں کو نہیں پہنچا۔ صدبی علاقوں میں جگہ جگہ جو بند تعمیر کیے گئے ہیں وہاں ندیوں اور چشموں کے کناروں پر رہنے بسنے والے پرندوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مہاراشٹر کے بنجر اور غیر آباد علاقوں میں سانپ آج بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اس لیے باز قسم کے پرندوں کو وہاں اپنی غذا آسانی سے میسر آجاتی ہے۔

لیکن فی زمانہ جنگلات گھٹتے جا رہے ہیں اور اسی لئے جنگلات پر جن چرند و پرند کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے ان کی تعداد بھی کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ جنگلات کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیاں بھی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہیں اور سارا قدرتی ماحول ہی تیزی کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے۔ قدرتی ماحول میں جب جب اس طرح کی تبدیلیوں کا دور آتا ہے تب بعض چرند پرند اسی بدلتے ہوئے ماحول سے فوراً مطابقت پیدا کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی گزارنے کا سامان فراہم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور جو ایسا نہیں کر پاتے ان کی نسلیں وقت سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں۔ پرندوں کا شکار کرنے والے باز اور شہباز ہی کی مثال لے لیجئے نا!

باز کی قسموں میں "ناراج" اور "دیادھ" دونوں پرندوں کے شکاری لیکن ناراج مقابلتاً زیادہ ڈھیٹ، انسان سے بھی نہ گھبرانے والا کھلے عام پرندوں کا شکار کرتا ہے جب کہ دیادھ پیڑوں پر چپ چاپ چھپے بیٹھتا ہے اور موقع پاتے ہی پرندہ پر جھپٹ کر اس کا شکار کر لیتا ہے۔

اس کے شکار کا دارومدار عموماً جھاڑیوں ہی پر ہوتا ہے یہ دونوں اپنی اپنی طور پر مخصوص پرندوں کا شکار پسند کرتے ہیں ناراج کی پسند میں سالنگی (ایک خاص قسم کا پرندہ) اور کبوتر خاص ہیں لیکن ضرورت پڑنے پر کوّے بھی گوارہ ہوتے ہیں لیکن دیادھ جنگلی مرغیاں۔ تیتر، بٹیر جیسے پرندوں ہی کو ہی پسند کرتا ہے۔ آج جب کہ انسانی بستیاں تیزی سے بڑھ پھیل رہی ہیں اور جنگلات تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ ان حالات سے ناراج کو آسانی سے سمجھوتہ ہو سکتا ہے لیکن دیادھ ایسا نہیں کر سکتا۔

دوسروں کے شکار کو چرا کر کھانے والا اور مردار خور سنہرے پروں والا باز

(Tawny - Eagle)

جو اپنی ان حرکتوں پر قطعی شرمندہ نہیں ہوتا حالات سے سمجھوتہ کرکے اپنی نسل کا بچاؤ کرکے اسے بڑھا بھی سکتا ہے لیکن سانپ کا شکار کرنے والا باز اور سیاہ باز مزاجاً ایسا نہیں کر سکیگا چونکہ اس قسم کے بازوں کی زندگی کا انحصار جنگلات کے وجود پر ہے اس لئے وہ بھی جنگلات کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔

جو جنگلات اور جھاڑیاں ابھی باقی ہیں انہیں صرف ٹکائے ہی نہیں رکھنا ہے بلکہ انھیں فروغ بھی دینا ہے اور شاید اسی طرح ہم شہباز جیسے پرندوں کے وجود اور ان کی نسلوں کا تحفظ کر سکیں گے اور آسمان کی بلندیوں اور خلاؤں کی وسعتوں کو شہباز کے لانبے لانبے بڑے بڑے پروں کے ساتھ بھری جانیوالی اڑانوں سے خوبصورتی ضرور میسر آتی رہے گی۔

✪

تلخیص و ترجمہ:
مرزا ساز قاسمی
۱۴۹ ارکیو۔ اے فیٹ والا کمپاؤنڈ
پائپ روڈ کرلا بمبئی ۴۰۰۰۷۰

پرکاش گوڑے
B-۱ ۔ ام اکھیان شری سوسائٹی
پاشان راستہ پونے ۸

چرند پرند کے اعداد و شمار

ہم جنگلاتی جانوران کے ضمن میں ہر سال ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ جنگلات اور جنگلاتی چرند اور پرند کے تحفظ کے سلسلے میں ہم نے کون کون سے کامیاب عملی اقدامات کئے اور اس میں اب تک کس درجہ ترقی کی ہے۔ محفوظ (مصنوعی) جنگلات میں شیروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اس کام میں ہم نے قابل ذکر ترقی کی ہے۔ شیروں کے اعداد و شمار کا وقفے وقفے سے حساب بھی رکھا جاتا ہے جس سے یہ اندازہ بھی بآسانی ہو جاتا ہے کہ ان کی تعداد میں کتنا اتار چڑھاؤ کتنی کمی بیشی ہوئی ہے۔ بعض محفوظ (مصنوعی) جنگلات میں شیروں کے علاوہ دیگر وحشی جانوروں کے رکھنے کے انتظامات بھی کئے گئے ہیں۔ ہم جن جنگلی جانوروں کو تحفظ دے رہے ہیں کیا وہ اطمینان بخش ہیں؟ اگر کسی جگہ بعض جانوروں کی تعداد میں کوئی کمی پیدا ہو رہی ہے تو اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ ایسے مسائل کے حل کرنے میں ان جانوروں کے اعداد و شمار کا کام نہایت مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اگر حقیقتاً ان جنگلاتی جانوروں کے تحفظ اور ان کی نسلی افزائش کی منصوبہ بندی پر سائنٹفک بنیادوں پر عمل کرنا مقصود ہو، وقتاً فوقتاً ان کے اعداد و شمار کی جانچ کرنا بھی لازمی ہے اور اسی جانچ کے تحت دلچسپ اور علم حیوانات کی رو سے کار آمد معلومات بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔

حیوانات کے اعداد و شمار کے اصول و قواعد ہمارے یہاں اب تک ابتدائی مراحل میں ہیں۔ پرندوں کے اعداد و شمار کے مسئلہ پر تو اب تک کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی گئی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں پونے کے پرندوں میں دلچسپی رکھنے والے کچھ صاحبان نے پرندوں کے اعداد و شمار کی قدرے کوشش کی تھی۔ کوّے، چڑیاں، مینا، طوطے، کبوتر، بگلے اور اسی طرح دیگر مہاجر آبی پرندوں کے اعداد و شمار کے کام میں پرندوں کے بیشتر محققین نے خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ باغات میں چونکہ پرندے منتشر حالت میں ہوتے ہیں اس لئے ان کے اعداد و شمار کا کام کچھ دشوار سا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے پرندوں کے بارے میں کار آمد معلومات بھی فراہم نہیں کی جا سکتی ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک میں اس تعلق سے ہماری کوششیں ابھی تازہ تازہ ہیں اس کے باوجود ہماری فراہم کردہ معلومات کافی دلچسپ ہیں۔

مضافات کے علاقوں کو چھوڑ کر

[illegible]

پونے شہر میں تقریباً ۳۲۰۰۰ (بتیس ہزار) پرندوں کی گنتی کی گئی ہے۔ اگر مختلف شہروں کے حدود اربعہ کے اعتبار سے پرندوں کا جو متناسب قائم کیا گیا وہ فی ایکڑ ۲/۶ رہا۔ ان تمام پرندوں میں ظاہر ہے کہ چڑیاں، مینا، طوطے اور کبوتر جیسے پرندے ہی بڑی تعداد میں پائے گئے۔ تعجب کی بات یہ بھی دیکھی گئی کہ کووں اور چڑیوں جیسے پرندوں جو عام طور پر انسانوں کے آس پاس اور قریب رہتے ہیں سے زیادہ تعداد میں مینا جیسے پرندے پائے گئے ہیں ان بتیس ہزار پرندوں میں کل ۱۳۰ قسم کے پرندے پائے گئے ہیں جن میں سے ۹۰ قسم کے بھارت کے مقامی پرندے ہیں اور بقیہ ۴۰ قسم کے پرندے ہنگامی طور پر ہجرت کر کے ہمارے ملک میں آتے ہیں

الغرض پونے شہر میں دیگر شہروں کے مقابلے میں زیادہ پرندے ہیں یا کم یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح پرندوں کے اعداد وشمار کا کام بھارت کے دیگر شہروں میں سرے سے ہوا ہی نہیں ہے البتہ لندن شہر میں یہ تجربہ کیا گیا ہے اگر مضافاتی علاقوں کو خارج کر دیا جائے تو صرف لندن شہر میں پرندوں کا تناسب فی ایکڑ ۱۷٫۵ پایا گیا۔ گویا پونے کے مقابلہ میں لندن شہر میں پرندوں کی زیادہ تعداد ہے اس تعلق سے جو بہت بڑی کمی محسوس کی گئی وہ یہ کہ پونہ شہر میں پرندوں کے اعداد وشمار کے موقعہ پر باغات میں پائے جانے پرندوں کا شمار مکمل طور پر نہیں کیا گیا

اگر پرندوں کے اعداد وشمار کی اس تحریک پر ہر سال باقاعدگی سے عمل کیا گیا تو اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا کہ کس ذات کے پرندوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اس طرح ان کے تحفظ کی مناسب تدبیریں بھی کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ڈھوک یا ماڑ ڈھوگ نامی پرندہ اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ یہ پرندہ گدھ کی قسم کا ہوتا ہے اور سبزہ زاروں میں پایا جاتا ہے شکار کے شوقین اس کا شکار بھی کرتے ہیں اس کی کمیابی کی بنا پر حکومت نے اس کے شکار پر قانوناً پابندی عائد کر دی ہے لیکن اگر اس بات کی تحقیق کی جائے کہ یہ پرندہ پورے ملک میں کتنی تعداد میں ہے اور مختلف ریاستوں میں اس کی تعداد کتنی ہے تو اس کی تعداد کی کمی وبیشی کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکے گا اور اس کے عین مطابق ان کے تحفظ کی مختلف تدابیر بھی عمل میں لائی جا سکے گی۔

مہاجر پرندوں کے اعداد وشمار کی یہ مہم کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ یہ پرندے کئی ملکوں کی سرحدوں کو پار کر کے آتے ہیں اور کئی ملکوں کی سرحد[illegible] کو پار کرتے ہوئے بھٹکتے رہتے ہیں اور[illegible] میں ہزاروں میل کا طویل سفر طے کرتے ہو[illegible] انھیں انسانوں اور قدرت کے ہاتھوں کئ[illegible] دشواریاں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا[illegible] ان حالات میں اگر ان پرندوں کے تحفظ کی بات کی جائے تو ان تمام ملکوں کو ان کے تحفظ کی ذمہ داری لینی چاہیے جن جن[illegible] ملکوں کی حدود میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اس سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوتا [illegible] کہ اگر کہیں کسی خاص قسم کے پرندوں کی [illegible] تعداد گھٹ رہی ہو تو وہ مخصوص ممالک [illegible] کے تحفظ کی تدابیر میں ترمیم واصلاح کی گنجائشیں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بطخیں، ندیوں، جھیلو[illegible] اور سمندروں کے کنارے پائے جانے [illegible] سمی گردڈ (شہباز) اور سانپ جیسے شکاری پرندے مہاجر پرندوں کے زمر[illegible] میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یورپ او[illegible] امریکہ میں ایسے پرندوں کے اعداد وشما[illegible]

کا کام ہر سال کیا جاتا ہے اور اسی لئے وہاں اس قسم کے سالہا سال کا ریکارڈ بھی محفوظ رہتا ہے۔ ایشیا میں اس قسم کے اعداد و شمار کا کام ۱۹۸۶ء کے موسم سرما میں پہلی بار کیا گیا لیکن چونکہ یہ تجربہ نیا تھا اس لئے وسیع پیمانے پر یہ کام نہیں ہو سکا۔ آجکل بھارت میں مختلف ریاستوں میں کئے گئے اعداد و شمار کے کام کا ایک مجموعہ ریکارڈ تیار کرنے کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ پونے کے مضافات میں بھی اسی منصوبے کے ایک حصے کی شکل میں اعداد و شمار کا کام لیا گیا ہے جس کے ذریعہ کافی کار آمد اور مفید معلومات حاصل کی گئی ہیں۔

پونے شہر اور مضافاتی علاقوں میں پائی جانے والی ندیوں اور جھیلوں میں ۵۰۰ بطخیں پائی گئی ہیں جن میں سے ۱۲ اہم مقامی اور بقیہ تمام قسم مہاجر کی ہیں۔ ان کے علاوہ کناروں پر مہاجر قسم کے ۴۰ مختلف قسم کے پرندے بھی پائے گئے ہیں کوٹ نامی پرندہ جو دور سے دیکھنے پر آبی مرغ جیسا دکھائی دیتا ہے لیکن جس کی چونچ کے اوپری حصہ پر گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا سا ہوتا ہے تقریباً دو ہزار کی تعداد میں پایا گیا۔ یہ اعداد و شمار ماہ جنوری کے ہیں۔

مختلف پرندوں کی مذکورہ تعداد میں موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر جس وقت پرندوں کے ہجرت کا دور شروع ہوتا ہے ستمبر اور اکتوبر کے مہینے میں کچھ پرندے بعض چشموں پر بڑی کثیر تعداد میں دکھائی دیتے ہیں اور جب ہجرت کا دور ختم ہونے کو ہوتا ہے اس وقت بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے لیکن جنوری کا مہینہ اس اعتبار سے نہایت شاندار مانا جاتا ہے اس مہینے میں بعض چشموں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جیسے جم کر دکھائی دیتے ہیں۔

اب ۱۹۸۷ء کے موسم سرما میں بھی پرندوں کے اعداد و شمار کی مہم چلائی ہے جب لگاتار کئی برسوں کے اعداد و شمار کا مکمل تخمینہ ہمارے پاس موجود ہوگا تبھی ہم پرندوں کے اعداد و شمار میں واقع ہونے والی کمی بیشی کا واضح اندازہ لگا سکیں گے۔ ★

تلخیص و ترجمہ:۔ نجمہ بیگم

ضیاؔ زخمی کھام گانوی

مراد، حزل سمجھ
کھام گاؤں، مہاراشٹر

خواب پلکوں کی منڈیروں پہ کوئی ٹوٹا بھی تھا
میں کہ تنہائی سے گھبرا کر کبھی رو دیا بھی تھا

میں ہی کوئی فیصلہ کر نہ سکا اپنے تئیں
ورنہ اس نے خط میں دل کا مدعا لکھا بھی تھا

اس کی چوکھٹ پہ یادیں چیختی ہی رہ گئیں
جاگ نہ پایا مقدر اس قدر سویا بھی تھا

میری خاموشی پذیرائی تھی اس کے عزم کی
ورنہ میرا تجربہ اس شخص سے زیادہ بھی تھا

پیار کی شمعیں جلیں آنکھوں میں کتنی دیر تک
وقتِ رخصت اس نے مڑ مڑ کے مجھے دیکھا بھی تھا

آج تک نہ مٹ سکے ہونٹوں سے چھالوں کے نشاں
بے خودی میں آتشی رخسار کو چوما بھی تھا

بڑھ گئی رسوائیوں سے اور بھی شہرت مری
اے ضیاؔ زخمی خدا کچھ مہرباں ایسا بھی تھا

• عبدالحق پٹھان
۲۹۴/۴۴ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳

شہد کی مکھی

تخلیق و تنظیم کے آئینے میں

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

اس شعر میں جو منطقی معمہ پیش کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ محیر العقول رموز و اسرار مگس کی زندگی کے مختلف مراحل میں دیکھنے کو ملتے ہیں جسکا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کیڑوں مکوڑوں میں صرف شہد کی مکھی ایسی ذی روح ہے جس پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور مشاہدہ کرنے والوں نے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ یونانی عالم ارسٹومیکس نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال مشاہدے میں صرف کئے۔ فلکس نے شہد کی مکھیوں کے مطالعہ کے لئے گھر بار خیر باد کرکے جنگل کی راہ لی۔ ان مشاہدات نے عقل و خرد کے پیکروں کو حیرت زدہ کردیا۔ انکی تحقیق نے شہد کی مکھی کی مجاہدانہ مگر باضابطہ زندگی کو انسان کے لئے قابل رشک بتایا ہے

شہد کی مکھی کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور یہ دنیا کے ان تمام خطوں میں پائی جاتی ہے جہاں موسم بہار ہوتا ہے اور پھولوں کی بہتات ہوتی ہے۔

شہد کی مکھی کا جسم

شہد کی مکھی کے جسم کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سر، سینہ اور پیٹ

سر میں آنکھ، سونڈ اور منہ شامل ہے بظاہر دو آنکھیں ہوتی ہیں لیکن دراصل یہ بہت سی خوردبینی آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جن کی مدد سے مکھی دور کی چیزیں بہت آسانی سے دیکھ سکتی ہے۔ قریب کی چیزیں دیکھنے کے لئے تین اور آنکھیں ہوتی ہیں سر کے بیچوں بیچ دو آنکھیں ہوتی ہیں جو چھتے بنانے اور پرواز کرنے میں مدد کرتی ہیں

زبان بہت لمبی اور لچکدار ہوتی ہے۔ نچلا ہونٹ لمبا ہوتا ہے جو موم کو نرم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ٹانگوں کے پانچ حصے ہوتے ہیں اور تمام حصوں پر بال ہوتے ہیں جو زیرۂ گل جمع کرنے میں مدد کرتے ہیں

چار بازو ہوتے ہیں دو آگے اور دو پیچھے۔ ان پر موسم کے سرد و گرم اور نمی کا

اثر نہیں ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی کے جسم کا آخری حصہ معدہ ہوتا ہے جس میں سانس لینے، غذا ہضم کرنے، موم بنانے، انڈے دینے اور زخم لگانے والے اعضا ہوتے ہیں۔ ڈنک پیٹ کے آخری حصے میں ہوتا ہے جو آنتوں سے جڑا ہوتا ہے اس کے اوپر ایک گلٹی میں زہر جمع رہتا ہے شہد کی مکھی کے زہر کو زائل کرنے کے لیے پہلے کسی سخت چیز سے ڈنک کو نکالنا چاہیے پھر زخم پر سوڈا، امونیا، یا پوٹاشیم پرمیگنیٹ مل دینا چاہیے۔ نمک ملی مٹی یا گیلے چونے کا لیپ کر دینے سے بھی تسکین ہو جاتی ہے۔

شہد کی مکھی کی خوراک

شہد کی مکھی کی سب سے بڑی خوراک پھولوں کا رس اور زیرہ گل ہے اس کے علاوہ پکے ہوئے پھل، شکر، شربت، مٹھائیاں اور میٹھی چیزیں بھی کھاتی ہیں۔ ان اشیاء سے شہد کے اجزا جمع کرتی ہیں۔ شہد کی مکھی جب پھول کا رس چوسنا چاہتی ہے تو اس کی سونڈ باہر نکل آتی ہے اور پھول میں گھس جاتی ہے اور رس نکل کر پیٹ کے اندر ایک تھیلی میں پہونچ جاتا ہے اس کے بعد یہ معدے کے پچھلے حصے میں پہونچا دیا جاتا ہے جسے گودام کہتے ہیں۔ گودام میں شہد ذرا بھی خراب نہیں ہوتا اور ضرورت کے وقت نکالا جا سکتا ہے۔ شہد کی مکھی تقریباً ساٹھ ہزار پھولوں کا رس چوستی ہے تو کہیں پاؤ کلو شہد جمع ہوتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تمام شہد ایک ہی قسم کے پھولوں سے اکٹھا کرتی ہے۔ یہ نہیں کہ تھوڑا گلاب کے پھول کا، تھوڑا چنبیلی یا کسی دوسرے پھول کا

شہد کی مکھی کا چھتہ:-

ہر جاندار اپنے بسیرے کے لئے مکان ضرور رکھتا ہے۔ بیا کا گھونسلہ اپنی ساخت اور کاریگری کے لئے مشہور ہے لیکن شہد کی مکھی کا چھتہ نہ صرف کاریگری کا بہترین نمونہ ہوتا ہے بلکہ نقشہ سازی اور فن تعمیر میں بھی لاجواب ہوتا ہے شہد کی مکھی درختوں سے گیلا لاکھ اور اپنے جسم کی رطوبت سے موم حاصل کرتی ہے اور ان دونوں چیزوں کی مدد سے مزدور مکھیاں کسی ایسی جگہ جہاں دشمن کی رسائی دشوار ہو، چھتہ سازی کا کام شروع کرتی ہے۔ چھتہ سازی کے دوران امداد باہمی کے اصول پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔ ایک گروہ چھتے کی تعمیر میں لگتا ہے تو دوسرا گروہ خام مال مہیا کرتا ہے تیسرا گروہ درختوں سے لاکھ لا کر معمار مکھیوں کے سامنے پیش کرتا ہے معمار مکھیاں اس کی گولیاں بنا بنا کر رکھ لیتی ہیں اور انھیں کاٹ کاٹ کر چھتے میں لگاتی جاتی ہیں۔ چھتے کی قطاریں بھی الگ الگ گروہ بناتے ہیں اور ہر گروہ اپنا کام مکمل کر کے الگ ہٹ جاتا ہے چھتے کا اندرونی حصہ طلسم ہوش ربا کا منظر پیش کرتا ہے۔ چھتے کے اندرونی کمرے موم کے بنائے جاتے ہیں اس لیے ان کی تعمیر میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ پہلے کافی مقدار میں موم اپنے جسموں سے نکال کر جمع کر لیا جاتا ہے۔ پھر ایک ساتھ تعمیر کا کام شروع ہوتا ہے۔

اس بات کا پتہ آج تک نہ چل سکا کہ شہد کی مکھیوں کو ہندسہ کا علم کس طرح حاصل ہوا! سارے کمرے شش پہلو ہوتے ہیں۔ دیواریں ترچھی ہوتی ہیں نہ کوئی بڑی نہ کوئی چھوٹی نہ آڑی۔ نہ ترچھی۔ سب ایک ہی زاویہ بناتی ہیں چھتے میں چھوٹے کمرے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں مزدور یا خادمہ مکھیاں

شہد کی مکھی کا چھتہ

رہتی ہیں۔ درمیانی سائز کے کمروں میں نر مکھیاں رہتی ہیں جنھیں "نکھٹو" بھی کہتے ہیں رانی مکھی اور اس کے بچوں کے کمرے اور زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ بعض ہال بھی ہوتے ہیں جن میں شہد جمع کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً چاروں طرف سے بند کر دیئے جاتے ہیں جب چھتہ تیار ہو جاتا ہے تو رانی مکھی انڈے دینے کا کام شروع کر دیتی ہے ایک چھتے میں عموماً ایک ہی رانی ہوتی ہے

اور وہ ایک دن میں سات آٹھ سو انڈے دیتی ہیں۔ کبھی کبھار ایک دن میں تین چار ہزار انڈے بھی دیدیتی ہے بعض اوقات مزدور مکھیاں بھی انڈے دیتے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ ان انڈوں سے صرف نکھٹو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ماہرین اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ مزدور مکھیوں کے کمرے رانی مکھی کے برابر ہوتے ہیں اس لئے رانی مکھی کے لئے کھانے کی جو خاص چیزیں آتی ہیں انھیں کر

غلطی سے کھا لینے کی وجہ سے مزدور مکھیوں میں انڈے دینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے

شہد کی مکھی کا کنبہ:-

رانی مکھی جب بڑی تعداد میں انڈے دے چکتی ہے تو انھیں اٹھا اٹھا کر جدا کمروں میں رکھ دیتی ہے۔ یہ معمہ آج تک حل نہ ہو سکا کہ رانی مکھی کے پاس ایسی کون سی طاقت ہے جس کی مدد سے وہ جس قسم کے بچے چاہتی ہے پیدا کر سکتی ہے۔ رانی مکھی جو انڈے مزدور مکھیوں کے کمرے میں رکھتی ہے ان سے مزدور مکھیاں پیدا ہوتی ہیں۔ نکھٹوؤں کے کمرے میں نکھٹو اور رانی کے کمرے میں رانی مکھیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی رانی مکھی اپنے اور نکھٹوؤں کے کمرے میں انڈے نہیں رکھتی جس کی وجہ سے نکھٹو اور رانی مکھیاں پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ کم سرد ممالک میں شہد کی مکھیاں گیارہ ماہ تک انڈے دیتی رہتی ہیں۔
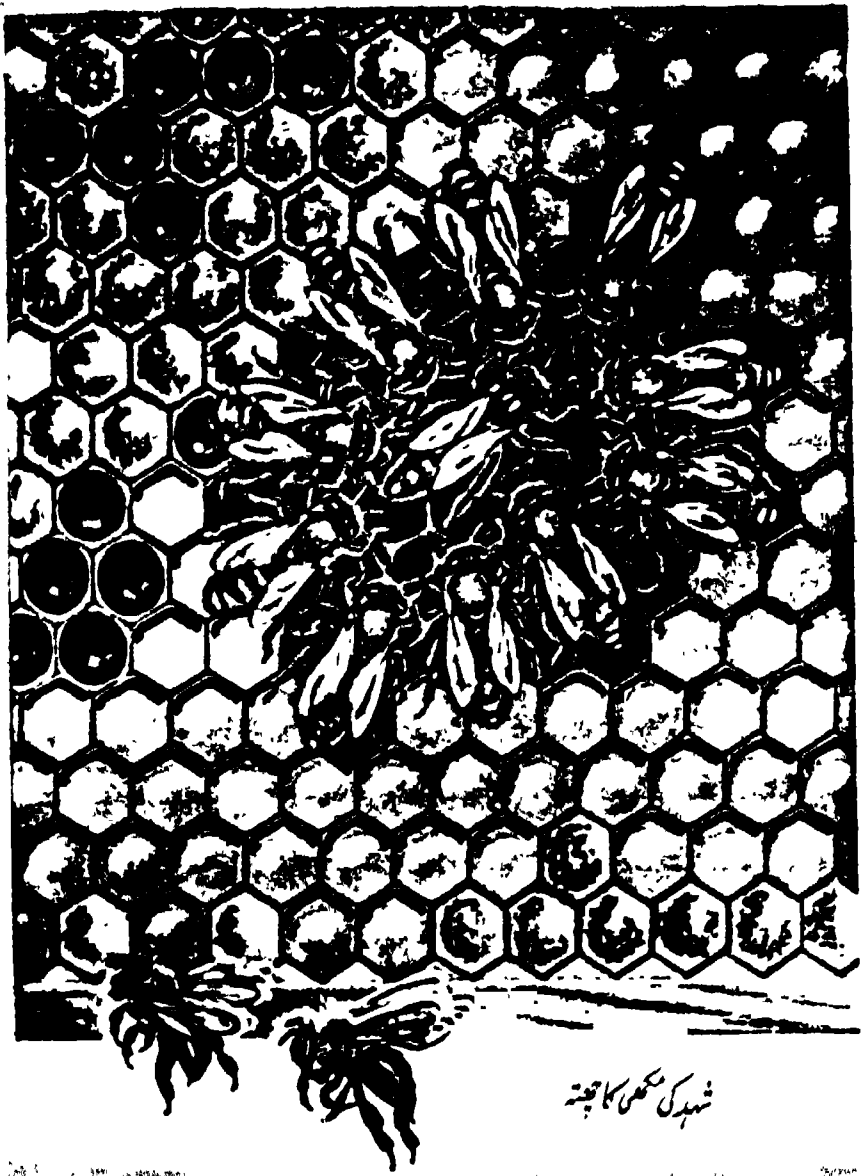
انڈے دینے کے دو تین روز بعد وہ ترخ جاتے ہیں اور کرم باہر نکل آتے ہیں۔ خادمائیں انھیں شہد اور موم کھلاتی ہیں۔ پانچ چھ روز میں ان خانوں کے منہ باہر سے بند کر دیئے جاتے ہیں اور کرم اندر ہی اندر ریشمیں کویا بناتے ہیں اور دس دن کے بعد مکھی بن کر باہر نکل آتے ہیں اور مکھیوں کے ساتھ کام میں لگ جاتے ہیں لیکن نوجوان رانیوں کو اس قسم کی آزادی نصیب نہیں ہوتی ہے اور ان کے کمروں کے دروازے موم سے اچھی طرح بند کر دیئے جاتے ہیں صرف ایک سوراخ کھانا دینے کیلئے کھلا چھوڑ دیا

جاتا ہے۔ جوان رانیوں کو قید میں رکھنے
کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی بوڑھی ماں
ان سے بہت حسد اور عداوت رکھتی ہے
اور ہر وقت انھیں مار ڈالنے کی فکر میں
رہتی ہے۔

جب بوڑھی رانی اپنے خدمت گار
کے ساتھ چھتہ چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔
اور دوسرا چھتہ بناتی ہے تو ان قید
رانیوں میں سے ایک رانی کو رہا کر دیا
جاتا ہے اور وہ انڈے دینا شروع
کر دیتی ہے اگر کبھی سردی کی شدت
یا کسی اور وجہ سے بوڑھی رانی نیا چھتہ
نہیں بنانا چاہتی تو تمام نوزائیدہ رانیوں
کا قتل عام ہو جاتا ہے اور کام والیاں
ان کی حفاظت نہیں کرتیں۔ کتنا منظم
اور دلچسپ ہے ان کا نظام زندگی!
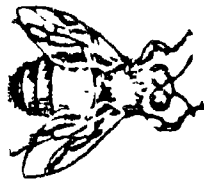
شہد کا چھتہ ایک بستی:۔

شہد کی مکھی کا چھتہ ایک پوری
بستی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مختلف
طبقات کے افراد رہتے ہیں۔ نر یا نکھٹو
مکھیاں۔ رانی مکھیاں۔ مزدور یا نوکر مکھیاں
نوزائیدہ مکھیوں کے لاروے۔ پیوپے
اور بار آور انڈے۔

نر یا نکھٹو مکھیاں دوسری مکھیوں
سے موٹی لیکن چھوٹی ہوتی ہیں۔ سونڈ نہ ہونے سے
شہد حاصل کرنے کے لائق نہیں ہوتیں۔
نہ ڈنک ہوتا جس کے سبب اپنی حفاظت
نہیں کر سکتیں۔ کوئی کام نہیں کرتیں
کھانے پینے کے لئے بھی دوسروں کی
محتاج ہوتی ہیں اس لئے انھیں نکھٹو کہتے
ہیں نسل پیدا کرنے کے لئے ان کی
ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بہت دنوں تک

QUEEN

رانی مکھی

نوکر (خادم) مکھی

DRONE

نکھٹو مکھی

زندہ نہیں رہتیں۔ ادھر رانی مکھی نے
انڈے دینا شروع کئے اور ادھر نکھٹوؤں
کا خاتمہ ہوا۔ ایک بستی میں نکھٹوؤں کی تعداد
پانچ سو سے دو ہزار تک ہوتی ہے۔
شہد کے چھتے میں ایک پتلی لمبی
چمکیلی چھوٹے سے رنگ پروں والی مکھی
سب کے لئے محترم و منظم ہوتی ہے اسے
رانی کہتے ہیں وہ پورے چھتے میں منفرد
ہوتی ہے۔ انڈے دینا اس کا کام ہے اس
لئے اس کے ساتھی اس سے محبت کرتے ہیں
خود بھوکے رہتے ہیں مگر اسے پیٹ بھر کر
خوب اچھی طرح کھلاتے ہیں لیکن یہ صرف نام
کی رانی ہوتی ہے چھتے میں حکومت کام کرنے
والیوں کی ہی ہوتی ہے کسی نے سچ کہا ہے
جو کمائے وہی لالوں کا لال کہلائے۔ شہد
کی مکھیوں کی دنیا میں اسی ضرب المثل پر عمل
ہوتا ہے۔

ہر چھتے میں مزدور یا نوکر مکھیاں بیس
ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہیں۔ یہ خادمائیں
دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو خوراک کی
تلاش میں باہر جاتی ہیں کھیتوں اور باغوں
میں جا کر شہد جمع کرتی ہیں دوسری وہ جو
دایہ کا کام کرتی ہیں۔ گھر میں موم تیار کرتی
ہیں۔ رانی کی خدمت کرتی ہیں۔ چھتہ بناتی
ہیں اس کی نگرانی کرتی ہیں۔ ضرورت پڑنے
پر دوسری مکھیوں سے لڑتی بھی ہیں غرض
محنت و مشقت کے جتنے کام ہو سکتے ہیں
سب یہی نوکر مکھیاں انجام دیتی ہیں۔

شہد کی مکھی کے دشمن:۔

شہد کی مکھی کے بے شمار دشمن بھی
ہیں جن میں جنگلی پرندے، بالخصوص جانور جیسے
مچھر، پتنگے، پروانے، بھڑ، زنبور، چیونٹیاں
مکڑیاں، مینڈک، ریچھ، موم خورا
(HONEY EATER)
اور سب سے بڑھ کر انسان یہ سب ہمیشہ تاک
میں رہتے ہیں اور ان کی محنت و مشقت سے
خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

شہد کی مکھی کے فوائد:۔

شہد اور موم انسان کے لئے نہایت
کارآمد ہے۔ شہد غذا کے طور پر استعمال ہوتا
ہے دوا میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے
خالص اور عمدہ شہد نہایت طاقت بخش اور
مصفی خون ہوتا ہے موم روغن بنانے

روغن کرنے، موم بتیاں اور دیا سلائی بنانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ برہم اور دانت بنانے کے کام میں بھی آتا ہے۔ شہد کی مکھی ایک پھول سے دوسرے پھول پر بیٹھتی ہے تو بیجوں کو بھی ساتھ لے جاتی ہے جس سے پھل لگتے ہیں اس طرح وہ کسانوں کی مدد کرتی ہے۔ آج کل شہد کی مکھیاں مرغیوں اور ریشم کے کیڑوں کی طرح پالی بھی جاتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں ایک باقاعدہ منفعت بخش تجارت میں بے لوث شریک ہو کر انسان کی خود غرضی کا مذاق اڑاتی ہیں۔

شہد کی مکھی کی خوبیاں انسانوں میں نہیں ہیں

شہد کی مکھیاں کئی باتوں میں انسانوں سے بہتر ہیں یہ مل جل کر رہتی ہیں اور ایک ساتھ کام کرتی ہیں اپنے دشمن پر سب مل جل کر حملہ کرتی ہیں بڑی دور اندیش اور حد درجہ محنتی جفاکش اور کفایت شعار ہوتی ہیں۔ بچت کی عادت انھیں برے دنوں میں آسودگی عطا کرتی ہے ان کے ہر کام میں سلسلہ اور باقاعدگی پائی جاتی ہے اپنے نفع پر دوسروں کے نفع کو ترجیح دیتی ہیں۔ اپنی جماعت کی بھلائی اور نفع کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دیتی ہیں انسان شہد کی مکھیوں کی ان خوبیوں کو اپنا لے تو ملک اور قوم کی کتنی خدمت کر سکتا ہے۔

غزل

سونا ملیح آبادی

ہم تمہارے کوچے کی رسم یوں نبا میں
پھول پھول آئے تھے زخم زخم جائیں

تم حسین پھولوں کو شاخ شاخ سے چن لو
زرد زرد پتوں کو ہم سمیٹ لائیں

دھوپ کے مسافر ہیں دھوپ دھوپ ہے
شجر شجر عریاں سر کہاں چھپائیں

کچھ پتہ نہیں چلتا کتنی رات باقی ہے
کب تلک چراغوں میں ہم ہو جلائیں

ہر صدا کی ہوتی ہے بازگشت اے دل
جو فریب دیتے ہیں وہ فریب کھائیں

طالبانِ الفت کو رہروانِ منزل کو
سونا میرے نقشِ پا آئینہ دکھائیں گے

تجدیدِ خریداری کیلئے گذارش

اس شمارے سے اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے یا ختم ہو چکی ہے تو آج ہی آئندہ مدت کے لئے رقم خریداری بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیجئے تاکہ رسالہ آپ کی خدمت میں مسلسل جاری رہے۔

بصورت دیگر مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے بعد رسالہ کی ترسیل ممکن نہ ہو سکے گی۔ خریدار حضرات بطور خاص نوٹ فرما لیں۔ تجدید خریداری کی رقم روانہ فرماتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (جو آپ کے پتے کی سلپ کے اوپر درج ہوتا ہے) ضرور درج فرمائیں اور اپنا نام، پتہ، پن کوڈ نمبر بھی صاف صاف تحریر فرمائیں۔

(ادارہ)

• ایس۔ اے۔ حیات
سیکریٹری اسٹڈی سرکل
مقام: آبگلہ۔ پوسٹ نیادگنج ضلع گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۳

ریگستان کا پھول

ریگستان کا نام ذہن میں آتے ہی انسانی رجحان اس خطۂ ارض کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جہاں کی زمین ریتیلی اور خشک ہوتی ہے۔ تیز اور گرم ہوائیں بہتی ہیں۔ قرب وجوار کے علاقوں میں پانی کا نام و نشان دور دور تک نظر نہیں آتا ہے۔ ایسی سرزمین میں کسی بڑے پودے کا قیاس بعید از عقل ہے۔ ایسے علاقوں میں نباتات کے چھوٹے چھوٹے کنٹیلی جھاڑیاں ہی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ جس کی نشوونما کے لئے کم پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ریگستان کی فضاؤں کو پُر لطف اور پُرکشش بنانے والا پودا ہے۔ کیکٹس (CACTUS) ریگستان کی زینت ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے باغوں اور گھروں میں لگانا پسند کیا جاتا ہے۔

کیکٹس (Cactus) کا پودا
ڑا ہوتا ہے۔ اس میں پتیاں نہیں ہوتی
ں۔ اس کی شکل مثل گیند ہے۔ اس
جسم اس ساخت کا ہوتا ہے کہ یہ پڑوس
کے دوسرے پودوں پر چڑھ جاتا ہے۔
ن کی زیادہ تر نسلیں زیادہ سے زیادہ
و یا تین میٹر تک اونچی ہوتی ہیں۔ اس

کا جسم گدے دار ہوتا ہے۔ جس میں سیال بھرا رہتا ہے۔ برسات کے دوران کیکٹس اس قدر پانی اپنے جسم میں بھر لیتا ہے کہ اس سے سال بھر کی ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعض پودوں کی بالائی سطحوں پر موم کی پرت یا چھوٹے چھوٹے گھنے ریشے ہوتے ہیں جو خشک موسم میں عمل تبخیر

کی رفتار کو سست کر دیتے ہیں۔ جس کے سبب جسم سے بہت کم پانی کا اخراج ہوتا ہے اور پانی جسم میں مناسب مقدار میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اعمالِ حیات بحسن و خوبی انجام پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

کیکٹس "نئی دنیا" کا پودا ہے۔ یہ عام طور پر امریکہ، میکسیکو، اور بھارت کے ریگستانی علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

ابتدا میں لوگ اسے محض سجاوٹی پودا (Ornamental Plant) سمجھتے تھے لیکن علم حیات کے ماہرین نے اس پر ریسرچ کیا اور اپنی تحقیقات کی روشنی میں بیش بہا نتائج اخذ کئے۔ یہ اقتصادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی متعدد اقسام چارے کی شکل میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ابتدائی دور میں Scurvy جیسے مرض سے محفوظ رہنے کے لئے اس کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ کاغذ کی صنعت میں، پلپ Pulp بنانے میں استعمال میں لیا جاتا ہے۔ اس کی مخصوص قسمیں کالی کھانسی کے دفع کے لئے کافی کارآمد ثابت ہوئی ہیں ان کے پھلوں کا شربت (Pancreas) سے رسوں کا اخراج بڑھاتا ہے۔ یہ زخموں کو جلد تیار کرنے کیلئے بھی مستعمل ہے۔ اس کی ایک مخصوص قسم ہے Opuntia dector جس میں تقریباً ۸ سے ۱۰ فیصد تخمیر کے لائق چینی موجود ہوتی ہے جو صنعتی شراب بنانے میں موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

کیکٹس کارآمد پودا ہے۔ یہ محض باغوں کی زینت نہیں بلکہ نفع بخش عطیہ قدرت ہے اس سے فائدہ اٹھایئے۔ پودوں کو اگایئے اور زندگی کو خوشحال بنایئے۔

دنیا عجائبات سے پُر ہے۔ پرندوں، تتلیوں اور ٹڈیوں سے لے کر
ننھے اور اَن دیکھے بے شمار پرندے، ایک سے ایک نرالے، قدرت کی کاریگری کی
زندہ مثالیں ہیں پھر ان کی خوبو، طرز و رنگ، طریقۂ بود و باش، ساخت و بناوٹ
بھی کتنی جداگانہ ہیں۔ کسی کی خوراک پودے اور پتیاں ہیں تو کسی کی کیڑے مکوڑے
اور کھیاں۔ کسی کی آواز دلوں کو لُبھاتی ہے تو کسی کی صدا شیروں تک کو ڈراتی ہے اس
آخر میں بیان کئے گئے نوع میں سے وہ پرندہ ہے جسے عقاب کہتے ہیں۔

• عبدالقیوم
(بمبئی)

عقاب

اس شکاری پرندے کی شہرت دنیا بھر میں ہے اس پرند کی تصویر پرانے وقتوں میں رومنا (اٹلی) فرانس وغیرہ کے جنگی علموں پر ہوتی تھی، قوت پرواز اور تیز نظری میں مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ شیر بھی اس کی آواز سنتا ہے تو دبک کر بیٹھ جاتا ہے اس کی جھپٹ اتنی تند و تیز ہوتی ہے کہ اڑتے ہوئے پرندوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور آسانی سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا پاؤں بہت طاقتور، پنجے نوکدار کھردرے ہوئے اور تیز ہوتے ہیں۔ خود اس کا وزن ۴، ۵ کلو گرام تک اور لمبائی تقریباً ۹۰ سنٹی میٹر تک اور دونوں پروں کا پھیلاؤ ۲۵۰ سینٹی میٹر کے قریب ہوتا ہے۔ مادہ عقاب بعض اوقات نر عقاب سے قدرے بڑی ہوتی ہے۔
دنیا کا سب سے مضبوط شکاری

مراٹھی افسانہ

پرامتھیوس

از

جی۔ اے۔ کلکرنی

ترجمہ

سلام بن رزاق

اس وسیع، بے آب وگیاہ، سیاہ پہاڑی کی بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر پرامتھیوس نے نشیب میں اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی دنیا پر نگاہ کی اور لمحے بھر کو وہ اپنا شدید اضطراب بھول گیا جو مسلسل اس کے وجود میں سلگتا رہتا تھا۔ اسے لگا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا فطرت کا یہ لازوال حسن ایک عظیم جسم ہے جس میں خود اس کا وجود کسی مضطرب دل کی مانند دھڑک رہا ہے۔ آسمان پر چاروں طرف بھورے رنگ کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جن میں وقفہ وقفہ سے کوئی بجلی کوند جاتی۔ اس نے سوچا وہ کسی بڑے راکشش کے دماغ سے گزر رہا ہے، اور جب اس دماغ میں معاً کوئی انوکھا خیال آتا ہے تو بجلی کوند جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خود اس کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا۔ آخر اس ویران پہاڑ پر وہ کیا کر رہا ہے؟ اس کے دل میں چلچلاتی دھوپ کی مانند یہ بے اطمینانی کیوں پھیلی ہوئی ہے؟ اس کے سبھی ساتھی کوہ آلمپس کی خنک، جاں بخش فضا میں زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ خدائے لایزال کی حمد گا رہے ہیں۔ مگر وہ...... وہ اس قدر مضطرب کیوں ہے؟ حالانکہ اسے موت کا بھی کوئی غم نہیں کہ وہ امر ہے۔ عزیز و اقارب، دوست احباب سے دور ....

وہ اس ویران پہاڑ پر کس جرم کی پاداش میں بھٹک رہا ہے۔؟ اس خشک پہاڑ سے اسے کیوں اتنی قربت محسوس ہوتی ہے۔؟ کسی ازلی ان دیکھی کشش سے بندھا وہ اس وسیع و عریض فلک بوس پہاڑی کی طرف کیوں کھنچا چلا آتا ہے؟ ایسے کتنے ہی سوال یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ معاً نیچے ایک ایسے منظر پر اس کی نگاہ پڑی کہ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نیچے وادی میں درجنوں مُردار خور گِدھوں کا غول غالباً کسی لاش پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ پرامتھیوس پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس نے دیکھا وہ ایک مُردہ جانور کے جسم میں اپنی تیز نکیلی چونچیں کھبو رہے تھے، مگر جلد ہی ایک دوسرے حیرت ناک منظر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

لمبے سیاہ پَروں والے گدھ اپنے پَر پھڑپھڑاتے مُردہ ڈھور کے جسم سے بوٹیاں نوچ رہے تھے، اور ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک تنہا گدھ ان سب سے بے نیاز ایک طرف خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اس نے ایک طویل عرصے سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ آنکھوں کے سوا اس کا پورا جسم بے جان تھا۔ گویا اس کی جان سمٹ کر اس کی آنکھوں میں دو نقطوں کی شکل میں متحرک ہو گئی تھی۔ پرامتھیوس نے اپنے دل میں اس تنہا گدھ کے لئے ایک عجیب و غریب کشش محسوس کی۔ اس نے سوچا یہ گدھ بھی اسی کی طرح اپنے جھنڈ سے کس قدر تنہا اور الگ ہے۔ وہ اس کے قریب آیا اور بولا:

"سن! یہ دوسرے گدھ اس طرح چونچیں بھر بھر کر اپنی بھوک مٹا رہے ہیں مگر تو ان سب سے الگ تھلگ بھوکا پیاسا بیٹھا ہے۔ مسلسل فاقوں نے تیرے جسم کو کس قدر لاغر کر دیا ہے۔ اس کے باوجود تو اس طرف غلطی سے بھی نگاہ نہیں کرتا۔ آخر کیوں؟" اس تنہا گدھ نے گردن گھما کر،

امتھیوس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں
رہی تھیں۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولا
"کیوں کہ میں مجذوب ہوں، اور اپنی مجذوبیت پر زندہ
ں۔ میری بھوک ان مردار خوروں سے مختلف ہے۔
ری اشتہا مردہ گوشت کے تھلوں سے نہیں مٹ سکتی"!
"اس کا مطلب ہے تجھے اس وادی میں بسنے والے زندہ
سانوں کا گوشت درکار ہے" پرامتھیوس نے کانپ کر کہا۔
"ہشت —" گدھ نے حقارت سے کہا: "ان غریب
انسانوں کا جسم تو اور بھی بے وقعت ہے۔ اگر ہم چار
دھ مل کر ایک آدمی پر ٹوٹ پڑیں تو اس بے چارے کو
جان کے لالے پڑ جائیں۔ وہ تو آگ تک پیدا نہیں کر سکتا
س لئے اندھیرا ہوتے ہی خوف و دہشت سے کانپنے لگتا
ہے۔ دہکتی آنکھوں والے وحشی جانور اس کی نظروں کے سامنے
س کے بچوں کو گردنوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچ لے جاتے
یں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے بے بس اور لاچار انسان کے
وشت کی مجھے کوئی رغبت نہیں۔ میری طلب ان سب سے
لگ ہے۔ میں کسی ایسے شخص کے گوشت سے اپنی بھوک
مٹانا چاہتا ہوں جو اَمر ہے۔ بالخصوص میں اس کے دھڑکتے
ل کا طلب گار ہوں۔ جب میں اپنی منقار اس مردِ جری کے گرم
تحرک دل میں پیوست کر دوں تو اس کے دل کی تھرتھراہٹ
محسوس کر سکوں۔ اس وقت اس شخص کے چہرے پر پیدا
ہونے والا موت کا کرب میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی ہوں"
پرامتھیوس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ایسا
لگا جیسے کوئی زبردست موج کسی چٹان سے ٹکرائی ہو —
ری وادی اس کی ہنسی کی گونج سے بھر گئی
"تو دیوانہ ہے" وہ بولا "بھلا کون امر پرستش ہوگا جو
یرے سامنے سینہ تان کر کہے گا لے میرے دل میں اپنی منقار
اڑ دے۔ یہ تیرا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا
ر تو یہ خواب دیکھتے دیکھتے ایک دن فاقوں سے گھل گھل
ر مر جائے گا"!
"شاید ایسا ہو ..... شاید ایسا نہ بھی ہو" گدھ نے
ر سکون لہجے میں کہا۔
"مستقبل کے بارے میں کون یقین سے کچھ کہہ سکتا ہے
لیکن اگر میرا خواب پورا ہوگیا تو اس سرزمین پر اس انوکھے تجربے
ی راج

سے آشنا ہونے والا میں واحد پرندہ ہوں گا۔ بالفرض ایسا
نہیں ہوا تو کم از کم تم مجھے اپنی اس دیوانگی کے لئے یاد تو رکھو گے"!
پرامتھیوس وہاں سے ہنستا ہوا رخصت ہوگیا مگر
اس تنہا گدھ کی ایک بات نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔
آہ بے چارہ انسان اس ظلمت کدے میں آج بھی آگ کی
دولت سے محروم ہے۔ روشنی کے بغیر اس کی زندگی کس
قدر اجیرن ہے۔ اچانک اسے بھی اپنا ایک پرانا خواب
یاد آگیا۔ جیسے سیاہ گھنے بادلوں میں بجلی سی کوند گئی ہو۔
اس کا جنون ایک بار پھر بیدار ہوگیا۔ اس نے سوچا۔ گدھ جیسا
بے بضاعت پرندہ اپنے جنون کی سلامتی کی خاطر زندہ ہے جبکہ
میرے بازوؤں میں دیوتاؤں جیسی قوت موجود ہے اور میں
موت پر بھی فتح پا چکا ہوں۔ میں چاہوں تو اس کرۂ ارض کو ایک
گیند کی مانند ستاروں کی جانب اچھال سکتا ہوں۔ تبھی
اس کا یقین پختہ ہوگیا اور وہ تیزی سے اولمپس پہاڑ کی طرف
روانہ ہوگیا۔ سامنے دیوتاؤں کے مقدس آتشکدے میں آگ
دہک رہی تھی۔ اس نے آتش کدے میں ہاتھ ڈال دیا اور
تھوڑی سی آگ لے کر انسانوں کی بستی کی طرف لوٹ گیا۔
پرامتھیوس آگ لئے ہوئے زمین پر ایک سورج کی مانند
طلوع ہوا جس نے مجبور اور بے بس انسانوں کی راتیں بھی
روشن کر دیں۔ وہ جوں ہی آگ لئے ہوئے زمین پر اترا —
تاریکی سے بے شمار احسانمند، بے بس اور لاچار ہاتھ آگے
بڑھے، اندھیرے میں شکرگذاری کے کلمات گونجے اور ان
الفاظ کی لرزش سے رات کا مخملی پردہ تھرتھرانے لگا۔
پرامتھیوس کا دل جوشِ مسرت سے بھر گیا۔
لیکن اس مسرت کے لمحے میں بھی اسے وہ فاقہ زدہ
گدھ اچھی طرح یاد تھا جو اس ویران بلند پہاڑی کی وادی
میں دوسرے مردار خور گدھوں سے الگ، اکا و تنہا بیٹھا تھا۔

شری ولاس راؤ دیشمکھ نے طلبا،
مبارکباد دیتے ہوئے یہاں کی ایکتا
دوسروں کے لئے ایک مثال قرار دی
زیر مملکت برائے انفارمیشن
اکٹر شری کانت جیکار اس پروگرام کا اہتمام
رنے پر ناگپور کارپوریشن نے سراہنا
رتے ہوئے ایسے پروگرام مستقبل میں
ھی منعقد کرنے کی توقع ظاہر کی۔
شری فاروق شیخ اور شریمتی آشا پارکھ
نے بھی ناگپور کے طلبہ کی پرزور لفظوں میں
ستائش کی اس پروگرام میں شری بال
یشیا نڈے نے آرکسٹرا دیا۔ شری کرانتی
اہ ڈائرکٹر آف پبلک برادری نے پروڈیو
یا۔ شری رمیش تلوار اور مشہور موسیقار شری
ونت سنگھ نے اس پروگرام کا اہتمام کیا۔

سال ۱۹۸۶ء کیلئے عوامی تعطیلات

حکومت مہاراشٹر نے ریاست مہاراشٹر
ں سال ۱۹۸۶ء کے دوران نیگو شیبل
سٹرومنٹ ایکٹ ۱۸۸۱ء کے تحت مندرجہ
یل عوامی تعطیلات کا اعلان کیا ہے۔
یوم جمہوریہ منگل ۲۶ جنوری مہاشیو
اتری منگل ۱۶ فروری ہولی (دوسرا دن)
جمعہ ۴ مارچ گڈی پاڑوا جمعہ ۱۸ مارچ
مہاویر جینتی، جمعرات ۳۱ مارچ گڈ فرائیڈے
جمعہ یکم اپریل ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر جینتی
جمعرات ۱۴ اپریل چھتر پتی شیواجی مہاراج
جینتی، پیر ۱۸ اپریل رمضان عید (عیدالفطر
(یکم شوال) بدھ ۱۸ مئی، بقرعید (عیدالاضحیٰ)
پیر ۲۵ جولائی۔ یوم آزادی۔ پیر
۱۵ اگست۔ پارسی سال نو (شہنشاہی) اور
محرم بدھ ۲۴ اگست گنیش چترتھی جمعرات
۱۵ ستمبر دسہرہ۔ جمعرات ۲ اکتوبر
عید میلاد۔ پیر ۲۴ اکتوبر دیوالی اماوسیہ
(لکشمی پوجا) بدھ ۹ نومبر دیوالی
(بالی پرانی پڈا) جمعرات ۱۰ نومبر گرونانک
جینتی۔ بدھ ۲۳ نومبر
اگر مندرجہ ذیل تہوار اتوار کو آتے
ہیں تو اس دن عوامی تعطیل کا اعلان نہیں
کیا جائے گا۔ مہاراشٹر ڈے اور بدھ
پورنیما یکم مئی مہاتما گاندھی جینتی ۲ اکتوبر اور
کرسمس ۲۵ دسمبر۔
اگر مندرجہ بالا کوئی مسلم تہوار
نشاندہی کردہ تاریخ کو نہیں ہوا تو حکومت
کے ملازمین کو جس دن ان کا تہوار منایا جانے
والا ہے اس دن اختیاری رخصت گرانٹ کی
جائے گی۔
۳۰ جون جمعرات اور ۳۱ دسمبر سنیچر کو
بینک کا ششماہی اکاؤنٹس کی جانچ کے
لئے بند رہیں گے لیکن ان تعطیلات کا
اطلاق سرکاری دفاتر پر نہیں ہوگا

۱۹۸۶ء کیلئے اختیاری رخصت

حکومت مہاراشٹر نے سال ۱۹۸۶ء
کے لئے مندرجہ ذیل ایام میں اختیاری
رخصت کا اعلان کیا ہے۔
مکر سکرانت جمعہ ۱۵ جنوری جمشید
نوروز پیر ۲۱ مارچ، رام نومی سنیچر
۲۶ مارچ۔ جنرا پور... (پہلا دن) سنیچر
۲ اپریل۔ رمضان عیدالفطر (دوسرا دن)
جمعرات ۱۱ مئی زرتشت۔ نو دیسو
(شہنشاہی) منگل ۳۱ مئی گرو ارجن دیو جی
کی برسی۔ ۱۸ جون گاتھا گمبر اس
(گاتھا ۴۴۴ کا ڈمی) جمعہ ۲۲ جولائی
خرداد سال (کاڈمی) سنیچر ۲ جولائی
پارسی سال نو گاتھا۔ (شہنشاہی) اور
محرم (عاشورہ کی وجہ سے) منگل
۲۳ اگست ناریل پورنیما سنیچر
۲۷ اگست خرداد سال (شہنشاہی)
پیر ۲۹ اگست جشن نامی سنیچر ۳ ستمبر

سمرا نوزاد ترا اودشی اور گوسائیں بھدرپد جمعرات ۸ ستمبر سرادن امادسیہ سنیچر ۱۰ ستمبر روشن ہوشنا (پہلا دن) پیر ۱۲ ستمبر کپور پور کی وجہ سے منگل ۲۰ ستمبر کپور پور بدھ ۲۱ ستمبر اننت چترداشی سنیچر ۲۴ ستمبر سدھا سکتی (پہلا دن) پیر ۲۶ ستمبر شہادت حضرت امام حسین جمعرات ۱۳ اکتوبر عید میلاد سنیچر ۲۹ اکتوبر، دیوالی (پہلا دن) (نارک چترداشی) منگل ۸ نومبر بھائی دوج جمعہ ۱۱ نومبر کرسمس (دوسرا دن) پیر ۲۶ دسمبر

مندرجہ ذیل دنوں کا بحیثیت اختیاری رخصت اعلان نہیں کیا گیا کیونکہ وہ اتوار یا عمومی تعطیل کو آ رہے ہیں۔ شب برات (۱۵ شعبان) اتوار ۳ اپریل زرتشت نو۔ دسو (کادمی) پیر ۲۵ جولائی گھٹ کھمبراس (گھٹا ؛؛؛ شہنشاہی) اتوار ۲۱ اگست ساونتساری جمعرات ۱۵ ستمبر کارتک پورنیما بدھ ۲۳ نومبر۔

سرکاری ملازمین زیادہ سے زیادہ چار اختیاری رخصت ان کے تہواروں کے دوران لے سکتے ہیں۔ ان اختیاری رخصت کی اجازت انہیں تحریری طور پر قبل از وقت ان کے افسر کو دینی ہوگی ان اختیاری رخصتوں کو ان کے سالانہ رخصت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

اگر مذکورہ مسلم تہوار ان ایام میں نہیں آئے تو مسلم سرکاری ملازمین ان کے تہواروں کی رخصت اس دن لے سکتے ہیں جس دن ان کا تہوار منایا جانے والا ہو۔

بمبئی کے کف پریڈ علاقے میں بنائے گئے جھولے لال مندر کا افتتاح مرکزی وزیر مملکت برائے شہری ہوابازی شری جگدیش ٹائٹلر نے ۵ نومبر ۱۹۸۸ء کو کیا۔ زیر نظر تصویر میں وزیر موصوف ربن کاٹ کر افتتاح کر رہے ہیں۔ مندر کے ٹرسٹی شری کنہیا لال کھاٹوانی بھی آپ کے ہمراہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

سابق چیف سکریٹری شری پی۔ ڈی۔ کسبیکر ۲ نومبر کو منترالیہ میں وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان کو آکٹرائے کے سلسلہ میں قائم کی گئی کمیٹی کی رپورٹ پیش کر رہے ہیں۔ زیر نظر تصویر میں وزیر برائے ہاؤسنگ ڈاکٹر روی سبرامنین اور وزیر مملکت برائے اطلاعات و رابطہ عامہ ڈاکٹر شری کانت جچکار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

عوامی جمہوریہ پولینڈ کے وزیر مملکت برائے معاشیات اور امداد باہمی شری اینڈریج وجوک نے ۱۲ر نومبر کو راج بھون بمبئی میں مہاراشٹر کے کارگذار گورنر جسٹس شری چنا تو ش مکرجی سے رسمی ملاقات کی۔ یہ اسی موقع کی تصویر ہے

تصویروں میں

ذی راج
میں بیرونی کے ہائی کمشنر ... ایچ جلودلی ابن محمد لیمنگ نے ...مبر کو راج بھون میں مہاراشٹر کے ...جسٹس شری چناتوش مکرجی سے رسمی ... یہ اسی موقعہ کی تصویر ہے۔

مہاراشٹر کے کارگذار گورنر جسٹس شری چناتوش مکرجی نے ۱۲ر نومبر ۱۹۸۶ء کو راج بھون بمبئی میں فلیگ ڈے مہم کا افتتاح کیا۔ زیر نظر تصویر میں گورنر موصوف فنڈ میں عطیہ دیتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

پارلیمانی جمہوریت کی ٹریننگ کی اختتامی تقریب کے موقع پر جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں دائیں سے کونسل میں حزب مخالف کے لیڈر شری آر۔ ایس۔ گوائی، کونسل سے [illegible] شری [illegible] راؤ تملک وزیر اعلیٰ شری ایس۔ بی۔ چوان اور اسمبلی کے [illegible] شری [illegible] بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ٹاٹا اسپورٹس کلب کے کپتان شری سیند گنگال مہاراشٹر کے کارگزار گورنر جسٹس شری ایس۔ کے ڈیسائی کے ہاتھوں ۳ نومبر ۱۹۸۰ء کو تاج محل ہوٹل بمبئی میں منعقدہ تقریب میں ٹائمس شیلڈ لے رہے ہیں۔

ریاست مہاراشٹر نے ریاستی سطح پر فروری ۱۹۸۸ء میں منعقد کئے جانے والے اروناچل پردیش نمائش کے بارے میں اروناچل پردیش کے گورنر شری رام پردھان نے ۱۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو بمبئی میں حکومت مہاراشٹر کے سینئر عہدیداران کے ساتھ اس سلسلے میں بات چیت کی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں گورنر شری رام پردھان کے

ساتھ مہاراشٹر کے ثقافتی امور کے سکریٹری شری ایس۔ شنکرمین۔ بائیں سے مہاراشٹر ٹورزم ڈیولپمنٹ کے منیجنگ ڈائرکٹر شری وردراجن ڈپٹی ڈائرکٹر آف نمائش شری صوبیدار اور ڈائرکٹر ثقافتی امور شری این ایل پٹیل دیکھے جا سکتے ہیں۔
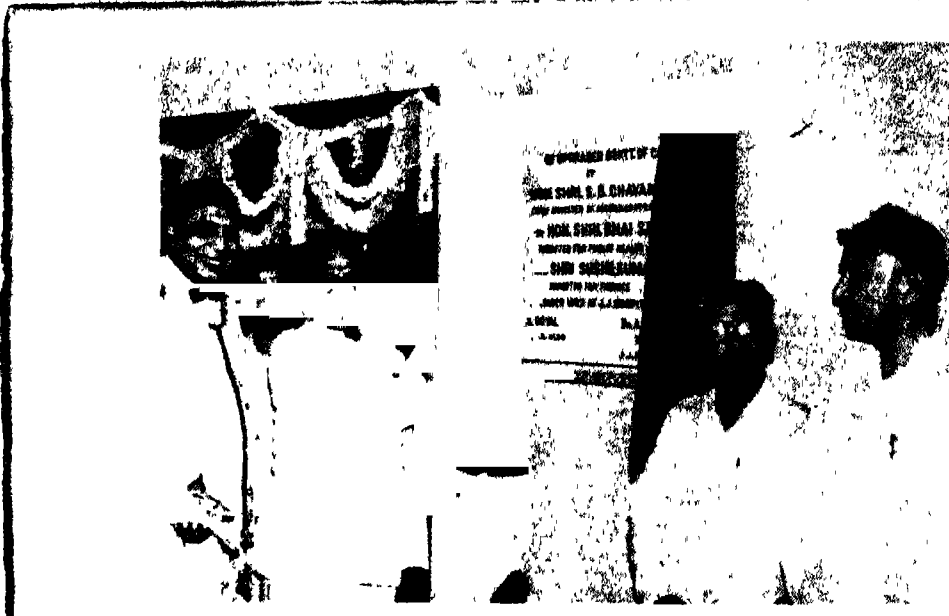
حال ہی میں

ہماراشٹر شری ایس.بی چوان
بے اسپتال میں تشخیص امراض
تاح کیا. زیرِ نظر تصویر میں
اکٹر بی. کے گوئل. وزیر اعلیٰ
رچوان. شری بھائی ساونت
شری سوشیل کمار وزیر برائے
ے جا سکتے ہیں.

ایسوسی ایشن آف شریف آف بمبئی کی طرف
سے ۱۱ر نومبر ۱۹۹۰ء کو ممتاز کرکٹر اور سابق
شریف آف بمبئی کی رحلت پر موجودہ شریف آف
بمبئی شری صدرالدین ڈابا کے دفتر میں ایک تعزیتی
میٹنگ منعقد کی گئی جس میں شری وجے مرچنٹ
کو پرجوش طریقے سے خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔
یہ اسی موقع کی تصویر ہے.

ری شنکر راؤ چوان نے ناگپور میں
ت کی جانب سے ہر سال ترقیاتی
ئے جانے والے انعامات کے
رہ تقریب میں سال ۸۶-۱۹۸۵ء
ن کو انعامات پیش کیے گئے
ں وزیر اعلیٰ شری ایس بی چوان
زل آف انفارمیشن کے سینیئر اسسٹنٹ
لال شاہ کو گجراتی کا پہلا انعام
ں. زیرِ نظر تصویر میں وزیر مملکت
ت و رابطۂ عامہ ڈاکٹر شری کانت
ے جا سکتے ہیں.

قارئین کی رائے

• ڈاکٹر ... [illegible]
[illegible]
۲۳۲ - ... - مائی باڈی، ضلع ناسک ۴۲۲۲۰۳

" قومی راج " یوں تو علمی، ادبی، معلوماتی اعتبار سے ایک مکمل جریدہ ہے۔ وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے "خاص نمبر" صحیح معنوں میں انفرادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

ان "خاص نمبروں" کی وجہ سے "قومی راج" دیگر رسالوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین جامع، مدلل اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ اس خصوصیت کے سبب "قومی راج" بہت مقبول ہے اور اس کے شمارے ریکارڈ کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کے لائق ہوتے ہیں۔
یقیناً آپ سب اور "قومی راج" سے منسلک اراکین ادارہ قابلِ تعریف اور قابلِ مبارکباد ہیں۔

• فردوس گیاوی
ننھے خاں کی گلی، پنچایتی اکھاڑہ۔ گیا - ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

ایک عرصہ کے بعد "قومی راج" دیکھا۔ یہ شمارہ "جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں، خصوصی نمبر" ہے۔ جو اچھا ہے اور اس کے اندرونی صفحات پر بکھرے تمام مضامین اسی موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شعری حصہ بھی کافی جان دار ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ، کاغذ نفیس، سرورق دیدہ زیب اور پرکشش ترتیب و تزئین آپ کی مدیرانہ صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ مگر افسوس اتنا اچھا رسالہ کسی بھی بکسٹال پر نظر نہیں آتا۔ "قومی راج" کا یہ شمارہ میں نے "خدابخش لائبریری" میں دیکھا اور وہیں مطالعہ کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کی چند کاپیاں ہر شہر کے بکسٹالوں پر بھی دستیاب ہو سکتیں۔
اس میں پہلے سے کافی اچھی تبدیلی آئی ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ آپ کی ادارت میں ترقی کے منازل طے کرے۔

• خورشید نعمانی
مہارشی دیانند آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس
۲۵۔ ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ روڈ، پریل۔ بمبئی ۱۲...

" قومی راج " صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نکھر آیا ہے۔ علمی و ادبی مضامین اگر کچھ زیادہ جگہ پائیں تو مناسب ہوگا۔

تنویر ملیح آبادی
مجاسہ پوسٹ ملیح آباد ضلع لکھنؤ (یوپی)
۲۲۶۱۱۱

" کانگریس کے صد سالہ جشن کا خصوصی نمبر جس میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی ایک شاندار اسٹل (رنگین) بھی شامل ہے۔ پسند آیا۔

آپ تو قومی راج کو خوبصورت بنا رہے ہیں۔ سارے مضامین اچھے ہیں۔

• محمد ظہیر الدین آصف
مکان نمبر ۶۸-۶-۶۰۔ اسٹریٹ اسلام پورہ
مقام: نرمل ۵۰۴۱۰۶، ضلع عادل آباد (اے پی)

" قومی راج " کا "جہیز مخالف اور آزادیٔ نسواں" نمبر نظر نواز ہوا۔ خوب سے خوب تر ہے، اور جس قدر بھی اس کی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے، جس کی نظیر "ہمارے" کی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔
یہ "خاص نمبر" ایک دستاویز ثابت ہوا۔ ان غریب والدین اور لڑکیوں کے لئے جن کو جہیز کی فکر کھوکھلا کر دیتی ہے اور ان لوگوں کے لئے جو خود کو، اپنی اولاد کو گائے بیلوں کی طرح قیمت لگا کر فروخت کرتے ہیں۔
یہ ضمیمہ پڑھ کر ہمارے گاؤں کے نوجوانوں میں ایک جذبہ پیدا ہوا اور ہم سب نے مل کر ایک جماعت "ینگ سوسائٹی" قائم کی ہے اور انشاء اللہ اس سلسلہ میں ہم ایسی تعمیری مہم چلائیں گے۔

★ ★ ★ ★ ★